اردو

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

عبدالحق بی۔اے (علیگ)

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ، اپریل ، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکۂ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ)

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی اے ، آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے —

—— :*: ——

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اردو پریس ، اردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ، اپریل ، جولائی
اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر
بحث ہوتی ہے ۔ حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپیہ سکۂ انگریزی
(مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپیہ سکۂ عثمانیہ)

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی اے ، آنریری سکریٹری
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے —

(باہتمام محمد صدیق حسن مینیجر انجمن اردو پریس ، اردو باغ ،
اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

دوسری غزل ملاحظہ ہو —

درد

اک آن سنبھلتے نہیں اب میرے سنبھالے
بے طرح کچھہ آنسوؤں نے پاؤں نکالے

جو کچھہ دکھاوے ہے خدا دیکھیں گے ناچار
صدقے ترے اک بار تو منہ اپنا دکھا لے

ایسے سے کوئی اپنے تئیں کیونکہ بچاوے
دل زلفوں سے بچ جاے تو آنکھوں سے چرالے

وہ سرخ لباس اس کے گلے میں نظر آیا
جس کے ہیں مرے دل میں پڑے اب تئیں لالے

کب مجھہ پہ گذرتا ہے کبھو میرا سا احوال
یوں چاہے سو تو اور بھی کچھہ باتیں بنالے

کیا جانئے کس دل کے تئیں آہ قسیں گے
زلفوں نے تو بے طرح یہ اب چھوڑے ہیں کالے

پھر آگے قیامت ہے اگر اب بھی نہ آؤ
مرمت کے جدائی کے دن اتنے تو ہیں ٹالے

ابرو نے تری جس طرف اب تیغ سنبھالی
مژگاں نے وہیں کردیے تب سامنے بھالے

وعدے کی تو مدت نہ کہی درد کچھہ اُس نے
اس غم کو بھلا کہئے کوئی کب تئیں ٹالے

— —

اثر

اب آنسو کہاں دیدۂ گریاں جو نکالے
یہ اشک نہیں بہوت بہے دل میں نے چھالے

دل اپنا پڑا اُس بت بے مہر کے پالے
دشمن کو بھی جس سے کہ خدا کام نہ ڈالے

مشکل ہے میری جان کسو دل کا اُڑانا
یوں مفت پڑا تو نہیں جو کوئی اُٹھالے

جوں نقش قدم خاک نشیں ہم ترے در کے
اس جا پہ مٹھیں پر نہ ٹلیں سو کوئی ٹالے

ساقی نئے جلوے سے آنہیں کیجئے معمور
ہیں خالی پڑے مثل حباب آنکھوں کے پیالے

سب حیلے حوالے سے تمہارے ہوں میں واقف
مت آئیے پر دل تو مرا کیجے حوالے

بل مارتے یوں ہوگئے با خاک برابر
وہ طفل سرشک اپنے جو میں آنکھوں میں پالے

یک جلوہ دکھاتے ہی ہوا آنکھ سے غائب
تک نام بتا دل کو چرا بھاگنے والے

دل نکلے پڑے ہے یہ ادھر اور اودھر آنسو
بے چارہ اثر کیا کرے کس کس کو سنبھالے

جی تو چاہتا تھا کہ اس قسم کی سب غزلیں نقل کر دیتا جو ایک ہی زمین میں دونوں دیوانوں میں ہیں - لیکن طوالت کے خیال سے دو ہی پر اکتفا کرتا ہوں اور میرے نزدیک ان دو غزلوں سے اس کا اندازہ بھی ہو جائے گا کہ درد اور اثر میں کتنی یکسانیت ہے —

غزل کا سب سے مہتم بالشان موضوع محبت اور اس کے متعلقات

ھیں - غزلوں میں عاشق اپنی حالت، محبوب کی صفات، اپنی مجبوریاں، محبوب کی زیادتیاں، اپنی وفا اور محبوب کی بے وفائی کا رونا روتا ھے - اُس کے دل کی حالت کبھی ایک سی نہیں رھتی - کبھی محبت اُسے کچھہ بنا دیتی ھے اور کبھی کچھہ - کبھی وہ عشق کو اپنا ایمان اور محبوب کو اپنا خدا سمجھنے لگتا ھے اور کبھی اپنے کئے پر پچھتاتا ھے - کبھی اپنی محبت کا اظہار کرتا ھے اور کبھی اسے پوشیدہ رکھہ کر اپنی بلند ہمتی اور اعلی ظرفی کا ثبوت دینا چاھتا ھے - سب کچھہ ھوتا ھے، متضاد خیالات دل میں آتے ھیں لیکن ایک سچا عاشق کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کرتا جو اُسے یا اُس کے محبوب کو لوگوں کی نظروں میں پست یا ذلیل بنا دے یا لوگ اُس کے جذبۂ عشق کا احترام کرنے کے بجائے اُسے دیوانگی سے تعبیر کریں —

انسان کی فطرت ایک خاص چیز ھے - اُس کا ھر فعل اُس کی فطرت کے رنگ میں ڈوب کر نکلتا ھے - لیکن کبھی کبھی مجبوریوں کی وجہ سے وہ ایسی باتیں کرنے لگتا ھے جو اُس کی فطرت کے بالکل خلاف ھیں - یہی حالت عاشق کی ھے - وہ ایک عاشق صادق ھونے کی حیثیت سے ھمیشہ عشق کے بلند جذبے سے کام لیتا ھے اور اُس کا ھر فعل اور قول اُس کی عاشقانہ فطرت کی بلندیوں کا آئینہ ھے - لیکن انتہائے یاس یا بد گمانی کی وجہ سے وہ کبھی ایسی باتیں بھی کر جاتا ھے جو اُس کی عاشقانہ فطرت کے منافی ھیں - ان چیزوں سے اُس کے بلند جذبۂ عشق پر کوئی اثر نہیں پڑتا - وہ اپنی جگہ قائم ھے - اس کی کمزوریاں فطرت انسانی کا خاصہ ھیں اور اگر وہ ایسا نہ کرتا تو اس کا عشق یا اس کی محبت کا جذبہ غیر فطری معلوم ھوتا - اور اس لیے اس میں کوئی امتیازی

شان باقی نہ رہتی —

اثر کے دیوان میں جن عاشقانہ جذبات کو نظم کیا گیا ہے اُن میں سے بہت کم ایسے ہیں جو ہماری راہبری کسی اعلیٰ (Ideal) محبت کی طرف کرتے ہیں - اُن کی محبت کے جذبات میں جن جن باتوں کی جھلک ہے وہ انسانی محبت کے لئے ضروری ہیں - اعلیٰ (Ideal) محبت انسان اور انسان میں ہونی ممکن نہیں - وہ دو مختلف جنسوں میں ہوسکتی ہے اس لیے اثر کے یہاں جب کسی اعلیٰ (Ideal) عشق کی ترجمانی ہوئی ہے وہاں صاف نظر آتا ہے کہ اُن کا محبوب اس آب و گل کی دنیا سے بالاتر ہے - ورنہ ہمیشہ اُن کی محبت کے فلسفہ میں فطرت انسانی کی صحیح تصویریں نظر آتی ہیں - وہ محبوب کی برائی بھی کرتے ہیں ' اپنے عشق کے انجام کو سونچ کر پچتاتے بھی ہیں ' اپنی محبت بھی جتاتے ہیں - لیکن صرف اس لیے کہ یہ فطری چیز ہے - لیکن اس کے باوجود ایسا کبھی نہیں کہ اس محبت میں پستی یا ابتذال کا شائبہ تک ہو - کبھی کبھی عشق مجازی میں بھی اعلیٰ (Ideal) عشق کی جھلک ہے —

ایسا عاشق ہمیشہ اپنی محبت کو اپنا ایمان اور مذہب جانتا ہے - اور محبوب کی محبت کو اپنے لئے ایک ایسا فرض سمجھنے لگتا ہے جس کا پورا کرنا اُس کی زندگی کا سب سے پہلا کام ہے - اس قسم کے شعر اثر کے ہاں اچھی خاصی تعداد میں ہیں —

کہوں کیا خدا جانتا ہے صنم محبت تیری اپنا ایمان ہے

ہم راست کو مسلماں حق ہی بتاں کہیں گے

تم بندے ہو خدا کے ہم بندے ہیں تمہارے

جو عاشق اس درجۂ عشق تک پہونچ جاتے ہیں وہ یہ محسوس کرنے

لگتے ہیں کہ عشق کوئی آسان چیز نہیں —

نشۂ عشق سہج ہے پینا　　لیکن اُس کا سنبھال مشکل ہے

یہی عاشق عشق کی تکلیفوں کو راحت جانتے ہیں —

عاشق جو گداز قلب سے گلتا ہے　　گلزار خلیل پھولتا پھلتا ہے

جوں شمع دل سوختہ جانان عشق　　روشن رہتا ہے جب تلک جلتا ہے

اور اُن کی تکلیف اور آرام کا دارومدار محبوب کے ساتھہ رہنے نہ رہنے پر ہے —

جنت ہے اُس بغیر جہنم سے بھی زبوں　　دوزخ بہشت ہے کی اگر یار ساتھہ ہے

وفاداری عشق

ایسے عاشق وفاداری کو اپنا ایمان جانتے ہیں اور ہر حالت میں محبت کا دم بھرتے ہیں - اُنہیں کوئی چیز اُن کے راستے سے ہٹا نہیں سکتی —

بے وفائی وہ گو ہزار کرے　　یہاں وفا ہی شعار اپنا ہے

ظاہرا کچھہ سوائے مہر و وفا　　بات تجھہ کو مگر نہیں آتی

ایسے عاشق ہر غم کو بلا شکوہ شکایت کے جھیلتے رہتے ہیں —

میں اور کروں گا تیرا شکوہ　　جنّیں یہ کہا غلط ہے

تم نیں جو کچھہ ستم سہے کوئی اثر وہ کیا کہئے

جی نہ رہے کہ یا رہے اب بھی نباہ کیجئے

کتنی اچھی تلقین ہے جس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبہ پر ہوسکتا ہے —

تم جور و جفا کرو جو چاہو　　ان باتوں پہ کب مجھے نظر ہے

اس مضمون کی ایک رباعی ملاحظہ ہو کس مزے میں کہی ہے —

دام زلفوں نے تیری ایسا ہے تیار کیا　　دیکھا آزاد جسے اُس کو گرفتار کیا

جو کیا خوب کیا اور جو ہوگا سو قبول　　تجھہ سے کب ہم نے کسی بات کا تکرار کیا

صرف اپنا عشق مکمل[1] ایسے عاشق اپنے عشق کے نزدیک دوسرے کے عشق کو ہیچ و پوچ جانتے ہیں —

ساری مجلس میں تیری اے ساقی ایک اپنے تئیں خمار رہا

عاشقی اور عشق کی باتیں سب جہاں سے اثر کے ساتھہ گئیں

محبوب سب کچھہ | ایسے عاشق اپنی ساری اُمیدوں اور خوشیوں کو صرف محبوب کی ذات سے وابستہ کردیتے ہیں - اُن کے تعلقات کی دنیا محبوب تک جاکر ختم ہو جاتی ہے —

میں تو اپنی بساط میں بے کس تجھکو اے مہربان رکھتا ہوں

تیری اُمید چھٹ نہیں اُمید تیرے در کے سوائے در ہی نہیں

نہ ہم واقف کسو سے نہ کسو سے کام رکھتے ہیں

سوا تیرے بساط اپنی خدا کا نام رکھتے ہیں

ایسے عاشقوں کی ہر طرح مشکل ہے - دیکھیں تو مشکل نہ دیکھیں تو مشکل - محبوب کا دیدار نصیب نہیں ہوتا تو دل تڑپتا ہے - دل کی اُمیدیں پوری ہونے کا وقت آتا ہے تو آنکھیں اُس جلوہ کی تاب نہیں لاسکتیں - جس سے انتہائی محبت ہے اُسی سے حد سے زیادہ ڈر بھی ہے - کس قدر سادگی سے سوال کرتے ہیں کہ —

تو نگہ کی نہ کی خدا جانے ہم تو ڈر سے کبھو نگاہ نہ کی

اسی مضمون کو دوسری طرح کہا ہے —

وہ کون لوگ ہیں جو تجھکو دیکھہ سکتے ہیں نگاہ کرتے ہی اپنا تو جی ہی جاتا ہے

محبوب کا ڈر | تو نے ہی تو یوں نڈر کیا ہے

بس ایک مجھے تیرا ہی ڈر ہے

رباعی۔ اپنے تو جی سے تیرا ڈر نہ گیا جی گیا یہ نہ گیا پر نہ گیا

آہ کس دن کے لئے یہ رہا آج کی رات اثر مر نہ گیا

یہ تو اُس عشق کے جذبہ کی ترجمانی ہے جسے مجازی کہنے کے بعد بھی ہم کسی نہ کسی حد تک اعلیٰ (Ideal) کہہ سکتے ہیں - لیکن اثر کی عاشقانہ شاعری کا لطف ان شعروں میں نہیں بلکہ وہاں ہے جہاں وہ اس خیالی دنیا سے اُتر کر حقیقت کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں - عاشق ' معشوق ' عشق اور محبت سب فطرت کے رنگ میں ڈوبے ہوے ہیں —

دل

اُن کی اس عاشقانہ شاعری میں دل کو ایک خاص اہمیت ہے - وہ اپنی مصیبتوں ' پابندیوں اور مجبوریوں کا ذمہ دار صرف دل کو ٹھہراتے ہیں - وہ اُسے اپنی ہستی کا کوئی جزو نہیں بلکہ ایک ہی راستہ پر چلنے والا مسافر سمجھتے ہیں - جہاں وہ رکا یہ بھی تھم گئے - اُس نے جو کیا انہیں بھی کرنا پڑا - اُس کی حماقتوں کا ساتھ دیا ' اُس کے کہے کو بھرا اور کہیں کہیں مجبور ہوکر ابل پڑے کہ اس بے ہنگام و بد شعار کی وجہ سے خدا جانے کیا کیا آفتیں اُٹھانی پڑیں - اس داستان کا لطف میرے لفظوں میں نہیں خود اثر کے لفظوں میں زیادہ ہوگا —

میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ
پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہوگیا

———

دل سے فرصت کبھی جو پائیے گا حال اپنا تجھے سنائیے گا

———

عشق کے صدمے اٹھاتا تھا دل اب تو وہ بھی نہیں کیا کیجئے گا

گر خانہ برانداز یہ دل آہ نہ ہوتا رسوائے دو عالم کوئی واللہ نہ ہوتا

اب توقع کسے بھلائی کی دل نہ ہوتا تو کچھہ بھلا ہوتا

یا خدا پاس یا بتاں کے پاس دل کبھو اپنے هاں رها هی نہیں

جان سے هم تو هاتھہ دهو بیٹھے اس دل بے قرار کے هاتھوں

آسودگی کہاں جو دل زار ساتھہ هے
مرنے کے بعد بھی یہی آزار ساتھہ هے
کلیجہ پک گیا هے کیا کہوں اس دل کے هاتھوں سے
همیشہ کچھہ نہ کچھہ اس میں خیال خام رهتا هے

منزل عشق میں اُن کے دوسرے هم سفر آہ و نالے هیں - وہ قدم قدم پر انہیں کام میں لاتے هیں - لیکن اس دشوار سفر میں اُن کے بلائے بھی کچھہ نہیں بلتی . یہ سب کچھہ معلوم هے لیکن جی نہیں مانتا هے پھر آزمائش کی جاتی هے اور یہ تیر خالی جاتے هیں - عاشق کو بھی رونا روتے زندگی ختم هوجاتی هے —

دیکھیں کے اُس کی سنگدلی کو هم اے اثر
گر کوئی نالہ هم سے سر انجام هوگیا

ایک آہ تو کی ہوتی بھلا اُس کے بھی آگے
پھر اُس میں اثر ہوتا اثر خواہ نہ ہوتا

دیکھتے تو سہی کہ کیا ہوتا ایک نالہ اثر کیا ہوتا

اُس سنگدل کے دل میں تو نالہ نے جا نہ کی
کیا فائدہ جو اور کے جی میں اثر کیا

کہسار میں ہر سنگ میں یہ کہتا ہے پکارے
اے درد مقرهوں تیرے نالوں کے اثر کا

تھامتا ہوں اثر میں آہوں کو جل نہ جاوے یہ آسماں کہیں

کچھہ نہ ہوتا اثر اثر اُس کو بھلے کو نالہ تو کیا ہی نہیں

ہردم آتی ہے گرچہ آہ پہ آہ پر کوئی کار گر نہیں آتی

یا ابھی نہیں دم میں تاثیر یا اثر اُٹھہ گیا فغاں سے

جب اُس کو اثر اثر نہ ہووے کیا فائدہ نالۂ و فغاں سے

اس قسم کے دیوان اثر میں پچاسوں شعر ہیں - ان میں کہیں
شاعر نے یہ کہا ہے کہ میرے نالہ میں اتنا اثر ہے کہ میں اُسے نکالتے ہوے

ڈرتا ہوں - کبھی اس خوف سے نالہ نہیں کیا کہ کہیں رائگاں نہ جائے اور کبھی کیا اور وہ کارگر نہیں ہوا اور آخر میں مجبوراً یہ کہہ کر خاموش ہوگیا کہ ع کیا فائدہ نالۂ و فغاں سے ---

محبوب کی بے وفائی

عشق کی دنیا میں وفا سب سے پہلی چیز سمجھی جاتی ہے اور عاشقوں کے نزدیک وفا ساری اُن پر ختم ہے اور بے وفائی محبوب پر - اردو کے شاعروں نے اس خیال کو دا جانے کتنے طریقوں سے نظم کیا ہے - اکثر اس میں اس قدر نڈا پن پیدا ہوگیا ہے کہ پڑھنے والوں کی طبیعت مکدر ہوتی ہے - کے دیوان میں پچاسوں شعر ایسے ہیں جن کا موضوع اپنی وفاداری محبوب کی بے وفائی ہے - اُنھوں نے ہر جگہ نئے نئے طریقۂ بیان اختیار ہیں - اور ہر موقعہ پر شوخی اور تغزل کی چاشنی نے اس موضوع شعروں کو بے حد کیف آگیں بنا دیا ہے ---

محبوب کی بے وفائی کا ذکر اُنھوں نے جن مختلف طریقوں سے کیا ہے اُن میں سے پہلا تو یہ ہے کہ محبوب نے مختلف مواقع پر جو جو وعدہ خلافیاں یا عہد شکنیاں کی ہیں اُنھیں طنزاً یا شاعرانہ انداز میں بیان کردیا ہے - ایسے موقعوں پر اپنی وفا کو درمیان میں نہیں لائے - لیکن طریقۂ بیان اکثر اس قسم کا ہے کہ پڑھنے والے اس میں لذت محسوس کرتے ہیں اور محبوب کی خوش جمالی کے باوجود عاشق کے ہم نوا بن جاتے ہیں - اس شکوہ میں کہیں طنز ہے اور کہیں شوخی لیکن ہر جگہ دل کا درد ضرور شامل ہے ---

بے وفائی پہ تری جی ہے فدا　　　قہر ہوتا جو با وفا ہوتا

کس بلا کا تغزل ہے ---

جس چیز کو محبوب جدا نہیں سیکھتا ہو وہی عاشق کے لیے جانکاہ ہے - کسی

قدر تفاوت ہے —

یہاں تغافل میں اپنا کام ہوا تیرے نزدیک یہ جفا ہی نہیں

کبھی عاشق ان بے وفائیوں کا شکوہ لطیف اشاروں میں کرتا ہے —

کیا کہوں کچھ کہی نہیں جاتیں باتیں ہیں بے شمار آنکھوں میں

دل اپنا پڑا اس بت بے مہر کے پالے دشمن کو بھی جس سے خدا کام نہ ڈالے

محبوب کی بے مہری کا شکوہ اس سے زیادہ زور دار لفظوں میں کرنا ممکن نہیں — شاعرانہ انداز بیان کا لطف، جذبات کا جوش اور ساتھ ہی تغزل کی پر کیف چاشنی شعر میں ایک ایسی روح پھونک دیتی ہے جسے پڑھ کر دل میں تازگی کے آثار پیدا ہونے لگیں —

کبھو جفا کے سوا تجھ سے کچھ نہیں دیکھا
یہ تو بھی مجھکو وفا کا گمان باقی ہے

اتنا بکلا کہ ہم غلط بیٹھا رہے
کون سی تیری بات پر کیجے

شعر کے لہجے میں کس قدر نرمی ہے — الفاظ کتنے سادے ہیں لیکن اس چھوٹے سے شعر میں جذبات کا ایک طوفان ہے — صاف معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے کے دل میں کتنے داغ ہیں — لیکن کوئی مجبوری زبان کو خاموشی پر مجبور کر رہی ہے —

چھوڑی نہ تو جفا کبھو بھولے نہ کی وفا
اے بے ثبات اس کی ہے کیوں کر نباہ کی

ایک دل جلے کی پکار ہے — کس قدر تلخی ہے —

کبھو دوستی ہے کبھو دشمنی تری کون سی بات پر جائیے

کس قدر فطری جذبہ ہے — انسان کو جس سے محبت ہوتی ہے اس

کی باتوں سے مختلف وقتوں میں مختلف اثر لیتا ہے۔ کبھی ایک بات میں دوستی کی جھلک نظر آنے لگتی ہے کبھی وہی بات دشمنی کا ذریعہ ٹھہرتی ہے۔ اس میں انسان مجبور ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے۔ لیکن اس فطرت کی ترجمانی ایک شاعر جس انداز سے کرسکتا ہے اس کی بہترین مثال یہ شعر ہے —

کبھی بھی تجھے مہر یا وفا ہے یا یہ ہی بساط میں جفا ہے

بتوں کی شان بے نیازی پر ایک رباعی اور سن لیجئے۔ اس کے بعد اس داستان کو یہیں چھوڑ کر آگے بڑھیں۔

نے حال تباہ کی انہیں بینائی نے نالۂ و آہ کی اثر شنوائی

کوئی مرتے مرو جیئے جیو بھائیں نہیں اللہ غنی بتوں کی بے پروائی

عاشق کی وفا معشوق کی بے وفائی

اب تک جو شعر لکھے گئے ان میں صرف محبوب کی بے وفائی، شان بے نیازی، تلون مزاجی اور تغافل کا شکوہ کیا گیا ہے۔ اپنی وفا کو کہیں درمیان میں نہیں لائے۔ لیکن اثر کے اکثر شعر ایسے بھی ہیں جن میں ایک طرف تو محبوب کی بے وفائی کا شکوہ ہے اور دوسری طرف اپنی وفاداری کا ذکر۔ اس تضاد سے محبوب پر ایک خاص اثر ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ممکن ہے کہ اعلیٰ Ideal محبت کے طالب اس طریقہ کو بلند عشق کے معیار سے گرا ہوا جانیں۔ لیکن میرے نزدیک اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس پر گذری ہو۔ ضبط اور صبر کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے۔ جب کسی کی زیادتیاں حد سے گذر جاتی ہیں تو مظلوم کی فطرت بالکل مفقود ہو جاتی ہے اور مجبوری اسے اسی قسم کی باتیں کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن عشق کا بلند جذبہ کبھی ان مجبوریوں کے باوجود بھی غالب آجاتا ہے اور

شاعر یہ کہنے لگتا ہے -

کچھ خوب نہیں یہ تیری باتیں ہر چند مجھے نباہ کرنا

تو کیوں عبث ہے دشمن جاں اس غریب کا

رکھتا نہیں عزیز اثر تجھ سے جاں تلک

بے وفا کچھ تری نہیں تقصیر

مجکو میری وفا ہی راس نہیں

اس شعر کی کیفیتوں کی جتنی داد دیجئے کم ہے - اپنی وفا کا گمان ہے - محبوب کی بے وفائی کا یقین ہے - محبوب سے اس کا شکوہ کیا جاتا ہے - وہ سب باتوں کو جھوٹ جانتا ہے - کہنے والا عاجز آجاتا ہے اور اپنے جلے ہوئے دل کے پھپولے اس طرح پھوڑتا ہے - صاف معلوم ہوتا ہے کہ جذبات کے ایک طوفان کو دبانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن ان کا جوش کسی پابندی کا محکوم نہیں رہ سکتا اس لیے صرف دبے ہوئے لفظوں میں یہ آگ چنگاری بن کر نکلی - شعلے اندر ہی اندر بھڑک رہے ہیں —

اسی طرح کا ایک اور شعر —

کیوں تو برضد جفا ہی کرتا ہے نہیں کچھ دعوٰۂ وفا مجکو

صاف ظاہر ہے کہ وفا کا دعویٰ ہے لیکن کہیں تو زبان کٹ جائے -

اے بتاں الٹی ہی خدائی ہے با وفاؤں سے بے وفائی ہے

میں اور مجھ سے آہ یہ تیرے سلوک ہیں افسوس قدر جانی نہ تو میری چاہ کی

وہ کسی اور سے کرے گا کیا جلّیں تجھ سے اثر نباہ نہ کی

ایک شعر اور سنئے - کتنی شوخی اور تغزل ہے —

پڑی ہے تازہ کسو سے معاملت درپیش مری وفا کو جو مذکور میں تو لاتا ہے

گو ہم ہیں عاشق وفادار پر اتنا بھی ستم نہ کیجئے

کس قدر درد بھری التجا ہے —

اِن شعروں کے علاوہ دو رباعیوں میں بھی اسی قسم کے مضامین ہیں- صرف ایک رباعی ملاحظہ ہو- کس قدر شاعرانہ انداز بیان اختیار کیا ہے —

نواوروں کے چاہنے کے دے ہے طعنے میں اور کو چاہتا ہوں چھٹ تجھہ یعنے

اس کہنے میں ترے کچھہ نکلتی ہے بات تک اپ ہی جی سے پوچھہ اس کے معنے

دوسرے شعر نے رباعی کی ادبی لطافتوں کو کس قدر بلند بنا دیا - جس طرح محبوب اس سوال کا جواب دے کر دل میں کڑھے گا اسی طرح پڑھنے والے اس معمے کو حل کر کے لذت محسوس کریں گے —

اثر کے جتنے شعر وفا اور بے وفائی کے متعلق لکھے گئے ان میں ہر جگھہ انہوں نے اپنی وفاداری کا اظہار کیا ہے لیکن ہرجگہ شاعرانہ نزاکت اور ادبی لطافت سے اس میں وہ بات نکالی ہے کہ پڑھنے والا ہمیشہ ان سے ہمدردی کرتا ہے - صرف یہی نہیں بلکہ اس کے دل میں ان کی محبت کی طرف سے بدگمانی بھی نہیں پیدا ہوتی —

ابتداے عشق

عاشق جب عشق کے کوچے میں قدم رکھتا ہے تو شروع شروع میں اسے وہاں دنیا کی ہر لذت محسوس ہوتی ہے - ہر بات میں حسن، ہر بات میں خوشی - لیکن اس ابتدا کی انتہا کوئی انہیں دل جلوں کی زبان سے سنے - اثر نے ایک رباعی میں اسی جذبہ کو نظم کیا ہے -

ہیں یاد مجھے تازہ ملاقات کے لطف لینے آپس میں ووں ہر اک بات کے لطف

کیا کیا میں کہوں گذشتہ اوقات کے لطف تھے دن کے جدے لطف جدے رات کے لطف

انجام عشق

کوئی دیتا میں دل دوانا تھا

تجھے واللہ یہ نہ جانا تھا

اپنی حماقت

واہ ری عقل تجھہ سے دشمن سے
دوستی کا گمان رکھتا ہوں

اس قسم کا ایک اور شعر ہے وہ بھی مزیدار ہے -

کوئی کھاتا تھا دغا جھوٹی مدارات سے میں
آپھنسا دام میں کیا جانئے کس بات سے میں

اور سنیے - اثر اب تک فریب کھاتا ہے تیری باتوں کو مان جاتا ہے

عشق میں انسان عقل کھو بیٹھتا ہے - اسے غلط و صحیح کی تمیز باقی نہیں رہتی - اس لئے ایک بار نہیں ہزار بار وہ اسی فریب میں مبتلا ہوتا ہے جس میں اب سے پہلے پچاسوں مرتبہ پھنس چکا ہے —

جان کا زیاں

یہ عشق ابتدا میں نئی نئی ترنگیں اپنے ساتھہ لاتا ہے - لیکن بہت جلد یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور عاشق یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس میں جی اور جان کا خطرہ ہے - زندگی اسی درد و الم میں کٹتی ہے اور آخر یہ آزار جان لےکر ٹلتا ہے - اثر نے نئے نئے طریقوں سے ان جذبات کو نظم کیا ہے - نہ ان پر کہیں پستی کا شبہ ہوتا ہے اور نہ وہ کہیں غیر شاعرانہ ہیں - حقیقت اور شعریت کی دنیا میں بے حد لطف امتزاج ہے —

اثر اب تو ملے ہے تو اس سے پر یہ ملنا مزا دکھاوے گا
تجھکو اگر اثر نہیں کہنے کا ہم کو کیا عاشق ہوئے سے اپنے ہی جی کا ضرر کیا
مرض عشق دل کو زور لگا جاں بلب ہوں خیال گور لگا
کس لئے وہاں چلے اثر مگر اور حال اپنا تباہ کرنے کو

عاشق کے جی پر بنتی ہے اور دنیا کو طعنہ زنی سے کام ہے —

عشق کی نفسیاتی حقیقت اثر نے کس قدر کھلے ہوئے لفظوں میں

بیان کی ہے - اعلی Ideal ۔شق پر جان دینے والے خواہ اسی اصول کے پابند ہوں لیکن دل سے اُسے برا ضرور کہیں گے - لیکن حقیقت کی دنیا میں رہنے والوں کے لئے اس میں آپ بیتی کا لطف ہے —

حقیقت جب کھلی دل پر ہوا معلوم تب ہم کو
کدھر کا عشق وے باتیں ترنگیں تھیں جوانی کی

ایک رباعی میں اثر نے بیان کیا ہے کہ عشق کا دل پر کیا اثر ہے- سن کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ آگ خود ہمارے سینوں میں سلگ رہی ہے —

جوں شعلہ جلے جی رخ زرد کے ساتھہ   ہوں سوختہ جاں دل کے اثر دردکے ساتھہ
جاڑے کے دنوں کی طرح نت سارے سال   نکلے ہے بھاپ ہردم سرد کے ساتھہ

اپنی ہستی میں انقلاب

اس عشق کی بدولت انسان میں جو جو تبدیلیاں ہو جاتی ہیں وہ دیکھنے والوں کو حیرت میں ڈال دیتی ہیں - انہیں دیکھہ کر خود محبوب بھی کبھی کبھی محو حیرت ہو جاتا ہے - اثر نے اس مضمون کو بھی بہت سی جگہ نظم کیا ہے اور ہر جگہ جدت بیان سے اس میں نیا لطف پیدا کرنے کی کوشش کی ہے —

کردیا کچھہ سے کچھہ ترے غم نیں   اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

کبھی کبھی یہ تبدیلی اس قدر فوری ہوتی ہے کہ دیکھنے والے اسے اور شدت سے محسوس کرتے ہیں —

نظر آتا تھا اثر حال ترا روز بروز   دیکھتا ہوں ولے اب اور طرح رات سے میں

ابتدائے عشق میں دل پر قابو ہوتا ہے لیکن یاس و حرماں کے تیر اسے چھلنی بنا دیتے ہیں اور انسان کے اختیار میں نہیں رہتا کہ وہ اسے اپنے قابو میں رکھہ سکے - شاعر کس قدر حسرت سے کہتا ہے -

آہ وہ دن گئے کہ ہم بھی اثر   دل کو اپنے سنبھال رکھتے تھے

اب اس تبدیلی کی حد ملاحظہ ہو کہ خود وہ جو اس انقلاب کا ذمہ دار ہے محو حیرت ہے —

یہ کیا ہوگیا دیکھتے دیکھتے اثر میں تو میں وہ بھی حیران ہے
کچھ اور ہی ہوا ہے حال میرا جب سے حال اثر سنا ہے

اپنی حالت بیان کرنے کا کیا لطیف طریقہ ہے کہ جنھوں نے اُس حال کو سنا ہے اُن کی حالت کا نقشہ کھینچ دیا - ظاہر ہے کہ جس تصویر کا یہ عکس ہے وہ خود کتنی رنگین ہوگی —

اس انقلاب کی آخری منزل یہ ہے کہ انسان اپنی ہستی سے بالکل بے خبر ہوجائے —

حالت مت پوچھ اب اثر کی کچھ بات رہی نہیں خبر کی

عشق میں دنیا کی دشمنی

اس عشق خانہ خراب میں جہاں اور سب باتیں ہیں وہاں یہ بھی ہے کہ زمانہ اپنا دشمن بن جاتا ہے - ایک کی دوستی سب کو دشمن بنا دیتی ہے اور ستم یہ کہ وہ بھی دوست نہیں - ایسی صورت میں عاشق کی زندگی اُس کے لیے وبال ہوجاتی ہے - اُس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے - اپنی اس بے کسی کا رونا یا تو اپنے دل سے روتا ہے یا پھر اسی بے وفا سے جس نے اس انجام کو پہنچایا —

جس کی خاطر سبھی ہوے دشمن نہ ہوا وہ بھی دوست یا قسمت

ایک تیرے لیے میں ساری عمر سب کی باتیں ہزارہا تو سہیں

ایک تیری ہی بات کے لیے ہم باتیں سو سو سبھوں کی سہتے ہیں

اس بے کسی کی آخری منزل یہ ہوتی ہے کہ اپنے پرائے سب محبوب

کی طرف ہو جاتے ہیں - عاشق بے چارہ سوائے اس کے کہ اپنے حال پر آپ روئے اور کیا کر سکتا ہے —

دوست دشمن سبھی ہوئے تیرے　　کیا برائی کا اب زمانا ہے

خدا سے لگاؤ | مومن کے ایک اس شعر پر :-
خدا کی بے نیازی ہائے مومن　　ہم ایماں لائے تھے نازِ بتاں سے

خدا جانے غزل کے کتنے دیوان صدقے اُتارے جاسکتے ہیں - معنی کے دریا ایک کوزے میں بند ہیں - اثر نے اس بے چارگی کو دو تین جگہ نئے نئے انداز میں بیان کیا ہے - عشق کی مجبوریوں کی آخری منزل ہے -

افسوس کہ اِن بتوں کے ہاتھوں　　اب آن پڑی اثر خدا سے

یہ تو وہ حالت ہے جب اپنے بت طناز کے چھوڑنے کا زخم دل میں تازہ ہے - اُس کے بعد جب یہ زخم زرا بھرنے لگتا ہے تو مختلف طریقوں سے اُس پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں —

دن رات ہر ایک سے نہ فریاد کرو　　اس خانہ خراب دل کو آباد کرو
اتنا بھی ان بتوں پہ مت بھولو اثر　　اپنے اللہ کو تم اب یاد کرو

جب دل اس نصیحت پر عمل پیرا ہو جاتا ہے ' سکون اور راحت کی منزلوں میں قدم رکھہ دیے جاتے ہیں تو اپنی مصیبتیں یاد آتی ہیں - اسی درد اور اس راحت میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - اطمینان کی سانس کے ساتھہ جذبۂ دل باہر آتا ہے —

مر گیا پر بتوں سے کچھہ نہ بنی　　اب اثر کی خدا سے خوب بنی

انجام عشق کے مختلف جذبات اور اُن کے متعدد درجے اثر کی زبان میں بیان کرد یے گئے - عاشق کی وفا داریوں اور محبوب کی بے وفائیوں کی داستان بھی دھرائی گئی - آہ و نالوں کی تاثیریں ہمارے

دلوں میں اُتریں - دل کا افسانہ کانوں کے رستے رگ جان تک پہنچا - سب کچھ ہوا مگر ابھی عشق کا قصہ ختم نہیں ہوا - ابھی بہت کچھ باقی ہے - عشق کے لوازم اُس سے زیادہ مہتم بالشان ہیں - اثر نے ان سب مضامین کو اپنی غزلوں میں دل کھول کر جگہ دی ہے - اس لیے اُن کے ذکر بغیر اس داستان کی تکمیل غیر ممکن ہے —

انتظار اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جس سے عاشق کو واسطہ پڑتا ہے انتظار کی وہ تلخ گھڑیاں ہیں جو کسی عہد شکن کے آنے کے خیال میں کاٹی جاتی ہیں - دل خدا جانے کیا کیا خیال لے کر بیٹھتا ہے لیکن ایک محدود وقت کے بعد یہ سب خاک میں مل جاتے ہیں - اور اب صرف اُس جذبہ کا احساس باقی رہ جاتا ہے جو انتظار کی دشوار منزل سے گذرنے کا لازمی نتیجہ ہے - ایک وقت ایسا آتا ہے کہ عاشق اس کے نام سے گھبراتا ہے - انتظار کا دوسرا نام اُس کے نزدیک موت ہے —

تیرے آنے کا احتمال رہا	مرتے مرتے یہی خیال رہا

وہاں نہ وہ قول نہ وہ قرار رہا	یہاں وہی اب تک انتظار رہا

نہ نکلا تو گھر سے پہ یہاں منت جی	تیرے منتظر کا نکلتا رہا

جو اس انتظار کی مرگ انجام لذت چکھ چکا ہے وہ بڑے بڑے مسائل کو اسی روشنی میں دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے —

مانا اثر کہ وعدۂ فردا غلط نہیں	لیکن کٹی نہ آج یہ شب انتظار کی

انتظار کی حد انسان کو بالکل نا امید بنا دیتی ہے —

نہ رہا انتظار بھی اے یاس	ہم امید وصال رکھتے تھے

انتظار کس قدر شدید چیز ہے اس کا اندازہ صرف ایک شعر سن کر ہو سکتا ہے —

دن انتظار کا تو کٹا جس طرح کٹا لیکن کسو طرح نہ کٹی رات رہ گئی

کبھی کبھی یہ انتظار جان لے کر ٹلتا ہے —

جی ہی جاتا رہا پہ تو نہ پھرا باز آئے ہم ایسے آنے سے

عاشق انتظار کرتے کرتے کچھہ اس قدر بے صبر ہوجاتا ہے کہ انتظار کا خیال تک اس کے لیے جاں سوز بن جاتا ہے - یہ بلا اس پر اس طرح مسلط ہوتی ہے کہ ہر بات کی ابتدا اور انتہا کے بعد اس کا مہلک خیال دل پر قبضہ کرلیتا ہے —

تیرے وعدوں کا اعتبار کسے گو کہ ہو تاب انتظار کسے

آج کی رات اثر صبح تو ہونی معلوم نہیں کٹتی نظر آتی ہے سر شام مجھے

عاشق کی مجبوریاں

عشق کی مجبوریوں کی کوئی حد نہیں - عاشق دنیا کی بلاؤں میں گرفتار ہوتا ہے - اس کے پاس ان کا کوئی علاج نہیں - وہ محبوب سے اس کا بدلا لینا چاہتا ہے - اس کے دل سے اس کے لیے بد دعائیں نکلتی ہیں - وہ دنیا کو اپنے سر پر اُٹھا لینا چاہتا ہے - ان مصیبتوں کی انتہا کے بعد وہ خدا جانے کیا کیا کرنا چاہتا ہے - لیکن بے اختیار ہے - کچھہ کرنے کے لیے ہاتھہ بڑھاتا ہے تو کوئی اس سے زیادہ اہم خیال اُس کے مذہب اور شرع کا کوئی اصول دامنگیر ہوتا ہے - زبان کھولنا چاہتا ہے تو پابندیء محبت زنجیر بن جاتی ہے - جینا مشکل ہے لیکن مرنا بھی آسانی سے نصیب ہونا ممکن نہیں - ہاتھہ پاؤں ' زبان سب اپنے ہیں لیکن کسی پر اپنا قابو نہیں - یہ سب محسوس کرنے کے بعد

عاشق ہر کام صرف اس نیت اور ارادہ کے ساتھہ کرنا شروع کرتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس میں کامیابی ہو جائے —

ان مجبوریوں میں پہلی مجبوری یہ ہے کہ جانکاہیء عشق تن بدن کی جان نکال لیتی ہے - کوئی کام کرنے کی طاقت باقی نہیں رہتی - کچھہ کرنا بھی چاہیں تو دل کی حسرت دل میں —

اظہار کیونکہ کیجے گا حال تباہ کا		نہ زور نالہ کا ہے نہ مقدور آہ کا

دل چاہتا ہے کہ اپنا حال محبوب کو دکھایا جائے لیکن مجبوری حائل ہے - خود عاشق کی زبان سے سنئے —

تو نہ آیا اِدھر کو ورنہ ہمیں		حال اپنا تجھے دکھانا تھا

اپنی بد نصیبی کا رونا ہے - اُسے دور کرنا اپنے اختیار میں نہیں - اس مجبوری نے دل میں ایک درد پیدا کردیا - اس لیے دوسروں کے لیے دعا نکلنے لگی —

کیا کہوں اپنی بد نصیبی کی		دے کسو کو نہ یہ خدا قسمت

دل جانتا ہے کہ محبوب بے وفا ہے - اپنی وفا کا بھی پورا یقین ہے لیکن مجبوریوں نے عادی بنا دیا ہے - اس لیے بجائے اس کی بے وفائی کے اپنی وفا کا رونا رویا جاتا ہے —

بے وفا کچھہ تیری نہیں تقصیر		مجھکو میری وفاھی راس نہیں

سب سے بڑی مجبوری یہ کہ ہر مصیبت کے باوجود بھی محبت کا چھوڑنا اختیار سے باہر ہے —

کیا کیجے اختیار نہیں دل کی چاہ میں

ہیں سب وگرنہ تیری یہ باتیں نگاہ میں

عاشق سب کچھہ کرسکتا ہے لیکن محبوب کو اپنی طرف سے

خوش ظن نہیں بنا سکتا - کتنی بڑی مجبوری ہے —

ایک میری ہی دعا دشنام سے مخصوص ہے
ورنہ پیارے کون تجکو یہاں دعا کرتا نہیں

مجبوری کا ایک درد بھرا مرقع اور ملاحظہ ہو —

ہم سے کشتہ بال امیروں کے روبرو ناحق خبر نہ لا کے سناؤ بہار کی

سب سے بڑی اور مہلک مجبوری عاشق کی یہ ہے کہ وہ اپنے دل کو قابو میں نہیں رکھہ سکتا —

دل جو یوں بے قرار اپنا ہے اس میں کیا اختیار اپنا ہے
آہ وہ دن گئے کہ ہم بھی اثر دل کو اپنے سنبھال رکھتے تھے

عاشق کی ایک اور مجبوری جس کا اُس کے پاس کچھہ علاج ہی نہیں یہ ہے کہ جب اُس نے محبوب سے اس بات کا شکوہ کیا کہ پیارے ہم تو تمہاری یاد میں اتنے بیچین تھے کہ جان پر آبنی' دنیا کی زبان پر ہماری داستان تھی' تم نے بھول کر خبر تک نہ لی - وہاں سیدھے سادے منہ سے جواب دے دیا کہ ہمیں خبر نہیں - اب بتائیے اس کا عاشق کے پاس کیا علاج - سوائے اس کے کہ یا تو معشوق کو جھوٹا ٹھہرائے یا اپنی مجبوری پر صبر و شکر کرے —

شہرا یہ تیرے عشق میں رسوائی کا میری
کیونکر میں مانوں پہنچا تیرے کان تک نہیں

نالہ مرا نہ پہنچا تیرے کان تک کبھی جاتا ہے گو زمین سے لے آسماں تلک

ہے مرا حال تو زبان زد خلق میں نہ مانوں تجھے خبر ہی نہیں

جب عاشق سے ان مجبوریوں کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا تو آخر اُس کے پاس صرف وہی وسیلہ رہ جاتا ہے جو ہر ابتدا کی انتہا ہے۔ اپنی مصیبتوں کا فیصلہ صرف ایک ذات پر چھوڑ دیتا ہے اور یوں کہتا ہے۔

تونے بندے سے جو سلوک کیا   بت کافر خدا سے پاوے گا

صبر کی کمی

عشق میں بےتابیاں جب حد سے گذر جاتی ہیں تو انسان صبر کی طاقت ہاتھ سے کھو بیٹھتا ہے۔ موت کا زہر اُسے صبر کی تلخی کے آگے آب حیات نظر آتا ہے۔ وہ دنیا کی ہر بڑی سے بڑی مصیبت جھیلنے کو تیار ہے لیکن صبر کے نام سے اُس کی روح کانپتی ہے۔ خود ہم اپنی روزانہ کی زندگی میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ صبر ایک حد تک ممکن ہوتا ہے اور اس کے بعد ہم عقل اور سمجھ کو بالائے طاق رکھ کر ایسی ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں جو کسی اور صورت میں گوارا نہیں ہوسکتیں۔ شاعر شاعرانہ مبالغہ کو دخل دے کر اس دنیاوی حقیقت کو شاعرانہ حقیقت کی حدود سے جلا دیتے ہیں۔ اثر کے شعروں میں اس جذبہ کی کثرت ہے —

بس ہو یا رب یہ امتحان کہیں   یا نکل جائے اب یہ جان کہیں

صبر چُھٹ دل سب اور باتوں میں   قابل امتحان رکھتا ہوں

آزما اور جس میں چاہے تو   صبر میں کر نہ امتحاں دل کو

غم میں بیٹھوں کہاں تئیں بت کے   اب اُٹھا دے کہیں خدا مجھکو

ہم سے کسو طرح نہ کٹے گی شب فراق اس پر نہ جا کہ روز کہا شام کرچکے

دن کٹا جس طرح! کٹا لیکن رات کٹتی نظر نہیں آتی

داستان عشق

عاشقی کے جہاں اور لوازم ہیں ایک یہ بھی ہے کہ عاشق کا دل اپنا دکھڑا سنانے کے لئے بیتاب ہو - اس میں تو ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے - ہر شخص جب اُس پر غم ہوتا ہے تو اُسے ہلکا کرنے کے لیے اُسے دوسروں سے بیان کرکرکے روتا ہے - عاشق بھی اس سے الگ نہیں ہوسکتا - فرق صرف یہ ہے کہ اس کا دل کبھی اپنی داستان کہنے سے نہیں بھرتا - یہ اپنی جس داستان کو بے حد ضروری سمجھتا ہے وہ دوسروں کے نزدیک ضرورت سے زیادہ طویل ہوتی ہے - وہ دوسروں سے اور خصوصاً محبوب سے اس بات کا طالب ہوتا ہے کہ وہ اُسے کان دھر کے سنے - لیکن وہ اسے ہمیشہ ایک تفریح کی چیز سمجھ کر یا تو سنتا نہیں اور اگر سنتا ہے تو اس کا مذاق اُڑاتا ہے - اس کا جی طرح طرح سے بے چین ہوتا ہے اور خود اُس کی داستان تو کجا اُس کا داستان سننے نہ سننے کا شکوہ ہی ایک دلچسپ افسانہ بن جاتا ہے —

اثر کا حال بھلا تک تو کچھہ سنا ہوتا ابھی تو اُس کی بہت داستان باقی ہے

کہیں جل کر کہہ اُٹھتا ہے —

کون سنتا ہے یہاں کسو کی بات بس اثر قصہ مختصر کیجے

اپنی بیتی اگر میں تجھہ سے کہوں بات نبڑے نہ اس کہانی کی

ایک مشکل یہ بھی ہوتی ہے کہ جب بولنے یا داستان کہنے کا موقع

ہوتا ہے تو عاشق کی زباں کو تالا لگ جاتا ہے اور جب وقت نکل جاتا ہے تو دل اسے بیان کرنے کے لئے زیادہ بے چین ہونے لگتا ہے —

رخصت ملی جو بولنے کی تو زباں نہیں جب تک رہی زبان تو ہم بے زباں رہے

کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ محبوب سے حال کہیں - لیکن ہمت نہیں پڑتی - لیکن جب جی پر بننے لگتی ہے تو دل اس مصیبت کے اٹھانے پر آمادہ ہو جاتا ہے —

بن حال دکھائے کوئی بنتی ہے اثر بے بات سنائے کوئی بنتی ہے اثر
اب حال دل اس سے کہہ گذرنا مجکو بن جو کہوں اٹھائے کوئی بنتی ہے اثر

اب ضبط سے تاب چپ رہنے کی نہیں طاقت صدمات عشق سہنے کی نہیں
ایک بات ہے موقوف ترے آنے پر بن آئے ترے کہوں سو کہنے کی نہیں

دوسری مصیبت یہ ہے کہ اس حال کو سن کر کوئی یقین لانے پر تیار نہیں ہوتا - اس مجبوری کا اظہار اثر نے بے حد شاعرانہ انداز میں کیا ہے -

گزرے ہے جو کچھہ کہ دل پہ کس سے میں کہوں کوئی نہ چڑھا نظر کہ اس سے میں کہوں
یہ بات ہی ایسی ہے کہ تو کہا پیارے باور نہ کرے اسے وہ جس سے کہوں

عاشق اپنی داستان سننے کے لئے صرف محبوب کو موزوں سمجھتا ہے - جب وہ سننا نہیں چاہتا ہے تو خون جگر میں ڈوبے ہوئے التجا اور محبت اور درد میں سرشار لفظ اس جذبہ کی ترجمانی اس طرح کرتے ہیں —

احوال تباہ کو دکھاؤں میں کسے افسانۂ درد دل سناؤں میں کسے
تو دیکھہ نہ دیکھہ سن نہ سن جان نہ جان رکھتا ہوں تجھی کو اور لاؤں میں کسے

ہجر وصل دونوں مصیبت

عاشق ہر بات کی تمنا کرتا ہے - ہر بات کا طالب ہے اور سب سے زیادہ وصال محبوب کا

متعلق - لیکن ایسے عاشق جو عشق کی سب منزلوں سے گذر چکے ہیں سمجھتے ہیں کہ عاشق خوش رہنے اور اپنی امیدوں اور تمناؤں کو پورا کرنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا۔ اس کے لئے زہر قاتل ہے لیکن تریاق اس سے بھی زیادہ مہلک - ہجر مشکل ہے لیکن وصال اس سے کہیں زیادہ جاں ستاں - جب یہ معلوم ہوجاتا ہے تو وقتاً فوقتاً اس کی آہیں دل کے جن جذبات کو باہر لاتی ہیں ان کی ترجمانی اثر کی زبان میں اس طرح ہو سکتی ہے۔

نہ ملو یا ملو فرض ہر طرح تم کو آسان مجکو مشکل ہے

آہ ملیے تو ستم ہے ورنہ ملیے تو غضب
کچھ نہ پوچھو دل کی حالت بے طرح اب تو پڑی

ہر طرح اب تو حال مشکل ہے ہجر کیسا وصال مشکل ہے

بلندی شوق نا امیدی

حسرت کا شعر ہے —

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
میری ہمتوں کی پستی میرے شوق کی بلندی

دنیا میں انسان کو اکثر غم اس لئے اٹھانے پڑتے ہیں کہ وہ کسی خوشی کی امید میں رہتا ہے۔ اگر خوشی کا خیال دل میں نہ ہو تو غم کی شدت اس قدر تکلیف نہ دے - ہم اپنی زندگی کے تجربات میں دیکھتے ہیں کہ ایک برائی اگر کوئی دشمن ہم سے کرے تو ہمیں اس سے اتنی روحانی تکلیف نہیں ہوگی جتنی اس صورت میں کہ ہمارا کوئی دوست ہمارے ساتھ وہی برائی کرے - اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دشمن سے ہمیں دوستی

کی نہیں دشمنی ہی کی امید ہے - لیکن اپنے دوست سے ہم دشمنی کا گمان بھی نہیں کرتے - اس لئے اس کی کسی معمولی سی بات کو بڑا سمجھا جاتا ہے - عشق کی دنیا میں عاشق کی حالت اس سے بھی بدتر ہے - وہ محبوب سے دنیا کی امیدیں رکھتا ہے اور ان میں سے اگر ایک بھی پوری نہیں ہوتی تو اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے - اس نفسیاتی جذبہ کو اثر نے دو ایک جگہہ نہایت شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے —

ہم غلط احتمال رکھتے تھے تجھہ سے کیا کیا خیال رکھتے تھے

دوسرا شعر ہے —

یوں تو کیا بات ہے تری لیکن وہ نہ نکلا جو تھا گماں دل کو

پہلا مصرعہ صرف اس لئے کہا کہ عاشق ہیں، محبوب کو بری نظروں سے دیکھنا گناہ جانتے ہیں -

خودداری

کسی شاعر نے کہا ہے —

صدبار جنگ کردہ با وصلح کردہ ایم او را خبر نہ بودہ ز صلح و ز جنگ ما

اس شعر کی تشریح یوں ہوسکتی ہے کہ ہر شخص میں خودداری کا کچھہ نہ کچھہ مادہ ضرور ہوتا ہے، کسی میں کم کسی میں زیادہ - عاشق بھی اس سے الگ نہیں - اس لئے جب کبھی محبوب کی طرف سے یہہ خیال ہوتا ہے کہ اس نے ہمارے ساتھہ غیر مناسب سلوک کیا تو اس سے لڑائی ٹھان لی جاتی ہے - مگر پھر نتیجہ معلوم - دل کو کون سمجھائے ؟ وہ پھر اسی طرح محبت کا دم بھرنے لگتا ہے - خیر یہ تو سب کچھہ ہوتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ خودداری عاشق کے دل میں کبھی نہ کبھی یہ خیال پیدا ضرور کرتی ہے - اثر کے بھی دو ایک شعر اسی مضمون کے سن لیجئے —

نہ ملوں جب تلک کہ تو نہ ملے اب یہی قصد جی میں ٹھانا ہے

اثر ان سلوکوں پہ کیا لطف ہے پھر اس بے مروت کے گھر جائیے

اس عشق کی داستان کہاں تک سنیے گا- اس میں کیف ضرور ہے لیکن بے جا طوالت اجیرن ہو جاتی ہے - ابھی اثر کی غزلوں کی اور خصوصیتیں بھی باقی ہیں - اب ان کی طرف متوجہ ہونا چاہئے —

تغزل

غزل کی اصطلاحی تعریف ہو سکتی ہے اور بیسیوں جگہہ کی گئی ہے لیکن تغزل کی کوئی اصطلاحی تعریف کرنے کے معنی شعریت کا خون کرنا ہے - میں اس کے لیے جن باتوں کو ضروری سمجھتا ہوں اس میں سے پہلی تو یہ ہے کہ اسے کسی نہ کسی عشق کے جذبہ سے تعلق ہو - خواہ محبوب کی طرف سے خواہ عاشق کی طرف سے - خواہ اس میں محبوب کے کسی حسن کی تصویر ہو یا کسی عیب کا مرقع- خون عاشق کے غم کی مصوری یا شکوہ و خوشی کے جذبات کا نقش - یہ سب باتیں ایک شعر کو تغزل کی حدود میں لا سکتی ہیں- دوسری چیز جسے میں نے تغزل کے لیے ضروری سمجھہ رکھا ہے شوخی یا شگفتگی ہے - یہ چیز مذاق سلیم کی حدود میں رہ کر جتنی وسیع ہوتی جائےگی اتنا ہی شعر کا تغزل بڑھتا جائے گا - میرے نزدیک تغزل کی بہترین مثالیں مومن کے یہاں مل سکتی ہیں - لیکن اثر کے دیوان کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس میں بھی اس بلا کا تغزل ہے کہ خدا کی پناہ- اثر کے کچھہ شعر پیش ہیں امید ہے کہ وہ آپ کو میرا ہم خیال بنا لیں گے —

نظریں ہر ایک سے ملاتے ہو تک تو آنکھیں کبھی ملائیے گا

کون ہو لے چلے ہو کس لیے دل نام اپنا ذرا بتائیے گا

کیا ہو گئی تیری شوخ چشمی   اید ہر نظریں دو چار کرنا
کیا لطف ہے لے کے دل مکرنا   اور الٹے مجھے گواہ کرنا

لے چکے دل تو قصد جاں ہے مگر   پھر شروع اب جو یہ تپاک ہوا

اوپر کے سب شعروں میں لطف شگفتگی اور شوخی کی جھلک ہے - ہر ایک میں معشوق کو مخاطب کیا گیا ہے اور نئے نئے طریقوں سے تفنن پیدا کرنے کی کوشش - لیکن یہ تفنن ہر موقع پر تغزل کی حدود کے اندر ہے —

امیر مینائی کا یہ شعر مجھے تغزل کے لحاظ سے بے حد پسند تھا —

اُن کو آتا ہے پیار پر غصہ   مجھہ کو غصہ پہ پیار آتا ہے

لیکن اثر کا شعر پڑھنے کے بعد اسے بھول گیا - اس میں کچھہ اور ہی لطف ہے —

جس گھڑی گھورتے ہو غصہ سے   نکلے پڑتا ہے پیار آنکھوں میں

مجھہ سے لے تو چلے ہو دیکھو پر   توڑیو مت کہیں میاں دل کو

اسی غزل کا ایک دوسرا شعر ہے اس میں بھی حد سے زیادہ تغزل ہے -

لیجئے گا نہ لیجئے گا پھر   دیکھئے تو سہی بتاں دل کو

کیا کوئی سودے والا گاہک کو اس طرح لبھانے کی کوشش کرے گا -

دل اپنا پڑا اس بت بے مہر کے پالے
دشمن کو بھی جس سے کہ خدا کام نہ ڈالے

سب حیلے حوالے سے تمہارے ہوں میں واقف
مت آئیے پر دل تو میرا کیجے حوالے

یک جلوہ دکھاتے ہی ہوا آنکھ سے غائب
تک نام بتا دل کو چرا بھاگنے والے

تینوں شعروں میں تغزل کا لطف ہے —

تیری عیاریوں کی باتیں اثر سب سمجھتا ہے گو دیوانہ ہے

کیجے نا مہربانی ہی آکر مہربانی اگر نہیں آتی

———

چھوٹی بحروں کی غزلوں میں عموماً ایسے شعر کثرت سے ہیں -

دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا دشمنی پر تو پیار آتا ہے

عاشق معشوق کو چھپ چھپ کر دیکھتا ہے۔ انجام کی پروا نہیں - دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور جو کچھہ کہتے ہیں اس میں تغزل کی انتہا ہے —

چھپ چھپ کے دیکھنے کے مزے سب یہ اے اثر
معلوم ہوں گے جو کبھو اونیں نگاہ کی

———

میرا دل مرے ہاتھہ لیجے اور ستم ہے مجھی سے مکر جائیے

———

کس کے ہاں تم کرم نہیں کرتے کبھو ایدھر نہ مہربانی کی

اب اثر میں بہت نہیں باقی — آن کی آن تک رہو بیٹھے

پڑی ہے تازہ کسو سے معاملت درپیش — مری وفا کو جو منڈ کور میں تولاتا ہے

گو ہیں ہم عاشق وفادار — پر اتنا بھی ستم نہ کیجئے

اثر کے شعروں کی اگر صرف مثالیں ہی لکھی جائیں تو صفحے کے صفحے سیاہ ہو جائیں - اُن کی تشریح بھی اس لیے نہیں کی گئی - ان کا لطف صرف طرز بیان سے وابستہ ہے اور طرز بیان ہی وہ چیز ہے جسے پڑھنے والا سب سے پہلے محسوس کرکے اس کا اثر لیتا ہے - ایسے شعروں کی کوئی شرح ان کی لطافتوں پر بار بن جاتی ہے -

طنز

اُردو میں لطیف طنزیات کی بہت کمی ہے - نظم میں یہ چیز جس حسن کے ساتھ مومن یا اکبر کے یہاں صرف ہوئی ہے کسی اور کے یہاں نہیں - خصوصاً مومن کی طنز میں تغزل اور ادبی لطافت کے ساتھ ظرافت کی چاشنی عجیب لطف دیتی ہے -

اثر کے کلام میں بھی اس قسم کی طنز کی مثالیں بہت سی مل جائیں گی جن میں صرف لفظوں میں نہیں بلکہ معنی میں طنز کا لطف ہے - اگر اُس کا ترجمہ دوسری زبانوں میں کر لیجئے تو بھی ظرافت یا طنز کی لطافت باقی رہتی ہے - (Addison) کے نزدیک اس قسم کی ظرافت کو لطیف طنز یا مزاح صادقہ کہتے ہیں --

محبوب سے کہنا چاہتے ہیں کہ تیری محبت میں ایسی ایسی مصیبتیں ہیں کہ جو اس پھندے میں پھنس گیا اُس کی زندگی جنجال میں پھنس گئی - لیکن طرز ادا نے اُسے کس قدر لطیف بنا دیا ہے —

خوب دنیا میں خوش رہا ہوگا جو کہ عاشق تہرا ہوا ہوگا

محبت کی، مصیبت سر آئی، خدا خدا کرکے اس مصیبت سے نجات حاصل کی تو لوگ کہتے ہیں —

جی اب کے بچا خدا خدا کر پھر اور بتوں کی چاہ کرنا

لیکن اس غزل میں ایک شعر اور ہے - اُس میں شیخ جی کی خبر لی گئی ہے - کس قدر مزے میں اپنے خیال کو ظاہر کیا ہے —

رحمت کے حضور بے گنا ہی مت شیخ کو روسیاہ کرنا

معشوق نے جی لے لیا، اب جان لینے کی تیاری ہے - عاشق اس فعل کو ظاہر ہے کہ کتنا اچھا جانے گا، لیکن دیکھئے کس طرح تعریف کرتا ہے -

جی لیے پر بھی رہے دشمن جاں آفریں اس نباہ کرنے کو

اسی قسم کا ایک اور شعر ہے —

لیا ہے دل ہی فقط اور جان باقی ہے ابھی تو کام تمھیں مہربان باقی ہے

اور سنئے —

بھلا شکر کرنے لگے پھر شکایت کرم، مہربانی، توجہ، عنایت

ایک رباعی میں بھی نہایت لطیف طنز ہے —

تو اوروں کے چاہنے کے دے ہے طعنے میں اور کو چاہتا ہوں چھت تجھے یعنے
اس کہنے میں تیرے کچھہ نکلتی ہے بات تک اپنے ہی جی سے پوچھہ اُس کے معنے

آخری مصرعہ میں طنز کی کتنی گہری جھلک ہے -

تصوف اثر کے کلام کا ایک بے حد نمایاں پہلو اُن کی صوفیانہ شاعری ہے جس پر شروع سے آخر تک درد کا رنگ چھایا ہوا ہے - کہیں کہیں آسان زبان میں صوفیانہ مسائل کو اس قدر بے تکلفی کے ساتھہ نظم کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے تصوف کا گہرا دریا ہے - اُس میں سے

کھرے کھرائے آبدار موتی نکل رہے ہیں - دقیق سے دقیق مسئلہ کے لیے وہی روزمرہ کی زبان ہے - اور لطف یہ کہ ہر شخص اُنہیں آسانی سے سمجھہ بھی سکتا ہے - اب ہم ان کے دیوان میں سے کچھہ ایسے شعر مثال کے لیے لکھتے ہیں جن میں تصوف کا اثر ہے -

انسان کی حقیقت

انسان دنیا میں آتا ہے اور تھوڑے دن رہ کر چلا جاتا ہے - اسے یہ تک علم نہیں ہوتا کہ اس کی ابتدا اور انتہا کیا ہے —

احوال کھلا نہ ابتدا کا　　معلوم ہوا نہ انتہا کا

انسان خواہ کتنا ہی دعویٰ کرے کہ اس نے خدا کو پہچان لیا سب غلط ہے - اس لیے کہ اس سے یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ خدا کی مکمل اور سچی تعریف کر سکے —

عرفان اتم ہے عجز عرفاں　　تعریف قصور ہے ثنا کا

انسان خود اپنی حقیقت سے بے بہرہ ہے —

معلوم ہوئی نہ کچھہ حقیقت　　میں کیا ہوں کون ہوں کدھر ہوں

بندہ اور خدا

نسبت مجھے آہ تجھہ سے کیا ہے　　بندا بندا خدا خدا ہے

جس طرح دنیا کی ہر چیز کا وجود دوسری چیز کے وجود پر منحصر ہے اسی طرح انسان محض ایک عکس ہے کسی دوسرے نور کا -

جوں عکس کہاں مرا ٹھکانا　　ترے جلوہ سے جلوہ گر ہوں

رسول کی حقیقت

محمد صلعم کا مرتبہ سب سے بلند ہے —

جس جاگہ پہنچے نہیں کسو کی　　فوق اس سے مقام مصطفیٰ کا

وہ سارے انبیاء کا مقصود اور جن و انس کا مسجود ہے —

مسجود کل ملائک وجن　　مقصود تمام انبیا کا

اُس کی تعریف سوائے خدا کے اور کوئی نہیں کرسکتا —

اللہ کی بس کہے محمد مظہر ہے وہ ذات کبریا کا
اور نعت نبی کرے بس اللہ یہ مونہہ نہیں اور ماسوا کا

خدا — خدا ہر جگہہ موجود ہے لیکن کسی کو نظر نہیں آتا —

گرچہ ہے نت وہ پردہ نشیں سب سے در حجاب
بے پردہ ہو پڑی ہے وہی ذات کس طرح
تجھہ سوا کوئی جلوہ گرہی نہیں
پر ہمیں آہ کچھہ نظر ہی نہیں

خدا رگ جان سے قریب ہے لیکن کسی کو اس کا پتا نہیں —

گرچہ دل میں ہی سدا جان جہاں رہتے ہو
پر بظاہر نہیں معلوم کہاں رہتے ہو

ہر جگہہ اسی کا ذکر ہے - مندر میں - مسجد میں - گرجے میں - شیخ و برہمن و پادری کی زبان پر اسی کا نام ہے —

اے رونق بزم جب سنا ہے مذکور ترا ہی جا بجا ہے

اسی خیال کو دوسری طرح یوں ادا کیا ہے —

عالم تمام مظہر اسما ہی بسکہ ہے کیونکر کسو ہی چیز کو بے نام سمجھئے

اسی خیال کو ذرا فلسفیانہ انداز میں ادا کیا گیا ہے - اس سے اثر کے علمی تبحر کا بھی اندازہ ہوتا ہے —

گر ہم ہی ہم ہیں آہ تو ہم ہم کبھو نہیں اور توہی تو ہے سب کہیں تو ہم کہاں رہے

اس شعر کی شرح اور تفسیر کے لئے ورق درکار ہیں —

زندگی کی حقیقت ۱ خدا سے لو لگانے والے زندگی کو اپنے لئے گناہ جانتے ہیں —

آہ ہم روسیاہ جیتے رہے　　اور چندے گناہ کرنے کو

ایسے لوگ دولت اور دنیاوی جاہ و ثروت کو بالکل بے حقیقت سمجھتے ہیں —

یہ دولت مند ہیں پابند انواع گرفتاری

چھٹیں ہرگز نہ قیدوں سے کہ لاکھوں دام رکھتے ہیں

انسان دنیا میں جو کرتا ہے وہ اس کا صحیح مقصد نہیں بلکہ اس سے بہت بلند —

تھا جو منظور سو نہ دیکھا یہاں　　ہم اثر کیا سمجھ کے آئے تھے

عشق | صوفیوں کا عشق دنیا والوں کے عشق سے بالکل جداگانہ ہے - اس کی حقیقت صرف ایک شعر میں سنئیے —

باوجودیکہ وہاں نہ ہجر نہ وصل　　کوئی مہجور کوئی واصل ہے

اس کی شرح صرف وہ لوگ کرسکتے ہیں جنہیں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے - لیکن صوفیوں کے مذہب میں اس سعادت کو حاصل کرنے والے کی جو کیفیت ہوجاتی ہے وہ اثر کی زبانی سنئیے -

صاحب دید کی زباں ہے لال　　شمع کو قیل و قال مشکل ہے

(ع) آنان کہ خبر شد خبرش باز نیامد - جو اس راز سے آگاہ ہوگئے ان کا راز معلوم کرنا اور زیادہ دشوار ہے —

خودی کا پردہ | اس عشق کی ابتدائی منزلوں میں قدم رکھنے کے لئے انسان کو سب سے پہلا سبق یہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی حقیقت کو کچھہ نہ سمجھے - خدا اور بندہ کے درمیان اگر کوئی چیز حائل ہے تو یہی ہستی یا خودی —

کچھہ محیط و حباب میں نہیں سد　　اپنی ہستی کا پردہ حائل ہے

صوفیوں کے مذہب میں شرک بڑا گناہ ہے - وہ صرف ایک ذات کے ماننے والے ہیں - حتیٰ کہ خودی بھی شرک ہے - اور یہ خودی اس وقت تک قائم ہے جب تک زندگی ہے —

مشکل ہے تاکہ ہستی ہے جاوے خودی کا شرک
تار نفس نہیں ہے یہ زنار ساتھ ہے

اور ایک عاشق صادق اپنی خودی کو مٹا دینا اپنی معراج جانتا ہے -

درد کا صدقہ اثر ہم بھی بھلا حق کے حضور
شمع ساں اشک ندامت سے خودی دھو کر چلے

زندگی اور اس کا فلسفہ و وبال

تصوف کی دنیا میں رہ کر زندگی کو جس نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا ہے وہ عام یا دنیاوی نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے - تصوف سے الگ ہٹ کر اثر نے زندگی کو جس نظر سے دیکھا ہے اس میں حسرت و یاس کا جذبہ طاری ہے —

اثر کا فلسفۂ زندگی سر تا سر قنوطی ہے - لیکن کہیں کہیں زندگی اور اس کے غموں کو کسی قدر فلسفیانہ یا شاعرانہ نظر سے دیکھا ہے - ایک جگہ زندگی کو کہتے ہیں —

یہی تار نفس کی آمد و شد جامۂ تن کا تانا بانا ہے

خصوصاً اس جگہہ حد کر دی ہے جہاں غم کی ایک فلسفیانہ وجہ بتائی ہے -

اپے اثر تقلب حالات قلب کو فہم غلط سے گردش ایام سمجھئے

یہ کہنے کے بعد زندگی کو سر تا سر غم کہنا کس قدر حیرت میں ڈالتا ہے - خصوصاً اس صورت میں جب کہ اثر کے کلام میں جگہہ جگہہ رجائی جذبات بھی ملتے ہیں —

یوں آگ میں سے بھاگ نکلنا نظر پڑا　　اپنے تئیں تو وضع نہ بھائی شرار کی

مرنے کے آے دن اثر اب آنکھہ کھولئے　　غفلت کے ھاتھوں بس بہت آرام کر چکے

ھنستے ھی مثل زخم رھئے　　گو سینہ چاک ھو رھا ھے

ایک رباعی میں کہتے ھیں —

اے ہم نفساں عبث نہ فریاد کرو　　گلگشت چمن کدھر ھے مت یاد کرو

اپنے دل کی خوشی تو ھونی معلوم　　بارے خوشی خاطر صیاد کرو

یہ سب کچھہ کہنے کے بعد وہ زندگی کو بے حد تلخ جانتے ھیں - اُن کا خیال ھے کہ زندگی میں غموں کے سوا اور کچھہ نہیں —

شمع ساں جلتے بلتے کاتی عمر　　جب تلک سر رھا وبال رھا

صرف غم ہم نہیں نوجوانی کی　　واہ کیا خوب زندگانی کی

کیا کہوں کس طرح سے جیتا ھوں　　غم کو کھاتا ھوں آنسو پیتا ھوں

زندگی کا دوسرا تلخ تجربہ انہیں یہ ھے کہ یہاں دوستی کا نام نہیں -

دشمنی بھی ھے جس کے آگے گرد　　یہاں وہ کہنے کو آشنائی ھے

تیسری مصیبت ھماری آرزوئیں ھیں - جب اِن آرزؤں کی انتہا ھو جاتی ھے تو آرزومند بے آرزو ھونے کی تمنا کرنے لگتے ھیں —

دل اپنا کچھہ اثر نہ چاھے　　بس ایک یہی تو آرزو کی

حقائق دنیوی

اثر نے جہاں اپنے شعروں کے ہر شعبہ میں حقیقت طرازی کی ھے وھاں اکثر ان کے کلام میں ایسی حقائق دنیوی بھی بیان کی گئی ھیں جن سے روز دنیا کو واسطہ پڑتا ھے اور جنہیں دنیا والے ھیچ جانتے ھوے بھی زبان سے نہیں کہہ سکتے —

دنیا کی رونق اپنے دم سے ھے - اگر ہم خوش ھیں تو ہمیں ہر چیز اچھی لگے گی اور اگر ھمارا دل غمگین ھے تو ہمیں اچھی باتیں بھی زہر

لکھیں گی۔ اس نفسیاتی حقیقت کو اثر نے یوں بیان کیا ہے —

وابستہ سب یہ اپنے ہی دم سے ہے کائنات

گو ہو جہاں یہ آپ نہیں تو جہاں نہیں

ایک دم سے لگی ہے کیا کیا کچھہ جان ہے تو جہان اپنا ہے۔

انسان اپنی حقیقت خود جتنی بہتر جانتا ہے کوئی نہیں جانتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس کا اعتراف نہ کرے —

خوب اپنے تئیں سمجھتا ہے هر کوئی قدردان اپنا ہے

ایک دوسری تلخ حقیقت۔ ایک عالم پڑا ہے گردش میں

گردش روزگار کے هاتھوں

مسلسل غزل

اُردو میں مسلسل غزلوں کا شروع سے رواج نہیں رہا۔ موجودہ دور کو چھوڑکر اگر مسلسل غزلیں تلاش کی جائیں تو شاید سارے دیوانوں میں مشکل سے ۱۰ - ۱۵ مسلسل غزلیں ملیں گی۔ اثر کے دیوان میں ایک نہایت اچھی مسلسل غزل ہے —

آشنا جو مزے کا هوتا ہے اپنے حق میں وہ کانٹے بوتا ہے

شیخ جی ایک روز مجھکو اثر لگے کہنے عبث تو روتا ہے

ان بتوں کے لئے خدا نہ کرے دین‌ودل یوں کوئی بھی کھوتا ہے

نہ تجھے دن کو چین ہے اک آن ایک دم رات کو نہ سوتا ہے

میں کہا خوب سن کے اے ناداں جا نصیحت کو کیوں ڈبوتا ہے

تو ہے ملاں تیری بلا جانے

عاشقی میں جو کچھہ کہ هوتا ہے

مسلسل غزلیں اُردو میں جو ہیں اُن میں بھی اتنا لطف

مشکل سے ملے گا —

تخلص سے فائدہ

اُردو شاعروں میں مومن نے اپنے تخلص سے بے حد فائدہ اُٹھایا ہے اور جہاں جہاں وہ نام کی طرح نہیں استعمال ہوا اُس نے عجیب لطف دکھایا ہے - اب ذرا اثر کے تخلص کی شان دیکھئے کہ مومن سے پہلے انہوں نے اس رنگ میں کیا گلکاریاں کی ہیں —

رہتا ہوں بہر حال سبھی وقت میں میں شاد
ہے گا یہ اثر خاص ترے درد و الم کا

تجھکو اگر اثر نہیں کہنے کا ہم کو کیا　　عاشق ہوے سے اپنے ہی جی کا ضرر کیا

درد و اثر

اثر کے کلام کی بڑی خوبی درد و اثر ہے - اُن کے جتنے شعر اب تک مثالوں میں پیش کئے گئے ہیں اُن میں سے بہت کم ایسے ہوں گے جن میں درد و اثر نہ ہو - اس لیے اُن کے کلام کی اس خصوصیت کا ذکر تحصیل حاصل سے زاید نہیں . البتہ چند شعر بلا کسی تنقید کے درج کئے دیتا ہوں —

اشک خونیں کے یہ نہیں قطرے　　بہ رہے ہیں شرار آنکھوں میں
کس لئے وہاں چلے اثر مگر اور　　حال اپنا تباہ کرنے کو
ہم سے شکستہ بال اسیروں کے روبرو　　ناحق خبر نہ لاکے سناو بہار کی

دل نکلے پڑے ہے یہ ادھر اور اودھر آنسو
بے چارہ اثر کیا کرے کس کس کو سنبھالے

دل جو یوں بے قرار اپنا ہے　　اس میں کیا اختیار اپنا ہے
اپنے جانے کی مت سنا ہم کو　　جی ہی جاتا ہے ترے جانے سے

نہ ملو یا ملو فرض ہر طرح تم کو آسان مجھکو مشکل ہے

جور جو چاھئے سو کیجئے پر میری حالت پہ بھی نظر کیجئے

زبان | اثر کے کلام کا اتنا نمونہ دینے کے بعد اُن کی زبان کے متعلق کچھ کہنا بے حد دلچسپ ہے اس لیے دو ایک باتیں کہہ کر اس فرض کو بھی پورا کرتا ہوں —

(۱) اثر کی زبان اپنے ہم عصروں کے مقابلہ میں بے حد صاف ہے - چند لفظوں کے علاوہ باقی زبان بالکل ویسی ہی ہے جیسی آج کل ہماری —

(۲) الفاظ کی نشست و ترتیب بھی بے حد سلیقہ کی اور تنقید سے پاک ہے —

(۳) متروک لفظوں میں کسو - کبھو ' جہت - نپٹ - تئیں - تک اور اس قسم کے دو چار لفظوں کے سوا اور کچھ نہیں استعمال کیا -

(۴) املے میں مجھکو کے بجاے مجکو - یہاں کے بجاے ہاں یا یاں کے بجاے یہاں - اُدھر ' ادھر کے بجاے کہیں کہیں اُودھر اور ایدھر لکھا ہے —

(۵) کہیں کہیں علامت فاعلی میں ' نے ' ترک کردیا ہے —

(۶) اُس نے کے بجاے اُن نے استعمال کیا ہے اور اُس کا املا ' انہیں ' رکھا ہے —

یہ اور ایسی قسم کی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں اس دور کے شاعروں کی زبان میں عام طور پر موجود ہیں - لیکن ان باتوں کے باوجود بھی زبان کی شستگی ' سلاست ' روانی اور پاکیزگی میں اپنا جواب نہیں رکھتی - سادگی اُن کے کلام ' زبان اور طرز بیان کی

خصوصیت خاص ھے —

مجموعی حیثیت سے کلام کے متعلق یہ کہا جاسکتا ھے کہ اُن کی فطرت شاعرانہ تھی ' ھر چیز اور خیال کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا - لیکن ھر چیز میں حقیقت کا خیال رکھا - مبالغہ اگر کہیں ھے تو وہ شاعرانہ حقیقت کی حدود میں آجاتا ھے - کلام میں ابتذال کا نام نہیں - ھر بات کے بیان میں درد و اثر اتنا ھے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرتا ھے کہ جو کچھہ کہا گیا ھے یہ یہ میرے دل کی بات ھے - یہی سب چیزیں ھیں جو ایک شاعر کی شہرت کو بقاے دوام کا خلعت عطا کرتی ھیں - اثر بھی اُردو کے زندہ رھنے والے شاعروں میں سے ھیں —

شیخ ملا نصرتی ملک الشعراے بیجاپور

(۴)

[از ایڈیٹر]

قصائد و غزلیات اور کلام پر عام راے

نصرتی کی تینوں مثنویوں کا ذکر کسی قدر تفصیل سے ہو چکا ہے - لیکن علاوہ مثنوی کے قصیدہ گوئی میں بھی اس کا پایہ بہت بلند ہے - اور اس صنف میں قدیم اردو کا کوئی شاعر اسے نہیں پہنچتا - شوکت لفظی علوِ مضامین اور زور بیان جو قصیدے کی خاص صفات ہیں وہ نصرتی کے قصائد میں بخوبی پائی جاتی ہیں - اگرچہ نصرتی درباری شاعر تھا لیکن اس کی قصیدہ گوئی صرف بادشاہوں کی مدح و ثنا تک محدود نہیں رہی بلکہ اس نے جنگ کے واقعات اور مظاہر قدرت کے بیان میں بھی بڑے پر زور قصائد لکھے ہیں —

اُس کے بیشتر قصائد علی نامہ کے ضمن میں آگئے ہیں جہاں وہ کبھی جشن کی تقریب میں، کبھی فتح کی مبارکباد پر اور کبھی مظاہر قدرت کے بیاں میں موقع موقع سے قصیدے لکھے گیا ہے - لیکن ان کے علاوہ بھی اس کے بعض قصیدے پاے جاتے ہیں - چنانچہ اس کا ایک طولانی قصیدہ جس میں تخمیناً (۱۳۶) اشعار ہیں معراج نبوی کے بیان میں ہے - اسے نصرتی کے "چرخیات" میں شریک کیا گیا ہے - قدیم دکنی میں قصیدے کی ایک قسم " چرخیات " سے موسوم کی گئی ہے یہ وہ قصائد

هیں جن کی تشبیہ فلکیات سے متعلق ہوتی ہے چنانچہ اس قسم کے قصائد سلطان قلی قطب شاہ، علی عادل شاہ ثانی اور دوسرے شاعروں نے بھی لکھے هیں - نصرتی نے بھی یہ قصیدہ اسی قسم کی تمہید سے شروع کیا ہے اور معراج کی مناسبت سے سورج کے غروب ہونے اور چاند کے نکلنے اور رات کی کیفیت کو طرح طرح کی تشبیہوں اور استعاروں کے ساتھ بیان کیا ہے - ابتدائی شعر یہ ہیں —

تخت پہ جب دن پتی* سہج پہ ٹھتا کون† | نس‡ کا سپہدار تب گرم کری انجمن
صبح کا فراش چک شمع سے روشن کرے | ریگ سے تاریاں کی نت مانج گگن§ کا لگن

روز و شب کا مقابلہ اور چاند سورج کا دعوا طرح طرح سے بیان کرتا ہے اور پھر یوں گریز کی ہے —

نور سوں نس کیا عجب روز کو روشن کرے | نس کے چندر کوں جتا کیس کی دکھلا کرن
بلکہ جو سرجا خدا نور نبی سے دو جگ | تب سوں جمالی جہاں پہن جلالی پوتن
نور خدا عین وہ مظہر دیں رین وہ | ہے شہ کونین وہ خلق کے جیو کا جیون
سرور پیغمبراں مفتخر نام آوراں | مالک پورب پچھم والئی اتر دچھن
طبع کی مجھہ شہپر خوش ہوئی پرواز کوں | دھر کے بلند بام کے پانچویں کہن پر کون

اس کے بعد معراج کا ذکر ہے اور خاتمہ پر بادشاہ (محمد عادل شاہ) کی مدح کرتا ہے - جس کے چند شعر یہ ہیں —

حمد ہے منعم کرا خلق پہ اس دور کے | ہے جو سمئی¶ رسول خسرو ملک دکن
صاحب دین و دول مالک ملک و ملل | عالم علم و عمل عامل نص و سنن
معدن جود و سخا منبع لطف و عطا | حامئی دین باوفا ماحئی کفر کہن

---

* دن کا سردار یعنی سورج - † جانا، رخصت ہونا - ‡ رات -
§ آسمان - ¶ رسول خدا کا هم نام یعنی محمد عادل شاہ -

صاحب فضل و هنر صف شکن بحر و بر | ملجۂ * فتح و ظفر هادی شمشیر زن
سچ هے نکیچ رچہ رهیا تب سوں سلاسیت کا | دیکھہ جسے دنگ اتھے دیو دسا سر کرن
شو † هوا دنیا کرا شوق سوں بھایا بنی | عدل شجاعت کرا باندھکے سہرا کنگن
گرچہ کسی مرد کوں هاتھہ ندی تھی ولے | شہ نے رنگھوک کہا لاکے پرت ‡ کی لگن
بھول کے پل پل کوں بل جاے تو کچھ شک نہیں | شہ سا ندیکھی بنا عمر منیں بیچ سہن
شہ سا سولچھن § نول ¶ کوں هے جگ میں کھو | یاد سوں جس اسم کی جاے کدورت محن
راج سوں شہ کے سدا حق تے دعا امن پا | جیوسوں منگے هت پسار دور کے سب مرد و زن
لطف سوں دهریا الاه شاہ کی شاهی تلک | جگ میں جلک پرا چھے عیش پرت کے پتن
جام سوں عشرت کے جم بزم بو معمور هو | چرخ میں دن رین کے گرم هے جوں انجمن
شہ کی ثنا "نصرتی" نغز نول یوں لکھے | دور کے دفتر اوپر سرا چھے هر یک بچن

یہ ابتدائی زمانہ کا قصیدہ هے - علی نامہ میں جو قصیدے اُس نے لکھے هیں وہ بہت پر زور اور شاندار هیں - قصائد میں عام طور پر اور خاص کر رزمیہ قصیدوں میں بلندئی خیال اور علوِ مضمون کے علاوہ بہت کچھہ دارو مدار الفاظ کی شان و شوکت پر هوتا هے - نصرتی نے هر موقع پر الفاظ کے انتخاب اور برمحل استعمال میں کمال دکھایا هے جس سے واقعات کے بیان میں بڑی قوت پیدا هوگئی هے - اور یہی وجہ هے کہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں اس کی زبان زیادہ مشکل هوگئی هے - اس کے قصائد میں مبالغہ بھی هے (اور قصیدوں میں مبالغہ هوتا هی هے) لیکن بے لطف نہیں - تشبیہات و استعارات بھی اُس نے خوب لکھے هیں اور ان میں جدت دکھائی هے —

---

* ملجا - † شوهر - ‡ محبت - § نیک چلن - ¶ نیا —

علی نامے میں کل چھ قصیدے ہیں اور یہ سب بڑے بڑے ہیں - جن میں سے ایک ۲۲۰ شعر کا اور ایک ۱۵۸ شعر کا، ایک ۱۵۰ شعر کا اور ایک ۲۱۸ کا ہے - سب سے پہلا قصیدہ قلعۂ پنالا کی فتح پر لکھا ہے جس کا خلاصہ اور چند شعر نمونے کے میں پہلے لکھہ چکا ہوں - دوسرا قصیدہ بادشاہ کی فتح اور جوہر صلابت خاں کی شکست کے متعلق ہے - اس کا مطلع یہ ہے —

علی عادل شہ غازی یو شاہ بوالمظفر کوں
دیا ہے جس خدا ایسا کہ تھا جیسا سکندر کوں

اس میں جوہر کی نمک حرامی اور بادشاہ کی شجاعت، بادشاہ کے ہاتھی، گھوڑے اور تلوار کی تعریف، جنگ کے معرکہ اور کشت و خون کا ذکر شاعرانہ رنگ میں کیا ہے —

اس فتح کے بعد بادشاہ جب دارالحکومت بیجاپور کی طرف مراجعت کرتا ہے اور فتح کی خوشی میں جو جشن کیا گیا ہے اس پر ایک بڑا قصیدہ لکھا ہے - جس کا مطلع یہ ہے —

اے شہ توں ہم نام علی شاہاں پہ تجہ سروری
دلدل فلک کا رام تجہ کرتا زمانہ قنبری

چونکہ یہ زمانہ سردی کا تھا، تو اسی قصیدے کے ضمن میں ایک دوسرا قصیدہ فصل زمستاں کی تعریف میں مختلف قافیہ و ردیف اور بحر میں لکھا ہے، جس کا مطلع یہ ہے —

دی ہے زمستاں نوگزی ڈونگا اوچا دھند کار آج
سردار ہو باد خزاں تھلتا کا رچیا ہے بہار آج

پانچواں قصیدہ مجلس عاشورہ کی تعریف میں ہے - اس کا مطلع یہ ہے —

کہتا ہوں اول حمد میں عالم کے سر جنہار کا
افلاک کا اونچا چھجا باندیا ہے کس بستار کا

اس میں مجلس کے انعقاد اور شہادت کا کسی قدر ذکر ہے - مطلع ثانی اور اس کے بعد کے چند شعر میں بادشاہ کی تعریف کر کے والدۂ بادشاہ حاجی بڑے صاحبہ کی مدح اور حسینی محل کی تعریف بڑی شان سے لکھی ہے - یہی وہ محل ہے جہاں مجلس عاشورہ ہوتی تھی - اور اس تعلق سے مجلس کی ترتیب، مرثیہ خوانی اور ماتم کا ذکر کیا ہے - نو دن رات تو یہ مجلسیں ہوتی رہیں، دسویں شب کو بادشاہ کے حکم سے شہر میں علم نکالے گئے —

نو دیس ہور نو رات ادک رونق تو یوں چڑتا کہے
دسویں رین میں قتل کی جیوں وقت آیا مار کا
فرمائے شہ تا شہر گشت اپے شدیاں کا کاڑنے
دھو لیو اندھارا نورسوں ظلمات کے رخسار کا

اس شہرگشت کا حال بڑی خوبی سے اور کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھا ہے - چھٹا قصیدہ جو فتح ملنار پر ہے بہت طولانی ہے اور پر شکوہ ہے، اس کا مطلع یہ ہے —

ہوا ہے کون عالم کے شہاں میں شہ ترے بل کا
سچا تو نانو کاری ہے وصئی شاہ مرسل کا

یہ بڑے شان کا قصیدہ ہے اور یہاں رزم و بزم کے بیان میں نصرتی نے بڑا کمال دکھایا ہے - اُسے خود بھی اس قصیدے پر ناز ہے —

سنو یک فتح کا شہ کے قصیدہ بے بدل یاراں
کہ ہر یک مختصر مضمون دھرے معنی مطول کا

ان کے علاوہ اس کا ایک هجویه قصیدہ بھی ھے - غرض اس طرح ایک قصیدہ معراج کے حال میں ' ایک مجلس عاشورہ کے ذکر میں' ایک هجو میں اور باقی پانچ جنگ یا جنگ کی مبارک باد کے متعلق هیں —

ان میں صرف معراج کا قصیدہ ایسا ھے جس میں نصرتی نے عام رواج کے مطابق تشبیب لکھی ھے - مجلس عاشورہ کے قصیدے میں حمد و نعت اور منقبت کے بعد شہادت کا کسی قدر ذکر ھے - باقی مبارک باد کے قصیدے بادشاہ کی مدح سے شروع هوتے هیں - مبارکبادی کے قصیدوں میں مدح کے علاوہ اس نے زیادہ تر یا تو جنگ کا ذکر کیا ھے یا جشن وغیرہ کی کیفیت دکھائی ھے - البتہ مجلس عاشورہ کے ذکر میں دوسری چیزوں کے ساتھہ علموں کے نکلنے ' مرثیہ خوانی ' الاوا * وغیرہ کا حال بھی درج کیا ھے - مثلاً مجلس مرثیہ خوانی کی نسبت لکھتا ھے ۔

جب شہ آپیں اِس بزم کوں ترتیب دے مجلس کریں ... هوے فیض خاص و عام پر یک دھات ادکہ ایثار کا
شکر پھوٹا نیاں کے طبق گویا گگن تارے بھرے ... چلد رسے کاسیاں بھرسھیے شربت گیتی پرکھار کا
یوں مرثیہ خواں مست کرزاری میں هردل کوستیں ... حیرت سوں نار ھے کس منیں احوال کچھہ هشیار کا
دائم جو پورے تھے مذھب جو تخم غم کا دل منیں ... انجواں کی خوشیاں سوں هوا حاصل و لک انبار کا

اسی کے ساتھہ الاوے کا ذکر کرتا ھے ۔

تھا عاشقاں کے دل نمن هر یک علاوہ سوز میں ... جیوں آہ مہجوراں اوٹھے هر هر شرارہ نار کا
ماتم میں جلتے دل کوں جلم پھرنہیں علاوہ تس گھڑی ... تھا لال ماتی تے بی کم کھاند لات تیز انگار کا
تس چار دیواری میں بھرلگتے کھلے کھن جب دیوے ... تب هوے ستاریاں کا گگن شر مندہ هر دیوار کا

اب علموں کا ذکر سنیے :—

نو دیس اور نو رات ادک رونق تیوں چڑتا کیے ... دسویں دن میں قتل کی جیوں وقت آیا مار کا

---

* عاشور خانے کے سامنے ایک گڑھا هوتا ھے جس میں محرم کے زمانے میں آگ جلاتے هیں

فرمائے شہ تا شہر گشت اپنے شدیاں کا کاڑنے دھولیہو اندھار انورسوں ظلمات کے رخسار کا
شہ کے نکلتے کر شدے سب شہر میں ہلبل ہوا ہر صحن میں یک ہور ہیا عالم بہتر ہور بہار کا
بس لا جو دیویاں کے رتن کوندن اوجالے کا کیا ہو جوت لک لکنے لگیا وسنہ صفا بازار کا
جملے میں رونق جا بجا جیوں شاہ کے نکلے شدے چوندھرا رتھیا یک ہاک ہو دل پایک و پروار کا

علموں کی آرائش کا بیان اس طرح کرتا ہے -

ہر ہر شدے کے تن اوپر تھی کسوت ایسی نور کی	سورج کوں جس کے سامنے طاقت نہ تھا چکلا چار کا
سہرے ثوابت سے سہیں ہور کہکشاں سے نو سری	عقد ثریا تے ادگ ہر یک ایلاقہ * ہار کا
دود ہر فرشتے رہتی پنکھے کر اپنے پر پدیریں	حوراں کے چک کے ہت چنور تھا طرۂ طرار کا
مجمر کے مہکاراں تے ہوے دن کا گریباں مشکبو	دامن رین کا عطر سوں ناقہ ہوا تا تار کا
جہاں وہم دوڑے وہاں تلک یوں حسن کی داشن ہوئی	نہیں بیس سکتی تھی نظر کر سعی لگ بیمار کا
تارے تو اکثر دیس کوں افلاک پر دستے ہیں کم	پن بیوئیں ستاریاں سوں بھرے دیکھا جگت اتبار کا
کیں خوب پتلیاں سوں دسیں مہیندیاں پریاں کی شہرسیاں	بد شکل ویتاں سوں کہیں دامن دسے کہسار کا
تصویر کی مہینداں پلا یوں وانر دسیں سیتا سوں جیوں	کہتا ہے کچھلا لنکا میں جا ہنونت رام اوتار کا
کیں گرڑ پنکھیاں کے بچے سیمرغ کے اندڑے کہیں	کیں تات ہور شرزا چیل کیں اژدھائے غار کا
کیں چین کے نقشے نول دیکھلائیں بندر ابن نری	کیں رست جو بھالیاں کی خرش بسرائے دل دوار کا

اس بیان سے ظاہر ہے کہ آپس کے میل جول سے ہندؤں کی رسمیں کس قدر اسلامی معاشرت اور تیوہاروں میں اثر کر گئی تھیں گویا محرم میں دسہرے کا رنگ نظر آتا ہے —

اب میں نصرتی کے قصیدوں میں سے کچھ کچھ اقتباس دیتا ہوں جس سے اس کی قوت بیان اور تخیل کی پرواز کا اندازہ ہوگا - بادشاہ نے

---

* ایلاقہ دراصل علاقہ ہے - ہار کے بیچ بیچ میں جو پھولوں کا گچھا ہوتا ہے اُسے علاقہ کہتے ہیں -

جب سیدی جوہر کی سرکشی کا خاتمہ کر کے بلدۂ بیجاپور کی طرف مراجعت کی ہے تو اس خوشی اور مبارک باد میں نصرتی نے ایک قصیدہ لکھا ہے ' اس کے بیان کا زور ذیل کے اشعار میں ملاحظہ ہو - سیدی جوہر نے بغاوت کی ہے اور فوج لے کر مقابلہ کو نکلا ہے - بادشاہ اس کی سرکوبی کے لیے بذات خود حملہ کرتے ہیں - بادشاہ کی شمشیر زنی کی کیفیت یوں بیان کی ہے —

برسیا کھڑک کے ابرتے یوں تس پہ پانی قہر کا
خشکی پہ سارے بحر اوبل چوندھر چلے لہو کی تری

(بادشاہ کی تلوار کے ابر سے قہر کا پانی ایسا برسا کہ سارے دریا طغیانی سے اُبل پڑے اور چاروں طرف لہو کا سیلاب موجیں مار رہا تھا) —

دریا رکت تے جوش کھا لنکا کوں کیتے غرق جب
موجاں تے پایہ سیت کا ڈھل ڈوبے رامیسری

جب خون کے دریا نے جوش کھا کر لنکا کو غرق کیا تو موجوں کے زور سے پل کا پایہ بیٹھہ گیا اور رامیشورم ڈوب گیا) -

کھایا شکست یوں پست ہو اس کل مکھی نے فوج سوں
تاریاں سوں جیوں نس ہوے ہوا دیگ آفتاب خاوری

(اس روسیاہ نے ذلیل ہوکر اس طرح شکست کھائی جیسے آفتاب عالم تاب کو دیکھتے ہے رات کے تارے ہوا ہو جاتے ہیں)

نہاٹا وطن میں گرچہ یوں بیگانہ اوس تے جگ ہوا
تس جیو بی تن مت جاے بن دیکھیا نہ اپنی بھتری

(اگرچہ وہ وطن کو بھاگ گیا لیکن زمانہ اس سے ایسا بیگانہ ہوگیا کہ

بغیر جان دیے اُسے اپنی بہتری کی کوی صورت نظر نہ آئی)-

جب شہ کھڑک کے آب سوں جھوں آگ فتنے کی بوجا
دارالخلافت کی طرف چلنے کیا عزم آوری
یوں اوچٹے یکبارگی با جیا دمامہ کوچ کا
جگ کی خوشی کی ہانک تے گوش فلک کو کرکری

(جب بادشاہ کی تلوار کی آگ سے فتنے کی آگ بجھہ گئی اور دارالخلافہ کی طرف مراجعت کا عزم فرمایا تو یکبارگی کوچ کے نقاروں کے بجنے اور اہل زمانہ کی خوشی کے نعروں سے فلک کے کان بہرے ہو گئے)

جوں موج شہ کا فوج تس جل تھل اوپرتے یوں چلیا
دریا کی جھوں اوپرال تے چلتا ہے باد صرصری

(بادشاہ کی فوج خشکی اور تری پر موج کی طرح اس طرح چلی جیسے دریا کے اوپر سے باد صرصر گزر جاتی ہے)

ویسے میں آکر تہلکہ نے ایسا دکھائی زلزلہ
پیدا ہوی جس دھاک تے تن میں سورج کے تھرتھری

(ایسے میں تہلکہ نے ایک زلزلہ برپا کردیا جس کے ڈر سے سورج کے بدن میں تھرتھری پیدا ہوگئی)

اس کے بعد وہ اُسی قصیدے میں " فصل زمستان " کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھہ جاتا ہے —

نصرتی کی رزمیہ نگاری کی کیفیت علی نامے کے ذکر میں آچکی ہے ۔ اُس مثنوی میں اُس نے اپنی قوت بیان ، بلندیء تخیل ، معلومات زمانہ اور قدرت زبان سے یہ ثابت کردیا ہے کہ رزمیہ نگاری میں کوئی اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا - اب میں اس کی شاعری کے دوسرے پہلوؤں

پر نظر ڈالنا چاهتا هوں —

قدرتی مناظر وغیرہ

نصرتی نے اپنی مثنویوں میں جگہ جگہ قدرتی مناظر کا بیان کیا ہے اور هر مقام پر اس کا اسلوب نیا ہے - اکثر وہ ان مناظر کو موقع اور محل کی مناسبت سے اس طور پر بیان کرتا ہے کہ وہ واقعہ کا جزو معلوم هونے لگتے هیں - اگرچہ بعض مناظر کے اشعار مثنویوں کے بیان کے دوران میں اس سے قبل آچکے هیں، تاهم یہاں چند مناظر سے کچھہ کچھہ اشعار نقل کیے جاتے هیں جن سے شاعر کی قوت مشاهدہ اور تخیل کا اندازہ هو سکے گا —

چاندنی کا سماں کیا خوب بیان کیا ہے —

چندر جب گگن کے کہستاں تے　　چاند جب آسماں کے کوهستان سے
حشم لے کے نکلیا بڑی شاں تے　　بڑی شان کے ساتھہ اپنا حشم لے کر نکلا
گیا کر سورج کوہ مغرب میں جان　　سورج جب کوہ مغرب کی طرف جانے لگا تو
لگی مارنے نس شہاباں کے بان　　رات شہابوں کے تیر مارنے لگی
دهواں جوت انگے دب نرالا هوا　　دهواں چاند کی روشنی کے آگے غائب هوگیا
اندهارے پہ غالب اجالا هوا　　اور اندهیرے پر اجالا غالب آگیا
پڑیا چاند کے مکہ تے پرتو جو صاف　　جب چاند کے چہرے کا عکس پڑا تو
هوی آرسی سب زمیں بیخلاف　　ساری زمین فی الواقع آئینہ بن گئی
لگیا لکلکانے زمیں کا طبق　　طبقۂ زمین جگمگانے لگا اور یہ معلوم
مڑے هیں اکهند جیوں روپہرے ورق　　هوتا تھا کہ روے زمین پر روپہلے ورق منڈهے هیں
سورج دیکھہ مغرب میں چاند نے کی چھانوں　　سورج نے مغرب میں چاندنی کا یہ سماں دیکھا
منگیا دیکھنے پھر پچھیں ست کے پانوں　　تو اس نے اپنے قدم پیچھے هٹاکر پھر اسے دیکھنا چاها

کمال دکھایا ہے - کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے اور یہ اتفاق نادر ہوتا ہے کہ ایک طرف سورج غروب ہو رہا ہے اور دوسری طرف چاند طلوع کر رہا ہے اور کچھہ دیر کے لئے دونوں ایک ساتھہ نظر آتے ہیں - مغرب میں سورج نے جو یہ سماں دیکھا تو اس سے رہا نہ گیا اور چلتے چلتے اس نے پلٹ کر پھر اسے دیکھا تھا - یہاں قدرتی منظر کے مشاہدے میں شاعر نے جو تخیل کی چاشنی دی ہے وہ نہایت پر لطف ہے —

ایک جگہ اس نے بہار کا سماں باندھا ہے - اگرچہ وہ سعدی کے بہاریہ قصیدے کے سامنے کچھہ حقیقت نہیں رکھتا تاہم اس نے استعارے اور تشبیہ سے جس طرح کام لیا ہے وہ کچھہ کم قابل تعریف نہیں —

سورج آ جو بیت الشرف کے ملنجھار	سورج نے بیت الشرف میں جلوہ افروز ہو کر
دیا بھوئیں کوں جب خلعت نو بہار	زمین کو خلعت نو بہار عطا فرمایا
کیا حسن پیدا زمانہ نوا	زمانہ نے ایک نیا حسن پیدا کیا
دھری نوجواں ہو کے خوبی ہوا	اور ہوا نوجوان ہو کر اپنی خوبی دکھانے لگی
دیا آبرو پھولبن کوں ابھال	ابر نے چمنستان کو آبرو بخشی
گلاں سرخ رو ہو رہے بالے بال	اور پھول سر تا پا سرخ رو ہوے
لئے چھین گل گلعذاراں تے رنگ	پھولوں نے گلعذاروں سے رنگ چھین لیا
لے آیاں کلیاں دلکوں خوباں کے تنگ	اور کلیاں خوبوں کے تنگ دل لے آئی تھیں
بچے سرو کے قد میں سیدھے ہوے	سرو کے بچے قد میں سیدھے ہوے
گلاں چاند کے نور دیدے ہوے	اور پھول چاند کے نور دیدے
ہنسے پھول ہو شوق کی گد گلی	شوخ کی گدگدی سے پھول ہنسے پڑتے تھے
رہی ناز میں مسکتاتی کلی	اور کلیاں ناز سے مسکرا رہی تھیں

چلی جھونکہ بڈتی چنبیلی کی بیل	چنبیلی کی بیل بڑھتی چلی اور دل لگی
گلے ہار ہو لائی چنڈیے سوں کھیل	میں چنڈیے کے گلے کا ہار ہوکر لپٹ گئی
جوانی میں سبزے نے آتا چلیا	سبزہ جوانی پر آرہا تھا اور
مدن بان ریحان پاتا چلیا	مدن بان میں خوشبو پیدا ہو رہی تھی
ہر یک گل کے دیدے میں داتیا مدن	ہر پھول کی آنکھ میں مستی بھری ہوی تھی اور
ہر یک شاخ کوں پھل کے نکلے جوبن	ہر شاخ میں پھل کا جوبن نکل آیا تھا
ہوا زلف سنبل تے جل بے شکیب	پانی زلف سنبل سے بے قرار تھا
لٹک سرو بارے کوں دیتا فریب	اور سرو اپنے ناز سے ہوا کو فریفتہ کر رہا تھا
بھولا نے انکھیاں مار بلبل کا من	اشاروں سے بلبل کا من موہنے کے لیے
لیا چک میں لالے نے کالا انجن	لالے نے اپنی آنکھوں میں کالا کاجل لگایا
پلکھی ہر ہر یک گل پہ شیدا دسیا	ہر پرندہ ایک ایک پھول پر شیدا معلوم ہوتا تھا
ہر یک دل میں یک حال پیدا دسیا	اور ہر دل میں ایک عجیب کیفیت پیدا ہو رہی تھی

فتح ملنار کے قصیدے میں باغ کی کیفیت جو اس نے بیان کی ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے - حوض کی نسبت کہتا ہے —

تیا کچھہ حوض ڈونگا ہے فلک جاں تھر نے سکنے

یعنے حوض اس قدر گہرا ہے کہ جس میں افلاک تھر سکتے ہیں —

جب اُس صاف شفاف پانی پر ہوا چلتی ہے تو موجوں کی جو حالت ہوتی ہے اُس کی تشبیہ ملاحظہ کیجیے —

چاہیں باد صباتے خوش صفا پانی پہ موجاں یوں

کہ جیوں محبوب کے مکھہ پر ڈھلک زلف مسلسل کا

اس کے بعد شاعرانہ مبالغہ ہے —

فلک سقائے خضری ہو پلاوے نیر سو جگ کوں
سورج کے جام سوں بھرتا ہے نت واں مشک بادل کا

(فلک سقائے خضر ہوکر ساری دنیا کو پانی پلاتا ہے اور وہاں بادل کی مشک ہمیشہ سورج کے پیالے سے بھرتا ہے) —

باغ کے سامنے حوض کی صفائی اور پاکیزگی کی تشبیہ دیکھئے —

دس آوے باغ کے آنگے صفائی حوض کی ایسی
سنواری دھن رکھے ہے یوں انگے آئینہ صیقل کا

باغ کے سامنے مصفا حوض ایسا ہے جیسے بنی سنوری معشوق کے سامنے صقیل کیا ہوا آئنہ —

ذیل کے شعر میں زمین کی سیرابی اور اس سے درخت اگنے کی شان کو کس خوبی سے بتایا ہے —

اوپر پاتال لگ بھوئیں تے بھریا ہے گنج پانی سوں
تلیں ہر رکھ اوتھیا ہے یوں سدنگ فوارہ جیوں کل کا

اوپر زمین سے پاتال تک پانی کا خزانہ بھرا ہوا ہے اور نیچے سے ہر درخت اس طرح نکلا ہے جیسے کل کا خوبصورت فوارہ۔

اس مبالغہ کو دیکھیے —

سرایت آب شیریں کر بھنایا بھوئیں کوں یوں وس میں
بڈے پر نیشکر ہوے لگے کر روپ دیونل کا

آب شیریں نے زمین کو رس سے اس طرح سینچا ہے کہ نرسل بڑہ کر نشکر کا روپ اور مزہ پیدا کرتا ہے۔

ہر یک پھل ڈال پھولاں سوں گواوے چھب کی نولاسی
جتی پر شاخ میوے کی اُسے دعویٰ سدا پھل کا

ہر پھولوں بھری شاخ کے سامنے حسن کی نزاکت اور نرمی ہیچ ہے
اور جو جو میوے سے لدی شاخ ہے اسے سدا پھلنے پھولنے کا دعویٰ ہے -

پڑے منڈویاں ملیں تے یوں صبا کی دھوپ سبزے پر
ہری اطلس اوپر گویا لکھے ہیں نقش زرحل کا

پھولوں کے منڈیوں میں سے صبح کے وقت کی دھوپ سبزے پر اس طرح پڑتی ہے جیسے ہری اطلس پر حل کیے ہوے سونے کے نقش ہوں -

صبا تختیاں کے صفحیاں پر لکھی سو لوح پھولاں تے
لیا ہر کالوا جاکا کنارا نیت جدول کا

صبا نے چمن کے تختوں کے صفحوں پر پھولوں سے تحریر کی ہے اور اس کی ہر نہر بمنزلہ جدول کے ہے —

خمیاں ڈالیاں تے دستے یو کنول پانی سوں چشمیاں میں
روپے کی آرتی کے جیوں چمک پر اوٹ آنچل کا

یعنے جھکی ہوئی ڈالیوں کی وجہ سے پانی کے چشموں میں کنول کی یہ صورت ہے جیسے چاندی کی آرتی کے روشن دیوں پر آنچل کی اوٹ ہو —
کیا خوب تشبیہ ہے اور کیا پاکیزہ بیان —

کسی پھل ڈال پر کوئی گل دسے نا بے جواب اکثر
پکڑتی ہے نظارے میں نظر احوال احول کا

کسی ڈالی پر کوئی پھول ایسا نہیں ہے کہ اس کا جواب نہ ہو (یعنے ایک پھول کے جواب میں دوسرا ویسا ہی پھول تھا) جس کے دیکھنے میں نظر احول کی نظر معلوم ہوتی تھی (جو ایک کے دو دیکھتی ہے) —
ایک دوسرے قصیدے میں باغ کی کیفیت ان اشعار میں بیان کی ہے اور کیسی سچی اور اچھی تعریف کی ہے -

ہرگز لگا کس یک پھول پر سورج کی لگ سکتی نظر
ہے چھتر ایسا سر بسر ہر برگ سایہ دار کا
چُھٹتے ہیں کالے نیر کے ییوں کالوے گلشن منے
جیوں کیس بکھرے جا دسے رخ مدمتے دلدار کا
خوشبو سوں پھولاں کے چمن پای تھی بوں پرورد گی
ہر لوے کا آب ہوے پُھل نیر ادک مہکار کا

کسی ایک پھول پر بھی سورج کی نظر نہیں پڑ سکتی کیونکہ اس پر برگ سایہ دار کی چھتری لگی ہوی ہے گلشن میں کالے پانی کی نہریں بہتی ہوی ایسی ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں جیسے مست دلدار کے رخ پر بکھرے ہوے بال- پھولوں کی خوشبو سے چمن نے ایسی پرورش پائی تھی کہ ہر نہر کا پانی پھولوں کا عرق بن گیا تھا جس سے سارا چمن مہک رہا تھا -

بدنور کے جنگل اور چشمے کا بیان بھی خوب لکھا ہے اس مقام کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں -

کہیں رُکھہ دار چینی کے دھریں سو پوست میں لذت
رکھے سو مغز میں خوشبو کہیں تو بن ہے صندل کا
کھٹے رُکھہ جام و جامن ہور پھنس ہور توت تھندو کے
بھلا واں کئیں ہے کئیں ہورا ہے کئیں ماپھل و میندل کا
رنگا رنگ کے گلاں خوشبو معطر جگ کر نہارے
دس آوے راے چنپا جہاں کمیاہ پھول پاڑل کا
صفا پانی کے چشمیاں میں سُہے یوں چھانوں پر سیاہی
سواد انکھیاں کوں جوں دیوے درس چشم مکحل کا

(یعنے صاف شفاف چشموں میں کالی کالی چھانو ایسی بھلی معلوم ہوتی تھی جیسے سرمگیں آنکھہ کو دیکھہ کر آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں)

دسیں یک یک کراڑے میں گویاں* کئی لاکھہ باگاں کی
ہر یک ڈونگر† کے دامن میں وطن کئی گرگ واسول‡ کا

اور اس کے آگے کیا خوب مصرع لکھا ہے

* شہر کے رہنے کی جگہ - † پہاڑی یا چٹان - ‡ ریچھ

رہن ہور دیس اس جاگہ پہ ہو ہمدرس بیٹھے ہیں

پہلے وہاں جنگل اس قدر گھنا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دن اور رات اس جگہ ہمدرس ہو کر بیٹھے ہیں پہلے جیسے ہمدرس یا ہم جماعت طالب علم بے تکلف ہوتے ہیں اسی طرح وہاں رات اور دن دونوں بڑی بے تکلفی سے ایک جگہ بیٹھے تھے - ایک دوسرے مقام پر اسی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے -

اندھارا ملیا یوں دسے نور سوں
کہ دن جنت ہے شام دیجور سوں

مبارک باد کے اس قصیدے کے ضمن میں موسم کے لحاظ سے جاڑے کی شدت کے متعلق بھی ایک قصیدہ لکھا ہے - اس قصیدے میں اصلیت کم ہے اور شاعرانہ تخیل کا رنگ زیادہ ہے - چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں -

اوپٹیا ہوا فوج یوں شبنم کیاں گولیاں چھانکتا
ڈرسوں اگن موں چھانپ لے دب رہی ہے تھارے تھار آچ

(ہوا کی فوج شبنم کے گولے اڑاتی ہوی نکلی ہے ' اس کے ڈر سے آگ ہر جگہ مُنہ چھپاے دبی پڑی ہے)

وو اگ کہ کوی مارے تو دم اٹھتی تے ہو سب تن زباں
ویسی بی سرکش سر نوا پیلی دسے سدھار آچ

(وہ آگ جو ذرا بھی کوئی دم مارتا تو سراسر بھڑک اٹھتی تھی آج ایسی سرکش ہستی بھی سر جھکاے اور زرد رو نظر آتی ہے)

شاعرانہ رنگ میں کیا خوب شعر کہا ہے

بیشک وطن اس جگ تے سٹ جاتی اگن ہو بے نشاں
گر دل میں اچھے عاشقاں دیتے نہ اس کو تھار آچ

(اس میں شبہ نہیں کہ اگر عاشق اسے اپنے دل میں جگہ نہ دیتے تو آگ کبھی کی اس دنیا میں بے نام و نشاں ہو جاتی)

حوض ایک ہوا یوں دسے مشرق تے مغرب لگ بھریا

کانپے فلک جیوں بز بوزا بیٹھی تو تس کی لہر آج

(ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشرق سے مغرب تک ہوا کا ایک حوض بھرا ہوا ہے - فلک اس بلبلے کی طرح کانپ رہا تھا جس کی موج نیچے بیٹھ رہی ہو)

شبنم جو اُجلا چھاچ سا آشیر سے جل میں پڑیا

ہر باٴیں ہوی ہے دہیں ٹھنڈی جم نیر سب یکبار آج

(شبنم جو چھاچھ سی سفید ہے دودہ جیسے پانی میں پڑی ہے جس سے ہر باولی کا پانی جم کر ٹھنڈا دہی ہوگیا ہے)

جل تھیج ہر ایک چہ بچہ بلور کی درپن دسے

اے چاند بیگی دیکھ لے تس بیچ اپس دیدار آج

(پانی کے جم جانے سے ہر ایک چوبچہ بلور کا آئینہ ہوگیا ہے - اے چاند جلدی سے تو اپنا دیدار اس آئینے میں دیکھ لے)

ہر رُکھ کوں بارا مارتے پیلے ہوے ہیں پات سب

ہر یک نگر کے باغ جہاں ہے ٹھنڈ سوں بیمار آج

(ٹھنڈی ہوا چلنے سے ہر درخت کے پتے زرد ہوگئے ہیں اور ٹھنڈ کی وجہ سے ہر نگر کے باغ بیمار سے نظر آتے ہیں)

نا سر فرازی پاسکے دولت تے ٹھنڈ کی کونپلی

نا بیل اپنی گود تے للبا کرے ہت بہار آج

(ٹھنڈ کی بدولت کونپلیں ٹھٹر کر رہ گئی ہیں اور بیل اپنی گود

سے اپنا ہاتھہ باہر نہیں نکال سکتی)

گلشن کے آئینہ اوپر پڑتا چلیا سردی سوں زنگ

ہر خار و خس شبنم سیتی ہوتا ہے جوہر دار آج

(گلشن کے آئینے پر تو سردی سے زنگ چڑھتا چلا جاتا ہے لیکن ہر خار و خس شبنم کی بدولت جوہر دار بن گیا ہے) —

لئی ٹھنڈ سوسیا گرچہ میں نہیں سور کی پروا دھریا

کیوں سیکنے بس آئیگا اِتیاں کو یک انگار آج

(اگر چہ میں نے بہت ٹھنڈ کھای تو بھی سورج کی پروا نہ کی کیونکہ ایک آگ اتنے لوگوں کو کیونکر کافی ہوگی) —

اس کے آگے ٹھنڈ کھانے کی وجہ سے حسن طلب کا بڑا اچھا موقع مل گیا ہے —

ایک مقام پر گرمی کی شدت کا حال لکھتے ہوے کہتا ہے -

نہ کہہ سور بل اگ کا بادل اتھا — اُسے سورج نہ کہو وہ آگ کا بادل تھا

نہ وو دھوپ یک آتشیں جل اتھا — وہ دھوپ نہ تھی بلکہ آگ بھرا پانی تھا

مگر کھیلیچ دوزخ کے دریا تے نیر — شاید دوزخ کے دریا سے کھولتا ہوا پانی

برستا اتھا جگ پہ جلتاچ تھیر — کھچ آیا تھا جو مسلسل اس دنیا پر برس رہا تھا

برستی تھی یوں دھوپ جگ پر کڑک — سارے جہاں پر دھوپ یوں کڑک کر برس رہی تھی

سوکوہ و زمیں رہے تھے چھاتی تڑک — کہ پہاڑوں اور زمین کی چھاتی تڑقی جاتی تھی

ایک جگہ چشمہ کے پانی کی صفائی کے متعلق لکھتا ہے -

اچھے اچھے پلے تے ات صفای آب کی ایسی

دس آوے تل لگے پر جا سٹھیں گردانہ چاول کا

(پانی اپنی خوبی کی وجہ سے ایسا صاف شفاف تھا کہ اگر اس

چشمے میں چاول کا دانہ پھینکیں تو تہ میں پہنچنے کے بعد بھی صاف دکھای دیتا تھا) —

بیان واقعہ یا کسی حالت کا سماں

رزمیہ واقعات کے بیان میں نصرتی کو خاص کمال حاصل ہے' وہ فوجوں کی آمد اور جنگ کے زورشور اور ہنگامہ خیزی کو اس خوبی سے بیان کرتا ہے کہ آنکھوں کے سامنے نقشہ کھچ جاتا ہے - مولانا شبلی مرحوم کو اردو زبان میں میرانیس سے قبل کوی نمونہ رزمیہ نظم کا نہیں ملا - میر ضمیر نے رزمیہ کی اِبتدا کی تھی لیکن وہ بالکل نقش اولیں تھا - مولانا کو اگر نصرتی کا کلام دیکھنے کا اتفاق ہوتا تو اعتراف کرنا پڑتا کہ میرانیس سے قبل بھی ایک ایسا باکمال شاعر گزرا ہے جس نے مسلسل رزمیہ نظمیں لکھی ہیں اور جو معرکہ آرای نیز دیگر واقعات کے بیان پر پوری قدرت رکھتا ہے - علی نامہ کے ضمن میں اس کے رزمیہ بیانات نقل ہوچکے ہیں' یہاں صرف یاد تازہ کرنے کے لیے کچھہ کچھہ اشعار نمونے کے طور پر لکھے جاتے ہیں —

مثلاً تلوار کے چلنے اور گھمسان لڑائی ہونے کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے —

کھنا کھن تے کھڑکاں کے یوں شور اتھیا

جوں تن میں پہاڑاں کے لرزا چھوٹیا

(تلواروں کی کھنا کھن سے اس قدر شور برپا ہوا کہ پہاڑوں کے جسم میں لرزہ پیدا ہوگیا) —

بلا نیند میں تھی سو ہشیار ہوئی

اجل خواب غفلت سے بیدار ہوئی

(بلا جو پڑی سو رہی تھی اس شور و غل سے اُٹھ بیٹھی اور اجل خواب غفلت سے جاگ اٹھی) --

سلاحاں میں کھڑ کاں جو دھسنے لگے
اگن ہور رکت مل برسنے لگے

(تلواریں جو ہتھیاروں میں دھسنے لگیں تو آگ اور خون کی ملواں بارش ہونے لگی ' یعنی تلواروں کی ضرب جو ہتھیاروں پر پڑتی تھی اس سے چنگیاریاں نکلتی تھیں اور جو وار آدمیوں پر پڑتا تھا اس سے خون کی ندی بہنے لگتی تھی اور یہی خون اور آگ کی ملواں بارش تھی) -

ہو یاں لہو کیاں چھٹکاں ہوا پر بخار
سٹیں تیغ جیباں تے شعلے ہزار

(لہو کے چھینٹے ہوا پر پہنچ کر بخار بن گئے اور تلواروں کی زبانوں سے ہزاروں شعلے نکلنے لگے) —

پھریا نس کا کھڑ کاں کے چنگیاں تے روپ
ہوا نرم چندنا سو سب گرم دھوپ

(تلواروں کی پے در پے چنگاریوں سے رات کا روپ کچھ اور ہی ہوگیا اور نرم نرم چاندنی گرم دھوپ ہوگئی) —

ہوا دھکدھکی یک انگارا ہو لال
سگل اوٹ پانی کیا جل ابھال

(ہوا دھک اٹھی اور لال انگارا ہوگئی جس کی حدت سے پانی اوٹ کر بادل کی صورت میں نمودار ہوا) -

ہوا پر شراریاں کا اٹ کھیل تھا
اوڑے لہو سو بس آگ پر تیل تھا

(ہوا پر شراروں کا تماشا نظر آتا تھا اور لہو جو اڑ رہا تھا وہ گویا آگ پر تیل کا کام دے رہا تھا) —

فرنگاں پہ لہو کے کھلالے دسیں
انیاں پرتے دھاراں پنالے دسیں

(تلواروں پر لہو کے فوارے جاری تھے اور انیوں پر سے خوں کی دھاریں پر نالوں کی طرح بہ رہی تھیں) -

پوں کو سرنگ رنگ پیدا ہوا
شفق ابر پر سب ہویدا ہوا

(ہوا کا رنگ سرخ ہوگیا تھا اور بادل پر تمام شفق چھائی ہوئی تھی) -

(ایک دوسری جگہ لڑای کے وقت میدان جنگ کا نقشہ یوں کھینچتا ہے —

ہوا پل میں پیدا کری بے مثال
اگن کا گگن اور دھوئیں کا ابھال

(ہوا نے پل بھر میں آگ کا آسماں اور دھوئیں کا عجیب و غریب بادل پیدا کردیا) -

غنیماں کے بھیجاں کوں کھانے شتاب
خوش آنے لگیا موں میں کھڑکاں کے آب

دشمنوں کے بھیجے کھانے کے لیے تلواروں کے منھہ میں پانی بھر بھر آتا تھا) -

کماناں رکھیا دل کشاکش منیں
اوبلنے لگے تیر ترکش منیں

(کمانوں نے دلوں کو کش مکش میں ڈال رکھا تھا اور تیر ترکش

مھں سے اُبلے پڑتے تھے) -

پھوکیا تہر یوں سخت بھالیا کا انگ

کہ پھکتا ہے جیوں باو لے کر بھو جلگ

(سخت بھالوں کا جسم یوں پھک رہا تھا جیسے اژدھا ہوا کھاکر پھنکارے بھرتا ہے) -

بھڑکنے ترنگاں ہو آگاں دسے

سواراں بھوکے ان کے باگاں دسے

(بھڑکتے ہوے گھوڑے آگ بگولا ہو رہے تھے اور بھوکے سوار شیر معلوم ہوتے تھے) -

نشانی ہے جوں مینھلوں لانے کوں باو

دیویں یوں مہراتے لڑای کوں تاو

(جس طرح ہوا بارش لانے کی نشانی ہوتی ہے ، مرہٹے اسی طرح لڑای کو گرما رہے تھے) -

نکلتے ہیں جیوں باگ نخچیر کوں

نکل یوں مہراتے دونو دھیر سوں

(جس طرح شیر شکار پر لپکتا ہے اس طرح دونوں طرف سے مرہٹے لڑنے کو نکلے) -

ایک دوسرے مقام پر لڑای میں تلوار کے چلنے اور اس کی خونریزی کا ذکر اس طرح کرتا ہے —

جھوما جھوم دو دھرتے آکر لگی | دونوں طرف سے دھڑا دھڑ تلوار برسنے لگی

اگن خوب شمشیر کی تھک تھکی | اور تلوار کی آگ خوب دھکنے لگی

یکس یک پہ جھباں جو پڑنے لگیا | ایک ایک پر اس کی ضرب پڑنے لگی

رکت بلد کیا ں چلکیا نچہ جھڑ نے لگیاں
رکت ان میں بہنے لگیا یوں سرنگ
پڑے بھوئیں پہ جیوں آگ جلتی کا رنگ
ہر یک لر چلی لہو کی بھر پور یوں
بھری مانگ میں بھوئیں کی سیندور جوں
دس آنے لگی ہو زمیں سرخ رو
ہوا لال رن بن جتا مو بمو
پہاڑاں و پربت سرنگ یوں دس آے
کہ جوں مخملی جھول ہاتیاں پہ بہاے

اور خون کی بوندیں سے چلکا رہاں جھڑنے لگیں
میدان جنگ میں بہتا ہوا خون یوں معلوم ہوتا تھا
جیسے زمین پر جلتی ہوی آگ کا رنگ -
خون کی ہر موج ایسی بھر پور تھی گویا
زمین کی مانگ میں سیندور بھرا ہوا تھا
سطح زمین سرخ نظر آتی تھی اور جتنا
رن اور بن تھا وہ سب لال ہو گیا -
پہاڑ اور پہاڑیاں ایسی سرخ نظر آتی تھیں
جیسے ہاتھیوں پر سرخ مخمل کی جھول

بعض اوقات نصرتی کسی حالت کا سماں صرف ایک شعر میں اس طرح کھینچ دیتا ھے کہ آنکھوں کے سامنے اس کا نقشہ کھچ جاتا ھے - مثلاً نواب بہلول خاں کی فوج کا مقابلہ شیواجی کے لشکر سے ھے - شیواجی کا لشکر کثیر ھے اور نواب کی فوج قلیل - دونوں لڑنے مرنے پر تلے ھوے ھیں نہ اُن کے پانو اکھڑتے ھیں نہ یہ جگہد سے ھلتے ھیں - اس کیفیت کو اس نے ان دو مصرعوں میں کس خوبی سے بیان کردیا ھے -

دندی بہوت اچھہ وو توڈتے نہ تھے
عجب یو کہ تھوڑے ھو ھلتے نہ تھے

یعنی دشمن (مرھٹے) تو تعداد میں بہت تھے اس لئے ڈٹے کھڑے تھے اور ٹلنے کا نام نہ لیتے تھے لیکن تعجب ان (بیجا پوریوں) سے ھے کہ باوجود تھوڑے ھونے کے اِنھوں نے اپنی جگہہ سے ذرا جنبش نہ کی.

دیکھنے کی بات یہ ھے کہ اس تمام مطلب کو چند لفظوں سے کس خوبصورتی سے ادا کیا ھے -

دھلی کی فوج کا سپہ سالار چے سنگھہ جب ہر طرف سے گھر جاتا ہے اور سخت پریشان ہوتا ہے تو اس پریشانی اور تردد کی صورت کیا خوب کھینچی ہے -

جم اُس سیس زانو میں مہماں ہوا
نظر کا تھکانا گریباں ہوا

یعنے اس کا سر زانو کا مہمان تھا اور اس کی نظر کا تھکانا گریبان تھا - اس سے بڑھ کر تردد اور فکرمندی کی صحیح تصویر ہو نہیں سکتی - بلاغت اور فصاحت دونوں ختم ہیں -

ایک جگہ آتش بازی کے بیان میں ہوائیوں کے چھوٹنے کو کس خوبی سے ادا کیا ہے -

بلدیاں جب ہوایاں نے بجلیاں تے ہوڑ
سٹیاں جب ثریا کے جھوکیاں کوں توڑ
ہوایاں اتھیاں آگ کیاں ناگنیاں
ہوا پر سو جاکر سنہولے جلیاں

یعنے ہوائیوں نے بجلیوں سے شرط باندھ رکھی تھی اور ثریا کے خوشے توڑ کے پھینک دیے تھے - یہ ہوائیاں نہ تھیں بلکہ ناگنیں تھیں جو ہوا میں جاکر سنہولے جلتی تھیں -

فراق یار میں انسان پر جو بے بسی اور بیقراری کی حالت طاری ہوتی ہے اور اس حالت میں اس سے جو جو حرکتیں صادر ہوتی ہیں اس کا بیان نصرتی نے گلشن عشق میں دو تین مقام پر کیا ہے اور بعض اشعار میں ایسی سچی اور پتے کی باتیں لکھہ گیا ہے کہ مثنوی میرحسن کا وہ مقام یاد آجاتا ہے جہاں شاعر نے بدر منیر کی اسی کیفیت کو

بیان کیا ہے - اگرچہ نصرتی کا بیان اس قدر صاف سادہ اور نیچرل نہیں جتنا میر حسن کا ہے لیکن دونوں کے اشعار سامنے رکھہ کر پڑھے جائیں تو نصرتی کے کلام کی ضرور داد دینی پڑے گی - یہ بھی خیال رہے کہ ان دونوں کے زمانے میں تخمیناً ڈیڑہ سو سال کا فرق ہے - اگرچہ اعادہ ہوتا ہے لیکن چند شعر یہاں نقل کرتے مناسب معلوم ہوتے ہیں -

کنور منوہر فراق کی حالت میں یوں گریہ وزاری کرتا ہے -

نہ کس سات کہنا مجھے بات بھاے | نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاھتا ہے
نہ کوئی بات بولے تو سن خوش لگ آے | اور نہ کسی کی بات سن کر جی خوش ہوتا ہے
نہ دیس تو نت اندز ھاری مجھے | دن رات سے بھی زیادہ تاریک نظر آتا ہے
رین کال دوزخ تے بھاری مجھے | اور رات کا وقت دوزخ سے بھی زیادہ بھاری معلوم ہوتا ہے
انکھیاں کھولتا ہوں تو یک تل نہ بھاے | آنکھیں کھولنا مجھے ایک لحظے کے لئے بھی نہیں
وگر مونچتا ہوں تو یو خوف آے | بھاتا اور اگر بند کرتا ہوں تو یہ ڈر ہے کہ
کہ مت پھر پڑے خواب دندی سوں سنگ | کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دشمن جاں پھر خواب
ستے پھر کے خرمن میں من کے انگ | میں آجاے اور پھر میرے دل کے خرمن میں آگ لگاے
پڑیا آہ ساھی نمن مجھہ رہنا | مجھے مچھلی کی طرح پڑا رہنا پڑتا ہے
گنوانا زباں ہور نہ چک مونچنا | زبان بند اور آنکھیں کھلی ہوئی

اسی طرح مدمالتی کے فراق کا بھی ذکر کرتا ہے ' اس بیان میں سے صرف چند شعر یہاں نقل کئے جاتے ہیں -

اوساساں نہ کچھہ مکھہ ستی بھاسکوں | نہ منہ سے آہ نکال سکتی ہوں
نہ چک تے انجو بھار بھی لا سکوں | اور نہ آنکھہ سے آنسو باہر لا سکتی ہوں
یکسک نت رہوں غم سوں کر سرتلار | تن تنہا ہوں اور غم سے سرنگوں
نہ کوئی بانٹ لیوے میرے دل کا بار | کوئی ایسا نہیں جو میرے غم کا بوجھہ بانٹ لے

زرا بن اگن تن پہ سارے لگیں — لباس اور گہنا مجھے بدن پر آگ سا معلوم ہوتا ہے

گلاں سیج کے مجھہ انگارے لگیں — اور سیج کے پھول انگارے معلوم ہوتے ہیں

تلے دن تو ہر کیوں سہیلیاں سنگات — دن تو جوں توں سہیلیوں کے ساتھہ کٹ جاتا ہے

پڑے بن بجر سل ہو سینے پہ رات — لیکن رات چھاتی پر پتھر کی سل ہوجاتی ہے

چندر مجھہ اوپر زہر کا ہو اياغ — چاند میرے لئے زہر کا پیالہ ہے

دیوے ہر ستارا میرے دل پہ داغ — اور ہر ستارہ میرے دل پر داغ دیتا ہے

ادک سوز لگ مجھہ تلپنا پڑے — سوز ہی دروں سے میں تڑپتی رہتی ہوں

اوسی گھات کے باج تپ نا پڑے — اور اُس دکھہ بغیر مجھے قرار بھی نہیں

اچھے نس تو دوزخ تے کالی کٹھن — رات دوزخ سے بھی زیادہ تاریک اور کٹھن ہے

دسے دن تو روز قیامت کا دن — اور دن قیامت کا دن ہے

میرے سر تلیں یوں کٹیں ماہ و سال — یہ کٹھن زمانہ جس طرح مجھہ پر گزرتا ہے

خدا بن کہوں کس سوں مجھہ دل کا حال — اُس کا حال میں خدا کے سوا کس سے کہوں

کہ ناچار اچھے روریا کے بدل — ناچار پاس خاطر کے لئے میں سہیلیوں میں

سو ہنس کھیل کنا سکیاں میں سگل — ہنس کھیل کے وقت گزار دیتی ہوں

لیکن شعر تو یہ کہا ہے -

جو دیکھوں نجھا تو دسے نین میں
جو بولوں بچن تو بسے بین میں

غور سے دیکھتی ہوں تو آنکھوں میں بسا ہوا نظر آتا ہے اور جو بات کرتی ہوں تو آواز میں رچا ہوا معلوم ہوتا ہے —

حسن بیان، تشبیہہ، استعارہ اور مبالغہ

نصرتی حقیقی شاعر ہے اس نے واقعہ کی تصویر کھینچنے اور خصوصاً نئی تشبیہوں کے پیدا کرنے میں بڑا کمال دکھایا ہے - اس کے کلام میں

حسن بیان کی خوبی بھی اکثر جگہہ نظر آتی ہے - اس قسم کے متعدد اشعار اس سے قبل آچکے ہیں تاہم بعض شعر وضاحت کی غرض سے یہاں نقل کیے جاتے ہیں —

دیکھئے سپاہیوں کی جرأت اور دلیری ان کے بشرے سے کس خوبی کے ساتھہ دکھائی ہے :

ہتیار ان کے اوسان سینہ سپر
زمیں پر قدم آسماں پر نظر

زور بیان ملاحظہ ہو -

چڑیا ہم سوں * جھگڑے کے لینے میں باؤ
ترنگاں † میں تیزی سواراں میں تاؤ

خوف کی حالت جو فوج پر طاری ہوی تو اس کی ایک کیفیت یہ بتائی ہے کہ ڈر کے مارے ان کے بدن اتنے خشک ہوگئے کہ جسم پر سے ہتیار گر پڑے —

سلح ڈھل پڑے ڈرسوں پتلے ہو آنگ

شایستہ خاں جب دن کی لڑائی اور کامیابی کے بعد شب کو اپنے محل میں جاتا اور ماہرویوں کی صحبت رنگ رلیاں منا تا ہے اور شیواجی دغابازی اور چوری سے اس پر آپڑتا ہے تو اس واقعہ کے بیان کو شب کے منظر سے شروع کرتا ہے اور اُس شب کا سماں حالت کی مناسبت سے کیا خوب بیان کرتا ہے —

سورج وہ کہ جس سامنے ہو زبوں چھپاتے ہیں چوراں بچالی میں مو

---

* دلیری † ہمت - † گھوڑے -

اوپر تخت وہ جب گیا گھر ملنجھار　　بیٹھا تب ہو حاکم چلدر اُس کی تھار
گیا عیش میں کر سہیلیاں سوں میل　　ہوا راج میں اُس کے چوراں کا کھیل

جنگ کی شدت اور شمشیر زنی کی گھما گھمی میں زمین اور آسمان پر بھی عجیب حالت طاری تھی —

زمیں ہور فلک ہو کے یک حال میں
لگے ناچنے تیغ کی تال میں

فوج کے کوچ سے جو گرد و غبار اُڑا ہے اس سے چاندنی اور چاند کی کیا صورت بنی ہے، اس حالت کے بیان میں حسن بیان اور تشبیہ دونوں قابل داد ہیں —

اوڑیا دل * کے دھم † تے دھولارا ہوا
صفا آب چندنا ہوا گدگوا ‡
سہے گرد یوں تن پہ چندر کے پاکھ
لگایا ہے جیوں مُکھ کوں جوگی نے راکھ

رات کی تعریف میں کیا پر لطف شعر کہا ہے

جو خوش مکھ پہ زلفاں پریشاں کرے
ہر یک شام بادل کو گریاں کرے

حالت فراق کے بیان میں کیا اچھا شعر کہا ہے، اسے میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور پھر لکھتا ہوں —

جو دیکھوں نجھا تو دسے نین میں
جو بولوں بچن تو بسے بین میں

---

* فوج -　　† دھوم -　　‡ گدلا -

نصرتی نے تشبیہات میں بڑی جدت کی ہے اور نادر تشبیہیں نکالی ہیں۔ مثال کے طور پر چند یہاں لکھی جاتی ہیں —

عجب کیا جو بل تجھہ کرامت سے پائیں
تو یک ہات میں دو کلنگڑے سمائیں

(یعنے کیا عجب تیری کرامت کی بدولت ایک ہاتھہ میں دو تربوز سما جائیں) —

چلیں باد صباتے خوش صفا پانی پہ موجاں یوں
کہ جیوں محبوب کے مکھہ پر ڈھلک زلف مسلسل کا

یعنے صاف شفاف پانی پر باد صبا کی وجہ سے اس طرح موجیں چل رہی تھیں جیسے محبوب کے چہرے پر زلف مسلسل کا ڈھلکنا۔ حوض کی تشبیہہ ملاحظہ ہو —

مگر نیم کا سہ فلک کا نکال
رکھیا تھا قضا بھر کے آب زلال

کھڑے پانی پر چاندنی کے پڑنے کی کیفیت کو یوں بیان کرتا ہے —

چند نا کھڑے پانی پہ پڑ بھتی یون یون لک لکے
جوں مہرہ پھرنے میں جلا دکھلاے کاغذ آر کا

یعنے جیسے کاغذ پر مہرہ پھرنے سے جلا پیدا ہو جاتی ہے اور وہ چمکنے لگتا ہے یہی حالت پانی کی چاندنی کے پڑنے سے تھی —

شیواجی کی فوج جب شکست کھا کر پسپا ہوتی ہے تو اُس کی زبانی اس حالت کو یوں بیان کیا ہے —

اُڑاے ہیں فوجاں کو مجھہ خس کے ناد
ابھالاں کے تکریاں کو جوں تند باد

مہری فوج کو خس و خاشاک کی طرح یوں اڑا دیا ہے جیسے تند ہوا بادلوں کے ٹکڑوں کو اُڑا دیتی ہے —

کچا توڑنا خار بہتر دسے
کہ چھوڑے تو ہو پختہ خنجر دسے

کانٹے کا کچا ہی توڑ دینا بہتر ہے' چھوڑ دیا گیا تو پختہ ہوکر خنجر ہی بن جاے گا —

مہراتے چپل ماودا ناں سوار
پریاں جھونکہ جناں کے راناں تلہار

مرہٹے تیز رفتار گھوڑیوں پر سوار ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا پریاں جنات کی رانوں تلے ہیں. کیا خوب تشبیہ ہے -
تلوار کی تیزی اور برش یوں بیان کرتا ہے —

کھڑگ دل میں گزرے خیالاں تے تیز

ایک دوسری جگہ اسی کو اس طرح لکھتا ہے -

ستیا جس پہ پر تو کھڑگ خان کا
گیا جل وجود اُس کے اوسان کا

یعنی جس پر خان کی تلوار کا پر تو بھی پڑگیا تو اس کے اوسان کا وجود جل کے خاک ہوگیا —

سُبھے گرد یوں تن پہ چندر کے پاکھہ
لگا یا ہے جیوں مکھہ کوں جوگی نے راکھہ

چاند پر گرد پڑنے سے وہ ایسا اچھا معلوم ہوتا تھا جیسے جوگی اپنے منہ پر راکھہ مل لینے سے —

دسے اشتراں تیر بیٹھے پہ ہور
کہ جیوں ناچنے پر پھولایا ہے مور

کیا اچھی تشبیہ ہے - یعنی اونٹوں پر اس قدر تیر پڑے تھے کہ وہ بیٹھے ہوے ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ناچتے وقت مور پر پھلائے ہوے -

ہوا رنڈ جن ٹک کھڑا پانوں گاڑ
دسے کھونٹ جیوں ڈال توڑے سو جھاڑ

یعنی جو میدان جنگ میں ذرا ثابت قدم ہو کے کھڑا رہا اس کا سر قلم ہوگیا - اس کی حالت اس درخت کی سی تھی جس کی ڈالیاں کاٹ لی جائیں اور رنڈ منڈ رہ جاے -

ہوا ہر طرف یوں چشم کو شکست
لگے پر دھکا جوں کہ چینٹیاں کی رست

یعنی فوج شکست کھا کر یوں تتر بتر ہوگئی جیسے چیونٹیوں کی قطار دھکا لگنے پر —

صف سے تیروں کے ایک ساتھ چلنے کی تشبیہ کیسی صاف اور نیچرل ہے —

اوڑے کھیت تے جیوں ہزاروں تلیر

جنھوں نے درخت پر سے یا کھیت میں سے تلیر اڑتے دیکھے ہیں وہ اس کی داد دیں گے -

ٹھنڈا ٹک ہوا یوں مدن مد کا تاؤ
کہ جیوں دود ابلتے پہ کرنے تھے باؤ

یعنی اس محبوب کا تاؤ یا جوش کسی قدر دھیما ہوا جیسے اُبلتے دودھ کا ابال ہوا دینے سے کم ہوجاتا ہے —

ہوے تن ہو بے سر رکت یوں رواں
ہنڈا جا پڑے شہد کا مرتباں

بے سرتنوں میں سے خون اس طرح جاری تھا جیسے شہد کا مرتبان
الٹ جاے تو اس سے شہد بہنے لگتا ہے۔

جنگ کے روز کیا کیفیت تھی

گگن پر ستارے ہوے حال میں
ھدرتا ہے سیماب جوں تھال میں

آسماں پر ستارے اس طرح ہل رہے تھے جیسے تھال میں پارہ ہلتا ہے۔

کماناں پڑیاں تٹ کے چلے انوپ
کہ جیوں دھامنیاں بھار لیتاں ہیں دھوپ

کمانیں چلوں سے الگ یوں ٹوٹی پڑی تھیں جیسے دھامنیں دھوپ
کھانے کے لیے باہر آپڑتی ہیں۔

وو زا ووز میں آگ کھڑکاں نے جھڑ
سپر چر موتی جیوں بھونے سو پہڑ

یعنی تلواروں سے پے در پے آگ جھڑ رہی تھی جس سے ڈھالوں کی یہ
حالت تھی جیسے بھنے پاپڑ —

سراں ہور انتڑیاں ہویاں چھل پھل
کہے توں کہ پسری کلنگڑیاں کی بیل

سر اور انتڑیاں یوں بکھرے پڑے تھے جیسے تربوز کی بیل پھیلی
پڑی ہو۔ کیا صاف تشبیہہ ہے —

کھڑے تھک ہو رجھوت برچھیاں سلگات
بتھاں موم کیاں جیوں فراشاں کے ہات

راجپوت برچھیاں لیے ہوئے اس طرح مبہوت کھڑے تھے جیسے فراشوں کے ہاتھ میں موم بتیاں —

دسیا مغز سر پھوٹ گرزاں تے یوں
رکھیں پھوڑ ناریل کھرے کوں جیوں

گرزوں کی مار سے سر پھوٹ پھوٹ کر مغز نکل آئے جیسے کوئی ناریل کا خول توڑ کر اس کی گری نکال لیتا ہے —

سراں پھوٹ جیوں خربوزے کے پڑے
دسیں ہو کلنگڑے ملنڈ اسے بڑے

سر پھوٹ پھوٹ کر خربوزوں کی طرح پڑے تھے اور سروں کے بڑے بڑے عمامے تربوز معلوم ہوتے تھے۔

یہ شعر بادشاہ کی تعریف میں ہے۔

جم اس ذات میں خلق و خوبی ہے یوں
اچھے پھول میں رنگ ہور باس جوں

یعنی اس کے اخلاق اور خوبیاں فطری ہیں جیسے پھول میں رنگ و بو۔

مبالغہ بھی شعر کے وصف میں داخل ہے' نصرتی نے اس صنعت میں بھی موقع موقع سے اپنا کمال دکھایا ہے۔ مثالیں دو چار یہاں لکھی جاتی ہیں —

پہاڑی رستہ کی دقتوں کے بیان میں کس دقت پسندی اور مبالغے سے کام لیا ہے۔

کوہل تھا کہستاں کے مکھ پہ گھات
معمے سے موہوم تھی جس پہ بات

کہ جس بات مشکل کا لینے میں نانوں
زباں کا پھسلتا ہے جم مُکھہ میں پانوں

یعنے رستہ بڑا تیڑھا تھا اور بتیا معنے سے بھی زیادہ موھوم تھی ' اُس مشکل رستے کا نام لیتے ھوے زبان کا پانوں مُنہ میں لڑکھڑاتا تھا -

گرمی کی حدت کو کس خوبصورتی سے ادا کیا ہے -

لگے جوش کہا سر میں پکنے دماغ
زرہ جل کے دینے لگی تن پہ داغ

گرمی سے دماغ سر میں پکنے لگے اور زرہ اس قدر گرم ھوگئی کہ بدن پر داغ دینے لگی -

گھوڑے کی چھل بل اور تیز رفتاری دیکھئے -

کیا شہ کا تازی تیز پر ہے نازکی بازی بھریا
سیکتی ہے جس طناز کن پرواز نس دن شہپری
خوش رنگ کس یک پھول کا ھرگز تفاوت نا کرے
گلشن اوپر چل جاے تو مانند باد صرصری

بادشاہ کا اسپ تازی کس قدر تیز رفتار اور طناز ہے کہ جس سے شہپری ناز و انداز سیکھتی ہے - اگر اس کا گزر گلشن میں ھو تو باد صرصر کی طرح گذر جاتا ہے اور کیا مجال کہ کسی پھول کا رنگ تک میلا ھو جاے -

ٹھنڈ کی تعریف میں کیا عجیب مبالغہ کیا ہے -

بیشک وطن اس جگ تے سٹ جاتی اگن ھو بے نشاں
گر دل میں اپے عاشقاں دیتے نہ اس کوں ٹھار آج

یعنے گرمی اس دنیا سے کبھی کی رخصت ھوجاتی اگر عاشق اُسے اپے دل میں جگہ نہ دیتے -

نصرتی نے تقریباً ہر صنف سخن میں کچھہ نہ کچھہ لکھا ہے - مثنویوں اور قصیدوں کا ذکر ہوچکا ہے ' اب دوسری اصناف کا ذکر کیا جاتا ہے -

غزل ہمیں فارسی سے ملی ہے اور یہ ابتدا سے اردو کے ساتھہ ہے اور ہوتے ہوتے اس نے وہ زور پکڑا کہ ایک مدت تک اردو شاعری غزل گوئی کی ہو کے رہ گئی - نصرتی نے بھی غزلیں کہی ہیں - یہاں میں اُس کی ایک مسلسل غزل نقل کرتا ہوں جو خاص لطف رکھتی ہے -

چندر بدن کہیا تو کہی موں * سنبال † بول
سورج مکھی کہیا تو کہی یوں نہ گھال ‡ بول
دونوں بھی تجھہ نکھوں تو سکے تجکوں کیا کہنا
کہی اس بہشت حسن کوں جم ¶ جگ اوجال § بول
بولیا نشاں ہے عشق کی راوت $ کا قد ترا
بولی کہ فوج فتنہ اوچانے ** کی ڈھال بول
بولیا رہے ملگے ترے سس †† پھول کن ‡‡ ہلال
بولی کہ با ولی میں ہے گی تجھہ سے نال ¶¶ بول
بولیا کہ تجہہ فراق تھے کے عاشقاں خراب
بولی مرے وصل ملے کیا تجہ ہے حال بول
بولیا کہ کعبہ دل ہے تو دل توڑنا حرام
بولی بتاں کے ہت §§ تھے توٹے تو حلال بول

---

* مُنہ - † سنبھال - ‡ پھینکنا ' ڈالنا - ¶ ہمیشہ' سدا - § جہاں افروز - $ رایت - ** بلند کرنا - †† زیور جو سر میں پہنا جاتا ہے - ‡‡ قریب' کنے - ¶¶ قریب - §§ ہاتھہ -

بولیا کہ لٹی * د نوں تھے تری بندگی میں ہوں
بولی کہ خیر پوچ کیتک ماہ و سال بول
بولیا کہ کیا ہے جلوۂ جاں بخش بیدلاں
بولی شکر لباں کے ادھر † کا اکال بول
تجھ مدمتی‡ کی چال کہیا میں کہ گج § کو سکھ
ھنس کر کہی کوے $ کوں نکو ھنس کی چال بول
بولیا کہ سروقد ترا لایا نظر میں دل
بولی کہ خوب اس کوں اچھوں¶ دیکھ بال†† بول
بولیا کہ دیکھنے میں تجھے طبع تازہ ہوئی
کہی نصرتی تو ویسے میں نارک خیال بول

ایک غزل نصرتی نے بعض شاعروں کی ہجو میں بھی لکھی ہے جس کے دو چار شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں -

نا وزن نا تلازم نا قافیہ ردیف ہے
مہمل بچن سراسر جانوں بھور جوڑا
نا علم میں دخل ہے نا باپ کوں (ہیں) بوجتے
جب بلہوس ہو تھرکیں جیوں شہد پر مکوڑا
تازی کی تیز بازی مشہور اس جگت میں
اس کی برابری کوں کیا خر کرے نگوڑا
اے نصرتی کلا کر اب چپ رھنا بھلا ہے
بادل کے گڑگڑے سوں طبل ہوا ہے بورا ‡‡

---

* بہت - † لب - ‡ مست - § ھاتھی - $ کوا - ¶ فی الحال -
†† دیکھ بھال - ‡‡ بہرا -

ایک غزل میں اور نقل کرتا ہوں، جس سے اس کے کلام کی روانی، فصاحت اور عاشقانہ انداز کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔

مغرور بے خبر ہے مد سوں مدن کی بالی
عالم کے جیو لینے لوچن * میں ہے سو لالی

اس خام سن میں دیکھو کیا پختگی کے فن ہیں
دینے کو وصل کاھل لینے کو جیو اتالی †

برھی کے نس میں غم سوں جلتا ہوں شمع نمنے
دکھلا صبا ‡ درس § کا اے خاور جمالی

مجہ من کرا کبوتر ہے تجھہ ہوا میں حیراں
پھر پھر نکو ازادے پلکاں کی مار تالی

مجھہ تجہ میں آ کھڑیا ہے احوال شہ گدا کا
کھتا کتھا یو سر تے اچھتا اگر ھلالی

سنتے سبب عجب کیا ہو تلخ طبع شیریں
نا بات سوں نہیں کم شکر لباں کی گالی

کڑوے بچن ھنسی میں یوں او چھپا لجاوے
کرتے ہیں مکھہ مٹھا جیوں دارو پلا کسالی

سو فن ترے نہو سیں مجہ یک ھنر برابر
جیو کھیلنا کھل ہے اے بلھوس خیالی

رندی کے فن ریا کی باتاں ہیں کیوں چھپے کیں
جو ہے سو عکس دل کا دستا ہے جگ میں خالی

---

* آنکھہ - † چالاک باز - ‡ صبح - § درشن -

سر مست نصرتی سوں چل سی نہ کچھہ حریفی

خوبوں کی بزم کا ہے او رند لا اُبالی

نصرتی نے رباعیاں بھی بہت سی کہی ہیں - دو ایک یہاں لکھی جاتی ہیں -

بد گوئی کے مجھہ حق میں بچن چل سیں نا

ڈونگر تو کدھیں بھونکی تے تل سیں نا

پھرتی ہے دوتن پیو کی چپ روتی دیکھہ

ہرگز تو تکے پانی سوں گھر جل سیں نا

ایضاً

دنیا کے سواداں ستی مکھہ موڑ ستو

سب اُس کے تعلق نے بھی دل توڑ ستو

پھوتوں کے ہے پاں تے (؟) یو فلک کا پرکار

شرکت کی * ھنڈی گھرا † پہ ابچا پھوڑ ستو

ایضاً

تجہ عشق کے دریا ملیں جن تہر گیا ہے

وہ گوھر مقصود گماں کر سو لیا ہے

گوشے میں نشست ہو کہ توں کر چلہ

تب نامی (؟) نشاں اس کو یو مطلب کو سیا ہے

--- * ———

علی عادل شاہ ثانی کی ایک غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے -

تج گال پر نکہ کا نشاں دستا ہے مجھہ اِس دھات کا

روشن شفق میں جگمگے جیوں چاند پہلی رات کا

* ھانڈی - † گھورا ، کوڑی —

نصرتی نے مخمس کی صورت میں اس غزل کی تضمین کی ہے اس کے چند بند لکھے جاتے ہیں -

دیکھیا سو رترے تجہ نین برقاں ستیاں اوسان سب
کرتیں بچن یوں گن بھرے طوطیاں نے بسرے گیان سب
کافور سے عارض تھے تجہ بھولاں دسے حیران سب
تج زلف مشکیں دیکھہ کر سانپاں تجے انیان سب
تج لب کری لالی انگھیں لالاں ستے سدہ گات کا

نظراں سوں کوندے جھوکے آ صحرا کوں یوں چوندھیر سوں
بس اس میں جب مشغول ہوے جیونکہ ہوس نخچیر سوں
کیا کام کیتے ناز کے دیکھہ سکت تدبیر سوں
ابرو کماناں کھینچ کر مارے پلک کے تیر سوں
زخمی ہوا دل کا ہرن لا گیا نشان تجہ ہات کا

کسوت مکلل جب بنا ہو آفتاب آتی ہے توں
دیکھے پہ جی بھولیا ہے سد سمجھے نہ دن ہو رات کوں
بولیا وہی خوشحال ہو سد میں آ دیکھیا سو موں
مکھڑا اس کی کا عید سا دستا اچنبک نور سوں
تس کیس پر زر کا انچل جھلکات ہے شبرات کا

عالم تھے بے پروا ہے او جس دل کوں توں پیاری لگے
خوبی ہے سب دنیا کی وہاں تجہ جیو کی جاں یاری لگے
تجہ لب کوں پیوے سو اسے امرت تھے بیزاری لگے
تیرے بچن شیریں انگھیں شکر دیکھو کھاری لگے
مکھہ میں اوچا کاری لیا ور کر ہیا نابات کا

مشکل پرت کا کھل ملد جب توں سبب سازی کرے
چکچک حریف اپنا علی عادل شہ غازی کرے
آخر عرابوں پر دمار اپنا سر افرازی کرے
بدبل پرت کا ماند کر شاهی سوں جب بازی کرے
لیتے بھولا من کا ترنگ رخ لیا رکھے شہ مات کا
اے نصرتی جب توں ملگے لکھنے مخمس بے بدل
تو قافیاں میں لیا بندھیا استاد عالم کی غزل
الحق بنایا توں پدک نکتہ تلمیں حوراں سے نول
زینت ہے دنیا میں رهنا سب عارفاں کے جیو کی کل
معنے سمجھائے قدر وہ جو هوے دهنی خوش بات کا

اس کے کلام کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ہم عصروں نے جیسا کہ قاعدہ ہے اس کے کلام پر نکتہ چینی کی ہے جس سے برافروختہ ہوکر وہ کہیں کہیں اپنی تصانیف میں ان نکتہ چینیوں کا جواب دیتا ہے - چنانچہ گلشن عشق کے آخری باب میں لکھتا ہے —

کریں بے سمجھہ یا جو حاسد اوداس   تو دونو بی معذور هیں میرے پاس
سرس شعر ادیکھے کوں کاں خوش لگاے   کہ الوان نعمت دوکھی کوں نہ بھاے

اسی طرح علی نامہ کے آخر میں کہتا ہے —

یکیک فن میں کئی سحر کے کر کے چھند   خبیثاں کی جیباں کوں کہتا هوں بند
ادیکھے جو یا جوج هوئیں لاکہ لاک   کہ هوں میں جہاں وهاں نسکیں وو تاک
حقیقت میں جو هوئیں کوتہ نظر   زباں پر رکھیں عیب ست سب هنر

یہ اشعار تو خیر معمولی هیں جو شاعر اکثر حاسدوں کے متعلق لکھہ جاتے هیں لیکن معلوم هوتا ہے کہ بعض مخالفوں نے اس کی زبان اور کلام

کے متعلق بہت کچھہ زباں درازی کی تھی جس پر چل کر اس نے ایک ہجویہ قصیدہ لکھا ہے جسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں - بعض شعر جو فحش ہیں خارج کردیے گئے ہیں —

سخن ور شعر کہنے تے رہنا چپ آج بہتر ہے
جماعت ہرزہ گویاں کی کہ ہر کونچے میں گھر گھر ہے
سخن ور کا سخن کچھہ ہور بچن کچھہ ہرزہ گویاں کے
مقولہ خام طفلاں کا نہ کہیں مرداں برابر ہے
ہنر یو آنہارا نہیں کہ ہیں مہمل کوں بن جہلتے
ہنر مندانچہ سوں دایم عداوت دل کی سر بر ہے
کہنوانا رکھہ سوں شاعر کچھہ ہے فن سوں شعر کہنا کچھہ
کرے راواں* حکایت کیا گویک پستک تس از بر ہے
ہمن سوں جول† رکھتے آہمن جوساچہ کوی اچھنا
نہ رکھہ سی باز کے بازو گر اشتر مرغ کوں پر ہے
جن اپنی خوب صورت پر ہنر میں ناز دیکھلاوے
اُنے تک موں پھرایا تو وو گوز خر تے کمتر ہے
کہنا نا نازنیں صورت زنانہ شعر یوں ہرگز
کہ مشکل ہوے خلقے کوں سمجنا مادہ یا نر ہے
مصفا ہور موزوں چپ کہنے تے شعر ہوتا نہیں
ہوا کیا چھاچھہ دود اجلا ولے لذت میں ابتر ہے
جو لذت دل نے سمجی سو کہنے نہیں بات موں آتی

---

* طوطا - † برابری -

بزرگی دل کی اس جاگہ زباں میں کاں میسر ہے

نہ آوے علم پڑنے تے فہی کوں کچھہ ہنر منْدی

سیکے کاں دوڑ تازی کی جو کم ذات اصل میں خر ہے

عروضاں پڑ کے کرنا کیا' اچھے تو طبع ناموزوں

کہ بیلکی * سطر لکھنے کن نکامی نیت مسطر ہے

طبیعت حق نے بخشی پن سخن کوں قدر نہیں ذرہ

ہوے بن آسمانی فیض کہیں پتھرا بھی جوہر ہے

منافق کی روش کچھہ کم نہیں سندھے کی بوری تھے

اُپر ہموار ہو بھتر'ال سب کاتیاں کہرا تہر ہے

مجھے دوموں کے لوکاں سوں بڑا ڈر بات کرنے کا

پچھیں تھے جے کہے سوا و جواب اسکوں نہ اکثر ہے

مثال ایک شعر میں اپے شہوری خوب بولیا ہے

کہ جس کی ات ہنرمندی مرے کن نت مقرر ہے

عجب کیا شعر ادیکھے کے کروں کہیں پر درست آخر

جو بسرے بات اسکندر تو گھوڑی اس کوں رہبر ہے

حسد کے درد منداں ڈہیں متھا نا مکھہ کوں لگسی ہو

لگے جیوں زہر امرت سا سخن کر روح پرور ہے

بھرا ہے خبث تھے سارا غباراں اُن کے بتیاں میں

چکل تک داب پکڑے تو ہزار یکدم میں ترتر ہے

دیکھاویں مولویت وہاں کہ جاں کوئی نہیں ہے مجلس میں

دُنیاں کا راج اُس جا کا جہاں خالی جو کوئی گھر ہے

---

* ٹیڑھی -

... ...

اگر خوش شعر پڑ کر بھی سمجھہ ہتکے تو کچھہ غم نہیں
کہ شعر اتنا چہ سمجے ان اپیں جتنا سخنور ہے

نظر میں کور طبعاں کے گلستاں عین خارستاں
ہنر باریک بیں آنکھیں ہر یک کانٹا بھی تونگر ہے

گلاں رنگیں نظر پر تھے رہے ہو داغ چھاتی میں
دسے تو خار یکھا دا وہی آنکھا نکا ان کی افسر ہے

جو صاحب طبع ہیں ان کوں بھی سب وقت اختیاری نہیں
کہ ہو الہام تب اتنا کہ جس بن جے مقدر ہے

کرم کر حق تعالیٰ یوں دیا اس فن کی دولت مجھہ
میری نوبت کے طبلاں سن دندی بد مغز نت کر ہے

میرا استاد عالم او مربی ہے کہ اس شہ کوں
پچھانے پھر کر اپنا کہ جس فن کا کبھشر ہے

علی عادل شہ غازی جو ہے صاحب خرد ایسا
کہ ہر مشکل ہنر جس کی غلامی کا چ منہر ہے

غزا کا فیض مجہ حق میں عطا ہو شہچہ سمجے پر
ہنر سب بخشنے کے تیں سبب وے بندہ پرور ہے

نوی میں طرز پیدا کر کہیا ہر بھانت شعر ایسا
سخن نو سکہ کا منزل کوں انہوں نے نت یو رہبر ہے

دکھن کے شاعراں کی میں روش پر شعر بولیا نہیں
ہوا کیا سب گزر گئے تو دیکھو حاضر وو دفتر ہے

خدا بخشی کوں طبعاں کے پرس * ہے مجہ سخن الحق
لگے یو جس پھتر دل کوں وہ پھر دیکھے تلک زر ہے

مرا شعر اھل کو ... ... مشقت خیر ھوے جانو
ولے کم ذات کے ھت میں سخن پڑنے تھے یوں ڈر ھے

طبیعت جس سخن تھے پا جو ھوے پھر عیب چھیں تس کا
ہوا جیوں باپ سوں منکر حرامی نسل اکثر ہے

بجز صاحب نظر ہرگز ھنر کی قدر کِن بوج
دیے تو ھات اندھلے کے برابر سنگ و جوہر ہے

قرینہ ھر سخنور کا ھنر منداں سمجتے ھیں
اچھے جاں موج زن دریا تو کس گنتی میں وھاں لر ہے

غزا کا تیغ ہے الحق اگرچہ مجہ سخن لیکن
سور جب اٹھہ اپیں دوڑے تو لازم وار اس پر ہے

زباں گرداں لے رھنا اپنا اے نصرتی بہتر
کہ کرنا ھجو لایق نہیں نہ حاسد تجہ پر ابتر ھے

الہی جب تلک لعنت اچھے ابلیس پر تب لگ
سیہ رو آچھو جگ میں کہ جے حاسد بد اختر ھے

اس ھجو یہ قصیدے میں ایک بات قابل غور ہے ' اس نے یہ فخر یہ بیان کیا ہے کہ میں نے دکھنی شاعروں کی روش پر شعر نہیں کہے اور جسے باور نہ ھو وہ میرے کلام کو ان کے کلام سے مقابلہ کر کے دیکھہ لے —

دکھن کے شاعراں کی میں روش پر شعر بولیا نہیں
ھزا کیا سب گزر گئے تو دیکھو حاضر وو دفتر ھے

---

* پارس -

حالانکہ خود اس نے بار بار اس کا اعتراف کیا ہے کہ میں نے دکھنی زبان اور دکھنی شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے - یہاں غالباً اس کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے جو شاعر گزرے ہیں ان کی تقلید نہیں کی بلکہ فارسی شعرا کے رنگ میں لکھا ہے - اس کی زبان بھی تہمت دکھنی کی ہے لیکن دوسرے شعرا کے مقابل میں مشکل ہے اس لیے کہ اس نے رزم و بزم کے دونوں میدانوں میں یکہ تازی کی ہے جس میں مختلف قسم نے حالات اور واقعات طرح طرح کے مناظر اور جذبات کی کیفیت بیان کرنی پڑی ہے اور موقع اور محل کی خصوصیت سے بعض اوقات انوکھے اور غیر مانوس الفاظ اور محاورے استعمال کرنے پڑے ہیں - یہی وجہ ہے کہ اس کے معاصرین نے اس کی زبان پر حرف گیری کی ہے جس کا اظہار خود اس نے اپنے کلام میں کیا ہے —

حقیقت میں جو ہوئیں کوتہ نظر

زباں پر رکھیں عیب ست سب ھنر

شفیق کو بھی اس کی زبان کے متعلق شکایت ہے چنانچہ وہ اپنے تذکرے میں لکھتا ہے " اگرچہ الفاظش بطور دکھنیاں بر زبانہا گراں می آید " - شفیق کی شکایت تو خیر ایک حد تک بجا ہے کہ وہ اورنگ آبادی ہے لیکن نصرتی کے معاصرین کی شکایت کسی قدر حیرت انگیز ہے —

نصرتی خود اپنے کلام کی قدر سمجھتا تھا اور اسے اس بات پر بڑا فخر تھا کہ اس نے دکھنی زبان کو سنوارا ہے اور اس میں نیا رنگ پیدا کیا ہے اور وہ وہ چیزیں لکھی ہیں جو اس سے پہلے ناپید تھیں دکھنی ایک بے مایہ اور بے حقیقت زبان تھی اس نے اس میں جان ڈالی اور اسے سزاوار تحسین بنایا —

گھڑیاں ہوں سلامت سوں یک یک بچن مضامین کی مد میں اوتہا سخن
لگایا ہوں کے نگ طبیعت سوں اوت دیا خوب سورج کے مہرے سوں جوت
اول کے اگر لوگ برناو پھر کتے تھے کہ ہے شعر دکھنی منافر
حقیقت میں ان کی طرف حق اتھا کہ تب شعر بے مایہ مطلق اتھا
سزاور تحسیں ہے یو شعر آج نہ کوئی رکھہ سکے بات حاسد کے باچ

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ ہندی میں فارسی کی سی فصاحت اور حسن نہ تھا لیکن ہندی میں بھی بعض خوبیاں ایسی ہیں جو فارسی میں نہیں۔ میں نے دونوں کی خوبیوں کو دھیان میں رکھا ہے اور ہندی شعر کو فارسی کا ہمسر بنا دیا ہے —

مری ہر بچن ہے معانی کی موت ٭ رکھیا ہوں سو ڈونگر کوں کاڑی کے اوٹ
تک آیا ہوں جاں سحر کے کام میں رکھیا بھر سمندر کوں یک جام میں
ہنر کا ملا موپ + لے مایہ دار عمارت اوچایا ہوں خوش پایہ دار
معانی کی صورت کی ہے آرسی دکھن کا کیا شعر جوں فارسی
فصاحت میں گر فارسی خوش کلام دھرے نظر ہندی بچن پر مدام
وگر شعر ہندی کے بعضے ہنر نہ سکتے ہیں لیا فارسی میں سنور
میں اس دو ہنر کے خلاصے کوں پا کیا شعر تازہ دونوں فن ملا

(یعنی اگرچہ فارسی کو فصاحت میں ہندی پر فخر حاصل ہے لیکن بعض خوبیاں ہندی میں بھی ایسی ہیں جو فارسی میں نہیں پائی جاتیں۔ سو میں نے دونوں کی خوبیوں کو ملا کر ایک نئی شان پیدا کی ہے)

اس کے بعد حاسد پر پھر چوٹ کرتا ہے کہ اُس کا حسد سے یہ کہنا

٭ بسکہ - + نقشہ —

کہ یہ تو دکھنی کتاب ہے کوی معقول بات نہیں - خریدار کو اچھے سودے سے کام ہے نہ کہ دوکان کے درو دیوار سے —

ادیکھیا ادک ہو حسد سوں کباب کہے بول اتنا کہ دکھنی کتاب
سمجدار کوں خوب سودے سوں کام نہ دوکان کا دیکھنا سقف و بام

اسی طرح وہ اپنی دوسری مثنوی (علی نامہ) کے بارے میں کہتا ہے -

عجب فن کی بولیاں ہوں یہ مثنوی کہ کئی بھانت ہے اس ہنر میں نوی
سنواریا ہوں کئی بزم کی انجمن کھلا یا ہوں خوش رزم کے پھولبن
بھریاں ہوں ہنر سوں سراسر کتاب رکھیا ہوں نزاکت سوں سب بھر کتاب

آگے چل کر پھر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ میں نے ہندی اور فارسی دونوں کی خوبیوں کا ست نکال لیا ہے —

میری بات میں لاف نیں بے خلاف کہ نادان کا ہے ہنر عین لاف
کہ یو شعر میں آج اس دھات سات کھیا ہوں بڑے دبدبے کے سنگات
کیا میں تو قطع نظر لاف سوں ولے داد ہے اہل انصاف سوں
کہ کیوں میں پکڑ آج بھانت اک نوی زبوں بات کوں کر دکھا یا قوی
اگر کوی معنی کوں کر وارسی پڑے رزمیہ ہندی و فارسی
اگر اوہے کامل سمج کا دھنی کہ تو اس یک سوں ہوے دو ہنر کا فنی
کہ دونوں کی خوبی مجہ انکھیاں میں آن خلاصہ نکالیا ہوں خوش مایہ چھان

آخر میں فخر کے ساتھہ اپنے تمام کلام پر نظر ڈالتا ہے اور نکتہ چیں کو چنوتی دیتا ہے —

کیا ہوں کوبل تھی سو وہ چلکے پنت کیا ہوں قصائد نول ان گنت
دیکھو بات مجہ عشق میں بے جواب کہ ہے گلشن عشق حاضر کتاب
جو ہوتے ہیں معشوق و عاشق میں کام کیا ہوں وو سب ناز کیاں بیوں تمام

دیکھیں رزمیہ گر کئے کا ہنر　　پڑیں شعر یو ہے سخن مختصر
نہ ہے مجہ میں اور ہر مدعی میں سخن　　نہ ویسا ہوں میں وو بی نہیں مجہ نمن
ادک تیز تازی تھے میرا خیال　　تھکانے میں جس کی فلک پر ہے جھال
قلم ہے مرا مست ہاتی تے چڑ　　جدر رخ کیا ذتم کیتا رگڑ
نشان آج مجہ طرز ہے بے مثال　　صفاں میں سخن کے ہتی پر کی ڈھال

بعض صاحبوں کا یہ اعتراض ہے کہ نصرتی یا اس سے قبل اور بعد کے بعض شعرا کے کلام کو اردو کہنا زبر دستی کی بات ہے - انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ زندہ زبان ہر زمانے میں بدلتی رہتی ہے اور یہی اس کی زندگی کی علامت ہے - رہ مردہ زبان ہے جو صحیفوں اور کاغذوں کے قفلوں میں بند ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے - اگر اُن صاحبوں کے معیار پر اساتذہ کے کلام کو جانچا جاے تو ولی اور ایک مدت کے بعد میر وغیرہ کے کلام کو بھی اردو سے خارج کرنا پڑے گا - میں نصرتی کے چند صاف شعر شعر پیش کرتا ہوں اور ان حضرات سے پوچھتا ہوں کہ یہ اردو نہیں تو اور کیا ہے --

نہ موجود ہونے کے سزاوار تھے　　نہ اس زندگی کے ہو سدار

کروں شکر منعم کا لاریب میں　　کہ پایا ہوں یو گنج از غیب میں

جنے جگ میں یوں راست بازی رکھی　　خدا تس کی تیوں سر فرازی رکھی

طمع اہل عزت کو کرتی ہے خوار　　کرے جگ منے قول پہ اعتبار

ترا ذہن نرمل تری طبع صاف سخن سنج باریک بھی موشگاف

سزاوار تجھ عشق کا تاج ھے روا تجھ کو عشاق پر راج ھے

علامت قیامت کا پیدا ہوا کہ دجال گویا ہو پیدا ہوا
پھریا سب کا ایمان یکبارگی لگے کرنے آپ اپنی آوارگی

دھنی تونچ ھے مسجد و دیر کا تُہیں ھے سبب صلح ہور خیر کا
اگر دین حق کے نہ قابل اھیں ولے تیری وحدت کے قائل اھیں

خدا پاس مقبول تیری دعا تو کل ترا حاصل مدعا
ترے ھاتھہ میں دین و دنیا کا بل خدا تجکوں دیتا ھے علم و عمل

ادب

تاریخ و سیر

متفرقات

اردو کے جدید رسالے

ادب

دل کی رانی ایک ھریجن کی کہانی

[از فرید مچھلی شہری]

یہ ایک چھوتی سی کہانی ہے- موھن ایک برھمن لڑکا ھے- سیر کے لیے اپنے ایک دوست کے ساتھ اپنے گاؤں جاتا ھے- وھاں ایک چماری لڑکی کو مصیبت میں مبتلا دیکھہ کر ھمدردی کرتا ھے- دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ھوجاتے ھیں- ماں باپ کو معلوم ھوا تو وہ سخت غضبناک ھوتے ھیں- آخر موھن کے دوست کی بھوی ایک ایسی چال چلتی ھے کہ دونوں کی شادی ھوجاتی ھے- کہانی دل چسپ ھے —

*

رباعیات اخگر

[مجموعۂ رباعیات اخگر مرادآبادی

مکتبۂ جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی قیمت ۸ آنے]

یہ مجموعہ مولوی محمد احمد ندوی صاحب نے طبع کرایا ھے

شروع میں حالات مصنف اور ایک مقدمہ ہے - رباعیاں مختلف مضامین مثلاً معرفت، مذہب، اخلاق وغیرہ پر ہیں - بعض بعض بہت پر اثر ہیں - بڑی بات یہ ہے کہ ہر رباعی سے شاعر کا خلوص ٹپکتا ہے نمونے کے طور پر دو ایک رباعیاں نقل کی جاتی ہیں-

مانا کہ گہر ہار پہنا دیتے ہیں
اور تاج بھی شاہوں کے سجا دیتے ہیں
اُن اوس کے قطروں کا ہے قایل اختر
اک چیونٹی کی جو پیاس بجھا دیتے ہیں

اے کاش زماں اور مکاں سے چھوٹوں
تیروں کی طرح قید کماں سے چھوٹوں
ہر درد بھرے دل کی دوا بن جاؤں
تفریق فلاں ابن فلاں سے چھوٹوں

**

نغمۂ روح

[کلام حضرت اختر انصاری - قیمت ایک روپیہ
ملنے کا پتا :- مولوی محمد افضل،
محلہ ناھر خاں، بدایوں]

یہ اختر انصاری کی مختلف نظموں اور غزلوں کا مجموعہ ہے - اختر صاحب کے حق میں یہ کہنا کافی ہے کہ وہ سچے شاعر ہیں - ان کے کلام

میں درد اور حزن و الم پایا جاتا ہے - طرز بیان صاف اور پراثر ہے۔ یہاں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جس سے اُن کے انداز بیان کا رنگ معلوم ہوگا۔

جو پوچھتا ہے کوئی " سرخ کیوں ہیں آج آنکھیں"
تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں '' رات سو نہ سکا "
ہزار چاہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی
کہ " رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا"
دل کا خوں آنکھوں میں کھچ آیا چلو اچھا ہوا
میری آنکھوں کو مرا احوال کہنا آگیا
سہل ہو جائے گی مشکل ضبط سوز و ساز کی
خون دل کی آنکھ سے جس روز بہنا آگیا
میں کسی سے اپنے دل کی بات کچھ کہتا نہ تھا
اب سخن کی آڑ میں کیا کچھ نہ کہنا آگیا

برشکال

خمار آگیں ہوا' اودی گھٹائیں' ہلکی ہلکی پھوار
سہانا دن ہے' فرط شوق سے طائر چہکتے ہیں
سرود و رقص کی محفل سجی ہے سبز پیڑوں پر
خوشی سے جھومتی ہیں ٹہنیاں پتے لہکتے ہیں
چمن میں ڈھیر ہے ہر سمت لاکھوں سرخ پھولوں کا
کسی آتش کدے میں جیسے انگارے دہکتے ہیں

عجب عالم ہے اس رنگیں سے میں مے پرستوں کا
نہیں حاجت شراب ناب کی یونہی بہکتے ہیں

—— • • ——

بلبل زار کر رہی ہے فغاں ہل رہی ہے بہار کی چھاتی

—— • ——

کوئی جب نالہ کرتا ہے کلیجہ تھام لیتا ہوں
فغان غیر بھی اپنی فغاں معلوم ہوتی ہے

باز کے سو شعر

(مولوی محمد تراب علی خاں صاحب باز
کے کلام کا انتخاب - قیمت دو آنے)

کسی خوش بیان شاعر کے کلام کا انتخاب آسان نہیں لیکن جاوید صاحب کے ذوق سلیم نے اس مشکل کو آسان کر دیا ہے - باز صاحب اپنی طبیعت اور رنگ کے لحاظ سے خاص شخص ہیں - انہوں نے اپنا رنگ خود ہی بتا دیا -

مرے اشعار میں ہے داغ کا رنگ
ہے نسبت کیفئی شیریں بیاں سے

اس انتخاب میں سے دو ایک شعر نقل کیے جاتے ہیں —

کوئی مست وصال کیا جانے بجھ گیا یا چراغ جلتا ہے
بے ثمر نخل آرزو دیکھا پھولتا ہے کبھی نہ پھلتا ہے

کالی گھٹا کو دیکھہ کر رندوں میں کھلبلی سی ہے
جھوم رہے ہیں بادہ خوار ابر بہار دیکھہ کر

—— * ——

اگر موت ہی باعث وصل ہے تو پھر اس سے آسان کیا چیز ہے
فرشتوں کا اُستاد حیران تھا یہ متی کا انسان کیا چیز ہے
محبت میں چھوتا بڑا ایک ہے یہاں شوکت و شان کیا چیز ہے

—— * ——

جگر کے سو شعر

مکتبہ جامعہ ملیہ - قرول باغ دہلی - قیمت چار آنے

جگر مرادآبادی موجودہ غزل گو شعرا میں ہیں - ان کا کلام اکثر رسایل و جراید میں شایع ہوتا رہتا ہے اس لیے وہ تعارف کے محتاج نہیں - ان کے ایک سو شعر کا انتخاب محمود علی خاں صاحب نے اپنے ذوق اور پسند کے مطابق کیا ہے جس کو مکتبہ جامعۂ ملیہ نے تجلی برقی پریس دہلی میں بہت پاک صاف چھپوا کر شایع کیا ہے - جگر کے کلام میں زبان و بیان اور خیالات کی خوبیاں موجود ہیں - کسی شاعر کے ذخیرۂ کلام سے چند شعروں کا انتخاب کرنا بہت دشوار ہے اور اس میں ذوق شعری کی آزمایش ہے - اس انتخاب کے مرتب نے چند شعر بہت اچھے منتخب کئے ہیں - ذیل کا شعر شاعرانہ خیال اور صناعی کے اعتبار سے خوب ہے —

بگڑا ہوا ہے رنگ جہان خراب کا
پھر لوں نظر میں رنگ کسی کے شباب کا

دو شعر اور ملاحظہ ہوں :-

عشق نے لذت جو دی تھی آہ تو نے عندلیب
اس کو بھی صرف نوا ہائے پریشاں کر دیا

— • —

بھڑکا رہا ہوں آتش عصیاں ہر ایک سمت
پھیلا رہا ہوں رحمت پروردگار کو

(چ)

— • —

حشرات الارض

مصنفہ محمد فضل الرحمان صاحب- ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن - قیمت ایک روپیہ چار آنے- کتابت و طباعت غنیمت حجم ۱۹۳ صفحات-

ہمارے ادب میں ڈراموں کا تقریباً فقدان ہے- اب سے پہلے بعض کمپنیاں شکسپیر وغیرہ کے ماخوذ ترجمے یا اُسی طرز پر لکھے ہوئے ڈرامے پیش کرتی رہیں- اب کہیں جا کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اِس صنف ادب کی طرف توجہ کی ہے اور کوششیں کی جا رہی ہیں کہ جدید طرز کے ڈرامے لکھے جائیں—

زیر نظر ڈراما بھی اسی قسم کی ایک کوشش ہے - لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ڈراما نگار نے اِس ڈرامے کو تھیٹر کے نقطۂ نظر سے لکھا ہے ' اور ادبی کوشش اُن کا اولین مقصد نہیں معلوم ہوتی- کم سے کم وہ جوش اور اصلیت جو ادبی ڈرامے کی جان ہیں اس میں پورے طور پہ موجود نہیں- ڈرامے کا پلاٹ ابسن (Ibsen) کے ایک ڈرامے An Enemy Of The

People) سے ماخوذ ہے - لیکن تعجب ہے کہ ڈراما نگار نے اس کا اعتراف نہیں کیا ہے- اِس پلاٹ کو اُردو میں منتقل کرنے میں اُنہیں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی- اصل ڈرامے کا جوش ' اور اُس کے ایک اہم کردار کی نیم مجنونانہ سرگرمی اور شوکت اِس ماخوذ ڈرامے میں مدھم نظر آتی ہے- جن حصوں میں اصل پلاٹ سے منحرف ہونے کی کوشش کی گئی ہے اُن میں اس ڈرامے کا شیرازہ ناقص ہو جاتا ہے —

یورپ کے جدید ڈرامے ' یورپ کی معاشرت پر منحصر ہیں ' اُن میں کچھ تبدیلیاں کرکے اُن کو ہندوستانی کی معاشرت پر "چسپاں" کرنے کی کوششوں سے اُردو ڈرامے کے معیار کے بگڑ جانے کا امکان بڑھتا جاتا ہے - یا تو ذمہ دارانہ ترجمے کئے جائیں یا ایسے ڈرامے لکھے جائیں جو ہماری معاشرت ' ہماری طرز زندگی ' ہمارے طرز خیال کی پیداوار ہوں- ادبی اور فنی نقطۂ نظر سے شروع سے آخر تک اس ڈرامے میں حقیقت ' اور زندگی کی صحیح نقاشی کے آثار کم نظر آتے ہیں- اس ڈرامے کا قصہ جو ہندوستان کی معاشرت پر منطبق کیا گیا ہے ' جا بجا سے کچھ ناقص سا معلوم ہوتا ہے ' اور پوری طرح ہندوستانی فضا پر صادق نہیں آتا- تفصیلوں میں ڈراما نگار کو نسبتاً زیادہ ناکامی ہوئی ہے - عمل اور مکالمے کی تفصیلوں میں روز مرہ کی معاشرت زندہ نظر آسکتی ہے لیکن اس ڈرامے کے اشخاص جو کچھ کہتے اور جو کچھ کرتے ہیں ' اُس میں زندگی ' اور اصلیت کے حقیقی آثار نظر نہیں آتے- ہر چیز میں "آورد" کا شائبہ ہے ' اور ہلکا سا تصنع پایا جاتا ہے —

فنی اعتبار سے "حشرات الارض" میں بعض کمزوریاں ہیں- چوتھے ایکٹ کے دوسرے سین میں ڈاکٹر جاھد کی تقریر کچھ بے معنی سی ہے -

اِبسن کے ہاں ڈاکٹر کی تقریر ایک خاص چیز تھی - ڈاکٹر جلسے کی پابندیوں اور مخالفتوں کی وجہ سے اپنے آپ سے گذر جاتا ہے۔ وہ کہنا کچھہ چاہتا ہے مگر مخالفت اور جوش میں کچھہ اور کہہ جاتا ہے - اِبسن نے اِس منظر کی تحریر میں کمال کردیا تھا- "حشرات الارض" میں یہی منظر کچھہ بے معنی سا ہوگیا ہے - ڈاکٹر کی تقریر اس قدر عجیب و غریب قسم کی ہے' اور ڈرامے کی نشو ونما اور مقصد پر اس کا قدرتی اثر اس قدر کم پڑسکتا ہے کہ پورا منظر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے- کاش اس منظر کی حد تک فاضل ڈراما نگار اصل کی پیروی کرتے تو ڈرامے میں کچھہ نہ کچھہ جان پڑجاتی —

ڈرامے کا مکالمہ بھی مربوط نہیں - ہر شخص کی گفتگو کا انداز الگ ہوتا ہے اور مکالمے کی سب سے بڑی خوبی یہہ ہے کہ وہ ہر شخص کے خاص طرز گفتگو سے قدرتی طور پر نشو ونما پاے - اِس ڈرامے میں مکالمہ بالکل یکساں ہے - باتوں سے کسی کردار کی ذاتی خصوصیتیں نمایاں نہیں ہونے پاتیں - تمام اشخاص ایک ہی قسم کی سادہ' بے لطف عبارت میں باتیں کرتے ہیں' جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈراما نگار نے مکالمہ نگاری کی طرف پوری توجہ نہیں کی - جوش، اصلیت اور لطف جو مکالمے کی قدرتی روانی سے پیدا ہوتے ہیں' اس ڈرامے میں پورے طور پر موجود نہیں- بعض جگہ مکالمہ بے ربط ہوگیا ہے جس سے ڈرامائی توازن میں فرق آگیا ہے مثلاً پہلے ہی سین کے ابتدائی چند صفحوں میں مختلف کرداروں کی گفتگو - بعض جگہ آداب مکالمہ کا خیال کم رکھا گیا ہے - مثلاً صفحہ ۵۲ اعزاز احمد صاحب (جن کی صاحبزادی سے اُن کے ایک بھتیجے کی شادی ہونے والی ہے) بھتیجے کی والدہ سے گفتگو فرماتے ہیں :-

شہربانو- "مجھے اتنی جلدی نہیں جتنی آپ کے بھتیجے کو جلدی ہے - دن
رات سر کھاتا ہے کہ مجھے زر زیور کپڑا لتا کچھہ درکار نہیں - بس
سیدھے سادے دو بول پڑھوا دو' —

اعزاز - "تو اس سے کہیے لڑکی کو بھگا لے جاے" —

شہربانو- "اُس کا تو کچھہ یہی ارادہ نظر آتا ہے .." —

ڈرامے کے ایک فرد "مری کالج کے منشی صاحب" ہیں جو مدراسی اُردو بولتے ہیں' ان کی زبان سے مدراسی کہلوانے کے لیے مکالمہ طویل ہوگیا ہے جو بے ضرورت معلوم ہوتا ہے - (مثلاً صفحہ ۳۸ سے صفحہ ۴۲ تک) - معلوم ہوتا ہے کہ لایق مصنف نے اس ڈرامے کو بہت روا روی میں لکھا ہے - یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں زبان کی فرو گذاشتیں بھی نظر آتی ہیں مثلاً

"کہیں پھر پار سال کی طرح اچار کھا کر پیچش کا دم چھلہ لگالیں گے" (صفحہ ۳۸) —

"آپ کو کسی قسم کی شکایات ہوں تو بلا خوف و خطر بیان کیجیئے - ان کا 'ارتفاع' ہمارا عین فریضہ ہے" (صفحہ ۴۰- یہاں "ارتفاع غالباً رفع کرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے) -

"برخلاف اس کے کتاب پڑھنے کے بعد انصافانہ راے قایم کرنا بہت مشکل ہے" - (صفحہ ۷۷ - اِس "انصافانہ راے" کی داد نہ دینا ظلم ہے) -

پلاٹ اور مکالمے کے بعد کردار نگاری کا سوال آتا ہے - کردار نگاری میں ابسن سے بہت انحراف کیا گیا ہے - اور مصنف نے ایک دو "طبعزاد" اشخاص ڈراما کا اضافہ بھی کیا ہے تاکہ ایک طرف عشق و محبت کی چاشنی بھی آجاے اور دوسری طرف ایک مدراسی منشی صاحب اپنی باتوں سے حاضرین اور ناظرین کو ہنسا سکیں -

"حشرات الارض" کے کردار زندہ آدمی بہت معلوم ہوتے ہیں یہ ایک طرح کا نمونہ (type) ہیں اور محض تھیٹر کی پیداوار ہیں - کرداروں کو اس ماخوذ ڈرامے میں غالباً ایکٹروں کو پیش نظر رکھہ کے جا بجا بدلا گیا ہے -

ڈاکٹر کا کردار اس میں مسخ ہوگیا ہے - ابسن کے وہ دو کردار جو اس ڈرامے میں "رعد" و "برق" بنے ہوئے ہیں زبان حال سے شکایت کر رہے ہیں - "مری کالج کے منشی صاحب" البتہ خالص ہندوستانی آدمی ہیں - اور وہ خشکی جو ابسن کے خیالات کی پوری ترجمانی نہ کرنے سے پیدا ہوی تھی اس کو رفع کرنے کے لئے اس کا داخل کرنا کچھہ نامناسب نہیں لیکن اس کردار میں بھی کچھہ جان نہیں البتہ غلط مدراسی اُردو بولنے میں اس کو کمال حاصل ہے —

اب ' جب کہ ڈراما کو ملک کے تعلیم یافتہ نوجوانوں نے اپنے ہاتھہ میں لیا ہے ' تو ضرورت اس امر کی تھی کہ یا تو وہ خود اپنی زندگی اور معاشرت کا مطالعہ کر کے ایسے ڈرامے لکھیں جو ادب میں باقی رہ جائیں یا یورپ کے معیاری ڈراموں کے ذمہ دارانہ ترجمے کریں جس سے اردو میں ڈراما کا صحیح معیار قائم ہونے میں مدد مل سکے - ورنہ اِس قسم کی کوششیں ممکن ہے کہ اسٹیج پر کامیاب ہوں - مگر ادب کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا - اور اردو ڈرامے کے ایک اور غلط معیار کے پیدا ہوجانے کا اندیشہ بھی ہے - (+ +)

مقالات حالی

شایع کردۂ انجمن ترقیءاُردو اورنگ آباد - صفحات ۳۱۰ کتابت طباعت اور کاغذ نہایت پاکیزہ اور عمدہ قیمت مجلد للعہ غیر مجلد ۸/ -

' مولانا حالی ' اُردو زبان کے بلند پایہ شاعر اور نثر نگار ہیں ان کی تصانیف مشہور اور مقبول ہیں اور بار بار طبع ہو چکی ہیں لیکن ان کے مضامین وغیرہ

جو مختلف رسائل و جرائد میں شایع ہوے ہیں اب تک مکمل طور پر یکجا جمع نہیں کئے گئے - انجمن ترقیء اُردو مستحق مبارکباد ہے کہ اس نے مولانا کے مضامین ' تبصروں اور تقریروں سب کو جمع کیا ہے اور ان کو خاص اہتمام سے طبع کرکے شایع کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے - اس سلسلے کے دو حصے ہیں' پہلے حصے میں عام مضامین ہیں' اور دوسرے میں کتابوں کے تبصرے اور وہ تقریریں ہیں جو مختلف جلسوں یا کانفرنسوں میں مولانا نے فرمائیں - پہلا حصہ چھپ چکا ہے جو ہمارے پیش نظر ہے دوسرا حصہ زیر طبع ہے —

یہ مقالے تعداد میں ۳۲ ہیں - جس طرح ان کی تعداد کافی ہے ' اسی طرح ان کے موضوعات میں بھی کافی رنگا رنگی اور تنوع ہے - مذہب ' اخلاق ' تعلیم ' ادب ' فلسفہ ' سیاسیات وغیرہ اس کے خاص موضوعات ہیں - ان تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری زبان میں علمی مضامین اور خیالات پہلے پہل کس طرح داخل ہو رہے تھے اور ان کو عام بنانے اور زبان کے دائرے کو وسیع کرنے میں مولانا حالی اپنے قلم سے کس طرح کام لے رہے تھے - ان مضامین کو لکھے ہوے پچاس سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہے ' لیکن ان میں اب تک وہی تازگی اور جدت موجود ہے ' اور آج بھی ہم ان سے رہبری و ہدایت حاصل کر سکتے ہیں —

ان مقالات کی اہمیت اور رنگارنگی کے قطع نظر ان کے بیان اور زبان میں بھی اُستادانہ خوبیاں ہیں - ' حالی ' کے جچے تلے اور مہذب و متین اسلوب ' اور سلیس و پاکیزہ زبان کے آثار ہر جگہ نمایاں ہیں - اس میں الفاظ و خیالات کا وہ معتدل اور خوش گوار توازن ہے کہ پڑھنے والے علمی مسائل کے ادا کرنے کے لئے ان سے بصیرت حاصل کر سکتا ہے - یہ کتاب ہر اردو داں کی نظر سے گزرنی چاہیئے - کتاب کے شروع میں مولانا کی سب سے آخری عکسی تصویر بھی شامل کی گئی ہے - (چ)

— —

تاریخ و سیر

حیات حافظ رحمت خاں

اٹھارھویں صدی عیسوی میں مغلوں کی مرکزی حکومت میں ضعف آیا اور حسب معمول ہندوستان کے مختلف اقطاع میں ملوک طوائف اور بد امنی کا دور دورہ ہوا' تو اس وقت مغلیہ افواج کے بر طرف شدہ افغانی سپاھی موجودہ روھیل کھنڈ کے علاقوں میں جا بجا خود قابض اور حاکم بن بیٹھے اور دھلی کی کمزور حکومت جب ان کو مغلوب نہ کرسکی تو ناچار انھیں اپنی طرف سے جاگیر و منصب عطا کرنے لگی اور اس طرح یہ لٹیرے پردیسی حکومت و ریاست کے مدعی بن گئے ؛ اس نئی ریاست کی تشکیل و ترقی بہت کچھہ ایک عالی خاندان روھیلہ سردار 'حافظ رحمت خاں' کی شجاعت و تدبیر کی رھین منت تھی' بلکہ اس اعتبار سے کہ حافظ موصوف کی شہادت کے ساتھہ ھی روھیلوں کی آزاد حکومت و قوت کا خاتمہ ھوگیا' اس ریاست کو انھی کی ذات سے منسوب و مختص کردینا کچھہ غلط نہ ھوگا- خوشی کی بات ھے کہ ایک ایسے ممتاز اور غیر معمولی شخص کے حالات کو سید الطاف علی صاحب بی' اے' بریلوی نے جمع کیا اور خاصی ضخیم کتاب کی صورت میں نظامی پریس بدایوں سے چکنے کاغذ پر صاف ستھرا چھپوا کر چند تصاویر کے ساتھہ شایع کردیا ھے -

شروع میں آنریبل مسٹر سیتا رام صاحب صدر نشین مجلس وضع قوانین صوبۂ متحدہ نے مختصر سا پیش نامہ تحریر فرما کر نو جوان مولف

کی عزت بڑھائی ہے اگرچہ خود کتاب کی قدر و قیمت یا آنریبل موصوف کی شہرت میں غالباً ان سطور سے کچھ اضافہ نہ ہوگا - پھر ایک تعریفی مقدمہ ناشر کتاب مولوی نظام الدین صاحب بدایونی نے تحریر فرمایا ہے- اس کے بعد لایق مولف کا دیباچہ ہے جس میں انہوں نے سیرالمتاخرین اور "فیض بخش" وغیرہ اس عہد کی بعض تاریخوں پر جرح کی ہے کہ چونکہ یہ کتابیں حکومت انگریزی کی سرپرستی میں یا انگریز حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہیں لہذا ان میں روہیلوں سے انصاف نہیں کیا گیا- بخلاف ان کے لائق مولف نے اپنا ماخذ بیشتر 'گل رحمت اور 'گلستان رحمت' کو بنایا ہے جو حافظ رحمت خاں کی گویا حمایت اور ستائش میں لکھوائی گئی تھیں- طرفہ یہ کہ خود انصاف پسند مولف نے خان شہید کی اولاد میں صاحبزادہ عبدالواجد خاں کی امداد و سرپرستی سے اپنی کتاب شایع کرنے میں کچھہ مضائقہ نہیں کیا —

اصل کتاب کے آغاز میں ملک روہ' روہیل کھنڈ' خاندان حافظ رحمت خاں کے مختصر حالات تحریر کئے ہیں- ان کی ولادت کا تخمینی سنہ ۱۷۰۸ ہے- لیکن ہندوستان میں مستقل اقامت کا زمانہ لائق مولف نے نہیں لکھا - البتہ سنہ ۱۷۳۰ کے کچھہ بعد سے ہم خان موصوف کو آنولے میں مقیم اور نواب محمد علی خاں کی رفاقت میں سرگرم کار پاتے ہیں- سنہ ۱۷۴۹ میں محمد علی خاں نے وفات پائی- وہ اپنا جانشین بھی حافظ رحمت خاں کو بنانا چاہتے تھے لیکن حافظ صاحب نے دستار حکومت محمد علی خاں کے صغیرالسن بیٹے سعداللہ خاں کے سر پر رکھہ دی - بعض مورخوں نے اسے ریا کاری قرار دیا ہے لیکن ہمارے مولف نے اس خیال کی شد و مد سے تردید کی اور اس فعل کو حافظ صاحب کے خلوص

و ایثار کی حیرت انگیز مثال ثابت کیا ہے اگرچہ خود ان کی کتاب شاہد ہے کہ سعداللہ خاں کی مسند نشینی اور بعد میں اس کے بھائیوں اور رھیلہ سرداروں میں تقسیم مملکت کے باوجود سارے ملکی اختیارات اورجنگی قوت حافظ رحمت خان ھی کے قبضے میں رھی اور بہت سی فتوحات اور ترقیوں کے بعد وھی دربار اودھ اور ان کے حلیف انگریزوں کے اصلی حریف قرار پاے اور انہی کی شہادت (سنہ ۱۷۷۴ ع) اور شکست کے ساتھہ ریاست روھیل کھنڈ بلکہ رھیلہ قوم کی حکومت و شہرازہ بندی کا خاتمہ ہوگیا —

کتاب زیر تبصرہ کو تاریخ نویسی کے اس معیار پر کہ واقعات گذشتہ کو پوری طرح سمجھکر سمجھا دیا جائے' جانچنا شاید بے محل ہوگا کیونکہ مولف صرف ایک سوانح عمری لکھنے بیٹھے ھیں - البتہ یہ امر تعجب سے خالی نہیں کے علی گڑہ کے انگریزی تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ان کی کتاب کا طرز قرون وسطیٰ کی فسانہ آمیز مشرقی تاریخوں سے زیادہ مشابہت رکھتا ھے حتیٰ کہ کمال خوش اعتقادی سے انہوں نے حافظ رحمت خاں کی بعض کرامتیں بھی نقل کردی ھیں - مگر اس سے بھی بڑھکر عجیب' خاں ممدوح کے علم و فضل' شعر گوی اور انشا پردازی کی دلیلیں ھیں جنہیں لائق مولف نے درج کتاب کرکے گویا ذوق سلیم کی تضحیک فرمائی ھے - غنیمت ھے وارن ھیسٹنگز کے مخالفین کی کتابیں اور رسالے ان کی نظر سے نہیں گزرے ورنہ عجب نہیں دیوان حافظ شیرازی کو وہ حافظ رحمت خاں کا کلام ثابت کرنے پر آمادہ ہو جاتے؟ بہر حال کتاب "حیات حافظ رحمت خاں" دلچسپی اور افادے سے خالی نہیں اور یقین ھے کے قومی یا خاندانی تعلقات کی بنا پر اھل روھیل کھنڈ میں کافی قبولیت حاصل کرے گی -

قیمت تین روپیہ - مطبع نظامی' بدایوں یا روھیلا بک ڈپو' نیلی تال روڈ بریلی سے طلب کی جائے —

(ش)

اسلامی تاریخ کی سچی کہانیاں (حصہ اول)

مرتبۂ مولوی محمد حسین محوی - شایع کردۂ

مکتبۂ جامعہ ملیہ دھلی قیمت ۴ آنہ

لایق مرتب نے اس چھوٹی سی کتاب میں عربی فارسی کی مختلف تاریخوں سے ۵۰ چھوٹی چھوٹی حکایتیں جمع کی ھیں اور ان کو سہل و سادہ عبارت میں تحریر کیا ھے تاکہ بچے سہولت سے پڑھیں اور سمجھیں - مرتب نے اپنے انتخاب میں یہ التزام کیا ھے کہ ایسی کوئی حکایت داخل ہونے نہ پائے جس میں اخلاقی تعلیم کا جوھر موجود نہو - بچوں کے لئے یہ کتاب بے شک مفید اور قابل مطالعہ ھے —

(چ)

سفر شاھانہ

(مولفۂ جناب مولوی محمد اکبر علی صاحب اڈیٹر صحیفہ روزانہ حیدرآباد دکن. قیمت قسم اول چوبیس روپے اور قسم دوم چھ روپے چار آنہ)

کہنے کو تو یہ اعلیٰحضرت حضور پرنور فرمانروائے مملکت آصفیہ کا سفر نامۂ دہلی و رام پور و لکھنؤ ہے لیکن علاوہ سفر کے مفصل حالات کے جو فاضل مولف نے ہمراہ رہ کر قلمبند کئے ہیں ، اس میں اُن تینوں مقامات کے تاریخی حالات اور وہاں کی عمارتوں اور آثار قدیمہ کی عکسی تصویریں اور نقشے اور دوسرے بہت سے کارآمد مضامین آگئے ہیں - یہ عجیب دلکش مرقع ہے - صرف تصویروں کا حساب کیا جائے تو شمار میں ۲۸۹ ہیں - تاریخی حالات بہت تحقیق سے جمع کئے گئے ہیں اور ساری کتاب بلاک بنوا کر نہایت خوش خط طبع کی گئی ہے - ایسی کتاب اردو زبان میں اب تک طبع نہیں ہوی تھی - فاضل مولف کی محنت اور تحقیق لایق ہزار آفرین ہے - اس میں انھوں نے وقت اور مصارف کی مطلق پروا نہیں کی اور انتہائی شوق اور محبت سے اس کام کو انجام دیا ہے - قسم اول اعلیٰ درجے کے آرٹ پیپر پر طبع ہوی ہے - جس کا ہر صفحہ بجائے خود ایک مرقع معلوم ہوتا ہے - علاوہ طباعت کے کمال کے جو اس کے ہر ورق سے ظاہر ہے ترتیب میں بھی بڑی خوش سلیقگی سے کام لیا گیا ہے - جہاں کہیں کسی عمارت کی تصویر ہے یا کسی ممتاز شخص کا نام آگیا ہے وہاں اس کے مکمل حالات اختصار کے ساتھ درج کردیے گئے ہیں - علاوہ جدید و قدیم عمارات اور آثار کی تصویروں کے جا بجا حال و گزشتہ تمدن کے مرقعے بھی نظر آتے ہیں - غرض یہ کتاب نہایت قابل قدر ہے اور ہر مدرسہ اور کالج اور ہر دفتر اور کتب خانے میں رکھنے کے لایق ہے —

—— * ——

غددوں کے جوھر اور علاج امراض

(از لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق - قلعہ گولکنڈہ ،

حیدرآباد دکن - قیمت چھ آنے)

ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب " اعادۂ شباب و درازئی عمر " پر بہت کچھہ لکھہ چکے ھیں ۔ وہ اس فن کے خاص ماھر ھیں - چونکہ اس مضمون کا زیادہ تر تعلق خاص غدد سے ھے ' اس لئے انھوں نے یہ رسالہ ان غدد پر لکھا ھے اور ان کی پوری کیفیت تحریر کی ھے اور یہ بتایا ھے کہ کن کن امراض میں غددوں کے جوھر استعمال کئے جاتے ھیں - جن صاحبوں نے ڈاکٹر صاحب کے پہلے رسالے پڑھے ھیں ان کے لئے اس رسالہ کا مطالعہ بہت مفید ھوگا - اس میں بعض بہت کام کی باتیں لکھی ھیں خصوصاً علاج بالاعضاء کا باب پڑھنے کے قابل ھے —

—*—

ارکان اسلام

شایع کردۂ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرول باغ دھلی قیمت ڈھائی آنہ)

یہ چھوٹی سی کتاب مسلمان بچوں کے لئے لکھی گئی ھے جس میں اسلام کے پانچوں ارکان کو مختصر طور پر سمجھایا گیا ھے تمام ضروری امور کو بہت صاف سلیس زبان میں سلیقہ سے ادا کیا ھے جن سے بچے بہت کم وقت میں بآسانی واقف ھوسکتے ھیں —

(ع)

—•—

کبیر اینڈ دی بھگتی موومنٹ

(Kabir and thc Bhagti Movement)

(مصنفہ مسٹر موہن سنگھ صاحب - صفحات ۹۳ -

پتہ - آتما رام اینڈ سنز پبلشر - لاہور)

مصنف کا قصد ہے کہ کبیر کے متعلق مکمل تحقیق کریں اور اپنی تحقیق کے نتائج کو تین علحدہ علحدہ جلدوں میں شائع کریں - چنانچہ کتاب زیر تبصرہ اس تحقیق پر پہلی جلد ہے جو ابھی حال میں شائع ہوئی ہے - انہوں نے اس جلد کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کے مضمون " از منۂ وسطیٰ میں تحریک بھگتی پر اسلامی اثر " مطبوعہ رسالہ " اسلامک کلچر " دسمبر سنہ ۱۹۳۳ ع کو پڑھنے سے انہوں نے یہ ارادہ کیا کہ کبیر کے متعلق تحقیقات اور چھان بین میں سرگرمی سے کام کریں اور جو غلط رائیں هندوستان کی از منۂ وسطیٰ کی معاشری اور مذهبی تاریخ کے متعلق قایم کی جارهی هیں ان کی صحت کریں - ان کا یہ ارادہ یقیناً مبارک ارادہ تها - کسی مضمون نگار کے لیے بهی شاید اس سے زیادہ قابل مسرت اور کوئی بات نہیں هو سکتی کہ اس کے خیالات دوسروں کے لیے فکر و تحقیق کے محرک بنیں - هم نے شروع سے آخر تک مسٹر موهن سنگھ صاحب کی تصنیف کردہ کتاب پڑهی - اس میں همیں خالص تحقیق بہت کم نظر آئی - انہوں نے دوسروں کے خیالات وآرا کو تهوڑا بہت بدل کر پیش کردیا هے اور بس - اگر چہ موصوف نے یہ دعویٰ کیا هے کہ وہ کبیر کی تحریک کے متعلق اس وقت اپنا کوئی خاص خیال نہیں رکهتے لیکن کہیں کہیں ان کے انداز خیال کی

جھلک صاف نظر آجاتی ہے - ان کی تحریر کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے قائل نہیں کہ ہندوستان کی ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ میں اسلام کا کوئی خاص اثر پڑا - وہ اس زمانے کی معاشری اور مذہبی تحریکات کا رشتہ بدھ مت کے ساتھ جوڑتے ہیں (صفحہ ۱۹) لیکن یہ نہیں بتاتے کہ یہ تحریکات اسلام کے ہندوستان میں پھیلنے سے کچھ قبل کیوں نہیں شروع ہوئیں - ان میں جو خالص اسلامی عناصر پائے جاتے ہیں' جنہیں ہر منصف مزاج محقق تسلیم کرے گا' وہ کہاں سے اور کیونکر آئے ؟ - اس مسئلہ کی تفصیلی بحث کے لئے ہمیں دوسری اور تیسری جلد کا انتظار کرنا ہوگا لیکن بہ ہر حال مصنف نے اشارتاً جہاں کہیں اس مسئلہ کو چھیڑا ہے وہاں ان کے خیال کی عام نہج کا پتہ چل جاتا ہے —

مصنف نے اشارتاً اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ نانک نے کبیر سے خوشہ چینی نہیں کی لیکن اس دعوے کی تائید میں کوئی استدلال یا ثبوت پیش نہیں کیا جو تحقیق کی کسوٹی پر پورا اُترے - دنیا کا بڑے سے بڑا مجتہد اور امام بھی دوسروں سے استفادہ کرتا اور اپنے گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا - اب تک یہ بات مسلم رہی ہے کہ نانک نے انہیں خیالات و افکار کو جو پہلے سے کبیر کی تحریک کی بدولت موجود تھے' عوام کے سامنے پیش کیا - اب اگر کوئی اس دعوے کی تردید کرنا چاہتا ہے تو اس پر بار ثبوت عاید ہوتا ہے - محض کہنے سے کوئی بات سچ نہیں ہو جاتی اور نہ دنیا اس کو تسلیم کر سکتی ہے —

مصنف کتاب نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے ہندی و قلمی مخطوطات کا بار بار ذکر کیا ہے جن سے انہوں نے اس کتاب کی تیاری میں مدد لی - اگر یہ ذکر صرف اس واسطے کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے موضوع سے متعلق

سے کوئی فائدہ نہیں ۔

لیکن اگر واقعی 'کبیر' کے متعلق مصنف کو کام کرنے کا سچا شوق ہے تو ہم انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ فوراً 'بیجک' 'گرنتھاوی' اور 'پنچاولی' وغیرہ کے ایڈیشن تنقیدی اصول پر تیار کریں۔ اس ضمن میں وہ یہ تحقیق کر سکتے ہیں کہ واقعی کونسا کلام 'کبیر' کا ہے۔ کونسا 'دھرم داس' کا ہے اور کون سا بعد کے پنتھیوں نے اضافہ کیا ہے - مختلف زمانوں کی زبان صاف پہچانی جائے گی - یہ ایک زبردست تاریخی اور لسانی خدمت ہوگی جو وہ کر سکتے ہیں - اس کام میں وہ اور دوسرے ہندی کے فاضلوں سے بھی مدد لے سکتے ہیں —

(ی)

قانون مباشرت

از ڈاکٹر فضل معین احمد دہلوی - ملنے کا پتہ دفتر معارف طبیہ روڈ گراں دہلی - قیمت چار آنے

اس کے نام سے ظاہر ہے کہ جنسی تعلقات اس کا موضوع ہے - بڑی حد تک طبی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے - شروع میں چند مفید صحت اصول بیان کئے گئے ہیں۔ اختصار کے ساتھہ ضروری جنسی معلومات فراہم کردی گئی ہیں - پھر ہر قسم کے جنسی امراض کا بیان اور اُن کے علاج کی تدبیریں ہیں - کتاب کا بہت بڑا حصہ نسخوں پر مشتمل ہے —

مصنف نے کتاب طب یونانی کے اُصول اور نظریوں کو زیادہ تر پیش نظر رکھہ کے لکھی ہے اور جہاں تک ممکن ہو، تحقیقات سے بھی فائدہ

اُٹھایا ہے - کہیں کہیں البتہ جدید ترین نظریوں کو وہ نظر انداز کرگئے ہیں - یا اُن مسائل کو تشنہ چھوڑ کے آگے بڑھ گئے ہیں جن پر زیادہ تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی —

مجموعی طور پر یہ کتاب ایک بہت کامیاب کوشش ہے - اور اُردو میں جنسی تعلقات کے موضوع پر قابل قدر اضافہ ہے — (+ +)

اُردو کے جدید رسالے

ہفتہ وار ہند

(اڈیٹر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی - کلکتہ - سالانہ قیمت پانچ روپے)

اگرچہ ہم ہفتہ وار یا روزانہ اخبارات پر تبصرہ نہیں کرتے لیکن "ہند" معمولی اخبار نہیں ہے - اس کا مقصد توہمات اور تعصبات کو مٹانا اور آزادی کا ولولہ پیدا کرنا ہے - اس کا اڈیٹر بے لاگ اور بے باک شخص ہے - وہ اپنی رائے کے اظہار میں کسی کی رو رعایت نہیں کرتا - اس کے قلم میں قوت اور بیان میں جوش ہے - اس اخبار میں مسائل حاضرہ پر پر زور تحریریں اور پر از معلومات مضامین ہوتے ہیں - علاوہ اس کے مختصر فسانے، نظمیں اور لطائف و ظرائف، تصاویر اور کارتون بھی ایسے ہوتے ہیں جو بصیرت افروز ہیں - اردو اخبارات میں

یہ خاص حیثیت اور خاص درجہ رکھتا ہے - اس کا سر ورق جس پر
شیر ببر کی تصویر بنی ہوئی ہے اس کے منشا کو صحیح طور پر ظاہر کرتا ہے - اس کے
متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ روزانہ " ہند جدید " کا بچہ ہے- ہم اُردو داں
طبقے سے خاص طور پر سفارش کرتے ہیں کہ وہ اس کی سرپرستی کرے -.اُس کا
مطالعہ ہر شخص کے لیے جو دنیا کے حالات سے باخبر رہنا اور زندگی کی جد و
جہد میں کسی صورت سے بھی حصہ لینا چاہتا ہے ' نہایت مفید ہوگا ـــ

*

اختر

(ماہانہ - دارالادب ہند' بل روڈ ' لاہور - سالانہ چندہ دو روپے چار آنے)

یہ لاہور سے ایک نیا رسالہ جاری ہوا ہے - اس کے مرتب کرنے
والے اختر شیرانی ' میاں محمد حسن بی - اے ' ایل ایل - بی '
محمد عمر فاروق ایم - اے ہیں - یہ "اُردو ادب و شعر کا ماہانہ مخزن"
ہے اور فی الحقیقت اسم با مسمیٰ ہے - یہ نوجوانوں کا رسالہ ہے - اس
کی تمہید (جو لمعات کے نام سے تحریر کی گئی ہے) پڑھ کر جی خوش
ہوا کہ نوجوان اب فرسودہ روایات اور رواج کی تاب نہیں لا سکتے '
وہ اردو ادب میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتے ہیں اور تقلید کے
پھندوں سے آزاد ہونا چاہتے ہیں - لیکن مضامین دیکھنے کے بعد اس کی
تصدیق نہ ہوئی - شاید آیندہ وہ اردو ادب کے پرانے کھنڈروں کو ڈھاکر
نئی تعمیر کی بنیاد ڈالیں - رسالہ بیشک دلچسپ ہے - لکھنے والوں کو
ذمہ داری کا احساس ہے - شروع میں سر محمد اقبال کی ایک چھوٹی
سی اردو نظم ہے جو بطور تبرک کے درج کی گئی ہے - پروفیسر

شیرانی صاحب اس رسالہ میں شاعر اور شکاری کی حیثیت میں جلوہ گر ہوے ہیں۔ اس کا بہت کم صاحبوں کو علم ہوگا کہ جیسے وہ زبردست نقاد اور ادیب ہیں ویسے ہی زبردست شکاری بھی ہیں۔ "حکایات شکار" کے نام سے ان کا مضمون اُن کی ضخیم کتاب کا ایک باب ہے ۔ یہ محض دل لگی کی باتیں نہیں ہیں بلکہ تاریخی تحقیق کے نکتے ہیں —
اتنے کم چندے میں بہترین رسالہ ہے —

سفیر سخن

(اڈیٹر ابوالکیف کیفی سرحدی ۔ پشاور ۔ چندہ سالانہ دو روپے)

یہ ماہانہ رسالہ پشاور سے آنریبل نواب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خاں صاحب کی سرپرستی میں شایع ہوا ہے ۔ اردو ادب کی دلچسپیوں کا مجموعہ ہے ۔ اور کوئی خاص بات نہیں ہے —

مرغ سحر

(اڈیٹر ڈاکٹر آئی ۔ بی ۔ ترک مان ۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ چار آنے ۔ ملنے کا پتہ — سکرٹری پولٹری اکسپرٹ نمبر ۱، سلطانپور روڈ لکھنؤ)

یہ ماہانہ رسالہ مرغیوں کے پالنے اور پرورش کرنے اور مرغیوں کی تجارت کے متعلق ہے ۔ خبریں بھی اس میں اسی فن کے متعلق ہوتی ہیں —

پھول جوبلی نمبر

(اڈیٹر شمس العلما مولوی سید ممتاز علی صاحب - لاهور - قیمت آٹھ آنے)

پھول بچوں کا عزیز رسالہ هے یہ اس کا جوبلی نمبر هے جو بڑے سلیقے اور خوش مذاقی سے مرتب کیا گیا هے - لکھائی چھپائی نہایت عمدہ هے - نظم و نثر کے مضامین جن میں بچوں کے لیے معلومات بھی هیں اور تفریح بھی، بہت خوبی سے جمع کیے گئے هیں - بچوں کے واسطے بہت اچھا تحفہ هے —

سالنامۂ کابل

یہ گذشتہ سالنامہ سے بھی زیادہ ضخیم اور پر از معلومات هے - افغانستان کے حالات اور وهاں کے نظم و نسق اور مختلف اداروں وغیرہ کے متعلق بہت تفصیلی معلومات درج هیں - علاوہ اس کے ممالک عالم کے حالات نیز مفید علمی اور تاریخی مضامین بھی جمع کئے گئے هیں - سیکڑوں رنگین تصویریں اور فوٹو اور کئی نقشے بھی هیں - اس کی ترتیب میں ارکان انجمن ادبی نے بڑی محنت اور قابلیت سے کام کیا هے اور اسے دیکھ کر اور پڑھ کر مسرت هوتی هے —

——— ❊ ———

اردو

چودھویں جلد　　　　سنہ ۱۹۳۴ ع

فہرستِ مضامین

مقالے

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۶	میرزا غالب کا غیر مطبوعہ خط	موسومہ نواب انوارالدولہ سعد الدین خان بہادر متخلص بہ شفق ' تلمیذ حضرت غالب	۱۹۳
۷	ولی کے سنہ وفات کی تحقیق	ایڈیٹر	۱۹۶
۸	خطبات گارساں دتاسی (اٹھارواں خطبہ)	جناب ڈاکٹر یوسف حسین خان صاحب	۲۳۷
۹	ٹیگور کے ادبی مضامین	جناب پنڈت ونشی دھروڈیا النکار صاحب	۲۸۹
۱۰	مرحوم دہلی کالج	جناب پنڈت منوہر لال زتشی صاحب ایم - اے '	۳۱۹
۱۱	لطیفۂ فرقت	جناب محمد اظہار الحسن صاحب بی اے ایل ایل بی وکیل غازی آباد	۳۲۴
۱۲	سودا کی حیات اور کلام کے متعلق غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں	جناب شیخ چاند صاحب ایم - اے ' ایل - ایل - بی	۳۴۱
۱۳	دہ مجلس کا اُردو ترجمہ	جناب کاشی پرشاد صاحب	۳۷۱
۱۴	شیخ ملا نصرتی ملک الشعراء بیجاپور نمبر (۲)	ایڈیٹر	۳۷۹
۱۵	کھڑی بولی	جناب پنڈت منوہر لال زتشی صاحب ایم - اے '	۴۶۷
۱۶	کھڑی بولی	جناب پنڈت ونشی دھروڈیا النکار صاحب	۴۷۱
۱۷	روسی ناول (پہلا دور)	جناب محمد مجیب صاحب بی - اے ' (آکسن)	۵۲۳
۱۸	ٹیگور کے ادبی مضامین	جناب پنڈت ونشی دھروڈیا النکار صاحب	۵۳۹

—(•)—

ادب

اُردو کے جدید رسالے

رسالوں کے خاص نمبر

زنانے رسالے

—(*)—

کتاب الطبیعیات

جلد سوم

کتاب النور

برائے

انٹر میڈیت

(جامعہ عثمانیہ)

از

مولوی محمد نصیر احمد صاحب عثمانی ، ایم ، اے ، بی ایس - سی (علیگ)
معلم طبیعیات کلیہ جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد دکن

عالیجناب مولوی محمد عبد الرحمن خان صاحب بی ایس - سی (لندن) اے آر ، سی ، ایس ، صدر کلیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن ، اس کتاب کی نسبت فرماتے ھیں —

کتاب النور زبان اردو میں اپنے طرز کی ایک نئی کتاب ھے —

مولوی محمد نصیر احمد صاحب معلم طبیعیات کلیہ جامعہ عثمانیہ نے اس کتاب کی تیاری میں ھند کی جامعات کے امتحانات انٹر میڈیت سائنس کے نصابوں کا پورا لحاظ رکھا ھے اور بڑی محنت سے طلبہ کی دقتوں کو رفع کرنے کی کوشش کی ھے - مجھے اُمید قوی ھے کہ اس کتاب کو پڑھ کر مبتدی نہ صرف نور کے مسائل بخوبی سمجھ سکیں گے ، بلکہ ان کو اس مضمون سے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کا شوق پیدا ھوگا - ۲۰۸ شکلیں ۳۳۷ صفحہ -

قیمت (تین روپے)

ملنے کا پتہ : — محمد سلیمان خان نمبر ۹۱۷ کلب روڈ ، چادر گھاٹ حیدرآباد دکن

دیگر تالیفات از مولوی محمد نصیر احمد صاحب عثمانی

(۱) کتاب الطبیعات - برائے انٹرمیڈیٹ

جلد اول - کتاب الخصواص والحرکت ...... (زیر تیاری)

جلد دوم - کتاب الحرارت والصوت ...... (زیر تیاری)

جلد سوم - کتاب النور ...... قیمت تین روپے

جلد چہارم - کتاب المقناطیس والبرق ...... (زیر طبع)

عنقریب شایع ہو جائے گی -

(۲) حرکت - برائے - بی - اے شائع کردہ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

(۳) افکار عصریہ - ترجمہ از انگریزی - اس کتاب میں مادہ، برق، روشنی، مقناطیس، اثیر وغیرہ کی ماہیت نہایت آسان پیرایہ اور سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے دارالمصنفین اعظم گڈہ کی طرف سے شایع ہورہی ہے عنقریب شایع ہوجائےگی

(زیر طبع)

(۴) حلقہ مسموم - سر آرتھر کانن ڈائل، مشہور انگریزی افسانہ نویس کے ایک دلآویز علمی قصہ کا ترجمہ، قابل دید - بار دوم ۱۲ آنے

(۵) وادی خوف - سر آرتھر کے ایک دوسرے ناول کا ترجمہ، اس میں شرلاک ہومز، مشہور سراغ رساں کے کارنامے ہیں، قابل دید باردوم ایک روپیہ ۴ آنے

منظورہ تعلیمات سرکارعالی برائے مدارس وکتب خانہ جات

(۶) خاندانی آسیب - سرآرتھر کے ایک تیسرے ناول کا ترجمہ اس میں بھی شرلاک ہومز کے کارنامے ہیں - قابل دید. ایک روپیہ ۴ آنے

(۷) دی پرابلم آف رورل اپلفٹ (انگریزی)

از محمد بشیر احمد، آئی، سی، ایس - دیہاتی ترقی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے نظیر کتاب ہے ...... دو روپیہ ۸ آنے

ملنے کا پتہ :- محمد سلیمان خان نمبر ۹۱۷ کلب روڈ، چادر گھاٹ حیدرآباد دکن

سائنس

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق "جو" نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہونگے، ان کو کسی قدر تفصیل کے بیان کیا جائے۔ ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ سات روپے سکۂ انگریزی (آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) نمونہ کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ انگریزی (یا دو روپے سکۂ عثمانیہ) — طلباء کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب (یا ہیڈ ماسٹر صاحب) انھیں پانچ روپے چار آنے سکۂ انگریزی (چھ روپے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندہ میں دیا جاتا ہے —

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد دکن

Vol. 14 October 1934 No. 56

The Urdu

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman -i-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

ABDUL HAQ, B. A. (ALIG.)

HONORARY SECRETARY

Anjuman -i- Tarraqqi -e- Urdu, Aurangabad. (Deccan.)

فہرستِ مضامین

:o:

روسی ناول

پہلا دور

میخائل یف گرافووچ سالتی کوف

از

[جناب محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)]

میخائل یف گرافووچ سالتی کوف (۱۸۲۶ - ۱۸۸۹) جو شچدرن کے نام سے بھی مشہور ہے تور کے ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوا - اس کا پہلا استاد پاول نامی ایک غلام کسان تھا جسے فن مصوری میں خاصا ملکہ تھا - اٹھارہ سال کی عمر میں سالتی کوف تسار کو لے سیلو کے کالج میں داخل ہوا اور وہاں سے فارغ ہوتے ہی اس نے اپنا پہلا ناول " ایک جھمیلا " لکھا ۔ سیاسی حاکموں کو اس ناول میں بہت سی باتیں قابل اعتراض معلوم ہوئیں ، اور اس کا نوجوان مصنف جلا وطن کر کے شہر ویاتکا کو بھیج دیا گیا - یہاں وہ سات سال تک رہا مگر واپسی پر اسے سرکاری ملازمت مل گئی - ملازمت میں اس نے خاصی ترقی کی اور ایک صوبے کا گورنر بھی مقرر ہوا ، لیکن اس کی طبیعت ملازمت کے لیے بالکل ناموزوں تھی ، اور ۱۸۶۸ میں وہ اس سے پیچھا چھڑا کر انشا پردازی میں مصروف ہوگیا - پہلے وہ اخبار " ہم عصر " کا مددگار ایڈیٹر ہوا ، اور جب وہ بند کرا دیا گیا تو شاعر نکراسوف کے ساتھ اخبار " سرگذشت وطن " کی ادارت میں

شریک ہوگیا - عمر کے آخری سالوں میں اسے ایک سخت بیماری ہوگئی جس نے اس کی زندگی تلخ کردی' مگر اس زمانے میں بھی اس نے اپنی تصانیف کا سلسلہ جاری رکھا - ویاتکا سے واپس ہوتے ہی اُس نے افسانوں کا ایک مجموعہ شایع کیا جس کا عنوان "مضافات کے مرقعے" تھا - ۱۸۷۶ میں اس کا ناول "حضرات گولوف لیف" چھپا جو اُس کی بہترین تصنیف مانا جاتا ہے - "تاشکنت والے" "ایک شہر کی تاریخ" "مضافات سے خطوط" "ہمارے زمانے کی شکل" وغیرہ اور افسانے ہیں جو اسی دور میں لکھے گئے - ۱۸۸۱ کے بعد کی تصانیف کہانیاں بڑے دن کی کہانیاں اور پوشے خونسک کی تاریخ ہیں - یہ تاریخ اس کی آخری ادبی خدمت تھی —

سالتی کوف کے پہلے ناول جھمیلے کو محض مشق سمجھنا چاہئے - اس وقت اسے زندگی کا مشاہدہ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا' اور اس کے ذہنی قویٰ بھی پوری نشو و نما نہیں پا سکے تھے - جلا وطنی میں اسے روسی زندگی کے مشاهدے کا بہت موقعہ ملا' اس کی سیرت بھی اس عرصے میں پختہ ہوگئی' اور جب اس نے پیٹر برگ واپس جاکر پھر قلم اٹھایا تو وہ اپنا کمال دکھا سکا - روسی ناول نویسوں اور انشاپردازوں میں جس کسی کا بھی سرکاری ملازموں سے سابقہ رہا اس نے اپنے آپ کو اُن کی سیرت اور ذہنیت کا خاکہ اتارنے پر مجبور پایا' اور سالتی کوف کے پہلے افسانوں کا موضوع انہیں لوگوں کی زندگی تھی - اس کی طبیعت طنز کی طرف مائل تھی لیکن وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اس کے افسانے پڑھ کر ہنسیں اور پھر انہیں بھول جائیں - اس کے طنز اور تضحیک میں ایک زہر تھا' وہ چاہتا تھا کہ یہ زہر ان لوگوں اور اس ذہنیت کے لئے مہلک ثابت ہو جن کا اس کے افسانوں میں ذکر ہے' اور سب کے دلوں میں

نفرت کا وهی جذبه پیدا هوجاے جو اس کے اپنے دل میں تھا - مفصلات کے مرقعے جب شائع هوے تو اصلاحی تحریک بہت زور پر تھی، ان افسانوں نے اور بھی اُدھم مچا دیا اور اصلاح کے حامیوں کا ایک زبردست هتھیار بن گئے - ۱۸۶۴ میں وہ انتظامی اصلاحیں جن کے لئے کوشش کی جا رهی تھی ایک حد تک ریاست کی طرف سے منظور هوگئیں، ۱۸۶۱ میں کسان آزاد کردئے گئے تھے اور ان دونوں اصلاحوں نے روسی زندگی کا رنگ بدل دیا - سالتی کوف کے افسانوں کا وہ سلسلہ جو ۱۸۶۱ سے شروع هوا پرانی زندگی کے باقی ماندہ آثار اور ان حالات کا نقشہ کھینچتا ہے جو نظام کے تغیرات نے پیدا کئے تھے - مفصلات کے مرقعوں کی طرح ان میں بھی وہ منصف بن کر بیٹھتا ہے، طرح طرح کے لوگوں کو اپنے سامنے بلا کر ناظرین کو ان کے اعمال نامے سناتا ہے، اور ان کو طنز اور تضحیک کے کوڑے لگاتا ہے - مختلف افسانوں میں مختلف جرموں کا پردہ چاک کیا جاتا ہے - ایک شہر کی تاریخ میں روس کی اصلاحی کوششوں اور ان کے انجام کا مضحک پہلو دکھاتا گیا ہے - پیٹر برگ کے دوران قیام میں مفصلات کے رهنے والے کا روزنامچہ وہ کیفیت ظاهر کرتا ہے جو روس کی نئی معاشرت ایک قدامت پسند زمیندار کے دل میں پیدا کرتی ہے - یہ بزرگ ایک بار تھیٹر جاتے هیں اور وهاں ایک خوبصورت ایکٹرس کودیکھتے هیں توانہیں اپنی بیکسی پر افسوس آتا ہے - ایک زمانہ تھا جب وہ قرب وجوار کی هر عورت کی نسبت کہہ سکتے تھے کہ وہ میری ملکیت ہے، میں اس کے ساتھ جو چاهوں کرسکتا هوں، کل یا ابھی فوراً، میں چاهوں تو اس کے بال کٹوا ڈالوں، چاهوں تو اپنے چرواہے آنتپ سے اس کا نکاح کرادوں - لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے، حکومت کے دن ختم هوگئے - وہ

ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ھیں "افسوس! اب ہم کسی کا کچھہ نہیں بگاڑ سکتے ' چاھے وہ مرضی ھی کیوں نہ ہو"! ان آثار قدیمہ کے ساتھہ ھی سالتی کوف نے ان لوگوں کے بھی مثالی نمونے لئے ھیں جو عہد تغیر کے خاص مظاہر تھے اور معاشرتی تبدیلیوں سے بہت جا اور بے جا فائدہ اٹھا رہے تھے - اس قسم کے لوگ زیادہ تر تاجر ٹھیکے دار' کارخانہ دار وغیرہ تھے ' اور سالتی کوف نے ان کی بے ایمانیاں ' ان کا کمینہ پن' ان کے ذلیل چال چلن اور ان کی بد اعمالیاں سب صاف صاف دکھائی ھیں اور اس طرح کہ اُن کی حمایت یا صفائی میں کچھہ بھی کہنے کی گنجائش نہیں رھتی - ان لوگوں سے بھی زیادہ سالتی کوف کو اُن تھوڑی بہت تعلیم ' تھوڑی بہت سمجھہ والے آدمیوں سے عداوت ھے جو لطیف اور اعلیٰ حوصلوں کو اپنے حیوانی سکون اور ادنیٰ نفسانی لذتوں پر قربان کرتے ھیں' جو بے انتہا بزدل ہوتے ھیں - مگر ان تمام شخصیتوں اور تحریکوں کی مخالفت پر فوراً کھڑے ہو جاتے ھیں جن سے ان کے سکون اور لطف اندوزی میں ذرا بھی خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا ھے ' اور جو اپنی مخالفت میں کسی کمینی حرکت یا جرم سے پرھیز نہیں کرتے - ایسے لوگوں کے لئے روس کی فضا بہت موزوں تھی اور روس کا کوئی خطہ اس آخور سے پاک نہیں تھا - سالتی کوف نے ان لوگوں کا خاکہ اتارنے میں بڑا کمال دکھایا ھے' اور اس کے طنز اور تضحیک کا زھر اور کسی کے لئے بھی ایسا قاتل نہیں معلوم ہوتا جتنا اس قسم کے لوگوں کے لئے -

۱۸۶۷ کے بعد سالتی کوف نے جو افسانے لکھے ان کا موضوع اس کے اپنے طبقے کے لوگ اور ان میں بھی خاص طور سے وہ حضرات تھے جو جدتوں کے بہت زیادہ دلدادہ تھے اور جنھوں نے ۱۸۶۱ اور ۱۸۶۴ کی اصلاحوں کی

بنا پر ایک بالکل ہی نئی دنیا بنا کر کھڑی کر دینے کے منصوبے باندھے تھے۔ ان تصانیف میں سالتی کوف کا مقصد طنز اور تضحیک نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ لوگ اور وہ سوسائٹی جس کی تصویر اتاری جارہی ہے دنیا میں صرف چند روز کی مہمان ہے اور وہ ان بیماریوں میں مبتلا ہو چکی ہے جو موت کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہیں۔ اسی سلسلے کا ایک ناول " حضرات گولوف لیف " سالتی کوف کی بہترین تصنیف ہے ' اور اس کا زیادہ تفصیل کے ساتھہ ذکر کرنا ضروری ہے ۔

" حضرات گولوف لیف " ۱۸۶۱ سے پہلے کے زمینداروں کے ایک خاندان کا قصہ ہے ۔ جس وقت داستان شروع ہوتی ہے ' اس خاندان کے بزرگ ولاجمیر میخائلووچ گولوف لیف بوڑھے اور مضمحل ہو چکے ہیں ' دن رات پلنگ پر پڑے رہتے ہیں اور صرف کبھی کبھی جب جوش آتا ہے تو دل کی کدورت نکالنے کے لئے اپنی بیوی کے کمرے تک لڑکھڑاتے ہوئے جاتے ہیں۔ اس کے دروازے سے ذرا سر نکال کر زور سے " چڑیل " یا " بھتنی " کہہ کر پکارتے ہیں' اور پھر بھاگ کر اپنے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کی بیوی ارینا پترووننا ان دیوانی حرکتوں کی عادی ہے ۔ شادی کے کچھہ دن بعد ہی اسے اپنے شوہر کی سیرت کا پتہ چل گیا تھا اور تبھی سے وہ اپنے شوہر کو جائداد اور گھر گرستی کے معاملات سے بے دخل کر کے خود حاکم اور قادر دل بن بیٹھی تھی ۔ ولاجمیر میخائلووچ کو جو اپاہج اور کمزور طبیعت کے آدمی تھے' مطلق کوئی شکایت نہ ہوتی اگر ایرینا پترووننا نے صرف حکومت پر قناعت کی ہوتی۔ مگر ارینا پترووننا نے ان کی شراب اور تمباکو بھی بند کردی ۔ اور کفایت شعاری کو اس حد تک پہنچا دیا کہ گھر میں کسی کو کبھی پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا تھا اور جو کچھہ ملتا تھا وہ بھی ایسا کہ کوئی بھلا مانس

اسے رغبت سے نہ کہاسکے - اس نے اپنا مقصد تو حاصل کرلیا - خاندانی جائداد جو پہلے بہت حقیر تھی' رفتہ رفتہ بڑھتی گئی' اور وہ چند ہزار کسانوں کی مالک بن گئی' مگر یہ دولت بہت گراں ملي - اسے حاصل کرنے کے لئے اریٹا پٹروفنا نے محبت اور سلوک کرنا ایسا چھوڑا کہ اس کا نام تک بھول گئی - ولاجمیر میخائلووچ تو اسے چڑیل اور بھتنی کہتے ہی تھے' اس کے بچوں کو بھی اس سے کوئی محبت نہیں ہوئی - دنیا میں کوئی شخص نہیں تھا جس پر اُس نے کوئی احسان کیا ہو' چھوٹے بڑے لوگوں میں کسی سے اس کے مراسم نہیں تھے اوراس کے ہمسائے سب جانتے تھے کہ وہ اسی کی منتظر بیٹھی رہتی ہے کہ ان میں سے کوئی مالی دشواریوں یا اور کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو وہ اس کی جائداد اونے پونے خرید لے - اگر اریٹا پٹروفنا کے دل کو انسانی ہمدردی یا محبت چھو بھی گئی ہوتی تو وہ محسوس کرتی کہ اس نے اپنے اصولوں پر چل کر کیا کھویا اور کیا پایا ہے' لیکن اس کا کوئی امکان نہ تھا - اس کا بڑا لڑکا ستپان بچپن بھر اُسے گالیاں دیتا رہا' اور اگرچہ گھر میں سب جانتے تھے کہ وہ بہت نیک اور با مروت ہے' اریٹاپٹروفنا نے طے کرلیا کہ وہ باپ کی طرح دیوانہ اور احسان فراموش ہے اور خود بھی اس کے نام دھرنے لگی - جب وہ تعلیم ختم‌کرکے نوکری کی تلاش میں ماسکو اور پیٹر برگ گیا اور چار سال تک کوشش کرنے کے باوجود ناکامیاب رہا تو اریٹا پٹروفنا نے سمجھہ لیا کہ یہ محض اس کی نالائقی ہے اور یہ نہ سوچا کہ اس کی ناکامیابی کا اصل سبب یہ ہے کہ اس کا کوئی سرپرست اور پرسان حال نہیں' کیونکہ گولوف لیف خاندان کو یا تو کوئی جانتا نہیں تھا اور جو جانتا تھا وہ اس سے نفرت کرتا تھا - اریٹاپٹروفنا کو بیٹے سے زیادہ اپنے روپے اور جائداد کی فکر تھی' اور جائداد محفوظ

دکھلنے کے لیے اس نے حق اور محبت کے تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا- جب ستپان نوکری کی تلاش میں نکلا تو اس نے اس کے لیے ماہوار جیب خرچ مقرر کردیا، مگر اتنا کم کہ اس پر گذر کرنا محال تھا - اس کی ناکامیابی کی خبر سن کر ارینا پٹروفنا نے اسے ایک مکان جو اس نے ماسکو میں خریدا تھا دے دیا اور حکم دیا کہ اس کے کرائے پر گذر کرو - لیکن ستپان گھر پر اس طرح قید رہا تھا کہ آزاد ہو کر وہ اپنی طبیعت کو قابو میں نہ رکھہ سکا، اور آخرکار اسے اپنا قرضہ ادا کرنے کے لیے مکان بیچ دینا پڑا-اس کے بعد گھر واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا- جب وہ گھر واپس آیا تو ارینا پٹروفنا نے اسے رہنے کو ایک کمرہ تو دے دیا مگر اس میں رات کو روشنی کرانا یا سردی کم کرنے کو آگ جلوانا ضروری نہیں سمجھا اور میز پر سے جو کچھہ بچ رہتا وہی کھانے کو بھجوا دیتی - اس تواضع کا انجام یہ ہوا کہ ستپان، جسے پہلے سے دق کی بیماری تھی، چند مہینے کے اندر مر گیا- اس کی موت بھی ارنیا پٹروفنا کو ایک خلاف عقل حرکت معلوم ہوئی، گو اُس نے اکثر اسے کھانستے سنا تھا اور یہ بھی جانتی تھی کہ اس کے پاس پہننے اوڑھنے کا سامان کافی نہیں - ارینا پٹروفنا کی لڑکی آننا نے بھی اسے ستپان کی طرح "مایوس" کیا- جب وہ تعلیم سے فارغ ہوئی تو اس نے اس کو انتظامی معاملات میں اپنا مددگار بنانا چاہا - لیکن اس سے نہ خاندانی رواج کے مطابق بھوکا رہا گیا نہ گھر کی بے لطف اور بے رونق زندگی برداشت ہوسکی، اور وہ ایک ادنیٰ فوجی افسر کے ساتھہ بھاگ گئی- ارینا پٹروفنا نے اسے "ماں کی دعائے خیر" سے محروم رکھا، مگر اپنی نیکی اور حق پرستی جتانے کے لیے اسے ایک ٹوٹا پھوٹا مکان اور تھوڑی سی زمین دے دی- تین چار سال بعد وہ دو لڑکیاں،

لیوبا اور آننا ' چھوڑ کر مرگئی - ارینا پتروفنا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا - " خدا کے کرم کی کوئی انتہا نہیں ...... ایک لڑکی چھین لی اور دو دے دیں " - اور وہ شکایت کیوں نہ کرتی - بچوں کی پرورش سے انکار کرنے کی اجازت اُسے نہ اُس کے اصول دیتے تھے نہ نیک نامی کا خیال —

ستپان، اور آننا کے علاوہ ارینا پتروفنا کے دو لڑکے اور تھے ' پورفیری اور پاول - پاول کی طبیعت پر جمود اس قدر حاوی تھا کہ اس کے لیے بات کرنا بھی ایک دقت طلب کام تھا ' اور اس کی عمر کھانے پینے اور خاموش بیٹھے رہنے میں گذرتی تھی - مگر پورفیری ہر اعتبار سے اپنی ماں کا بیٹا تھا - کفایت شعاری اور اصولوں کی پابندی میں وہ ارینا پتروفنا سے کچھ کم نہ تھا ' اور بچپن سے عجزوانکسار کا مجسمہ بن کر ماں کی خوشامد کرنا ' دل کی بات چھپانا اور ہر وقت ماں کا حکم بجا لانے پر مستعد رہنا اس کا قاعدہ تھا - ارینا پتروفنا کے دل میں ہمیشہ یہ کھٹکا رہا کہ پورفیری کی اطاعت گذاری ' خوشامد اور محبت محض دکھاوا ہے ' مگر پورفیری نے اسے کبھی کسی معاملے میں شکایت کا موقع نہیں دیا - اس کے برخلاف پاول نے کبھی اسے کسی بات سے خوش نہیں کیا بلکہ ہر وقت یہ ظاہر کرتا رہا کہ اسے ماں سے گہری دلی نفرت ہے - اس برتاو کے باوجود ارینا پتروفنا کو پاول سے زیادہ لگاو تھا ' لیکن جب کبھی لڑکوں کو کچھ دینے کا موقع آتا تو وہ پورفیری کو اوروں سے زیادہ دینے پر مجبور ہو جاتی - چنانچہ آخر میں جب جائداد کا بٹوارا ہوا تب بھی پورفیری کو اپنے بھائی سے بہت بہتر حصہ ملا —

پورفیری کو اس کے بھائی بہن بچپن سے " سود خوار " اور " جونک " کہتے چلے آئے تھے اور ارینا پتروفنا کو بڑھاپے میں جائداد تقسیم کرنے کے

بعد معلوم ہوگیا کہ کفایت شعاری اور اصولوں کی پابندی میں وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے' اسے باتیں کرنے کا شوق ہے ' اور اس سے بھی زیادہ باتیں بنانے کا اور گو وہ ہر وقت شاندار اصطلاحیں استعمال کرتا ہے ' وہ اپنے فائدے کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا اور اس کی ہوس اتنی شدید ہے کہ وہ کسی کی خاطر اپنا حق چھوڑنے پر راضی نہیں ہوسکتا - اسی وجہ سے جب جائداد کے بٹوارے کے کئی سال بعد پاول بیمار پڑا تو اریناپترو فنا اس کے یہاں گئی اور باوجودیکہ وہ اس کے منہ پر اسے اور پورفیری کو گالیاں دیتا تھا' وہ اس کی تیمارداری کرتی رہی اور اس کی جان کے لیے دعائیں مانگتی رہی - لیکن پاول مرگیا اور جس پھرتی سے پورفیری بھائی کے قریب مرگ ہونے کی خبر سن کر اس کے مکان پر' پہنچا جس انداز سے اس نے بھائی کی موت پر ہر چیز کا جائزہ لیا' اور اس گاڑی کی نسبت جس پر اریناپترو فنا وہاں آئی تھی اور جو اس کی ذاتی ملکیت تھی کئی بار اس سے اور دوسروں سے دریافت کیا کہ وہ درحقیقت کس کی ہے' اس اندیشے میں کہ وہ کہیں پاول کی نہ ہو اور اریناپترو فنا اس پر ناجائز قبضہ نہ کرلے - ان سب باتوں سے اریناپترو فنا کے دل کو بہت صدمہ پہنچا - جب وہ پاول کی تجہیز و تکفین کے بعد اپنے گھر واپس ہوئی تو اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ پورفیری کی صورت پھر کبھی نہ دیکھوں گی —

پورفیری دراصل "حضرات گولوف لیف" کا ہیرو ہے اور ناول کا مقصد زیادہ تر اسی کی سیرت کا ہر پہلو دکھانا ہے - پاول کی موت تک اس کی سیرت کا صرف ایک پہلو ظاہر ہوا تھا اور وہ اس کی زمانہ سازی' خوشامد' میٹھے اور پر تکلف الفاظ میں اپنا مطلب چھپانے اور اپنی غرض

پوری کرنے کے لیے ہر قسم کی بے عزتی برداشت کرنے کی صلاحیت تھی - جب پاول کے مرنے پر وہ اپنی بھانجیوں کی تھوڑی سی زمین اور بوسیدہ مکان کے علاوہ اریناپتروفنا کی کل جائداد کا مالک ہوگیا تو اس کی سیرت اپنے اصل رنگ میں نظر آئی - اس میں یہ صفت ضرور تھی ' جسے وہ کسی موقع پر بیان کرنے سے چوکتا نہیں تھا ' کہ وہ دوسروں کا حق مارنا ناجائز سمجھتا تھا ' اور اس کی ملکیت میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو اخلاقاً یا قانوناً کسی دوسرے کا حق ثابت کی جاسکے - لیکن اس کے ساتھ ہی وہ نہایت ہی سنگ دل اور خود غرض تھا ' اور اس نے اپنے لئے جو اصول مقرر کئے تھے وہ قانوناً نہیں تو اخلاقاً جرم اور بے رحمی کا ایک فلسفہ تھے - اس کے بڑے لڑکے ولاجمیر نے پیٹربرگ میں ایک لڑکی سے نکاح کرلیا اور پورفیری نے جھٹ اس کا گذارا بند کردیا ' کیونکہ ولاجمیر نے صرف یہ لکھا تھا کہ میں فلاں لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں ' شادی کرنے کی اجازت نہیں مانگی تھی - گذارا بند ہو جانے پر ولاجمیر بالکل محتاج ہوگیا ' اور مایوسی میں اس نے خود کشی کرلی - پورفیری کے چھوٹے لڑکے پیوتر نے سرکاری روپیہ جوے میں اُڑادیا ' اور جب اس کی خیانت پکڑی گئی تو وہ بھاگا ہوا باپ کے پاس مدد کے لیے آیا - اس کی مدد نہ کرنے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ یا تو خودکشی کرلیتا یا اگر اس کی ہمت نہ کرسکتا تو قید کردیا جاتا اور اس کی زندگی برباد ہو جاتی - لیکن پورفیری نے اس کی مدد کرنے سے قطعی انکار کردیا ' اسے قید کی سزا ہوگئی اور وہ چند مہینے بعد قیدیوں کے ایک ہسپتال میں مرگیا - پورفیری کی بھانجیاں لیوبا اور آننا جب بڑی ہوئیں اور انہوں نے بڑے حوصلے لیکر زندگی کے میدان میں قدم رکھا تو انہیں مالی امداد کی سخت ضرورت پڑی ' کیونکہ

ان کی اپنی جائداد بہت تھوڑی تھی - مگر پورفیری نے کبھی انھیں ایک کوڑی نہیں دی - انھیں ناٹک کے فن سے شوق تھا ' اگر ان کی سرپرستی کی جاتی تو ممکن تھا وہ ماسکو یا پٹربرگ کے کسی تھیٹر میں لے لی جاتیں ' اپنی استعداد کے مطابق ترقی کرتیں اور ان کے اخلاق پر کوئی برا اثر نہ پڑتا - لیکن مفلسی کی وجہ سے انھیں مفصلات کے تھیٹروں میں ایکٹ کرنا پڑا ' جہاں وہ بہت بری صحبت میں پڑگئیں - ناکامیابی ' مایوسی اور صحبت کے اثر نے ان کے اخلاق کو بگاڑ دیا - انھوں نے شراب خواری اور عیاشی شروع کردی اور آخر میں دونوں بہت ذلیل قسم کی رنڈیاں ہوگئیں - بڑی بہن لیوبا نے جب دیکھا کہ ذلت کے باوجود بھی پیٹ بھر کھانے کو نہیں ملتا تو اس نے زہر پی لیا ' چھوٹی بہن آننا کا بھی یہی ارادہ تھا ' مگر آخر وقت میں وہ ہمت ہار گئی اور اس نے چار و ناچار ماموں کے یہاں آکر پناہ لی -

دو جوان بھتیوں اور ایک بھانجی کی موت اور مسلسل تنہائی کی زندگی پورفیری نے کیسے برداشت کی ؟ اگر دوسرے انسانوں کی طرح وہ بھی دل رکھتا تھا تو اس نے ایسی کنجوسی اور خود غرضی کو کیسے گوارا کیا جس سے سارا خاندان تباہ ہوا اور کوئی بھی ایسا نہ رہ گیا جو دو پشتوں کی کفایت شعاری کا شکریہ ادا کرتا ؟ یہ معما پورفیری کی مذہبیت حل کرتی ہے - اریناپٹرونٹا کو دولت کی ہوس نے کنجوس اور سنگدل بنا دیا تھا اور اسی وجہ سے آخر میں اُسے پشیمانی ہوئی اور اس کے دل کو صدمے پہنچے - پورفیری نے اپنے اصولوں کی بنیاد مذہب پر رکھی تھی اور یہ بنیاد بہت مستحکم ہوا کرتی ہے - اس کی مذہبیت دوسروں کو محض مکاری اور ریاکاری معلوم ہوتی تھی ' اس کی پارسائی اور عبادت گذاری صرف ایک نفرت انگیز نمائش - دوسرے اس کی حاضر جوابی کو چالاکی اور عیاری سمجھتے تھے اور ان

مسلمہ اخلاقی اصولوں کو جو پورفیری کی زبان پر ہر وقت رہتے تھے اخراجات اور ذمہ داریوں سے بچنے کی ایک ترکیب اور بد اعمالیوں کو چھپانے کا ایک ذریعہ خیال کرتے تھے - لیکن پورفیری کی کٹر مذہبیت اور وہ اصول جنھیں بیان کرنے میں وہ اس قدر مشاق تھا' اس کے ضمیر کو راضی اور اس کے دل کو پرسکون رکھتے تھے اور وہ صدمے جو کسی دوسرے کی کمر توڑ دیتے اسے دراصل محسوس ہی نہیں ہوئے - عمر کے ساتھہ پورفیری کی دنیا تنگ ہوتی گئی' اس میں تجربہ حاصل کرنے کی مطلق صلاحیت نہیں رہی اور وہ ذہنی قویٰ جنھیں اس کی مسلسل تنہائی نے اظہار اور استعمال سے محروم رکھا تھا فضول بکواس کرنے کے بیہودہ مرض کی صورت میں اپنا زور دکھانے لگے - سوا ان چند گھنٹوں کے جو پورفیری گھر اور جائداد کا حساب کتاب دیکھنے میں صرف کرتا تھا اس کا سارا دن اور رات کا ایک خاصا حصہ کھاتے اور بکواس کرتے گذرتا تھا' اور یہ بکواس بھی ایسی لغو اور فضول ہوتی تھی کہ اسے سننے پر مجبور کرنا سخت سے سخت سزا تھی جو وہ کسی عزیز یا معتوب شخص یا دشمن کو دے سکتا تھا - لیکن وہی مذہبیت جس نے اس کے دل کو درد اور ہمدردی سے بیگانہ کردیا تھا اس کی خود پسندی کو بھی اپنی گود میں پالتی رہی؛ اور جس طرح پورفیری کو یقین تھا کہ اس نے دوسروں کے ساتھہ جو سلوک کیا وہ صحیح تھا ویسے ہی وہ اپنی زندگی اور طرز معاشرت سے بالکل مطمئن رہا اور اسے بے چین کرنے کو نہ کوئی حسرت پاس پھٹکی نہ امنگ -

آخر میں جب پورفیری کی بھانجی آننا ذلیل اور بیمار ہوکر اس کے یہاں رہنے کو آئی اور ایک مرتبہ رات کے تیسرے پہر پورفیری نے اسے اپنی ملازمہ یف پراکسیا کے ساتھہ بیٹھے شراب پیتے اور گندے گیت

کاتے پکڑا تو پورفیری کے معمول میں ایک تبدیلی ہوگئی اور وہ یہ کہ رات کو وہ آننا کے ساتھہ بیٹھہ کر شراب پینے لگا - شراب اور نشے کی خواهش اس بنیاد کے کمزور پڑنے کی پہلی نشانی تھی جس پر پورفیری نے اپنے فلسفۂ حیات کو تعمیر کیا تھا' اس قلعے کی دیوار کی پہلی دراڑ جس میں وہ اب تک محفوظ رہا تھا - آننا شراب پی کر بالکل مست ہوجاتی' نشے میں پورفیری کو خوب جی کھول کر گالیاں دیتی اور اپنی' اپنی بہن اور اپنے ماموں زاد بھائیوں کی تباهی اور بربادی کا سارا الزام اسی کے سر لگاتی - پورفیری پہلے تو جواب دیتا اور اپنی صفائی کرتا رہا لیکن نشے میں بحث کرنا اور دوسرے کو قائل کرنا دشوار ہوتا ہے' رفتہ رفتہ پورفیری کے دل میں کچھہ شک سا پیدا ہوگیا اور آخر کار آننا کی شکایتوں اور گالیوں نے اس پر اتنا اثر کیا کہ اسے اپنا پچھلا طرز عمل غلط معلوم ہونے لگا - یہ احساس گویا اس کے لئے موت کا پیغام تھا اور کچھہ دنوں بعد وہ واقعی موت کی آرزو کرنے لگا - لیکن موت نہیں آئی اور دنیا سے نجات حاصل کرنے کے لئے پورفیری کو اپنے ہاتھوں اپنی جان لینی پڑی —

سالتی کوف نے حضرات گولوف لیف میں صرف حقیقت نگاری کا کمال اور نفس انسانی کا ہر پہلو جانچنے اور پہچاننے میں مہارت نہیں دکھائی بلکہ مذہبی جذبے کا ایک روگ بھی ظاہر کر دیا جو سچی مذہبیت کا سب سے بڑا دشمن ہے' جو صرف عقیدت کی جڑ نہیں کاٹ دیتا بلکہ ان لوگوں کے روحانی تنزل کا باعث ہوا ہے جو مذہبی ہونے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں - اگر پورفیری محض مکار یا ریاکار ہوتا' اگر اس کی دینداری محض نمائشی ہوتی اور وہ کہتا کچھہ اور کرتا کچھہ تو

وہ عیاروں اور دغابازوں میں شمار ہوتا اور اس کی سیرت ہمارے لئے اتنی سبق آموز اور عبرت انگیز نہ ہوتی۔ لیکن پورفیری کے خلوص سے انکار نہیں کیا جاسکتا - اس کی خود پسندی اور خود پرستی صرف تکبر یا مزاج کا ایک عیب نہیں بلکہ اس کی عقیدت اور گہری مذہبیت کا دوسرا رخ ہے - اس کی سنگدلی میں اس بھیانک ذہنی بیماری کی ایک جھلک بھی نہیں نظر آتی جو دوسروں کے درد اور تکلیف کو لطف اندوزی کا ذریعہ بنادیتی ہے بلکہ یہ بھی اُس کے اصولوں اور عقیدوں کا ایک لازمی نتیجہ ہے اور اس کی سیرت دیکھتے ہوے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ سنگدل نہ ہوتا تو اپنے عقیدے پر قائم نہ رہ سکتا - یہی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے اس کی سیرت اور سرگذشت ہمارے لئے خاص طور سے سبق آموز ہوجاتی ہے - انسان کو صرف جھوٹی مذہبیت سے نہیں بچنا چاہئے بلکہ اس خلوص سے بھی جو درد اور محبت کے سامنے سر نہ جھکائے -

سالتی کوف کی تصانیف کے تیسرے دور میں نہ اس کے پہلے افسانوں کا طنز اور تضحیک ہے ' نہ " حضرات گولوف لیف " کی طرح سوسائٹی اور انسانی ذہنیت پر تنقید - " کہانیوں " کے مجموعے میں زیادہ تر ۱۸۶۱ سے پہلے کی کسانوں کی زندگی دکھائی گئی ہے اور مصنف کا مقصد نکتہ چینی نہیں بلکہ ہمدردی کا جذبہ بیدار کرنا اور نظر میں وسعت پیدا کرنا معلوم ہوتا ہے - " بڑے دن کی کہانیاں " مذہبیت سے لبریز ہیں اور یہ وہ مذہبیت ہے جو ضمیر کو روشن ' دل کو محبت کے نشے سے چور کردیتی ہے اور ایثار کی تیز آگ میں اس تمام آخور کو جلا کر خاک کردیتی ہے جو انسان کی طبیعت میں اسی طرح خود بخود جمع ہوتا رہتا ہے جیسے اس کے جسم پر میل - سالتی کوف کے دل پر اس وقت وہی کیفیت گذر رہی تھی

جس نے گوگول کو انشاپردازی سے توبہ کرائی تھی اور وہ بھی اپنے آپ کو عمر بھر کی طنزیہ تنقید اور تضحیک کا اس صورت سے کفارہ ادا کر رہا تھا- یہ ارادہ سب سے زیادہ اس کے آخری ناول " پوشے خونسک کی تاریخ " میں نمایاں ہے - یہ " تاریخ " اُس نے دل سے تمام شکایتیں نکال کر اور نظر کو عیب جوئی کی عادت سے پاک کرکے لکھی تھی - اس میں پرانے طرز کی زندگی اور پرانا فلسفۂ حیات اسی طرح کے شاعرانہ رنگ روپ میں دکھائی دیتا ہے جیسے اک کوف کی " خاندانی داستان " میں - سالتی کوف گویا دنیا سے رخصت ہوتے ہوئے کہا سنا معاف کرانا چاہتا تھا اور اپنے قلم اور تخیل سے اپنے خلوص کی شہادت دلوا رہا تھا - اس کا شمار روس کے سب سے زیادہ تلخ زبان اور سخت گیر نقادوں میں ہوتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اس کی محبت اور ہمدردی کا رشتہ دوبارہ قائم کرنے کی اس کوشش کو بھی یاد رکھنا چاہئے —

روسی ناول

از

جناب محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)

پہلا دور

لسکوت

نکولائی سیمیونووچ لسکوف صوبہ اورل کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ معمولی حیثیت کا سرکاری ملازم تھا، مگر ماں رئیس خاندان سے تھی اور لسکوف کا بچپن عام زمینداروں کے بچوں کی طرح گذرا۔ وہ سولہ سال کا تھا کہ اس کے ماں باپ دونوں کا انتقال ہوگیا اور وہ اسکول چھوڑ کر ملازمت کرنے پر مجبور ہوا۔ کچھ سال بعد وہ ایک انگریز مسٹر اسکاٹ کے کاروبار میں شریک ہوگیا، روس اور بیرونی ملکوں میں بہت سفر کرتا رہا، اور اس طرح اسے روسی فطرت اور معاشرت کے مطالعے کا نہایت اچھا موقع ملا۔ ۱۸۶۰ء میں اس نے مضمون نگاری شروع کردی اور دو سال مشق کرکے اخبار نویسی کے ارادے سے پیٹربرگ گیا۔ اخباروں اور رسالوں نے انشاپرداز کی حیثیت سے اس کی خاصی قدر کی مگر لسکوف سیاسی فرقہ بندیوں سے بالکل الگ رہنا چاہتا تھا اس لئے اخبار نویسی کے میدان میں اس کے قدم کبھی جم نہیں سکتے تھے۔ انتہا پسند فرقے کے اخباروں نے اسے ایک مضمون کی بنا پر بائی کاٹ کردیا اور اس بائی کاٹ

کا نتیجہ صرف یہ نہیں ہوا کہ اس کے مضامین کا ان اخباروں میں چھپنا بند ہوگیا بلکہ اس کی ادبی تصانیف بھی عام طور پر نقادوں کی توجہ سے محروم رہیں۔ لسکوف نے اخبار نویسی رفتہ رفتہ چھوڑ دی مگر اس کے ناولوں اور افسانوں کا سلسلہ جاری رہا - ۱۸۶۳ میں اس کا پہلا افسانہ شایع ہوا، اس کے دوسرے سال "پس و پیش" اور ۱۸۷۱ میں "چھری کٹاری" - یہ دونوں ناول سیاسی تھے اور ان کی وجہ سے لسکوف انتہا پسند حلقوں میں بالکل مردود ہوگیا - "چھری کٹاری" کے بعد لسکوف دامن جھاڑ کر سیاسی مباحثوں سے علحیدہ ہوگیا - "گرجا والے" جو شائع ہوا بہت مقبول ہوا اور اس کے علاوہ لسکوف نے روسی کلیسا اور پادریوں کے رہن سہن پر جو افسانے لکھے وہ بھی بہت پسند کئے گئے - کلیسائی مذہب کی طرفداری کرنے سے اس نے دربار کے بہت سے سربر آوردہ لوگوں کو خوش کردیا، اور خود ملکہ کے اثر سے اسے سرکاری مذہب کی حمایت کرنے کے معاوضے میں ایک عہدہ مل گیا جس میں تنخواہ وصول کرنے کے سوا کوئی کام نہ تھا - مگر ملکہ کی یہ سرپرستی ایک غلط فہمی پر مبنی تھی اور جب لسکوف نے کلیسا والوں کا مذاق اڑانا شروع کیا اور اس کی آزاد خیالی میں کوئی شک نہیں رہا تو وہ عہدے سے برطرف کردیا گیا - آخر عمر میں لسکوف پر تالستای کی شخصیت کا بہت اثر ہوگیا - گرو چیلے کے خیالات اور ذہنیت میں بہت فرق تھا مگر لسکوف اپنے خاص طرز پر تالستای کی اخلاقی تعلیم کا پرچار کرتا رہا —

مصنفوں کو مشہور اور بدنام کرانے میں نقادوں کی رائے کو بہت دخل ہوتا ہے اور روس میں عام رائے بالکل نقادوں کے اشارے پر چلتی تھی - لیکن نقادوں کی عداوت کے باوجود لسکوف کی تصانیف مقبول اور

ہر دلعزیز رہیں اور سیاسی حادثوں اور خیالات کے تغیر سے اس
ہردلعزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا - یہ کامیابی لسکوف کے ناولوں کی
بہترین تعریف ہے اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ روسی قوم کیسی
خوش مذاق اور قدردان ہے جو اپنے ذہنی رہنماؤں کی ممانعت پر بھی
لسکوف کی قدر کرتی رہی - اور اس معاملے میں عام ناظرین کی رائے
نقادوں سے زیادہ صحیح تھی - روسی نقاد لسکوف کو قدامت پرست اور
روشن خیالی اور ذہنی آزادی کا دشمن سمجھتے تھے ' مگر وہ غلطی پر
تھے - لسکوف میں صرف ایک ضد تھی جو اسے اچھی چیز کا برا پہلو بھی
دکھانے پر مجبور کرتی تھی ' اور اگر اس نے انقلابیوں کا اکثر مذاق اڑایا
تو قدامت پسندوں کو بھی نہیں چھوڑا - لیکن روسی نقادوں کو ایسی
حقیقت نگاری جس میں انسان اور انسانی زندگی کے اعلی حوصلے اور
گہرے روحانی مسائل نظر انداز کئے گئے ہوں یا جس سے کوئی اخلاقی
یا سیاسی عقیدے اخذ نہ کئے جاسکیں ہمیشہ ناگوار معلوم ہوتی تھی ' اس
لئے کہ ناول اور افسانے ہی ایک ذریعہ تھے جس سے قوم میں اخلاقی
اور سیاسی عقیدے وغیرہ پھیلائے جاسکتے تھے ' اور جو مصنف ناول محض
قصہ سنانے کے لئے لکھتا اور تعلیم یا اصلاح اس کی غرض نہ ہوتی وہ
انہیں اوچھا اور پست ہمت ' اپنی قوم کے مستقبل سے بے پروا ' اور اس
کی کامیابی کے رستے میں ایک رکاوٹ معلوم ہوتا تھا - ایک حد تک تو
ان کا ناول نویسوں سے رہبری اور اصلاح کی توقع کرنا بجا تھا -
روسی حقیقت نگاری اگر عام انگریزی یا فرانسیسی طرز کے مقابلے میں
بہت زیادہ بلند اور قابل قدر ہے تو اسی وجہ سے کہ اس کے مقاصد
بہت اعلی ہیں اور وہ محض سطحی زندگی کی عکاسی نہیں ہے - لسکوف

پر روسی ناول کے معیار میں فرق ڈالنے کا الزام ضرور آتا ہے' لیکن اس میں خوبیاں بھی اتنی ہیں کہ ہم یہ خطا معاف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں ــــ

لسکوف کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کی زبان ہے - اس نے و پاکیزگی اور فصاحت جو تورگنیف کی تصانیف میں عروج پر پہنچی اور جس کا دستہ ٹیف سکی کے سوا ہر روسی انشا پرداز نے حوصلہ کیا بالکل ترک کردی اور اس کے ناولوں میں انوکھے اور شاذ محاورے' عجیب عجیب اصطلاحیں' ایہام اور مستعمل مگر غلط الفاظ کثرت سے ملتے ہیں - یہ خاص انداز بیان اس کی عبارت کو کسی قدر مشکل ضرور کر دیتا ہے لیکن اس کی وجہ سے اس کی زبان بہت رنگین اور دلچسپ ہو جاتی ہے' اور اس کے قصے پڑھنے میں ایک خاص مزہ آتا ہے' کیونکہ قصے اور انداز بیان میں ایک لطیف مناسبت ہوتی ہے - لسکوف کی دوسری صفت اس کی داستان کی شوخی اور رنگارنگی ہے - اس کی تصانیف کی فضا اس مایوسی اور حزن سے پاک ہے جو روسی انشا پردازوں میں عام طور سے پائی جاتی ہے' وہ ناول اور افسانے قصہ سنانے کی غرض سے لکھتا ہے اور اس کے قصے ایک اہمیت اور دلچسپی رکھتے ہیں جس کا فلسفے یا اخلاقی اور سماجی مقاصد سے کوئی واسطہ نہیں - یوں اس کی نظر ہمیشہ قصے پر جسی رہتی ہے' اس نے اپنے ناولوں کی آرائش سیاسی اور اخلاقی نظریوں سے نہیں کی ہے بلکہ ان حادثوں اور واقعات سے جن سے اس کا ہر ناول لبالب بھرا ہوتا ہے - یہ واقعات اور حادثے اکثر مضحک ہوتے ہیں اور لسکوف اپنے کیرکٹروں کا مذاق اڑانے سے کبھی نہیں چوکتا' خواہ وہ دل میں ان کی کتنی ہی قدر کرتا ہو اور اپنے ناظرین سے

ان کا ادب کرانا چاھتا ھو - نقادوں نے یہ انداز دیکھہ کر ھمیشہ کے لئے طے کر لیا کہ وہ محض ایک مسخرہ ھے ' لیکن دل لگی بازی اور سچے احترام کی آمیزش لسکوف کے فلسفۂ حیات کی خصوصیت تھی اور اس آمیزش کا طریقہ ایسا ھے کہ دونوں کیفیتوں کا ایک دوسرے پر کوئی اثر نہیں پڑتا ' اور اس کی دل لگیوں کے باوجود اس کے ھیرو' اس کی اور اس کے ناظرین کی نظروں میں ھیرو ھی رھتے ھیں - اگر لسکوف کے فلسفۂ حیات پر ذرا غور کیا جائے تو ھمیں اس پر بھی تعجب نہ ھوگا کہ اس نے ان متضاد چیزوں کو یکجا کرنے کی کوشش کیوں کی - وہ مذھب اور اخلاق میں کسی قسم کی تنگی اور حد بندی کا قایل نہیں تھا ' کے اس کے نزدیک آزاد فضا میں نشو و نما پانا انسان کی سب سے اھم روحانی ضرورت تھی اور نیکی اس کے خیال میں وھی تھی جو نیک عمل اور انسانی ھمدردی میں ظاھر ھو - جیسے وہ سچے اور اچھے عقیدوں کو رسمی مذھب کا نام دے کر ان کی تاثیر گھٹانے کے خلاف تھا ویسے ھی اسے یہ ناگوار تھا کہ ایسی ھستیاں جو ادب اور احترام کی مستحق ھوں مورتیں بنا کر کھڑی کر دی جائیں اور انسان کی نظر کو اس کی اجازت نہ دی جائے کہ انہیں ھر پہلو سے دیکھے —

شروع کے سیاسی ناولوں میں لسکوف اپنے اصل رنگ میں نظر نہیں آتا ' اور اس دور کے افسانوں میں بھی ظاھر ھوتا ھے کہ اس کا فلسفۂ حیات مکمل اور پختہ نہیں ھوا تھا - اس زندہ دلی ' وسعت نظر اور رواداری کا بھی ' جو اس کی خاص صفتیں تھیں ' اس کی پہلی تصانیف میں پتا نہیں چلتا ' اور اس کے کیرکٹر زیادہ تر انسانی سیرت کے برے نمونے ھیں - لسکوف کی طبیعت کے جوھر پہلی مرتبہ اس کے ناول " گرجا والوں "

میں چمکے ' اور اسی ناول نے اس کی شہرت کی بنیاد ڈالی - اس ناول میں لسکوف نے ایک فرضی شہر ستارگورود کے گرجا کے تین پادریوں کی داستان سنائی ہے ' اور ان تینوں میں سے ہر ایک کی سیرت اور صورت کا نقشہ کھینچنے میں کمال دکھایا ہے - سویلی توبے روزوف ' گرجا کے صدر پادری ' نہایت نیک اور پارسا آدمی ہیں اور ان کا شمار ان سیرتوں میں ہونا چاہئے جو شائستہ زندگی کا مایۂ ناز ہیں - توبے روزوف میں مذہبیت کا وہ سچا جذبہ ہے جو انسان کو ہر وقت اپنے اعمال اور نفس کی اصلاح میں مصروف رکھتا ہے اور جو ضمیر کو اتنا زودحس کردیتا ہے کہ دوسروں کی نکتہ چینی کے لئے نہ موقع ملتا ہے نہ خواہش رہتی ہے - زخاریا بے نے فاکتوف ' گرجا کے دوسرے پادری ' اس مسکینیت کی ایک مثال ہیں جو غربت اور دینی خدمات میں محو رہنے سے اکثر مذہبی لوگوں میں پیدا ہوجاتی ہے - انہوں نے نفس کشی اس لئے کی ہے کہ مجبور تھے ' دنیاوی حوصلے ترک کئے اس سبب سے کہ انہیں پورا کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی - ان کا عجز وانکسار ان کے عقیدوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ افلاس اور طبیعت کی کمزوری کا - آخلاؔ جس نیت سن ' گرجا کا ڈیکن ' صورت ' سیرت اور عادتوں کے اعتبار سے اپنے دونوں افسروں سے بالکل جدا ہے - اس کا جسم ایک دیو کا ہے ' طبیعت بچوں کی سی ' اور شوق وہی جو تندرست نوجوانوں کو ہوا کرتے ہیں - گو اُس وقت جب داستان شروع ہوتی ہے اس کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ ہی ہے ' مذہبیت اس کو چھو بھی نہیں گئی ہے ' اور اپنی کلیسائی خدمات انجام دینے کے بعد وہ سارا دن کھیل کود ' ورزش اور گپ شپ میں صرف کرتا ہے - لیکن لطف یہ ہے کہ ان سب صفتوں کے باوجود بیدینی اور

آزاد خیالی کی مخالفت بھی اسی کے ذمے پڑتی ہے اور جن جن طریقوں سے وہ یہ فرض ادا کرتا ہے ان کا بیان ناول کا سب سے زیادہ دلچسپ حصہ ہے - مثلاً وہ ایک مدرس کے یہاں سے جو علم تشریح کی معلومات کا ذخیرہ بڑھانے پر تلا ہے' مردوں کی هڈیاں چرا لاتا ہے' اور چپکے سے دفن کرکے پھر تمام شہر میں اپنے کارنامے کی خبر سناتا پھرتا ہے - شہر کی میونسپلٹی والوں کے لئے یہ ایک مستقل تماشا سا ہوگیا ہے کہ وہ ایک طرف تو علم کو فروغ دینے کی غرض سے مدرس کو لاوارث مردوں کی لاشیں دیتے ہیں اور دوسری طرف دین کی حفاظت کے لئے ڈیکن آفلا کو انہیں چرا کر دفن کردینے کا انعام دیتے ہیں - افلا کو یہ نہیں معلوم ہے کہ مردوں کی هڈیاں چراکر دفن کردینے سے دین عیسوی کو کیا فائدہ پہنچتا ہے' اور وہ اس مسئلے پر کبھی غور بھی نہیں کرتا - اسے فقط اپنا فرض ادا کرنے سے مطلب ہے - پھر ایک بار دریا میں نہاتے وقت وہ کسی جان پہچان کے ڈاکٹر کو ایک هڈی دکھاتا ہے اور ڈاکٹر اسے بتاتا ہے کہ یہ انسان کے ڈھانچے کی ایک هڈی ہے جسے (astragelus) کہتے ہیں - افلا کو یقین تھا کہ یہ هڈی "چھوٹی سی دم" ہے - (astragelus) کا لفظ بھی کچھ ایسا تھا جسے اس کے خیال میں کسی شریف اور دیندار عیسائی کو ہرگز اپنی زبان پر نہ لانا چاہئے - اس لئے افلا نے ڈاکٹر کو شرک اور توہین مذہب کی سزا دینا ضروری سمجھا' اور اس کی گردن دبا کر اسے دریا میں کئی ڈبکیاں دیں - ڈاکٹر بیچارے نے لاکھ ثابت کرنا چاہا کہ astragelus کے لفظ سے دین عیسوی یا کلیسا کے عہدہ داروں کی کوئی توہین مقصود نہیں' لیکن افلا اسے ڈبکیاں دیتا رہا' اور کسی طرح سے اسے معاف کرنے پر راضی نہ ہوا - افلا کے بعد "گرجا والوں" کا سب سے

دلچسپ کیرکٹر وہی مدرس ہے جس کے یہاں سے افلا ہڈیاں چرایا کرتا ہے - مدرس " مذکر " ہے ' اور سائنس کا شیدائی ' اور چونکہ اس کے ارد گرد جتنے لوگ ہیں وہ سب بہت مذہبی ہیں اور سائنس اور سائنس دانوں کا احترام نہیں کرتے ' اسے اپنے ماحول سے سخت شکایت ہے - اس کی ماں ہر بات میں اس کی مخالفت کرتی ہے ' جن مردوں کی لاشیں وہ لاتا ہے ان کی مغفرت کے لئے وہ گرجا میں دعائیں مانگتی ہے اور جب مدرس کوئی بات کرتا ہے جس کو وہ نہیں سمجھتی تو اپنی جہالت پر شرمندہ ہونے کی بجائے مدرس کی ناک کے سامنے تالی بجاتی ہے * - ماں کے بعد مدرس کو سب سے زیادہ شکایت افلا سے ہے ' جسے وہ علم اور روشن خیالی کا دشمن بلکہ اس سے بھی زیادہ یقین کے ساتھ پولیس کا جاسوس سمجھتا ہے ' اور گرفتار ہونے اور سزا پانے کا خوف اس پر ایسا طاری ہے کہ افلا کے علاوہ بھی وہ ہر شخص کو جو اس کے علمی ذوق کا قائل نہیں جاسوس فرض کرلیتا ہے - شہر میں مدرس کو تسلی دینے والی صرف ایک خاتون ہیں جو اس وقت سے آزاد خیالی کی فدائی بن گئی جب اس کے باپ نے زنا کی سزا میں اس کو درے لگائے تھے اور پولیس والوں نے بجائے باپ کو جیل خانے میں بند کرنے کے صاف صاف کہدیا کہ تم ایسی ہی سزا کی مستحق ہو —

افلا دین کی حمایت اور مدرس جاسوسوں سے بچنے کے لئے جو ترکیبیں کرتا ہے وہ بہت دلچسپ ہیں ' لیکن " گرجا والوں " کی داستان میں پھر بھی واقعات اور حادثوں کی وہ افراط نہیں جو لسکوف کی تصانیف میں عام طور سے پائی جاتی ہے - " مسحور سیاح " ۱۸۷۳ کا قصہ ایک

---

* نحوست دور کرنے کا عمل جو روسی عوام میں رائج تھا —

شخص کی سرگذشت ہے جو اپنے بھتیجوں کی انگریز اُستانی کے ناگوار التفات سے جان بچانے کے لئے روس چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے' اور پولیس والے اسے "ماکر" اور انقلابی سمجھ کر اس کا پیچھا کرتے ہیں اور بیرونی ممالک کی پولیس کو بھی اس کی طرف سے بدظن کردیتے ہیں - اسی سال کی دوسری تصنیف "مقفل فرشتہ" جس میں ایک مقدس مورت کی چوریوں کا قصہ ہے' لسکوف کے خاص طرز کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے- "دنیا کے سرے پر" ۱۸۷۶ کا ایک افسانہ ہے جس میں لسکوف نے' جو اس وقت تک سرکاری مذہب کا پیرو مانا جاتا تھا مذہب عیسوی کے ایک مبلغ کی سرگذشت سنا کر اپنی آزاد خیالی پہلی بار ظاہر کی- اسی زمانے میں لسکوف پر تالستائی کی تعلیم کا اثر پڑنے لگا' مگر اس پر بھی اس نے اپنا نرالا رنگ نہیں بدلا اور "کھبا لوہار" ۱۸۸۲' "بڑے دن کی کہانیاں" ۱۸۸۶ "ترکیتی" ۱۸۸۷ اور "برمحل قصے" ۱۸۸۷ ظرافت اور حیرت انگیز اور دلچسپ سانحوں سے لبریز ہیں- ان افسانوں میں "کھبا لوہار" خاص طور سے مقبول ہوا- اس میں زار روس کے سفر یورپ کا ایک قصہ ہے - زار جس ملک میں جاتا ہے وہاں کے لوگ اسے اپنی صنعت و حرفت کے کرشمے دکھاتے ہیں - لیکن زار سب سے زیادہ انگریزی صنعت اور کاریگری سے مرعوب ہوتا ہے جس کا ایک اعلیٰ نمونہ وہ خرید کر ساتھ بھی لے جاتا ہے - یہ ایک فولاد کی مکھی ہے' اس قدر چھوٹی کہ خورد بین کے بغیر نظر نہیں آتی - مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ ایسی چھوٹی مکھی کے پیٹ میں ایک کل ہے اور جب اس میں کوک بھری جاتی ہے تو وہ ناچنے لگتی ہے- زار کے ہمراہ اتفاق سے پلاتوف' ایک سن رسیدہ' تجربہ کار اور قوم پرست دریاے دون کے کنارے پر رہنے والا کوسک بھی

ہے ' جس کا ہتیولا ہن روس کی آبرو بچا لیتا ہے اور زار کو اپنی رعایا سے
مایوس اور یورپ کی قوموں کا گرویدہ نہیں ہونے دیتا - زار جب مکھی
دیکھتا ہے اور انگریزوں کی کاریگری کی تعریف میں الفاظ کا دریا بہاتا
ہے تو پلاتوف اس سے وعدہ کرتا ہے کہ میں روسی کاریگروں سے اس کے
جواب میں کوئی اعجوبہ تیار کراؤں گا - روس واپس آنے کے کئی سال
بعد آخر کار جب زار کا انتقال ہوتا ہے اور اس کا بیٹا تخت پر بیٹھتا
ہے تو پلاتوف کو اپنا وعدہ پورا کرنے کا موقعہ ملتا ہے - وہ فولاد کی مکھی
کو شہر تولا کے مشہور لوہاروں کے پاس لے جاتا ہے ' اور لوہار اپنے کام کی
نزاکت اور باریکی جتانے کے لئے مکھی کے ہر پیر میں جوتی پہنا دیتے ہیں
اور جوتوں کے تلوں پر اپنے نام کھود دیتے ہیں - زار ان کے کام سے بہت
مرعوب ہوتا ہے ' اور ان میں سے ایک کو جو کھبا ہے روسی صنعت کے اس
کارنامے کو دکھانے کے لئے انگلستان بھیجتا ہے - انگریز اس کی بہت قدر
کرتے ہیں ' اور ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں کہ اسے اپنے پاس رکھیں -
لیکن وہ نہیں مانتا ' اور کچھ دن مہمان رہنے کے بعد روس واپس ہوتا
ہے - راستے میں جہاز پر وہ ایک ملاح سے شراب پینے کی شرط لگاتا ہے اور
جب جہاز بندرگاہ پر پہنچتا ہے تو لوگ اسے مست پاتے ہیں اور کسی کو
معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون ہے اور کہاں جانا چاہتا ہے - دربار میں بھی
سب اس کا قصہ بھول گئے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ کھبا لوہار جو
شراب خواری کی کثرت اور سردی لگ جانے کی وجہ سے بیمار پڑ گیا تھا
محتاجوں کے ہسپتال میں مرجاتا ہے اور کسی کو اس کی خبر نہیں ہوتی -
روسی اور عام یوروپی ذہنیت کے مقابلے سے جو نتیجے نکلتے ہیں ان کے علاوہ
داستان میں بہت سی خوبیاں ہیں - اس کے مکالمے بہت پر لطف ہیں اور

زبان انوکھی مگر بہت دلچسپ ہے —

لسکوف نے اپنے آخری ناولوں اور افسانوں سے تالستائی کی طرح اخلاقی تعلیم دینی چاہی اور یہ دکھایا کہ اصل چیز مذہبی رسوم کی پابندی نہیں بلکہ ایسا عمل ہے جس سے خلوص اور دل کی نیکی ظاہر ہو - " پہاڑ " " ایس کلون کا رہزن " اور " حسین آزا " جو اس دور کے بہترین افسانے ہیں کسی قدر شہوت انگیز ضرور ہیں لیکن یہ عیب ان کی اخلاقی اہمیت میں فرق نہیں ڈالتا ' بلکہ حقیقت کو اور زیادہ واضح اور روشن کردیتا ہے - ان افسانوں کے بعد بھی لسکوف نے ایک ناول " خرگوشوں کی پرورش گاہ " لکھا جو ابھی کچھہ سال ہوئے پہلی بار شائع ہوا - یہ ناول اس کے شروع کے طرز پر ہے اور اس کا ہیرو پے رے گود ایک کمزور دماغ کا شخص ہے جسے ایک بااثر رشتہ دار کی مہربانی سے پولیس میں ایک بڑی ذمہ داری کا عہدہ مل گیا ہے - پے رے گود اپنی مشکل خدمات خاصی کامیابی کے ساتھہ انجام دیتا رہتا ہے جب تک کہ اسے باغی مذکر گرفتار کرنے کا خبط نہیں ہوجاتا - اس منصوبے کو پورا کرنے کی کوشش میں وہ ایک ایسی زک پاتا ہے کہ اس کا دماغ بالکل خراب ہوجاتا ہے اور اس کی عمر کا بقیہ حصہ پاگل خانے میں گذرتا ہے - لسکوف کے انداز بیان نے اس داستان کو جو بظاہر محض مزاحیہ ہے قوم اور قومی ذہنیت کی تنقید اور اس کی گمراہی عیاں کرنے کا ایک ذریعہ بنا دیا ہے - بصیرت افروز ظرافت لسکوف کا حصہ تھی —

ٹیگور کے ادبی مضامین

از

پنڈت ونشی دھر ودیا النکار

ادبیات عالم

ہمارے دماغ میں جتنی قوتیں ہیں وہ دنیا کی تمام چیزوں کے ساتھہ تعلق قائم کرنے کے لئے ہیں - اسی تعلق کے ذریعے ہم اپنی ہستی کو حقیقی بنا لیتے ہیں اور اسی میل کے ذریعے ہم حقیقت کو حاصل کرتے ہیں - اگر یہ تعلق نہ ہو تو ہماری ہستی اور دوسری چیزوں کی ہستی کا کچھہ مطلب ہی نہیں رہتا —

دنیا میں حقیقت کے ساتھہ ہمارا تعلق تین قسم کا ہوتا ہے - عقل کا تعلق ' غرض کا تعلق ' اور مسرت کا تعلق - ان میں سے عقل کا تعلق حقیقت کے ساتھہ ایک طرح کی حریفانہ حیثیت رکھتا ہے گویا وہ ایک شکاری کے ساتھہ شکار کا تعلق ہے - گویا عقل حقیقت کو فریق ثانی کی حیثیت سے خود کے بنائے ہوے کٹہرے میں کھڑا کرکے اور اس پر جرح کرکے اس کے دل کی بات کو رتی رتی باہر نکال لاتی ہے - اسی وجہ سے حقیقت کے بارے میں عقل کو ایک قسم کا گھمنڈ ہو جاتا ہے - وہ جس مقدار میں حقیقت کو جانتی ہے اُسی مقدار میں اپنی قوت کو محسوس کرتی ہے - اس کے بعد

حقیقت کے ساتھہ غرض کا تعلق ہے - اس غرض یعنی مطلب کے تعلق میں ہماری قوت اور حقیقت کا ایک طرح کا اتحاد پیدا ہوتا ہے -اسی غرض کے سبب حقیقت ہم سے نزدیک تر ہو جاتی ہے - پھر بھی اُس کے ساتھہ جو ہماری علیحدگی ہے وہ فنا نہیں ہوجاتی - انگریز سوداگروں نے جس طرح ایک دن نواب کے آگے سر جھکا کر اور نذرانے دے کر اپنا مطلب نکال لیا تھا اور کامیاب ہوکر آخر کار خود تخت کے مالک بن بیٹھے تھے اسی طرح حقیقت سے کام لے کر اور اس سے اپنا مطلب پورا کرکے آخر میں ہم سمجھتے ہیں کہ گویا ہمیں نے دنیا کی حکومت حاصل کرلی ہے - تب ہم کہتے ہیں کہ قدرت ہماری خادمہ ہے؛ پانی' ہوا اور آگ ہمارے بندۂ بے دام ہیں —

اس کے بعد حقیقت کے ساتھہ مسرت کا تعلق ہے - اسی حسن یا مسرت کے تعلق میں حقیقت سے ہماری علیحدگی فنا ہو جاتی ہے - وہاں گھمنڈ نہیں رہتا' وہاں خود کو بالکل حقیر اور کمزور ہستی کے حوالے کردینے میں ہمیں ذرا بھی تامل نہیں ہوتا- وہاں متھرا کے راجا کو بندرابن کی گوپیوں کے پاس اپنی شاہی عظمت کے چھپانے کا طریقہ نہیں سوجھتا- حقیقت کے ساتھہ جہاں ہماری مسرت کا تعلق ہوتا ہے وہاں ہم اپنی عقلی قوت کو بھی محسوس نہیں کرتے' اور کام کی قوت کو بھی محسوس نہیں کرتے وہاں ہم صرف خود ہی کو محسوس کرتے ہیں - بیچ میں کوئی رکاوٹ یا دوری نہیں رہتی —

اگر اختصار کے طور پر کہا جائے تو حقیقت کے ساتھہ عقل کا تعلق ہمارا مدرسہ ہے' غرض کا تعلق ہماری کچہری ہے اور مسرت کا تعلق ہمارا گھر ہے- مدرسے میں بھی ہم پوری طرح نہیں رہتے' اور دفتر میں بھی ہم پورے طور سے اس کے نہیں ہوجاتے'؛ صرف گھر ہی میں ہم بغیر کسی رکاوٹ کے حقیقی

طور پر رہتے ہیں - مدارس میں آراستگی نہیں ہوتی ' دفتروں کو سجایا نہیں جاتا لیکن گھر کی آرائش مختلف سامانوں سے کی جاتی ہے —

یہ مسرت کا تعلق کیا شے ہے ؟ دوسروں کو اپنا اور اپنے کو دوسروں کا سمجھنا - جب ہم ایسا سمجھہ لیتے ہیں تب تفریق کا کوئی سوال نہیں رہتا - یہ بات ہم کبھی نہیں پوچھتے کہ ہم خود کو کیوں پیار کرتے ہیں - ہمیں اپنے احساس ہی میں مسرت معلوم ہوتی ہے - یہی احساس جب ہم دوسروں میں پاتے ہیں تب اس بات کے پوچھنے کا کوئی مطلب ہی نہیں رہتا کہ ان کو ہم کیوں پیار کرتے ہیں —

" یا جنّی دلک رشی " نے " گارگی " سے کہا تھا :—

نوارے پترسّیَ کاماےَ پترہ پریو بھوتی
آتمنستو کاماےَ پُترَہَ پر یو بھوتی
نوارے وِتسّی کاماے وِتم پریم بھوتی
آتمنستو کاماےَ وِتّم پریم بھوتی "

ہمیں بیٹا اس لیے پیارا نہیں معلوم ہوتا کہ ہم اسے چاہتے ہیں بلکہ ہم خود کو چاہتے ہیں اس لیے ہمیں بیٹا پیارا معلوم ہوتا ہے - دولت ہمیں اس لیے پیاری نہیں معلوم ہوتی کہ ہم اسے چاہتے ہیں لیکن چونکہ ہم خود کو چاہتے ہیں اس لیے دولت ہمیں پیاری معلوم ہوتی ہے —

اس قول کا یہ مطلب ہے کہ جس چیز کے اندر ہم خود کو کامل طور سے دیکھہ سکتے ہیں ہم اسی کو چاہتے ہیں - بیٹا ہماری کمی کو دور کر دیتا ہے؛ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم بیٹے کے اندر خود کو اور بھی زیادہ حاصل کرتے ہیں گویا اس کے اندر ہم 'اور بھی زیادہ ہم' ہو جاتے ہیں - اسی لیے وہ ہمارا اپنا ہے؛ وہ ہم سے الگ ہو کر بھی ہمیں اپنے اندر حقیقی شکل میں

بنا لیتا ہے - اپنے اندر جس حقیقت کو ہم یقین کامل سے دیکھ کر پیار کرتے ہیں بیٹے کے اندر بھی اسی حقیقت کو اسی طرح گہرائی سے دیکھنے میں ہماری محبت بڑھ جاتی ہے - اسی سبب سے' یہ جاننے کے لیے کہ ایک انسان کیسا ہے ہمیں اس بات کو جاننا چاہئے کہ وہ کس چیز کو پیار کرتا ہے - اس سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اس تمام دنیا کے اندر کس چیز میں اپنے آپ کو پایا ہے' کتنی دور تک اس نے اپنے آپ کو پھیلا دیا ہے - جہاں ہمیں کسی طرح کی محبت نہیں ہوتی وہاں ہماری روح اپنے حدود کے دائرے کے اندر ہی رہتی ہے —

بچہ باہر روشنی کو دیکھ کر یا کسی کو چلتا پھرتا دیکھ کر خوشی سے ہنس پڑتا ہے اور شور کرنے لگ جاتا ہے - وہ اس روشنی اور چلبلے پن میں اپنی ہی روح کو بڑی شکل میں دیکھتا ہے' اسی لیے وہ خوش ہوتا ہے —

لیکن صاحب شعور ہونے کے بعد جب آہستہ آہستہ بچے کی روح دل و دماغ کی بہت سی تہوں میں پھیل جاتی ہے تب صرف انہیں چیزوں میں اسے مسرت حاصل نہیں ہوتی - یہ نہیں کہ بالکل حاصل نہیں ہوتی بلکہ تھوڑی حاصل ہوتی ہے —

اس طرح انسان کی جس قدر نشوونما ہوتی جاتی ہے وہ اتنی ہی بڑی شکل میں اپنی حقیقت کو محسوس کرنا چاہتا ہے —

اگر انسان اپنی روح کو باہر دیکھنا چاہتا ہے تو سب سے پہلے وہ اسے دوسرے انسانوں ہی کے اندر دیکھ سکتا ہے - آنکھوں کے ذریعے دیکھنے میں' کانوں کے ذریعے سننے میں' دل کے خیالات میں' تخیل کی جولانیوں میں' دل کی عجیب کششوں میں وہ دوسرے انسانوں ہی کے اندر قدرتاً

اپنے آپ کو کامل طور سے دیکھہ پاتا ہے ۔ اسی لئے انسان کو جان کر ' انسان کو کھینچ کر ' انسان کا کام کرکے وہ بہت خوش ہو جاتا اور ملک اور زمانے میں جو انسان جتنے زیادہ انسانوں کے اندر اپنے آپ کو ملاکر دیکھہ سکا ہے اور اپنے آپ کو چمکا سکا ہے وہ اتنا ہی بڑا آدمی ہے ' وہی دراصل مہاتما ہے ۔ تمام انسانوں کے اندر ہی ہماری زندگی کی کامیابی ہے ۔ اس بات کو جو شخص کسی نہ کسی اچھے موقع پر کچھہ نہ کچھہ سمجھہ سکا ہے اس کی قسمت میں اپنی شخصیت کا حصہ کم ہوگیا ہے ' وہ روح کو اپنے اندر دیکھنے ہی سے اپنی بے حقیقتی کو سمجھتا ہے —

سب کے اندر خود کو دیکھنا یہ ہماری انسانی روح کی فطرت ہے ۔ خود غرضی اور غرور اس میں رکاوٹ ڈالتے ہیں ۔ اسی قسم کی رکاوٹوں سے ہماری روح کی قدرتی ترقی رک جاتی ہے ۔ انسانیت کے کامل حسن کو ہم بغیر کسی رکاوٹ کے نہیں دیکھہ سکتے —

لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بعض لوگ یہ سوال کریں گے کہ اگر انسانی روح کی یہ فطرت ہے تو اس کی پیروی سے دنیا میں اس کی اتنی بری گت کیوں بنتی ہے ؟ اس خود غرضی اور غرور ہی کو کیوں نہ فطرت کہا جائے جن کو تم رکاوٹ کہہ کر اُڑا دیتے ہو ؟

در اصل بہت سے لوگ ایسا کہا کرتے ہیں کیونکہ فطرت کی نسبت اُس کی رکاوٹیں زیادہ نظر آتی ہیں ۔ پہلے پہل جب کوئی آدمی بائسیکل پر بیٹھنے کی مشق کرتا ہے تو وہ چلنے کی نسبت زیادہ گرتا ہے ۔ اگر اس وقت کوئی کہے کہ وہ آدمی بیٹھنے کی مشق نہیں کرتا گرنے کی مشق کرتا ہے تو اس بارے میں بحث کرنی فضول ہوگی ۔ دنیا میں خود غرضی اور غرور کا تصادم ہمیں قدم قدم پر نظر آتا ہے لیکن اگر

اُن کے ہوتے ہوئے بھی انسان اپنی فطرت کو بچانے کی کوشش یعنی سب کے ساتھہ ملنے کی کوشش کو نہ دیکھہ پائے ' اگر گرنے ہی کو فطرت کہہ کر تکرار کرے تو یہ بحث بالکل فضول ہوگی —

حقیقت میں جو فطرت ہمارے لئے قدرتی ہے اُسے قدرتی شکل میں سمجھنے کے لئے ہی ' اُسے پوری قوت سے کام میں لگا دینے کے لئے ہی رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں - انہیں رکاوٹوں کے ذریعے سے وہ جاگ اٹھتی ہے اور اس کی یہ بیداری جس قدر زیادہ ہوتی ہے اس کی مسرت بھی اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے ' ہر معاملے میں ایسا ہی ہوتا ہے —

عقل کی مثال لیجئے - علت و معلول کے تعلق کا پتا لگانا عقل کا ایک خاصہ ہے - آسانی سے مشاہدے میں آنے والی چیزوں میں جب تک وہ اس کام کو بہ سہولت انجام دیتی ہے تب تک وہ خود کو کامل طور پر نہیں دیکھہ پاتی - لیکن تمام دنیا میں علت و معلول کے تعلق اس قدر گہرائی میں پوشیدہ ہیں کہ ان کا پتا لگانے میں عقل کو جان توڑ کوشش کرنی پڑتی ہے - انہیں رکاوٹوں کے دور کرنے کی محنت میں عقل سائنس اور فلسفے میں خود کو اچھی طرح دیکھہ پاتی ہے - اسی سے اس کی شان اور عظمت بڑھتی ہے - در اصل اچھی طرح غور کرکے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس اور فلسفہ عقل کے حصول کے سوا اور کچھہ نہیں - جہاں عقل اپنے قانون پر غور کرتی ہے وہاں اُس چیز کو اور خود کو انتہا کرکے دیکھتی ہے - اسی کو " اِدراک " کہتے ہیں - اِسی ادراک میں عقل کو مسرت حاصل ہوتی ہے ورنہ سیب جس وجہ سے زمین پر گرتا ہے سورج اسی وجہ سے زمین کو اپنی طرف کھینچتا ہے ' اس بات کے معلوم کرلینے میں انسان کے لئے اس قدر مسرت کا کوئی

سبب نہیں تھا : کھینچتا ہے تو کھینچا کرے ہمیں اس سے کیا مطلب ؟ ہمارا اس سے یہی مطلب ہے کہ دنیا کے اس ہمہ گیر قانون کو ہم نے اپنی عقل کے ذریعے سمجھہ لیا - ہر جگہ اپنی عقل کو محسوس کرلیا - ہماری عقل کے ساتھہ زمین سے لیکر سورج ' چاند اور تاروں تک سبھی مل گئے - اس طرح دنیا کا غیر محدود راز انسانی عقل کو باہر کھینچ کر پھر اُس کے سامنے خود کو بڑی شکل میں نمایاں کرتا ہے - خود کو تمام دنیا کے ساتھہ ملاکر پھر اپنے آپ کو انسان کے حوالے کردیتا ہے - تمام چیزوں کے ساتھہ عقل کے اسی میل کا نام علم ہے - اسی میل کے ذریعے قوائے عقلیہ کو مسرت حاصل ہوتی ہے —

اسی طرح تمام انسانوں میں کامل طور سے اپنی انسانیت کے تعلق کو پانا انسانی روح کا قدرتی خاصہ ہے اور اُسی میں اسے سچی مسرت حاصل ہوتی ہے - ہمیں روح کے اس خاصے کو ذی شعور یا جیتی جاگتی شکل میں پانے کے لئے اندر باہر بڑی بڑی بندشوں اور رکاوٹوں میں سے گزرنا پڑتا ہے - اسی سبب سے خود غرضی میں اتنی طاقت ہے ' غرور اس قدر اٹل ہے اور دنیا کا راستہ اتنا دشوار گزار ہے - ان تمام رکاوٹوں میں سے گذر کر جہاں انسان کی فطرت اُجلی ہوکر کامل حسین شکل میں خود کو بزور نمایاں کرتی ہے وہاں بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے - وہاں ہم خود کو بڑی شکل میں دیکھتے ہیں —

اسی سبب سے ہم بڑے لوگوں کی سوانح عمری پڑھنا چاہتے ہیں - ان کی سوانح عمری میں ہم اپنی رکاوٹوں سے گھری ہوئی طبیعت کو آزاد اور شگفتہ پاتے ہیں - تاریخ میں ہم اپنی ہی فطرت کو طرح طرح کے لوگوں میں ' مختلف ممالک میں ' مختلف واقعات میں ' مختلف معیاروں میں اور مختلف

سلسلوں میں دیکھہ کر خوش ہوتے ہیں ' گو ہم صاف طور پر سمجھیں یا نہ سمجھیں مگر اپنے دل میں اس بات کو ضرور محسوس کرتے ہیں کہ تمام انسان اور ہم ایک ہیں ۔ اِس اتحاد کو جس حد تک ہم اچھی طرح محسوس کرتے ہیں اسی حد تک ہمیں مسرت حاصل ہوتی ہے —

لیکن سوانح عمری اور تاریخ میں ہم ابتدا سے انتہا تک سب کچھہ صاف طور پر نہیں دیکھہ سکتے - وہ بھی بہت سی رکاوٹوں اور بہت سے شبہات سے ڈھکی ہوئی نظر آتی ہیں ' تاہم اس کے ذریعے سے ہمیں انسان کے متعلق جو کچھہ علم حاصل ہوتا ہے وہ بلا شبہ بہت بڑا ہے - لیکن ہم پھر اُسی علم کو اپنے دل کے موافق بناکر اور اپنی مرضی کے مطابق سجا کر ہمیشہ کے لئے زبان میں محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں - اگر ہم ایسا کر سکیں تو وہ علم خاص طور پر ہمارا ہو جاتا ہے - خوبصورت زبان میں عالی دماغی کے ذریعے جب ہم اس علم کے اندر اپنی محبت کو نمایاں کرتے ہیں تو وہ انسان کے دل کی شے بن جاتا ہے - پھر وہ اس دنیا کی آمد و رفت کی رو میں نہیں بہہ جاتا —

اس طرح باہر کی یہ جو ناممکن البیان خوبصورت روشنی ہے خواہ وہ طلوع آفتاب کا حسن ہو ' یا کسی بڑے آدمی کی زندگی کی چمک یا اپنے اندرونی جذبات کا طوفان ہو - غرض جو کچھہ بھی ہو ' ہر لحظہ ہمارے دل کو بیدار کرتا رہتا ہے - دل اُسے اپنی تخلیق کے ساتھہ ملا کر اسے اپنا سمجھہ کر محفوظ کر لیتا ہے - اس طرح اِن تمام چیزوں کے ذریعے سے وہ در اصل خود ہی کو ' خاص طور سے نمایاں کرتا ہے —

میدان عمل میں انسان اپنے جسم ' دل اور دماغ کی تمام قوتوں اور تجربے سے گھر ' سماج ' راج اور مذہب و ملت کی تعمیر کرتا ہے - اسی تعمیر

میں انسان نے جو کچھہ حاصل کیا ہے' جو کچھہ جان لیا ہے ' جو کچھہ اس کی خواہش ہے سب کچھہ نمایاں ہوتا ہے - اس طرح انسانی فطرت دنیا کے ساتھہ مل کر اور مختلف شکلیں اختیار کر کے سب کے بیچ میں خود کو قائم کرتی ہے -۔اس طرح جو چیزیں جذبات کے اندر صاف نہیں تھیں وہ بہت سی چیزوں کے بیچ میں مختلف اعضا کے ذریعے ایک جسم حاصل کر لیتی ہیں - غرض ہر آزاد انسان گھر' سماج ' راج اور مذہبی فرقوں کے بغیر جن کی تعمیر بے شمار انسانوں نے زمانۂ دراز میں کی ہے خود کو اچھی طرح اور کامل طور پر نمایاں نہیں کر سکتا - یہ سب چیزیں انسان کے لیے انسان ہی کی شکل کی ہو گئی ہیں - اگر ایسا نہ ہو تو ہم ان چیزوں کو تہذیب یعنی کامل انسانیت کے نام سے نہیں پکار سکتے - راج یا سماج کے جس کسی کام میں بھی ہم انفرادی طور پر بالکل آزاد ہیں یعنے جہاں کہیں ایک کے ساتھہ سب کا میل نہیں ہوتا' وہیں ہم غیر مہذب ہیں -۔اسی سبب سے مہذب سماج میں راج کو نقصان پہنچنے پر اس حکومت کے ہر ایک شخص کے بڑے جسم کو صدمہ پہنچتا ہے - اگر سماج بعض شعبوں میں تنگ نظر ہو تو اس سماج کے ہر شخص کی ذاتی نشو و نما رک جاتی ہے - انسان کے دنیاوی میدان کی مذکورۂ بالا تمام بنائی ہوی چیزیں جس مقدار میں وسیع ہوتی ہیں اسی مقدار میں وہ اپنی انسانیت کو بغیر کسی رکاوٹ کے نمایاں کر سکتی ہیں اور جس قدر وہ تنگ نظر ہوتی ہیں اسی قدر انسان خود کو نمایاں نہ کر سکنے کے سبب پستی میں گر جاتا ہے - کیونکہ یہ دنیا اپنے عمل کی بدولت انسان کو نمایاں کرنے کے لیے ہے اور نمائش ہی مسرت ہے —

میدان عمل میں بھی انسان خود کو نمایاں کرتا ہے لیکن اس میں خود کو نمایاں کرنا اس کا اصلی مقصد نہیں ہوتا وہ تو اس کا ایک بالواسطہ نتیجہ ہوتا

ہے - ایک گھر والی گھر کے کاموں میں خود کو نمایاں تو کرتی ہے لیکن خود کو دکھلانا ہی اِس کا اصلی مقصد نہیں ہوتا - گھر کے کاموں کے ذریعے سے وہ اپنے بہت سے مقاصد پورے کر لیتی ہے اور یہ مقاصد اس کے کاموں کے ذریعے اس کی فطرت کو ہمارے پیش نظر کر دیتے ہیں —

لیکن ایک وقت آتا ہے جب انسان خاص طور پر خود کو نمایاں کرنا چاہتا ہے - غور کر کے دیکھو کہ گھر میں جس دن شادی ہوتی ہے اس دن ایک طرف شادی کی تیاریاں ہوتی رہتی ہیں اور دوسری طرف صرف شادی کے لوازمات اور رسوم کی تکمیل کے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے دل کو کھول کر بتانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے - اس دن گھر کے آدمی اپنے گھر کی مسرت کا سب کے سامنے اعلان کیے بغیر نہیں رہ سکتے - اور یہ اعلان کس طرح کیا جاتا ہے ؟ شہنائی بجتی ہے ' دئے جلتے ہیں ' پھول اور پتوں سے گھر سجایا جاتا ہے - راگ رنگ ' خوشبو اور دل خوش کن نظاروں اور مسرت کے ذریعے دل خود کو سودھاری فوارے کے مانند چھوڑ دیتا ہے - اس طرح مختلف قسم کے اشاروں میں اپنی مسرت کو دوسروں کے دلوں میں جگا کر حقیقی بنانا چاہتا ہے —

ماں اپنے بچے کی خدمت کیے بغیر ہرگز نہیں رہ سکتی - یہی نہیں - صرف خدمت کے ذریعے نہیں ' ماں کی محبت خود بخود بغیر کسی سبب کے خود کو نمایاں کرنا چاہتی ہے ' وہ محبت کتنے کھیلوں ' کتنے پیاروں اور کتنی زبانوں میں سے پھوٹ پڑتی ہے - ماں بچے کو مختلف رنگوں کی آرائش سے سجا کر ' طرح طرح کے گہنے پہنا کر بغیر کسی غرض اور مطلب کے اپنی مامتا کو ان چیزوں کی کثرت کے ذریعے ' اور دل کی امنگوں کو حسن کے ذریعے نمایاں کئے بغیر نہیں رہ سکتی —

اس سے یہ پتا لگتا ہے کہ ہمارے دل کی فطرت یہی ہے - وہ اپنے جوش کو بیرونی دنیا کے ساتھ ملا دینا چاہتا ہے - وہ بذات خود کامل نہیں ہوتا وہ اندرونی حقیقت کو بیرونی حقیقت کی شکل میں قائم کرکے ہی زندہ رہتا ہے - انسان جس گھر میں رہتا ہے وہ گھر اس کے لئے اینٹ اور لکڑی کی شکل میں ہی نہیں ہوتا اُس گھر کو وہ اپنی رہائش کی جگہ بنا کر اُس پر اپنے دل کے جذبات کا رنگ چڑھا دیتا ہے - جس ملک میں اُس کا دل رہتا ہے وہ ملک اُس کے نزدیک صرف مٹی ' پانی اور آسمان نہیں ہوتا ؛ وہ ملک جب اُس کے نزدیک خدا کی زندگی بخش شکل کو ماں کی شکل میں نمایاں کرتا ہے تب اُسے مسرت حاصل ہوتی ہے - ورنہ دل اپنے آپ کو باہر نہیں دیکھ سکتا - اگر ایسا نہ ہو تو دل بے حس ہوجاتا ہے اور دل کے لئے بے حسی موت ہے —

اس طرح دل حقیقت کے ساتھ اپنے جذبات کا تعلق قائم کرتا ہے - جہاں جذبات کا تعلق ہوتا ہے وہاں لین دین ہوتا ہے - ہمارے دل کی مالکہ جس گھر سے جیسی سوغات پاتی ہے اگر اُس گھر میں ویسی سوغات نہیں بھیج سکتی تو گویا اس کے وقار کو صدمہ پہنچتا ہے - اس طرح کی سوغات کی تھالی میں اُسے اپنے جذبات اور تعلقات کو نمایاں کرنے کے لئے مختلف مال مسالوں کے ذریعے ' زبان ' موسیقی ' برش اور پتھروں کے ذریعے ' تخلیق کرنی پڑتی ہے - اس کے ساتھ ساتھ اگر کوئی اس کا اپنا مطلب بھی پورا ہوجاتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اکثر وہ اپنے مطلب کو قربان کرکے صرف خود کو نمایاں کرنے کے لئے بے چین رہتی ہے - وہ دیوالیہ ہوکر بھی اپنے کو مشہور کرنے میں دریغ نہیں کرتی انسان کی فطرت میں یہ جو نمائش کا جذبہ ہے یہی اس کی فضول

خرچی کا شعبہ ہے - اسی میں عقل کو ' جو خزانہ دار ہے ' بار بار اپنا سر پیٹنا پڑتا ہے —

دل کہتا ہے کہ میں اندر جتنا سچا ہوں باہر بھی اتنا سچا کسی طرح ہو سکوں گا - ایسے اسباب اور اس طرح کا اچھا موقعہ کس طرح حاصل ہو سکے گا - وہ روتا ہے کہ میں خود کو سب کے سامنے نمایاں کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا - ایک دولت مند آدمی جب اپنے دل میں یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ دولت مند ہے تو خود کو دولت مند دکھانے کے لئے " کُبیر " (یعنی دولت کا دیوتا) کی دولت کو بھی اُڑا دینے میں تامل نہیں کرتا - ایک عاشق جب اپنے دل میں سچی محبت محسوس کرتا ہے تو اُس محبت کو دکھانے کے لئے یعنی باہر حقیقی شکل میں لانے کے لئے وہ مال ' جان اور عزت وغیرہ سب چیزوں سے ایک پل میں دست بردار ہو جاتا ہے اس طرح باہر کی چیز کو اندر کی اور اندر کی چیز کو باہر کی چیز بنا دینے کی بے چینی کسی طرح کم نہیں ہوتی - شاعر " بلرام داس " (بنگالی شاعر) نے کہا ہے : -

" تو مار ھیار بھتر ھیتے کے کیل باھر "

(تمہارے دل کے اندر سے کس نے باہر نکال دیا)

یعنی پیاری چیز دل کے اندر کی چیز ہے اُسے گویا کسی نے باہر نکال لیا ہے - اسی سبب سے اُسے پھر اندر لوٹا دینے کے لئے اتنی زبردست خواہش ہوتی ہے اور اس کا برعکس بھی دیکھا جاتا ہے - دل اپنی اندرونی خواہش اور جوش کو جب کسی طرح بھی باہر نہیں دیکھ پاتا تب آخر کار وہ مختلف ذرائع سے خود بخود اس کی شکل کا عکس اتارنے کے لئے جان توڑ کوشش کرتا ہے - اس طرح دنیا کو اپنی اور

خود کو دنیا کا بنانے کے لئے دل کی بے چینی ہمیشہ کام کرتی رہتی ہے۔
خود کو باہر نمایاں کرنا بھی اسی کام کا ایک شعبہ ہے۔ اسی وجہ سے
دل اسے نمایاں کرنے کی خاطر انسان کو سب کچھہ تج دینے کے لئے
آمادہ کرلیتا ہے —

وحشی فوج جب لڑنا چاہتی ہے تو وہ صرف دشمن کو ہرا دینے
پر ہی بس نہیں کرتی وہ دشمن کو شکست دینے کے بعد اپنے جسم پر رنگ
مل کر، شور و غل مچا کر اور باجے بجا کر ناچا کرتی ہے۔ یہہ ہے اندرونی
قتل کی خواہش کو باہر مشکّل کرکے کھڑا کرنا۔ ایسا نہ کرنے سے گویا قتل
کی خواہش مکمل نہیں ہوتی - قتل کی خواہش اپنے مقصد کو پورا کرنے
کے لئے جنگ کرتی ہے اور اپنی شکل کو دکھانے کی مسرت کے لئے یہہ تمام
فضول حرکات کیا کرتی ہے —

موجودہ زمانے کی مغربی جنگوں میں بھی جیتنے کی خواہش کو
دکھانے کے لئے باجے وغیرہ کا سامان کچھہ کم نہیں ہوتا - پھر بھی موجودہ
زمانے کی لڑائیوں میں عقلی چالوں کی اہمیت ہوگئی ہے - آہستہ آہستہ
انسانی دل کی فطرت اس سے پرے ہٹتی جاتی ہے - مصر میں جب
درویشوں کی جماعت نے انگریزی فوج پر دھاوا کیا تھا تو وہ صرف لڑائی
جیتنے کے لئے ہی نہیں جان دیتے تھے، بلکہ اپنے اندرونی جوش و خروش
کو دکھانے کے لئے وہ آخری شخص تک مرمٹے تھے - لڑائی میں جو صرف
فتح چاہتے ہیں وہ ایسی فضول حرکت نہیں کرتے - خودکشی کے ذریعے
بھی انسان اپنے دل کو نمایاں کرنا چاہتا ہے - بھلا اتنے بڑے فضول خرچ کا
کون قیاس کرسکتا ہے ؟ —

پوجا کرنے میں عقلمندوں کا طریقہ کچھہ اور ہے اور خالص عبادت

کرنے والوں کا کچھہ اور- عقلمند سوچتا ھے کہ پوجا کے ذریعے خدا سے فلاح حاصل کرلوں گا اور خالص عبادت کرنے والا سوچتا ھے کہ پوجا کے بغیر عبادت پوری نہیں ھوتی- اس کا چاھے اور کوئی نتیجہ نہ ھو دل کی عبادت کو باھر نمایاں کرنے سے اس کا پہلو ھوجاتا ھے-اس طرح عبادت پوجا کے اندر خود کو نمایاں کرکے کامیاب بناتی ھے- عقلمند کی پوجا سود پر روپیہ لگانا ھے اور خالص عبادت کرنے والے کی پوجا صرف فضول خرچی ھے-دل خود کو نمایاں کرنے میں نقصان کی قطعی پروا نہیں کرتا-

تمام دنیا کے اندر جہاں کہیں ھم اپنے دل کی اس فطرت کو دیکھتے ھیں وھیں ھمارا دل خود بخود اپنے آپ کو اس فطرت کے حوالے کردیتا ھے اور کسی بات کے جاننے کی خواھش نہیں کرتا - دنیا میں اسی بے حساب فضول خرچی کا ایک پہلو حسن ھے - جب ھم دیکھتے ھیں کہ پھول صرف بیج بننے کے لئے جلدی نہیں کرتا بلکہ اپنے مقصد کو طے کرکے خوبصورت شکل میں کھلتا ھے ؛ بادل صرف پانی برسا کر اپنے کام کو پورا کرکے جلد فارغ نہیں ھوجاتا بلکہ بغیر مطلب کے ٹھہر کر اپنے دلکش رنگوں کی نمائش سے نظروں کو اپنی طرف کھینچ لیتا ھے ؛ درخت صرف لکڑی بن کر برسات اور روشنی کے لئے ایک دبلے اور کمزور بھکاری کی طرح ھاتھہ نہیں پھیلائے رھتے بلکہ وہ ھرے بھرے حسن کی الوھیت میں اپنے چاروں طرف حسن کی بوچھاڑ کر دیتے ھیں- جب ھم دیکھتے ھیں کہ سمندر بادلوں کے ذریعے زمین پر صرف پانی برسانے کے لئے ھی ایک بڑا دفتر کھولے نہیں بیٹھا ھے بلکہ وہ اپنے چنچل نیلے پن کی اتھا گہرائی سے ڈراونا بھی ھے ؛ پہاڑ صرف ندیوں کو پانی تقسیم کرکے ھی اکتفا نہیں کرتا بلکہ وہ جوگ میں بیٹھے ھوے مہادیوجی کے مانند اپنی ڈراونی شکل کو فضائے آسمانی میں خاموشی کے ساتھہ قائم کئے ھوے ھے ؛ تو

اس وقت ہمیں دنیا میں دل کی فطرت کا پتہ چلتا ہے - اور اس وقت ہمیشہ بیدار رہنے والی عقل سر ہلا کر پوچھتی ہے کہ دنیا بھر میں اتنی غیر ضروری اداؤں کی فضول خرچی کس لئے ہے ؟ ہمیشہ جوان رہنے والا دل کہتا ہے کہ مجھہ کو مبہوت کرنے کے لئے اس کے سوا دوسرا کوئی سبب سمجھہ میں نہیں آتا - دل ہی جانتا ہے کہ دنیا کے اندر ایک اور دل بھی ہمیشہ خود کو نمایاں کر رہا ہے ورنہ دنیا کے اندر اتنا روپ ، اتنی موسیقی ، اتنی ادائیں ، اتنے اشارے اور کنائے اور اتنی زیب و زینت کس لئے ہے ؟ دل بیوپاری کی کنجوسی سے مبہوت نہیں ہوتا اسی سبب سے اُسے کھینچنے کے لئے جل تھل اور آسمان میں قدم قدم پر اصل مطلب کو چھپا کر اتنا غیر ضروری اہتمام کیا گیا ہے - دنیا اگر حسن کے رس میں ڈوبی ہوی نہ ہوتی تو ہم بالکل حقیر اور بے آبرو ہوکر رہتے - ہمارا دل کہتا کہ اس دنیا کی محفل میں مجھہ کو مدعو نہیں کیا گیا لیکن تمام دنیا اپنے ان گنت کاموں میں بھی مسرت پیدا کر کے یہی کہہ رہی ہے کہ میں تم کو چاہتی ہوں ، میں تم کو مختلف طرح سے چاہتی ہوں ، ہنسی میں رونے میں ، ڈر میں بھروسے میں ، غصے میں اور سکون میں —

اس طرح دنیا میں ہم دو طرح کے کام دیکھتے ہیں - ایک کام کا اظہار اور دوسرے جذبات کا اظہار - لیکن کام کے ذریعے جو کچھہ نمایاں ہوتا ہے اسے کامل طور سے دیکھنا اور سمجھنا ہمارا کام نہیں ہے - ہم دنیا کے اسرار کا پوری طرح اپنی علمی قوت سے حل نہیں سمجھہ سکتے کیونکہ وہ کامل طور پر ہمارے سامنے نمایاں نہیں ہوسکتے - لیکن جذبات کا اظہار بالکل کھلا اظہار ہے - جو خوب صورت ہے وہ خوب صورت ہے اور جو عظیم ہے وہ عظیم ہے ، جو خوفناک ہے وہ خوفناک ہے دنیا کی مسرت ایک دم

ہمارے دل میں داخل ہوتی ہے اور ہمارے دل کی مسرت کو باہر کھینچ لاتی ہے - اس ملاپ میں کتنی ہی تاک جھانک کیوں نہ ہو، کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ پیش آئیں تو بھی تلاش کرنے سے جذبات کے اظہار اور ہمارے دل کے میل کے سوا اس میں کچھہ نہیں ملتا —

تب ہی تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا اور انسانی دنیا کے مابین ایک طرح کی مشابہت ہے - خدا کی صداقت کی شکل دنیاے علم و عرفان کے گونانوں واقعات میں نمایاں ہوتی ہے اور اس کی مسرت کی شکل دنیا کے مختلف رسوں میں بے نقاب ہوتی ہے - واقعات میں خدا کے علم کی شکل کو سمجھنا مشکل ہے لیکن رس میں اس کی مسرت کی شکل کو محسوس کرنے میں دشواری نہیں ہوتی کیوں‌کہ رس میں تو وہ خود اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے —

انسانی دنیا میں بھی ہماری علمی قوت کام کر رہی ہے اور ہماری قوت نشاط رس کو پیدا کرتی ہے - کاموں کے ذریعے ہماری حفاظتی قوت اور رس کے ذریعے ہماری خود نمائی کی قوت ظاہر ہوتی ہے - ہمارے لئے حفاظت ذاتی کی ضرورت ہے اور خود کو نمایاں کرنا ہماری ضرورت سے زیادہ ہے —

ہم لڑائی کی مثال میں یہ دکھا چکے ہیں کہ ضرورت نمائش کے اور نمائش ضرورت کے راستے میں رکاوٹیں ڈالتی ہے - خود غرضی فضول خرچی نہیں چاہتی اور فضول خرچی ہی میں مسرت اپنا پتہ دیتی ہے - اسی سبب سے خود غرضی کے میدان میں ہماری نمود و نمائش جتنی کم ہوتی ہے اتنا ہی وہ کام معزز ہوجاتا ہے اور خوشی کے جلسے میں خود غرضی کو جتنا بھلا دیتے ہیں جلسہ اتنا ہی خوش نما ہوتا ہے —

اس لیے ادبیات میں انسان کے لیے خود کو نمایاں کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی - خود غرضی اس نمائش سے دور ہے - وہاں دکھہ دل میں آنسوؤں کی دھاریں پیدا کرتا ہے لیکن ہمارے دنیا کے کاموں میں دست اندازی نہیں کرتا - ڈر ہمارے دل کو دہلا دیتا ہے لیکن ہمارے جسم کو صدمہ نہیں پہنچاتا - سکھہ ہمارے دل کو شگفتہ کر دیتا ہے لیکن ہمارے لالچ کو نہیں جگاتا - اس طرح انسان اپنی ضرورت کی دنیا کے پہلو بہ پہلو ضرورت کے علاوہ دنیاے ادبیات کی تخلیق کر رہا ہے - اس کے ذریعے وہ خود کو کوئی نقصان نہ پہنچاکر مختلف رسوں کے ذریعے اپنی فطرت کو مختلف شکلوں میں محسوس کرنے کی مسرت حاصل کرتا ہے - اپنی نمود و نمائش کو بغیر کسی رکاوٹ کے دیکھتا ہے وہاں کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی وہاں مسرت ہی مسرت ہوتی ہے - وہاں سپاہی پہرہ دار نہیں ہوتے وہاں خود مہاراجہ ہوتے ہیں —

اس لیے ادبیات میں ہم کس چیز کی واقفیت حاصل کرتے ہیں ؟ اس چیز کی جو انسان میں ضرورت سے بالا ہے ' جو الوہیت ہے ' جو اس کی تمام ضرورتوں کو عبور کرگئی ہے - جو اس کی دنیا کے اندر ختم نہیں ہوسکتی -

اسی وجہ سے ہم نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ کھانے کا مزا اگرچہ دنیا میں چھوٹے بچے سے لے کر بوڑھے تک ہر کوئی جانتا ہے اس پر بھی ادبیات میں سوائے مزاحیہ (A farce) کے اسے کہیں اور جگہ نہیں ملی کیونکہ وہ مزا بھوک کی سیری سے آگے نہیں بڑھتا - پیٹ بھرنے کے بعد ہم بادل کی طرح ایک گہرے " آہا " یعنی کلمۂ انبساط کے اظہار سے اسے (کھانے کے مزے کو) جلد رخصت کر دیتے ہیں - ادبیات کے شاہی دربار میں دکشنا دینے کے لیے ہم اسے مدعو نہیں کرتے لیکن جو ہمارے بھنڈار کے برتنوں میں کسی طرح بھی

نہیں سما تا وهی تمام رسوں کی طوفان خیز روانی ادبیات کے اندر لہریں اُٹھا کر ترنم کرتی هوی بہہ جاتی هے - انسان اُسے اپنی ضرورتوں هی میں ختم نہیں کرسکتا اسی لیے بھرے دل کی روانی سے ادبیات میں نمایاں کرکے سکون حاصل کرتا هے —

اس طرح کی زیادتی میں انسان دراصل نمایاں هوتا هے انسان کھانے کو پسند کرتا هے یہ بالکل سچ هے؛ لیکن انسان بہادر هے یہ اس سے بھی زیادہ سچ هے - وہ گنگا کی طرح پتھروں کو پیس کر ایراوت (اندر کا هاتھی) کو تیرا کر گانو' شہر اور دھان کے کھیتوں کی پیاس بجھا کر ایک دم سمندر میں جا گرتا هے - انسان کی بہادری انسانی دنیا کے تمام کاموں کو پورا کرکے دنیا کو عبور کر جاتی هے —

اس طرح قدرتاً انسان کی جو چیز عظیم الشان اور همیشہ رهنے والی هے اور جسے وہ اپنے کاموں میں ختم نہیں کرسکتا وہ انسان کی ادبیات میں محفوظ هوکر خود بخود انسان کی بہت بڑی شکل بنا دیتی هے —

اور بھی ایک سبب هے - دنیا میں هم جسے دیکھتے هیں منتشر شکل میں دیکھتے هیں - اسے، کچھہ آگے سے کچھہ پیچھے سے کچھہ ادھر سے اور کچھہ ادھر سے دیکھتے هیں اور دس کے ساتھہ مقابلہ کرکے دیکھتے هیں - لیکن ادبیات میں اس طرح نہیں دیکھا جاتا - ادبیات میں جس چیز کو نمایاں کیا جاتا هے اُسی پر پوری روشنی ڈالی جاتی هے - اس وقت کسی اور دوسری چیز کو نہیں دیکھنے دیا جاتا - اس کے لیے مختلف قسم کی صنعتوں سے ایک خاص جگہ بنا دینی پڑتی هے جہاں سے صرف وهی چیز چمکتی رهتی هے —

ایسی حالت میں اس قسم کی کامل آزادی میں اور اس طرح کی تیز روشنی میں جو چیز اچھی نہیں معلوم هوتی اسے هم قدرتاً ایسی جگہ

نہیں کھڑا کرتے کیوں کہ ایسی جگہ پر اگر ناموزوں چیز کھڑی کردی جائے تو وہ اس کی بے توقیری ہے - دنیا کے مختلف پردوں میں پیٹو آدمی پر نظر نہیں پڑتی لیکن جب ہم اسے ادبیات کے پلیٹ فارم پر مخصوص روشنی میں پیش کرتے ہیں تو وہ مضحکہ انگیز بن جاتا ہے - اس لیے انسان جس شکل کو روشنی میں لاتا ہے اور وہ ناقص نہیں ہے ' انسان کا دل جس شکل کو رحم یا بہادری میں ' خوف یا سکون میں اپنا ٹھیک نمائندہ تسلیم کر لینے میں پس و پیش نہیں کرتا اور جو شکل حسن صنعت کے حدود میں کھڑی ہوکر ٹکٹکی باندھنے والی نظر کو برداشت کر سکتی ہے ' اسی شکل کو انسان قدرتاً ادبیات میں جگہ دیتا ہے - ورنہ اس کی غیر موزونیت ہمارے لیے باعث تکلیف ہوجاتی ہے - راجا کے سوا اگر ہم کسی اور کو تخت پر بیٹھا ہوا دیکھیں تو ہمارے دل میں بغاوت پیدا ہوجاتی ہے —

لیکن تمام انسانوں میں قوت مدرکہ بڑھی ہوی نہیں ہوتی - سب سماج بھی وسیع نہیں ہوتے اور کوئی وقت ایسا آتا ہے جب کہ ایک عارضی اور ناقص چیز کا فریب انسان کو چھوٹا بنا دیتا ہے - ایسے بگڑے وقت کے آئینے میں چھوٹی چیز بڑی نظر آتی ہے اور اس وقت کے ادبیات میں انسان اپنی چھوٹی چیز کو بھی بڑی بنا کر دکھاتا ہے اور اپنے بدنامی کے داغ پر فخر کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے - اس وقت صنعت کی بجائے اپنی چالاکی ' عظمت کی بجائے غرور اور " ٹینیسن " کی بجائے " کپلنگ " کو لا کھڑا کرتا ہے —

لیکن بڑا وقت بیٹھا ہوا ہے - وہ سب کو چھانتا اور پھٹکتا ہے - اس کی چھلنی میں سے جو چھوٹا اور ناقص ہوتا ہے وہ نکل آتا ہے اور مٹی میں مل کر مٹی بن جاتا ہے - مختلف زمانوں اور مختلف لوگوں میں

وھی چیزیں تکتی ھیں جن میں تمام انسان خود کو دیکھہ سکتے ھیں - اس طرح چھان کر چلنے سے جو چیزیں رہ جاتی ھیں وہ تمام ملکوں اور تمام زمانوں کے انسانوں کی ملکیت ھوتی ھیں —

اس طرح توڑ پھوڑ کر اور گھڑ کر ادبیات میں انسانی فطرت کا ' انسان کے اظہار کا ھمیشہ رھنے والا نمونہ خود بخود جمع ھوتا جاتا ھے - یہی نمونہ نئے زمانے کی ادبیات کی پتوار کو بھی پکڑے رھتا ھے - اس نمونے کے مطابق اگر ھم ادبیات پر غور کریں تو تمام انسانوں کی قوت مدرکہ کی مدد لینی پڑتی ھے —

اب اصل بات کے کہنے کا وقت آگیا ھے - وہ یہ ھے کہ اگر ھم ادبیات کو ملک ' زمانہ اور کردار میں محدود کرکے دیکھیں تو ھم ادبیات کو حقیقی طور سے نہیں دیکھہ سکتے - اگر ھم اس بات کو سمجھہ لیں کہ ادبیات میں تمام دنیا کا نمائندہ انسان خود کو نمایاں کر رھا ھے تو ھم ادبیات میں قابل دید چیز کو دیکھہ سکیں گے - جہاں ادبی تصنیف میں مصنف خود صرف اظہار کا ذریعہ نہیں بن گیا ھے وھاں اس کی تصنیف برباد ھوگئی ھے اور جہاں مصنف نے اپنے احساسات میں تمام انسانوں کے جذبات کو محسوس کیا ھے اور اپنی تصنیف میں تمام انسانوں کے درد کو نمایاں کیا ھے وھاں اس کی تصنیف نے ادبیات میں جگہ حاصل کرلی ھے - ھمیں ادبیات کو اس طرح سمجھنا پڑے گا کہ تمام دنیا کا نمائندہ انسان شاھی معمار بن کر اس ادبیات کے مندر کی تعمیر کر رھا ھے مصنف مختلف ملکوں اور مختلف زمانوں سے آکر اُس کے مزدور بن کر کام کر رھے ھیں - تمام

عمارت کا خاکہ کیا ہے ؟ یہ کسی کو معلوم نہیں - لیکن بنانے میں جہاں غلطی ہوجاتی ہے وہاں وہ بار بار ٹوٹ جاتی ہے - ہر ایک مزدور کو اپنی قدرتی کامل قابلیت کے ذریعے اپنی تخلیق کو سب کے ساتھہ موزوں بناکر اُس نظر نہ آنے والے خاکے کے ساتھہ ملانا پڑتا ہے - اس میں اس کی قابلیت ظاہر ہوتی ہے اور اسی سبب سے اُسے معمولی مزدوروں کی طرح معمولی تنخواہ نہیں دی جاتی - اس کی ایک اُستاد کی طرح عزت کی جاتی ہے —

ہم پر جس مضمون کے غور و خوض کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے اُسے ادبیات عالم (Comparative Literature) کہتے ہیں —

انسان اپنے افعال کے ذریعے کونسی بات کہتا ہے ؟ اُس کا مقصد کیا ہے ؟ اس کی کوشش کس قسم کی ہے ؟ اگر ہم ان باتوں کو جاننا چاہیں تو تمام تاریخوں میں انسان کے مقصد کی پیروی کرنی پڑے گی اکبر کی حکومت ' یا گجرات کی تاریخ ' یاالزبتھہ کا کردار اس طرح الگ الگ کرکے دیکھنے سے صرف معلومات حاصل کرنے کی خواہش پوری ہوتی ہے - جو جانتا ہے کہ اکبر یاالزبتھہ صرف ذریعہ ہیں ' جو جانتا ہے کہ انسان تمام تاریخوں کے ذریعے اپنے بہت گہرے مقصد کو مختلف جد و جہد ' بھول اور اصلاحوں کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہے ' جو جانتا ہے کہ انسان تمام کاموں میں سب کے ساتھہ بڑی حد تک مل کر نجات حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہے ' جو جانتا ہے کہ آزاد حکومت خود کو ایک بادشاہ کی حکومت میں اور ایک بادشاہ کی حکومت خود کو جمہوریت میں کامیاب بنانے کے لئے کوشش کررہی ہے ' اور انسان تمام دنیا کے نمائندہ انسان میں خود کو نمایاں کرنے کے لئے '

انفرادیت اکثریت میں خود کو حاصل کرنے کے لئے جوڑ توڑ کر رہے ہیں' وہ شخص انسان کی تاریخ میں کسی خاص شخص کا نہیں بلکہ ہمیشہ رہنے والے انسان کے ہمیشہ رہنے والے زندہ مقصد کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے - وہ صرف تیرتھ کے مسافروں ہی کو دیکھ کر واپس نہیں ہوجاتا بلکہ تمام مسافر جس دیوتا کے درشن کے لئے مختلف مقامات سے آتے ہیں اُسے دیکھ کر گھر لوٹتا ہے —

اسی طرح ادبیات میں انسان اپنی مسرت کو کس طرح نمایاں کرتا ہے اور اِس نمائش کی حیرت انگیز تصویر میں انسان کی روح اپنی کونسی جاودانی شکل کو دکھلانا چاہتی ہے ' ادبیات میں یہی چیز دراصل قابل دید ہے - وہ خود کو روگی ' بھوگی ' یا جوگی کی کس شکل میں تعارف کرانے میں خوش ہوتا ہے ؟ دنیا میں انسان کا اپنا پن کتنی دور تک حقیقی بن گیا ہے یعنی سچ کہاں تک اُس کا اپنا بن گیا ہے ؟ اسی بات کے جاننے کے لئے ادبیات کی دنیا میں داخل ہونا پڑے گا - اسے بناوٹی سمجھ لینا درست نہیں ہے ۔ یہ ایک دنیا ہے اس کے عناصر کسی خاص شخص کے تابع نہیں ہیں - دنیا کی اور چیزوں کی طرح اس کی تخلیق ہو رہی ہے اور اسی بے انتہا تخلیق کی سب سے اندرونی تہ میں ایک انتہا کا نمونہ مستقل طور سے موجود ہے —

آفتاب کے اندر کی چیزیں خود کو مائع اور ٹھوس شکل میں مختلف طرح سے بنا رہی ہیں - ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے لیکن اُن کے چاروں طرف جو روشنی کا دائرہ ہے وہ آفتاب کو دنیا کے سامنے نمایاں کرتا ہے یعنی سب کے ساتھ خود کو ملا دیتا ہے - اگر ہم انسان کو اسی طرح کامل طور پر دیکھنے کی چیز بنا سکتے تو ہم اُسے بھی آفتاب

ھی کی طرح دیکھتے - اُس وقت ہم دیکھتے کہ اُس کی چیزیں اندر ھی اندر آھستہ آھستہ مختلف تہوں کے ذریعے بن رھی ھیں اور اس کے چاروں طرف ایک روشنی کا چمکدار دائرہ ھمیشہ اپنے آپ کو چاروں طرف پھیلا کر خوش ھو رھا ھے - ایک بار ادبیات کو اُس روشنی کے دائرے کی شکل میں دیکھو جو انسان کے چاروں طرف پھیلی ھوئی ھے تو معلوم ھوگا کہ یہاں روشنی کا طوفان بپا ھے ' روشنی کا سوتا پھوٹ رھا ھے اور روشنی کے بخارات کا اجتماع ھو رھا ھے —

شہر کے راستے پر چلتے چلتے ھم دیکھتے ھیں کہ انسان کو فرصت نہیں ھے - پنساری دوکان پر بیٹھا ھوا ھے ' لوھار لوھا پیٹ رھا ھے ' مزدور بوجھہ اُٹھائے جا رھا ھے ' بنیا اپنے کھاتے کا حساب ملا رھا ھے ' اُس وقت ھم اس کے ساتھہ ایک دوسری چیز کو نہیں دیکھہ پاتے - لیکن ایک مرتبہ چپ چاپ دیکھو راستے کے دونوں طرف ھر ایک گھر میں ' ھر ایک دوکان میں ' بازار میں ' گلی کوچے میں ' کس قدر شاخ در شاخ مسرت کی موج کتنے راستوں سے ھوکر ' کتنے میل ' تلخی اور فریبی پر پھیلتی چلی جا رھی ھے - رامائن ' مہابھارت ' کتھا کہانی ' کیرتن پانچالی (کتاب کا نام) دنیا کے نمائندہ انسان کے دل کا آب حیات دن رات ھر ایک انسان کو بانٹ رھی ھیں - بالکل حقیر لوگوں کے چھوٹے چھوٹے کاموں کی آڑ میں رام لچھمن آکر کھڑے رھتے ھیں ' تاریک مکان میں " پنچبوتی " (ایک مقام کا نام) کی رحم سے بھری ھوئی ھوا چلتی ھے - انسان کے دل کی تخلیق اور اس کے دل کی نمائش دونوں ' انسان کے میدان عمل کی سختی اور اس کی فریبی کو ' اپنے حسن اور ملگل کے کلگن پہنے ھوئے ھاتھوں سے ڈھانک رھے ھیں - تمام ادبیات کو تمام انسان کے

چاروں طرف ایک مرتبہ اس طرح دیکھنا پڑے گا - دیکھنا ہوگا کہ انسان اپنی حقیقی ہستی کو جذبات کے ذریعے اپنے چاروں طرف اور بھی بہت دور تک بڑھا کر لے گیا ہے - اس کی بارش کے چاروں طرف کتنے گانوں کی برسات ' نظموں کی برسات ' کتنے " میگھ دوتھ " (کالی داس کی ایک نظم) کتنے " ودیا پتی " (ہندی اور بنگالی زبان کا مشہور شاعر) پھیل رہے ہیں - اپنے چھوٹے سے گھر کے سکھ دکھ کو اُس نے کتنے چندر بنسی اور سورج بنسی خاندان کے راجاؤں کی سکھ دکھ کی کہانی میں بڑا بنا لیا ہے - اس کی لڑکی کے چاروں طرف پاربتی کی دلدوزی ہمیشہ گھومتی رہتی ہے - وہ کیلاس (مہادیوجی کے رہنے کی جگہ) کی عظمت میں اپنی غربت کے دکھ کو ملا دیتا ہے - اس طرح لگاتار انسان اپنے چاروں طرف جس وسعت کو پیدا کرتا ہے اس کے ذریعے گویا خود کو پھیلا کر اپنے آپ کو وسیع کرتا جارہا ہے - جو انسان اپنے حالات سے مجبور ہے وہی انسان اپنے جذبات کی تخلیق کے ذریعے جو اپنی اس وسعت کی تخلیق کررہا ہے ' دنیا کے چاروں طرف ایک دوسری دنیا بنا رہا ہے - یہی ادبیات ہے —

اس بات کا آپ خیال تک بھی نہ کریں کہ اس ادبیات عالم میں میں آپ کا رہنما بن سکوں گا اپنی اپنی قوت کے مطابق ہم سب کو یہ راستہ طے کرنا پڑے گا - جس طرح میں تو اتنا ہی کہنا چاہتا تھا کہ زمین میرا کھیت ' تمہارا کھیت ' اور اُس کا کھیت نہیں ہے ' زمین کو اس طرح سے جاننا بالکل اناڑیوں کی طرح جاننا ہے - اسی طرح ادبیات میری تخلیق ' تمہاری تخلیق ' اور اُس کی تخلیق نہیں ہے - عام طور پر ہم ادبیات کو اسی طرح اناڑی پن سے دیکھا کرتے ہیں -

اس اناڑی پن کی تنگ نظری سے خود کو ہٹاکر ادبیات عالم کے اندر انسان عالم کو دیکھنا ہم اپنا مقصد بنائیں گے : ہر ایک مصنف کی تخلیق کے اندر ایک تکمیل کو دیکھیں گے اور اس تکمیل کے اندر تمام انسانوں کی نمائش کی کوشش کا تعلق معلوم کریں گے - اس طرح کے عزم کرنے کا وقت آگیا ہے —

ساقی نامۂ درد مند

از

شیخ چاند ایم، اے - ایل ایل ، بی

محمد فقیہ المتخلص بہ درد مند اودگیر ضلع بیدر (دکن) کے نجباء سے تھے ان کی پیدائش وہیں ہوی - کم سنی میں اپنے والد کے ساتھ سنہ ۱۱۳۶ ھ میں شاہ جہاں آباد دھلی گئے تھے - آزاد بلگرامی کے بیان کے مطابق شاہ ولی اللہ اشتیاق سرھندی نبیرۂ شاہ اہل وحدت نے اپنے سایۂ عاطفت میں لیا اور تہذیب اخلاق اور تحصیل حیثیات میں مشغول ہوے - درد مند کے والد نے جب کچھ دنوں کے بعد رحلت کی تو میرزا جان جاں مظہر نے اپنے آغوش شفقت میں لیا —

قایم نے آزاد بلگرامی کی اس اطلاع کو دو سال بعد (۱۱۶۸ ھ) اس رنگ میں پیش کیا - " درد مند عنفوان شباب میں دلفریب حسن رکھتا تھا - شاہ ولی اللہ اشتیاق ... اس کے جمال کے مشاہدے سے حیات تازہ حاصل کرتے تھے ' لیکن چونکہ حسین پھول میں وفا کے رنگ و بو کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے اس لیے معمولی تغیر سے میرزا جان جاں سے جا ملا " —

قایم کے بیان میں درد مند کے تلون مزاج بلکہ بے وفایانہ افتاد طبع

کا اشارہ ملتا ہے - جس ادنیٰ تغیر کا قایم نے ذکر کیا ہے اس کا کچھ حال نہیں کھلتا - لیکن اس میں مطلق شبہ نہیں کہ درد مند اپنے والد کی وفات کے بعد مرزا مظہر کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے تھے - یہ واقعہ ۱۱۶۱ سے قبل کا ہے اس لیے کہ شاہ اشتیاق نے بقول قایم اسی سال رحلت کی - اس سےکافی قبل مظہر نے درد مند کو اپنے ظل عاطفت میں لیا تھا - اس کے بعد درد مند مظہر ہی کے تربیت کردہ ' شاگرد اور مرید کہلائے اور شاہ اشتیاق کی سرپرستی و استادی کا ذکر مذکور بہت کم ہوگیا اسی زمانے میں لوگ اس کو بھول گئے چنانچہ ہم عصر تذکرہ نگاروں نے درد مند کے سلسلے میں اشتیاق کی بجائے مرزا مظہر کا ذکر کیا ہے -

میر نے ۱۱۶۵ میں لکھا ہے : - " اس قدر جانتا ہوں کہ مرزا مظہر کے نظر یافتہ ہیں " آزاد نے سرو آزاد (مولفہ ۱۱۶۶ ھ) میں لکھا ہے : - " ان کی (مرزا مظہر کی) عنایت و تربیت سے مجموعۂ کمالات ہوگئے اور فن سخن میں رتبۂ شایستہ پیدا کیا " - گردیزی کا بیان ہے : - " درد مند کی شمع ادراک مرزا مظہر کے تجلی کدے سے روشن ہوی ہے " - قایم ۱۱۶۸ میں لکھتا ہے : - " مدت تک ان کی (مظہر کی) خدمت میں استفاضۂ آگاہی کیا اور سخن سنجی شروع کی " - ان کے علاوہ قدرت اللہ شوق ' میر حسن ' شفیق عبدالوہاب افتخار ' علی لطف ' قاسم اور دیگر تذکرہ نویسوں نے بھی لکھا ہے -

اگر چہ تذکرہ سازوں نے درد مند کے حق میں شاہ اشتیاق کی ابتدائی تعلیم ' تربیت اور فیض و اثر کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ ان کی صحبت و تعلیم نے دیگر فیوض و برکات کے ساتھ درد مند کے دل میں شعر و سخن کا شوق بھی جاگزیں کردیا تھا - شاہ صاحب ایک صاحب ذوق شاعر تھے - قایم نے ان کی نسبت لکھا ہے - " باوجود مذاق علمی چاشنیٔ فقر داشت

در کوٹلۂ فیروز شاہ سکونت داشت انزوا گزیدہ اوقات عزیز بیاد الٰہی بسر می برد هر گاہ کہ از تدوین و ترتیب نسخۂ عقبیٰ فراغتش روے نمود چیزے از قبیل فارسی بر سبیل فکر می کرد - بندہ روزے بخدمتش حاضر شدم حرفہاے بامزہ می گفت " —

اس صحبت کا اثر ہونا لازمی تھا اور ہمارا خیال ہے کہ فارسی کا شوق ابتداءً یہیں پیدا ہوا اور یہی وجہ ہے کہ ۱۱۶۶ ھ سے قبل اپنا فارسی دیوان مرتب کر لیا تھا جیسا کہ گردیزی کے بیان سے ثابت ہوتا ہے - اور اسی کا اثر تھا کہ آخر تک فارسی ہی میں طبع آزمائی کرتے رہے اور ریختہ کی نسبت لکھا ہے کہ مرزا مظہر جان جاں کی محبت سے مجبور ہو کر اس میں طبع آزمائی کی ہے —

محبت نے مجکوں کہا لا جواب
وگرنہ میں اور ریختہ کیا حساب

شاہ اشتیاق کی صحبت میں دردمند نے سخن گوی شروع کی ہو یا نہ کی ہو لیکن یہ تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ شاعری کا ذوق اُنہیں شاہ صاحب ہی کی صحبت میں ہوا - یہ ضرور ہے کہ مرزا مظہر کی استادی نے ان کے جوہر خوب چمکائے - مرزا ہی سے فقیری کا فیض پایا اور ریختہ میں طبع آزمائی بھی انہیں کی ایما سے کی - چنانچہ خود لکھا ہے :

خدیو سخن میرزا جان جاں کہ حکم اس کا ہے ناطقے پر رواں
اسے سب میں یارب امامت رہے قیامت تلک وہ سلامت رہے
کہاں تھا مجھے ریختہ کا خیال ہوا واجب ایک امر کا امتثال
محبت نے مجکوں کہا لا جواب وگرنہ میں اور ریختہ کیا حساب

دردمند کا قیام دہلی میں تقریباً تیس سال رہا اس طویل عرصے میں وہ کسب حیثیات کرتے رہے اور رفتہ رفتہ وہ کمال پیدا کیا کہ اچھے اچھے اہل علم و فضل ان کے معترف ہوگئے - خود مرزا جان جاں ان کے اوصاف شاعرانہ پرناز کرتے تھے اور اپنی استادی اور ان کی شاگردی پر فخر و مباہات کرتے تھے - اپنے ایک شعر میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے —

مظہر مباش غافل از احوال دردمند

لعلے ست ایں کہ درگرۂ روزگار نیست

قاسم نے لکھا ہے کہ :

" مرزاے مرحوم ان سے بدرجۂ اعلی خوش تھے " —

دردمند نے اپنے فضل و کمال اور شہرت و ناموری کی بنا پر بعض مقتدر امیروں کی سر پرستی حاصل کرلی تھی - ان میں سب سے زیادہ مشہور محمد شاہی مصاحب و وزیر نواب امیر خاں انجام عمدۃالملک ہیں جن کا اس زمانے میں طوطی بول رہا تھا۔ قاسم نے دردمند کے ایک شعر کے بارے میں لکھا ہے کہ "جب محمد شاہ بادشاہ محل سرا میں داخل ہوے اور وہاں سے نواب انجام کو رخصت کیا تو اس موقع پر یہ شعر کہا :—

سدھارے سرا پردۂ خاص کو

مرخص کیا بردۂ خاص کو

یہ شعر ساقی نامے کے کسی نسخے میں نہیں ملا شاید کسی دوسری نظم کا ہو - اس شعر سے نواب عمدۃالملک کی سر پرستی کی ہلکی سی شہادت ملتی ہے - محمد علی خاں کوی امیر تھے جو دردمند کے ممدوح تھے

ان کی شان میں لکھا ہے : -

رہی نہیں مجھے نیک و بد کی تمیز
کہ ہے ایک خاطر قیامت عزیز

کروں آب گوہر سے اول وضو
تب اس نام سے میں کروں گفتگو

سعادت ہے اس نام کا ذکر خیر
عبادات ہیں ناتمام اس بغیر

نبی اور علی اس سے آتے ہیں یاد
دو دولت ہیں یک نام سے مستفاد

محمد علی خاں سعادت کا جان
کہ کرتے ہیں اس سے فخر دونو جہان

امامت کا نخل برو مند ہے
کہ شاہ ولایت کا فرزند ہے

کئی شعروں میں ان کی تعریف ہے - یہ نہ معلوم ہوسکا کہ یہ کون امیر تھے - خود میر نے اسی زمانے میں لکھا ہے کہ ' کوئی محمد علی خاں تھے " -

یہ واقعات عہد محمد شاہی کے ہیں - اس کے اخیر میں نادری قہر نازل ہوا جس نے دہلی کو بے جان اور نڈھال کردیا - اس کے بعد ہی ابدالی کے ہنگاموں اور یورشوں کا آغاز ہوگیا اور خانہ جنگی ' طوایف الملو کی اور خود غرضیوں اور سازشوں کا وہ بازار گرم ہوا کہ دہلی میں کسی کا ٹھکانا نہ رہا - خود امراء و روسا دہلی کو چھوڑنے لگے - قدرشناس بے ٹھور ٹھکانا ہوگئے اور جگہ جگہ پناہ گیر ہونے لگے - اس فتنہ خیز اور افرا تفری کے زمانہ میں درد مند نے دہلی کو خیر باد کہی -

آزاد بلگرامی اور گردیزی کے بیان کے مطابق درد مند ۱۱۶۶ ھ کے لگ بھگ شاہ جہاں آباد سے بنگال گئے - وہاں کے حاکم نے بڑی قدر کی - وہاں یہ بجمعیت خاطر گزراں کرتے تھے - علی لطف کا بیان ہے کہ " چند مدت عظیم آباد میں بود باش کی ہے اور رفاقت میں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کے بھتیے کی گزران معاش کی ہے - بعد اس کے پھر دلی گئے اور چند مدت وہاں رہے - پھر نوازش محمد خان شہامت جنگ

بھتیجے نواب وردی خان مہابت جنگ کے بلائے ہوے شاہ جہاں آباد سے مرشد آباد میں آے اور طور بود و باش کا وہیں ٹھہراے - رفاقت میں نواب مذکور کی البتہ ایک رفاہ حال ہوا - آخر ۱۱۷۲ ھ میں بلدۂ مرشد آباد کے اندر انتقال ہوا" —

تاریخ وفات کے بارے میں اختلاف ہے - یوسف علی خاں نے (جو درد مند کو اپنا دوست بتاتا ہے) اپنے تذکرے (مولفہ ۱۱۸۰ - ۱۱۱۴ ھ) میں سنہ وفات ۱۱۷۹ ھ لکھا ہے (ملاحظہ ہو فہرست کتب خانۂ شاہان اودھ) - درد مند بہت خوش اختلاط شخص تھے - لوگوں سے مراسم اچھے تھے - آزاد بلگرامی سے ملاقات نہ تھی لیکن ان سے خلوص تھا - آزاد کا بیان ہے " فی مابین فقیر (آزاد) و مشار الیہ (د د مند) غائبانہ اخلاص وافی است و ہمیشہ طریق مراسلات مسلوک "-علی لطف نے لکھا ہے " طریقۂ مصاحبت و اختلاط کے ماہر حد سے زیادہ تھے " —

درد مند کی شہرت و عظمت کا راز ان کی شاعری میں ہے - وہ فارسی اور ریختہ دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے لیکن فارسی کی طرف میلان طبع زیادہ تھا - اکثر مشہور اور مستند تذکروں میں ان کا ذکر اور ان کے کلام کے نمونے موجود ہیں - ان کا فارسی دیوان بقول گردیزی سنہ ۱۱۶۲ ھ سے قبل مشہور ہو چکا تھا - کتب خانۂ شاہان اودھ میں اس کا ایک نسخہ موجود تھا - فارسی دیوان ہمارے پیش نظر نہیں البتہ مختلف تذکروں * میں ان کے جو اشعار بطور نمونہ درج ہیں وہ یہاں نقل کئے جاتے ہیں —

* سرو آزاد ' تذکرۂ بے نظیر ' گل رعنا مولفہ شفیق ' عبرۃ الغافلین سودا —

در کوے مے فروش نماند آبرو مرا   لب تشنگی فروخت بدست سبو مرا
جاں بے کسانہ دادم و شادم کہ عمرہا   بوداست برمراد تو مرگ آرزو مرا

—————

ایں الم در قفس آورد بفریاد مرا   کہ بہار آمد و کس گل نفرستاد مرا

—————

آں قدر باقفس افتاد سرو کار مرا   کہ فراموش شد آخر رہ گلزار مرا
گرہمہ شربت وصل است کہ لذت ندھد   آنقدر داشت فلک تشنۂ دیدار مرا

نامہ ام تا باز ننماید کسے خوب مرا   کشتہ قاصد را بگردن بستہ مکتوب مرا

—————

صدے ز قفس جست کجاں می برم امروز   ایں گونہ کہ رنگ از رخ ہا پریدہ است

—————

(رباعی)

از فیض تو اے شافع روز محشر   هر روز بود عید غدیر دیگر
چوں جام بود چشم امیدم در حشر   بر دست تو اے ساقیٔ حوض کوثر

(رباعی)

آنم کہ نشاط را از شیون طلبم   سرمایۂ زیستن ز مردن طلبم
چوں تیغ جفا کشی من از بہ دعا   از سر تا پا چو شمع کردن طلبم

—————

تا دید جذبۂ دل حیرت شعار من   آئینہ صاف نیست بہشت غبار من

چو خوبی بلندہ خوبے شود گرد م اسپراو　　مردم جوانی را هم عمراست پیراو

(رباعی)

یک چند عتاب و ناز ظاهر کردی　　وین عمر دو روزہ بار خاطر کردی
بعد از مردن رحمت بخاکم افتاد　　اول بایست آنچه آخر کردی

یہ اشعار شاہد ہیں کہ دردمند فارسی کے پختہ گو شاعر ہیں - ان کے کلام میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں جو ایک مشاق اور صاحب ذوق شاعر کے لئے لازم ہیں - اس زمانے کے اساتذۂ تلقود نے ان کے فارسی کلام پر بہت عمدہ رائیں دی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا فارسی کلام مقبول اور مشہور تھا - ہم چند رائیں درج کرتے ہیں - آزاد بلگرامی " از شعرائے خوش تقریر ' فارسی و ریختہ هر دو خوب می گوید " - شفیق " در سخن رتبۂ بلند و پایۂ ارجمند می دارد - اشعار فارسیش بین الجمهور مشهور است " " شعر فارسیش با گفتگوے مرزا (مظهر) مانا است " - علی لطف " فارسی دیوان ان کا صاحب نظروں کا منظور ہے " —

گردیزی " دیوانے بہ زبان فارسی جمع کردہ دراں تلاش معنی رنگین و الفاظ درد آگین نمودہ داد سخن گستری دادہ "

فارسی سے قطع نظر کرلی جاے تو دردمند کا پایہ اردو شاعری میں بھی کافی بلند ہے اردو دیوان کا اب تک پتہ نہیں چلا - تذکروں * میں چند اشعار ملتے ہیں جو یہاں بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں ان سے دردمند

---

* گردیزی ' قائم ' میر حسن ' علی لطف —

کی ریختہ گوئی کا ایک حد تک اندازہ ہوگا —

ہے غم سے رقیبوں کے مرا دل ناشاد
اس دھر کے سے جاتے ہیں سبھی عیش بباد
پرویز کے شیشہ خانۂ عشرت پر
سنگ آیا و لیکن سخت آیا فرہاد

———

کہسار میں جا گرا ناحق کے تئیں پرویز سے جا بھڑا ناحق کے تئیں
کوئی ٹکر پہاڑ سے لیتا ہے فرہاد کا سر پھرا ہے ناحق کے تئیں

قفس تک بھی نہ پہنچے اور پڑے دور آشیانے سے
عجب ساعت میں بچھڑے ہیں چمن کے آشیانے سے

———

الٰہی مت کسی کو پیش رنج و انتظار آوے
ہمارا دیکھئے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

• دردمند کو اردو زبان کی تاریخ میں جو جگہ ملتی ہے وہ محض ان کی مثنوی ساقی نامے کی وجہ سے - یہ ایک مثنوی ہے جس کا تعلق خمریات سے ہے - یہ کوئی عشقیہ مثنوی نہیں اس لئے اس میں کسی فسانے کی مسلسل و مربوط رویداد نہیں - اس کے نام (ساقی نامہ) سے ظاہر ہے کہ رندی و مستی اور خمر و نشہ کے مضامین کی حامل ہے - اس کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ اردو زبان میں ان مضامین کو اس شکل میں مستقل طور سے پہلی دفعہ اس قادر کلامی کے ساتھہ قلم بند کیا گیا ہے - دو سو سال قبل کی زبان ہے - عہد محمد شاہی میں لکھی گئی ہے لیکن جو

نمکینی اور صفائی اس کی زبان میں ہے اور جو سلاست و پختگی اس کے طرز ادا میں پائی جاتی ہے اس سے آج بھی ہم لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ بات اس دور کی شاعرانہ پیداوار میں بڑی حد تک مفقود ہے۔ فارسی میں ساقی نامے شاعروں نے کثرت سے لکھے ہیں لیکن اردو میں ان کا وجود نہ تھا درد مند سب سے پہلا شاعر ہے جس نے اس اہتمام اور کامیابی کے ساتھ یہ نظم لکھی ہے کہ اس کے بعد کسی شاعر کو لکھنے کی ہمت نہیں ہوی اور یہی وجہ ہے کہ تمام اساتذہ نے اس کی تعریف متفق اللسان ہوکر کی ہے۔ چند رائیں ملاحظہ ہوں —

آزاد بلگرامی: " ساقی نامۂ ریختہ او مشہور است کہ مقبول طبایع گردید " -

قدرت اللہ شوق: " ساقی نامۂ او بر السنۂ خواص و عام مذکور است " —

افتخار دولت آبادی: " ساقی نامۂ او شہرت دارد " -

شفیق: " ساقی نامۂ ریختہ او مشہور آفاق است " " طرفہ صفائے و نمکے دارد " —

میر حسن: " ساقی نامۂ ... بسیار با نمک گفتہ و گوہر معانی سفتہ " —

قاسم: " ایں ساقی نامہ خیلے مشہور و بر زبان خلق جاری است " -

ان تذکرہ نگاروں کے علاوہ اردو زبان کے " نقاش اول " مرزا جان جاں بھی اس کی بڑی تعریف کرتے تھے اور بقول قاسم اس کو بار بار سنتے تھے —

ساقی نامہ کی مقبولیت و شہرت کا حال قدیم تذکرہ سنجوں کے بیانوں سے بخوبی ہوتا ہے اس کے سوا ایک اور ثبوت اس کی غیر معمولی شہرت کا یہ ہے کہ سید عبد الولی عزلت نے اس کے جواب میں ایک مثنوی ۲۳۱ شعر کی بیان ظہور کے تاریخی نام سے ۱۱۷۴ ھ میں لکھی۔ یہ خیال ہوسکتا ہے کہ درباری رشک و حسد سے مغلوب ہوکر جواب میں یہ مثنوی

لکھی ہو اس لئے کہ دونوں ایک ساتھہ کچھہ عرصے کے لئے مرشد آباد میں تقریباً ایک ہی سرکار کے متوسل تھے - دردمند کا سر پرست نواب علی وردی خاں کا بھتیجا تھا اور عزلت کا سرپرست خود نواب تھا۔ لیکن یہ قیاس کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا عزلت ایک ضابط و متین متوکل اور با وضع قلندر تھا۔ درباری رقابت سے اس کی ذات بہت ارفع تھی دوسرے گر وہ اس کا جوب دیتا بھی تو مرشدآباد میں دے سکتا تھا جہاں دردمند بھی موجود تھا اور شاعرانہ مجادلے کے لئے موزوں میدان بھی تھا۔ اس کے برخلاف عزلت نے یہ جواب مرشد آباد کو خیر باد کہنے کے کافی عرصے کے بعد دکن میں دیا ہے اور وہ بھی ایک عجیب اتفاق کی بنا پر - خود عزلت نے اپنی مثنوی بیان ظہور کی تقریب میں لکھا ہے "چند پر خلوص احباب چاندنی کا لطف اتھا رہے تھے' صحبت شعر بھی گرم ہوگئی کسی نے درد مند کے ان اشعار کا ذکر چھیڑ دیا جو اس نے چاندنی کے حق میں کہے ہیں" (ملاحظہ ہوں آخری آتھہ شعر) - جن کا خلاصہ یہ ہے کہ شاعر نے ساقی کو سیر باغ کی ترغیب دی پھر جام و مینا کا اشتیاق ظاہر کیا' راگ کی خواہش کی اور آخر میں چاندنی کے سیر کی تکلیف دی۔ جوش مستی اور سرور مے و نغمہ میں چاندنی نے قیامت کردی - اس عالم میں دل پر تاثرات و جذبات کا جو ہجوم ہوا تو تاب نہ لاسکا - نور مہتاب کو دیکھہ کر جی اس طرح ڈوب گیا جس طرح پانی کو دیکھہ کر مصروع کا دل بیتھہ جاتا ہے - شاعر کہتا ہے کہ مہتاب سے دشمنی کی توقع نہ تھی لیکن ذرا غور کیا تو خود اپنا قصور نظر آیا - مے و نغمہ اور رندی و مستی گناہ ہے جس کی پاداش میں خدا نے طوفان نازل کیا۔ لیکن چونکہ ہم گنہگار' حضرت محمد علیہ السلام

کے امتی ہیں اس لئے ہمارے لایق طوفان نور نازل کیا - دردمند نے شاعرانہ حسن تعلیل سے جوش مہتاب کے اثرات کو دکھایا ہے ' لیکن عزلت نے یہ اعتراض کیا ہے کہ " حضرت محمد علیہ السلام کے امتی دنیا میں مورد عتاب نہیں - اس کے سوا چاندنی اس وقت سے ہر ماہ چٹکتی ہے جب سے کہ دنیا بنی ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں کہ اسے طوفان کہا جاے - بڑے تعجب کا مقام ہے کہ امت نوح پر تو صرف ایک بار طوفان آے اور حضرت محمد کی امت پر ہر ماہ طوفان نازل ہو - یہ طوفان مخصوص بہ امت محمدی نہیں - سابق کی امم بھی بلا تخصیص اس کی مورد تھیں - مقام حیرت ہے کہ اہل معنی (دردمند) اس ذرا سی بات کے سمجھنے میں کوتاہی کریں - دردمند ایک پختہ گو شاعر ہے ایکی غلطی کے طوفان میں گھر گیا ہے " اس کے بعد چاندنی کے متعلق اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں کہ اس میں دو رمز ہیں —

کیا حق نے عزلت پر اپنا کرم ۔۔۔ دو معنی کئے اوس کے دل پر رقم
یہ ہے رمز اول جسے ماہ سے ۔۔۔ جو پوچھا میں الہام اللہ سے
کہ دل پر جلیں کے بہ فضل خدا ۔۔۔ ذرا مہر ایماں کا پر تو پڑا
وہ پوچھیں کہ محرم ہیں جو مومناں ۔۔۔ نہویں رحمت حق سے مایوس یاں
کہ جوں شب سے کل کر کے مہتاب آے ۔۔۔ ہٹے ظلمت اوس کی ہو جاے ضیاے
سیہ نامۂ مومنوں سے بہ حشر ۔۔۔ نکل نور رحمت ہو جاوے کا نشتر
جو سچ پوچھو تو نور ایماں وہی ۔۔۔ بن آوے کا خود نور رحمت سہی
ورق ان کے جرموں کا اُلٹے گا رب ۔۔۔ سیہ نامے اُجلے ہو جاویں گے سب
دویم رمز یہ ماہ سے ہے عیاں ۔۔۔ کہ عصیاں ہے حق نمک بھولنا
نمک نور خورشید کا کیا ہلال ۔۔۔ شب و روز بڑھتا رہا بال بال

ہوا بدر تب مہر سے کرکے عار رکھا دل میں اپنے کلف کا غبار
حق پرورش سب بھلا مہر کا حریف مقابل ہوا مہر کا
کیا مہ نے حق نمک دل سے حک نہیں چاندنی پھوٹ نکلا نمک

دردمند اور عزلت کے بیانوں کو پیش نظر رکھ کر فتوت اورنگ آبادی نے اپنی مثنوی در معلوی (مولفہ ۱۱۷۴ - ۱,۷۵) میں چلند شعر لکھے ہیں جن میں دونوں کے بیانات سے انحراف کرکے اپنا قول پیش کیا ہے —

کیا دونو نے خوب مہ کا ثبوت کہ تھا اصل میں اس کا جو تار و پوت
نشہ میں مجھے سے کے آیا خیال کہ ضرب المثل مہرا یہ ہے مقال
کہ مستوں کا احوال سن بے خبر ترحم کا حق نے کیا ہے نظر
ہے عصیاں یہ یہ مغفرت کا نشاں کہ سر مستوں کا ہے یہ حق بے گماں
خدا کی بھی قدرت تو معمور ہے نہیں چاندنی پردۂ نور ہے

——— ———

ان شاعرانہ موشگافیوں سے بھی ثابت ہے کہ ساقی نامہ کی شہرت عالمگیر تھی اس کو غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی ۔ اس زمانے میں کسی شاعر یا صاحب تنقید نے اس کی زبان و بیان پر خردہ گیری نہیں کی بلکہ تمام ارباب نظر نے اس کی بڑے شد و مد سے تعریف کی ہے - شفیق اورنگ آبادی نے ذیل کے شعر پر اعتراض کرتے ہوے لکھا ہے " اجزاے مصرعۂ ایں بہت خلاف روز مرۂ ھندوستان است و از جدا خواندن ایں بہت دریں ولا خود ثابت می شود " -

شفیق نے وہ شعر اس طرح نقل کیا ہے :—

ارے زاھدو ملکروں کے امام ارے آب انگور تجھہ پر حرام

لیکن ساقی نامے کے تمام نسخوں میں یہ شعر اس طرح درج ہے —

ارے زاہد ' اے منکروں کے امام

ارے آب انگور تجھہ پر حرام

اس سے ظاہر ہے کہ شفیق کے پیش نظر کوئی غلط نسخہ تھا - مصرعہ اولیٰ کے اجزا پر اس کا جو اعتراض ہے اس صورت میں وہ خود بخود رد ہوجاتا ہے —

ساقی نامے کی شہرت و مقبولیت (جو عرصے تک اس کو اہل شعر و سخن اور صاحبان فن میں رہی ہے) پر نظر کرتے ہوے ایک زمانے سے اس کی تلاش تھی - اتفاق سے اس کے تین نسخے مخدومی مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کے کتاب خانے میں ہاتھہ آے جن سے ایک نسخہ مرتب کرلیا گیا ہے جو ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے - ہماری قدیم مثنویوں میں جو چلد شعر خمر و نشہ کے مضامین پر لکھے جاتے تھے ہمارا خیال ہے کہ ان کے رواج اور ترقی میں درد مند کے ساقی نامے کی شہرت و مقبولیت بھی کارفرما ہے - اس نظر سے بھی اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا - قدیم اساتذہ کا کلام ہر وقت ہمارے پیش نظر رہنا چاہئے اس لئے کہ جب نیا ادب قدیم کی جگہ لیتا ہے تو اپنے اندر پچھلے اثرات ضرور پنہاں رکھتا ہے جس سے یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ ہم میں کس حد تک اپج اور جدت ہے اور کس حد تک ہمارے ادب پر قدیم خیالات کا قبضہ ہے اس تقابلی مطالعے سے ہم اپنی جدتوں اور ادبی فتوحات کو جانچ سکتے ہیں اور ان کے برقرار و زندہ رکھنے کی فکر کر سکتے ہیں ورنہ اکثر اس لاعلمی اور بے خبری میں بہترین اور مایۂ ناز خصوصیات اور امتیازات پائمال غفلت ہو جاتے ہیں —

ساقی نامہ

حمد

الہی تیرا حمد مقدور نہیں   اگرچہ سخن کا یہ دستور نہیں
بجا ہے جو تیرا ثنا گر نہیں   یہ مونہہ ان شرابوں کا ساغر نہیں

نعت

میرا نعت میں بھی یہی حال ہے   وہی عجز اس عجز پر دال ہے
کہ جیوں شمع ہوں سنت عاجز بیاں   جلانے کے قابل ہے میری زباں

مناجات

مناجات میری یہی ہے تمام   کہ ساقی کوثر دیوے مجکو جام

مدح مرزا مظہر

زہے پیر و مرشد زہے پیشوا   کوئی کیا کرے اوس کی مدح و ثنا
نہیں مدح کا قافیہ تنگ ہے   کہ اس مدح سے اسکتیں تنگ ہے
خدیو سخن میرزا جان جاں   کہ حکم اوس کا ہے ناطقے پررواں
ہے اوس کا لقب ذوالجلال سخن   کہ بندے ہیں اوس کے سب ارباب فن
سب اہل کمال اوس سے ہیں مستفید   کہ ہیں علم و عقل اوس کے دونو مرید
کرے کیوں نہ مشکل دو عالم کی حل   کہ جس کا ید اللہ ہے بانہہ بل
کوئی آج اوس کے برابر نہیں   وہ سب کچھہ ہے اِلا پیمبر نہیں
میں پھرتا ہوں گرد اس کے ہر صبح و شام   کہ ہے عشق کا اوس کے دل پر مقام

تمنا ہے یہ اس کف خاک کوں ... کہ چھوڑے نہ اُس دامن پاک کوں

اُسے سب میں یارب امامت رہے ... قیامت تلک وہ سلامت رہے

کہاں تھا مجھے ریختے کا خیال ... ہوا جب سے اس امر کا امتثال

محبت نے مجکوں کیا لا جواب ... وگر نہ میں اور ریختہ کیا حساب

مدح محمد علی خاں

رہی نیں مجھے نیک و بد کی تمیز ... کہ ہے ایک خاطر قیامت عزیز

کروں آب گوہر سے اول وضو ... تب اُس نام سے میں کروں گفتگو

سعادت ہے اُس نام کا ذکر خیر ... عبادات ہیں نا تمام اُس بغیر

نبی اور علی اُس سے آتے ہیں یاد ... دو دولت ہیں یکنام سے مستفاد

محمد علی خاں سعادت کا جان ... کہ کرتے ہیں فخر اُس سے دونو جہان

امامت * کا نخل برو مند ہے ... کہ شاہ ولایت کا فرزند ہے

کہوں اُس کی دولت کا کیا اقتدار ... کہ کرتے ہیں یہاں بخت بھی افتخار

کہوں کیا سواری کا اُس کی بیاں ... کہ چلتا ہے سورج لے اُس کا نشاں

یہی اُس کی رفعت پہ بس ہے گواہ ... کہ ہے نقش پا اُس کے ہاتھی کا ماہ

عطا میں ہے ہاتھہ اُس کا سب سے بلند ... جیسے دل کے دیلے میں یہ درد مند

کہوں اُن کی جرأت کا کیا کاروبار ... جنہوں کی ہے میراث میں ذوالفقار

کروں سجدۂ شکر قدرت کے تئیں ... نہ پوچھوں معانی و صورت کے تئیں

پڑی اُس کی خوبی کی ازبسکہ دھوم ... لیا ہاتھہ قدرت کا صانع نے چوم

کروں اُس کے اخلاق کا کیا بیاں ... مجھے شکر سے اُس کے فرصت کہاں

غرض میں کروں پر یہی ہے یقین + ... کہ جد اُس کا ہے سید المرسلین

کیا چاہئے سب کچھہ اوس پر قیاس ... کہ حیرت سے میرے رہے نیں حواس

---

* (نسخہ) امارت

+ (نسخہ) غرض ملکراں پر نہیں ہے یقین

مناسب نهیں اب بغیر از سکوت   که هے وه تصور میرے دل کا قوت
الهی بحق دل درد مند   اوسے دونو عالم میں رکهه سر بلند

خطاب به ساقی

ارے ساقی اے جان فصل بهار   یہی تها همارا تمهارا قرار
همارے بسر نے کی یه فصل هے ؟   فراموش کرنے کی یه فصل هے ؟
ستم سے گذر کچهه تو انصاف کر   خدا سیتی ڈر کچهه تو انصاف کر
تامل سے تک دیکهه گل کا شکوه   که لبریز هے باغ تا دشت و کوه
اس آتش سے میرا نه کر دل کباب   نه کر میری طاقت کے زهره کو آب
که میں جاں بلب هوں پیالے کی طرح   لگی هے مجهے آگ لالے کی طرح
ارے مجهه سے کیا جرم واقع هوا   که دل تیرا مجهه سے جو یوں پهر گیا
نه تو مجکو دیتا هے جام شراب   نه فریاد کا میری دیتا جواب
میرے عیش کا دفتر ابتر نه کر   قیامت کو مجهه پر مکرر نه کر
ترے اس تغافل سے ظاهر هوا   که پایا هے تونے ستم میں مزا

قسمیه

تجهے جام صهبا کے سر کی قسم   تجهے اپنے مینا کے سر کی قسم
تجهے جان گل کے لهو کی قسم   تجهے باغ کے رنگ و بو کی قسم
تجهے جام کے چشم تر کی قسم   تجهے اپنی پنهاں نظر کی قسم
تجهے ناز و مستی کی اپنی قسم   تجهے خود پرستی کی اپنی قسم
ادا سے لهکنے کی تجکو قسم   نشه سے بهکنے کی تجکو قسم
قسم هے تجهے بے سبب جنگ کی   قسم هے میرے نام کے ننگ کی †
ارے بے وفا بے مروت صنم   میں دیتا هوں تجکو قسم پر قسم

† (نسخه) قسم هے تجهے نام اور ننگ کی

تجھے دختر رز کی حرمت کی سوں　　تجھے منہچوں کی شرارت کی سوں
تجھے جان مستوں کی لغزش کی سوں　　صراحی سے مے کی تراوش کی سوں
تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں　　تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں
تجھے سانس کی اپنے لینے کی سوں　　مجھے سانس میں جان دینے کی سوں
تجھے ناتوانوں کی طاقت کی سوں　　تجھے بے قراروں کی فرصت کی سوں
شب عید کے تجکو چاؤں کی سوں　　تجھے اپنے مہندی کے پاؤں کی سوں
جو تونے کیا ہے کو مجھ پر حرام　　تو اتنا کر اے ظالموں کے امام
کہ اس سر کشی سے نہ کر پائمال　　مرے خوں کو کر اپنے اوپر حلال
ارے ساقی اے سر پناہ دماغ　　ارے بزم مستوں کے شمع و چراغ
اٹھا خاک سے پر خماروں کے تئیں　　جلا اُن تغافل کے ماروں کے تئیں
کسی کا ستانا تجھے خوب نہیں　　خصوصاً جلانا مجھے خوب نہیں
مجھے اس طرح مت بسر رحم کر　　نہ مجھ پر تو اپنے اوپر رحم کر
مجھے مرنے جینے کی نہیں کچھ تمیز　　تیرے واسطے زندگی ہے عزیز
تجھے رحم کچھ مجھ پر آتا نہیں　　مگر جیونا میرا بھاتا نہیں
تو اتنا سخن دل ستی مان رکھ　　کہ میں سخت مشتاق ہوں پہچان رکھ
برا مت ہو گر کچھ بھلا میں کہوں　　کہ آخر ترے خیر خواہوں میں ہوں

فخریہ

تیری جان کی سوں غنیمت ہوں میں　　سلیقوں میں عالم قیامت ہوں میں
میرے وضع و اطوار پر کر نظر　　میرے طرز و گفتار پر کر نظر
اگر عشق میں دوں تحمل کو عرض　　لیوے کوہ کن مجھ سے ہمت کو قرض
میرا عقل میں کون انباز ہے ؟　　ارسطو میرا ایک دوا ساز ہے
فلک چرخ مارے کا کر صد ہزار　　نہ لاوے کا مجھ سا کوئی روزگار

نہ توڑ آئینہ اپنے دیدار کا / زیاں خوب نہیں اپنی سرکار کا
یہ سب میکدے میں جو آتے ہیں یار / مجھے دیکھہ ہوتے ہیں تیرے شکار
اگرچہ تجھے مجھہ سے رغبت نہیں / ولے کوئی ایسی خسارت نہیں
کہ مجھہ سا جدا ہووے تجھہ سات سے / یہ شہباز جاتا رہے ہات سے
کوئی تجھہ سا خوباں میں فائق نہیں / تری شان کے ظلم لایق نہیں
مت اس طرح پیارے کسو کو بسر / مبادا کوی ناتواں جاے مر
نہ اپنی سفارش یہ کرتا ہوں میں / تری خیر خواہی میں مرتا ہوں میں
جو منظور تیری بھلای نہ ہوے / نظر میں تیری آشنای نہ ہوے
تو مرنے کی کچھہ مجکو پروا نہیں / کچھہ اس جینے کی تمنا نہیں
جو کچھہ تھا سو ہمت میری سہہ گئی / ولے جی میں یہ آرزو رہ گئی
مری بات تونے نہ مانی کبھو / مری قدر تونے نہ جانی کبھو
اسی غم کو جاؤں گا لے گور میں / کہوں گا یہی حشر کے شور میں
محبت نے مجکو کیا بے ادب / محبت ہے ان شوخیوں کا سبب
وگر نہ کہاں مجکو یہ تاب ہے / کب اس حرف کا یہ دہن باب ہے
یقیں جانیو گر نہ ہو ایک آن / تری مہربانی کا ہم کو گمان
تو صورت نہ پکڑے ہماری حیات / نکل جاے جی ناامیدی کے سات
محبت کا ہم خوب پایا ہے بھید / سبب زندگی کا نہیں جز امید
جو کھینچا کبھو مہر سے تونے ہات / ستمگر کو محشر میں نہیں ہے نجات
تو یہ زندگانی گوارا نہیں / اجل جو نہ آوے تو چارا نہیں
ولیکن شکایت کا نہیں احتمال / کہاں ہے اسیروں کو یہاں تک مجال
یہ ممکن نہیں بندۂ خاص سے / کہ پر دور ہے شان اخلاص سے

حکایت بر سبیل تمثیل

لگن میں پڑا ایک پروانہ رات
یہ کہتا تھا ارباب مجلس کے سات

کہ اس بے پرو بال کی عرض ہے
کہ ابلاغ اوس کا تمہیں فرض ہے

مرا شمع سے یہ سندیسا کہو
اوسے خوب سمجھا کے اتنا (*) کہو

یہی تھا لکھا میری قسمت میں جان
قیامت تلک ہجر ' وصل ایک آن

جو تجکو میرا یہ خوش آتا ہے حال
تو مجکو شکایت کی کب ہے مجال

سراپا مزہ (ن) گرچہ آتش میں ہے
سعادت مری تیری خواہش میں ہے

جو میری برائی سے ترا ہو بھلا
تو مجکو نہیں چارہ غیراز رضا

وہی کر تو جس میں ترا کام ہو
و لیکن نہ اتنا کہ بدنام ہو

یہ کہہ کر کیا کام اپنا تمام
ہوا زندگانی کا روز اوس پہ شام

جو کوی عشق میں اس ادب سے مرے
خدا تا ابد اوس پر رحمت کرے

خطاب بہ زاہد

ارے زاہد اے ملکروں کے امام
ارے آب نگور تجھہ پر حرام

نہیں جانتا تو جو اسرار مے
نہ کر بے وقوفی سے انکار مے

یہ وہ آب ہے جس آتش ڈرے
ہزار الاماں جس سے دوزخ کرے

موافق کے ہے واسطے سلسبیل
مخالف کو یوں ہے کہ جیوں آب نیل

جو کوی شخص پانی سوں بیزار ہے
یقیں ہے کہ آب اوس کوں در کار ہے

تری تر زبانی خوش آتی نہیں
تیری خشک مغزی یہ بھاتی نہیں

زباں مت نکال اپنی خامے کی طرح
نہ چڑہ سر پر اتنا عمامے کی طرح

تو آزار دیتا ہے مستوں کے تئیں
ستاتا ہے ساغر پرستوں کے تئیں

یہ محشر کے دن تیرے شانے سے ریش
بلاے سیہ ہو کے آوے گی پیش

(*) (نسخہ ا) ایسا - (ن) میرا —

جلا ویں گے روز قیامت کے تئیں یہ مسواک سے تیرے قامت کے تئیں
جو اندھے کو دیکھے کوی چاہ پر تو واجب ہے لاوے اوسے راہ پر
میں کہتا ہوں یہ وضع کچھہ خوب نہیں سلامت روی کا یہ اسلوب نہیں
نہیں ھانہہ مستوں کے رھتی عناں مبادا پہونچ جاے تجکو زیاں
ستانا ترا اون سے کیا دور ہے کہ سب طرح سے مست معذور ہے
جو بھرنا ہے آپ اپنے خوں سے ایاغ تو بکنے کا مجکو ہے کب اب دماغ

در تعریف اهل چمن

مبارک ہو اے میکشاں فصل گل دکھانے لگی اپنی شاں فصل گل
دیکھو ٹک شہ گل کا جاہ و جلال کہ جس کا ہے فوارہ سا مور چال *
نظر تم کرو ٹک چمن کی طرف شگوفے کو مستی سے آیا ہے کف
چمن میں بھرا ہے نشہ یہاں تلک کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک †
تماشے سے جاتے ہیں سب غم بسر کہ پھولا ہے گلزار دل کھول کر
زبس گرم ہے جوش گل سے ہوا نہالوں کو پلکھا کرے ہے صبا
ہوا کے نشہ نے کیا بسکہ زور پڑا آب کرتا ہے مستی میں شور
زبس گرم جوشی کا یہاں ہے رواج کھلا ہے دل اس طرح پھولوں کا آج
کہ بو دھو سکے داغ لالہ کے تئیں جیسے ڈرد تھوے کی پیالہ کے تئیں
کھلی ہے ایسی اختلاطوں کی راہ کہ سنبل سے اٹکی ہے گل کی نگاہ
عزیز و تغافل کا ہنگام نہیں مگر تم کو گل ساتھہ کچھہ کام نہیں
یہ دن کو غنیمت نہیں جانتے میری عرض یارب ‡ نہیں مانتے

در اشتیاق گوید

* (نسخہ) کہ جس کا ہے فوارہ شاخوں پہ لال
† (نسخہ) کہ جاتی ہیں نرگس کی انکھیاں جھپک
‡ (نسخہ) یارو

ارے ظالموں مفت ہے یہ بہار   کہاں یہ نشہ پھر کہاں یہ خمار

کہ جیوں نقش بر آب ہے یہ جہاں   ٹک یک موج میں تم کہاں ہم کہاں

اولٹ جائے گا ایک دم میں ورق   کروگے سبھی جیوں قلم سہلہ شق

نہ یہ مے نہ یہ باغ رہ جائے گا   نہ ملنے کا یہ داغ رہ جائے گا

کوی درد اس دکھہ سے بدتر نہیں   کہ * سب ٹھاٹ ہے ' تم میسر نہیں

لہو دل کا پیتا ہے گلشن کا سیر   یہ آب خضر زہر ہے تم بغیر

جو ہو جائے گا باغ بے آب و تاب   کوی پی کے تب کیا کرے گا شراب

میں کچھہ پوچھتا نہیں تغافل کا بھید   نہ تھی ہائے تم سے مجھے یہ امید

کہ اس طرح جاؤگے تم اوس + کو چوک   کروگے تم اس فصل میں یہ سلوک

یہ سختی ہے حق میں تمہارے زبوں   کہ گلشن کے زہرے کو کرتی ہے خوں

نہ روتا ہوں اس چشم خونبار پر   مجھے رحم آتا ہے گلزار پر

کہ تم بن عجب حال ہے اب کے سال   چمن پر برستا ہے گرد ملال

نہ بلبل کو ہے بولنے کا دماغ   نہ غنچے کو دل کھولنے کا دماغ

مجھے یہ خوشی تھی کہ آئی بہار   نکل جائیں گے دل کے سب خار خار

کبھو کب تھا طالع سے یہ احتمال   کہ شادی سے لوں اپنے ماتم کی فال

نہ تھا جانتا ہائے یہ سہلہ ریش   کہ سب دوست دشمن ہو آئیں گے پیش

تغافل نے یاروں کے مارا مجھے   کہ بے وقت انہوں نے بسارا مجھے

میرے تئیں پڑا اتفاق ایک بار   چمن کی طرف فصل گل میں گذار

کھڑا دیکھتا تھا بہار طیور   کہ ناگہ سنا میں نے بلبل کا شور

یہ کہتی تھی تنہا نپٹ درد سے   دل گرم سے اور دم سرد سے

کہ ایام اسیری کے کیا خوب تھے   خصوصاً مجھے سخت مرغوب تھے

---

* (نسخہ) کہ سب ہیں مگر الخ

+ (نسخہ) تم مجھکو چوک

پھنسے تھے سبھی هم نفس ایک بار — همیں دام لگتا تھا باغ و بہار

عجب تھا مزہ درد و اندوہ کا — عجب تھا جشن مرگ انبوہ کا

توجہ تھی هم ساتھہ صیاد کو — پہونچتا تھا هر وقت فریاد کو

موافق تھی دام قفس کی هوا — سب آپس میں کرتے تھے جی کو فدا

نہ تھے آشنا داد و بیداد کے — کہ تھے سب اسیر ایک صیاد کے

پڑا اب کے سال اس طرح اتفاق — کہ جاتے رہے سب وہ اهل وفاق

چمن کی هوا مجھہ پہ اب تنگ * هے — میری زندگی موت کا رنگ † هے

نہ لگتا هے جی صحبت غیر میں — نہ کھلتا هے دل باغ کی سیر میں

نہ کچھہ ذوق هے آب و دانہ ستی — پھڑکتا هے جی آشیانہ ستی

مجھے گل کی صورت ‡ لگے هے زبوں — چمن هے نظر میں میری حوض خوں

اکیلے کو کب خوب لگتا هے باغ — بلا هے رفیقوں کی دوری کا داغ

سخن میں توقف جو واقع هوا — بجز رنج ¶ اس کا سبب کچھہ نہ تھا

نہ تھا کچھہ مجھے طاقت و زور سے $ — کہ میں دم لیا تھا تک یک شور سے

پھر آیا سخن کا نشہ جوش میں — پھر آئی هے دیوانگی هوش میں

در ذوق راگ

جلوں کا سر اب کیوں نہوے بلند — کہ هے دل مرا ایک مطرب سے بند

جو کچھہ کام هے مجکو اوس ساتھہ هے — میرے دل کا دل اوس کے اب هاتھہ هے

وہ مطرب هے فن اپنے میں مقتدا — جو دعوی کرے وہ سو هے کا بجا

ستارا عجب اوس مغنی کا هے — کہ زهرہ کے منہ پر بجاتا رهے §

---

* (نسخہ) ساگ † (نسخہ) ڈھلگ ‡ (نسخہ) کا سایہ (نسخہ دوم) واشد

¶ (نسخہ) بجز غصہ (نسخۂ دوم) بجز غفلت $ (نسخہ) نہ تھا کچھہ تھکا طبع کے زور سے

§ (نسخہ) بجاتا هے نے

ارے مطرب اے دردمندوں کی جان
کبھی تو کہا اپنے والوں کا مان

تغافل کے هاتھوں سے طنبور وار
گریباں کو میرے نہ کر تار تار

صدا گوش کر اپنے مشتاق کی
خبر لے تک آہنگ عشاق کی

مجھے اب تلک ذوق صہبا سے تھا
جو کچھ کام تھا جام و مینا سے تھا

هوا سیر دل اب مے ناب سے
گیا هوں گزر عالم آب سے

لگی هے مجھے پیاس اب آگ کی
گلو گیر هے تشنگی راگ کی

نچھوڑ اس طرح پیاس کے حال میں
ڈبو دے مجھے راگ کے تال میں

نکر سر بلند اپنی بیداد کا
نکر حق تلف میری فریاد کا

یہ تاکید کرتا هوں اس واسطے
ترے کان بھرتا هوں اس واسطے

کہ تک یک صبر کا پانو چل جائے گا +
تو یہ جی خفا هو نکل جائے گا

ملاقات کا سب طرح ذوق تھا
خصوصاً مجھے یہ بڑا شوق تھا

کروں چاندنی کی ترے ساتھ سیر
ولیکن تیرے جی کی سوں تجھ بغیر

پڑا آج کی رات یوں اتفاق
کہ سب هوگئے جمع اهل وفاق

کہ شبخون کر لشکر خواب پر
سبھی جا کے بیٹھے لب آب پر

مرا جی گیا ڈوب مہتاب دیکھ
جیسے مرگی والے کا جی آب دیکھ

عداوت کی کب چاند سے تھی امید
ولیکن هوا مجکو معلوم یہ بھید

کہ واقع هوے هم سے از بس گناہ
گئے نامے کی طرح چہرے سیاہ

هوے سب طرح مستحق عذاب
تو لازم هوا اب نزول عذاب

ولیکن خدا بھیجتا تھا سدا
مناسب هر یک قوم کے یک بلا

نبی کی هوی بسکہ حرمت ضرور
اس امت پہ آیا هے طوفان نور

+ (ن) کہ تک صبر کرتا هوں جل جاؤں گا

شیخ ملا نصرتی ملک الشعراے بیجاپور

(۳)

از اڈیٹر

تاریخ اسکندری

علی عادل شاہ ثانی کا انتقال سنہ ۱۰۸۳ھ (۱۶۷۲ع) میں ہوا - اور اس کے ساتھہ ھی بیجاپور کی شان و شوکت بھی رخصت ہوگئی - اس کا بیٹا سکندر اس وقت چار سال کا تھا - تخت نشینی کی رسم ادا ہوی لیکن حکومت ناتجربہ کار اور خود غرض وزرا کے ہاتھہ میں رہی - آخر آپس کی ناچاقیوں اور خود غرضیوں نے سلطنت کا خاتمہ کردیا -

علی عادل شاہ اپنی عیاشی اور بے اعتدالیوں کی بدولت ایسا بیمار پڑا کہ صحت نے جواب دیدیا اور حکیموں کی حکمت کارگر نہ ہوئی - جب وہ اپنی زندگی سے مایوس ہوگیا تو ایک روز عبدالمحمد کو بلا کر کہا کہ مجھے اب زندگی کی امید باقی نہیں رہی ' سلطنت کی حالت اندیشہ ناک ہے ' ایک طرف مغل سر پر کھڑے ہیں دوسری طرف سیوا گھات میں لگا ہوا ہے - نہ معلوم میری آنکھہ بند ہوتے ہی کیا صورت پیش آے ' اس لیے میری مصلحت یہ ہے کہ تم شہزادے کو تخت پر بٹھاکر کاروبار سلطنت کو اپنے ہاتھہ میں لے لو - اس کے بعد کسی کو

مخالفت کی مجال نہ ہوگی ' بادشاہت محفوظ ہوجاے گی اور میں اطمینان سے اس دنیا سے کوچ کرجاؤں گا —

عبدالمحمد بارہ سال سے حکومت کا سارا کاروبار چلا رہا تھا 'اس کی کاردانی اور وفاداری مانی ہوئی تھی - علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں سلطنت کے استحکام اور حفاظت میں عبدالمحمد کے تجربہ ' شجاعت اور لیاقت کو بہت بڑا دخل تھا - یہی وجہ تھی کہ بادشاہ کو جو اعتماد اس پر تھا وہ کسی پر نہ تھا - لیکن عبدالمحمد کی نظر دور اندیش نے دیکھہ لیا تھا کہ اب دربار کا رنگ کچھہ اور ہے اور بادشاہ کے مرنے کے بعد یہ رنگ اور شوخ ہوجاے گا - اس لیے اُس نے اس بار امانت کے قبول کرنے سے عذر کیا - ہر چند دیانت راو اور سلطنت کے دوسرے بہی خواہوں نے سمجھایا کہ بادشاہ کا یہ عین منشا ہے کہ شاہزادے کو تمہارے سپرد کرکے اپنے جیتے جی استقلال سلطنت کو دیکھہ لیں ' تم کسی وسوسے کو دل میں نہ لاؤ ورنہ سارا کام درہم برہم ہوجاے گا - عبدالمحمد راضی نہ ہوا اور خود ہی یہ تجویز کی کہ خواص خاں شاہزادے کو تخت پر بٹھاکر دارالخلافہ اور اس کے آس پاس کے علاقے کا انتظام کرے - مجھے شمال مشرقی علاقہ (قلعہ شاہ درک، و گلبرگہ وغیرہ) سپرد کردیا جاے تاکہ مغلوں کی روک تھام کرتا رہوں - عبدالکریم بہلول خاں کو مغرب (یعنی مرج اور قلعہ پنالہ وغیرہ) کی طرف بھیج دیا جاے تاکہ وہ شیواجی کے مقابلے کے لیے تیار رہے - مظفر خاں کو سمت جنوب (بدنور وغیرہ) کا صوبہ‌دار بنادیا جاے تاکہ جنوب کے ہندو راجاؤں پر نظر رکھے اور ہم سب خواص خاں کے احکام کی تعمیل کریں - عبدالمحمد کی یہ قرارداد بیجاپور کی تباہی کا پیش خیمہ تھی -

خواص خاں نے اسے لطیفۂ غیبی سمجھ کر فوراً قبول کرلیا - دونوں جانب سے قسما قسمی اور قول و قرار ہوئے کہ بادشاہ کہ وفات کے دوسرے ہی روز اس پر عملدر آمد ہوگا - بادشاہ کا مرض بڑھتا گیا اور اسی کے ساتھہ اندر ہی اندر سازشوں کا جال پھیلتا گیا - صرف عبدالمحمد ایک شخص تھا جو اپنے قول پر ثابت قدم رہا - آخر کئی مہینے مرض الموت کی صعوبت جھیلنے کے بعد ۱۳ شعبان ۱۰۸۳ ھ کو بادشاہ نے انتقال کیا - خواص خاں نے شاہزادۂ سکندر کو تخت پر بٹھایا اور زمام حکومت اپنے ہاتھہ میں لے لی - دوسرے روز عبدالمحمد نے پیغام بھیجا کہ باہم جو قول و قرار ہوا تھا اب اس پر عمل ہونا چاہئے - خواص خاں نے کہلا بھیجا کہ بادشاہ بچہ ہے یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ شاہی قلعے تم لوگوں کے حوالہ کردوں - عبدالمحمد اس بد عہدی کو دیکھہ کر بہت دل شکستہ ہوا اور آخر بالکل قطع تعلق کر لیا - یہ سلطنت بیجاپور کی بد نصیبی تھی —

" غرض بادشاہ کی خورد سالی اور کم حوصلہ لوگوں کی صاحب اختیاری نے ارکان سلطنت میں تزلزل پیدا کر دیا اور شیرازۂ انتظام درہم برہم ہوگیا - اطراف و جوانب کے قابو جو جو تاک میں بیٹھے تھے ، اُٹھہ کھڑے ہوے اور ہر طرف شور و فتنہ بپا ہوگیا - سب سے اول بغلی دشمن شیواجی بھونسلہ نے جو علی عادل شاہ ثانی کے آخر زمانے میں بعض شاہی قلعوں اور علاقوں ، اور بعض مغلیہ اضلاع پر قابض ہوگیا تھا ، سر اٹھایا " -

اب جو اسے معلوم ہوا کہ اُن ارکان سلطنت میں سے جن پر قوام مملکت کا دارومدار تھا ، کوئی نہیں رہا تو اس نے دست درازی شروع کی - پہلے قلعہ پنالہ پر تصرف کیا اور بعد ازاں عادل شاہی مملکت کی تسخیر کے لیے ہر طرف لشکر روانہ کیے —

خواص خاں نے جب یہ دیکھا تو عبدالکریم بہلول خاں کو اس کے مقابلے پر بھیجا - جب وہ امرانی کے قریب پہنچا تو شیواجی کے لشکر نے اس پر حملہ کیا اور قتل و خونریزی کا ہنگامہ بپا کر دیا - بہلول خاں بڑی ثابت قدمی اور پامردی سے مقابلہ کرتا رہا اور باوجودیکہ اس کی فوج کم تھی اور غنیم کا لشکر بہت زیادہ تھا ' صبح سے شام تک بڑی بہادری سے مصروف پیکار رہا - دونوں طرف بہت سے مقتول و مجروح ہوے - آخر شیواجی کا لشکر منتشر ہوگیا - بہلول خاں نے اسے غنیمت سمجھ کر تھکوتہ کی طرف کوچ کیا - جب بیجاپور سے تازہ مدد پہنچی تو وہاں سے کوچ کرکے دشمن پر حملہ کیا اور شیواجی کے لشکر کو شکست دی - شیواجی کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو اس کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی اور اپنے سرداروں کو سخت ملامت اور سرزنش کی - اسی جنگ کا حال نصرتی نے اپنی اس مثنوی میں لکھا ہے —

جہاں تک تحقیق کیا گیا ہے دنیا میں اس مثنوی کا صرف ایک ہی نسخہ ہے جو میرے کتب خانے میں ہے - نام اس کا تاریخ اسکندری ہے جو خود نصرتی نے اپنے ایک شعر میں بتادیا ہے —

کہنہار یو تاریخ اسکندری

لگے جس کی گفتاریوں سرسری

سنہ تالیف ۱۰۸۳ ھ ہے جو نصرتی کے اس مصرع سے ظاہر ہے — .

سہس ہور اسی پر جو تھے تین سال

نصرتی کی یہ مثنوی گلشن عشق اور علی نامہ کے مقابلے میں بہت ہی مختصر ہے - یعنے اس میں صرف ۵۵۴ شعر ہیں - کلام میں وہ زور اور شگفتگی بھی نہیں جو اُس کی دوسری مثنویوں میں پائی جاتی ہے -

یہ نصرتی کا آخری کلام ہے اور اُس کے اور بیجاپور کے انحطاط کا زمانہ ہے - نہ اگلی سی شان و شوکت تھی نہ پہلے بادشاہوں کا سا جاہ و جلال تھا اور نہ اُن کے سے پرعظمت کارنامے تھے ' اس لیے شاعر کی طبیعت کو ابھارنے والی کوئی بات نہ تھی - بہلول خاں کی فتح ' نصرتی نے جس کے گن گاے ہیں ' براے نام فتح تھی - اس کے بعد ہی نفاق و مخالفت کی گرم بازاری شروع ہوگئی اور سلطنت بیجاپور کے اقبال کا ستارہ گھٹانے لگا —

اس کتاب کا ذکر کسی تذکرہ نویس نے نہیں کیا ' البتہ میرزا ابراھم زبیری صاحب بساتین السلاطین نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے - " ملک الشعرا میاں نصرتی در تاریخ اسکندری کہ بزبان ھندی منظومہ پرداختہ است کہ بجنگ امران مشہور گشتہ است داد تہور و شجاعت عبدالکریم بہلول خاں و سخنوری فصاحت و بلاغت خویش آنچناں دادہ است کہ سخندانان انصاف کیش و ھنر شناسان معانی اندیش گوھرھائے تحسین و لآلیءِ آفریں برآں نثار می کنند " —

اب ہم اصل مثنوی کی طرف رجوع کرتے ہیں —

ابتدا حمد سے کی ہے اور اس کے دو ہی شعر لکھے ہیں لیکن جیسا کہ نصرتی کا دستور ہے کہ وہ حمد بھی مضمون مثنوی کی مناسبت سے لکھتا ہے ' یہاں بھی ان دو ہی شعروں میں اُس نے اُس زمانے کی خفیف سی جھلک دکھادی ہے —

سرانا جتا سو خدا کوں مرے کہ وہ عین حکمت ہے جوں اُن کرے

جو اچھتا سرج دن کوں نت برقرار تو کیوں نس کوں آتا چلدر پر مدار

(پہلے خدا کی جتنی حمد و ثنا کی جاے اس کو سزاوار ہے ' وہ جو کچھہ کرتا ہے عین حکمت ہے - اگر سورج ہمیشہ آسمان پر قائم

رھتا تو چاند شب کو کیسے آتا) —

پہلا شعر اگرچہ خالص حمد کا ھے لیکن جس نہج سے یہ حمد کی گئی ھے اس سے صاف افسردگی اور پژمردگی ٹپکتی ھے - دوسرے شعر میں ایک بادشاہ کے جانے اور دوسرے کے آنے کی طرف اشارہ ھے جسے اُس نے تیسرے شعر میں کھول کر بیان کردیا ھے —

بڑے بادشہ گر نہ ھوتے سلف نہ پاتے شہی شاھزادے خلف

اس کے بعد کے تین شعر یہ ھیں —

بہلا ر ھے جس زمین پر جو خوں بہے کیوں نا ھووے سبب کچھہ زبوں

نپاتا زبوں وقت گر کس تے کس رھتا کیوں قیامت لگ اُس نر کا جس

جلم ھے اُسی مرد کا زندہ نام بڑی جس تے ھے نیک نامی تمام

(یعنے جس سر زمین پر خونریزی ھونے والی ھے اُس کا کوئی نہ کوئی زبوں سبب ھوتا ھے - اگر زبوں وقت کو کسی سے اعانت نہ ملتی تو قیامت تک اُس بہادر کی شہرت کیوں قائم رھتی - ھمیشہ اُسی مرد کا نام زندہ رھے گا جس نے بڑی نیک نامی حاصل کی ھے) —

اس کے بعد ایک شعر میں کتاب کا نام اور دوسرے میں سنہ تالیف بتایا ھے - اور اس کے بعد صرف ایک شعر میں نئے بادشاہ کی تخت نشینی کا ذکر ھے —

جو ملک دکن میں ھوا شاہ نو لباس آپ دنیا کری تازہ نو

ان اشعار میں نہ جوش ھے نہ مسرت جو اس موقع کا تقاضا تھا ، جس سے صاف ظاھر ھے کہ شاعر اپنے ماحول سے متاثر ھے اور دل امنگ سے خالی ھے —

ارکان سلطنت کی ھوس کا نقشہ یوں کھینچا ھے —

ہوس تن جو ہر تن کوں گھر گھر جدا کہ ہونا شہی کے اپس کد خدا

یعنی ہر ایک کو یہ ہوس تھی کہ بادشاہی ہمارے ہاتھ آجاے —

سلگ نہیں سکی کس کے فتوے کی اگ تھلدا ہو کہ بیٹھا سب یک پل میں جگ

کسی کے فتنے کی آگ نہ سلگ سکی اور ان سب کے جوش ٹھنڈے پڑگئے -

آخر زمام حکومت خواص خاں کے ہاتھ آئی

لیے ہاتھ سو کام خان خواص کیے شکر اکثر سو تر لوک خاص

اس شعر میں " اکثر " کا لفظ پر معنی ہے —

یہی بول ہر مکھہ تے آتا ہوا کہ بدنیتاں کا نہ بھاتا ہوا

(ہر ایک کی زبان پر یہی بات تھی کہ اچھا ہوا بدنیت لوگوں کا چاہا نہ ہوا) —

کریں لگ خردمند بیعت درست ہوے لوگ بد عہد پیماں کے ست

(یعنی عقلمندوں کے بیعت کرتے کرتے بد عہد لوگ اپنے عہد و پیمان سے پھر گئے) —

اور مفسدوں نے فساد برپا کرنا شروع کیا

شریراں شرارت ہو پیدا کیے اثر جیو میں مستی کا پیدا کیے

دبی تھی سو آتش اوتھی پھر سلگ پڑیا دغدغے کی حرارت میں جگ

اور سب سے بڑھ کر مفسد اعظم (یعنی شیواجی) نے سر اٹھایا

خصوصاً سیوا کا فریبے نظام جو فرعون کا ہے سو سایہ تمام

جلگ * جگ میں مہلت ہے ابلیس کوں تلک + چال ہے تس کی تلبیس کوں

اس کے بعد اُس کے لشکر کی کثرت اور اس کی دست درازیوں کا حال بیان کرتا ہے - چند شعر ملاحظہ ہوں

---

* جب تک + تب تک —

نچھے یہس جا نلگ پون کوں مجال　　اچھے واں تلک تس کے گھوڑیاں کی چال

جو جانلگ ہے چالے کو چمتی* کی جھول†　　جلم تس پہ اوس کے حشم کا ہے کھول

بچے آسماں کے جو گڑ تھے بلند　　لیا چڑ ستھا واں سوفن کا کمند

(وہ قلعے جو بلندی میں آسمان کے بچے سمجھے جاتے تھے، اُن پر مکر و حیلہ سے چڑھ کر قبضہ کر لیا)

کریا چڑ جہازاں جو دریا پہ دوڑ　　کیا لوٹ بندر فرنگیاں کے چوڑ

(جہازوں میں چڑھ کر سمندر پر حملہ کیا اور فرنگیوں کے بندر لوٹ کر تباہ کر دیے) —

سدا تس تے دریا و‡ طوفان دسے　　زمیں نحس نس پگ تے ویران دسے

(اس کی وجہ سے ہمیشہ دریا میں طوفان رہتا ہے اور اس کے ملعوس قدموں سے زمیں ویران نظر آتی ہے)

ستے بات سارو جو اوس بھویں پہ پانوں　　ملے نا یک یک ھنگہ بستی کا نانوں

(اگر مسافر اُس سرزمیں میں قدم رکھے تو اُسے ھنتے ھنتے بھر کسی بستی کا نشان نہ ملے گا)

جو اوس سیں جتے فوجداراں لڑے　　لوٹے کے وتے یا سدہر بند پڑے

(جتنے فوجدار اُس سے لڑے وہ یا تو لوٹے گئے یا اُس کے ہاتھوں قید ہوے) —

پن اُس دل میں تھا خان کا سخت دھاک　　کیے تھے جو یک بار اُسے بھی ہلاک

(باجود اس کے دل میں بھی خواص خاں کی دھاک بیٹھی ہوی تھی کیونکہ وہ اُسے ایک بار چرکا دے چکے تھے)

نہ آسیں ککر آج کہر کس پہ چھوڑ　　نہ لڑسیں اپلگ .جھہ سیکی فوج جوڑ

---

* چھونٹی　† قطار　‡ یہ کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے "و" کی جگہ "میں" ہونا چاہئے —

(یہ سمجھ کر کہ وہ کاروبار سلطنت کو چھوڑ کر نہیں آے گا اور مجھ سے لڑنے کے لیے فوج جمع نہیں کر سکے گا)

بھروسے پہ کر یہ مقرر خیال وطن تے نیکل لیکے فوجاں دنبال
جو یک عمر الگ تھا سو قابو طلب پڑیا دیکھ قابو موافق سبب
قدم در قدم ملک میں فن سوں پیٹھ پکڑ یک کو بل تھار آمد میں بیٹھ
وھیں ملک سب مار کر لے تلف بٹھایا ھزاراں سوں دل ھر طرف

یعنے اس یقین پر کہ خواص خاں امور سلطنت کو کسی دوسرے پر چھوڑ کر مقابلے کے لیے نہیں آسکتا وہ لشکر لے کر نکلا - وہ ایک مدت سے ایسے موقع کی تاک میں تھا اور اب اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ملک میں گھسنا شروع کیا اور خود ایک دشوار گزار مقام پر آکر بیٹھ گیا اور وہاں سے ملک کو تباہ و تاراج کرنا شروع کیا —

یہ رنگ دیکھ کر خواص بے چین ہو جاتا ھے —

سمب دیکھ خان مملکت کے مدار غضب میں ھوے پن کھیے یوں بچار
کہ نیں آج ممکن جو میں اُٹھ کے دوڑ جو بھی کر ستوں مار فوج اس کی چوڑ

چونکہ خود مقابلے کے لیے جانا ممکن نہ تھا اس لیے ایک دوسری تدبیر کی —

دوسرا باب بادشاہ کے دربار کے متعلق ھے جس میں بہلول خاں کو خلعت عطا فرما کر شیواجی کے مقابلے کے لیے بھیجا جاتا ھے —

اس باب کے تمہیدی اشعار یہ ھیں

دل افروز یک روز فیروز تھا فرح بخش جوں عید نو روز تھا
ادک تازگی پا زمین و زمن ھوا تھا رنگا رنگ گلشن نمن
ظفر بخش اُس دن کی پا خوب قدر شہنشاہ فرما شہانی صدر

اس کے بعد بادشاہ، محل اور تخت وغیرہ کی تعریف کرتا ہے - خواص خاں اپنے رفقا کے ساتھ آتا ہے - لوگ اس کے سلام کے لیے حاضر ہیں - سب سے مقدم شیواجی کا معاملہ ہے جس کی خان کو بڑی فکر ہے —

سیوا نے جو پکڑیا ہنر نا پسند سیکھانے اوسے ات ادک خوب پند
کن ایسا ہے کر مرد اپس من میں لیائے تو کر یاد نواب کوں ویں بلائے

یعنی شیواجی نے جو یہ ناشایستہ حرکت شروع کی تو خواص خاں سوچنے لگا کہ اس کی گوشمالی کے لیے ایک معقول شخص کی ضرورت ہے اس وقت اُسے نواب (عبدالکریم بہلول خاں) کا خیال آیا اور فوراً اُسے بلا بھیجا۔ یہاں شاعر بہلول خاں کی شجاعت اور علم و ہنر وغیرہ کی تعریف کرتا ہے —

اتنے میں جب بہلول خاں آتا ہوا نظر آیا تو

وہیں خان اپس مجلس خاص سوں بہوت دے کے تعظیم اخلاص سوں
جو بیٹھے سو ہو مل کے خاطر فراغ ہوے دیکھ یکس یک کوں خوش باغ باغ

معمولی مزاج پرسی وغیرہ کے بعد اصل معاملے پر گفتگو ہوتی ہے —

بیاں کر کے یک دلبری کے نکات نہ لے وہیں راج کارن کی بات
کہے خان کافر خر بے لگام سیکھیا ہے جنم چر کہ کھانے حرام
جیکوں لا نہارے ہیں شیراں کو ڈر تو کاں ان کی نظراں میں اچھتا ہے خر
ولے وو جو ہے سو خر پر * تمیز کہ جس وقت پاتا ہے فرصت عزیز
نرکھ کچھ دھنی کے زیاں پر نظر کرے خوار سب باغ شاہی کو چر
غرض یو کہ اہل غرض نابکار لگے خرتے کم دیکھنے میں بچار
کہ جس گھرتے جیکوں بڑیا ہو انگے پچھیں توڑنے پھر وہی گھر ملگے
زیاں کار کوں کچھ نہ اس سود ہے پڑیا گھر تو آپیں بھی نابود ہے

---

* کاتب غلطی سے " بے " کی جگہ " پر " لکھ گیا ہے —

بد اندیش بد کیش یعنے سیوا ہوا شاد عمل دیکھ شہی کا نوا

... ...

یتی ملک میں آگ سلگی ہے سانچ کہ سب شہر بھکل ہے لگنے ہی آنچ

ہوا فرض اپتا یوں کہ یہ آگ آج سلگنے ندینے کی کرنا علاج

کہ ہے دل تمارا جو تیراں کا میغ بجھانا جھڑپ اُس برف برق تیغ

(خواص خاں بہلول خاں سے کہتا ہے کہ اس خر بے لگام (یعنے شیواجی) نے چر کر حرام کھانا سیکھا ہے - لیکن جن کی دھاک شیروں کے دل میں ہے وہ کب اس گدھے کو خیال میں لاتے ہیں - یہ خر نامشخص اپنے آقا کے نقصان کا خیال نہیں کرتا اور جب موقع پاتا ہے شاہی باغ کو خراب کر ڈالتا ہے - غرض یہ نابکار صاحب غرض گدھے سے بھی کمتر ہے ' کیونکہ جس گھر کی بدولت اس نے عروج پایا اُسی کے توڑنے کی فکر میں ہے - لیکن زیاں کار کو اس سے کچھ فائدہ نہیں کیونکہ جب گھر ہی برباد ہوگیا تو یہ خود بھی نیست و نابود ہوجائے گا - یہ بد اندیش بد کیش نئی بادشاہت کے عمل کو دیکھ کر خوش ہے (کہ اُسے ہاتھ رنگنے کا خوب موقع ملے گا) ... ... اس فساد کی آگ ملک میں ایسی بھڑکی ہے کہ اس سے تمام شہر بیکل ہے - اب یہ ہمارا فرض ہے کہ اس آگ کو سلگنے نہ دیں اور ابھی سے اس کی تدبیر کریں - تمہارا لشکر جو تیروں کا بادل ہے وہ فوراً اُس پر برف باری کر کے بجھا دے) ..

بہلول خاں یہ تقریر سن کر جواب دیتا ہے

کہے جب سخن مملکت کے مدار سلیا سوچ بولیا وو یوں کامگار

"سیوا گرچہ اس بوم کا بوم ہے کیتی تس بزرگی سو معلوم ہے

تمارا جو شاید ہے خاطر شریف تو کیا ہے وہی جو ملیا کوی حریف

کہ ہے ان گنت فوج اُس پاس اگر ولے چور کاں آئے ساواں کے سر
(یعنی گو اس کے پاس بے شمار فوج ہے لیکن چور ساہوؤں یعنی کھرے لوگوں کے سامنے کہاں آسکتا ہے)

ہمیں جاں کھڑے رہیں تو کر اختیار رکھیں نانظر میں دندی * کا شمار
مرا ہر سپاہی سو سردار ہے بھری ترکش اُس کی سویک بھار ہے
... ...
لگیا ہے مری تیغ کا جس کو دھاک دیکھت موج پانی کا ہووے ہلاک
بیجاپور کی نیں صنعت یہ نوی کہ ہے شہر و شرزیاں کی کھلی † گونی ‡
سہوا آج موڑھی جو فوجاں کو نیت چلایا ہے آگیں اپیں رکھہ جو پیت
(وہی سہوا آج فوجیں سامنے لا رہا ہے جو پہلے پیٹھہ دکھا کر بھاگا تھا)
سر اُس کا کوچل یوں کروں اُس کو گم کہ جیوں سانپ کا سر کوچلے پہ دم
(اُس کی فوج کا سر کچل کر اُسے ایسا بیکار کردوں کا جیسے سانپ کا سر کچلنے پر اُس کی دم بیکار ہو جاتی ہے)
نپچل سی ہمارے پہ کافر کا حد کہ ہے دیندار اں کوں حق کا مدد

یہ جواب سن کر خواص خاں کو بڑا اطمینان ہوا اور وہ اسے بادشاہ کے حضور میں لے جاتا ہے ۔ بادشاہ اُسے خلعت و منصب سے سرافراز کرتے ہیں اور فوج کی سالاری پر مقرر کرکے مہم پر روانہ کرتے ہیں —

بہلول خاں لشکر کی تیاری میں مصروف تھا کہ جاسوس خبر لائے کہ شیواجی کا بے شمار لشکر چلا آرہا ہے ۔ وہ اپنی فوج کے جمع ہونے کا حکم دیتا ہے اور اس کے سامنے تقریر کرتا ہے کہ یہ جان نثاری اور

* دشمن † پرانی ‡ شہروں کے رہنے کی جگہ

وفاداری کا وقت ہے - غنیم چڑھا چلا آرہا ہے ' اپنے ملک اور وطن کی حفاظت ہمارا فرض ہے - اس کے ساتھہ اہل لشکر کی مذہبی حمیت کو بھی جوش میں لاتا ہے - سپاہی اپنے سردار کی شجاعت کی تعریف کرتے ہیں اور اس کے ساتھہ لڑنے مرنے اور جان دینے کا عہد کرتے ہیں —

اس کے بعد بہلول خاں کے سوار ہونے اور لشکر کی روانگی کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے —

لکھتا ہے -

جو نواب چوڈول کا کج چڑچلیا کہے توں کہ بھوئیں کے اوپر گڑ چلیا
کہے سب نے دیکھہ اُس تجلی سوں دھور کہ نِکلیا گگن پر جو مطلع تے سور

(یعنے جب نواب ہاتھی پر عماری میں سوار ہوکر چلا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا زمین پر قلعہ چلا جارہا ہے - سب نے اس بہادر کی یہ شان دیکھہ کر کہا کہ مطلع آسمان سے آفتاب نکلا ہے) —

پھر باجوں کی گرج ' نقاروں کے شور ' دماموں کے بجنے ' جلاجل اور دوسرے باجوں کی کیفیت بیان کی ہے - اس کے بعد لشکر اور اہل لشکر کا کچھہ ذکر کیا ہے - مثلاً

لگے ہر ہتی یوں وہ پاکھر کے نال کہ اوتریا ہے ڈونگر پہ آجھوں ابھال
دسیں ہر جھلکتی سلیں اوس میں برق نہ تھا گاجنے ہور گرجنے میں فرق
ہتیاں پر رنگا رنگ ڈھالا دسیں کہستاں پہ جیوں نونہالاں دسیں
چلے تو ہتی ڈلنے سب دھرن عرابے (کی) گاڑیاں تے ہدریا گگن

(ہر ایک ہاتھی جس پر پاکھر پڑی ہوئی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ پر بادل اُتر آیا ہے - ہر ایک چمکتی ہوئی برچھی میں بجلی نظر آتی تھی ' اب باجوں کے بجنے اور گرجنے میں کوئی فرق نہ رہا

تھا - ہاتھیوں پر رنگ برنگ کی ڈھالیں پڑی تھیں جو ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے کوہستان پر نونہال - جب ہاتھی چلتے تھے تو زمین زلزلے میں آجاتی تھی اور جب (سامان جنگ) کی گاڑیاں چلتی تھیں تو آسمان ہلنے لگتا تھا)-

اب اصل جنگ کی کیفیت بیان کرتا ہے - یہ جنگ بہت مختصر اور صرف دو روز کی ہے - ہر روز کی لڑائی الگ الگ بیان کی ہے - اس لڑائی کو وہ چور اور ساہو کی لڑائی سے تشبیہ دیتا ہے —

کھڑے چور ہور ساؤ لڑنے کوں سانڈ

اول اس نے غنیم کی فوج کی کثرت ' اسلحہ کی بہتات ' گھوڑوں اور ہاتھیوں کے ہجوم کا بیان شاعرانہ انداز میں کیا ہے - کہتا ہے کسی جنگل کے درختوں میں اتنی ڈالیاں نہیں جتنے اس فوج کے رنگ برنگ کے جھنڈے ہیں -

نہ کیں بن کے ڈالیاں بہ اتنے ہیں پات

نشاناں تو اوس تے ادک دمات

اور نہ کسی کوہستان میں اتنے سنگریزے ہیں جتنے اس کے ہاں مست ہاتھی پڑے جھوم رہے ہیں -

نہویں کس کہستان میں سنگ یتے

کھڑے تھے یتے مست جھولتے متے

نہ کسی سرزمین سے اتنی چیونٹیاں ابلتی ہوں گی جتنا اس کے ساتھہ لاو لشکر تھا -

نہ کس بھویں پہ چنتیاں ابلتیاں ہیں جم

چلے باند رستا یتا کچھہ حشم

نہ کسی عفونت میں اتنے مچھر هوں گے جتنے اس کے ساتھہ سپاهی تھے —

اسی طرح ایک ایک دو دو شعر هتھاروں اور گھوڑوں وغیرہ کی لکھتا ھے - گھوڑیوں کے وصف میں دو شعر یہاں نقل کئے جاتے هیں —

اتھیاں مادوانچہ ناگن بھریاں وہ گھوڑیاں ناگن بھری تھیں
پر یارتھوں نتھیاں پن دسیں جوں پریاں پریاں تونہ تھیں لیکن پریاں سی معلوم هوتی تھیں
چھلے گرم هوویں تو آتش سے تاؤ گرمی میں آگ سے بڑہ کر
سبکپن میں کرتیاں پون پر پراؤ اور سبکی میں هوا سے زیادہ هیں

اب لڑائی شروع هوتی ھے - جب غنیم نے عادل شاهی فوج کو دیکھا تو وہ اپنا لشکر لے کر چلا اور یہ ارادہ کیا کہ بیجاپوری لشکر کو چاروں طرف سے محصور کر لے -

کہیا یوں کہ چوندھرتے فوجاں چلاوں
جزیرہ کر اول پچھیں سب ڈو باوں

نواب غنیم کی چال کو سمجھہ گیا اور فوراً حکم دیا کہ -

جو ھے سب عرابا یو آتش کا موت
بلد و فوج کے گرد سب اوس کی کوٹ

یعنی تمام گاڑیوں کا جن پر توپیں رکھی هوئی هیں فوج کے گرد ایک حصار باندہ دو - فوج کو اس حصار کے پیچھے رکھہ کر تیر باری کا حکم دیا - خود نواب هاتھی پر تھا - جب دونوں طرف سے لڑائی کا بازار گرم هوا اور سوار گھوڑے دوڑا کر ایک دوسرے پر حملہ آور هوے تو اس سے گرد و غبار کا جو طوفان برپا هوا ' اسے شاعر نے اس طرح بیان کیا ھے —

اوٹھے جب ترنگ مار چوندھیریل	جب بہادر گھوڑے اٹھا کر چاروں طرف
اوڑی گرد تب یوں مدور نکل	سے حملہ آور ہوے توگردمدور شکل میں اُٹھی ؛
اوچایا ہے شیطان جوں گرد باد	گویا شیطان نے ایک بگولہ اٹھایا
کہ جاتا فلک اوز کہ خیمے کی ناد	ہےجوخیمےکی صورت میں فلک تک پہنچ گیا ہے ۔
حرکت زمانے کی رھی کوئی گھڑی	دنیا میں آسمان سے اتنی دھول اڑی
کہ یوں جگ میں گردوں تے ماٹی اڑی	کہ زمانے کی حرکت رک گئی
نکل جاکے سورج کے دیدے تے جوت	سورج کی آنکھوں سے روشنی جاتی رھی
ھلال یوں دسیا جیوں ہوجای سو پوت	اورھلال بے رونق پوت کی طرح دکھائی دیتا تھا

گھوڑوں کے تاپوں سے جو گرد اُڑی اور گولوں کے چھٹنے سے جو دھواں پھیلا ' اس کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے

گھڑی یک میں سب آسمان ہور زمیں	گھڑی بھر میں تمام آسماں اور زمیں
دھلویں اور اگن میں بھری تب یقیں	دھلویں اور آگ سے بھر گئے
بھری بھویں ھو گلشن کے جاگیاں پہ نار	زمیں پر گلشن کی جگہ آگ بھر گئی
سمندر لہے چھمن بولموریاں کی تھار	اور باغ میں بھلوروں کی جگہ سمندر نے لے لی
ھوا پر جمے یوں دھلویں کے تھوے	ھوا پر دھلویں کے ایسے طبق جم گئے تھے
جو بیٹھے بگولے ھو نکلے کوے	کہ بگلے جو بیٹھے تھے وہ کوے ھو کر نکلے
اوٹھیاں لے جو باناں روش ناگ کے	بان جو ناگ کی طرح اُٹھ کر بلند ھوے
بندیاں پل ھوا کے اوپر آگ کے	تو انھوں نے ھوا پر آگ کے پل باندھ دیے
غلو لے چلے تھے جدھر دے کے سیس	گولوں نے جدھر کا رخ کیا ادھر
ستے پاڑ فوجاں پہ فوجاں کوں پیس	فوجوں کی فوجیں پیس کر رکھ دیں
کہاں شور باناں جدھر کے اوٹھیاں	بانوں کے شور سے ھاتھی ڈر کر

هتی ڈر سوں جنگل پھرے لے پراں اپنی جان بچانے کے لیے جنگل میں بھاگ گئے۔
دھنویں کا جلک سدا تھا درمیاں جب تک دھوئیں کی دیوار بیچ میں حائل تھی
دونوں دل تو قائم اتھے جاں کے واں دونوں لشکر جہاں کے تہاں کھڑے رہ گئے

اتنے میں زور کی ہوا آتی ہے اور اس دیوار کو اڑا لے جاتی ہے اور پھر دونوں طرف کے بہادر ہتھیار درست کرکے حملہ شروع کرتے ہیں،

نکلیا جو میانے تے بارا حجاب
ہلے تھارتے جھانک راوت شتاب

اس موقع پر نصرتی بہلول خاں کی تیر اندازی کا نقشہ کھینچتا ہے جو بلا شبہ قابل تعریف ہے اور اس سے اس کی شاعرانہ قوت بیان کا اندازہ ہوتا ہے —

وہیں دیکھ خاصہ پکڑ ہت کماں نواب نے یہ دیکھ فوراً اپنی کماں اٹھائی
کہیا ہاں اے ترکس بنداں ہونہاں اور کہا کہ اے ترکش بندو! ہاں!
جو دھرتے تھے تیراں چلانے کی لاف وہ جو تیر اندازی کی لاف مارتے تھے
کرو آو یک تیر کی صف تے صاف وہ اب آئیں اور صفوں کو صاف کریں
پکڑ نے کشاکش کے گوشے میں تھانوں اس نے کماں کے گوشے میں ہاتھ ڈال کر
اپیں سعد و قاص کا لے کے نانوں | سعد وقاص کا نام لیا
خدنگ جوڑ چلے میں کھینچیا کماں ور پھر جو چلے میں تیر جوڑ کر کھینچتا ہے تو
دیا بوسہ تس ہات اوپر آسماں آسماں نے (بے اختیار) اس کے ہات کو بوسہ دیا
نہ قوس قزح تب رکھی کس سوں تاب اس وقت قوس قزح بھی اس کی تاب نہ
نہ چلنے کے اتنے میں تیر شہاب لاسکی اور نہ اتنے تیر شہاب تھے جو چلتے۔
کماں اپنے قبضے میں پکڑیا جو دھس اس بہادر نے جب کماں کو اپنے قبضے میں پکڑا
رگ و پے میں اوس کے بھریا آپ کس تو خود بخود اس کے رگ وپے میں قوت سرایت کرگئی

نظر کی صفائی کوں دکھہ شست میں	میں نظر کی صفائی کو دکھہ کر
دیکھا تیر کی راستی دست میں	تیر کی راستی کو هاتھہ میں دیکھا
چلایا یکے دور انداز تیر	اور پھر اُس دور انداز نے اتلے تیر چلائے
کہ چھو تکتا سونوں اوس کہا جس اسیر	کہ جس پر پڑا وہ بچ نہ سکا
کہ هوتا جو لگتا تو گنبد پہ مار	اگر وہاں گنبد بھی هوتا تو اس پر اگر کر
کبوتر کے انڈرے تے سک اس کے پار	[کبوتر] کے انڈے میں سے پار هو جاتا

جب سپاہ نے نواب کی یہ سرگرمی دیکھی تو انہوں نے بھی تیر چلانے شروع کیے

چلے تیر خاصے کے جیوں پیش امام
خدنگ مقتدی هی سپہ کے تمام

اس کے بعد وہ ان کی تیر اندازی شمشیر زنی اور گولہ باری کے کمال اور دشمن کے پامال هونے کا ذکر کرتا هے۔ آخر میں نواب کی قابلیت اور بہادری کی تعریف کرتا هے —

تردد پہ خاصے کے لاکھہ آفریں	نواب کی جد و جہد پر لاکھہ آفریں هے کہ
رکھیا تھا نظر میں جو وو سب زمیں	وہ میدان جنگ پر هر طرف نظر رکھتا تھا
دیکھے تو اپیں سن میں تھا نوجوان	دیکھنے میں تو نوجوان هے لیکن
پن استاد تھا پیر مرداں کو واں	بڈھوں بڈھوں اُستاد
یو هے حق میں دھوراں کے خوب یک مثل	بہادروں کے حق میں یہ کیا اچھی مثل هے
کہ لڑنے تے آپیں لڑانا کو بل	کہ لڑنے سے لڑانا بہت مشکل هے
کرے گا لڑائی یو یک دو پہ وار	جنگ میں ایک شخص زیادہ سے زیادہ دو پر وار
لڑاوے لڑاوے تو لوتاں هزار	کرے گا لیکن لڑانے والا هزاروں کو سلادے گا
مگر تھا اوسی تے وہ چو ڈھل اوپر	شاید اسی خیال سے وہ عماری پر سوار

کہ رکھنا اپس ہر طرف پر نظر تھا کہ ہر طرف نظر رکھہ سکے
جدھر تے جو کام آ کہ مشکل پڑے جدھر کوئی مشکل آ پڑتی تو فوراً وہ
کرے توڑ نا اوس میں ہرگز اڑے اس کا توڑ کرتا اور کبھی قاصر نہ رہتا۔

نواب کی بہادری دیکھہ کر سپاہی بھی جان توڑ کر لڑے اور ہر شخص اپنے سردار پر جان فدا کرنے کے لیے تیار تھا۔ اب دونوں طرف سے خوب جم کے لڑائی ہوی —

جمی آ دو دھرتے لڑائی عظیم	دونوں طرف سے جم کر بہت بڑی لڑائی ہوئی
لیئے دم کھڑا جیوں ہو ماندا غنیم	اور غنیم تھکا ماندا سا ستانے کو ٹھہر گیا
	فوج کے گرد عرابوں کا حصار باندھ لیا
عرابے پہ یک فوج کا بند حصار	اور چاروں طرف سے آتشباری شروع ہوگئی
دھریا آگ کا آ کہ چوندھرتے مار	گولوں کی مسلسل اس قدر بھر مار ہوی
غلولیاں کا ہر دم چھوٹنے یوں تھوا	کہ ان کے انگاروں سے ہوا انگیٹھی بن گئی
انگاریاں تے اوس ہوئی انگیٹی ہوا	تیر چڑہ چڑہ کر صفوں پر اس طرح گرتے تھے
پڑے صف پہ یوں تیر پکڑے پہ اوج	جس طرح ٹڈی دل کھیت پر گرتا ھے
کہ جیوں کھیت چرنے کوں ٹولاں کی فوج	جھلندے اس طرح جھر جھرے ہوگئے تھے
جھجر یوں نشاناں ہوے دھات دھات	جس طرح ٹڈیوں کے بیٹھنے سے درختوں کے پتے
کہ جیوں ٹلول بیٹھے پہ جھاڑاں کے پات	لیکن نواب نے اس کی مطلق پروا نہ کی اور
مگر دل میں کچھہ وھم خاصہ نہ لیائے	اس کی اتنی حقیقت بھی تو نہ سمجھا جتنی میلہ
نہ وو میہوں ھے جان فرغل منگائے	کی کہ فرغل منگا کر پہن لیتا۔ اُس کی
زباں میں نہ تھی مار بن کچھہ بی بات	زبان پر سوائے "مار" کے کوئی بات نہ تھی
نہ تیر و کماں تے نیکا لیا وو ہات	اور نہ اُس کے ہاتھہ سے تیر و کمان
	ایک دم کے لیے چھٹا۔

نظر میں اتھا ہو نشانہ غنیم | اس کی آرزو یہ تھی کہ غنیم نشانہ بنے اور
رکھے دل پہ بھویں مار پڑتا سو بھم | ایسا تڑبھتے کہ اُس کا لشکر زمین پر تڑپتا ہو -

آخر میں نواب کی خوش خلقی اور مقبولیت کے متعلق لکھتا ہے

جو خوش خلق نواب جگ میت کا اتھا سب سوں اخلاص کی ریت کا
نہ خویشاں چہ اتھے اس پہ آجیوسوں بیش کہ تھے پاس لوگ اس کے بیگانے خویش

(نواب جو خوش خلق اور مقبول زمانہ تھا اُس کی رسم و راہ سب سے پر اخلاص تھی ' صرف خویش و اقارب ھی اُسے عزیز نہ تھے بلکہ بیگانے بھی اُس کے نزدیک خویش و اقارب کے برابر تھے) -

اور اسی پہ نصرتی نے پہلے روز کی جنگ ختم کردی ھے - اس نے کہیں یہ نہیں لکھا کہ شیواجی کی فوج کو شکست ہوی یا اُس کی فوج منتشر ہوگئی جیسا کہ صاحب بساتین السلاطین یا دوسرے بیجاپوری مورخوں نے لکھا ھے --

دوسرے روز کی جنگ غنیم کی تیر باری سے شروع ہوتی ھے - خاص کر اس بارش کا نشانہ نواب کی چوڈول ھے --

هوی تھی ادک ریز چوڈھل پہ یوں
برستا ھے برسانت ڈونگر پہ جیوں

(یعنی چوڈول پر تیروں کی بارش اس طرح ہورھی تھی جیسے پہاڑ پر مینھہ برستا ھے) -

اھل لشکر میں جو خیر اندیش تھے انہوں نے پکار کر نواب سے یوں خطاب کیا -

کی بیٹھا سو مار ھر کا ھو نشان
توں پکڑیا ھے کیا گھر ڈوبانے کی شان
پکا مار چو ڈھل ھوئی جو تلک
رھے گا تو وھانچہ کر کو تلک
توں بانچ اب ھمن مار اپے حضور
کہ نہں کد لڑای رھے باج دھور
نہ ڈرسیں بلا میں جو گھالے گا توں
موئے پر تبھلے کوں پالے گا توں
اوتر ھست ھور بیگ تازی سوار
کہ کر حملہ دشمن کوں لیتے ھیں مار

تو ھر مار کا نشانہ بنا کیوں بیٹھا ھے
کیا گھر ڈبونے کی ٹھہرائی ھے -
چوڈول پر اتنی تیروں کی بارش ھوئی ھے
اب تو وھاں کب تک رھے گا -
تو اپنے آپ کو بچا اور ھمیں مرنے دے کیونکہ
بغیر سپہ سالار کے لڑائی نہیں ٹھہرسکتی -
اگرتوھمیں جنگ میں جھونکے گاتوھم نہیں ڈریں گے
کیونکہ (ھم جانتے ھیں کہ) مرے پیچھے توھمارے
تبھلے کی پرورش کرے گا - اب ھاتھی سے اُتر آ
اور جلد گھوڑے پر سوار ھو اور ھم ابھی
حملہ کر کے دشمن کو مارے لیتے ھیں -

نواب نے جب یہ سنا تو یوں جواب دیا -

سنے سوچہ نواب یو بات کے
کہ تملا کوں یاراں نہ معلوم ھے
کہ دارا کوں اشاہ اورنگ سوں
پڑی تھی لڑای سو سوندل کے جھوں
اتھا شاہ دارا جو ھاتی سوار
پڑیا جھوں غلولیاں کا چوندھرتے مار
نلھا تاب اوتر کیے ترنگ جھوں چڑیا
لگیا فوج کوں تب کہ خاصہ پڑیا
ھوی پل میں اس دھات لشکر کی موڑ
کہ نہں لڑسکے پھر کہ بھی فوج جوڑ

نواب نے یہ بات سن کے کہا کہ
یارو شاید تمھیں یہ معلوم نہیں ھے
کہ دارا کو شاہ اورنگ سے
اسی طرح کی لڑائی کا سابقہ پڑا تھا
شاہ دارا جو ھاتھی پر سوار تھا
اُس پر جب چاروں طرف سے گولیوں کی
مار پڑی تو تاب نہ لا کر ھاتھی سے اتر
گھوڑے پر سوار ھوا' تو فوج سمجھی
کہ بادشاہ مارا گیا - پھر کیا
تھا پل بھر میں سارا لشکر تتر بتر ھوگیا

اور پھر اسے جمع کر کے نہ لوا سکا -

وھی کام سنبھال دانا کرے
جو نادان کرنے تے عزت دھرے
تمیں جانتے ھیں کہ نیں یو مثل
چھپے تو بی نا ھوے اجل کوں وجل
بزرگاں کے رکھہ قول پر خوش مدار
یہی سب برتتا ھوں میں بار بار
اگر تیغ عالم بجنبد ز جاے
نبرّد رگے تا نخواھد خداے
سمجھتا ھوں کر حق تے یاری ھے آج
مجھے بال کوں کچھہ نہ بھاری ھے آج
اگر ھو تو بھی کچھہ خدا کی رضا
رضاوند ھوں جیوں وہ انبرے قضا
ولے میں رکھیا ھوں سو بڑتا قدم
جدھر تے بھی دھسنا انگے نا کہ کم
جو ھوے بیدھڑک ھول تے سر بسر
اوسے کیا ھے غوغاے محشر تے ڈر
ھتی پر جو ھوں میں تو بیریاں پہ داب
کہ یک نیزہ جیوں سر پہ ھے آفتاب
فلک پر تو نہ اُڑ سکیں لئی ھے فرق
ملنگے بھویں جو پڑ کے تو ھوویں گے غرق

کام ایک ھی ھے' دانا سوچ سمجھہ کر کرتا ھے مگر نادان اس طرح کرتا ھے کہ اپنی عزت کھو بیٹھتا ھے - کیا تم نے یہ مثل نہیں سنی کہ ہزار چھپو اجل نہیں ٹلتی - بزرگوں کے اس قول پر میرا اعتقاد ھے اور ھمیشہ اس پر عمل کرتا ھوں

اگر تیغ عالم بجنبد ز جاے
نبرد رگے تا نخواھد خداے

میں سمجھتا ھوں کہ آج خدا کی طرف سے میری مدد ھے اور میرا بال بیکا نہو گا اگر کچھہ ھوا بھی تو خدا کی رضا ' اور میں اس کی رضا پر راضی ھوں - لیکن میں نے بڑھتا ھوا قدم رکھا ھے ' جدھر سے بھی گھسوں گا آگے بڑھوں گا نہ کہ پیچھے - جو خوف سے نڈر ھے اُسے غوغائے محشر سے بھی ڈر نہیں - میں جو ھاتھی پر ھوں تو اس سے دشمنوں پر رعب ھے - میں ان کے سروں پر اس طرح ھوں جس طرح آفتاب کا ایک نیزے پر آجانا - آسمان پر تو اُڑ کے جا نہیں سکتے کہ وہ بہت دور ھے ' اور اگر زمین پر رھے تو غارت ھو جائیں گے

جو هلتے هیں دبائے تے بھی چھوڑ تھانوں	اور اگر جگہ چھوڑ کر ذرا بھی هلے
کہ جیوں مر نسک جھاڑتے هاتھہ پانوں	تو هاتھہ پانو هلائے بغیر نہیں مر سکتے -
پتنگاں کے پڑتے نہ ہو جسی هلال	پتنگوں کے گرنے سے هلال کی شمع بجھہ نہیں
مریں جل جو پکڑیں بوجانے کا خیال	سکتی اور اگر وہ بجھانے کا خیال کریں گے تو
نجانو کہ بھالے کر اُن کے هیں بھار	خود جل مریں گے - یہ خیال نہ کرنا کہ اُن کے
هرن هیں کرو بھکدی سگ شکار	بھالے دار بڑے قوی هیں ' وہ هرن هیں کتوں سے
رکھو مار یو فوج کافر پلید	شکار کرو - اس فوج کافر کو مار کر تہس نہس
رکھو کھیت یا سب هو مسلم شہید	کر ڈالو - یا تو ان کا یہیں خاتمہ
	کر دو ورنہ سب شہید هو جاؤ

یہ تقریر سن کر اهل لشکر میں جوش پیدا هوا اور وہ پہلے سے زیادہ آمادۂ پیکار هوگئے اور اس بے جگری سے لڑے کہ مخالف بھی ان کا لوها مان گئے اور پریشان هوکر کہنے لگے کہ ان سے لڑنا مشکل هے -

لڑے جب یو دهلی کے فوجاں سے چھوٹ	یہ لوگ جب دهلی کی فوج سے لڑے تو
لیے هیں گے امراؤ یک دم میں لوٹ	انہوں نے آناً فاناً میں سب امرا کو لوٹ لیا
اگر مرد میدان بہلول هے	اگر مرد میدان بہلول هے تو هم اس کے
همن دسویں حصے کا کاں تول هے	دسویں حصے کے برابر بھی نہیں -
دکھن کا ملو یک دھور نیں هے بچاس	دکھن کا یہ بہادر ایک نہیں بلکہ پچاس کے برابر
نہ لشکر سب اوس کا بی هے اوس کے پاس	هے حالانکہ ابھی اس کا پورا لشکر اس کے پاس نہیں -
کھڑا یو سو ویں آگ کا هو ابھال	جہاں یہ کھڑا هوا آگ کا بادل چھا جاتا هے
ستھا برق بونداں سوں عالم کوں جال	اور بجلی کی بوندوں سے ایک عالم کو جلا دیتا هے -
همیں آج نہاتیں تو ناسوس یوں	اگر هم آج اسے برداشت نہ کر کے بھاگے
صبا مکھہ دیکھانا دهلی پاس کیوں	تو کل اپنے آقا کو کیا منہ دکھائیں گے -

ایتا کام سہوت پہ ہے یہ رو — اب آخر میں اتنا کام کرنا لازم ہے کہ
کہ لیتا عرابا یو یک کر ڈھوا — ایک ہلہ کر کے عرابوں پر قبضہ کر لیں-

یہ کہہ کر انہوں نے زور شور سے حملہ کیا اور پھر ایک بار قتل و غارت کا بازار گرم ہوگیا -

لہوباں پر دھسے کر دلیری یتی — تلواریں لے کر بڑی دلیری سے گھس پڑے
پڑے جیوں کہ جلتی اگن میں ستی — جیسے جلتی آگ میں ستی جا پڑتی ہے
کھڑک ھل رہے جب یو بھالے پڑے — جب تلواریں رہ گئیں تو بھالے اٹھائے
دھڑک آگ اٹھی جب دنتا لے پڑے — ور اس سے آگ اور بھڑک اٹھی
رکھے تھوپ گجدل کوں بھالیاں کی مار — بھالوں کی مار سے ہاتھیوں کے دل کو کونچ ڈالا
سھئے کے یکس یک میں دو دو سوار — اور ایک ایک بھالے میں دو دو سوار پرود یے
ہزاراں سوں بھالے جدھر آ ستئے — جدھر ہزاروں بھالے لے کر آپڑے
اُدھر یک بیک فوج الٹھا ستے — ادھر ساری فوج ایک دم میں درہم برہم کردی
اتھا رین راوت جو گھوڑے کی پیٹ — جو بہادر سوار گھوڑے کی پیٹھ پر تھا
کیا دو کوں یک نیزہ بیٹھا سو نیٹ — اس پر نیزہ اِس صفائی سے پڑا کہ ایک کے دو
زرہ نا رکھی تن کوں بھالے تے جھانپ — ہوگئے - زرہ بھالے سے جسم کو نہ
کہ انکوے نہ مکڑی کے جالے تے سانپ — بچا سکی کہ سانپ مکڑی کے جالے سے نہیں
بھالیا آکہ جھلکیا سو جس تن کے آڑ — رک سکتا - جس پر نیزہ آکر لگا '
بوڑی رکھہ اودھر جا رہیا تن کے پار — بوڑی تو ادھر رہ گئی اور باقی نیزہ جسم کے
موی کو سنلد آگ کوں نیں ڈری — اُس پار نکل گیا - مردہ کو سنلد
عرابے کی خندق رکت سوں بھری — آگ سے نہیں ڈری ' اور عرابے
کی خندق خون سے بھر گئی -

ہوتے ہوتے یہ لڑائی وہاں تک پہنچ گئی جہاں نواب بہلول خاں کھڑے تھے اور اب معرکہ بہت شدید ہوگیا -

ہتی پر وئیں خاصہ برچی سنبال
کہیا مار لو دیکھتے کیا ایتال
سکل کوٹ پاڑو اسی ٹھور میں
کہ آئے ہیں اپے پگوں گور میں
سنے سوچ شمشیر بنداں یو بات
ہوے پاوں اوتارا فرنگاں لے ہات
ستے جس پہ شمشیر کا وار آ
ترنگ ہور اوسے بھویں پہ بھسلاے لیا
سنبالیا سو بھالے لے ثابت کٹار
کیا پھوڑ بکتر کوں چھاتی کے پار
چلاویں اگر دھنک ہاتی پہ توڑ
پڑے وو ہتی دیکھہ اپس جیو چھوڑ
دیکھا ویں تو سنداں پہ توڑاں کے بہانت
اوڑیں ہو کہ چنگیاں متے گج کے دانت
کمر پر ستیں ہیں تو نیں لگ خبر
نکل جاے یک دل کو دو پھانک کر

... ...

زرہ کا تو ہے وار بہنے میں حال
کہ بھر لوٹ انگے لڑکے کاں رہے کلنجال

نواب نے وہیں ہاتھی پر برچھی سنبھالی
اور للکار کر کہا کہ دیکھتے کیا ہو، مارو !
سب کو مار کر یہیں تمام کردو کہ وہ
اپنے پاوں چل کر اپنی قبر میں آئے ہیں
جب شمشیر زنوں نے یہ بات سنی تو پیدل
اُتر کر تلواریں ہاتھوں میں سنبھالیں
جس پر تلوار کا وار کیا تو وہ
گھوڑے سمیت زمین پر آرہا -
بھالے لے کر کٹار سنبھالی جو بکتر کو
توڑ کر چھاتی کے پار نکل گئی -
ہاتھی پر جب وہ وار کرتے تھے تو
وہ فوراً بیدم ہوکر گر پڑتا تھا
اُن کے وار ایسے تھے جیسے گھن پر ہتھوڑے کی ضربیں
کہ اس مار سے مست ہاتھیوں کے دانت چنگاریوں
کی طرح اُڑتے تھے - کمر پر جب ہاتھ پڑتا تھا تو
اس وقت تک خبر نہیں ہوتی تھی جب تک تلوار
دو ٹکڑے کرکے نہیں نکل جاتی تھی

... ...

زرہ کا حال پتلا تھا ؛ پر زور سیلاب
کے آگے کائی کہاں ٹھہر سکتی ہے -

ستے کاٹ یوں کافراں کو کٹھن — ان شدید کافروں کو کاٹ کر اس طرح ڈال دیا
کہ قربانی بکریاں کوں جیوں حج کے دن — جیسے عید قربان میں بکرے قربانی کرتے ہیں

لیکن اُدھر کے بہادر بھی کچھ کم نہ تھے ' انہوں نے پھر قدم جماکر لڑنا شرع کیا —

عین اجل پن دیکھت نیں ڈرے — موت نظر آرہی تھی مگر اُس پر بھی وہ نہیں ڈرے
کہ ناموس کون بیش انگے جیو کرے — کہ ناموس کے آگے جان کوی چیز نہیں ۔
روش ہے عرابے سوں لڑتا سو دھور — قاعدہ ہے کہ جو بہادر عرابوں کی حصار باندہ کر
کھید پڑے پہ دشمن کوں نا جاے دور — لڑتاہے وہ دشمن کو پسپا کرنے پر بھی دور نہیں جاسکتا
کہ جوڑے پہ قابو سوں گاڑیاں کو ذات — اس لیے کہ گاڑیوں کو اس طرح جوڑ کر مضبوط کھڑا
ہلیں تب بکھرتا ہے یک دم وو پہات — کیا جاتاہے کہ اُس سلسلے کو توڑیں تو انتشار پیدا ہوجاتا ہے ۔

اگرچہ غنیم بیجاپوریوں کے حملوں سے پریشان ہوگیا تھا اور اس میں مقابلے کی تاب نہ رہی تھی لیکن ایک مشکل یہ آپڑی تھی کہ ندی پر اُس کا قبضہ تھا اور خوب سمجھتا تھا کہ بیجاپوری کیسے ہی بہادر کیوں نہ ہوں پیاسے لڑنا آسان نہیں ہے - ادھر دھوپ کڑاکے کی پڑنے لگی جس سے اہل لشکر کی بے تابی اور بڑھ گئی —

کہ جانے تھے چلتا تو نیں کچھ علاج — وہ جانتے تھے کہ یہ معاملہ لاعلاج ہے
ولے ہویگے عاجز تو پانی کے باج — پانی بغیر وہ خود بخود عاجز ہو جائیں گے
دیکھے دھونڈ تو بر جاے تھا وہ قیاس — غور سے دیکھو تو اُن کا یہ قیاس بجا تھا
جیوے کا بھوکا ناجیوے مار پیاس — آدمی بھوکوں جی سکتا ہے لیکن پیاس کامارانہیں جی سکتا
کہ اصبح تے واں بھری یک جو دھوپ — صبح ہوتے ہی دھوپ کا عمل شروع ہوگیا لشکری
کھڑے تھے ہمی ہم سوں لڑنے جو چوپ — محض ہمت کے بل پر کھڑے لڑ رہے تھے

ایک تو سر پر دھوپ یک تو آسر پہ اف، پچھوری تھی دھوپ پڑ رھی تھی
دوسرے دلوں میں آگ بھڑک رھی تھی، سلگتی تھی دوسری دررونے میں دھک
سپوا کا وو لشکر تو صورت حرام سپوا کا صورت حرام لشکر شاید
تمام نسل شیطان کا تھا مگر نسل شیطان سے تھا
کہ ایک کو سامنے سے ھٹاتے تھے تو کہ یک پیش آتے کوں کرنے کو پس
اس کی جگہ اور دس آجاتے تھے دسیں پھر اوسی یک کی جاگے پہ دس
اسلام کا لشکر گنا چنا تھا اور سو دل اسلام کا تھا سو معدود تھا
خدا کے کسی کی مدد کا آسرا نہ تھا کومک غیر حق ان پہ نابود تھا
لڑائی ہر لحظہ ایسی کٹھن ہوتی جاتی تھی لڑای تو پل پل کوں ایسی کھٹن
کہ کسی نے اپنی عمر میں کبھی نہ دیکھی ہوگی بڑی یوں کہ دیکھیا نہ ھوے عمر کن

حال یہ تھا کہ ھوا تیروں سے بھر گئی تھی، سنگ لاخ زمین گولوں سے پٹ گئی تھی، ھاتھوں میں چھالے پڑگئے تھے اور زخموں سے خون بہہ رھا تھا - اگرچہ لڑنے کی تاب و طاقت نہیں رھی تھی مگر صرف ھمت کے بل بھروسے پر لڑ رھے تھے - یہاں شاعر نے گرمی کی تپش اور پیاس کی شدت کو شاعرانہ رنگ میں بڑی خوبی سے بیان کیا ہے —

روحوں نے جسموں میں کھلبلی مچا رکھی تھی وجوداں میں روحاں دھری چٹپٹی
آسمان تندور بن رھا تھا اور زمین بھٹی - تندور آسماں تھا زمیں تھی بھٹی
سر میں بھیجے جوش کھاکر پکنے لگے لگے جوش کھا سر میں پکنے داغ
اور ذرہ تپ کر جسم پر داغ دینے لگی - زرہ جل کے دینے لگی تن پہ دماغ
دھن کے امرت کا چشمہ سوکھ گیا گیا سوک سب امرت کا چشمہ دھن
اور زبان ماھیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگی - پڑی جیب بے آب ماھی نمن
سختی کی تاب نہ لاکر لہو خشک ہوگیا ھوا خشک لہولیا نہ متحمل سوں تاب

کھڑک بن نہ تھا کس بی جائے پہ آب　　اور سوائے تلوار کے کسی جگہ پانی نظر نہ آتا تھا

کھڑے تھے تو دھریک تے یک دل میں جوگ　　اگرچہ ایک سے ایک لولاگے کھڑا تھا مگر

ولے آب بن تلملیا سب ہی لوگ　　بغیر پانی کے سب ہی بیقرار تھے

نواب نے خیال کیا کہ اگرچہ فتح خدا کی عنایت سے ہماری ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ ظالموں نے ہم پر پانی بند کردیا ہے، لہذا اب ایک آخری حملہ کرنا لازم ہے یا تو یہیں شہید ہوے یا پھر اس نجات پائی - اس بیان کو نصرتی کے الفاظ میں سنیے —

سمج ہوی یو نواب کے دل میں راز　　تب نواب کے دل میں یہ بات آئی کہ

خدا تو دیا فتح کر سرفراز　　خدا نے ہمیں فتح سے تو سرافراز کیا

پن اوس دینداراں پہ ظالم ملا　　لیکن ظالموں نے دینداروں پر کربلا کی

بساے ہیں لیا محنت کربلا　　سی صعوبت نازل کر رکھی ہے

کہ پکڑے ہیں لگ لرو و کافر پلید　　پلید کافروں نے نہر پر قبضہ کرلیا ہے، افسوس

ہوے آہ سب پانچ مارے شہید　　ہم سب یہیں شہید ہو جائیں گے

ہوا منج اپنا حملہ کرنا ضرور　　اب منجبہ پر حملہ کرنا لازم ہوگیا تاکہ

کہ تب لگ بلا یو نہوے سرتے دور　　یہ بلا سر سے ٹلے -

وہیں دھور بولیا کہ اے یکہ تاز　　پھر فوراً اس بہادر نے للادر کو کہا کہ اے یکہ تاز، تیر انداز

سپاہی تیر انداز شمشیر باز　　شمشیر باز سپاہیو، ہم نے اگرچہ لڑائی

لڑائی تو مارے ہمیں پن ہے دھاک　　مار لی ہے لیکن اندیشہ یہ ہے کہ کہیں ہم

مبادا کہ بے آب ہم ہوئیں ہلاک　　بے آب ہلاک نہ ہو جائیں، اگر ان کی

اگر اُن کی جاہت لگے لرکا آ　　بجائے صرف نہر کا پانی تمہارے ہاتھ لگا تو

نا امیدی سوں تمنا　　وہ ناامیدی کی وجہ سے تمہیں سراب نظر آے گا

نہ پانی کہ جس ہوے تو امرت کی چاہ　　نہ کہ وہ پانی جو امرت کی خاصیت رکھتا ہے -

چلو میں لو لاتا ہوں خضر راہ	او اب میں خضرراہ بن کر آسے لاتا ہوں -
کروں میں جو حملہ تو باقی یہ ساند	اب میں باقیوں پر حملہ آور ہوتا ہوں '
دیکھوں کیوں رھتے ار کے پانی کو باند	دیکھوں اب وہ کیسے پانی روکتے ہیں -
کھیا سوچ سلمک تے کاڑے نیکال	یہ کہتے ہی سامنے سے عرابے نکالے اور
شکر نال ہست نال لے مکھہ پہ گھال	شکر نال اور ہست نال اُن کے منہ پر چلانے شروع کیے -

س کے بعد آخری باب " فتح یا فتن نواب بہلول خاں بر لشکر سیواجی و اورا ہزیمت دادن " کے عنوان سے ہے - اور اسی پر مثنوی کا خاتمہ ہے - اس حملے اور فتح یابی کی کیفیت خود نصرتی کے الفاظ میں بیان کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے —

وہیں خاصہ نواب جب چل دیا	جب نواب اس طور سے نکلا تو دونوں
دونو دھیر کی فوج کوں ہو کیا	طرف (یمین ویسار) کی فوج کو بڑھا یا
چھوتے شہر یک دم چو زنجیر تے	جب یکبار گی زنجیر سے شہر چھتے تو
ہوے آ جو غرش میں جو بھیرتے	ہر طرف غرانے لگے - گھوڑوں کے
ترنگاں کے تل تے یتی گرد اوڑی	نیچے سے اس قدر گرد اُڑی گویا زمین آسماں
کہے یوں زمیں جا فلک سوں جوڑی	سے جا لگی - ستارے روئی ہو گئے اور
ستاریاں کی روئی جو ہو بیشلاف	زمیں اور آسماں مل کر لحاف بن گئے
فلک اور زمیں مل ہوا یک لحاف	فلہم جہاں کھڑے تھے وہیں جمع ہوگئے اور
کھڑا ہو جو جاں ساندتا تھا فلہم	اور پھر انہوں نے لڑائی شروع کی -
لڑائی پھر آنانا تا تھا غلیم	اُن کی فوج گرد رواں کی طرح نظر آتی ہے اور
دسے فوج اون کے گرد جو رواں	اُن کے حسابوں زمانہ تاریک ہو گیا تھا
ہوے تیرہ تب تس کے لیکے جہاں	

پھوٹے کرہ نایاں نے دشمن کے گوش
کیا مغز بھیجا ہوجا گے تے ہوش
نقاریاں تے میدان ہدر نے لگیا
کھڑا تھا سو جل رقص کرنے لگیا

قرناؤں کی آواز سے دشمن کے کان بہرے ہوگئے تھے اور ہوش و حواس بجا نہیں رہے تھے - نقاروں کی گونج سے میدان ہلنے لگا اور پانی جو کھڑا تھا رقص کرنے لگا -

بہادر کے دشمن پہ طالع پڑے
دھڑاں میں دلاں دھاک سوں دھڑ دھڑے
ہوی دل میں ہشیار نخوت کی اُمت
گھٹ اوساں کی ہوئی دلاں میں شکست

دشمن پر بہادر نواب کے طالع غالب آئے اور دل اُن کے جسموں میں خوف سے دھڑدھڑ کر رہے تھے اب ان کے دلوں میں نخوت پیدا ہونی شروع ہوی لیکن اوسانوں کو دلوں میں پہلے ہی شکست ہوچکی تھی -

پڑی دھور کی جب صلابت کی چھاؤں
لگے اوڑنے بارے پہ دشمن کے پاؤں
جو نواب کر رخ مخالف کے دھیر
برسنے لگیا صف سوں یک مٹھ ہو تیر
دیے چھوڑ سو مرغ تیراں شتاب
پیے بیٹھ ان سر کے کانسیاں میں آب
جمی فوج یک پل میں ہوی پھوٹ پھاٹ
یکیک نہاسنے کوں دسے لاکھ باٹ

جب نواب کی بہادری کا ظہور ہوا تو دشمن کے پاؤں ہوا میں اڑنے لگے - نواب نے جب مخالف کی طرف رخ کیا تو صف لشکر سے تیروں کے مٹھے برسنے لگے - اور سیکڑوں تیروں کے مرغ چھٹے جو ان کے سروں کے پیالوں میں گھس کے پانی پینے لگے جمی جمائی فوج ایک پل میں تتر بتر ہوگئی اور بھاگنے کے لیے ایک ایک کو لاکھوں رستے نظر آنے لگے -

کہے تو کہ گڈرے پہ ہاتی چھوٹا
بھریا تھا ہنگامہ سو یکدم پھوٹا
پھوٹے جمع تھے سو ہوے نا امید
دسی پل میں کالی زمیں سب سفید
پڑے سو کھیدپڑے پہ کھند لات میں
دسے وو برابر ہو جا بات میں

گویا گدھے پر ہاتھی چھوٹ گیا ہے اور وہ بھرپور ہنگامہ ایک دم میں منتشر ہوگیا - یہ منتشر مجمع ناامید ہوگیا اور وہ زمین جو کالی تھی سب سفید نظر آنے لگی - بھاگڑ میں جو گر پڑے وہ کھند لے گئے اور رستے میں زمین کے برابر ہوگئے

جتن کر وو پھر چھوڑ یوں لر چلے — جب سب جتن کرنے کے بعد وہ نہر چھوڑ کر بھاگے
نتھا نہر واں لہو اپس بھر چلے — تو نہر میں پانی کی بجائے اپنا لہو بہتا ہوا چھوڑ گئے
ہوی لال بھویں یوں وہ کالی سکت — وہ کالی کلوٹی زمیں اس طرح لال نظر آتی
بیجاپور کن جیونکہ جوگی کا مت — تھی جیسے بیجاپور کا جوگی کا مت -
نظر رن کے مردیاں کو دیکھت تھکی — نظر میدان جنگ میں مردوں کو دیکھتے دیکھتے تھک گئی
کہے توں کہ پردا ہے یک ناٹکی — گویا وہ ناٹک کا پردہ تھا -
ہوا کیچ یوں لہر کہ لہو تھانوں تھانوں — جگہ جگہ لہو کے بہنے سے اس قدر کیچڑ ہو گئی، تھی
پھسلنے لگے بھویں پہ تیراں کے پانوں — کہ زمیں پر تیروں کے پانو پھسلنے لگے -
دیکھت تب کہ نواب دشمن سکل — جب نواب نے دیکھا کہ تمام دشمن جان
چلیا لیکہ جیو سامنے تے نیکل — سلامت لے کر بھاگ گئے ہیں تو
کہے حکم سب پر کہ اب بس کرو — حکم دیا کہ اب بس کرو اور بزدلوں
چکائیاں بہ ظاہر نکو کس کرو — پر زور نہ دکھاؤ
بھلے مرد کا مرد پر وار ہے — بھلے مرد کی لڑائی مرد سے ہونی چاہئے
نگوزیاں کوں چپ دیکھنا عار ہے — ان کم بختوں کا تو دیکھنا بھی موجب عار ہے
کہ نہاتے ہمیں یولا جو کوتے کے پاؤں — یہ کتوں کی طرح سے بھاگے ہیں اور
نہ پھر سیں بچکتے ہیں دیکھہ اپنی چھاؤں — اپنے سایہ کو بھی دیکھہ کر بدکتے ہیں
کدھیں پھر کہ مردی پکڑ آئیں گے — اگر پھر کبھی مرد بن کر آئیں گے
کریں گے سو اپنا سزا پائیں گے — تو اپنے کیے کی سزا پائیں گے -

یہ کہہ کر نواب خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور میدان جنگ میں خوشی کے شادیانے بجنے لگتے ہیں - اس وقت وہیں سارے لشکر کے ساتھہ پڑاو ڈال دیتا ہے اور تیز رفتار ہرکارے بھیج کر فتح کی خوش خبری ہر طرف بھیجتا ہے - جب خواص خاں کو یہ خبر پہنچی تو بادشاہ کے

حکم سے بیجاپور میں جشن منایا گیا اور جگہ جگہ فتح کا خطبہ پڑھا گیا - قلعے پر سے بندوقیں اور توپیں چھوڑی گئیں- چونکہ بادشاہ کی یہ پہلی فتح تھی اس لیے گھر گھر مٹھائی تقسیم ہوی - بادشاہ نے نواب بہلول خاں کو خلعت سے سرفراز فرمایا - اور ملک ملک میں اس فتح کی شہرت ہوی —

یہ سب نصرتی کا بیان ہے جو اس نے اپنے آخری اشعار میں لکھا ہے - وہ اشعار یہ ہیں - ترجمے کی ضرورت نہیں کیونکہ اوپر کا بیان انہیں اشعار کا خلاصہ ہے ' علاوہ اس کے یہ اشعار ہیں بھی آسان —

بھی بات کر شکر حق لیا بجا ۔۔۔ کھڑا رن پہ رہ شادیانے بجا
دیلایا اوسی تھار ڈیرے تمام ۔۔۔ کیا واں سر بدل سوں اپنا مقام
خبر لے کہ اس فتح کا چار دھیر ۔۔۔ چڑے تھر پر شاطراں جیوں کہ تیر
خصوصاً سنے جب حکومت پناہ ۔۔۔ خوشی بانٹنے جگ پہ کر حکم شاہ
بیجاپور میں عید کر آشکار ۔۔۔ پڑا خطبہ اس فتح کا تھار تھار
جو تھے کوٹ پر بان بھانڈے تمام ۔۔۔ دغا نے کوں فرمائے در حکم عام
شہنشہ کی ہے فتح پہلی ککر ۔۔۔ بلٹائے بہوت گھر پہ گاڑیاں شکر
پٹھا خلعتاں پادشاہی نواز ۔۔۔ کیے سرتے نواب کو سرفراز
دیے شہرت فتح یوں شہر میں ۔۔۔ کہ ہوے قصہ ہر ملک پر دھر میں

اس کے بعد نصرتی نے دو شعر اپنے اور اپنی کتاب کے متعلق لکھے ہیں —

منگے جیوں رہنا نام ہر کامگار ۔۔۔ زمانے پہ یک نقش ہو یادگار
وہیں " نصرتی " دھر کہ سرتے امس ۔۔۔ لکھیا فتح * نواب نامے کا جس

(ہر کامگار یہ چاہتا ہے کہ اس کا نام دنیا میں یادگار رہے - اس

* کاتب نے غلطی سے فتح کی جگہ فن لکھہ دیا ہے

خیال سے نصرتی نے ہمت کرکے نواب کی فتح منانے کے لیے یہ نامہ لکھا ہے) —

آخری شعر دعائیہ ہے اور اسی پر کتاب کا خاتمہ ہے —

الہی زمانے میں جم تھانوں تھانوں

اچھو مجہ بچن تے یو مرداں کا نانوں

(الہی ! دنیا میں ہمیشہ جگہ جگہ میرے کلام کی بدولت اِن مردوں کا نام زندہ رہے) -

اس پر بے اختیار آمین کہنے کو جی چاہتا ہے -

اس میں شبہ نہیں کہ یہ مثنوی علی نامے کی ٹکر کی نہیں - وہاں مغلوں اور شیواجی سے بڑے بڑے معرکے ہوئے ہیں اور اُن لڑائیوں کی حیثیت عظیم الشان جنگوں کی ہے - اُن کے مقابلے میں یہ ایک چھوٹی سی لڑائی ہے اور فوج بھی کم ہے اور سلطنت کا وہ جاہ و جلال بھی نہیں جو علی عادل شاہ ثانی کے وقت میں تھا - تاہم بڈھے نصرتی نے اس میں بھی اپنا کمال دکھایا ہے اور بعض موقعوں پر وہی رزمیہ شان اور قوت کلام پائی جاتی ہے جو علی نامے میں ہے —

(باقی آیندہ)

عمر خیام

ایک لی ریکل ڈراما

از

(عزیز احمد صاحب متعلم کلیۂ جامعہ عثمانیہ)

[عزیز احمد سلمہ' نے یہ ڈرامہ موسیقیانہ انداز میں لکھا ہے اور بعض حیثیتوں سے اردو زبان میں اپنی نوعیت کا خاص ڈرامہ ہے - اس میں علاوہ شاعرانہ خوبی کے سیرت نگاری کا حسن بھی پا یا جا تا ہے - عزیز موصوف کا ادبی ذوق قابل تحسین ہے اور امید ہے کہ اگر اس رستے پر ثابت قدم رہے تو آیندہ اردو ادب میں نام پیدا کریں گے - ایڈیٹر]

پہلا منظر

— مدرسہ —

وقتست کہ از جام جہاں آرایند

وز چشم سحاب چشمہا بکشایند

موسیٰ دستاں ز شاخ کف بنمایند

عیسیٰ نفساں ز خاک بیروں آیند

[مدرسے کے سامنے سبز قطعۂ زمین - حسن بن صباح ' عمر خیام اور

وہ طالب علم جس کو نظام الملک کا خطاب ملنے والا ہے]

[" آواز فطرت " کی آمد]

آواز فطرت

(بیک گراونڈ سے)

وہ چیز جس کو طلسم حیات کہتے ہیں — جسے حجاب رخ کائنات کہتے ہیں

وہ شب کہ جسکو زمانے میں رات کہتےہیں — وہ دن کہ جسکو زمانے نے روز گردانا

کسی پہ کھل نہ سکا اس کا راز دنیا میں — وہ شے جسے صنعت بے صفات کہتے ہیں

شکست کھا کے ہوی عقل سر نگوں آخر

طلسم ساز کا چل ہی گیا فسوں سحر

آواز فطرت

(نظام الملک سے مخاطب ہو کر)

بتا تو ہی تجھے اک دن نظام الملک ہونا ہے

تجھے کشت جہاں میں تخم انصاف آ کے بونا ہے

بتا تو ہی کہ اس ہستی کا آخر مدعا کیا ہے

سنا ، اس زندگانیء جہاں کا ماجرا کیا ہے

نظام الملک

زندگانی اک فضائے لامکاں کا نام ہے — عکس روئے صانع کون و مکاں کا نام ہے

زندگی وہ خواب ہے تعبیر ہو جسکی فنا — ہستیء انساں ، طلسم بے نشاں کا نام ہے

پھر بھی یہ ہستی حیات جاوداں کا عکس ہے — زندگی انسانیت کے امتحاں کا نام ہے

زندگی کی شمع روشن ہے ازل کے نور سے — خاک انساں سجدہ گاہ قدسیاں کا نام ہے

آواز فطرت

(حسن بن صباح سے)

حسن ابن صباح اب تو بتا
کہ انجام اس زندگی کا ہے کیا؟
عزازیل سے تو نے سیکھا ہے کیا؟
کہ اس زندگی کا ہے کیا مدعا

حسن بن صباح

زندگی ایک شورش آتش فشاں کا نام ہے　ذرہ ہائے مضطرب کے اک جہاں کا نام ہے
زندگی اک برق ہے خرمن جلانے کے لیے　زندگی کی موج خار آشیاں کا نام ہے
دھر میں شورش نہ ہو تو زندگی بے لطف ہے　زندگانی نشہ و سنگ گراں کا نام ہے
ہے ازل سے عالم فانی پہ ابلیسی اثر　خاک انساں، مشت خاک رائگاں کا نام ہے
بزدلی کا نام اس دنیا نے نیکی رکھ دیا　راز عصیاں، زندگی کی داستاں کا نام ہے

آواز فطرت

(عمر خیام سے)

اے عمر خیام ہے تیری جبیں کیوں پر شکن
کس لیے خاموش ہے تو؟ کس لیے رنج و محن
زندگی کے راز پنہاں کی بھی کچھ تفسیر کر
تجھکو ہونا ہے جہاں میں شاہ اقلیم سخن

عمر خیام

زندگی خواب پریشان جہاں کا نام ہے　حاصل ہستی وبال جانستاں کا نام ہے
ہر قدم پر جسکو اک طوفاں کا اندیشہ رہے　زندگی اُس کشتیء بے بادباں کا نام ہے
جو خزاں کے خوف سے ہر لحظہ پژمردہ رہے　زندگی اُس سرو سبز بوستاں کا نام ہے

جسکے آنے کا پتہ ہے اور نہ منزل کا نشاں   زندگی اُس کاروان خستہ جاں کا نام ہے
جسکی تہ تک عقل و ہوش و دل نہ پہونچ سکے کبھی   زندگانی اُس طلسم جاوداں کا نام ہے

آواز فطرت

تعبیر خواب زیست تو یوں کر چکے مگر
تھا تین طاقتوں کا جدا جا بجا اثر
(نظام الملک سے) تم کو ملی حیات' تو آغوش زہد میں
(حسن بن صباح سے) ابلیسیت میں آئی تمھیں زندگی نظر
(عمر خیام سے) تمکو ملی حیات شکست حیات میں
ٹوٹا جو جام' مستیء مے نے کیا اثر
لیکن یہ دیکھنا ہے کہ یہ تین قوتیں
بنتی ہیں دور زیست میں کس طرح راہ بر
ہوگا جہاں نظامت طوسی سے مستفید
صباح کے اصول سے پھیلے گا شور و شر
خیام پی کے بادہ کرے گا جہاں کو مست
اور درد دل سے چشم جہاں ہوگی خوں سے تر
ان تین طاقتوں میں رہے گی وہ کش مکش
جس سے رخ زمانہ پہ ہو یگا اک اثر

[آواز فطرت کے جانے بعد]

حسن بن صباح

جہاں تسکین پاتا ہے فریب نور ایماں سے
مگر میں درس مستی لے رہا ہوں شور عصیاں سے

گلستان جہاں پھکار خار و گل کا میداں ہے
کروں کا دامن گل چاک میں خار گلستاں سے

سکون عیش سمجھا دہر نے ہیجان ہستی کو
جگا میں دوں کا طوفاں بن کے اس خواب پریشاں سے

جسے ابلیسیت کہتی ہے دنیا اک کرشمہ ہے
لیا ظلمت میں درس زیست جس نے نور یزداں سے

نظام الملک

ہے عمر دو روزہ میں دعا بس یہ خدا سے　متصد ہو مرا خدمت دین فقر و فنا سے
متصد ہو مری زیست کا ہمدردیٔ انساں　ہو مجھکو غرض گر تو ہو خالق کی رضا سے

عمر خیام

نکل کر اس جہان رنگ و بوسے جاوداں ہو جا
اُبھر کر خاک کی پستی سے محو لا مکاں ہو جا

یہاں ہنگامۂ برور خاک و باد و آب و آتش ہیں
تو ان سب سے گذر کر نور یزداں میں نہاں ہو جا

فریب عکس میں اُلجھا ہوا ہے عالم فانی
جمال راز ہستی کا جہاں میں ترجماں ہو جا

[پردہ]

دوسرا منظر

— دربار —

آں بہ کہ دریں زمانہ کم گیری دوست
با اہل زمانہ صحبت از دور نکوست

آں کس کہ بجملگی ترا تکیہ براوست
چوں چشم خرد باز کنی دشمنت اوست

[الپ ارسلان کا دربار]

[رقص و سرود]

ایک درباری
(الپ ارسلان کی تعریف میں)

دنیا جو آج خرم و فرخندہ کام ہے — ہر سو جہاں میں شادی و بہجت کا نام ہے
باقی رہے جہاں میں الپ ارسلاں کا دور — جس میں نظام ملک کا یاں انتظام ہے
الطاف اور فضل سے عالم ہے مستفید — تحصیل علم و فن کا غضب اہتمام ہے
ہے دشمنوں کے سر کے لئے تیغ بے پناہ — اور دوستوں کو فضل و عنایت سے کام ہے
سیلاب کامیابی و نصرت کے سامنے — اعدائے بدنہاد کا قصہ تمام ہے
ہیں دل سے محو قیصر و کسریٰ کی عظمتیں — سلجوقیوں کے دور کا وہ اہتمام ہے

الپ ارسلاں
(نظام الملک سے)

نظام الملک تیرے فیض پر دنیا یہ کہتی ہے
کرے خورشید کو جو ماند اختر ہو تو ایسا ہو
بہے خوں ہو کے جو ہر درد دل کی داستاں سنکر
جہاں میں آہ کوئی دیدۂ تر ہو تو ایسا ہو

[حسن بن صباح آتا ہے]

حسن بن صباح

دور ہستی میں شہید جلوۂ باطل ہوں میں
زندگی کا اک نشان سعی بے حاصل ہوں میں

شعلۂ باطل بھی اس دنیا کی ظلمت میں بجھا
دہر میں دور چراغ کُشتۂ محفل ہوں میں

قوت شر بھی مصاف زیست میں ناکام ہے
ہوکے خوں جو بہہ چکا ہو آہ اب وہ دل ہوں میں

نظام الملک

(سفارشاً)

بزم ہستی سے پشیمانیٔ عصیاں لیکر
ایک دل خستہ چلا دیدۂ حیراں لیکر
ہے ترے فضل و کرم سے مجھے امید کہ اب
یاں سے جائیگا نہ وہ قلب پریشاں لیکر
کوئی آفت زدہ آیا در دولت پہ ترے
جب گیا یاں سے گیا بخت درخشاں لیکر

الپ ارسلاں

بس نظام الملک کی خاطر ہمیں منظور ہے
سلطنت کی شمع روشن اُس کے دل کا نور ہے
آج سے رکن حکومت ہم بناتے ہیں تجھے
سرپرستی ہم کو تیری ہر گھڑی منظور ہے

[نظام الملک جاتا ہے]

[موسیقی]

حسن بن صباح

یوں تو آساں زندگی ہے اک دل محزوں کے ساتھ
لطف تب ہے جب بسر ہو شاہد گلگوں کے ساتھ

یوں نظام الملک کے زہد ریا آمیز نے
ساز عشرت کردیا برباد اک افسوں کے ساتھ
جس طرح آئے خزاں صحن چمن کو لوٹنے
اور رخصت ہو جوانان چمن کے خوں کے ساتھ

الپ ارسلاں
(ملامت اور غصے سے)

کیا مروت کا یہی انجام ہے ؟
دوستی کیا بس اسی کا نام ہے ؟
تیری ہر جنبش میں پنہاں اک فریب
رہزن ایماں تیرا ہر کام ہے

[نظام الملک آتا ہے]

حسن بن صباح
(دربار سے جاتے ہوئے)

تمھارے ساز عشرت کو پریشاں کرکے چھوڑوں گا
تمھارے خوں سے زخم دل کا درماں کرکے چھوڑوں گا
اجازت باغباں ' گلچھلیوں کی گر نہیں دیتا
تو اس سے گلشن کو ہمرنگ بیاباں کرکے چھوڑوں گا
یہی ٹھہری جو شرط زندگی سیلاب ہستی میں
تو ہر قطرے میں پیدا زور طوفاں کرکے چھوڑوں گا
گلہ کی بجلیوں کی ضوفشانی سے مدد لوں گا
تیرا خرمن نثار برق تاباں کرکے چھوڑوں گا

[جاتا ہے]
[عمر خیام آتا ہے]

نظام الملک

حضور شاہ میں ایک کمال فن آج آیا ہے
چمن سے رازدار سر گلشن آج آیا ہے
عمر خیام جس کے فیض سے دنیا منور ہے
چمن زار جہاں سے گل بدامن آج آیا ہے

الپ ارسلاں

اے عمر خیام اے ملک سخن کے شہر یار
خوش نصیبی سے ہوا اس شہر میں تیرا گذر
ہاں بتادے گر تجھے جاہ و حشم درکار ہو
تیرے قدموں پر زمانے بھر کی دولت ہو نثار

عمر خیام

گو شاہد گردوں کی ادا اور ہی کچھ ہے
پر قلب مصفا کی ضیا اور ہی کچھ ہے
ہے علم کی خدمت سے غرض مجھکو جہاں میں
مانا کہ زمانے کی ہوا اور ہی کچھ ہے
آہنگ طرب سے ہمیں دنیا میں غرض کیا
زخم دل محزوں کی دوا اور ہی کچھ ہے
سرشار ہے دنیا مئے گلگوں کی ضیا سے
پر تشنگیٔ آب بقا اور ہی کچھ ہے

[پردہ]

منظر در منظر

حسن بن صباح کے فدائیوں کے ہاتھ نظام الملک کا قتل

تیسرا منظر

— شاہراہ —

هر جاکہ گلے و لالہ زارے بودست
از سرخی خون شہر یارے بودست
هر شاخ بنفشہ کز زمیں می روید
خالے ست کہ بر رخ نگارے بودست

[شاہراہ]

[نظام الملک کے ماتم میں راہ گیروں کا ماتمی لباس]

[عمر خیام آتا ہے]

عمر خیام

ہنگامہ کیوں بپا ہے کہ ماتم کناں ہیں سب ؟
کیا ہو رہا ہے شہر میں کیوں نوحہ خواں ہیں سب ؟

راہ گیر

نظام الملک طوسی کی شہادت کا یہ ماتم ہے
اُسی کی موت کے غم میں سیہ پوش ایک عالم ہے
کیا دنیا کو مالا مال جس کے فیض نے برسوں
اُسی فیاض و عادل کے گذر جانے کا یہ غم ہے
حسن صباح جس کے کارہائے شر کی شورش سے
بدی کی طاقت اِس دنیاے فانی میں مسلم ہے
شہید اُس نے کیا اُس پاک ہستی کو مکائد سے
کہ جس کے رنج و غم میں خونفشاں اب چشم عالم ہے

عمر خیام

ماتم کے ساتھہ آمد فصل خزاں ہے آج
ہر برگ گل سے خون شہیداں عیاں ہے آج
ہر موج بحر زیست کی ہے قاصد فنا
طوفاں سے غرق کشتیِ عمر رواں ہے آج
پیک اجل نے راز فنا کیوں بتا دیا
ہر سر رہین منت سنگ گراں ہے آج
تعمیر زندگی ہے اجل ہی کے واسطے
تار نفس میں سوزش برق تپاں ہے آج
[وقفہ]

عمر خیام

کیا خون تمنا سے زمانے نے وضو برسوں
رہی برق تپاں کو خرمنوں کی جستجو برسوں
ہوی جب خار و گل میں کشمکش صحن گلستاں میں
ہوا امت کر پریشاں کاروان رنگ و بو برسوں
شہید ناوک بیداد ہر صید حرم ہے یاں
مٹایا دور گردوں نے طلسم آرزو برسوں
کبھی دنیا سکوں سے آشنا ہونے نہیں پائی
رہا شرمندۂ چاک گریباں ہر رفو برسوں
بس اب اے شاہد گردوں حسد کی انتہا بھی ہے
کہ ہر رخسار سے مٹتا رہا یاں رنگ رو برسوں

دوسرا راہ گیر

حسن صباح بھی دنیا سے رخصت ہوگیا آخر
ہزاروں قتل کرکے جان اپنی کھوگیا آخر

عمر خیام

اجل گلشن میں پہلے آئی جور باغباں ہوکر
گری پھر خرمن صیاد پر برق تپاں ہوکر
کوئی ظالم ' کوئی مظلوم دنیا سے ہوا رخصت
فنا کا راز باقی ہے صدائے الاماں ہوکر
فنا کے واسطے پیدا کیا دنیا میں انساں کو
ڈبویا نام ہستی زندگی نے رائگاں ہوکر

[پردہ]

چوتھا منظر

— میکدہ —

آمد سحرے ندا ز میخانۂ ما
کے رند خراباتی و دیوانۂ ما
بر خیز کہ پر کنیم پیمانہ ز مے
زان پیش کہ پر کنند پیمانۂ ما

[میخانہ]

عمر خیام

مغبچوں کی سنگت

[کوزوں کے انبار]

مغبچوں کی سنگت

بے رنج و تعب

اے اہلِ شب

ہنگام طرب

آتا ہے اب

روشن کوکب بھی فروزاں ہے اب مثل شعاع رحمت رب

اِس رنج کا اس حرماں کا سبب ؟ یہ شور و فغاں بیکار ہیں سب

عمر خیام

یہاں تک ہستی انسان کو غم نے ناک رکھا ہے

کہ ہر موج نفس میں خنجر سفاک رکھا ہے

خمیر جام بنتا ہے گل خاک حسیناں سے

مئے گلگوں ہے یا خون دل صد چاک رکھا ہے

مگر اب بادۂ صافی کو پی لے کچھ تو تسکیں ہو

یہ سامان شکست شیشۂ ادراک رکھا ہے

سنگت

پھر آج چمن میں جلوہ فگن ہے شاہد گل کا رخ روشن

پھر لالۂ و ایمان و سوسن سے رشک ختن ہے آج چمن

عشرت کے ترانے گانے کو

اور لذت غم کے مٹانے کو

پھر آج چمن میں جلوہ فگن ہے شاہد گل کا رخ روشن

عمر خیام

بر خیز و دوائے ایں دل تنگ بیار

ں بادۂ مشکبوے گلرنگ بیار

اجزاے مفرح غم ار می خواہی
یاقوت مے و بریشم چنگ بہار

سنگت

لو جام شراب کہ پھر گلشن اب باد بہار کا ہے مسکن
اے مطرب پھر وہ طرز کہن سب بھولیں جس سے رنج و محن
ہو جائیں جو ساقی کے درشن تو آو لٹا دو تن من دھن
عشرت کے ترانے گانے کو
اور لذت غم کے مٹانے کو
پھر آج چمن میں جلوہ فگن ہے شاہد گل کا رخ روشن

[جام و چنگ کے ساتھہ ساقی کی آمد]

عمر خیام

خیام اگر زبادہ مستی خوش باش
با لالہ رخے اگر نشستی خوش باش
چوں آخر کار نیست خواہی بودن
آں گاہ کہ نیستی چو ہستی خوش باش

مغبچے

وہ ضیائے طلعت مہ جبیں کہ مہ دو ہفتہ ہو شرمگیں
وہ ہوائے کاکل عنبریں کہ خجل ہو جس سے غزال چیں
وہ طلسم نرگس سرمہ گیں کہ جہاں ہے جس سے تہ نگیں
وہ جمال عارض آتشیں کہ چمن میں رشک سے گل حزیں
(سنگت) - تری ہر جھلک بت نازنیں ہے شکیب عشق پہ نکتہ چیں
وہ فسون عشوۂ جانستاں کہ ہر ایک قلب ہے خونچکاں
وہ تبسم لب ارغواں کہ فروغ محفل گلرخاں

مژۂ دراز ہے دل‌ستاں کہ ہر ایک لب پہ ہے الاماں
وہ نگہ میں وسعت لامکاں کہ نگوں ہے گنبد آسماں
(سنگت) - تھری ہر جھلک بت نازنیں ہے شکیب عشق پہ نکتہ چیں

ساقی کا گیت

خزاں ہونے کو ہے فصل شباب آہستہ آہستہ
بس اب جاری رہے دو یہ شراب آہستہ آہستہ

مئے رنگیں اگر ہے کامیاب آہستہ آہستہ
سکوں پائے دل پر اضطراب آہستہ آہستہ

ادھر ہو دختر رز بے حجاب آہستہ آہستہ
اُدھر مست طرب چنگ و رباب آہستہ آہستہ

رخ رنگیں مے ہو بے نقاب آہستہ آہستہ
کہ ہو جیسے طلوع آفتاب آہستہ آہستہ

عمر خیام

بروئے گل از ابر نقاب است هنوز
در طبع و دلم میل شراب است هنوز
در خواب مرو چہ جائے خواب است هنوز
جانا مے دہ کہ آفتاب است هنوز

[پردہ]

پانچواں منظر

— لب آبجو —

من هیچ ندانم کہ مرا آں کہ سرشت
از اهل بهشت کفت یا دوزخ زشت

قوتے و بتے و بادۂ بر لب کشت
ایں هر سہ مرا نقد و ترا نسیہ بہشت
[لب آبجو]

[عمر خیام ' ساقی ' ارر مغبچوں کی سنگت]

عمر خیام

سبزہ هو چمن هو اور مئے گلگوں هو چھایا هر سو بہار کا افسوں هو
موجود اگر ساقیء گلفام رهے دنیا کی مصیبتوں سے دل کیوں خوں هو

دو دن کی اگر هے زندگانی ساقی رخصت هونے کو هے جوانی ساقی
تو هو ' مے هو ' بہار هو ' پھر کیا هے اک لمحہ هے عمر جاودانی ساقی

[" شاهد بہار " کی مجسم صورت میں آمد]

شاهد بہار کا گیت

(کورس) چمن پہ اک نکھار هے کہ آمد بہار هے

بہار هے جو دل ستاں
تو هے هر ایک شادماں
طیور بھی هیں نغمہ خواں
زمیں بھی وہ بوستاں
کہ آسماں نثار هے

(کورس) چمن پہ اک نکھار هے کہ آمد بہار هے

نکھار پر جو هے چمن
گلگوں پہ آج هے پھبن
کلی هر ایک خندہ زن
مہک رهی هے یا سمن
ترنم هزار هے

(کورس)　چمن پہ ایک نکھار ہے　کہ آمد بہار ہے

کہیں بتان آزری
ہیں محو ناز و دلبری
غضب ہے جلگ زرگری
وہ عشوۂ وفسوں گری
ہر اک بے قرار ہے

(کورس)　چمن پہ اک نکھار ہے　کہ آمد بہار ہے

جہاں میں ایک جوش ہے
کہ شور ناؤ نوش ہے
یہ چشم مے فروش ہے
کہ گم شکیب و ہوش ہے
زمانہ مے گسار ہے
چمن پہ اک نکھار ہے　کہ آمد بہار ہے

[" لیلی شب " کی آمد]

لیلی شب

زمانہ مست ہے لیلائے شب کی چشم میگوں سے
نسیم جاں فزا آتی ہے کوہ دشت وھاموں سے

دلوں میں اک مسرت کی لہرسی دور جاتی ہے
مہک اُٹھتے ہیں غلچے بھی ھوا کے رمز مکلوں سے

قمر نکلا لباس نور میں گلگشت کی خاطر
ستارے جھانکتے ہیں فصل گل کو بام گردوں سے

شب مہتاب میں محبوب ہو ، ساغر ہو ، مینا ہو
خجل ہو گلشن فردوس تک اس کیف افسوں سے

[" خت رز " کی آمد]

دختِ رز

دختِ رز آئی ہے چشمِ دلستاں کھولے ہوے
رازِ مستی کی نہفتہ داستاں کھولے ہوے

ظلمتِ گردوں میں حسن و عشق ہوجائے فنا
جام کی گردش ہے چشمِ دلبراں کھولے ہوے

آتشِ سیال میں عکسِ جمالِ یار ہے
ہے سبہ مستی رموزِ جاوداں کھولے ہوے

شورِ مینا نے چمن والوں کو حیراں کردیا
رہ گئے گل لب بہ اندازِ فغاں کھولے ہوے

مستِ نازِ حسن تجھہ کو چشمِ میگوں کی قسم
اب تو آجا گیسوے عنبر نشاں کھولے ہوے

[تینوں شکلیں غائب ہوجاتی ہیں]
[عمر خیام کا ساغر ٹوٹ جاتا ہے]

عمر خیام

ابریق مئے مرا شکستی ربی بر من درِ عیش را بہ بستی ربی
بر خاک بریختی مئے ناب مرا من مست نیم مگر تو مستی ربی

(وقفہ)

اک ادائے ناز سے ساغر کے ٹکڑے کردیے
پھر ستمگر نے دلِ مضطر کے ٹکڑے کردیے

بیخودی کا راستہ جس نے بتایا دہر کو
رہزنِ گردوں نے اُس رہبر کے ٹکڑے کردیے

شعلۂ دل کو بجھا کر صبر آجاتا تجھے
کیا ستم ہے مشتِ خاکستر کے ٹکڑے کردیے

ہے سکوں اِس عرصۂ ہنگامہ پرور میں محال
ظلمتِ شب نے مہ و اختر کے ٹکڑے کردیے

(وقفہ)

دل مضطر فنا کا رازداں معلوم ہوتا ہے
کہ راز ہستی اب جاوداں معلوم ہوتا ہے

حباب بیخودی کو اس جہاں میں عیش کہتے ہیں
اسیروں کو قفس ہی آشیاں معلوم ہوتا ہے

فریب دید سے دنیا میں ہر دام سیہ بختی
خیال گیسوے عنبر فشاں معلوم ہوتا ہے

مگر پھر نیستی اس خواب ہستی سے جگاتی ہے
تبسم بھی اک انداز فغاں معلوم ہوتا ہے

فنا کے جام میں آب بقا لیکن ہے پوشیدہ
فنا کا راز ہستی کا نشاں معلوم ہوتا ہے

نگاہ غور سے تعمیر ہستی کو اگر دیکھیں
زمیں کا ذرہ ذرہ آسماں معلوم ہوتا ہے

(طویل وقفہ)

ناکردہ گناہ در جہاں کیست بگو　آں کس کہ گنہ نہ کرد چوں زیست بگو
من بد کنم و تو بد مکافات دہی　پس فرق میان من وتو چیست بگو

[حسن ابن صباح کی روح داخل ہوتی ہے]

عمر خیام

حسن ابن صباح کی روح کیوں
یہاں آئی ہے اس طرح سرنگوں

حسن بن صباح کی روح

مرا تو نام بھی دنیا بھلا چکی لیکن
زمین شعر کا وہ شہر یار باقی ہے

نشان زہر نہ باقی رہا زمانے میں
مگر شراب سخن کا خمار باقی ہے

[حسن بن صباح کی روح غائب ہو جاتی ہے]

[نظام الملک طوسی کی روح داخل ہوتی ہے]

نظام الملک کی روح

جسے زمانے نے رند جانا طلسم ہستی کا رازداں ہے
اُسی کی عظمت کا آج چرچا زمیں سے تا حد آسماں ہے
سمجھ سکا گر نہ اُس کو زاہد قصور تھا تنگیٔ نظر کا
ملی حقیقت وہ بے خودی میں نثار خود گلشن جناں ہے

[غائب ہو جاتی ہے]

[رقص و سرود]

عمر خیام

من ظاہر نیستی و ہستی دانم
من باطن ہر فراز و پستی دانم
با ایں ہمہ از دانش خود شرمم باد
گر مرتبۂ ورائے مستی دانم

[پردہ]

ادب

تاریخ و سیر

مذہب

طب و حفظان صحت

متفرقات

اردو کے جدید رسالے

زنانے رسالے

جواہر سخن

(مرتبۂ مولوی محمد مبین کیفی چریا کوٹی، صفحات ۲۱۵ طباعت
کاغذ وغیرہ عمدہ، شایع کردۂ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد،
قیمت مجلد پانچ روپے، غیر مجلد ساڑھے چار روپے - انجمن
ترقی اردو اورنگ آباد سے مل سکتی ہے)

اردو نظموں کے معیاری اور جامع انتخابات کی طرف اب تک بہت کم توجہ کی گئی ہے، اس سے قبل متعدد انتخابات شایع ہوے ہیں لیکن ان سے حقیقی انتخابات کی شرایط پوری نہیں ہوتی ہیں - مقام مسرت ہے کہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد نے اس کی طرف عملی قدم بڑھایا ہے۔ چنانچہ حال میں اس نے اپنے انتخابات کی پہلی جلد چھہ سال کی کوشش اور اہتمام کے بعد شایع کی ہے جو ہمارے پیش نظر ہے —

انتخابات میں جن اصولوں کو مد نظر رکھا گیا ہے اس کی صراحت اکیڈیمی کے سکرٹری ڈاکٹر تاراچند اور مرتب حضرت کیفی نے کردی ہے

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ "اکیڈیمی کی مجلس انتظامیہ نے سنہ ۱۹۲۷ ع میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ اردو کے سربرآوردہ سخن وروں کے کلام کا انتخاب شایع کیا جاے - ضرورت یہ تھی کہ ایک ایسا جامع انتخاب مرتب ہو جس میں نہ صرف غزلوں کا انتخاب ہو بلکہ وہ ہر صنف سخن پر حاوی ہو، اس میں تاریخی اصول بھی مدنظر رہے تاکہ شعر اور اس کے زمانے کا تعلق عیاں ہوجاے اور زبان کی تدریجی ترقی کی منزلیں نگاہ کے سامنے آجائیں - اس انتخاب میں اس امر کا بھی لحاظ رکھا جاے کہ نہ تو اتنا مختصر ہو کہ شاعر کی خصوصیات اور اس کے شاہکاروں کی پوری طرح نمایندگی نہ ہوسکے، نہ اتنا بسیط ہو کہ اس میں کل رطب و یابس شامل ہوجائیں - چنانچہ یہ انتخاب انہیں اصولوں کے تحت میں تیار ہوا ہے - اس کے علاوہ اس میں شعراء کے انتخاب کے معاملہ میں بھی احتیاط برتی گئی ہے - جہاں تک ممکن ہوا ہے ہر ایسا شاعر جس کو صاحب طرز کہہ سکتے ہیں اس میں شامل کیا گیا ہے" - مرتب نے اپنے تمہیدی بیانات میں انہیں اصولوں کا اعلان کیا ہے - یہ تمام اصول نہایت خوش آیند بھی ہیں اور علمی بھی - اس کے سوا اکیڈیمی نے ایک نہایت معقول اور ضروری اہتمام کیا - انتخاب کا کام کیفی صاحب اردو ریسرچ سکالر کے تفویض کیا جنہوں نے کثیر دواوین، انتخابات، تذکرے اور سوانح وغیرہ سامنے رکھ کر یہ انتخاب چھ جلدوں میں (جو چھ دوروں پر مشتمل ہیں) تیار کیا، لیکن چونکہ انتخاب اکثر ذاتی رجحانات اور ذوق کی بناء پر ہوتا ہے اور اکیڈیمی ایسا ہر دلعزیز انتخاب تیار کرنا چاہتی ہے جس سے مختلف الطبایع ناظرین لطف اندوز اور محظوظ ہوسکیں اس لئے چھ مشہور علما کی ایک مجلس مقرر کی جس کے ارکان نے فرداً فرداً ایک

ایک جلد کی نظر ثانی کی ہے - نظر ثانی کے لیے بھی اکیڈیمی نے ایک علحدہ دستورالعمل بنایا ہے جس کے تحت نظر ثانی ہوئی ہے - اس دستور العمل کی تفصیل درج نہیں کی - جلد زیر تبصرہ کی نظر ثانی مولوی سید سلیمان ندوی نے فرمائی ہے - بہرحال اکیڈیمی نے اپنی کوشش اور اہتمام کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور تمام ابتدائی مراحل کو خوش اسلوبی سے طے کیا لیکن اِن تمام انتظامات کے باوجود افسوس کے ساتھہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اکیڈیمی کو اپنے مقاصد میں قطعاً ناکامی ہوئی (ہماری یہ راے موجودہ جلد کے متعلق ہے) —

سب سے پہلے ہماری نظر کتاب کی بنیادی ترتیب و تبویب پر پڑتی ہے جو غیر اصولی اور غیر علمی ہیں - اس کا بڑا سبب ادب کی تاریخ اور اس کے ارتقائی رجحانات سے ناواقفیت ہے - مرتب نے اس جلد میں پہلا دور لیا ہے اور اس کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے " پہلے حصے میں شعراے دکن کے کلام کا نمونہ اور اُن کے مختصر حالات ہیں اور دوسرے حصے میں شعراے دہلی کے کلام کا نمونہ اور اُن کے مختصر حالات اور خصوصیات درج ہیں " - یہ ترتیب بہت آسان معلوم ہوتی ہے لیکن جیسا کہ ہم بیان کرچکے ہیں زبان کی تاریخ اور اس کے ارتقائی رجحانات سے ناواقفیت کی بنا پر مرتب عجیب و غریب پیچیدہ غلطیوں کے شکار ہوگئے ہیں اور قدم قدم پر لغزش کی ہے —

پہلے دور کا پہلا حصہ دکنی شعرا پر مشتمل ہے - مرتب نے ان کی ترتیب میں کوئی زمانی و مکانی التزام رکھا اور نہ دکن کے مختلف صوبوں کے لسانی فروق کو پیش نظر رکھا ہے - ان کی نظر میں گجرات' بیجاپور' گولکنڈہ اور اورنگ آباد سب برابر ہیں - انہوں نے سواے گجرات کے بقیہ

تمام مرکزوں کو بقید عنوان درج تو کردیا ہے لیکن زمان و مکان کے تعین کرنے میں بڑی فاش غلطیاں کی ہیں - اگر گولکنڈہ اور بیجاپور وغیرہ کے الگ الگ مرکز قایم کردیے گئے تھے تو یہ بتانا چاہئے تھا کہ ان کے علحدہ تعین کا کیا سبب ہے - ان دونوں مقاموں کے لسانی فروق اور ادبی و شعری رجحانات کیا ہیں - مرتب نے یہ نہیں کیا اور اس سے قبل جو بعض حضرات نے بے سوچے سمجھے یا بخیال سہولت یہ التزام، کیا تو انہیں کی اندھی تقلید میں خود بھی یہ مراکز قایم کردیے —

اگر مرتب یہ نہیں بتاسکتے تھے تو صاف سیدھی بات یہ تھی کہ کتاب کی ترتیب کی بنیاد زمانی اعتبار یا سنہ وار رکھتے - موجودہ ترتیب تو قطعاً اصولی نہیں - پھر مرتب نے بڑا ستم یہ کیا کہ ایک مرکز کے شعرا کو دوسرے مرکز کے تحت درج کردیا مثلاً شعراے احاطۂ مدارس و بیجاپور میں صبای ' گجراتی اور محمود گجراتی کو شامل کردیا - حالانکہ مدراس اور گجرات میں ہر لحاظ سے بعد المشرقین ہے - مرتب نے ان دونو شاعروں کو باشندگان گجرات بتاتے ہوے بھی یہ غلطی کی ہے - اسی طرح جعفر زٹل کو دکنی اور عزلت کو اورنگ آبادی شاعر تسلیم کرلیا ہے —

دکن میں اردو شاعری کے تین مشہور اور اہم مرکز ہیں - بیجاپور ' گولکنڈہ اور اورنگ آباد - پہلے دو مرکزوں کے لسانی و شعری امتیازات و فروق کا تعین اب تک نہیں ہوا ' اور ان کا تعین کرنا ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے - یہ دونوں ٹھیٹ دکنی کے مرکز ہیں - اورنگ آباد کا مرکز بعد کو قایم ہوا اور یہ پہلے دو مرکزوں سے ہر لحاظ سے مختلف و ممیز ہے - اورنگ آبادی زبان دکھنی نہیں (جیسا کہ رسالہ اردو بابت اکتوبر ۳۲ ع میں مضمون دکھنی مخطوطات پر تنقیدی نظر میں مفصل و مدلل

طور پر ثابت کیا گیا ہے)۔اسی طرح گجرات کا ایک علحدہ مرکز ہے اور اس کی ادبی و شعری پیداوار کسی طرح دکن سے کم نہیں۔یہ میدان محققین کی نظروں سے ابھی تک پوشیدہ ہے —

دھلی میں اردو شاعری کا باضابطہ آغاز عہد محمد شاہی میں ہوا۔ یہ دور ایہام گویوں کا تھا۔ اس میں کم سے کم سولہ ایسے مشہور شاعر ہیں جو اپنے وقت کے صاحب طرز استاد مانے جاتے تھے، جن میں آبرو، حاتم، ناجی، مضمون وغیرہ بطور خاص مشہور ہیں۔ایہام گوی کے خلاف مظہر، سودا، میر وغیرہ نے اپنی کوششوں کا آغاز کیا اور اردو شاعری کو ایہام گوی کے تباہ کن قید و بند سے آزاد کیا۔مظہر بقول مصحفی زبان اردو کے "نقاش اول" ہیں۔سودا نے بھی طرز ایہام گوی کی مذمت جا بجا اپنے اشعار اور نظموں میں کی ہے اور ایک نئے طرز کا آغاز کیا۔ایہام گوی اور اس نئے طرز کے متعلق میر نے اپنے تذکرے کے خاتمے پر وضاحت کردی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "شاعران سلف میں ایہام کا رواج تھا لیکن اب طبایع اس صنعت کی طرف بہت کم مایل ہیں ... ہم نے جو انداز اختیار کیا ہے وہ تمام صنعتوں پر حاوی ہے" —

اس بیان سے ظاہر ہے کہ دھلی میں پہلے ایہام گویوں کا دور تھا۔ اس کے خلاف مظہر، سودا، میر وغیرہ نے ایک نئی تحریک کا آغاز کیا۔ مرتب اگر اردو شاعری کا غور سے مطالعہ کرتے اور ان تمام رجحانات کو پیش نظر رکھتے تو ان کو اپنی کتاب کی ترتیب میں ضرور بنیادی تبدیلیاں کرنی پڑتیں اور شعراے دکن اور شعراے دھلی دونوں کے خاص خاص ادوار بلحاظ خصوصیات مقرر کرنے پڑتے۔لیکن انہوں نے اس کا کوئی لحاظ نہیں کیا حالانکہ انہوں نے اس کا دعویٰ بھی کیا ہے "ہم نے ترتیب

دور میں زیادہ تر تدریجی ترقی کا خیال رکھا ہے - اگرچہ ترتیب سال و سن سے بھی اعراض نہیں کیا گیا ہے لیکن جہاں کہیں ان دونوں میں تصادم ہوا ہے ہم نے پہلی شکل کو ترجیح دی ہے " —

مرتب نے اس دور میں بعض مشہور صاحب طرز اساتذہ کو ترک کردیا ہے ' دکن کے کئی نامور شعرا بے التفاتی کا شکار ہوگئے ہیں - دھلی کے شعرا میں سودا ' میر ' سوز وغیرہ بھی نہیں لیے گئے ' حالانکہ ان کے بعد کے شاعر اس میں آگئے ہیں - یہ سب صاحبان طرز ہیں اور اپنے اپنے رنگ کے استاد ' میر اور سودا کی نسبت غالباً مرتب اپنے اس عذر کو کار گر اور کافی خیال کرتے ہیں کہ " پہلی جلد کے انتخاب میں کوشش کی گئی ہے کہ اشعار کی تعداد کے لحاظ سے منتشر نمونے یکجا ہو جائیں - اس لئے اس دور کے شاعروں میں سے کمتر ایسے ہیں جن کے دیوان شایع ہوے ہیں " - اگر اس بیان سے یہ مراد ہے کہ ان شعرا کو ترک کردیا گیا ہے جن کے دیوان شایع ہو چکے ہیں تو سوز کا بڑا ضخیم دیوان ہے جو اب تک معرض طبع میں نہیں آیا - اسی طرح اور بھی چند شاعر ہیں جن کے حق میں حقیقتاً ناانصافی ہوی ہے —

مشہور شعرا کے ترک کے ساتھہ مرتب نے یہ بھی کیا کہ جن شاعروں کو لیا ہے ان کا بلند پایہ کلام پیش نہیں کیا یا کم سے کم ایسا کلام انتخاب نہیں کیا جو مخصوص انداز رکھتا ہے - سراج کی مثنوی بوستان خیال (جس کا ذکر مرتب نے کیا ہے اور سہیل علی گڑہ میں اور علحدہ بھی چھپ چکی ہے) کا کوی نمونہ اس انتخاب میں نہیں - بوستان خیال شاہ سراج کے خاص انداز بیان کا نمونہ ہے - نصرتی کے قصاید میں جو زور ' بلند آہنگی اور شکوہ ہے وہ فارسی کے مسلم الثبوت قصیدہ گو شاعروں

کے کلام سے کم نہیں - اس کے قصاید کے نمونے چھپ چکے ہیں - ان کے نہ ہونے سے نصرتی بلکہ اس دور کی قصیدہ گوئی کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا - اس طرح آبرو اور دوسرے ایہام گو شعرا کا ایسا انتخاب کیا ہے جو موجودہ زمانے کی زبان سے بہت قریب ہے - اس سے یہ ہوا کہ ایہام گوئی کا عمدہ اور صحیح نمونہ پیش نہ ہوسکا - آبرو کی بعض مثنویاں اور فغاں کی ہجویات اور دیگر نظمیں خاص وزن رکھتی ہیں - ان کے انتخاب کا نہ ہونا بڑی کمی ہے - ان حالات میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ موجودہ انتخاب میں نمایندہ یا معیاری کلام درج ہے —

کتاب کی غیر اصولی ترتیب و تبویب اور انتخاب کے بعد ہماری نظر فاضل مرتب کی ان آزاد اور بے لگام آرا اور تنقیدوں پر پڑتی ہے جو بعض بنیادی مسایل کے حق میں صادر ہوئی ہیں - دکھنی شاعری کے متعلق وہ لکھتے ہیں " دکنی شاعری کی لفظی خصوصیات میں یہ امر نمایاں ہے کہ اس نے اپنے فاتحوں کا اثر قبول نہیں کیا - اس سے جہاں تک ہو سکا اپنی زبان کا آئینہ بنی رہی - اگرچہ اس تعصب اور سخت گیری نے اس کو محدود دائرے سے آگے بڑھنے نہیں دیا " —

فاضل مرتب کو یہ نہیں معلوم کہ جو زبانیں فتح اسلام کے وقت دکن میں بولی جاتی تھیں وہ مرہٹی ، کنڑی اور تلنگی تھیں - دکھنی اردو میں ان تینوں زبانوں میں سے کسی کا کوئی بنیادی عنصر شریک نہیں حتیٰ کہ ان زبانوں کے معمولی اور چند (سواے ایک آدہ کے) الفاظ بھی استعمال نہیں ہوے ہیں - دکن میں جو قدیم اردو رائج ہوئی وہ وہی زبان تھی جو مسلمان فاتح شمالی ہند سے بولتے آے تھے - مرور زمانہ سے اس میں فرق پیدا ہوتا گیا اور دکن کی فضا میں وہ

آزاد نشو و نما پاتی رہی اور رفتہ رفتہ شمالی ہند کی زبان سے مختلف ہوتی گئی - لیکن اس میں کبھی بھی دکن کی کسی اصلی اور قدیم زبان کا کوئی جزو شامل نہ ہو سکا - بعض الفاظ ایسے ماتے ہیں جو کسی قدر متغیر شکل میں مرہٹی میں پائے جاتے ہیں لیکن اس سے یہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ وہ مرہٹی کے ہیں - اس لیے کہ ایسے الفاظ مرہٹی اور دکھنی اردو میں پراکرت سے آئے ہیں اور ان دونوں زبانوں میں علحدہ علحدہ پہاچلے سے ان میں تغیرات پیدا ہوگئے ہیں ' براہ راست مرہٹی سے ایسے الفاظ دکنی اردو میں داخل نہیں ہوے ہیں - ایسی حالت میں فاضل مرتب کی رائے کیا وزن رکھتی ہے —

مرتب نے ولی کو خاتم الشعراء دکن لکھا ہے' دکن کی شاعری ولی پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اس کے بعد در اصل اورنگ آباد میں اردو شاعری کا مرکز قایم ہوا ہے جس میں بڑے باکمال شاعر ہوے ہیں - ان میں سراج ' عاجز' داؤد ' سامی وغیرہ خاص طور سے مشہور ہیں (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مضمون اورنگ آباد اور اردو شاعری مندرج مجلہ عثمانیہ جلد ایک) —

مرتب نے شعرا کے حالات وغیرہ اور ان کے اسماء وسنین تک میں غلطیاں کی ہیں حالانکہ بہت سے تذکرے چھپ چکے ہیں اور جن شاعروں کا ذکر اس کتاب میں ہے ان پر متعدد مضامین لکھے جا چکے ہیں - اس پر بھی مرتب " ہنوز روز اول " کا شکار ہیں - اس قسم کی بے شمار غلطیاں ہیں - اس مختصر تبصرے میں گنجائش نہیں کہ ان سب کو گنایا جائے - چند پیش کی جاتی ہیں - ذیل کی غلطیوں کے اسباب ہمارے خیال میں تین قسم کے ہیں - (۱) غیر معتبر ماخذات (۲) حوالوں کی

اور اصل کتابوں کی کمی (۳) عجلت اور چھان بین اور تحقیق وتدقیق سے بیگانگی - ہمارے خیال کی تائید ذیل کی مثالوں سے ہوتی ہے —

عارف الدین خاں عاجز کی تصانیف میں مرتب نے فیروز شاہ اور ملکۂ مصر کو شامل کردیا ہے اور اس کو دکنی شاعر اور اورنگ زیب کا معاصر فرض کرلیا ہے - حالانکہ عاجز اورنگ آبادی شاعر ہے اور بقول مہر ۱۱۶۵ سے بارہ سال قبل اکبر آباد سے دکن آیا - اس کی مشہور تصنیف علاوہ دیوان کے مثنوی لعل وگوہر ہے - قصۂ ملکۂ مصر کا مصنف محمود ہے - بعض صاحبوں نے اس کو محمدعلی اور بعض نے سید محمد لکھا ہے اور تخلص عاجز بتایا ہے حالانکہ اس شاعر کا تخلص محمود ہے - اول الذکر دونوں نام غلط ہیں - خود قصۂ ملکۂ مصر کے خاتمے پر شاعر نے اپنا تخلص اس طرح ظاہر کیا ہے :-

اے محمود اب پیر کا ناوں لے
ختم کر درازی سواب چھوڑ دے

مرتب نے سیف الملوک بدیع الجمال کا سنہ تصنیف ۱۰۴۵ بتایا ہے حالانکہ خود شاعر نے خاتمے پر اس کا سنہ تصنیف ۱۰۳۵ بتایا ہے —

برس یک ہزار ہور پیں تیس میں
کیا ختم یو نظم دن تیس میں

تحفۃ النصائح کا سنہ ۱۰۴۶ بتایا ہے خود شاعر نے ۱۰۴۵ لکھا ہے —

ہجرت تے دس سو سال ہور چالیس پر بھی پانچہ اتھے
تب یو مرتب سب ہوا تحفہ سو دکھنی نامور

مرتب نے اس خیال کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے کہ ہاشمی بیجاپوری ریختی کا موجد ہے - اس کا سنہ وفات ۱۱۰۹ ھ بتایا ہے - ہاشمی بے شبہہ ریختی

میں طبع آزمای کرتا تھا لیکن اس کو موجد ریختی کہنا درست نہیں ' خود وجہی کی غزلیں ۱۰۱۸ ھ میں ریختی میں ملتی ہیں - مثلاً ہم دو شعر ایک غزل کے نقل کرتے ہیں —

چلو نا جائیں اے سہلیاں ہمارا لال جاں اچتا
ولے کوی جانتا نیں ہے کہ بہوند و وو کاں اچتا
نشاں نیں بے نشاں ہے وہ نشاں اس کا نہ کے منجکوں
سکی اُڑ جائیں پنکھی ہو اگر اس کیں نشاں اچتا

مرتب ضروری تاریخ سے بھی واقف نہیں اور نہ وہ اس سے واقف ہونے کی زحمت اٹھانی گوارا کرتے ہیں - انہوں نے مرزا کے متعلق لکھا ہے " عالمگیر نے جب اورنگ آباد فتح کیا اس وقت وہ موجود تھے " - اورنگ آباد شاہ جہاں کے عہد میں فتح ہوا - اس وقت اس کا نام کھڑکی تھا جس کو خود اورنگ زیب نے اپنی شہزادگی کے زمانے میں ترقی دی اور نام اورنگ آباد خجستہ بنیاد رکھا - یہ ۱۰۶۸ ھ کا واقعہ ہے - عالم گیر نے گولکنڈہ فتح کیا - مرزا در اصل تانا شاہ والی گولکنڈہ کا مقرب تھا اور میر حسن نے (جس کا حوالہ مرتب نے دیا ہے) یہی لکھا ہے - تانا شاہ کی مملکت کی حدود سے اورنگ آباد باہر تھا اور قلمروے مغلیہ میں شاہ جہاں کے زمانے سے داخل تھا —

لایق مرتب نے محمد قلی قطب شاہ کا سنہ ولادت ۹۷۷ لکھا ہے - یہ نہ تو اس کی ولادت کا اور نہ تخت نشینی کا سنہ ہے - وہ جمعہ چار رمضان ۹۷۳ کو پیدا ہوا اور ۹۸۸ ھ میں تخت نشین ہوا - محمد قلی قطب شاہ کے تخلص کے بارے میں مرتب نے لکھا ہے کہ وہ فارسی میں قطب شاہ اور اردو میں معانی تخلص کرتا تھا - یہ غلط ہے - مرتب نے جو اردو کلام اس کا درج کیا ہے اس میں خود قطب شہ تخلص موجود ہے اور اگر فارسی میں اس کا تخلص

معانی ہے تو پھر اس نے اردو میں کیوں معانی تخلص استعمال کیا - خود مرتب نے اپنی کتاب کے صفحہ ۲۸ پر ایک اردو شعر درج کیا ہے جس میں معانی تخلص موجود ہے - یہ غلطی در اصل محبوب الزمن کے بیانات پر اعتبار کرنے سے ہوی - اگر رسالہ اردو جلد ۲ کو غور سے دیکھہ لیا جاتا تو یہ غلطی نہ ہوتی —

مرتب نے ایک اور مضحکہ خیز غلطی کی ہے - شفیق کے حالات لکھے ہیں اور مخزن نکات ' چمنستان شعرا ' نکات الشعرا اور تذکرۂ میر حسن کے حوالے دیے ہیں - حالانکہ چمنستان شعرا مولفہ شفیق کے سوا بقیہ تذکروں میں سے کسی میں اس کا حال درج نہیں - مرتب کو یہ تو سوچنا چاہئے تھا کہ شفیق کا سنہ ولادت ۱۱۵۸ ھ (جیسا کہ خود مرتب نے بھی لکھا ہے) اور نکات الشعرا کا سنہ تالیف ۱۱۶۵ ھ - کیا میر صاحب اپنے تذکرہ میں طفل ہفت سالہ کا ذکر بحیثیت شاعر کے کرسکتے تھے —

اس جلد کے آغاز میں اکیڈیمی کے لایق سکرٹری نے اس اہتمام کا ذکر کیا ہے جو دکنی شاعروں کے کلام کی غلط نقلوں کے ازالہ کے بارے میں اکیڈیمی نے کیا ہے - اس اہتمام کے باوجود بھی صحیح کلام نقل نہ ہوسکا اور بے شمار غلطیاں رہ گئی ہیں - جن سے شعر مہمل ' بے معنی اور فہم سے باہر ہوگئے ہیں - ہم چند مثالیں درج کرتے ہیں —

صفحہ ۳ " لکہ جوت ہے پرتھارولے تھک رتن ہے " - اس میں تھک کی بجاے ٹیک (بمعنی ایک) چاہئے - یہ غلطی در اصل رسالہ اردو کی کتابت کی غلطی کی وجہ سے چلی آرہی ہے - رسالۂ اردو میں کاتب نے ٹیک بجاے ٹیک کے لکھہ دیا حالانکہ ٹیک کے نیچے مضمون نگار نے معنی کے طور پر " ایک " لکھہ دیا تھا جس سے کتابت کی غلطی

میں شبہ نہیں ہوسکتا لیکن سب اس کو غلط نقل کرتے چلے آتے ہیں اور کوئی معنی ومفہوم پر غور نہیں کرتا - اس پوری غزل میں یہ لفظ غلط نقل ہوگیا ہے - جس کی وجہ سے تمام اشعار مہمل ہوکر رہ گئے ہیں -

صفحہ ۴۸ " بتیاں ستر چھہ سات سر' - اس میں بیتاں (بمعنی ابیات) چاہئے -

صفحہ ۶۴ " ابتا ھاشمی تو مناجات کر "- اس میں مناجات تو خیر طباعت کی غلطی ہے لیکن ابتا کی جگہ اِتا (بمعنی اتنا) چاہئے —

صفحہ ۶۴ " پسند کر کر روراکیں جو سب ہوشمند " - یہ مصرع دراصل اس طرح ہے " پسند کرکے راکھیں جو سب ہوشمند " -

صفحہ ۵۴ " نوری ایس کے دل کی کسی نہ کہہ بتھا " - اس میں ایس کی بجائے اپس (بمعنی اپنے) چاہئے —

صفحہ ۹۰ " کم سمجھہ سکتے تھے اس کو خاص و عام "- خاص و عام کی بجائے خلق عام چاہئے ورنہ شاعر کا مدعا یہ نہیں کہ منطق الطیر خاص کی سمجھہ سے بھی باھر ہے —

صفحہ ۹۰ " لیکن اس کو دیکھہ کر دلچسپ بول " - یہاں کو کی بجائے کے چاہئے -

صفحہ ۹۱ " شوق سوں ایسا روچایا یک چھجا " - یہاں شاعر طوطی سے خطاب کررہا ہے کہ تو شوق مستی میں ایک نغمہ بلند کر - اصل نسخہ میں روچایا کی جگہ اوچا (بمعنی بلند یا اونچا کر) ہے اور چھجا کی جگہ چہچہا ہے —

صفحہ ۱۷۲ "خبر تیر عشق میں نہ جنوں رھا نہ پری رھی"- تیر کی بجائے تحیر چاھیے

اس قسم کی بکثرت غلطیاں موجود ہیں - اس غلط نقل سے صاف ظاہر ہے کہ مرتب قدیم اردو کے ناقابل فہم اور غلط اشعار کو صحیح

سمجھتے ھیں اور اُن پر اپنی آزاد رائیں صادر کرتے چلے جاتے ھیں - پہلے تو وہ اشعار کو سمجھتے نہیں ھیں دوسرے ان کے پیش نظر شاعروں کا کلام وافر مقدار میں موجود نہیں ھے - ان دو صورتوں میں ان کی راے ظاھر ھے کہ قیاسی اور ناقص ھوگی چنانچہ اکثر شاعروں کے کلام پر انہوں نے جو رائیں دی ھیں وہ قابل قبول نہیں - مرتب اگر تفصیلی کلام کا مطالعہ کریں تو اُن کو اپنی تنقیدوں پر ضرور افسوس ھوگا -

ھم نے یہ تبصرہ بہت ھی روا روی میں لکھا ھے - اگر اِس انتخاب کا زیادہ غور سے مطالعہ کیا جاتا تو یقین ھے کہ غلطیوں کا ایک دفتر ھو جاتا - اکیڈیمی کو ھمارا مشورہ ھے کہ وہ اپنے انتخابات کے سلسلے میں اپنی کوشش اور اھتمام کو زیادہ وسعت اور عمدگی سے عمل میں لاے - یہ جلد بہت اھم تھی اور اتفاق سے اس میں گوناگوں خرابیاں پیدا ھوگئیں - اس جلد سے صاف ظاھر ھوتا ھے کہ اس کی تیاری کے لئے نہ تو ادبیات اردو کی تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا گیا اور نہ زیادہ مہلت اس کے مرتب کرنے میں کی گئی ھے -

(چ)

———) * (———

بچوں کی نظمیں

(مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دھلی - صفحات ۵۵ قیمت پانچ آنے)

اس کتاب میں بچوں کے لئے سلیس اور سادی نظمیں جمع کی گئی ھیں جو پر لطف بھی ھیں اور مفید بھی - ھماری زبان میں بچوں کے لئے ایسی کتابیں بہت کم ھیں اور اس لیے یہ مجموعہ بہت قابل قدر ھے -

———) * (———

اصغر کے سو شعر

(مکتبۂ جامعۂ ملیہ دھلی - قیمت چار آنے)

اس چھوٹی سی خوبصورت کتاب میں اردو کے مشہور شاعر اصغر گونڈوی کے سو اشعار کا انتخاب کیا گیا ھے - شروع میں اصغر صاحب کے حالات اور کلام پر آٹھ صفحے کا دیباچہ ھے - جو صاحب اصغر کے حکیمانہ کلام کے دلدادہ ھیں وہ اس انتخاب کو پڑھ کر ضرور خوش ھوں گے —

———) * (———

گنج پنہاں

(جعفری بک ڈپو ' سیتاپور قیمت چار آنے)

یہ میرانیس کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ ھے جسے جناب آہ سیتاپوری نے شایع کیا ھے - یہ جناب زیلب کی شہادت پر ھے -

———) * (———

گلزار معانی

(کلام جناب پنڈت دینا ناتھ مدن بی - اے ' معجز دھلوی ' لال حویلی ' محلۂ چوری گراں دھلی - قیمت چار آنے)

یہ جناب معجز کی غزلیات کا مجموعہ ھے - جن صاحبوں نے اُن کی تالیفات مخزن اسرار اور پیام سالک دیکھی ھیں وہ جانتے ھیں کہ معجز صاحب کو تصوف سے خاص لگاؤ ھے - یہ کلام بھی عارفانہ اور صوفیانہ ھے —

———) * (———

چراغ ایمن

(کلام کنور احمد صیانت الزماں صاحب فکری سلطان پوری -
صفحات ۹۶ - قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے - ملنے کا پتہ
کنور احمد اعتبار حسین خاں - ہاریمئو ' ڈاک خانہ
جگدیش پور ضلع سلطان پور)

یہ جناب فکری کا مجموعۂ کلام ہے - کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسم بامسمیٰ ہیں - خیالات کے اظہار میں جرأت ہے اور ان کی شاعری صرف غزل تک محدود نہیں - عام نظموں اور غزلوں دونوں میں اچھے جذبات کو خوبی سے ادا کیا ہے - تصنع اور ابتذال نہیں پایا جاتا - فکری کا ذوق صحیح اور طبیعت پرجوش ہے —

چند ڈرامے

از نور الہی محمد عمر	ناشر اُردو بک اسٹال -

یہ کتاب ایک ایک باب کے سات چھوٹے چھوٹے مذاقیہ ڈراموں کا مجموعہ ہے - جن میں سے اکثر مغربی مزاحیہ ڈراموں سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں - ادبی حیثیت سے اِن میں کوئی خاص خوبی نہیں ہے - عبارت کو تھیٹری انداز میں مقفیٰ اور مسجع بنانے کی کوشش کی گئی ہے - ظرافت میں شستگی نہیں -

پہلا ڈراما "اُدماتی" - گلبرٹ کے دلکش لطیف آپیرا "Trial by jury" کا آزاد ترجمہ ہے ' لیکن اصل کی لطافت و خوبی اور خوش اسلوب ظرافت

پیدا نہیں ہوسکی جملے کہیں کہیں بھونڈے ہوگئے ہیں - گفتگو میں تسلسل نہیں رہا اور بعض جگہ وہ حصے جو اصل آپیرا کی جان تھے بالکل حذف کردیے گئے ہیں - اصل آپیرا لطیف مزاحیہ نظم میں تھا، نثر میں اس کی وہ خوبی باقی نہیں رہی —

دوسرا ڈراما "جلون ادب" ایک تھیٹریکل فارس (Farce) ہے - مذاق عامیانہ ہے - اور ادبی یا ڈرامائی تناسب کا لحاظ نہیں رکھا گیا - مکالمے کی طرح ظرافت میں بھی تکلف پایا جاتا ہے - ظرافت میں شگفتگی نہیں، اور ہر جملے سے معمولی تصنع ظاہر ہوتا ہے - تیسرے ڈرامے کا ماخذ وہ دلچسپ قصہ ہے کہ ایک جج کی گونگی بیوی علاج کے بعد اس شدت سے باتونی ہوجاتی ہے کہ تنگ آکر خود جج کو بہرا ہوجانے کی دوا استعمال کرنی پڑتی ہے - اِس میں شروع کا مکالمہ جو جج اور وکیل کے درمیان ہے بہت پھس پھسا اور بے لطف ہے - پھر جج اپنی بیوی کی خاموشی کی شکایت کے بعد اُس کے باتونی پن کی شکایت اس قدر جلد، اور بے ربط طور پر کرنے لگتا ہے کہ واقعے کا سارا لطف کرکرا ہوجاتا ہے - البتہ اِس ڈرامے میں قابل تحسین چھڑ جج کی رپورٹ ہے —

"پہلی پیشی" - "لاگ ڈانٹ" اور "ہمہ خانہ آفتاب" اسی قسم کے مزاحیہ ڈرامے ہیں - کہیں کردار عیسائی ہیں تو اُن کی زبان مستورات دهلی کی شستہ زبان ہے - اور کہیں کردار مسلمان ہیں تو اُن کی زندگی مغرب کی مہذب زندگی کی نقل ہے —

(ع-۱)

راز

از کے - ایم - یوسف الدین مطبوعۂ آرتھر استاک ویل لمیٹڈ - لندن
قیمت ۲ شالنگ چھہ پینس

شروع میں تمہیداً چند سطروں میں مصنف نے بیان کیا ہے کہ اِن میں سے بعض ترجمے اُردو نظموں کے مشہور ترجمے ہیں اور بعض انگریزی ہی میں لکھے گئے ہیں' گو خیالات اور تصورات اُردو کے ہیں - لیکن کہیں اُس کی صراحت نہیں ہے کہ ان میں سے کون سی منثور نظمیں ترجمے ہیں' اور کون طبع زاد ہیں - اِس کا بھی پتا نہیں چلتا کہ کن اردو نظموں کا ترجمہ کیا گیا ہے -

اِس کتاب کی اشاعت کا کوئی مقصد سمجھہ میں نہیں آتا - اگر اِس کا باعث یہ ہوا ہے کہ انگریزوں کو اردو شاعری کے طرز تخیل اور طرز ادا سے واقف کرایا جاے' تو اس کے لئے ضرورت تھی کہ منتخب شعراء کے منتخب کلام کا صحیح اور فصیح ترجمہ کیا جاتا -

اِن ٹکڑوں میں جو صاف سادہ انگریزی نثر میں لکھے گئے ہیں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی -

ترجمے معمولی قسم کی نظموں کے کئے گئے ہیں - اور پہلی نظر میں معلوم ہوجاتا ہے کہ ٹیگور کی نظموں کے انگریزی ترجموں کو پیش نظر رکھہ کے اپنے طور پر مترجم صاحب نے یہ نظمیں انگریزی میں ترجمہ کی ہیں - یہ معلوم نہیں اِن میں سے کون سی نظمیں طبعزاد ہیں - معیار سب تقریباً یکساں ہے - ہمیں امید نہیں کہ اس قسم کی کوششوں سے غیر اردو داں طبقوں اور خصوصاً یورپ میں اردو شاعری کے متعلق کوئی اچھا خیال پیدا ہوگا -

(ع - ا)

شعر الحکم جلد دوم

از ضامن حسین صاحب گویا جہان آبادی - کتاب مجلد ہے -
طباعت و کتابت دیدہ زیب - حجم تقریباً (۸۰) صفحات

یہ " گویا " جہان آبادی کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ہے - مولانا عبد الماجد بی - اے نے شاعر کا تعارف کرایا ہے - مجموعۂ نظم تین حصوں پر مشتمل ہے - پہلے حصے میں غزلیں اور رباعیاں ہیں ' دوسرا حصہ نعتوں اور منقبتوں کا مجموعہ ہے - تیسرے حصے میں مختلف نظمیں ہیں - خیالات میں جدت نہیں لیکن پاکیزگی اور متانت ضرور ہے - زبان بہت صاف ہے اور ادائے بیان میں خاص لطف اور نزاکت ہے - اور عام رنگ ظاہر کرتا ہے کہ پر مشق شاعر ہیں - بعض بعض شعر بہت اچھے نکل گئے ہیں - دوسرا اور تیسرا حصہ پہلے حصے کے مقابلے میں کسی قدر پھیکا اور بے رنگ ہے —

(ع - ا)

فانوس خیال

از امین الدین احمد صاحب - ملنے کا پتہ لائبریرین لوھارو
اسٹیٹ لائبریری - قیمت ایک روپیہ - طباعت و کتابت اچھی -

یہ تیسرے درجہ کا ناول شاید ہی کسی طبقے میں مقبول ہو سکے
قصہ ناھموار سا ہے - واقعات کی ترتیب ناممکن طریقے پر کی گئی ہے ·

انگریزا اور اینگلو اینڈین سوسائٹی کا بہت غلط تصور پیش کیا گیا ہے، اور اس سوسائٹی میں مسلمان ہیرو جس طرح ملتا ہے اور جو واقعات پیش آتے ہیں وہ سب تقریباً ناممکن ہیں - طرز خیال رینالڈس کے ناولوں سے ملتا جلتا ہے - کسی اعتبار سے اس ناول میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی —

(ع - ا)

بیاض سحر

مصنفۂ د-ب-سدید (اہلیہ سید نراب علی صاحب) قیمت مجلد
تین روپیہ آٹھ آنے - قومی کتب خانہ لاہور

یہ ناول ایک پنجابی خاتون کی تصنیف ہے - مقدمہ سر عبدالقادر نے لکھا ہے - کتابت اور طباعت دونوں قابل تعریف ہیں --

مگر اس سے زیادہ اس کتاب کی تعریف میں کچھہ نہیں کہا جا سکتا کہ " اخلاقی ناول "لکھنے کا شوق اُردو خواتین کو شاید زنانہ رسالوں کی فضا سے شروع ہوا - اس قسم کے ناول جن کا مقصد زنانہ پند و موعظت ہوتا ہے ' جن کے قصے عجیب و غریب پیچ در پیچ ' اور مختلف ومتضاد عناصر سے مرکب ہوتے ہیں اور جو مسلم خواتین کی نیم تعلیم یافتہ ذہنیت کا آئینہ ہیں ' اُردو میں بکثرت لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں —

اُردو زبان میں ایسے ناولوں کی بہت سخت ضرورت ہے جو خواتین " نسوانی نقطۂ نظر " سے لکھیں - وہ خالص نسوانی نقطۂ نظر جس سے وہ

روز مرہ کی زندگی کو دیکھتی اور سمجھتی ہیں اُن کا خالص نسوانی طرز خیال، نسوانی طرز ادا، زندگی کے ساتھہ اُن کی نسوانی ہمدردی ان سب چیزوں کی اُردو زبان کو ضرورت ہے - اخلاقی ناولوں کا خاطر خواہ اثر اُسی صورت میں ہوسکتا ہے جب واقعات بالکل مطابق فطرت اور معاشرت کا آئینہ ہوں - واقعہ نگاری میں خلوص کی جھلک خود بخود پیدا ہو جاتی ہے - اور یہ خلوص ناول کے اخلاقی مقصد کو بہت زیادہ پر اثر بنا سکتا ہے —

سر عبدالقادر اپنی تمہید میں تحریر فرماتے ہیں ' ہندوستانی شرفا کا پرانا تمدن اس زمانے کے نئے نئے اثرات سے بہ سرعت بدل رہا ہے ' اور اس کی جگہ نیا تمدن ابھی پوری طرح قائم نہیں ہوا - بیگم تراب علی نے اس دور تغیر کے حالات اس کتاب میں خوبصورت پیرایے میں بیان کیے ہیں " - افسوس کہ ہمیں اس سے کسی قدر اختلاف ہے - پلاٹ اس قدر عجیب و غریب ہے کہ ہندوستان کی معاشرت کی مختلف فضاؤں میں سے کسی فضا پر صادق نہیں آ سکتا - افراد قصہ میں زندگی نہیں، حقیقت نہیں - قصے کے واقعات اس قدر عجیب ہیں کہ اُن کا اس ترتیب سے پیش آنا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے - " دور تغیر " کی نفسیاتی کیفیت تو درکنار ظاہری معاشری کیفیت کا بھی صحیح مطالعہ نہیں کیا گیا ہے - مکالمہ بھی بے ربطی اور تصنع سے خالی نہیں - تاہم کہیں کہیں مکالمے میں زندگی کے آثار پیدا ہوگئے ہیں ' اور وہی حصہ اس کتاب کا قابل مطالعہ اور لایق داد ہے —

ناولوں سے اخلاقی اثرات پوری طرح ڈالے جاسکتے ہیں - مگر اخلاقی مباحث سے نہیں ' واقعات کے فطری تسلسل سے اخلاقی مباحث بھی

اسی صورت میں مفید ہوسکتے ہیں جب وہ فطری طور پر افراد قصہ کی گفتگو میں خود بخود آ جائیں - ورنہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ناظرین (خصوصاً وہ ناظرات جن کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے) اس قسم کے مباحث کو چھوڑ چھوڑ کر صرف قصہ پڑھ لیتی ہیں —

لیکن اس خیال سے کہ یہ کتاب ایک خاتون نے لکھی ہے بہت کچھ قابل قدر ہے اور جس طبقے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے اُس میں بہت پسند کی جائے گی اور مسلم خواتین اور لڑکیاں جنھوں نے معمولی تعلیم پائی ہے اس کتاب کو بہت پسند کریں گی - مگر ضرورت یہ ہے کہ خواتین کا ادبی مذاق بھی اب کچھہ ترقی کرے اور خواتین کی تصانیف کا معیار بھی بلند ہو —

(ع - ا)

کارنامۂ اسلام

(تصنیف سید عنایت علی صاحب مسرور صفحات ۲۲۸ قیمت
دو روپے - قرول باغ - دہلی)

یہ سید عنایت علی صاحب المتخلص بہ مسرور (انبہٹوی) کا دلچسپ اور قابل قدر کارنامہ ہے - یعنی مسدس کی صورت میں رسول کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی پوری سیرت شریف (۲۸۳ صفحات میں) نظم کردی ہے - اس میں

ولادت باسعادت سے لے کر وفات تک کے تمام حالات کافی تفصیل سے موجود ھیں بلکہ بعض واقعات کی مختلف روایات تک قلم بند کی ھیں - پوری نظم شاعر کے حسن اعتقاد اور قدرت کلام کی شہادت ھے اور ھمیں امید ھے کہ مسلمانوں میں خاطر خواہ قبولیت حاصل کرے گی - خصوصاً لڑکے اور لڑکیوں کو سیرت مبارک پڑھانے میں اس سے بخوبی کام لیا جاسکے گا - نمونے کے لیے کتاب کے پہلے دو بند پیش کئے جاتے ھیں :-

جب ظلمت گناہ سے عالم سیاہ تھا ھر فرد اس جہان کا گم کردہ راہ تھا
ھادی تھا کوئی اور نہ کوئی دیں پناہ تھا مردم ھر ایک صورت مردم گیاہ تھا

باطل پرستیوں کا زمانے میں تھا چلن
برپا تھے چار سمت فسادات ما و من

جلتی تھی بات بات پہ تلوار ھر طرف خونریزیوں پہ لوگ تھے تیار ھر طرف
ناحق تھے نقد جاں کے خریدار ھر طرف دختر کُشی کا گرم تھا بازار ھر طرف

انساں تھے صورتاً پہ بہائم صفات تھے
بے رحمیوں سے قاطع تار حیات تھے

عجب نہیں کہ یہ نظم لکھنے کی تحریک پنجاب سے شاھنامۂ اسلام کی اشاعت یا شہرت سن کر ھوی ھو - بہر حال، یہ بہت خوشی کی بات ھے کہ لکھنؤ جیسے مقام میں رہ کر فاضل مصنف نے شاعری سے ایسا مفید کام لیا اور اتنی بڑی مربوط و مسلسل نظم تیار کردی —

فاضل مصنف سے دو روپے میں، مسجد بکر منڈی بشیرت گنج، لکھنؤ، کے پتے سے مل سکتی ھے —

(ش)

تحفۂ سامی

(مرتبہ مولوی اقبال حسین صاحب ایم - اے ' بی - ال -)

ایران کے خاندان صفوی کا شاہزادہ سام میرزا جو بحالت تہد اکستھہ برس کی عمر میں شاہ اسمٰعیل ثانی کی سنا کی کا شکار ہوا ' (سنہ ۹۸۴ ھ) نہایت علم دوست اور صاحب ذوق ادیب تھا - اس کا تذکرہ تحفۂ سامی اگرچہ نادرالوجود ہے لیکن علمی طبقے میں کافی شہرت و اعتبار رکھتا ہے اور اس میں نویں صدی کے اواخر سے دسویں صدی ہجری کے وسط تک کے مشاہیر کے حالات لکھے ہیں ' جن میں بعض نامور اشخاص خصوصاً شعرا سے مصنف خود ملا اور مستفید ہوا تھا - پوری کتاب سات ابواب یا "صحائف" میں ہے اور ان میں سے پانچویں صحیفہ کا موضوع "شاعران مقرر و فصحاے بلاغت گستر" قرار دیا ہے اور سب سے پہلے یہی تکڑا مولوی اقبال حسین صاحب ایم اے بی ایل کی تصحیح و تحشیہ سے ' زیر سرپرستی پٹنہ یونیورسٹی چھپ کر شائع ہوا ہے - لائق مدون یقین دلاتے ہیں کہ باقی صحائف بھی عنقریب طبع کرا دیے جائیں گے -

کتاب نہایت عمدہ کاغذ پر ٹائپ میں تقریباً ۲۰۰ صفحات پر چھاپی گئی ہے - تین سو سے زیادہ شعرا کا تذکرہ ہے - اس لیے جامی ' ہاتفی ' بنائی ' امیدی اور اہلی کے سوا بہت کم کوئی شاعر ہے جس کا ذکر ڈیڑھ دو صفحے یا زیادہ پر آیا ہو - حالانکہ حالات کے ساتھہ کلام کا نمونہ بھی شامل تذکرہ ہے - کتاب کی عبارت عموماً شگفتہ اور سلیس ہے اور جا بہ جا لطائف و محاضرات سے اس کی دلچسپی میں اضافہ ہوگیا ہے - یوں بھی خود

لکھنے والے کا ادیب و ہمعصر ہونا اس کی وقعت بڑھانے کے لیے کافی ہے -

فاضل مدون نے انگریزی مقدمے کے ساتھہ فارسی میں بھی مختصر سا مقدمہ تحریر فرمایا ہے لیکن ذیلی حواشی ہر جگہ انگریزی میں لکھے ہیں اور ان میں بھی کچھہ زیادہ تفصیل و تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھی - برایں ہم ان کا اہل ادب پر یہ احسان کچھہ کم نہیں ہے کہ ایک ایسے عمدہ اور کمیاب تذکرے کو صحت کے ساتھہ چھاپ کر شائع کردیا - کتاب پر ملنے کا پتہ یا قیمت درج نہیں ہے - غالباً رجسترار پتنہ یونیورسٹی سے طلب کی جاسکتی ہے —

(ش)

مختصر تاریخ عالم

(مولانا سید حکیم احمد نقوی صاحب - گوالیار صفحات ۱۶۰ قیمت ایک روپیہ)

قابل مولف نے اس کتاب میں مختصر طور پر خشکی پر حیات کے پیدا ہونے اور پہلے، انسان کے مماثل حیوانات اور اصل نوع انسان کے ظہور، اقوام انسانی، ترقی کے ابتدائے مراحل اور تاریخی زمانے کے آغاز کی کیفیت صاف زبان میں بیان کی ہے - یہ اس مختصر تاریخ عالم کی پہلی جلد ہے - جس قدر اس میں درج اُن کے ماخذ معتبر اور جدید ہیں - اردوداں کے طبقے اور خصوصاً طلبہ کے لیے مفید کتاب ہے —

تعلیمات قرآن

(مرتبۂ جناب اسلم جیراجپوری صاحب - قیمت دو روپے - قرول باغ- دہلی)

یہ قابل قدر کتاب مولانا اسلم جیراجپوری (معلم جامعہ ملیہ ' دہلی نے اس غرض سے تالیف کی ہے کہ اسلام کے ضروری اصول و عقائد کو صرف قرآن مجید کی آیتوں سے بیان کیا جائے - قرآن مجید ہی کو سمجھنے سمجھانے کے لئے ' احادیث کو جمع اور تفسیر وفقہ کو مرتب کیا گیا تھا ' لیکن تقلید جاہلانہ کی بدولت مسلمانوں میں ان علوم کا اتنا زور بڑھا کر اصل سر چشمۂ ہدایت و تعلیم یعنی قرآن سے لوگوں کا "رشتہ توٹ گیا" اور اس کو حافظ اسلم صاحب قوم کی بدبختی اور تنزل کا سب سے بڑا سبب سمجھتے ہیں -

کتاب کے چھہ حصے ہیں ' جن میں خالق ' مخلوق ' دین ' رسالت ' کتاب اور معاد کے متعلق ' ذیلی عنوانات دے کر ' آیات قرآن کو اردو ترجمے کے ساتھہ نقل کردیا ہے - صرف ذیلی حواشی یا کہیں کہیں متن میں کوئی فقرہ کسی مسئلے کی تشریح و تعبیر کے لئے تحریر ہے ورنہ فاضل مولف کی کوشش یہی ہے کہ فقط قرآن سے قرآن کی تعلیم پیش کی جائے - ہر عنوان کے تحت میں انہوں نے اس مضمون کی چیدہ چیدہ آیات نقل کردی ہیں لیکن غالباً یہ بہتر ہوتا کہ ذیلی عنوانات کو کم کر کے زیادہ ضروری مسائل کی تمام آیات کو یکجا لکھدیا جاتا کیونکہ جیسا کہ خود انہوں نے تحریر فرمایا اور مسلم ہے یہ مسائل مختلف سورتوں اور آیتوں میں پھیلے ہوے ہیں اور جو شخص صرف قرآن سے انہیں سمجھنا چاہتا ہے اس کے لئے لازم ہے کہ جملہ آیات متعلقہ کو اپنے سامنے رکھے-

فاضل مولف نے صاف طور پر لکھدیا ہے کہ " قرآن کے اندر میں نہ خود

اپنا کوئی خیال لے کر گھسا ہوں نہ کسی کے خیال کی پروا کی ہے بلکہ دیانت اور تقویٰ کے ساتھہ قرآن کو خود قرآن ہی سے اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے - جہاں جہاں مجھسے غلطیاں ہوی ہوں ' اگر طالبین قرآن ان سے مجھہ کو مطلع فرمائیں گے تو میں ممنون ہونگا - اور انشاءاللہ اپنے خیال اور کتاب دونوں کی اصلاح کروں گا " -

یہ بالکل صاف اور ناقابل اعتراض مسلک ہے لیکن ظاہر ہے کہ جس قوم نے رفتہ رفتہ ' کرامات اولیا ' کو ماننا جزو ایمان قرار دے لیا ہو ' اس میں عام عقائد سے ذرا بھی مختلف بات کہنا ' مقبول نہیں ہو سکتا - مولانا اسلم صاحب کو دو مسئلوں میں معتقدات متداولہ سے اختلاف ہے - ایک تو یہ کہ وہ پیغمبر اسلام (علیہ الصلواۃ والسلام) کو کوئی حسی معجزہ دیے جانے سے انکاری ہیں - دوسرے قیامت سے پہلے حیات بعدالموت کے قائل نہیں ہیں - موسیٰ وغیرہ دوسرے انبیا کے حسی معجزات کا ' جو قرآن میں مذکور ہیں ان کو اقرار ہے لیکن حضور سرور کائنات مفخر موجودات کی نسبت عقیدہ رکھتے ہیں کہ قرآن میں آپ کا سب سے بڑا معجزہ خود قرآن کو بتا یا گیا ہے - اس کے سوا آپ کا اور کوئی معجزہ بروے قرآن ثابت نہیں ہوتا - حافظ صاحب کے اِسی خیال پر بعض حضرات نے گرفت کی ہے اور حسب معمول اس علمی بحث میں بے جا شدت سے بھی کام لیا گیا ہے - ممکن ہے اسی تیزی میں کچھہ غلط فہمی بھی پیدا ہوگئی ہو - غیب دانی یا پیشگوئی کی ایسی مثالوں سے ' جیسے رومیوں کی فتح ایران پر ' فتح مکہ یا منافقین کے خفیہ مشوروں کا بذریعہ وحی الٰہی انکشاف ' ومثلہم ' فاضل مولف کو انکار نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ قرآن میں صراحتاً مذکور اور تاریخ سے ثابت ہیں ' اور بلا شبہہ ان کو خوارق یا معجزات ہی میں شمار کرنا پڑے گا اگرچہ

مولانا اسلم نے اس کا کوئی ذکر نہیں فرمایا ہے - مسئلۂ ثانی میں بھی کافی بحث و گفتگو کی گنجائش ہے اور فاضل مولف نے جو کچھہ تحریر کیا ہے اس میں بظاہر بعض پہلو تشنہ رہ گئے ہیں لیکن مجموعی طور پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اگر ان کی طرح اس مسئلے کو کوئی صرف خود قرآن حکیم سے سمجھنا چاہے تو غالباً انہی کا ہم خیال ہوجائے گا- باقی یہ دوسری بحث ہے کہ خود رسول اللہ صلعم کے جو اقوال اور تصریحات صحت و تواتر کے ساتھہ ہم تک پہنچے ہیں ' ان سے قرآن کے سمجھنے میں کوئی واسطہ نہ رکھنا کس حد تک مفید یا جائز ہوگا —

بہرحال' کتاب نہایت محنت اور قابلیت سے لکھی گئی ہے اور غور و خوض سے پڑھنے کے لائق ہے - برقی پریس دھلی میں بہت صاف ستھری چھپی ہے —

(ش)

سبیل السلام

(مولنٰا مولوی عبدالحی صاحب صفحات ۸۶ -
قیمت بارہ آنے - مکتبہ جامعۂ ملیہ - دھلی)

مولوی عبدالحی صاحب معلم دینیات جامعۂ ملیہ دھلی ایک خاص رنگ میں قرآن شریف کی تفسیر لکھہ رہے ہیں' اور بہت خوب لکھہ رہے ہیں- لیکن یہ مسلسل نہیں ہے بلکہ مختلف حصے الگ الگ شائع ہورہے ہیں - ان میں تفسیر سورہ بقرہ (الخلافت الکبریٰ) اور آل عمران (بیان) ملک میں کافی شہرت پاچکی ہیں - مندرجۂ عنوان حصہ پارۂ قدسمع اللہ کی نو سورتوں کی تفسیر ہے - فاضل مفسر ذی علم و پرجوش مسلمان ہیں اور عہد حاضر

کے سیاسی اور تمدنی مسائل کو خاص طور پر پیش نظر رکھ کر یہ تفسیر لکھ رہے ہیں - امید ہے کہ مسلمان ان کی مساعی حسنہ کی خاطر خواہ قدر اور اس کتاب سے پورا استفادہ کریں گے —

(ش)

طب و حفظان صحت

جوانی کا تحفظ اور بڑھاپے کی روک تھام

از لفٹننٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق - قلعۂ گولکنڈہ

حیدرآباد دکن - صفحات ۳۵۲ - قیمت دو روپے

جوانی دیوانی سہی، مگر کون ہے جو سدا جواں رہنا نہیں چاہتا؟ اور کون ہے جو جوانی جانے کے بعد اپنے بڑھاپے کو آن کے ساتھ قائم نہیں رکھنا چاہتا؟ جوانی ہو یا بڑھاپا، انسان کی مسرت اور کامیابی کا راز صحت میں ہے - اور اس کتاب میں اسی راز کو آشکارا کیا ہے —

ڈاکٹر اشرف الحق صاحب نے اعادۂ شباب، درازیٔ عمر اور مضامین متعلقہ پر متعدد رسالے لکھے ہیں لیکن یہ کتاب بہت جامع ہے - صحت سے متعلق جتنے ابواب اور شعبے ہیں ان سب پر بڑی صفائی اور تفصیل سے بحث کی ہے اور جسم و دماغ کی صحت قائم رکھنے کے لیے ذاتی نیز نامور طبیبوں اور ڈاکٹروں کے تجربوں کی بنا پر نہایت مفید اور کارگر تدبیریں بتائی ہیں - ہر شخص جو دنیا میں خوشحالی کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے اُسے اس کتاب کا مطالعہ کرنا لازم ہے - اس کتاب نے بیسیوں کتابوں کے

مطالعہ اور ڈاکٹروں کے مشوروں سے مستغنی کر دیا ہے - ڈاکٹر اشرف الحق کی یہ تالیف ہر لحاظ سے ہمارے شکریے اور تعریف کی مستحق ہے —

ڈاکٹر صاحب نے کتاب کے آخر میں انگریزی اردو اصطلاحات کی ایک فرہنگ بھی درج کردی ہے جو بہت کار آمد چیز ہے —

جنسی امراض اور ان کا علاج

مصنفہ کرنل بھولانانھہ - قیمت تین روپے - ملنے کا پتہ
کتب خانہ لطف زندگی اعوان منزل موچی دروازہ لاہور

اُردو زبان میں صنفی موضوعات پر ایسی کتابوں کی بہت ضرورت ہے جن سے صحیح علمی معلومات ہو سکیں - صنفیات پر کچھہ کتابیں جو اب تک شایع ہوی ہیں، ضرورت سے زیادہ "شاعری" سے مملو ہیں - زیر نظر کتاب کی اہمیت اس وجہ سے اور زیادہ ہو جاتی ہے کہ اس کی حیثیت بالکل فنی ہے - کتاب کو متبول بنانے کے لیے شاعری نہیں کی گئی ہے - علمی زبان میں اختصار کے ساتھہ لیکن جامع طور پر صرف موضوع سے بحث کی گئی ہے —

کرنل بھولا ناتھہ نے یہ کتاب لکھہ کر اُردو زبان کے اس ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا ہے - اس فن پر دوسری زبانوں میں صدھا کتابیں لکھی گئی ہیں - مگر اُردو زبان میں اس قسم کی خالص فنی کتابوں کا تقریباً فقدان تھا - یہ کتاب جو خالص طبی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے —

کتاب کا پہلا حصہ ضروری صنفی معلومات سے متعلق ہے ' اور وضاحت کے ساتھہ قابل مصنف نے اس موضوع کے تمام ضروری پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے - نقطۂ نظر اس حصۂ کتاب میں بھی طبی ہے - مگر عام لوگ بھی اس سے پوری طرح مستفید ہو سکتے ہیں —

دوسرے حصے میں جنسی امراض اور صنفی کمزوریوں کے ویدک، طبی اور ڈاکٹری علاج ہیں - تیسرا حصہ برتھہ کنٹرول سے متعلق ہے - ضروری نقشے اور ضرورت کے اعتبار سے تشریحاً قلمی تصویریں بھی موجود ہیں —

(ع - ا)

متفرقات

پیام سالک

(مولنا جناب پنڈت دینا ناتھہ مدن معجز صاحب دهلوی، بی - اے
لال حویلی، محلہ چوڑی گراں، دهلی - قیمت ایک روپیہ)

جناب معجز دهلوی اس سے قبل شریمد بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ "مخزن اسرار" کے نام سے کر چکے ہیں - "پیام سالک" مُنی اشٹاوکر کی گیتا کا منظوم ترجمہ ہے - اصل کتاب بھی نظم میں ہے اور ترجمہ بھی اردو نظم میں کیا گیا ہے - اس میں بیس باب ہیں - ہر باب میں اشعار کی تعداد مختلف ہے - کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ سو - یہ در اصل اشٹاوکر مُنی کی وہ تعلیم ہے جو انہوں نے طالب ہدایت راجہ جنک (سیتا جی کے والد) کو وحدت و معرفت کے بارے میں دی ہے —

یہ اسرار معرفت اور وحدت الوجود کا صحیفہ ہے - فاضل مولف نے

اِسے نظم میں بڑی خوبی سے ترجمہ کیا ہے - پہلے اصل سنسکرت شعر لکھا ہے اس کے نیچے اردو ترجمہ منظوم اور اس کے بعد شرح - معجز صاحب اردو کے قابل ادیب اور شاعر ہیں - اور چونکہ وہ ویدانت اور تصوف دونوں سے باخبر ہیں اس لیے ان کے ترجمے میں لفظی اور معنوی دونوں خوبیاں موجود ہیں - ایسی بلیغ کتابوں کے ترجمے کے لیے محض ادیب اور شاعر ہونا کافی نہیں - اس کے لیے اسرار معرفت سے بھی واقف ہونا ضروری ہے - اور یہی وجہ ہے کہ معجز صاحب کا ترجمہ اصل کے قریب پہنچ گیا ہے - تصوف کی اصطلاحات اور تصوف کی زبان کو جس خوبی کے ساتھ انہوں نے برتا ہے وہ بہت قابل تعریف ہے - آخر میں اُن تمام مسائل کی فہرست درج کردی ہے جو اس کتاب میں معرض بحث میں آئے ہیں اور جن جن اشعار میں یہ بحث آئی ہے ان کا نمبر بھی دیدیا ہے —

جو حضرت مسائل معرفت سے شوق رکھتے ہیں وہ اس کتاب k ضرور مطالعہ فرمائیں —

موتی

(مرتبۂ جناب سید یوسف صاحب بخاری دہلوی - گلی امام جامع مسجد دہلی - صفحات ۱۴۲ ' قیمت بارہ آنے)

یہ حکیمانہ اور شاعرانہ اقوال کا مجموعہ ہے جو قابل مولف نے بڑی جستجو اور کاوش سے عربی ' فارسی ' انگریزی ' اردو اور ہندی کے ادبی ذخیروں سے چن چن کر نکالے ہیں اور مختلف عنوان کے تحت جمع کیے ہیں - کل عنوانات ۱۱۸ ہیں اور ان میں سب کچھ آگیا ہے -

اکثر اقوال ترجمہ ہیں اور ترجمے میں زبان اور موزونیت کا حتی الامکان خیال رکھا گیا ہے - جو نہایت ضروری ہے ورنہ ان کا مقبول ہونا ممکن نہیں - شروع میں ایک مقدمہ ہے جس میں اقوال کے فلسفہ و ماہیت پر بحث کی گئی ہے - کتاب کی ابتدا میں جناب اختر انصاری کا تعارف اور جناب راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کے تبصرے ہیں ۔۔

خیالات مہاتما گاندھی

(حصۂ اول و حصۂ دوم ' صفحات ۲۴۸ و ۵۱۲ ' قیمت فی جلد سوا روپیہ - ملنے کا پتا ' رفعت یار خاں صاحب ' چال نمبر ۴۲ ' ورلی ' بمبئی (۱۸))

یہ مسٹر سی - ایف اینڈریوز کی انگریزی کتاب کا اردو ترجمہ ہے - مسٹر اینڈریوز سے بڑھ کر کوئی شخص مہاتما گاندھی کے خیالات کا ترجمان نہیں ہوسکتا - انہوں نے گاندھی جی کی تحریروں اور تقریروں کے ایک بہت بڑے انبار کو چھان چھٹک کر مختلف عنوانات کے تحت میں اُن کے خیالات ' جذبات و معتقدات اور ان کے کارناموں کو ایسی خوبی اور صفائی سے بیان کیا کہ گاندھی جی کی زندگی اور اُن کے مقصد کے سمجھنے کے لیے ان کا مطالعہ لازم ہے - مسٹر اینڈریوز کی گاندھی جی سے عقیدت ' اُن تمام معاملات اور کار ناموں سے ذاتی واقفیت جن کا تعلق گاندھی جی کی زندگی سے ہے ' ہندوستان کے حالات پر کامل عبور — یہ سب باتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے اس کتاب کی خوبی اور وقعت دو بالا ہوگئی ہے - اور حقیقت یہ ہے کہ مسٹر اینڈریوز سے بہتر کوئی دوسرا شخص اس کام

کو انجام نہیں دے سکتا تھا - ترجمہ بھی (جس کسی نے کیا ہے) بہت اچھا کیا ہے —

پیراک

(مولفۂ جناب سید اکبر علی صاحب ایم - اے ' ایل ٹی - پاٹانالہ ' لکھنؤ - قیمت چار آنے)

یہ رسالہ فن شناوری پر ہے - کسی زمانے میں یہ فن شریف تھا اور شرفا تیر اندازی ' شہسواری کی طرح اسے بھی سیکھتے تھے - سید اکبر علی صاحب نے درحقیقت بڑا احسان کیا ہے کہ انہوں نے اس مختصر رسالے میں پیراکی کی وہ گر جو اساتذۂ فن کسی غیر کو نہیں بتاتے تھے ' تشریح اور تصویروں کے ساتھ الم نشرح کر دیے ہیں - اس رسالے کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوا کہ پیراکی اور تیراکی میں فرق ہے - پیرنے میں ہاتھ اور پیر استعمال کرنے پڑتے ہیں لیکن تیرنے میں نہیں - غرض سید صاحب نے اس رسالے میں ہر قسم کی پیرائیاں اور تیرائیاں ' ان کی اصطلاحات اور ان کا عمل بہ تفصیل بیان کردیا ہے - اس فن کے سیکھنے کے لیے یہ رسالہ بہت کچھ رہنمائی کر سکتا ہے —

سمندر کا عجائب خانہ

(مولفۂ جناب سید محمد عسکری جعفری صاحب)

اس میں سمندر کی عجیب و غریب مخلوق کا حال نو ابواب میں

بیان کیا گیا ہے - یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے - سطح زمین پر کی چیزیں تو آسانی سے نظر آجاتی ہیں لیکن سمندر کی تہ میں جو آبادی ہے وہ نظر سے اوجھل ہے - کتاب میں کہیں کہیں تصویریں بھی ہیں - کتاب دلچسپ ہے اور خاص کر لڑکے لڑکیوں کے لیے بہت موزوں ہے —

نفسیات مذہب

از مولوی سید وہاج الدین صاحب بی - اے ' بی ٹی - چھوٹی تقطیع
صفحات ۷۸ ' لکھائی چھپائی اچھی - قیمت آٹھ آنے -
شایع کردہ جامعۂ ملیہ دہلی -

مولوی سید وہاج الدین صاحب عثمانیہ کالج اورنگ آباد میں معاشیات کے استاد ہیں لیکن اپنے مفوضہ مضمون کے سوا ان کو نفسیات سے خاص شغف ہے - اس سے قبل اس مضمون پر ان کی مشہور کتاب نفسیات ترغیب اور چند مقالے شایع ہو چکے ہیں - مقالہ زیر تنقید بھی اسی موضوع پر ہے - یہ مقالہ اردو اکادمی جامعہ ملیہ کے ایک جلسہ میں فاضل مصنف نے پڑھا تھا —

مقالہ کے نام سے ظاہر ہے کہ اس کا موضوع کس قدر اہم اور نازک ہے - اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ انسانی فطرت میں حاسۂ مذہبی کن کن شکلوں میں نمودار ہوتا ہے اور اس جذبے کا دوسرے جذبات سے کیا تعلق ہے - تاثرات ' جذبات اور وجدانات کا تعلق چونکہ انسانی نفس سے ہے جہاں یہ سب پرورش پاتے ہیں اس لئے مذہبی جذبے کو نفسیات کی روشنی میں دیکھنے سے اس کی اصل حقیقت معلوم ہو سکتی ہے - اس مقالے

میں مذہبی جذبے کو اسی روشنی میں دکھایا گیا ہے - ماحصل بحث کا یہ ہے کہ انسانی فطرت میں احساس مذہب اس قوت اور مضبوطی کے ساتھ بسا ہوا ہے کہ وہ باوجود کوشش کے بھی فنا نہیں ہو سکتا - اسی لئے انسان کو اس کے تقاضے سے مفر نہیں - وہ ضرور ظاہر ہوتا ہے لیکن اپنے اظہار کی وہ جو شکل اختیار کرتا ہے اس کا انحصار طبیعی اور معاشرتی ماحول اور حالات پر ہے -

ان دقیق مسایل کو فاضل مقالہ نگار نے نہایت شگفتہ اور پاکیزہ زبان اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے - ان کے اسلوب بیان میں ایک دلکشی اور رعنائی ہے -

(چ)

راگ سکھشا

مصنفۂ خادم محی الدین صاحب - شایع کردۂ قومی کتب خانہ لاہور - قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھہ آنے طباعت و کتابت بہت اچھی اور دیدہ زیب - حجم تقریباً (۱۲۰) صفحات -

یہ کتاب قابل مصنف نے موسیقی کے ابتدائی طالب علموں کے لئے لکھی ہے - مصنف نے اِس کو پچاس اسباق میں تقسیم کیا ہے - ترتیب سے سلیقے کا اظہار ہوتا ہے - اسباق میں غیر ضروری تفصیل سے کام نہیں لیا ہے - لیکن جو کچھہ سمجھایا ہے، واضح کر کے تشریحوں کے ساتھہ سمجھایا ہے - جا بجا تصویروں اور اشکال سے تشریح کی گئی ہے - یہ کتاب صرف موسیقی کے طالب علموں ہی کے لئے نہیں بلکہ عوام کے لیے بھی جو موسیقی سے ذوق رکھتے ہیں بہت مفید ثابت ہوگی —

(ع - ا)

اُردو کے جدید رسالے

معلومات

(ماهانه ، اڈیٹر جناب عبدالوالی صاحب بی - اے ،

لکھنو - سالانہ چندہ پانچ روپے)

ہمیں جس قدر " معلومات " کے بند ہونے پر افسوس ہوا تھا اس سے زیادہ اس کے دوبارہ اجرا پر خوشی ہوئی - اٹھارہ برس کی مدت کچھ کم نہیں ہوتی ، اس عرصے میں دنیا کچھ کی کچھ ہوگئی ہے - سیاسیات ، معاشیات ، طرز خیال ، علم و فن میں انقلاب عظیم پیدا ہوگیا ہے - ایسے انقلابی زمانے میں جب کہ ہمارے اخبار اور رسائل اپنی پرانی ڈفلی پر وہی پرانا راگ الاپ رہے ہیں معلومات جیسے رسالے کی شدید ضرورت تھی- وہ ملک میں حرکت اور دلوں میں سچا جوش پیدا کرنا چاہتا ہے - وہ رسم و رواج ، بے معنی تقلید ، فرسودہ خیالات اور از کار رفتہ نظریوں کے جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کر کے نئی راہ عمل ، روشن خیالات اور زندہ تحریکات پیش کرنے کا خواہاں ہے - وہ پرانے کھنڈروں کو مسمار کر کے جدید خوشنما عمارتیں تعمیر کرنا چاہتا ہے- وہ مردہ اور مردہ دلوں کا دشمن اور زندوں اور زندہ دلوں کا ساتھی ہے - معلومات اسم بامسمیٰ رسالہ ہے - اس کا فاضل اڈیٹر اپنے ملک کے حالات اور دنیا کی تحریکات سے باخبر ہے اور اپنے اہل وطن کو ان سے باخبر کرنے اور رکھنے کا آرزو مند ہے -

وہ ناصح بے عمل نہیں ' اس نے اس اتھارہ برس کی مدت میں بہت کچھ کھکھیز اتھای ہے ' آنکھیں بند کرکے غول کے ساتھہ نہیں رہا بلکہ جو کچھہ گزرا اُسے اس نے آنکھیں کھول کے دیکھا ' غور کرکے سمجھا اور بہت کچھہ حاصل کیا - اس مشاھدے اور تجربے اور مطالعہ کے نتائج وہ ھمارے سامنے پیش کر رھا ہے - کون ہے جو ان کے قبول کرنے سے ابا کرے گا ؟ وہ اپنے خیال کے اظہار میں نہایت جری اور بے باک ہے -اس کے بیان میں جوش ' قوت اور سادگی ہے - اُس کے خیالات میں تازگی اور زندگی ہے - اس کے دل میں آگ ہے جو دوسروں کو گرمائے بغیر نہیں رہ سکتی - اس کی رایوں سے اختلاف ھو مگر اس کی صداقت اور خلوص میں شک نہیں ھو سکتا —

یہ بہت قابل قدر رسالہ ہے اور اردو زبان میں اپنی نوعیت کا ایک ھی ہے - ھماری خواھش ہے کہ یہ رسالہ ھر اردو پڑھے لکھے شخص کے ھاتھہ میں ھو - اس وقت کی ضرورت اسی کی مقتضی ہے - ھمیں امید ہے کہ ھماری یہ استدعا رائگاں نہیں جائے گی —

الناظر

(اڈیٹر مولوی ظفرالملک علوی صاحب - لکھنؤ - سالانہ چندہ دو روپے آتھہ آنے - ارزاں اڈیشن ایک روپیہ سالانہ)

رسالۂ الناظر کسی تعارف کا محتاج نہیں - چار سال بند رھا ' اب پھر اس کے سرگرم اور مستعد اڈیٹر نے دوبارہ جاری کیا ہے - اُسے دیکھہ کر یہ مطلق خیال نہیں ھوتا کہ کبھی بند بھی ھوا تھا - وھی صورت وھی تقطیع وھی لکھای اور چھپای ہے اور بالکل ویسے مضامین ھیں جیسے پہلے

چھپتے تھے - الناظر کے دوبارہ اجرا پر اس کے پرانے خریدار اور اس کے قدردان ضرور خوش ہوں گے اور اس کی ترقی اشاعت نیز اُسے کار آمد اور بہتر بنانے میں پوری پوری مدد دیں گے - الناظر اپنے پہلے دور میں زبان اور ادب کی قابل قدر خدمت کر چکا ہے اور توقع ہے کہ اب وہ زیادہ قوت اور استقلال کے ساتھہ اس خدمت کو انجام دے گا جو چار سال کی خاموشی کی سب سے بہتر تلافی ہوگی -

ماہ تمام

(اڈیٹر محمد اسحاق صاحب - کلای سہل اسٹریٹ کلکتہ
سالانہ قیمت چار روپے)

یہ ماہانہ رسالہ کلکتہ سے اسی سال شایع ہونا شروع ہوا ہے - مضامین اور نظمیں دلچسپ ہیں - مختصر فسانے بھی ہوتے ہیں - ایک آدہ تاریخی اور علمی مضمون بھی ہوتا ہے - کلکتہ سے ایسے رسالے کا جاری ہونا بہت غنیمت اور قابل قدر ہے - لکھای ' چھپای کاغذ بہت اچھا ہے - جو رسالہ ہمارے پیش نظر ہے اس میں ایک رنگین تصویر بھی ہے - غالباً اس کا التزام کیا گیا ہے —

ایوان

(مدیر مجنوں گورکھپوری - ایوان اشاعت - گورکھپور - سالانہ چندہ چار روپے)

اس کا شمار اچھے رسالوں میں تھا لیکن کچھہ تو ناقدردانی کی وجہ سے اور کچھہ اڈیٹر کی صحت کی خرابی کے باعث اسے بند کرنا

پڑا - اب دو سال کے بعد قابل اڈیٹر نے ہمت کرکے پھر جاری کیا ہے اور اُسی آب و تاب سے شایع ہوا ہے - امید ہے کہ اس کے خریدار اور قدردان اس ناگوار تجربہ کے بعد اُسے بند نہ ہونے دیں گے —

کونین

(اڈیٹر عزیزالرحمن اصلاحی و محمد یحیی اعظمی - گورکھپور
سالانہ چندہ ڈیڑہ روپیہ)

یہ رسالہ بھی گورکھہ پور سے شایع ہوا ہے - مذہبی ادبی تعلیمی اور معاشیاتی مضامین ہوتے ہیں - تقطیع بڑی ہے اور ہر صفحے میں دو کالم ہیں - معاملات حاضرہ پر بھی بحث ہوتی ہے - اس قیمت میں بہت اچھا رسالہ ہے اور اشاعت و امداد کا مستحق —

قائد

(مالک و مدیر سید حبیب احمد صاحب افق کاظمی - خانقاہ
ضیئیہ امروہہ - سالانہ چندہ عام خریداروں سے ایک روپیہ)

خوشی کی بات ہے کہ امروہہ سے بھی ایک رسالے کا اجرا ہوا ہے - یہ زیادہ تر مذہبی اور اخلاقی ہے - ایک روپیہ سال میں ہر مہینے ۳۲ صفحے کا رسالہ برا سودا نہیں - مذہبی و اخلاقی نیز اصلاحی مضامین کے شوقین ضرور اس کی قدر کریں گے —

البرق

(مدیر، محمد علی - پنجاب انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ
جالندھر شہر سالانہ چندہ تین روپے)

رسالے کا مقصد نام سے ظاہر ہے - یہ ایک انجینیرنگ انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے شایع ہوتا ہے جہاں بجلی کے کام کی تعلیم دی جاتی ہے - رسالے میں زیادہ تر مضامین زراعت اور حرفت و صنعت پر ہوتے ہیں - ایسے رسالوں کی ملک کو زیادہ ضرورت ہے - رسالہ سلیقے سے مرتب کیا جاتا ہے - دلچسپی کے لیے ایک آدھ ایسا مضمون بھی نظر آیا جو غیر متعلق ہونے کے علاوہ بے کیف بھی ہے - سائنس اور صنعت و حرفت کا میدان خود اس قدر وسیع ہے کہ اس میں طرح طرح کی دلچسپیاں پیدا ہو سکتی ہیں، بشرطیکہ لکھنے والا اپنے مضمون پر قادر ہو اور لکھنا بھی جانتا ہو -

شہاب

(اڈیٹر ارشد عظیم آبادی - مچھوا بازار اسٹریٹ - کلکتہ -
سالانہ چندہ ایک روپیہ چار آنے)

اس نام کا ایک رسالہ کئی مہینے ہوے جوناگڑہ سے شایع ہو رہا ہے، دوسرا حیدرآباد دکن سے نکلتا ہے اب یہ تیسرا کلکتہ سے نکلا ہے - ایک ہی زبان میں ایک نام کے تین رسالے! یہ کچھہ اچھا معلوم نہیں ہوتا - شاعروں کو شکایت تھی کہ ڈھونڈے سے بھی تخلص نہیں ملتا لیکن اب معلوم ہوا کہ اڈیٹروں کو رسالے کا نام تلاش کرنے میں بھی مشکل آپڑی

ھے - کلکتہ سے حال میں ایک رسالہ "ماہ تمام" کے نام سے شایع ہوا ھے اور اس کے بعد ھی شہاب کا ظہور ہوا ھے - رسالہ دلچسپ ھے - شروع ھی میں شایق احمد صاحب عثمانی نے ایک مضمون "اردو پر رحم کرو" لکھا ھے - اس میں اردو ٹائپ پر بھی بحث کی ھے اور سچی بات لکھی ھے کہ نستعلیق ٹائپ کا خیال چھوڑ دو، نسخ کافی ھے، اس کو اختیار کرلو - کلکتہ سے اردو رسالوں کا جاری ہونا نیک فال ھے —

میزان الافکار

(مدیر فایق کرتھوری صاحب - رام سوامی کوارٹرز کراچی سالانہ چندہ بارہ آنے)

یہ چھوٹی سی تقطیع کا رسالہ کراچی سے شایع ہوا ھے - اس کے نگرانِ اصول افسر صدیقی امر وھی ھیں - چند غزلیں ھیں اور چند چھوٹے چھوٹے مضامین - افسوس ھے کہ سندہ کو جہاں مسلمانوں کی کثیر آبادی ھے ایک معقول رسالے کی بھی توفیق نہ ہوی —

الموسی

(مدیر، مرزا سرفراز علی متعلم سال دوم ؛ انٹر میڈیٹ سٹی کالج، حیدرآباد دکن - سالانہ چندہ عام خریداروں سے چار روپے، طلبائے حال سے دو روپیہ اور طلبۂ قدیم سے تین روپے)

سب سے پہلے اورنگ آباد کالج سے ایک رسالہ نورس نکلا جو کئی

سال سے برابر جاری ہے اس کے بعد کلیۂ جامعۂ عثمانیہ نے اس کی تقلید میں مجلہ عثمانیہ جاری کیا جب ورنگل میں انٹرمیڈیٹ کالج قائم ہوا تو اس نے بھی اورنگ آباد کی تقلید کی - سب سے آخر انٹرمیڈیٹ سٹی کالج نے یہ سہ ماہی رسالہ جاری کیا ہے - اس کا نام موسی ندی کے نام پر رکھا گیا ہے جس کے قریب اس کالج کی عمارت واقع ہے - شروع میں سخنہائے گفتنی ہیں جنہیں بلاوجہ بہت طول دیا ہے - کچھ غزلیں اور نظمیں ہیں - ایک مزاحیہ مضمون ہے جو بہت گرا ہوا ہے - تالستائی کے ایک ڈرامے کا اردو ترجمہ ایک طالب علم نے کیا ہے اور اچھا کیا ہے - مجموعی حیثیت سے رسالہ بہت اچھا ہے اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ زیادہ تر مضمون نگار طلبہ ہیں - سرورق میں جدت کی گئی ہے اور سادگی میں حسن پیدا کیا گیا ہے ' جس سے ذوق صحیح کا پتا لگتا ہے - چھپا بھی اچھا ہے -

گہوارۂ ادب

(مدیر ابرار احمد ' انور شاہ خاں - الگزنڈرا ھای اسکول ' بھوپال - عام قیمت سالانہ ایک روپیہ چار آنے)

یہ رسالہ بھوپال کے ھائی اسکول کی طرف سے سال میں تین بار شائع ہوتا ہے - مضامین بہت مناسب اور معقول ہیں اور خاص کر طلبہ کے لیے موزوں - نظمیں اور فسانے بھی ہیں - آخر میں مدرسہ کی خبریں وغیرہ ہیں - خوشی کی بات ہے کہ بھوپال کے ایک ھای اسکول نے ایک ایسا اچھا رسالہ نکالا ہے - رسالہ باقاعدہ دو سال سے جاری ہے - لکھنے

والے زیادہ تر طلبہ اور مدرس ہیں - قیمت بھی بہت کم ہے حالانکہ ضخامت ۶۴ صفحے سے زائد ہوتی ہے - رسالہ مصور ہے —

زنانے رسالے

زیب النسا

اڈیٹر صغرا ہمایوں مرزا (حیدرآباد دکن) لاہور سے
شایع ہوتا ہے - سالانہ چندہ تین روپے ۔

یہ رسالہ بیگم شاہنواز کی سرپرستی اور صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ حیدرآباد کی مشہور انشاپرداز کی اڈیٹری میں لاہور سے شائع ہوتا ہے - پہلا ورق تصویروں کا ہے - مضمون ہر قسم کے ہیں لیکن زیادہ تر عورتوں سے متعلق ہیں - پہلا مضمون بیگم شاہنواز صاحبہ کا " قرطاس ابیض اور خواتین ہند " پر ہے - باقی مضامین ہلکے پھلکے ہیں - چند نظمیں بھی ہیں جو بری نہیں - آخری حصے میں کشیدہ کاری کے چند نمونے ہیں اور سب سے مرغوب ورق وہ ہے جس میں اچھے اچھے کھانے پکانے کی ترکیبیں ہیں - سب سے آخری صفحے میں دنیا کی مختلف خبریں ہیں —

مستورات

(مدیرہ حبیب بلقیس بیگم - سول لائن کانپور - سالانہ
چندہ عام خریداروں سے تین روپیہ ' غیر مستطیع طلبہ و
طالبات سے ڈیرہ روپیہ)

یہ پندرہ روزہ رسالہ نواب فخر یار جنگ بہادر معتمد فنانس

حیدرآباد دکن کی سرپرستی میں شایع ہوتا ہے - یہ سرپرستی ایسی ہی بے جوڑ ہے جیسے حیدرآباد کی ایک خاتون کا لاہور کے ایک رسالہ کا اڈیٹر ہونا - لیکن اس رسالے کی یہ خصوصیت قابل قدر ہے کہ مضامین کارآمد ، دلچسپ اور رسالے کے مقصد کے موزوں ہیں اور بہت صاف ستھری زبان میں لکھے ہوتے ہیں - آخری صفحے پر کشیدہ کاری کے لیے بھی کوی نہ کوی نمونہ ہوتا ہے - ایک نمبر میں گھریلو دوائیں اور بچوں کے علاج کے ضروری نسخے بھی دئے ہیں - جو بہت ضروری اور مفید ہیں - کبھی کبھی کسی کھانے یا میٹھے کے پکانے کی ترکیب بھی درج ہوتی ہے —

رهبر نسوان

(اڈیٹر فاروقی بیگم - دهلی - سالانہ چندہ تین روپے)

یہ ماہانہ رسالہ بیگم آصف علی (بیرسٹر دهلی) کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے - پڑھی لکھی عورتوں کے لیے سب سے بہتر پرچہ ہے - مضمون بہت معقول اور مناسب اور پڑھنے کے قابل ہوتے ہیں - پہلا رسالہ جو ہمارے سامنے ہے اس میں ہر مضمون کسی نہ کسی قابل شخص کا لکھا ہوا ہے اور تمام مضامین ضروری اور مفید مباحث پر ہیں - پہلے دو صفحے تصویروں کے لیے وقف ہیں اور یہ سب مشہور عورتوں کی ہیں - رسالے کے اندر بھی بعض عورتوں کے فوٹو ہیں - خوان نعمت کا حصہ بہت ہی خوب ہے - نسوانی دنیا کی خبریں بھی ہیں اور آخری دو صفحوں پر کشیدہ کاری کے لیے نمونے دیے ہیں - عورتوں کے لیے یہ رسالہ بہت دلچسپ ، مفید اور قابل مطالعہ ہے —

اُردو

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

ایڈیٹر

عبدالحق بی۔اے (علیگ)

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد (دکن)

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ، اپریل ، جولائی اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم دیڑھ سو صفحے ہوتا ہے —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکۂ انگریزی (مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ)

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی اے ، آنریری سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے —

:o:

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اردو پریس ، اردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

اردو

جلد ۱۴	اپریل سنہ ۱۹۳۴ ع	حصہ ۵۴

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد دکن

اردو

اپریل سنہ ۱۹۳۴ ع

فہرست مضامین

خطبات گارساں دتاسی

اٹھارھواں خطبہ

مترجمہ

(جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب، ڈی۔ لٹ

[ریڈر] پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن)

حضرات!

میں ہر سال اپنے خطبۂ افتتاحیہ میں آپ صاحبوں کے سامنے اُس ذہنی تحریک کا ذکر کیا کرتا ہوں جو ہندوستان میں اپنا اثر دکھا رہی ہے۔ خاص کر میں نے اپنے موضوع کو ہندوستانی زبان تک محدود کرلیا ہے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی تہذیب کے عناصر شامل ہیں۔ میں اپنے اُستاد جان شیکسپیئر کی طرح لفظ 'ہندوستانی' کو ہندی اور اُردو دونوں کی مجموعی حیثیت کے لئے استعمال کرتا ہوں۔ میرے ان خطبات میں غالباً ہر اس شخص کو دلچسپی ہوگی جو ذہن انسانی کی ترقی کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہو رہی ہے کہ اہل ہند نے پچھلے سال میں ترقی کی راہ میں ایک قدم اور

آگے کی جانب بڑھایا ہے اور مجھے توقع ہے کہ دوسروں کو بھی یہ سن کر خوشی ہوگی —

برہم سبھا * کی اہمیت برابر ہر سال بڑھتی جا رہی ہے اور اس کا حلقۂ عمل وسیع ہوتا جا رہا ہے - ہندو لوگوں کی یہ ایک اصلاحی انجمن ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ قدیم ہندی معتقدات کو پھر سے زندہ کیا جائے - صرف کلکتہ میں اس وقت تقریباً دو ہزار خاندان اس سبھا میں شامل ہو چکے ہیں- اس کے علاوہ ہزارہا ہندو ایسے ہیں جنہوں نے اس سبھا کے پیغام کو کان دھر کے سنا ہے اور بت پرستی سے احتراز کرنے لگے ہیں- ان میں سے اکثر نے اصولی طور پر ذات پات کے امتیاز کو بھی ترک کرنے کا عہد کرلیا ہے لیکن عملی طور پر ابھی انہوں نے قدم آگے نہیں بڑھایا + —

اس انجمن کو اگر فروغ حاصل ہوا تو ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا - اس تحریک کی بدولت یہ ممکن ہوگا کہ مغربی تہذیب اور قدیم ہندی روایات میں ایک قسم کا امتزاج پیدا ہو - اس سے ہندو معاشرت کی اصلاح ہوگی - اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ کام مسیحیت کی بجائے اس کی روشنی کے عکس سے پایۂ تکمیل کو پہنچے - ممکن ہے برہم سبھا کے برہمن ارکان کو اس میں شبہ ہو کہ انہوں نے مسیحیت کی تعلیم سے فیض حاصل کیا ہے لیکن بہر حال حقیقت

---

* اس انجمن کو برہمو سماج بھی کہتے ہیں - اس کے متعلق ڈیلی ٹیلیگراف مورخہ ۲ مئی سنہ ۱۸۶۸ ع میں ایک نہایت دلچسپ مضمون شایع ہوا ہے-

+ انڈین میل مورخہ ۱۳ اپریل سنہ ۱۸۶۸ ع —

حقیقت هی رهتی هے *—

اس انجمن کا جشن سالگرہ ۲۴ جنوری کو منایا گیا۔ راجہ رام موهن راے نے اس انجمن کو ۳۸ سال کا عرصہ هوا قائم کیا تھا۔ اس تقریب کے سلسلے میں بابو کیشاب چندر کے مکان سے جلوس روانہ هوا جو در اصل فی الوقت هندو موحدین کا مرکز سمجھا جاتا هے۔ بابو صاحب کی عمر ۲۵ سال هے اور وہ اس تحریک کے سر گروہ هیں۔ جلوس مرزا پور کی طرف روانہ هوا جهاں ایک نئے مندر کی اس موقع پر بنا ڈالی جا رهی تھی۔ خاص اس موقع کے لئے دعائیں لکھی گئی تھیں جنھیں لوگ گاتے جاتے تھے۔ هر ایک کے هاتھ میں ایک چھوٹی سی جھنڈی تھی جس پر سنسکرت زبان میں عبارتیں لکھی هوئی تھیں۔ یہ عبارتیں اس تحریک کے معتقدات سے تعلق رکھتی تھیں۔ مرزا پور پهنچنے کے بعد مندر کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس رسم کی ادائگی کے وقت بھجن گاے گئے۔ شام کے وقت ایک جلسہ منعقد هوا جس میں بابو صاحب نے تقریر کی۔ اس تقریر میں جن خیالات کا

---

* کولونیل چرچ کرانیکل میں (اپریل سنہ ۱۸۶۸ع) کلکتہ کے ایک برهمن کا خط شائع هوا هے جس نے مسیحی مذهب قبول کر لیا هے۔ وہ برهمو سماج کے ارکان کو دعوت دیتا هے کہ جهاں انهوں نے ایک قدم آگے بڑھایا هے وهاں ایک اور سهی۔ وہ انهیں یہ بھی بتلاتا هے کہ ان کی تحریک مسیحی ماحول کی رهین منت هے اور یہ کہنا افسانے سے زیادہ وقیع نهیں کہ برهمو سماج اصلی هندو تعلیم پر مبنی هے۔ بنارس کے ایک اور دوسرے برهمن نے جس کا نام نهمیا گورہ هے اور جس نے مسیحی مذهب قبول کر لیا هے، ابھی حال میں کیتھولک مذهب کی حمایت میں ایک رسالہ شائع کیا هے اور اس میں بھی برهمو سماج کے متبعین سے خطاب کیا گیا هے۔ اس رسالے میں عذاب کے ابدی هونے پر بھی بحث کی هے اور برهمو سماج کے دعووں کا جواب دیا هے۔ کولونیل چرچ کرانیکل۔ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ ع —

اظہار کیا گیا وہ مسیحي تعلیم سے بہت ملتے جلتے تھے۔ تقریر کے ختم ہونے پر ایک بھجن پڑھا گیا اور جلسه برخاست ہوا —

بابو کیشاب چندر نے کچھہ دنوں بعد بمبئی میں ایک جلسے میں جس میں منتخب لوگ شریک تھے اپنی انجمن کے متعلق تقریر کی اور نہایت خطیبانه انداز میں ان اُصول پر روشنی ڈالی جن پر انجمن کی بنا ڈالي گئی ہے *۔ اپني تقریر کے دوران میں بابو صاحب نے خدا کي ذات کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوے بتلایا که اس کا علم انسان کی عقل سے باہر ہے۔ بابو صاحب نے خدا کا جو تصور پیش کیا وہ اس سے مختلف تھا جو سینٹ پال نے ایتھنز کے لوگوں کے روبرو پیش کیا تھا۔ جس مقام پر آپ کی یه تقریر ہوئی اُس کے اِردگرد ہندوؤں کے بتخانے ہیں جہاں وشنو، شیو، گنیش، ہنومان، لکشمی اور پاربتی کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس گرد و پیش میں آپ نے بت پرستی کے خلاف تبلیغ کی اور بتلایا که گونگے بتوں کے آگے سرجھکانے سے بھلا کیا فائدہ ؟۔ آپ نے یه بھی فرمایا که توحید دراصل انسانی اخلاق کا سر چشمه ہے۔ حضرت مسیح نے بھی توحید ہي کي تعلیم دی تھی۔ پھر آپ نے اس امر پر خاص کر زور دیا که معاشری مسائل کا بھي عقیدۂ توحید سے گہرا تعلق ہے۔ توحید میں اعتقاد کي بدولت بنی نوع کی وحدت کا تصور انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ جب آدمی خدا کی

---

* بابو صاحب نے بمبئی میں جس انجمن کے زیر اہتمام تقریر کی اس کا نام "پرارتھنا سماج" ہے۔ پچھلے سال میں نے انجمن "وید سماج" کی نسبت ذکر کیا تھا۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے که ان دونوں انجمنوں کے مقاصد مشترک ہیں —

وحدانیت پر ایمان رکھتا ھے تو وہ ذات پات کی تقسیم پر یقین نہیں رکھہ سکتا۔ اس اعتقاد کی وجہ سے عدل و مساوات وجود میں آتی ھے۔ چنانچہ توحید کا ماننے والا قبل از بلوغت شادیوں، عورتوں کو گھروں میں بند رکھنے، بچوں کو قربان کرنے، اور مذھبی جکڑ بندیوں کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا جو ھندوستان کی تباھی کا باعث ھو رھے ھیں۔ بابو صاحب کے الفاظ ھیں کہ "اگر خدا کی وحدانیت پر میرا اعتقاد پکا ھے تو جبلی طور پر میں نہ صرف ھندوؤں کو بلکہ مسلمانوں، پارسیوں اور اھل یورپ کو اپنا بھائی سمجھوں گا" —

اسی جگہ دوسرے جلسے میں بابو صاحب نے عبادت کی حقیقت کے متعلق اظہار خیال کیا اور بتلایا کہ سچی عبادت وہ ھے جو دل سے کی جاے۔ الفاظ کو حفظ کر لینے یا انھیں بار بار دھرانے سے کوئی فائدہ نہیں اس واسطے کہ بسا اوقات لوگ ان الفاظ کے معنی تک سے بے خبر ھوتے ھیں۔ اپنی وسیع مشربی کا ثبوت دینے کے لئے آپ نے شاستروں میں سے سنسکرت زبان میں چند دعائیں پڑھیں پھر اس کے بعد انجیل، زند اوستا اور قرآن سے چند دعائیں پڑھیں۔ آخر میں آپ نے کہا "اب ھم سبھوں کو دعا کرنی چاھئے کہ ھندو پارسی اور مسلمان کی تفریق اٹھہ جاے اور جس قدر اور دوسرے فرقے ھیں جن کے باعث ھم میں نفاق پیدا ھوگیا ھے، دنیا سے مٹ جائیں! —

موصوف نے بنارس میں اسی موضوع پر ایک تقریر کی جس میں بنگالی عورتوں نے بھی شرکت کی جو حجاب ڈالے ھوے تھیں * —

---

* اے ایس شیرنگ کی کتاب "مقدس شہر بنارس" صفحہ ۲۴۳ —

پچھلے مارچ کے مہینے میں موصوت نے ڈھاکے میں ڈھائی سو ھندوؤں کے جلسے کی صدارت کی- جلسے کی کارروائی کا افتتاح انجمن کے بنیادی اصول پڑھنے سے کیا گیا- یہ اصول بالکل وھی ھیں جو "ویدسماج" کے ھیں* حسب ذیل دفعات میں یہ اُصول بیان کئے گئے ھیں —

(۱) اوم† - ھر چیز کے وجود سے پہلے خدا موجود تھا- کائنات کو اس کی مشیت نے پیدا کیا -

(۲) وھی سب کا مالک ھے اور اُسی نے سب کو پیدا کیا- وہ ھر جگہ موجود ھے وہ قادرمطلق ھے - اس کو کوئی دیکھ نہیں سکتا- اس کی ذات کا انحصار کسی پر نہیں اور نہ کوئی اس کی برابری کرنے والا ھے - وہ نیکیوں کا سرچشمہ ھے اور عقل کا منبع -

(۳) اصل ایمان یہ ھے کہ اس کی ذات سے محبت کی جاے اور نیک اعمال کئے جائیں -

(۴) دنیاوی اور روحانی فلاح صرف اس کی بندگی سے حاصل ہو سکتی ھے -

---

* میں نے ۲- دسمبر سنہ ۱۸۶۷ ع کے خطبے میں ان کی نسبت تذکرہ کر دیا ھے —

† یہ ایک پر اسرار فقرہ ھے جس کو ھندو لوگ اپنی تحریرات کے شروع میں لکھا کرتے ھیں- اس کی بڑی عالمانہ توجیہیں کی گئی ھیں " بنگال ایشیا ٹک سوسائٹی کی کارروائی" مورخہ ستمبر سنہ ۱۸۶۶ ع میں مسٹر جے بیمز' ایچ بلوکمان اور راجندرلال متر نے اس پر اسرار لفظ کے متعلق اپنی اپنی راے کا اظہار کیا ھے -

اِن بنیادی عقاید کے پڑھنے کے بعد ایک دعا پڑھی گئی جس میں قدیم اصنام پرستی اور ہمہ اوستی خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے - اس دعا کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں " اوم - اے مالک ہم تیری پرستش کرتے ہیں - تو آگ میں اور پانی میں، پودوں میں اور تناور درختوں میں اور کل کائنات میں جاری و ساری ہے" + —

اس دعا کے بعد ایک دوسرے بابو صاحب نے تقریر کی جس میں حکومت برطانیہ کی تعریف کی اور کہا کہ اس کے سایۂ عاطفت میں اہل ہند کو ضمیر کی آزادی کا حق حاصل ہے - اس حکومت کی برکتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ملک میں تعلیم کا رواج بڑھ رہا ہے - ہندو لوگ اس تعلیم کے ذریعے سے اپنی عظمت پارینہ کو حاصل کرسکتے ہیں جس نے انہیں تمام دنیا کی اقوام میں ممتاز حیثیت دے دی تھی -

برھمو سماج کے ایک جلسے کا یہ حال جو کلکتہ میں منعقد ہوا تھا، ایک شخص نے چشم دید بیان کیا ہے جو " بمبئی ٹائمز " میں شایع ہوا ہے- " جس مکان میں جلسہ منعقد ہوا وہ باہر سے دیکھنے میں زیادہ عالیشان نہیں ہے - وہ ایک گلی میں واقع ہے جہاں سے ہر وقت لوگ گزرتے رہتے ہیں- اس مکان کے بڑے کمرے میں پہونچنے کے لئے دو سیڑھیوں پر چڑھنا پڑتا ہے - یہ کمرہ لمبا ہے اور اس میں لکڑی کی بنچیں بچھی ہوئی ہیں - دیواروں پر کسی قسم کی تحریریں یا مقولے آویزاں نہیں دکھائی دیتے - بیچ میں ایک اونچی جگہ ہے جس کے چاروں طرف جالی لگی ہوئی ہے اور جس کا فرش سنگ مرمر کا ہے - فرش کے ایک حصے پر ایک قالین بچھا ہوا ہے-

---

+ باقی دعا میں اسی خیال کو پھیلایا ہے -

اس جگہ سے الٹی جانب ایک چوکی پر دو برھمن پالتھی مارے بیٹھے ہوے تھے اور ان کے پاس دعاؤں اور بھجنوں کی کتابیں رکھی ہوئی تھیں - سامنے ایک تخت پر ایک گانے والا بیٹھا تھا- اس کے پیچھے قدیم برھمو سماج کے صدر کے بیٹے بابو دبندر ناتھہ ٹگور ہارمونیم بجا رہے تھے * شروع میں عبادت کی رسم ادا ہوئی اور پھر اس کے بعد اپنشدوں میں سے سنسکرت زبان میں بعض حصے پڑھے گئے - پھر ایک برھمن نے ایک مختصر سی تقریر کی - ازاں بعد گانے والے نے دعائیں ہارمونیم کے سروں کے ساتھہ گانا شروع کیں - جلسہ ختم ہونے پر لوگ فوراً کمرے سے باہر نکل کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیے - مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس ساری کارروائی میں مجھے جذبات کی گرم جوشی نام کو بھی کہیں نظر نہ آئی - سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوے تھے اور برابر ڈیڑہ گھنٹے تک جب تک جلسہ ہوتا رہا نہ کوئی اُٹھا ، نہ کوئی سرکا اور جھکنے کا تو وہاں ذکر ہی نہیں تھا - ہاں ، حاضرین ، جن کی تعداد سو کے قریب تھی نہایت توجہ کے ساتھہ سب کچھہ سنتے رہے اور کبھی کبھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے دل اعتقاد سے لبریز ہیں - نہ کمرے میں اور نہ آس پاس کہیں اور کوئی عورت موجود نہ تھی " —

برھمو سماج کے ارکان نے حکومت کو ایک عرضداشت پیش کی ہے

---

* مس کارپنٹر نے جو ریورنڈ لانٹ کارپنٹر کی بیٹی ہیں ، اپنے ایک خط میں لفظ " قدیم " کی تصریح کی ہے - اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل میں برھمو سماج تحریک کے لیڈر دبندر ناتھہ ٹگور تھے جو دوارکا ناتھہ ٹگور کے بیٹے تھے اور رام موہن رائے کے جگری دوست تھے - ان سے میری پیرس میں ملاقات ہوئی تھی - رام موہن رائے نے دبندر ناتھہ ٹگور سے علحدگی اختیار کرنے کے بعد ایک زیادہ وسیع المشرب فرقے کی بنا ڈالی -

جس میں یہ درخواست کی هے کہ ان کي مخصوص رسوم کے مطابق جو شادیاں کي جائیں انهیں حکومت تسلیم کرے - لیکن اس کے ساتھ هي بابو کیشاب چندر نے اپنی ایک تقریر میں اس امر کی تصریح کردی کہ برهمو سماج کی تحریک اس خیال کی تائید نہیں کرتي کہ وہ هندو اور مسلمان جنهوں نے اپنے عقاید کلیتاً ترک کردیے هیں یا وہ لوگ جو همہ اوستي فلسفے یا افادیت کے قائل هیں' یا مشککوں یا عقل پرستوں کو بهي اس قانون کے تحت لایا جاے جو دراصل صرف انهیں کے فرقے کے لئے مخصوص هونا چاهئے - ان کی تحریک کو دوسروں کے خیالات کے ساتھ گڈ مڈ نہ کرنا چاهئے * —

چماروں کي ذات هندوؤں کے نزدیک نہایت ذلت کی نظر سے دیکھی جاتي هے - صوبۂ شمالی مغربی کے چماروں کو جب اس ذلت کی زیادہ برداشت نہ رهي تو انهوں نے ترک وطن کا فیصلہ کیا - چنانچہ تقریباً چار لاکھ آدمیوں نے اپنے دیس کو چھوڑ کر 'چھینگڑہ' میں توطن اختیار کیا جو دریاے مہاندی کے قریب ایک سطح مرتفع هے † - ان میں سے صرف چار سو چمار ایسے هیں جنهوں نے اپنے آبائي پیشے کو جاري رکھا هے - باقیوں نے کاشتکاري شروع کردي هے - ان میں سے بیشتر "ست نامي" تحریک کے ساتھ وابستہ هوگئے هیں - چنانچہ اکثر نے ذات پات کی تفریق اور بت پرستی کو ترک کردیا هے اور اب وہ ایک خدا پر اعتقاد رکھتے هیں - اس اصلاحي تحریک کا مقصد یہ هے کہ هندوؤں

* انڈین میل مورخہ ۲۷ اگست سنہ ۱۸۶۸ ع

† ٹائمز مورخہ ۲۰ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ ع -

میں عبادت کا شوق پیدا کیا جاے' حقه چلم ترک کرائي جاے اور شراب اور دوسری نشه آور اشیا سے احتراز کي تعلیم دي جاے* —

پچھلے موسم بہار میں بنگالیوں نے "چیت میلے" کے نام سے ایک بہت بڑا اجتماع منعقد کیا جس کا مقصد یه تھا که مختلف مذهب والوں اور مختلف ذات والوں کے درمیان بھائی چارا پیدا کرنے کي کوشش کي جاے تاکه اس سے عام ملکی فلاح و بهبود کي سبیل نکلے - چنانچه اس میلے کے موقع پر ایک کمیٹی کے سپرد یه کام کیا گیا هے که وه اس مقصد کے حاصل کرنے کے ذرائع تلاش کرے - نیٹو اوپنین (Native Opinion) مورخهٔ ۱۲ اپریل سنه ۱۸۶۸ ع میں لکھا هے که اس کمیٹي کی پہلي کوشش یه هوگی که ذات پات کی تفریق کو مٹائے جس کی وجه سے اهل هند میں اتحاد پیدا هونا نا ممکن هے - یه کوشش نهایت مبارک هے اور یوروپین لوگوں کو اس کی جس قدر هوسکے همت افزائی کرني چاهئے —

آج کل پنجاب میں ایک هندو شخص نے جس کا نام رام سنگه هے اصلاحی تحریک شروع کی هے- یه تحریک زیاده تر سکھه طبقے تک محدود هے اور کہا جاتا هے که کچھه مسلمانوں نے بھي اس کی اتباع شروع کر دی هے - یه بھي کہا جاتا هے که اس کے پیرووں کی تعداد تقریباً ایک لاکھه کے پہنچ چکي هے لیکن معلوم هوتا هے که یه اصلاحي تحریک مذهبي نهیں سیاسي نوعیت رکھتی هے† —

---

* ایچ ایچ 'ولسن' نے اپنی کتاب 'یاد داشت متعلق فرقه هاے هنود'' میں ست نامیوں کی نسبت دلچسپ حالات لکھے هیں صفحه ۳۳۹ (جدید ایڈیشن) —

† انڈین میل مورخه ۱۴ دسمبر سنه ۱۸۶۷ ع نیز ۹ جولائی سنه ۱۸۶۸ ع-

تہذیب و تمدن کا جو ہمارا معیار ہے اس کے مطابق اہل ہند ترقی کر رہے ہیں - سعدی کا قول بالکل درست ہے کہ "انسان کو اپنی صلاحیتوں کی نشو و نما کرنی چاہئے - صندل کی لکڑی میں اگر خوشبو نه هو تو وہ سوائے جلانے کے اور کس کام کی هوسکتی ہے"—

اہل هند کی ترقی کا حال ایک هندوستانی اخبار کی زبانی سنئے * - "آج سے دس سال قبل اہل هند کا عام دستور تھا کہ وہ اپنی زندگی بیکاری میں گذارتے تھے - لیکن اب حالت بالکل بدل گئی ہے - بچے پڑھنے لکھنے میں مشغول نظر آتے هیں ' جوان لوگ اپنے کام دھندے میں منہمک رهتے هیں اور یہاں تک که بوڑھے بھی اس طرح بے فکری سے نہیں رهتے جیسے که پہلے رها کرتے تھے - پہلے مزدور اپنی کاهلی کی وجه سے قوت لایموت کو محتاج تھے لیکن اب اپنی مشقت کے بل پر انہیں سب کچھه حاصل ہے - تعلیم کی ترقی اور ترویج ' تجارت کا فروغ اور ریلوں کی وجه سے نقل و حرکت اور رسل و رسائل کے باعث اہل هند کی زندگی میں غیر معمولی تغیر پیدا هوگیا ہے" - لیکن اس کے بعد هی یه هندوستانی اخبار افسوس کے ساتھه لکھتا ہے که "شراب نوشی کا رواج روز بروز بڑھتا جاتا ہے - هندو معتقدات کے ماننے والے کم هوے جاتے هیں - چنانچه اب ان مذهبی رسوم کی پابندی ترک کی جا رهی ہے جن پر شاستروں کے مطابق عمل پیرا هونا هر هندو کا فرض ہے - دن میں تین دفعه جو هندوؤں کو عبادت کرنی چاهئے اس کی کسی کو پروا نہیں رهی - اب گھی کے چراغ کوئی نہیں جلاتا - دیوتاؤں کی مورتیوں کو

---

* سوم پرکاش - ۳۰ جولائی —

اب لوگ صندوقوں میں بند کرکے رکھنے لگے "—

ہندوستانی اخبارات میں * والیان ملک اور اُمرا کے متعلق اس قسم کے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں کہ وہ تعلیم حاصل کرنے کی طرف سے بے توجہی برت رہے ہیں- اگر یہ لوگ تاریخ اور دوسرے علوم سے واقفیت حاصل کریں تو خود انہیں اس سے بہت فائدہ ہوگا- اس طبقے کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے اہل یورپ کے امرا کی مثال پیش کی جا رہی ہے کہ انہیں باوجود اپنے اعلیٰ نسب و شرت کے متفرق علوم سے واقفیت حاصل کرنے کا کس قدر شوق ہوتا ہے- لیکن ہندوستانی اخبارات میں بعض روشن خیال نوابوں کا بھی ذکر ملتا ہے مثلاً نواب رامپور جن کا نام کاب علی خان ہے نہایت تعلیم یافتہ شخص ہیں- ان کی علم پروری کے دیسی اخبارات معترت ہیں - میرٹھ کے اخبار میں ان کی مدح میں ۸۰ اشعار کا قصیدہ نقل کیا ہے- اسی طرح مہاراجہ کپور تھلہ کا شمار روشن خیال مہاراجوں میں کیا جاتا ہے- موصوف نے ابھی حال میں دس ہزار روپیہ بطور عطیہ دیا ہے تاکہ روز مرہ کی زبان کے توسط سے مغربی علوم کو رواج دیا جاے+ —

دیسی امرا کے علاوہ برطانوی حکومت بھی دیسی زبانوں کی ہمت افزائی کر رہی ہے جس پر اس کو مبارک باد دینی چاہئے- دراصل ہندوستانی لوگ اس کے متعلق بہت عرصے سے مطالبہ کر رہے تھے- حکومت کے اس فعل سے اہل ہند کے دل میں برطانیہ کے ساتھ محبت پیدا ہو گئی

* دیکھئے اودھ اخبار ۱۸ اگست سنہ ۱۸۶۸ ع —

+ انڈین میل مورخہ ۹ اپریل سنہ ۱۸۶۸ ع —

هے - وهي برطانیه جس کی نسبت یونانی مورخ پروکوپ (Procope) کا خیال تھا که وه "سانپوں سے پٹا پڑا هے اور جهاں ممالک فرنگ (یعنی فرانس) کے مرے هوؤں کی ارواح رات کے وقت بهیجی جاتی هیں - ان ارواح کو ملاح لوگ اِس کنارے سے اُس پار لے جاتے هیں - ان ملاحوں کا کام هی بس یه هے" —

سر اسٹرافورڈ نارتهه کوٹ کے جدید مجوزہ قانون کی رو سے هندوستانیوں کو سول سروس میں داخل هونے کا موقع ملے گا اور انهیں ان سب امتحانوں کی منزلوں سے نهیں گذرنا پڑے گا جن سے هر انگریز کو گذرنا پڑتا هے —

یه واضح رهے که بے شمار هندوستانی ایسے هیں جو انگریزي زبان کی تحریر و تقریر پر کامل قدرت رکهتے هیں - ان میں سے ایک کولا پور کے مهادیو گوبلند راناڈے هیں جو بمبئی کے الفنسٹن کالج میں انگریزي ادب کے پروفیسر مقرر کئے گئے هیں - وه اس خدمت کے لئے نهایت موزوں شخص ثابت هوے هیں * —

جونا گڑه کی ریاست کے ولی عهد شهزادۂ بلند اختر کی بسم‌الله کی تقریب میں ۲۲ جولائی سنه ۱۸۶۸ ع میں ایک جلسه منعقد هوا جس میں نواب جونا گڑه کے اعزا و اقارب کے علاوه اعلی عهده داروں ' امرا ' شیوخ اور علماے شهر نے شرکت کی - شهزادے کے استاد محمد خیرات علی نے اردو میں اس موقع پر ایک تقریر کی جو اوده اخبار مورخه ۱۸ اگست سنه ۱۸۶۸ ع میں چهاپی گئی هے - اس تقریر کے بعض اجزا کا ذیل میں

* هوم ورڈ میل مورخهٔ ۱۰ فروری سنه ۱۸۶۸ ع

ترجمه درج کیا جاتا ھے —

" شہزادۂ ولیعہد کی بسم اللہ کے موقع پر میں علم کی تعریف میں چند کلمات بیان کرنا چاھتا ھوں - کسی دانشمند کا قول ھے کہ ھر علم مفید ھے - جاننا نہ جاننے سے ھر حالت میں بہتر ھے - آپ سب تعلیم و تعلم کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتے ھیں - آپ کو معلوم ھونا چاھئے کہ خدائے عز و جل نے کائنات میں جس قدر اشیا پیدا کی ھیں ان میں علم کا مرتبہ سب سے بلند ھے - علم کے ذریعے سے انسان کو ذی حیات اشیا کی تکوین و تشکیل' ان کا طریق زندگی اور ان کے خصائص کا پتہ چلتا ھے - علم ایک طرح کي روشنی ھے اور جہالت بمنزلۂ تاریکی ھے - علم کائنات ھستی کی جان ھے - بغیر اس کے وہ ایک بے جان جسم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھہ سکتی - عام سے انسان ھدایت پاتا ھے بغیر اس کے وہ بھٹکا پھرتا ھے - علم دولت ھے اور جہالت افلاس' علم عزت ھے اور جہالت ذلت' علم سے انسان سربلندی حاصل کرتا ھے اور جہالت اسے گڑھے میں گراتی ھے - انسان کو' عقل و تمیز کے باعث جن سے وہ اچھائی برائی میں فرق کرتا ھے' اشرف المخلوقات کہا گیا ھے - بغیر علم کے عقل و تمیز کی روشني حاصل نہیں ھوسکتی - اچھائی اور برائی کے درمیان آدمی علم ھي سے فرق کرسکتا ھے - علم ھی سے انسان انسان بنتا ھے - علم ھي کي بدولت اسے اس کا حال معلوم ھوتا ھے کہ وہ کہاں سے آیا ھے اور اسے کہاں جانا ھے - اگر انسان اپنے تئیں سمجھہ لے تو گویا اس کو ذات باری تعالیٰ کی معرفت حاصل ھوگئي - علم اور اپني ذاتی صلاحیت کے ذریعے انسان کائنات فطرت کے رموز و اسرار سے واقفیت حاصل کرسکتا ھے - اس کو یہ معلوم ھوتا ھے کہ خداوند تعالیٰ اپنی قوت سے کیونکر تمام کائنات

کے کارخانے کو چلاتا ہے- غرض کہ انسانی نطق کی یہ طاقت نہیں کہ علم کی کماحقہ تعریف کرسکے جس کی بدولت دین و دنیا کے مسائل کا حل کیا جاتا ہے—

"علم کی قسموں میں سے ایک فلکیات ہے جس کے ذریعے ستاروں کی رفتار اور ان کی گردش' ان کا طلوع و غروب اور ان کے عروج و زوال کا حال معلوم ہوتا ہے- سورج سے دنیا کو حرارت اور زندگی حاصل ہوتی ہے- اسی پر موسموں کے تغیر و تبدل کا دارومدار ہے- قطب ستارہ اور قطب نما کے ذریعے اور اس کی مدد سے آپ جہاز رانی کرسکتے ہیں اور سمندروں کی راہ سے ممالک غیر کی سیر کرسکتے ہیں- ان کے رسوم و علوم کا حال معلوم کرسکتے ہیں اور ایک ملک سے دوسرے ملک میں تجارتی مال لے جاسکتے ہیں- ایک زراعت کا علم ہے جس کی بدولت غلے اور پھل پھلواری حاصل کی جاسکتی ہے جو انسان کی غذا کے کام آتی ہے- علوم کی تعداد حد شمار سے باہر ہے- اگر ان سب کا یہاں ذکر کیا جاے تو طول کلام ہوگا... حیوانات نباتات اور جمادات سب انسان کی خاطر تخلیق کئے گئے ہیں- ان کے ذریعے ہم اپنی ضروریات پوری کرسکتے ہیں اور حظ بھی حاصل کرسکتے ہیں- ہم جس طرح چاہیں انہیں استعمال کرسکتے ہیں- تندرستی میں بھی اور حالت بیماری میں بھی—

"علوم کو ہم دو قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں- علوم دینی اور علوم دنیاوی- ان دو شقوں کے علاوہ اور تیسری کوئی ہو ہی نہیں سکتی- ایک کے ذریعے ہم خدا کی معرفت حاصل کرتے ہیں اور دوسرے کے ذریعے فطرت کے راز ہم پر منکشف ہوتے ہیں- انسان کو چاہئے کہ وہ ان علوم کے حاصل کرنے کی سعی کرے اور اس کے ساتھ اس کا اعتراف کرتا

رھے کہ بغیر خدا کی مشیت کے انسان کچھہ نہیں کرسکتا - اس کا کرم ہو تو انسان علم حاصل کرسکتا ھے - خدا کی سب سے بڑی نعمت عقل ھے جس کا تعلق انسان کے دماغ سے ھے - علم سے عقل کو جلا ہوتی ھے - اگر انسان تحصیل علم کے لئے ساعی نہ ہو تو اس کی روح کو زنگ لگ جاتا ھے - علم سے انسان کی عقل میں روشنی پیدا ہوتی ھے' جہالت کی تاریکیاں دور ہوتی ھیں اور اشیا کی حقیقت معلوم ہوتی ھے —

" ویسے تو علم حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے لئے ضروری ھے لیکن خاص کر انہیں اس کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ھے جنہیں خدا نے انسانوں کی حکومت عطا کی ھے - انہیں چاھئے کہ خوش انتظامی اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کو سمجھنے کے لئے تحصیل علم کریں تاکہ ان کے لشکر اور عام مخلوق ان سے خوش رھے - ان کا فرض ھے کہ تعلیم کو رائج کرنے کی حتی المقدور کوشش کریں - اس سے ان کی رعایا کو بھی فائدہ ہوگا اور خود ان کا نفع بھی اس میں ھے - اسی طرح عندالضرورت وہ اپنی رعایا کی امداد پر بھروسہ کرسکیں گے -

مذہب و معاشرت کی ان اصلاحی تحریکوں کا ذکر کرنے کے بعد جن کی ابتدا خود ہندوستانی لوگوں نے کی ھے' ہم مسیحی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے متعلق کچھہ کہنا چاھتے ھیں کہ یہ بھی اہل ہند کے لئے نہایت اہم اور اصلاحی کام ھے - مسیحی مذہب کی صداقت کا اعتراف اور اس کی ترقی اس قدر تیزی کے ساتھہ نہیں ہو رہی ھے جیسی کہ توقع کی جاتی ھے - لیکن یہ ضرور ھے کہ اسی ضمن میں جو کچھہ کام کیا جا رہا ھے وہ نہایت ٹھوس ھے —

" سالنامۂ تبلیغ و اشاعت " میں ھندوستان کے کل کیتھولک لوگوں کی تعداد ۸ لاکھ بتلائی گئی ھے- اس میں سے ایک لاکھ ۶۰ هزار سیلون میں ھیں جیسا کہ وھاں کے اسقف نے واضح کر دیا ھے جن کا نام ڈاکٹر بون جان ھے جو دراصل میڈیا (Medea) کے بزرگ کلیسا ھیں- آپ کو اس کی خاص فکر رھتی ھے کہ دیسی عیسائیوں کو تعلیم و تلقین کریں اور ان کے دینی حقوق کی نگہہ داشت کریں * —

مسیحیت کی تعلیم و تلقین سب سے پہلے ھندوستان میں سینٹ طامس نے کی تھی- پھر ان کے بعد ایک اور دوسرے طامس اور فرانسوا زیویر نے مسیحی مذھب کا پیغام اھل ھند کو پہنچایا- آج اس وقت ھمارے زمانے میں بھی پرجوش مبلغین مسیحیت ھندوستان میں جوش و خلوص کے ساتھ کام کر رھے ھیں- قدیم شرک و کفر کے ماننے والوں اور جدید فطرت پرستی کے علم برداروں کے مقابلے میں ان مبلغین مسیحیت کو ھر جگہ کامیابی ھو رھی ھے- جیسا کہ انجیل مقدس میں ھے : " صداقت پسند دلوں کے لئے تاریکی میں روشنی ظاھر ھو جاتی ھے " † اور " اب وقت آگیا کہ وہ جو روحانی اعتبار سے مرچکے ھیں خداوند کے فرزند کی آواز کو کان دھر کے سنیں ‡- ایک سہ پہر کی عبادت کے وقت کی دعا کے الفاظ یہ ھیں : " اگرچہ حضرت مسیح دنیا سے کوچ کر گئے لیکن ان کی روح مقدس ھر لمحہ کلیسا میں نئی زندگی پیدا کرتی رھتی ھے- کلیسا

---

* " Answers to the questions proposed by the Sub-Committee of education of Ceylon " - by Rev. Ch. Bonjean, Colombo, 1867.

† Ps. CXI. 4.

‡ سینٹ جان کی انجیل -

ان کا جسم باطنی ہے - وہ باطنی طور پر کلیسا میں موجود ہیں- کلیسا کے اعضا و جوارح کو ان کے دم سے زندگی حاصل ہوتی ہے اور اس کے ہر فعل پر ان کا اثر موجود ہوتا ہے "—

مسٹر کلارک نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۳ فروری سنہ ۱۸۹۸ ع میں شہر امرتسر کے چرچ مشن کے متعلق بعض اطلاعات بہم پہنچائی ہیں - ان کے الفاظ یہ ہیں: "مسیحیت کی ترقی آہستہ آہستہ ہو رہی ہے لیکن اس سے ہمت نہیں ہارنی چاہئیے - ہم عدم توجہی اور کفر و شرک کے سرد سمندر سے چاروں طرف گھرے ہوے ہیں- مسیحیت کی لہر پر جو شخص آجاتا ہے وہ نجات کے کنارے لگ جاتا ہے - اس کی تعلیم میں ایک ایسی قوت موجود ہے کہ اہل فکر اس کی بدولت ابدیت کے صراط مستقیم پر پہنچ سکتے ہیں" ...—

اسکاتستان کے آزاد کلیسا کی شاخ جو ناگپور میں قایم کی گئی ہے مسیحی تہذیب و تبلیغ کا کام کمال خوبی کے ساتھ انجام دے رہی ہے- اس شاخ کے قایم کرنے والے ایک نہایت ذی علم اور انسانیت پرست شخص ہیں جن کا نام ای بشپ ہے - لاہور کا امریکی مشن بھی خوب پھل پھول رہا ہے - لاہور میں اس مشن نے جو کالج قایم کیا ہے اس کے طلبہ کے تقسیم انعام کے جلسے میں سر ڈانلڈ مک لیوڈ نے صدارت کی- موصوف نے دوران تقریر میں اس امر پر زور دیا کہ دیسی زبانیں جو دیہات میں بولی جاتی ہیں ان کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہئیے- آپ نے یہ بھی فرمایا کہ ان زبانوں سے پوری واقفیت مسیحیت کی تبلیغ و اشاعت کے لئے بھی ناگزیر ہے - مسیحیت کا پیغام دیہاتیوں تک پہنچانے کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی زبان میں رسالے لکھوا کر تقسیم

کرائے جائیں *۔

شہر سیہور میں جو بیگم صاحبہ بھوپال کی حدود حکومت میں واقع ہے ' چالیس ہزار روپے کے خرچ سے ایک کلیسا تعمیر کیا گیا ہے - اس رقم کا بیشتر حصہ خود بیگم صاحبہ بھوپال اور ہلکر والی اندور نے اپنے پاس سے دیا ہے - دیسی اُمرا نے بھی چندے سے اس کام میں مدد دی + ۔

انگلی کن (Anglican) کلیسا جن میں ہر اتوار کے روز خطبہ و عبادت کا انتظام کیا جاتا ہے ' تعداد میں برابر بڑھ رہے ہیں - ان میں روزانہ عبادت بھی ہوتی ہے - (انڈین میل ' ۷ مارچ سنہ ۱۸۶۸ ع) ۔

دہلی میں ایک طبی مشن ابھی حال میں قائم ہوا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اہل ہند کی مستورات کے علاج کا علحدہ انتظام کیا جائے اور اس کے ساتھ ان میں مسیحی تعلیم کی نشر و اشاعت کی جائے - ایک خاتون اس کام میں شریک ہیں جن میں وہ سب اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہیں جو اس قسم کے کام کرنے والوں میں ہونے چاہئیں - وہ زنانے میں آتی جاتی ہیں اور انہوں نے دیسی عورتوں کو تعلیم دے کر بیماروں کی تیمارداری وغیرہ کے کام سکھا دیے ہیں - چنانچہ اس مشن کو توقع سے زیادہ کامیابی ہو رہی ہے - مشن کے اس کام کی بدولت دہلی کی بہت سی غریب عورتوں کے لیے آمدنی کا ایک سہارا ہوگیا ۔

میرے پچھلے خطبے کے بعد ۱۲ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ ع کلکتہ کے بزرگ

---

* Colonial Church Chronicle مورخہ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ع میں اس کا اعلان کیا گیا ہے کہ صوبجات شمالی و مغربی میں تبلیغ و اشاعت کی غرض سے " انجمن ترقی علوم مسیحی " اُردو زبان میں رسائل تیار کروا رہی ہے -

+ انڈین میل ' مورخہ ۵ مارچ سنہ ۱۸۶۸ ع -

کلیسا نے جو سارے ہندوستان اور سیلون کے مہا پادری ہیں، اپنی پہلی تقریر میں اپنے ہم مذہبوں کی حالت کا جائزہ لیا اور ان کے لیے راہ عمل پیش کی۔ موصوف نے اس تقریر کی نقل مجھے بھی بھیج دی ہے۔ اس کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے سال موصوف نے چالیس مختلف مقامات میں بپتسما کی رسم ادا کی، پچیس جلسے منعقد کرائے، مدرسوں اور کالجوں کا معائنہ کیا، چوبیس سپتالوں اور چار قیدخانوں میں گئے، تین نئے کلیساؤں کی افتتاحی رسم ادا کی اور نو قبرستانوں میں دعا کے لئے گئے۔ موصوف کے ان مشاغل کو دیکھتے ہوے آپ کے جوش مذہبی کا پتہ چلتا ہے۔ آپ بلا تکلف دیسی لوگوں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں اور خاص کر اُردو پر آپ پورے طور پر حاوی ہیں۔ آپ نے اپنی تقریر کے دوران میں مسیحی مذہب کے مبلغوں کو اس ضرورت کا احساس کرایا کہ وہ ملکی زبانیں محنت سے سیکھیں تاکہ دیسی لوگوں کے ساتھ اپنا تعلق قائم کر سکیں۔ آپ نے کہا کہ اہل ہند کے توہمات میں تو کمی پیدا ہو رہی ہے لیکن وہ ابھی مسیحی مذہب قبول کرتے ہوے ہچکچاتے ہیں۔ موصوف کے الفاظ یہ ہیں: ”یہ سچ ہے کہ اہل ہند مسیحی مذہب کے اُصول و عقاید کی پاکیزگی کو تسلیم کرتے ہیں اور حضرت مسیح کی پاک زندگی اور ان کی سیرت کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہیں لیکن جب وہ خود مسیحی مذہب کے نام لیواؤں کو دیکھتے ہیں تو ان کی زندگی کو ان کے مذہبی اُصول کے منافی پاتے ہیں۔ ان حالات کو دیکھ کر وہ ایک طرح کی روحانی کشمکش میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کے دل کی بے چینی اور بڑھ جاتی ہے۔ یورپ میں آج کل عقل پرستی کا دور دورہ ہے، چنانچہ اس کا اثر ہمیں اہل ہند پر بھی نظر آتا ہے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ خود مسیحی لوگ اپنے

مذهب کی پیروی نهیں کرسکتے تو ایسا مذهب قبول کرنے سے کیا فائدہ '
جهاں تک که مادیت کے نظریوں کا تعلق هے میں ذاتی طور پر سامعین کا
هم خیال هوں که " ان نظریوں پر عمل کرنے سے انسانی فطرت نهایت
پست هوجاتی هے - مادیت کے نظریوں اور قدیم زمانے کے نظریۂ تناسخ
میں کوئی فرق نهیں هے جس کی وجه سے انسان تقدیر کا قائل هو کر
زندگی سے مایوس هوجاتا هے - همه اوستی فلسفے میں بهی یه خیال ملتا هے -
میرا خیال هے که موجودہ نظریے بهت دن تک نهیں چل سکیں گے جس
طرح وہ قدیم زمانے میں بهت دن تک نه چل سکے " - میں اور دوسرے
مسیحیوں کی طرح دعا کرتا هوں که ایسا هی هو —

" خطروں سے انسانی اعتقاد میں نئی جان پڑتی هے - آدهی
رات کا اندهیرا ایمان کے لئے روز روشن کی طرح هے " —

ریورنڈ پروفیسر بنرجی اور بابو کهلدر موهن ٹگور کے اهتمام سے
کلکته میں ایک دیسی عیسائیوں کی انجمن قایم هوئی هے جس کا مقصد
یه هے که جن هندوستانیوں نے مسیحی مذهب قبول کرلیا هے ان کو پاک باز
زندگی کی تلقین کی جاے اور ان کے حقوق کا تحفظ کیا جاے - یه دونوں
حضرات پهلے هندو تهے * —

اس سال کے دوران میں بعض ممتاز مسلمان مسیحیت کے حلقے میں
داخل هوے هیں - چنانچه دهلی کے شاهی خاندان کی بعض شهزادیوں کے
بپتسمے کی رسم ابهی حال میں منائی گئی هے —

اودہ اخبار مورخه ۲ جولائی میں یه خبر درج هے که ایک نهایت

---

* (Colonial Church Chronicle) مورخه اکتوبر سنه ۱۸۶۸ ع

سر برآوردہ اور عالم فاضل ہندو جس کا نام بابو رام ناتھہ ہے' اسلام قبول کر لیا ہے - ہندوستان میں ہندوؤں کا حلقۂ اسلام میں داخل ہونا باعث تعجب نہ ہونا چاہئیے اس واسطے کہ قرآن میں محمد (صلی‌اللہ علیہ وسلم) نے انجیل کی بعض صداقتوں کو شامل کرلیا ہے - چنانچہ یہی صداقتیں ہیں جنہیں دیکھہ کر ہندو گمراہی کو چھوڑنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں - اس باب میں میں اُن ارباب قلم سے اختلاف رکھتا ہوں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے معتقدات کو گڈ مڈ کردیتے ہیں یا مسلمانوں کو ہندوؤں سے بھی بد تر سمجھتے ہیں - انہیں معلوم ہونا چاہئیے کہ اسلام دراصل مسیحیت ہی کی ایک شاخ اور اس کی تعلیمات کی غلط توجیہ کا نام ہے حالانکہ ہندوؤں کا دھرم اہل یونان و روما کے مذہب کی طرح اصنام پرستی پر مبنی ہے جس کو مسیحیت نے تباہ کیا - ہندوؤں کے بت ان بتوں کی طرح ہیں جنہیں سینٹ پال نے پامال کیا اور ان کے توہمات تو اہل یونان و روما کے توہمات سے بھی گئے گذرے ہوے ہیں - یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں آکر اسلام نے اپنے ہندو گرد و پیش کا اثر قبول کیا ہے اور اس کی اصلی سادگی پر بھی بٹہ لگ گیا ہے —

اخبار عالم مورخہ ۲۱ مئی سنہ ۱۸۶۸ ع میں ایک عجیب و غریب واقعہ درج ہے - مسیحی مبلغین اور مسلمان مولویوں نے ایک موقع پر باہم یہ طے کیا ہے کہ وہ آپس میں مل کر مباحثہ کریں گے اور اگر مبلغین مسیحیت کے دلائل تشفی بخش ہوے تو مولوی ان کا مذہب قبول کرلیں گے ورنہ وہ اسلام کے حلقے میں اپنے تئیں شامل کرلیں گے - مجھے اس کا علم نہیں کہ اس مباحثے کا کیا نتیجہ نکلا - لیکن بہر نوع مجھے اس کا کامل یقین ہے کہ مسلمان کبھی یہ تسلیم نہیں کریں گے کہ وہ مباحثے میں ہار گئے -

مسلمانوں اور ہندوؤں کو کامل طور پر اس کی آزادی حاصل ہے کہ وہ اپنے اپنے عقائد کی تبلیغ کریں جس طرح مسیحی مشنری کرتے ہیں- مسلمان لوگ خاص کر اس آزادی سے پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں- چنانچہ دھلی کے گلی کوچوں میں ان کے واعظ جلسے منعقد کرتے ہیں اور اپنے دین کی حمایت میں مسیحی مشنریوں کے اعتراضات کا جواب دیتے ہیں اور اپنے مذہب کی فضیلت ثابت کرتے ہیں- دھلی کے مسلمان پنجاب کے شیعہ لوگوں کی طرح مہدی موعود کا ذکر نہیں کرتے- پنجاب کے شیعوں کا خیال ہے کہ سنہ ۱۲۸۶ ھجری مطابق ۱۸۶۹ ع میں امام مہدی کا ظہور ہوگا جو سنہ ۲۳۶ ھ مطابق سنہ ۸۷۹ ع میں اس دنیا سے رو پوش ہو گئے تھے- امام مہدی قیامت سے پہلے ظاہر ہو کر مسلمانوں کو غیروں کے جوے سے نجات دلائیں گے —

' بدیا بلاس ' کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دھلی میں مسیحی مبلغین کے ہندوؤں اور مسلمانوں سے خوب مباحثے رہے- لیکن چونکہ مباحثے کے سلسلے میں دل خراش باتیں کی گئیں اور کالی گلوج تک نوبت آگئی تو مجسٹریٹ نے اس قسم کے جلسوں کو ممنوع قرار دیدیا ہے- لیکن ہر فرقے کو اس کی اجازت باقی ہے کہ وہ اپنے مذہبی عقائد کی نشر و اشاعت کرے لیکن اس طریقے سے کہ کسی دوسرے کے مذہب کی تذلیل اور کسی کی دل آزاری نہ کی جاے- ہندوؤں کے پنڈت اور مسلمانوں کے علما مشنری لوگوں کی طرح برابر اپنے مذاہب کی حمایت میں جلسے منعقد کر رہے ہیں- اودھ اخبار کے مدیر نے بھی اپنے اخبار میں اس کے متعلق اِظہار خیال کیا ہے کہ جس وقت سے انگریزی حکومت اودھ میں قایم ہوئی ہے اس وقت سے برابر مسلمانوں کو چاھے وہ سنی ھوں یا شیعہ یہ حق حاصل رہا ہے کہ وہ بھی مشنریوں کی طرح لکھنو میں اپنے جلسے منعقد کریں اور ان کے

اعتراضات کا جواب دیں - حکومت اس معاملے میں مطلق دخل اندازی نہیں کر رہی ہے - یہ مضمون ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے - " ہمیں پوری توقع ہے کہ ہندو پنڈت اور مسلمان علما اپنے اپنے شہروں میں دہلی ' اور لکھنو کی طرح' اپنے مذہب کی حمایت میں جلسے منعقد کریں گے اور اس امر کا خاص لحاظ رکھیں گے کہ مسیحی مذہب کے متعلق بیجا بد گوئی اور طعن سے احتراز کیا جاے گا '—

پچھلے سال میں عماد الدین کے مسیحیت قبول کرنے اور ان کی اس تصنیف کے متعلق ذکر کرچکا ہوں جس میں انہوں نے اسلام کی تکذیب کی ہے - اس کتاب کا نام " تحقیق الایمان " ہے - مجھے اس کا ایک نسخہ پہنچ چکا ہے اور ان کے مشرف بہ مسیحیت ہونے کا حال بھی ان کی ایک تصنیف سے معلوم ہوا * - اس تصنیف کے شروع میں ایک دیباچہ ہے جس میں مصنف نے اپنی زندگی کے حالات قلمبند دئے ہیں - بعض بعض جگہہ تعلی سے کام لیا ہے - لیکن اس قسم کی تحریرات صرف مشرقی ممالک ہی کی خصوصیت نہیں ہیں - یہ پوری تحریر لطف سے خالی ہے - موصوف نے اپنا مذہب بدلنے کے متعلق جو کچھہ لکھا ہے وہ بالکل درست معلوم ہوتا ہے - موصوف کہتے ہیں کہ پندرہ سال کی عمر سے مجھے مذہبی تحقیق و جستجو کا شوق پیدا ہوا اور اس غرض سے میں نے علما اور فقرا کی صحبت اختیار کی تاکہ ان کی تعلیم سے فیض حاصل کیا جاے - میں نے مسجدوں اور خانقاہوں کی خاک چھانی' فقہ اور حدیث کی تحصیل کی - لیکن جب سے مسیحی مذہب کے متبعین سے ملنے جلنے کا موقع ملا اس وقت سے مجھہ پر یہ کھلا کہ مذہب اسلام کے

---

* موصوف نے اپنے مسیحی مذہب قبول کرنے کا حال " واقعات عمادیہ " میں لکھا ہے - آپ ایک ماہوار اخبار کے مدیر بھی ہیں جس کا حال آگے آے گا -

حقائق پر شبہ کیا جاسکتا ہے - جب میں نے اپنے یہ شبہات علما کے سامنے پیش کئے تو انہوں نے تیوریوں پر بہت کچھہ بل ڈالے اور بعض نے اپنے استدلال سے میری تشفی کی کوشش کی - اس کے بعد میں نے مذہبی تحقیق کو ترک کیا اور علم و ادب کی تحصیل میں مشغول ہوگیا - لیکن شبہات میں کوئی کمی پیدا نہ ہونا تھی نہ ہوئی - اس پر میں نے صوفیا کا مسلک اختیار کرنا چاہا اور مراقبے میں رہنے لگا - میں نے کھانا پینا بہت کم کردیا، رات رات بھر قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا اور صرف ان مسلمانوں کی صحبت میں جاتا تھا جو اپنے اتقا کی وجہ سے مشہور تھے - پنج وقتہ نماز کے علاوہ میں نے تہجد اور چاشت کی نماز بھی شروع کردی - اولیا کے مزاروں پر زیارت کے لیے جاتا تھا اور راہبوں کی طرح جنگلوں میں زندگی بسر کرنے لگا - تصوف کی ایک کتاب میں نظر سے گذرا کہ کاغذ کے پرزوں پر اللہ تعالیٰ کے نام لکھہ کر ان میں جو کا آٹا بھر کے پڑیاں بناکر دریا میں پھینکو تاکہ مچھلیاں کھائیں - مدتوں اس پر عمل کیا لیکن نہ مراقبے سے، نہ عبادت سے اور نہ کسی اور ذریعے سے دل کو اطمینان نصیب ہوا - قرآن کی وہ آیات جن میں دوزخ کی نسبت حالات بیان کئے گئے ہیں میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگیں - میں نے ان کا مقابلہ حضرت مسیح کی تعلیم اور ان کے مذہب کے معتقدات سے کیا —

اس وقت تک عمادالدین اسلامی عقاید کو تسلیم کرتے تھے بلکہ آگرہ کی شاہی مسجد میں مشنری (Pfander) کے خلاف تقریریں کرتے تھے اور اس کے اعتراضات کا جواب دیتے تھے - مشنری (Pfander) کی کتابوں سے جو ہندوستانی زبان میں لکھی گئی ہیں سارے ہندوستان میں ہل چل

مچ گئی ہے اور ہر طرف سے اُن کے جوابات دئے جا رہے ہیں —

آخر آہستہ آہستہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ اسلامی علما عمادالدین کی تسکین کرنے سے عاجز ہو گئے - وہ اب اپنے کمرے میں سب سے الگ بیٹھہ کر رویا کرتے تھے - اس دوران میں ان کو ایک مسلمان فاضل مولوی صفدر علی کے مسیحیت قبول کرنے کا علم ہوا - اس کا اثر یہ ہوا کہ عمادالدین نے بھی انجیل مقدس اور متعلقہ کتب کا مطالعہ شروع کر دیا - اسے مسٹر مکنٹوش سے جو ایک نہایت ہمدرد اور فاضل انگریز تھے بڑی مدد ملی - موصوف لاہور کے نارمل اسکول کے ناظم تھے - بالآخر پورے غور و خوض کے بعد عمادالدین نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مسیحی مذہب قبول کر لے - ریورنڈ ٹی آر کلارک سے بھی اس معاملے میں مدد ملی - میں ریونڈ کلارک کی بیوی کے خط کے متعلق اوپر ذکر کر چکا ہوں - ریورنڈ کلارک کے ہاتھہ پر عمادالدین نے ۲۹ اپریل سنہ ۱۸۶۶ ع کو بپتسما قبول کیا اور انہیں وہ روحانی عافیت حاصل ہوئی جس سے عرصے سے وہ محروم تھے —

پچھلے سالوں میں ہندوستان میں جو علمی اور ادبی انجمنیں قایم ہوئی ہیں وہ برابر اپنا کام کئے جا رہی ہیں - ان میں سب سے اہم علیگڑہ والی انجمن ہے جس کے بانی سید احمد خاں، صدر الصدور بنارس ہیں جنھوں نے اپنی اس تصنیف کے باعث خاصی شہرت حاصل کر لی ہے جو انہوں نے انجیل مقدس کی تعلیمات کے متعلق لکھی تھی - یہ انجمن، انجمن اسلام سے مختلف ہے جس کی نسبت میں ابھی ذکر کروں گا * -

* ۳ دسمبر سنہ ۱۸۶۷ ع اور ۱۸۶۷ والے خطبوں میں میں نے غلطی سے ان دونوں انجمنوں کو آپس میں گڈمڈ کر دیا ہے —

اس کو مذہبی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں - اس کی رکنیت ہندؤں اور انگریزوں کے لئے بھی ممکن ہے - اس انجمن کا مقصد وحید یہ ہے کہ مغربی علوم و فنون کو اردو میں ترجمے کے ذریعے رواج دیا جاے - تاکہ ان تک ہر ہندوستانی کی رسائی ہو سکے —

اس انجمن کی مطبوعات کی ساتویں جلد میرے پیش نظر ہے - یہ آر - اس - برن کی کتاب " Outlines of modern farming " کا اردو میں ترجمہ ہے - اس کا نام " رسالۂ علم الفلاحت " ہے - اس کتاب میں تصاویر بھی ہیں اور ترجمے میں حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے (*) - اس انجمن کے اخراجات کی کفالت ارکان کے عطیات سے ہوتی ہے - اس انجمن نے ایک علحدہ فنڈ اس غرض سے قایم کرنا شروع کیا ہے کہ ہندوستانی نوجوانوں کو بغرض تعلیم یورپ بھیجنے کا انتظام کیا جاے تاکہ مغرب میں جو کچھ بھی جاننے کے لایق ہے اس کو ہندوستانی نوجوان سیکھیں اور اپنے ملک کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کریں (+) - یہ خبر بھی مشہور ہے کہ خود سید احمد خاں کا انگلستان جانے کا قصد ہے - آپ اس انجمن کے بانی ہیں اور آپ اس سال پھر اس کے معتمد اعزازی مقرر کئے گئے ہیں - سید احمد خان ایک نہایت جید عالم ہیں - آج کل آپ ایک فہرست تیار

(*) یہ کتاب ۲۵۴ صفحات پر مشتمل ہے - یہ لیتھو میں نہیں بلکہ ٹائپ میں چھاپی گئی ہے - سید احمد خان کے مطبع میں اسی انجمن کی کتابیں طبع کی جاتی ہیں - کچھ دنوں سے ایک اخبار بھی اس مطبع سے شائع ہونا شروع ہوا ہے جس کی نسبت آگے ذکر آے گا —

(+) اخبار عالم ' مورخہ ۲ اپریل سنہ ۱۸۶۸ ع —

کرنے میں مشغول هیں جس میں اردو زبان کی سب کتابوں کا حال درج هوگا - گویا یه فہرست کیا هوگی زبان اردو کی تاریخ هوگی - اس کے ساتھه آپ نے ایک " اردو لغت " کا کام بھی شروع کرادیا هے - اس لغت میں اردو زبان کے سب محاورے درج هوں گے (*) - یه فہرست اور لغت دونوں انجمن کے سلسلۂ مطبوعات میں شامل هوں گی - ان کے علاوہ قدیم اردو شعرا کے انتخابات اردو اور فارسی شاعری اور خطابت پر کتب تصنیف کرائی جائیں گی - انجمن کے پروگرام میں یه بھی داخل هے که عربی اور فارسی کی تاریخیں اور دیگر مشہور کتب کا اردو میں ترجمه کرایا جائے (†) - اس انجمن کی طرف سے متعدد انگریزی کتابوں کے ترجمے شائع هو چکے هیں - یه بھی اس کے مقاصد میں شامل هے که مغربی علوم صحیحه اور منطق پر اردو میں تصانیف لکھائی جائیں - میں سمجھتا هوں یه صرف تجربتاً کیا جا رها هے اس لئے که مغربی اور ایشیائی نقطۂ نظر میں اس قدر فرق هے که یه کام بہت دشوار معلوم هوتا هے - لیکن ممکن هے که یه تصانیف موجودہ حالت میں ان مصنفوں کے لئے مفید ثابت هوں جو آئندہ هندوستان میں جنم لیں گے —

(*) میں نے یه معلومات ۲۲ مئی کے اس انجمن کے رسالے سے حاصل کی هیں جس میں راجه جے کشن داس کی پوری رپورٹ درج هے جو انہوں نے ۹ مئی کے عام جلسے میں پڑھی تھی - موصوف انجمن کے معتمد هیں —

(†) ان کتابوں میں حسب ذیل شامل هیں :- تاریخ یمینی ' تاریخ ابوالفضل ' تاریخ الماثر ' (غالباً تاریخ تاج الماثر مراد هے ' مترجم) ' طبقات ناصری ' تاریخ فیروز شاهی ' تاریخ تیمور ' انتخاب تاریخ ابن خلکان —

بہت عرصے سے مجھے " رسالۂ انجمن لاہور" نہیں ملا - اس انجمن کا مقصد بھی یہ ہے کہ مفید علمی معلومات کی نشر و اشاعت کی جائے (*)- میں خود اس انجمن کا رکن ہوں - اس انجمن کی جانب سے ۳۲ رسالے شائع ہو چکے ہیں - ایک رسالے کو " اخبار عالم " نے پورا نقل کر دیا ہے (†)- اس کا عنوان " جانداروں کے ارتقا کی کڑیاں " ہے - اس رسالے میں مختلف جانوروں کی اقسام کے متعلق بحث کی گئی ہے - مکھی سے لے کر ہاتھی ' اونٹ اور مگر مچھ ' سب ہی کے متعلق کچھ نہ کچھ اس میں موجود ہے (‡)- اس رسالے کے شروع میں لکھا ہے کہ " بعض جانور انسان سے بڑے ہوتے ہیں اور ان کی عمریں بھی اس سے زیادہ ہوتی ہیں لیکن وہ عقل سے محروم ہوتے ہیں - اس عقل کی بدولت انسان خدا تک پہنچ سکتا ہے "- مولف رسالہ نے خاص کر اس فرق کی صراحت کی ہے جو انسان اور جانور میں پایا جاتا ہے - اسی ضمن میں مولف نے لکھا ہے کہ چھوٹے چھوٹے جانوروں کی جبلی قوت مدرکہ بڑے جانوروں سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے - غرض کہ اس رسالے میں اسی قسم کے مباحث ہیں جن کے متعلق میں زیادہ تفصیل نہیں دینا چاہتا —

(*) ۱۰ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ ع کے " اخبار عالم " سے معلوم ہوا کہ نواب سکندر علی خان رئیس مالیر کوٹلہ نے ایک ہزار روپے کے علاوہ جو انہوں نے انجمن کو پہلے دیے تھے ' ایک لاکھ روپے کا عطیہ مرحمت فرمایا ہے - اس اخبار سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نواب صاحب موصوف عنقریب انگلستان کے سفر کے لئے روانہ ہونے والے ہیں اور اپنے بڑے صاحبزادے کو تعلیم کے لئے ہمراہ لے جائیں گے جن کی عمر ۱۲ سال ہے —

(†) " اخبار عالم " مورخہ ۱۴ نومبر سنہ ۱۸۶۷ ع - (مہرتھ)

(‡) یہ رسالہ " اخوان الصفا " کی طرح ہے جس کا میں نے " Les ani maux " کے نام سے ترجمہ کیا ہے —

ایک اور دوسرے رسالے کے مرتب کا خیال ہے کہ ہندوستان میں تہذیب و تمدن کی ترقی محض خیالی ہے - اصلیت میں اس کا کوئی وجود نہیں (*)- اس کے الفاظ یہ ہیں - "یہ بہت دشوار ہے کہ دیسی لوگوں کی ذہنیت سے ان کے قدیم تعصبات علحدہ کئے جائیں اور ان خلاف فطرت رسوم کو معدوم کیا جاے جو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہیں- سواے اس کے کوئی صورت نظر نہیں آتی کہ خدا اپنی قدرت سے یکایک ہندوستان کے حالات بدل دے- یہ درست ہے کہ بعض مقامات پر اسکول اور کالج قایم کئے جارہے ہیں لیکن ان سے کوئی فائدہ نہیں - تھوڑی بہت تعلیم حاصل کرنے کے بعد جب کسی ہندوستانی کو لکھنا پڑھنا شُد بُد آجاتا ہے تو اس کی تمام تر کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ نوکری حاصل کرلے چاہے وہ ادنی درجے ہی کی کیوں نہ ہو- نوکری مل جانے کے بعد لکھنا پڑھنا سب ختم ہوجاتا ہے- اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت ان لوگوں کو علم حاصل کرنے کی سچی خواہش نہیں ہوتی- اگر کسی کو پڑھنے سے دلچسپی ہوئی تو وہ قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھتا ہے- مثلاً بدر منیر' بکاولی' اور باغ و بہار وغیرہ- فی الوقت اس کی کوئی توقع نظر نہیں آتی کہ ہندوستانی لوگ تاریخ' اخلاق اور فاسفه کی کتابوں کو رغبت کے ساتھ پڑھیں - دراصل ضرورت اس کی ہے کہ مذکورۂ بالا موضوعوں پر وہ کتابوں کا مطالعہ کریں- بڑے افسوس کی بات ہے کہ حکومت کی جانب سے دہلی میں سنه ۱۸۴۰ ع میں جو ترجموں کا سلسله شروع ہوا تھا وہ جاری نہ رہ سکا اور ان کی اشاعت کا کام

(*) رساله نمبر ۲۵ —

بند ہو گیا (*) "۔

پچھلے سالوں کي طرح اس سال بھی ۸ ذیقعدہ سنه ۱۲۸۴ هجری مطابق ۴ مارچ سنه ۱۸۶۸ ع کلکته کے ٹاؤن هال میں انجمن اسلام کا جلسۂ عام منعقد هوا - اس میں مختلف مضامین پڑھے گئے اور بعض نادرالوجود اشیا کی نمائش کی گئی - جلسے میں وائسرائے بهادر ' لفٹنٹ گورنر بنگال' دیسی امرا اور انگریزوں کے بعض سر بر آوردہ لوگوں نے شرکت کی - مدیر " اخبار عالم " نے اس امر پر اظهار تاسف کیا هے که وہ اس سالانه جلسے میں شریک نه هو سکے - موصوف کو انجمن کے مقاصد سے همدردی هے اور آپ نے اس کی اکثر موقعوں پر بهت تعریف کی هے اور یه خواهش ظاهر کی هے که کیا اچھا هوتا اگر هندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں اس قسم کی انجمنیں قایم هو جاتیں تاکه علوم و فنون اور ادب کو ترقی دی جائے اور هندوستان کے تمول و فلاح میں اضافه کیا جائے ۔

۱۳ مارچ کو بنگال کی " انجمن علم عمرانی " (Social Science Association) کا ایک جلسه کلکته میں منعقد هوا - اس جلسے میں دیسی امرا و روسا کے علاوہ بهت سے انگریزوں نے بھی شرکت کی جو سیول اور فوج دونوں صیغوں سے تعلق رکھتے تھے (+) - گزشته جون کے مهینے میں اس انجمن کے

(*) سنه ۱۸۴۰ ع میں میرے دوست ایف بوتروس (F. Boutros) پرنسپل دهلی کالج اور ان کے جانشین ڈاکٹر اے اسپرنگر کے زیر اهتمام انگریزی کتب کا اردو میں ترجمه شروع کیا گیا تھا اور حکومت نے اس کام کی سرپرستی اپنے ذمے لی تھی - چنانچه متعدد کتب کے تراجم شائع هوئے جن کی هندوستان میں اس وقت تک بهت قدر هوتی هے - افسوس هے که یه سلسله عرصے تک جاری نه رہ سکا - هماری خواهش هے کاش که پھر کوئی اس کام کو شروع کرے ۔

(+) اخبار عالم ' مورخه ۱۶ اپریل سنه ۱۸۶۸ ع ۔

" مجلۂ علمیہ " کا دوسرا نمبر شائع ہوا ہے۔ اس میں صدر جلسے کا خطبہ درج ہے اور اس کے علاوہ ملکی تجارت و صنعت' صفائی' تہوار اور اسی قسم کے دوسرے مسائل پر مضامین ہیں - ایک مضمون تعلیم مسلمانان ہند پر اور ایک تعلیم نسوان پر ہے - یہ مضامین اس لئے دلچسپی کا باعث ہیں کہ ان کے لکھنے والے خود ہندوستانی ہیں- ایک مضمون میں ریو رنڈ جے لانگ نے بنگال کی کہاوتوں کو جمع کر دیا ہے (*)-

اس انجمن نے متعدد اہم سوالات کا اعلان کیا ہے اور قابل اور اہل لوگوں سے ان کے جواب مانگے ہیں - ان سوالات کے ذریعے سے تعلیم و تعلم' لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس اور ایسے مدارس قایم کرنے کے لیے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے جہاں لڑکے اور لڑکیاں ساتھہ مل کر تعلیم حاصل کریں (†) —

سنہ ۱۸۶۱ ع میں مہاراجہ بنارس اور مہاراجہ وزیانگرم کے زیر سرپرستی ایک " مجلس مباحثہ " قایم ہوئی ہے جو ایک خالص علمی جماعت ہے- یہاں مذہبی اور سیاسی مسائل پر بحث کی اجازت نہیں ہے -اس میں اعلیٰ خاندانوں کے ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہیں جنھیں ہندو یا اسلامی ادب سے دلچسپی ہے-ان کے علاوہ بعض یورپین بھی اس مجلس میں شریک ہوگئے ہیں - اس مجلس کے جلسے ہفتہ وار منعقد ہوا کرتے ہیں اور مختلف مسائل پر تقریروں کا انتظام کیا جاتا ہے-تقریر کے بعد ارکان مجلس کو متعلقہ مسائل پر بحث و گفتگو

(*) ہوم ورڈ میل ' مورخہ ۶ مئی سنہ ۱۸۶۸ ع -

(†) انڈین میل ' ۲۷ فروری سنہ ۱۸۶۸ ع —

اجازت هوتي هے - جس طرح هماري يوروپين انجمنوں میں هوتا هے اس مجلس میں بهی ارکان کو اس کا پورا موقع حاصل رهتا هے که وه اپنے خیالات کی نشو و نما کرسکیں —

یه مجلس بهي "انستيتيوت آف فرانس" كي طرح پانچ حصوں میں منقسم هے : تعلیم ' عمرانی ترقي ' فلسفه و ادب ' علوم و فنون اور فنون - اس مجلس کے هر شعبے کا صدر یوروپین هے لیکن معتمدین هندوستانی هیں - بدقسمتی سے میں اب تک اس انجمن کی مطبوعات سے ناواقف هوں - میرے پیش نظر "مجله علمیه" کا بس ایک نمبر هے جس کے متعلق میں ذکر کرچکا هوں - اس میں سنه ۱۸۶۴ - ۶۵ ع کي رپورٹ شامل هے اور اس کے علاوه ۳۷ مضامین هیں جو سب کے سب ' سوائے ایک کے ' هندوستانیوں کے قلم سے لکھے هوے هیں - ان میں سے بیشتر مضامین اردو یا هندی میں هیں - سب مضمونوں کا کم و بیش اس موضوع سے تعلق هے که هندوستانی لوگوں کي ذهنی اور اخلاقی ترقی کے واسطے نئی راهیں نکالی جائیں —

ان مضامین کے بعض عنوان یه هیں : تعلیم نسواں کے فوائد ' پردے کی خرابیاں ' یوروپین لوگوں سے ملنے سے کیا علمی فائدے حاصل هوتے هیں ' هندوستان میں علوم طبیعی کی ترقی ' سنسکرت خطابت ' عربی فلسفه اور هندوؤں کی موسیقی وغیره - هندوستانی زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے حسب ذیل عنوان هیں : هندی کی اهمیت ' اردو کی ابتدائي کتب اور فارسی رسم الخط کا به مقابله رومن خط قابل ترجیح هونا - ماه جون میں انجمن کا جو جلسه منعقد هوا تها اس میں یه مسئله بهی زیر بحث رها که نوجوانوں کو جسماني ورزش کی اهمیت جتائی جائے

جیسے قدیم اہل یونان کا دستور تھا (*) —

ابھی حال میں اعلان ہوا ہے کہ لکھنو میں "انجمن تہذیب" کے نام سے ایک علمی اور ادبی حلقہ قایم ہوا ہے جس کے مقاصد کم و بیش وہی ہیں جو بنارس کی انجمن کے ہیں - اس انجمن میں عام سیاسی مسائل، قوانین، رسوم، علوم و فنون اور موجودہ ہندوستانی ادب کے متعلق بحث و گفتگو ہوا کرے گی - اس انجمن کے اصلی کارکن پنڈت اور منشی لوگ ہیں - اس انجمن کے معتمد شیو نرائن ہیں جنھوں نے اردو اور ہندی کے اخبارات سے درخواست کی ہے کہ وہ انجمن کی مطبوعات کے معاوضے میں انجمن کو اپنا اخبار بھیجا کریں —

اسی قسم کی متعدد انجمنیں ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں قایم کی جارہی ہیں یہ سب دراصل نتیجہ ہے اس تعلیم کا جو ہندوستانی لوگوں کو سرکاری یا مشن کے مدارس میں دی جارہی ہے - ان انجمنوں کے قیام سے یہ فائدہ ہوا ہے کہ اہل ہند میں تحقیق و جستجو کا مادہ پیدا ہو رہا ہے اور ان میں علم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو رہا ہے - + دہلی کی انجمن کے قواعد و ضوابط رسالہ "دہلی سوسائٹی" کے نام سے شائع ہوے ہیں - یہ قوائد و ضوابط اُردو میں ہیں اور پیارے لال نے انہیں ترتیب دیا ہے —

میرٹھ میں ایک "انجمن فلکیات" قایم ہوئی ہے جس میں ۵۰

(*) اودھ اخبار مورخہ ۲۳ جون سنہ ۱۸۶۸ ع —

+ Trubner's Literary Record مورخۂ فروری سنہ ۱۸۶۸ ع میں بھی اس قسم کی رائے کا اظہار کیا گیا ہے - میں اس رائے سے بالکل متفق ہوں —

ارکان شریک ہیں- اس کے قواعد و ضوابط میرے پیش نظر ہیں جو اُردو میں ہیں اور نہایت سلیس زبان میں لکھے گئے ہیں- فی الحال اس انجمن کی طرف سے ایک ماہوار رسالہ شائع ہوگا جس میں انجمن کی تمام کارروائیوں پر تبصرہ ہوا کرےگا- ارکان انجمن کا خیال ہے کہ کچھہ عرصے بعد ایک مستقل علمی مجلہ شائع کیا جاے گا—

لاہور ہندوستان کے اور دوسرے شہروں سے اپنی علمی و ادبی خدمت کے باعث سبقت لے گیا- یہاں پہلے سے ایک علمی انجمن موجود ہے اور اس کے علاوہ اور دوسری متعدد جماعتیں ہیں جو علم و ادب کی خدمت انجام دے رہی ہیں- "جامعۂ مشرقیہ" کے قیام کی وجہ سے اور زیادہ مدد ملے گی- مسٹر لیپل گرفن (Lepel Griffin) کا خیال ہے کہ وہ ایک "انجمن ہمالیہ" قایم کریں جس کے پیش نظر یہ مقصد ہوگا کہ ہمالیہ پہاڑ کے متعلق جہاں تک ممکن ہے معلومات فراہم کی جائیں- اس باب میں علم نسل، لسانیات، آثار قدیمہ اور مذہب کے متعلق خاص تحقیقات کی جاے گی—

لاہور میں ایک "انجمن حیوانات" بھی قایم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کے مختلف ممالک کے حیوانات کے نمونے جمع کئے جائیں اور ان کے خصائل و عادات کا مقابلہ اور تحقیق کی جاے—

میں سال گزشتہ اس عرض داشت کے متعلق ذکر کر چکا ہوں جو صوبجات شمال و مغربی کے ہندوستانی باشندوں نے کلکتہ یونیورسٹی کے نام بھیجی تھی جس کو سر اے گرانت ہندوستان کی کیمبرج سے تعبیر کرتے ہیں اس لئے کہ بمبئی یونیورسٹی ان کے نزدیک ہندوستان میں

بمنزلۂ آکسفورڈ ہے*- اس عرض داشت کا مضمون یہ تھا کہ جس طرح
مغربی علوم میں یونیورسٹی سند عطا کرتی ہے اسی طرح مشرقی علوم کے
لئے سند ہونی چاہئے- لیکن اس عرض داشت کو یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے
مسترد کر دیا- اب ان عرض داشت بھیجنے والوں نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ
اپنی علحدہ یونیورسٹی قایم کریں گے جس میں مشرقی علوم کی ہندوستانی
میں تعلیم دی جائے گی †- اس یونیورسٹی کو "مشرقی یونیورسٹی" کے
نام سے موسوم کیا جائے گا اس لئے کہ یہاں خاص کر قدیم ہند کی السنہ
و ادب کی تعلیم کا انتظام کیا جائےگا اگرچہ اس کے ساتھ دوسرے علوم
کی بھی تعلیم دی جائے گی- چونکہ تینوں صوبوں کی یونیورسٹیاں مغربی
طرز کی ہیں اور ان میں انگریزی میں تعلیم دی جاتی ہے' اس لئے
اپنی خصوصیت کے لحاظ سے اس کو مشرقی کہا جائےگا ‡- اگر اس یونیورسٹی
کو قائم کرنے میں کامیابی ہوئی تو پوری توقع ہے کہ ہندوستانی زبان
کی نشاۃ ثانیہ کے لیے راستہ صاف ہو جائے گا اور اُردو زبان میں مشرقی

---

* موصوف صوبۂ بمبئی کے ناظم تعلیمات تھے اور آج کل اڈنبرا یونیورسٹی
میں پرنسپل ہیں —

† دیکھئے "بنگال ایشیا تک سوسائٹی کی کارروائیاں" سنہ ۱۸۶۶ع صفحہ ۱۲۰-

‡ انگریز پرستی کے خلاف اسی وقت ہندوستان میں ایک رد عمل
نظر آتا ہے - واقعی یہ بات قابل افسوس ہے کہ ہندوستانیوں کو
انگریزوں سے بھی زیادہ صاحب بننے پر فخر ہوتا ہے اور ان کی جماعات
میں فاتحوں کی زبان اختیار کی جا رہی ہے- چنانچہ مولوی وحیدالدین
جو انگریزی تعلیم کے حامیوں میں سے ہیں اور جنہوں نے اپنے خرچ سے
چھوٹے بچوں کے لئے ایک مدرسہ بھی قایم کیا ہے جہاں انگریزی کی تعلیم
کا انتظام کیا گیا ہے' اس انگریز پرستی کے خلاف بطور مثال پیش
کئے جاتے ہیں—

مذاق کے مطابق محاوروں اور استعاروں کو باقی رکھتے ہوے مغربی خیالات کی ترویج ہو سکے گی - گویا اُردو مغربی خیالات کے ساتھہ تطابق کی کوشش کرے گی اور جدید تصورات و افکار کی بدولت ایک نئی زندگی وجود میں آئے گی ـــ

ہم سر ڈی مک لیوڈ لفٹننٹ گورنر پنجاب کے دلی طور پر ممنون ہیں کہ صاحب موصوف نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ ہندوستانیوں کی یہ کوشش بجا اور درست ہے کہ وہ اپنی اور اپنے آبا و اجداد کی زبان کو سرکاری نظام تعلیم میں کما حقہ اہمیت دلانا چاہتے ہیں- آپ نے فرمایا کہ سرکاری عہدہ داروں کو اپنی دیسی زبان پر پوری قدرت حاصل کرنی چاہئے بالخصوص وہ جن کے تفویض تعلیم دینے کا کام ہے ان کے لئے دیسی زبان سیکھنا ناگزیر ہے- اس کی یقیناً ضرورت ہے کہ بعض اُستادوں کو انگریزی کی مہارت حاصل ہو لیکن بہرحال عوام کی تعلیم ان کی زبان ہی میں ممکن ہے - وہ لوگ جو عوام کو تعلیم دینے کی غرض سے مقرر کئے جائیں ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ عوام کی زبان میں اظہار خیال کر سکیں تاکہ اس طرح سے مغربی اور مشرقی علوم کے امتزاج کی شکل پیدا ہوسکے - اگر یہ اساتذہ مشرقی کلاسک پر حاوی ہوں اور مشرقی نقطۂ نظر رکھتے ہوں تو وہ دراصل اُردو کے جدید ادب کو پیدا کر سکتے ہیں جو اہل مغرب اور اہل مشرق کے باہمی میل جول کے باعث جنم لے گا ـــ

میرے ایک پرانے شاگرد اسٹین کار (Stein Karr) نے جو کلکتہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں، جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر تقریر کرتے ہوے یونیورسٹی سنڈیکیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوے کہا تھا کہ اس میں

کوئی هرج نہیں که ایک چوتھی یونیورسٹی هندوستان کے کسی بڑے شہر میں قایم کی جاے اور لاهور کی مشرقی جامعه کے مجوزہ لائحۂ عمل کو اختیار کیا جاے - آپ نے هندوستان کے همدرد کی حیثیت سے یه الفاظ فرماے * "اس کی بظاهر کوئی وجه نظر نہیں آتی که سنسکرت میں لوگ ڈاکٹر کی ڈگری حاصل نه کریں' عربی میں تکمیل کی سند نه پائیں † اور هندی میں بی - اے نه کرسکیں - ان السنه کی بھی وهی قدر و قیمت هے جو انگریزی کی هے اور حقیقت یه هے که هندوستانیوں کے نزدیک ان زبانوں کی انگریزی سے زیادہ اهمیت هے - یه ایک خیال خام هے که انگریزی کبھی بھی سارے هندوستان کی مشترک زبان هوسکے گی - جس طرح مغلوں کی عمل داری کے ساتھه فارسی مٹ گئی ‡ کسے معلوم که انگریزی کا بھی یہی حشر نہیں هونے والا هے" ؟

لاهور میں جو مشرقی جامعه قایم کی گئی هے اسے خاطر خواہ کامیابی

* انڈین میل مورخه ۹ اپریل سنه ۱۸۶۸ ع -

† عربی کے ذکر پر مجھے یاد آیا که مسٹر هاول نے جو میرٹھه کے حلقے کے ناظر تعلیمات هیں' حکومت کے ایما پر ایک "عربی اردو" لغت تیار کرانا شروع کی هے - یونیورسٹی کے طلبه جو امتحانات کی تیاری کرتے هیں انہیں اس لغت سے بہت مدد ملے گی اور ان کے علاوہ هر هندوستانی اور هر مسلمان اس سے استفادہ کرسکے گا -

‡ میرے خیال میں یه دعوی پورے طور پر صحیح نہیں هے اس لئے که فارسی زبان هندوستان سے بالکل مٹ نہیں گئی - هاں فارسی میں لوگ گفتگو نہیں کرتے لیکن اب بھی فارسی میں لوگ اسی طرح هندوستان میں لکھتے هیں جیسے یورپ میں لاطینی میں -

ہو رہی ہے * - پنجاب ایک بڑا صوبہ ہے جس کی آبادی ایک کروڑ ۷۰ لاکھہ نفوس پر مشتمل ہے - مہاراجہ کشمیر نے اس جامعہ کے قیام کے لئے ایک لاکھہ روپے کی رقم عطا کی ہے - کشمیر وہی خطہ ہے جس کے متعلق طامس مور نے لکھا ہے " کون ہے جس نے وادی کشمیر کے گلابوں کا ذکر نہیں سنا جو دنیا میں اپنی نظیر آپ ہیں اور کون ہے جس نے وہاں کے مندروں ' غاروں ' اور چشموں کا ذکر نہیں سنا ہے جو ایسے صاف و شفاف ہوتے ہیں جیسے عاشق کی آنکھیں جس کے دل میں معشوق کی صورت بسی ہوتی ہے (لالہ رخ) - ہمیں پوری توقع ہے کہ پنجاب کے دوسرے والیان ملک مہاراجہ کشمیر کی تقلید کریں گے - مہاراجہ پٹیالہ نے بھی اس جامعہ کے قیام و استحکام کے لئے ۵۰ ہزار روپیہ کا عطیہ دیا ہے - راجہ جھند اور راجہ نابھا دونوں نے گیارہ گیارہ ہزار روپیہ دیا ہے - سردار صاحب کالسیا نے تین ہزار روپیہ دیا ہے - راجہ بلسپور اور رئیس ناہن دونوں نے پانچ پانچ سو روپے دیے ہیں - مہاراجہ کپورتھلہ نے دو ہزار روپے سالانہ دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب انہوں اس رقم کے علاوہ بھی دس ہزار روپے اور دیے ہیں - اور دوسرے والیان ملک نے بھی اپنا سالانہ چندہ بہ نسبت پہلے کے دو چند کردیا ہے اور بعضوں نے بڑی بڑی رقموں کا وعدہ کیا ہے - سب والیان ملک محسوس کر رہے ہیں کہ اس جامعہ کے قیام سے اہل ہند کی روشن خیالی میں اضافہ ہوگا - لاہور کے باشندوں نے بھی

---

* اس طرح ڈاکٹر لیٹنر کی خواہشیں پوری ہوں گی - موصوف آج کل دردستان کشمیر اور تبت ادنی کے متعلق تصانیف لکھنے میں مصروف ہیں - آپ ان علاقوں کی السنہ کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں جن کے متعلق کسی نے پہلے کوئی کام نہیں کیا - آپ کا خیال ہے کہ یہ السنہ سنسکرت سے نکلی ہیں -

اس جامعه کے ساتھه اپنی همدردی صرف زبانی جمع خرچ سے نہیں کی هے بلکه وه عملی طور پر چندے میں شریک هو رهے هیں اور اپنی دلچسپی کا اظہار کر رهے هیں * -

یه جامعه معلوم هوتا هے اب باقاعده قایم هو گئی هے - چنانچه " اوده اخبار " کے مطالعے سے معلوم هوتا هے که اس یونیورسٹی کی ایک کمیٹی بنادی گئی هے جس میں هندوستانی اور یورپین دونوں شریک هیں - اس کمیٹی میں ڈاکٹر لیٹنر به حیثیت رکن هیں - اس یونیورسٹی کی تحریک کے حامیوں کا ایک جلسه بتاریخ ۹ ستمبر لاهور میں منعقد هوا تها تاکه اس پر غور کیا جاے که لاهور کے گورنمنٹ کالج کی مجوزه یونیورسٹی کے نصاب کے متعلق همدردی کیونکر حاصل کی جاے اور اس کالج میں مشرقی علوم کی همت افزائی کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں - چنانچه فیصله یه هوا که اس کالج کو سوله سو روپے سالانه کی رقم دی جاے تاکه وهاں اردو اور فارسی کی تعلیم کا انتظام کیا جاے اور ان دونوں زبانوں کا شوق پیدا کرنے کی غرض سے طلبه کو وظائف دیے جائیں بشرطیکه حکومت اس رقم کی دگنی رقم اسی مقصد کے لئے کالج کو دینا منظور کرے -

صوبے کے مرکزی مقامات میں عجائب خانوں کے قایم کرنے کی جو تجویز تهی اس کے موافق لاهور میں ایک بڑا عجائب خانه قایم کیا گیا هے + گورنر جنرل بهادر نے آثار قدیمه کے متعلق ایک رپورٹ مرتب کرنے کی تجویز منظور کی هے جس میں هندوستان کے مختلف صوبوں کی ایسی

---

* صرف پچھلے جون کے مہینے میں لاهور کی پبلک نے نو سو گیاره روپے چندے کے لئے جمع کئے - هوم ورڈ میل مورخه ۱۴ ستمبر سنه ۱۸۶۸ ع -

+ اخبار عالم مورخه ۲۱ نومبر ۱۸۶۷ ع -

عمارتوں کا حال جو تاریخی اهمیت رکھتی هیں ' تفصیل سے درج هوگا - آثار قدیمه میں بعض تین هزار سال پرانے هیں حکومت اس امر کی کوشش کرے گی که ان کی حفاظت کا انتظام کیا جاے - ان آثار کی تصاویر بنائی جائیں گی اور ان کے بلاک تیار کراے جائیں گے —

کپتن هالرائڈ (Holroyd) جو ابھی حال میں پنجاب کے ناظم تعلیمات مقرر هوے هیں دس سال تک به حیثیت ناظر مدارس کام انجام دے چکے هیں - میجر فلر (Fuller) کی غیر موجودگی میں وہ نظامت کا کام کرچکے تھے - دراصل موصوف سے زیادہ اهل اس خدمت کے لئے اور کوئی نہیں مل سکتا - اپنے پیشرو کی رسم کے مطابق آپ نے ۲۵ مارچ کو دھلی کے دیسی مدارس کے طلبه کو تقسیم انعامات کے لئے ایک دربار منعقد کیا - اس موقع پر آپ نے هندوستانی میں نہایت روانی کے ساتھه ایک تقریر کی اور دوران تقریر میں میجر فلر اور مسٹر هٹن کے انتقال پر ملال کا خاص طور پر ذکر کیا جو دھلی کالج کے ڈائرکٹر تھے * -

پنجاب کی طرح صوبجات شمالی و مغربي کے باشندوں کي بھی یه تمنا هے که دھلی میں ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنا ڈالی جاےجہاں کے شاهی محلات آج ویران پڑے هوے هیں -

خیال یه هے که اس جامعه میں اردو میں تعلیم دی جاے گی اور اس زبان کی تحقیق کا خاص انتظام کیا جاے گا اور اس کو اس لایق بنانے کی کوشش کی جاے گی که وہ قدیم زبانوں کی جگه لے سکے - جدید تصانیف اور ترجموں کے ذریعے سے اس زبان کے خزانے کو مالا مال کیا جاے گا اور ایک

---

* هوم ورڈ میل مورخه ۴ مئی سنه ۱۸۶۸ ع -

نئے ہندی یورپی ادب کی بنا پڑے گی۔ آج کل صوبۂ دہلی کے لفٹننٹ گورنر سر ڈبلو میور ہیں جو خود ایک مشہور مستشرق ہیں جن کی تصانیف ہندوستان اور یورپ میں قدر و منزلت کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔ ہمیں پوری اُمید ہے کہ موصوف اس تجویز کے ساتھہ اتفاق کریں گے اور دہلی میں اس ہندی یونیورسٹی کے قیام کو ممکن بنانے میں ہر ممکن کوشش کریں گے —

کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی تینوں صوبجاتی، سرکاری، یونیورسٹیاں عافیت کے ساتھہ اپنے کام میں منہمک ہیں۔ نومبر سنہ ۱۸۶۷ع کے آخری ہفتوں میں بمبئی یونیورسٹی کے امتحانات میں تقریباً پانچ سو طلبہ نے شرکت کی۔ آبادی کو دیکھتے ہوے یہ تعداد بہت کافی ہے (*)۔ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانات میں شرکت کرنے والے طلبہ کی تعداد پندرہ سو نو ہے۔(+) یہ یونیورسٹی گیارہ سال سے قایم ہے۔ اس عرصے میں بارہ ہزار ایک سو اکستھہ طلبہ نے امتحانات میں شرکت کی۔ اس تعداد میں بنگالی، شمالی ہند اور سیلون کے طلبہ شامل سمجھنے چاہئیں (‡)۔ ان میں سے ایک ہزار دوسو

(*) پچھلے سال امتحان میں شرکت کرنے والے طلبہ کی تعداد ۴۴۰ تھی —

(+) گزشتہ سال امتحان میں شرکت کرنے والے طلبہ کی تعداد تیرہ سو پچاس تھی —

(‡) "اخبار عالم" مورخہ ۱۶ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع میں درج ہے کہ جن طلبہ نے امتیاز حاصل کیا ان میں یونیورسٹی کالج کا ایک طالب علم لال بہوری سنگھہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس طالب علم نے میرٹھہ کے مشن اسکول میں تعلیم پائی ہے اور وہ "اخبار عالم" کے لئے انگریزی مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا کرتا تھا۔ اس نوجوان ہندو کی ذہانت اور ادبی ذوق اعلیٰ درجہ کا ہے —

اٹھائیس طلبہ ہندو تھے ' ایک سو تین عیسائی تھے' اٹھاون مسلمان اور ایک سو بیس چھوٹے چھوٹے مذہبی فرقوں سے تعلق رکھنے والے تھے (*) - یہ سب طلبہ ہندوستانی زبان سے واقف تھے لیکن ان میں سے بعض نے اردو ' بعض نے ہندی (+) ' بعض نے بنگالی ' چند نے فارسی ' عربی یا سنسکرت ' بعض نے انگریزی اور بعض نے لاطینی کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیا تھا - اس سال بی اے کی ڈگری کے لئے دو سو گیارہ طلبہ امتحان میں شریک ہوے حالانکہ سال گزشتہ صرف ایک سو اکتالیس شریک ہوے تھے —

۹ - دسمبر سنہ ۱۸۶۷ ءکو بنارس میں جو یونیورسٹی کا امتحان ہوا اس میں طلبہ کو انگریزی میں مضمون لکھنے کے لئے حسب ذیل موضوع دیے گئے جو یقیناً نوجوان ہندوستانیوں کے لئے اس لئے اور بھی زیادہ دشوار ہونے چاہئیں کہ انگریزی ان کی مادری زبان نہیں ہے " (‡) - "خدا نے دیہات پیدا کیا اور انسان نے شہر بنایا " (‡‡) - "کیا یہ درست ہے کہ اگر کسی گناہ کے برے نتائج نہ ظاہر ہوں تو وہ گناہ نہیں ہے " —

سر اسٹفورڈ نارتھ کوٹ نے اپنی جیب خاص سے کلکتہ یونیورسٹی کو دو ہزار روپے کا عطیہ دیا ہے تاکہ اس سے ان طلبہ کو وظیفہ دیا جاے جو بنگال ' صوبۂ شمالی و مغربی ' پنجاب اور اودھ کے علاقوں میں داخلۂ یونیورسٹی سنہ ۱۸۶۹ ع کے امتحان میں اعلیٰ درجہ پر کامیاب ہوں —

(*) فرینڈ آف انڈیا (ہوم ورڈ میل مورخہ ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع) —

(+) اس سال کلکتہ یونیورسٹی کے اردو کے ممتحن ڈاکٹر ایچ بلوکمان اور ہندی کے بابو کرشن کمال بھٹا چارجی مقرر ہوے ہیں —

(‡) انڈین میل مورخہ ۲۰ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع —

(‡‡) ایضاً —

سرجان لارنس بہ حیثیت وائسرائے ہندوستان میں بہت ہردلعزیز تھے- ان کے جانے کے بعد لارڈ میو وائسرائے مقرر ہوے ہیں - ہمیں پوری توقع ہے کہ موصوف بھی ویسی لوگوں میں ہردلعزیزی حاصل کرلیں گے - آپ نے پہلا کام یہ کیا ہے کہ اپنی مجلس عاملہ سے اس کی منظوری حاصل کی ہے کہ ہر سال نو ہندوستانی طلبہ بغرض تعلیم انگلستان بھیجے جایا کریں اور ان کی تعلیم کے جملہ اخراجات حکومت برداشت کرے - یہ طلبہ انگلستان کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کریں گے اور اپنے دوران قیام میں سول سروس یا کسی اور حکومتی شعبے کے لیے تیاری کریں گے - ہر صوبے سے دو طلبہ منتخب کئے جایا کریں گے - صوبۂ شمال مغربی سے ایک اور ایک سال چھوڑ کر پنجاب سے ایک طالب علم لیا جائے گا - اسی طرح ایک صوبۂ اودھ سے اور ایک صوبۂ متوسط سے - چھ طالب علموں کو حکومت خود چنا کرے گی - باقی تین مقابلے سے لئے جائیں گے - یہ تینوں پریزیڈنسیوں کے طلبہ ہوں گے (*) —

' اخبار عالم ' مورخہ ۶ فروری سنہ ۱۸۶۸ ع میں مختلف صوبوں کی تعلیمی حالت کے متعلق تعداد و شمار دیے ہیں (†) - ہندوستان کی سنہ ۱۸۶۵ع کی تعلیمی حالت حسب ذیل ہے —

(*) ہوم ورڈ میل ' مورخہ ۱۰ اگست سنہ ۱۸۶۸ ع —

(†) اسی نمبر میں یہ بھی ہے کہ مہاراجہ جے پور نے صنعت و حرفت کا ایک مدرسہ قایم کیا ہے - اس کے لئے ضروری کتابیں اور سائنٹفک آلات یورپ سے منگائے جائیں گے - انڈین پبلک اوپینین میں ہے کہ اسی قسم کے چار اور مدرسے ہندوستان کے مختلف حصوں میں قایم ہونے والے ہیں - ان میں سے ایک لاہور میں ہوگا —

بنگال (*) : ۲۷۰۴ مدارس ' ۱۱۷۶۴۴ طلبه ' ۲۲۰ مدارس نسوان ' ۵۷۱۲ طالبات
صوبه شمال مغربی: ۹۱۸۴ مدارس' ۱۹۹۲۶۹ طلبه' ۵۷۴ مدارس نسوان ۱۰۷۰۳ طالبات
پنجاب : ۲۹۶۵ مدارس' ۱۰۱۹۹۳ طلبه ' ۱۰۲۹ مدارس نسوان ' ۱۹۵۶۱ طالبات
مدارس (+) : ۱۲۴۵ مدارس ' ۳۸۲۵۵ طلبه ' ۱۳۹ مدارس نسوان ' ۳۳۱۵ طالبات
بمبئی : ۱۴۱۹ مدارس ' ۹۹۸۵۶ طلبه' ۶۵ مدارس نسوان' ۲۴۳۶ طالبات
اوده : ۱۶۸ مدارس ' ۱۰۰۷۵ طلبه ' ۱۸ مدارس نسوان' ۴۰۶ طالبات
صوبه متوسط: ۱۴۳۶ مدارس' ۴۶۵۸۵ طلبه' ۹۲ مدارس نسوان' ۲۳۶۱ طالبات
میسور : ۸۰ مدارس ' ۵۵۸۳ طلبه ' ۷ مدارس نسوان' (‡)
کل تعداد: ۱۹۲۰۱ مدارس' ۶۱۹۳۶۰ طلبه ' ۲۱۴۴ مدارس نسوان' ۴۴۵۵۴ طالبات

گزشته جولائي میں سر ولیم میور(Muir) کمایوں کے پہاڑی علاقے میں تشریف لے گئے تھے- آپ نے اس علاقے کے ان مدارس کا معائنه کیا جو للدن کے مختلف مشنوں کے خرچ پر چلائے جاتے ھیں - آپ نے مدارس میں انعامات تقسیم کیے-ان درسگاھوں میں ایک ھندوستاني مدرسه

(*) انگریزی اخبار " اکسپرس " میں جو اعدادو شمار شائع ھوئے ھیں وہ ان سے مختلف ھیں - غالباً وہ سنه ۱۸۶۶ ع کے ھوں گے - اس کے مطابق مدارس کی تعداد دو ھزار نو سو آتھه ہے اور طلبه کی تعداد ایک لاکھه اکیس ھزار چارسو اسی ہے —

(+) سنه ۱۸۶۷ ع کی سرکاری رپورٹ دیکھنے سے معلوم ھوتا ہے که صوبۂ مدراس میں تعلیم کو خوب ترقی ھورھی ہے - مارچ کے آخر میں وھاں مدارس کی تعداد ایک ھزار تین سو چھیاسی تھی اور طلبه کی تعداد ۵۱ ھزار ایک سو آتھه تھی- ان میں سے ۳۸ ھزار چھه سو اتھاسی ھندو تھے ' ایک ھزار آتھه سو بائیس مسلمان تھے اور باقی میں یورپین' یورشین اور دیسی عیسائی شامل تھے —

(‡) میسور کی طالبات کی تعداد معلوم نہیں —

ہے ' ایک انگریزی اسکول ہے جس میں صرف لڑکوں کو تعلیم دی جاتی ہے ' ایک میں صرف لڑکیوں کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے اور ایک مدرسہ ہے جس میں ہر اتوار کے دن مسیحی عقاید کی تعلیم دی جاتی ہے - ہندوستانی مدرسے میں ۱۲۵ طالبہ ہیں اور انگریزی اسکول میں سو ہیں - سرولیم میورجب ہندوستانی مدرسے میں تشریف لے گئے تو اس موقع پر آپ نے ہندوستانی (اردو) میں تقریر کی اورہندوستانی طلبہ کو بعض نصیحتیں کیں اور بتلایا کہ انگریزی زبان اور مغربی لبرل علوم کے سیکھنے سے ان کو کیا کیا فوائد حاصل ہوں گے —

اہل یورپ کی آمد سے پہلے ہندوستان میں ایشیا کے دوسرے ممالک کی طرح تعلیم نسوان کی طرف مطلق کوئی توجہ نہیں کی جاتی تھی - در اصل تعلیم نسوان کی طرف سے بے توجہی کا ایک نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اہل یورپ کے مقابلے میں اہل مشرق ہر اعتبار سے پست ہوتے ہیں - جیسا کہ ٹینیسن نے کہا ہے " جو چیز طبقۂ نسوان کے لیے فائدہ بخش ہے وہ یقیناً مرد کے فلاح و بہبود کا باعث ہوگی ' عورت اور مرد دونوں قعر مذلت میں بھی ساتھ کرتے ہیں اور ساتھ ہی دیوتاؤں کی سی عزت حاصل کرتے ہیں - آزاد بھی ساتھ ہوتے ہیں اور غلام بھی ساتھ ہوتے ہیں " —

در اصل حکومت نے تعلیم نسوان کی جو ہمت افزائی شروع کی ہے اس سے ہندوستانیوں کا فائدہ ہے - حکومت کی طرف سے اس کا انتظام کیا گیا ہے کہ تقاریر کے ذریعے تعلیم نسوان کی تحریک کو فروغ دیا جائے - چنانچہ سنہ ۱۸۵۱ ع سے جب سے کہ حکومت نے اس جانب توجہ کی ہے ' عورتوں میں تعلیم کا رواج برابر بڑھتا جاتا ہے - حکومت اپنے خرچ

سے معلمات کے لئے نارمل اسکول قایم کرا رهی هے اور اس وقت کلکته، بمبئی اور مدراس کے صوبوں میں متعدد نارمل اسکول موجود هیں * -

باشندگان بمبئی تعلیم نسوان کے باب میں به نسبت اور دوسرے هندوستانیوں کے زیادہ پیش پیش رهے هیں اور ان کی ذهنی اور اخلاقی اصلاح کے لئے برابر کوشاں رهے هیں - چنانچه ان کی همدردی کا عملی ثبوت یه هے که گزشته سترہ سال میں انهوں نے اپنے بل بوتے پر ۶۶ اسکول لڑکیوں کی تعلیم کے لئے قایم کئے هیں جن میں اس وقت تقریباً چار هزار لڑکیاں تعلیم حاصل کر رهی هیں† - یه بات بھی اس ضمن میں قابل لحاظ هے که تعلیم اور خیرات کے کاموں میں بمبئی کے باشندوں میں پارسی لوگ سب سے زیادہ حصه لیتے هیں اور بهت سے مدرسوں کے اخراجات کا انحصار تمامتر انهیں پر هے -

لیکن "اخبار عالم" کے مدیر کا خیال هے که بنگال میں به نسبت هندوستان کے اور دوسرے علاقوں کے تعلیم نسوان کو زیادہ فروغ هو رها هے ‡ - اپنے اس دعوے کی تائید میں موصوف نے آٹھ ایسی عورتوں کے نام گنائے

---

* ناگپور میں بھی ایک نارمل اسکول هے جہاں دیسی معلمات کو تیار کیا جاتا هے - اس وقت ۲۵ هندوستانی لڑکیاں یہاں تعلیم پا رهی هیں - ایک مسلمان خاتون نے جو حاجی بھی هیں، اسی شہر میں مسلمان لڑکیوں کے لئے ایک مدرسه قایم کیا هے - موصوفه نہایت روشن خیال اور تعلیم یافته هیں اور اردو اور مرهٹی لکھ پڑھ سکتی هیں -

† اخبار عالم - ۱۹ مارچ سنه ۱۸۶۸ع -

‡ اخبار عالم مورخه ۲۳ - جولائی سنه ۱۸۶۸ ع

ہیں جن کي تصانیف کو خاص شہرت حاصل ہوئی ہے - یہ سب کی سب ہندو عورتیں ہیں - ان میں سے ایک پٹنہ کي ہیں، ایک بسنت پور کی ہیں اور باقی چھہ کلکتہ کي ہیں* —

جسٹس فیر نے بیتھوون سوسائٹی کے جلسے میں گزشتہ سال تعلیم نسوان کے موضوع پر خطبہ پڑھا تھا - آپ نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا کہ عورتوں کو خود عورتیں تعلیم دیں اس لئے کہ ایسے بہت سے مدارس ہیں جہاں لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں اور ان کے منتظم برہمن لوگ ہوتے ہیں - اس قباحت کو دور کرنے کی بس یہی ایک صورت ہے کہ معلمات کے لئے نارمل اسکول قایم کئے جائیں - یہاں کی فارغ التحصیل معلمات کے ہاتھہ میں لڑکیوں کی تعلیم دی جا سکتی ہے -

صوبۂ شمال مغربی کے ناظم تعلیمات مسٹر کمپسن [Kempson] کي پر جوش مساعي کی بدولت وہاں بھی تعلیم نسوان کو برابر ترقی ہو رہی ہے - اس وقت صرف بریلی میں لڑکیوں کے پندرہ مدرسے ہیں - ان میں دوسو چھیاسی لڑکیاں تعلیم پا رہی ہیں - اس امر کا بھي فیصلہ ہوگیا ہے کہ مسلمان لڑکیوں کو اردو میں تعلیم دی جائے گي اور ہندو لڑکیوں کو ہندی میں - اردو اور ہندي دونوں ہندوستانی کي شاخیں ہیں - دونوں کے درمیان بس طرز تحریر کا فرق ہے - یہ فرق ہندوستانیوں کے مذہبی اختلاف پر مبنی ہے - جس کي نسبت میں بارہا تذکرہ کر چکا ہوں - ان مدرسوں میں استانیاں کام کرتی ہیں اور ان کے کام کی نگرانی بھی عورتیں کرتی ہیں - ہندوستانی

---

* ہوم ورڈ میل مورخہ ۱۳ - جنوری سنہ ۱۸۶۸ع -

استانیوں کو، چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، یہ بات پسند نہیں کہ مرد لوگ اور وہ بھی یوروپین معائنے کے لئے ان کے مدرسوں میں آئیں۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی ناظران کے مدرسے کے معائنے کے لئے آتا ہے تو انہیں بہت ناگوار ہوتا ہے اور بعض اوقات وہ اپنی بے بسی پر آبدیدہ ہوجاتی ہیں۔ چنانچہ بنگلور کی مثال موجود ہے۔ یہاں کے نارمل اسکول کے معائنے کے لئے جو ابھی حال ہی میں قایم ہوا ہے مسٹر رائس، ناظر تعلیمات میسور گئے تھے۔ موصوف نے اپنے معائنے کے وقت استانیوں اور طالبات کو ہر طرح سے اطمینان دلایا اور لڑکیوں کے لئے مٹھائی تقسیم کرائی جو انہیں بہت مرغوب ہوتی ہے* —

مس کارپنٹر نے اپنی کتاب "ہندوستان میں چھہ ماہ"‡ میں تعلیم نسوان کے متعلق بعض دل چسپ تفصیلات دی ہیں جنہیں پڑھ کر ہر اس شخص کو خوشی ہوگی جو ہندوستان کے معاملات کے ساتھہ دل چسپی رکھتا ہے۔ موصوفہ نے بھی معلمات کی نہایت زوردار حمایت کی ہے اور لکھا ہے کہ نوجوان لڑکیوں کی تعلیم بغیر اس کے نہیں ہوسکتی جب تک نئے نارمل اسکول معلمات کی تعلیم کے لئے نہ قایم کئے جائیں۔ چنانچہ موصوفہ کی اس حمایت نیز بعض سر بر آوردہ

---

* بنگلور ہیرلڈ، مورخہ ۸- اپریل سنہ ۱۸۶۸ع (دی ٹائمز آف انڈیا)۔

‡ اس کتاب پر میں نے مجلۂ مشرقی میں ایک مضمون بھی لکھا ہے جو ابھی شایع ہوا ہے۔

ہندوستانیوں کی کوشش کا یہ نتیجہ نکلا کہ حکومت نے خاص اس غرض کے لئے بارہ ہزار روپے سالانہ کی رقم منظور کی ہے تاکہ صوبوں کے صدر مقامات یعنی کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں نارمل اسکول قایم کئے جائیں -

مس کارنپٹر ستمبر میں پھر ہندوستان تشریف لے گئی ہیں تاکہ اس کام کی تکمیل کی کوشش کریں جس کی جانب حکومت نے بھی توجہ مبذول کی ہے - پر جوش نوجوانوں کا ایک وفد ترتیب دیا گیا ہے تاکہ بمبئی پہنچنے پر ان کا استقبال کرے - موصوفہ کا ارادہ ہے کہ اپنا دورہ احمدآباد سے شروع کریں - جو گجرات کا قدیم دارالسلطنت ہے اور جہاں موصوفہ کا خیال ہے کہ ان کی تجاویز کو سب سے زیادہ کامیابی کی اُمید ہے - ہندوستانی عورتوں کی زندگی کو سدھارنے اور اسے بہتر بنانے کے لئے مس کارنپٹر جس خلوص کا اظہار کر رہی ہیں وہ واقعی قابل داد ہے - اس کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ موصوفہ مذہبی معاملات میں مطلق کسی قسم کا دخل دینا نہیں پسند کرتیں - یہ کام انہوں نے مشنری لوگوں پر چھوڑ دیا ہے جن کا فرض ہے کہ اپنی تعلیم کے ذریعے ہندوستانیوں کے دلوں کو رام کریں اور مغربی تہذیب و تمدن کے دروازوں کو ان کے لئے کھول دیں -

مسز آر کلارک کے خط سے معلوم ہوا کہ امرتسر میں تعلیم نسوان کی بتدریج ترقی ہو رہی ہے - موصوفہ نے سنہ ۱۸۶۵ ع میں اس شہر میں زنانہ اسکول قایم کیا تھا - ابھی حال میں آپ نے عورتوں کے لئے ایک نارمل اسکول کی بنا ڈالی ہے تاکہ مدارس ابتدائی میں تعلیم ختم

کر چکنے کے بعد ان کے لئے تعلیم کا انتظام ہوجائے جو آیندہ پڑھانے کا کام کرنا چاہتی ہیں۔ مدارس ابتدائی میں جغرافیہ، تاریخ ہند، ریاضی اور صرف ونحو کی تعلیم دی جاتی ہے۔ املا کی مشق کرائی جاتی ہے : کانے اور کشیدہ کا کام سکھایا جاتا ہے۔ امرتسر کے مدارس ابتدائی کے طلبہ کی تعداد اس وقت پچیس ہے۔ مسز کلارک لکھتی ہیں کہ "یہ تعداد بہت حقیر معلوم ہوتی ہے لیکن یہ لحاظ رہے کہ ابھی کام کی ابتدا ہوئی ہے"۔

تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو موجودہ سرکاری نصاب تعلیم کو اچھا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ ۱۸ اگست سنہ ۱۸۶۸ع کے "اودھ اخبار" میں اس کے خلاف ایک طویل مضمون درج ہے۔ اس مضمون میں صراحت کے ساتھ اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ ہندوستانی اور یورپین نقطہ ہائے نظر میں زمین آسمان کا فرق ہے ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کا ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ جس کی وجہ سے خود ان کا نقطۂ نظر بالکل پس پشت نہ ڈالدیا جائے۔ اس مضمون کے الفاظ یہ ہیں! ' دراصل ہر ملک کی ذہنی صلاحیت برابر ہوتی ہے لیکن مختلف ملکوں کے باشندوں کے خیالات میں اختلاف ہوتا ہے اور ان خیالات کو ظاہر کرنے کے طریقے جداگانہ ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً اہل مشرق اہل مغرب کی طرح، اپنے خیالات کو سیدھے سادے الفاظ میں ظاہر کرنا پسند نہیں کرتے بلکہ وہ تشبیہ و استعارہ کثرت سے استعمال کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ اگر اہل یورپ کے خیالات آب و رنگ اور مبالغے کے ساتھ ان کے سامنے پیش نہ کئے جائیں تو وہ

انہیں قبول کرنے میں پس و پیش کریں گے۔ چنانچہ ہندوستانیوں کو تعلیم دینے میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ اگر تاریخ ہندوستان میں صرف عہدوار اور بڑے بڑے لوگوں کے ناموں کا ذکر ہوگا جیسا کہ اکثر ابتدائی کتابوں میں ہوتا ہے تو اس سے کچھ حاصل نہ ہوگا بلکہ ضرورت اس کی ہے کہ کتاب کا طرز تحریر ایسا ہو جو جاذب توجہ اور دل کش ہو تاکہ ہندوستانی ذہنیت کو اپیل کرسکے۔

ٹیگور کے ادبی مضامین

از

(پنڈت ونشی دھر ودیا النکار صاحب)

احساس حسن

عمر کے پہلے دور میں "برھم چریہ" (تجرد کی زندگی) کے ذریعے زندگی کو باقاعدگی اور ریاضت سے نشو و نما دینا چاھئے - اگر ھندوستان کی اس پرانی نصیحت پر عمل کیا جاے تو بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیال پیدا ھوگا کہ یہ تو بڑی کٹھن منزل ھے اس کی بدولت انسان یا تو بڑا شہ زور بن سکتا ھے یا نفسانی قیود سے آزاد ھوکر کوئی بڑا مہا تما بن سکتا ھے - لیکن اس ریاضت میں لذت کی گنجائش کہاں ھے' ادبیات' مصوری اور موسیقي کہاں چلی گئی؟ جب ھر اعتبار سے انساني ترقی کا خیال رکھا جاے تو حسن کی بحث کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا -

یہ درست ھے حسن؛ لازمی ھے - ریاضت کا منشا خود کشی ھوھي نہیں سکتا - ریاضت کا منشا تو روح کی نشو و نما ھے - حقیقت میں طالب علمی کے زمانے میں برھم چریہ (تجردانہ زندگی) کو قایم رکھنا خشک اور لاحاصل ریاضت نہیں ھے - کسان کسی کھیت کو بنجر زمین بنانے

کے لئے مر مر کر محنت نہیں کرتا بلکہ وہ جب ہل سے کھیت کی زمین کھود ڈالتا ہے، سہاگے سے ڈھیلوں کو کچل کر زمین مسطح کردیتا ہے اور کُھرپی سے گھاس اور چھوٹے چھوٹے پودوں کو اُکھاڑ کر کھیت کو بالکل صاف کر دیتا ہے تو ممکن ہے اناڑی لوگ یہ خیال کریں کہ زمین پر ظلم ہو رہا ہے - لیکن پھلوں کی نشو و نما اسی طرح کرنی پڑتی ہے - اسی طرح صحیح طور پر لذت کا حقدار ہونے کے لئے ابتدا میں کٹھن کھیتی کی ضرورت ہوتی ہے ' لذت کے راستے ہی میں گمراہ کرنے والی بہت سی رکاوٹیں ہیں- جو شخص ان تمام مصائب سے بچکر معراج کمال پر پہنچتا ہے باقاعدگی اور ریاضت کی اسی کو زیادہ ضرورت پڑتی ہے - لذت کے لئے ہی اس تلخی کو گوارا کرنا پڑتا ہے -

اِنسان کی یہ بد قسمتی ہے کہ اس کا مطمح نظر اکثر اسباب حصول میں دب جاتا ہے - وہ گانا سیکھنا چاہتا ہے' اُستادی سیکھ بیٹھتا ہے - دولت مند ہونا چاہتا ہے لیکن روپیہ جمع کر کے قابل رحم ہوجاتا ہے - ملک کی اصلاح چاہتا ہے مگر کمیٹیوں میں صرف رزولیوشن پاس کرکے خود کو سبکدوش سمجھنے لگتا ہے —

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ باقاعدگی اور ریاضت اصلی مقصد کی جگہ لے لیتے ہیں - جو لوگ باقاعدگی اور ریاضت ہی کو منزل مقصود اور ثواب سمجھتے ہیں وہ ان کی ہوس میں لوبھی بن بیٹھتے ہیں اور یہ باقاعدگی اور ریاضت کا لالچ انسان کے چھ * دشمنوں کے علاوہ ساتواں دشمن بن جاتا ہے —

* ہندو شاستروں کے مطابق انسان کے چھ دشمن ہیں - کام (جذبات بہیمی) کرود (غصہ) لوبھ (لالچ) موہ (دنیا سے دلبستگی) اہنکار (غرور) متسر (حسد) -

یہ انسان کی حماقت کی تعریف ہے کہ وہ جب کسی چیز کے جمع کرنے پر آتا ہے تو دم لینا نہیں چاہتا - ولایت کے بعض لوگوں کے متعلق یہ سنا جاتا ہے کہ وہ دیوانوں کی طرح ملک ملک کے ڈاک کے مستعملہ ٹکٹ جمع کیا کرتے ہیں اور اس کام کے لیے تلاش اور خرچ کرنے میں زرا کمی نہیں کرتے - اسی طرح بعض لوگ جمع کرنے کے نشے میں دیوانے بن کر چینی برتن اور پرانے جوتوں کے اکٹھا کرنے میں لگے ہوے ہیں - منطقۂ شمالی میں جاکر وہاں عین وسط میں جھنڈا گاڑ دینا یہ بھی ان کی اسی قسم کی حرکت ہے - وہاں برفانی طبقوں کے سوا اور کچھہ نہیں لیکن دل نہیں مانتا کہ آگے نہ بڑھے - وہ منطقے کے وسطی حصے کے جس قدر قریب جا پہنچا ہے اسی مقدار سے اسے نشہ چڑھا ہوتا ہے - جو شخص پہاڑ پر جتنے فٹ اونچا چڑھا ہے وہ اُسی کو ایک کمال سمجھتا ہے - اس لا حاصل مقصد کے لیے بعض لوگ خود مرجاتے ہیں اور کتنے ہی مزدوروں کو اپنے ساتھہ لے مرتے ہیں اور پھر بھی رکنا نہیں چاہتے —

فضول خرچی اور تکلیف جس قدر زیادہ ہوتی ہے بے معنی اور لاحاصل کامیابی کی عظمت بھی اتنی ہی بڑی معلوم ہوتی ہے - باقاعدگی اور ریاضت کا لالچ بھی تکالیف کی مقدار اور وسعت کے موافق خوشی محسوس کرتا ہے - اگر سخت بستر پر سونے سے ریاضت کی ابتدا کی جاے تو مٹی پر بچھونا بچھا کر ' پھر صرف کمل بچھا کر اور پھر کمل کو بھی چھوڑ کر بالکل مٹی پر سونے کا لالچ رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے - ریاضت کو مقصود بالذات سمجھہ کر آخر خودکشی تک نوبت آجاتی ہے - اس کا منشا اس کے سوا کچھہ نہیں کہ صرف زہد و تقوی کی طرف دنیا کو مائل کیا جاے گویا گلے کی پھانسی کو توڑنے کی کوشش میں اس پھانسی

کو اور تنگ کرکے مرنا ہے —

اس لیے اگر ریاضت ہی کو مقصد قرار دے لیا جاے تو سختیوں کا دباؤ اس قدر بڑھ جاے گا کہ فطرت میں سے حسن کا احساس بالکل مفقود ہوجاے گا - اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہے لیکن کمال ارتقا کے حصول کو مقصد بنا کر اگر ریاضت کی رفتار کو ٹھیک طور پر قابو میں رکھا جاے تو انسانیت کے اعضا میں سے کسی عضو کو بھی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ وہ تندو مند ہوجاتے ہیں —

بات یہ ہے کہ ہر قسم کی بنیاد سخت ہوا کرتی ہے اگر وہ سخت نہ ہوتو بوجھ نہیں سہار سکتی - جو چیز کسی شکل کو اختیار کرتی ہے یا کسی چیز کو مُشکّل کرتی ہے وہ سخت ہی ہوتی ہے - انسان کا جسم کتنا ہی نرم کیوں نہ ہو اگر سخت ہڈیوں پر اُس کا ٹکاؤ نہ ہوتا تو وہ محض مضغۂ گوشت ہی ہوتا اوراس کی کوئی شکل نہ ہوتی - اسی طرح علم کی بنیاد بھی سخت ہے اور مسرت کی بنیاد بھی سخت اگر علم کی بنیاد سخت نہ ہوتی تو وہ محض ایک غیر مسلسل خواب ہوتا اور اگر مسرت کی بنیاد سخت نہ ہوتی تو وہ پاگل پن کا ایک مجنونانہ کھیل ہوتا —

یہی سخت بنیاد ریاضت ہے - اس میں سوچنے کی قوت ہے ' طاقت ہے اور سخت استحکام ہے - یہ دیوتا کے مانند ایک ہاتھ سے فیض بخشتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے مار ڈالتی ہے - یہی ریاضت کسی شے کے قائم کرتے وقت جیسی مضبوط ہوتی ہے توڑنے کے وقت بھی ویسی ہی سخت رہتی ہے - حسن سے پوری طرح لذت اندوز ہونے کے لیے اسی ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ اگر ہماری حرکات ہمارے قابو میں نہ ہوں

تو جس طرح بچہ کھانے کی تھالی کو لے کر روٹی اور ترکاری وغیرہ کو صرف جسم پر مل کر اور مٹی میں بکھیر کر سب تتر بتر کرڈالتا ھے اور اُس کے پیٹ میں بہت ھی تھوڑا جاتا ھے، ٹھیک یہی حالت ھماری اُس سامان کے ساتھہ ھوتی ھے جس سے ھم لذت اندوز ھونا چاھتے ھیں- ھم صرف اُسے اپنے جسم پر چپڑ لیتے ھیں، لذت بخش نہیں بنا سکتے —

حسن کو وجود میں لانا بھی بے قابو تخیل کا کام نہیں ھے - سارے گھر میں آگ لگاکر کوئی شام کا دیا نہیں جلاتا- آگ آسانی سے بے قابو ھوجاتی ھے اس لئے گھر میں روشنی کرتے وقت آگ کو قابو میں رکھنا چاھیئے- دنیا کے میلان کے متعلق بھی یہی بات ھے - دنیاوی میلان کی آگ کو اگر ھم ایک دم پوری طرح جل اُٹھنے دیں تو جس حسن کو صرف رنگین بنانے کے لئے اس میلان کی ضرورت تھی اُسے وہ جلا کر خاک کرڈالتی ھے - یہی میلان پھول چننے کے لئے جاتا ھے اور انہیں توڑ کر خاک دھول میں ملا دیتا ھے -

یہ بات سچ ھے کہ ھمارا بھوک کا میلان دنیا میں جہاں دستر خوان بچھا کر بیٹھہ جاتا ھے اُس کے نزدیک ھی اکثر حسن کا ایک جلوہ نظر آتا ھے - پھل سے صرف ھمارا پیٹ ھی نہیں بھرتا بلکہ وہ لذت میں، بو میں اور شکل میں بھی اچھا ھوتا ھے - اگر وہ مطلق خوش نما نہ ھوتا تو بھی ھم اُسے پیٹ بھرنے کے لئے کھاتے - ھماری اتنی اھم ضرورت کے ھونے پر بھی وہ صرف پیٹ بھرنے کے ھی خاطر نہیں بلکہ حسن سے لذت اندوز ھونے کے خیال سے بھی ھم کو مزہ دیتا ھے - یہ فائدہ ھماری ضرورت کے علاوہ ھے -

دنیا میں حسن کی شکل میں یہ جو ھماری بالائی آمدنی ھے وہ

ہمارے دل کو کس طرف لے جا رہی ہے ؟ اس کی کوشش یہ ہے کہ ہمارے دل کا پھندا ڈھیلا ہوجائے اور بھوک کی سیری کی خواہش ہی ہمارا معبود یا واحد مقصد نہ بن جائے - تیز بھوک آگ بگولا ہو کر کہہ رہی ہے کہ تمہیں کھانا ہی پڑے گا ' میں اور کچھہ سننا نہیں چاہتی- اُس وقت حسن مسکراکر امرت برساتا ہوا ہماری اہم ضرورت کی غصیلی سرخ آنکھوں کو پس پردہ کر دیتا ہے اور پیٹ کی آگ کو دبا کر بہ طریق احسن کھانے کا انتظام کرتا ہے - لازمی غرض میں انسان کے لئے ایک طرح کی بے عزتی ہے لیکن حسن غرض سے بالا ہے- اسی سبب سے وہ ہماری بے عزتی کو دور کر دیتا ہے - حسن ہماری بھوک کی سیری کے ساتھہ ساتھہ ہمیں ایک اور بلندی کی طرف لے جا رہا ہے - اسی لئے ایک دن جو لوگ بالکل وحشی تھے آج وہ انسان بن گئے ہیں ' جو صرف اپنے حواس کا حکم مانتے تھے وہ آج محبت کی طاقت کے قائل ہو گئے ہیں- آج ہم بھوک لگنے پر بھی جانوروں اور جنگلیوں کی طرح جوں توں کر کے کھانے کے لئے نہیں بیٹھہ جاتے - نفاست اور صفائی نہ ہونے پر ہماری کھانے کی خواہش جاتی رہتی ہے - اِس لئے اب ہم میں صرف ایک کھانے ہی کی خواہش نہیں رہی ہے (اس کے علاوہ کچھہ اور بھی ہے) - نفاست نے اس خواہش کو کمزور کر دیا ہے - ہم بچے کو شرم دلا کر کہتے ہیں کہ چھی چھی 'یوں ندیدوں کی طرح کھاتے ہو! اس طرح سے کھانا دیکھنے میں اچھا نہیں معلوم ہوتا- نفاست نے ہمارے اس میلان کو ہمارے قابو میں کر دیا ہے - دنیا کے ساتھہ صرف ہماری غرض کا رشتہ قائم نہ رکھہ کر اُس نے مسرت کے رشتے کو جوڑ دیا ہے- غرض کے رشتے میں ہماری لاچاری ہے ' غلامی ہے؛ مسرت کے رشتے میں ہماری نجات ہے —

اسی وجه سے هم دیکھتے هیں که آخرکار حسن انسان کو ریاضت کی طرف کھینچ رها هے - انسان کو وہ ایک اس قسم کا امرت دیتا هے جس کے پینے سے انسان بھوک کی سختی پر دن بدن غالب آتا جاتا هے- لوگ نفس کی بے لگامی کو برا سمجھه کر اُسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں هیں وہ اُسے بدنما سمجھه کر دل سے چھوڑنے پر آمادہ هو جاتے هیں —

جس طرح حسن همیں آهسته آهسته نفاست اور ریاضت کی طرف کھینچ کر لاتا هے اُسی طرح ریاضت بھی هماری حسن سے لذت اندوز هونے والی طاقت کو بڑھا دیتی هے - جب تک همارا دل پوری یکسوئی سے غور کرنے کا عادی نه هو تب تک هم حسن کی گہرائی تک پہنچ کر اُس سے لذت آشنا نہیں هو سکتے - ایک وفا شعار ' ستی (مخلص) بیوی هی محبت کا حقیقی لطف اُٹھا سکتی هے ' هرجائی عورت کو یه چیز کہاں نصیب هے - ستی پن هی نفس پر قدرت رکھنے والی وہ مستحکم قوت هے جس سے هم حسن کے پوشیدہ لطف کو حاصل کر سکتے هیں - هماری حسن کی محبت میں بھی اگر اُس ستی پن کی ریاضت نه رهے تو کیا هوتا هے ! وہ صرف حسن کے باهر هی باهر مضطرب هوکر گھومتی رهتی هے ' مستی کو مسرت سمجھه کر دھوکا کھاتی هے اور جسے پاکر وہ ایک دم سب کچھه چھوڑ کر مطمئن هو کر بیٹھه سکتی تھی اس سے محروم هو جاتی هے- سچا حسن کامل مرتاض هی کے سامنے جلوہ نما هوتا هے ' لالچی اور عیاش لوگوں کے سامنے نہیں - جو لوگ پیٹو هیں وہ کھانے کا مزا نہیں اُٹھا سکتے- پوش * راجه نے رشی کمار اُتنک سے کہا جاؤ ' زنانه محل میں جاؤ ' وهاں پٹ رانی کو دیکھه سکوگے- اُتنک محل میں گیا لیکن رانی کو نه دیکھه سکا-

* مہابھارت کی ایک کہانی هے —

ناپاک ہوکر کوئی شخص ستی کو نہیں دیکھہ سکتا - اتنک اس وقت پاک نہیں تھا —

دنیاوی حسن کے شاندار زنانہ محل میں جو ستی لچھمی موجود ہوتی ہے وہ بھی ہمارے سامنے ہی ہے لیکن پاک نہ ہونے کی وجہ سے ہم اُسے نہیں دیکھہ سکتے - جب ہم عیاشی میں ڈوب جاتے ہیں ' عیش کے نشے میں مست ہوکر گھومتے ہیں تب تمام دنیا کی نورانی لباس والی ستی لچھمی ہماری نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے —

اس بات کو ہم مذہبی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ مسرت کے نقطۂ نظر سے (انگریزی میں جسے آرٹ کہتے ہیں) اُسی کا لحاظ کرتے ہوے کہہ رہے ہیں - ہمارے شاستروں میں بھی آیا ہے کہ صرف دھرم کے لئے ہی نہیں بلکہ سکھہ کے لئے بھی نفس کُش ہونا چاہئے - " سکھارتی سینتو بھویت " یعنی اگر خواہشات کی تکمیل چاہتے ہوتو اُن کو اپنے قابو میں رکھو - اگر تم حسن سے لذت اندوز ہونا چاہتے ہوتو خواہش نفسانی پر قابو حاصل کرکے دل کو صاف بناکر سکون حاصل کرلو - اگر ہم خواہش نفس کو قابو میں رکھنا نہیں جانتے تو اس خواہش کی تکمیل کو حسن کی خواہش کی تکمیل سمجھہ کر غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں - جو شے دل کی ہے اُسے دونوں ہاتھوں سے مسل کر سمجھتے ہیں کہ گویا ہم نے اُسے حاصل کر لیا - اسی لئے ہم نے کہا ہے کہ احساس حسن کو صحیح طور پر بیدار کرنے کے لیے برھم چریہ (تجرد انہ) زندگی بسر کرنے کی ضرورت ہے —

جن کی آنکھوں میں ڈھول ڈالنا مشکل ہے وہ فوراً شک زدہ ہوکر کہیں گے افوہ! یہ تو شاعری ہوگئی - وہ کہیں گے کہ دنیا میں ہم اکثر

یہ دیکھتے ہیں کہ ماہر فن اور ہنر مند لوگ جو حسن کی تخلیق کرتے آے ہیں اُن میں سے اکثر ایسے ہیں جنھوں نے اپنے پیچھے ریاضت کی کوئی مثال نہیں چھوڑی ہے۔ ایسے لوگوں کی سوانح حیات پڑھنے کے قابل نہیں ہیں۔ اس لئے شاعری کو چھوڑ کر حقیقت پر غور کرنا ہمارا فرض ہے —

ہم پوچھتے ہیں کہ ہم کسی چیز کی حقیقت پر اس قدر یقین کیوں کرتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ وہ ہماری نظروں کے سامنے ہے۔ لیکن اکثر صورتوں میں ہم جس چیز کو حقیقی سمجھتے ہیں اُس کے اکثر پہلو ہماری نظر سے پوشیدہ رہتے ہیں۔ کچھہ تھوڑا سا ہی دیکھہ کر ہم سمجھہ لیتے ہیں کہ گویا ہم نے سب کچھہ دیکھہ لیا۔ انسانوں سے صادر ہونے والے حقیقی واقعات کو لیجئے۔ ایک آدمی جس چیز کو سفید کہتا ہے دوسرا اگر اُسے مٹیالا کہتا تو مضائقہ نہ تھا لیکن وہ تو اُسے بالکل کالا کہتا ہے۔ نپولین کو کوئی دیوتا کہتا ہے اور کوئی شیطان۔ اکبر کو کوئی دریا دل اور رعایا کا خیر خواہ مانتا ہے اور کوئی اُسے ہندو رعایا کی تباہی کا اصلی سبب بتلاتا ہے۔ کچھہ لوگ کہتے ہیں کہ اِسی چار ورنوں * (طبقوں) کے اُصول نے ہمارے ہندو سماج (معاشرہ) کی حفاظت کی ہے اور بعض کہتے ہیں اسی تقسیم کے اُصول نے ہمیں بالکل تباہ کر دیا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ دونوں فریق اپنی سچائی کی دھائی دیتے ہیں —

حقیقت میں انسان سے صادر شدہ افعال میں ایک ہی جگہ کئی

---

* ہندؤں میں ذات کی تقسیم چار طبقوں میں ہوئی ہے۔ برہمن، اکھشتری، ویش، شودر —

کئی متضاد باتیں پائی جاتی ہیں - انسان کو نظر آنے والے اجزا میں دو مختلف پہلو نظر آتے ہیں - اُن کا پوشیدہ ملاپ نظر نہ آنے والے اجزا میں بے شبہ چھپا رہتا ہے - اسی لئے حقیقت مشاہدہ ہی میں نظر نہیں آتی بلکہ اُس میں پوشیدہ رہتی ہے - اسی سبب سے اس کے متعلق اس قدر بحث اور جماعت بندی ہوتی ہے اور اسی لئے ایک ہی تاریخ دو مقابل فریقوں کو وکالت نامہ دیتی ہے —

دنیا کے ماہرین فن اور اہل کمال میں بھی جہاں ہم کوئی کم زوری دیکھتے ہیں وہاں اُس کی حقیقی تعریف کرنے کے بعد بھی ہم اُس کے خلاف کچھ نہ کچھ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں - حسن کی تخلیق کم زوری سے، غیر مستقل مزاجی سے اور نفس کی بے لگامی سے ہوتی ہے، یہ بالکل اجتماع ضدین ہے - اگر اس بارے میں کسی سچے واقعے کو بھی ثبوت میں پیش کیا جاے تو بھی ہم کہیں گے کہ تمام گواہوں کو حاضر نہیں کیا گیا ہے اور اصلی گواہ غائب ہے - اگر ہم دیکھیں کہ ڈاکوؤں کی ایک جماعت بہت ترقی کر رہی ہے تو اس واقعے کی اصلیت سے یہ کُلیہ قائم نہیں کیا جا سکتا کہ ڈکیتی کا پیشہ ترقی کا ذریعہ ہے - یہ بات بغیر کسی دلیل کے کہی جا سکتی ہے کہ ڈاکوؤں کی جو انتہائی ترقی دیکھی جاتی ہے اُس کا اصلی سبب باہمی اتحاد ہے - یعنی جماعت میں ایک دوسرے کی خاطر اُصول کی پابندی کی جاتی ہے - لیکن جب یہ ترقی تنزل کی طرف مائل ہوجاے گی تو اس تنزل کا سبب اتحاد نہیں ٹھیرایا جا سکتا - تب کہا جاے گا کہ دوسروں کے ساتھ ظلم کرنا ہی اُن کے تنزل کا سبب ہے - اگر ہم دیکھیں کہ کسی شخص نے بیوپار میں بہت کچھ کما کر اُڑا دیا ہے تو یہ نہیں کہا جاے گا

کہ جو روپیہ اُڑا سکتے ہیں وہی کمانے کا طریقہ بھی جانتے ہیں- لیکن ہم یہ کہیں گے کہ روپیہ کمانے میں وہ آدمی بڑا ہوشیار تھا- اس بارے میں اُس میں نفس کو قابو میں رکھنے اور دور اندیشی کی طاقت دوسروں کی نسبت غیر معمولی تھی لیکن روپیہ اُڑاتے وقت اُس کا فضول خرچی کا میلان اُس کی روپیہ کمانے کی ہوشیاری پر سبقت لے گیا ہے—

ماہرین فن جہاں حقیقت میں کامل ہوتے ہیں وہاں وہ مرتاض بھی ہوتے ہیں، وہاں خود کامی نہیں چل سکتی- وہاں دل کی تربیت اور ریاضت کا ہونا لازمی ہے- ایسے کامل اور مہابلی لوگ بہت ہی تھوڑے ہیں جو علم ہونے پر بھی اس علم کو سولہ آنے کام میں لگا سکتے ہیں- انسان سے کہیں نہ کہیں لغزش ہو جاتی ہے- سبب یہ ہے کہ ہم سب تنزل سے ترقی کی طرف بڑھ رہے ہیں، کہاں ترقی کی آخری حد پر نہیں پہنچے ہیں- لیکن زندگی میں ہم جو کوئی دوامی اور عظیم‌الشان چیز بناتے ہیں اُسے ہم اپنے اندرونی اخلاقی ادراک کی مدد ہی سے بناتے ہیں، نہ کہ اپنی لغزش کی مدد سے- اہل کمال نے بھی جہاں اپنے ہنر کو نمایاں کیا ہے وہاں اپنی اخلاقی خوبیاں ہی دکھائی ہیں اور جہاں انہوں نے اپنی زندگی کو برباد کیا ہے وہاں اُن کے اخلاق کی کم زوریاں ہی نظر آتی ہیں- وہاں اخلاق کے اُس شاندار مقصد کی طرف جاتے ہوے جو اُن کے دل میں ہے اخلاق ذمیمہ کی رخنہ اندازی سے اُنہیں تکلیف پہنچی ہے- کسی چیز کو بنانے میں نفس کُشی کی ضرورت ہوتی ہے اور بگاڑنے کے لئے نفس کی بے لگامی کی- حقیقی علم کے لئے ریاضت کی ضرورت ہے اور سطحی علم کے لئے نفس پر قابو نہ ہونے کی- تو اس صورت میں یہ بات کہی جاے گی کہ ایک ہی انسان کے اندر حسن کے نشو و نما کی قوت اور اخلاقی قوت کی بےلگامی

ساتھہ ساتھہ تکمیل پا سکتے ھیں - یہ تو ایسی ھی بات ھے جیسے شیر اور بکری ایک ھی گھاٹ پر پانی پئیں —

شیر اور بکری ایک ھی گھاٹ پر پانی نہیں پیتے - یہ بات سچ ھے ' لیکن کب ؟ جب شیر بھی پورا شیر بن جاتا ھے اور بکری بھی پوری بکری بن جاتی ھے - بچپن میں دونوں ایک ساتھہ کھیل بھی سکتے ھیں لیکن بڑے ھوجانے پر شیر بھی بکری پر جھپٹتا ھے اور بکری بھی بھاگنے کی کوشش کرتی ھے —

اسی طرح احساس حسن کی حقیقی تکمیل کبھی بھی میلان کی غیر مستقلی اور دل کی بے لگامی کے ساتھہ ایک جگہ نہیں رہ سکتی - دونوں ایک دوسرے کی ضد ھیں —

اگر یہ کہا جاے کہ یہ دونوں ضد کیوں ھیں؟ تو اس کا بھی سبب ھے - وشوامتر نے خدا کے ساتھہ شرط بد کر ایک نئی دنیا پیدا کی تھی وہ اُن کے غصے اور فریب کی مخلوق تھی - اسی لئے وشوامتر کی بنائی ھوئی دنیا خدا کی دنیا کے ساتھہ میل نہ کھا سکی ' اُسے چنوتی (چیلنج) دے کر تکلیف پہنچانے لگی - یہ دنیا انمل اور عجیب تھی ' اس لئے اس کائنات کے ساتھہ نباہ نہ کر سکی ' آخر میں دکھہ دے کر اور دکھی ھو کر وہ تباہ ھو گئی —

اگر ھمارا میلان خطرناک ھو جائے تو وہ خدا کی بنائی ھوی دنیا کے مقابلے میں خود ھی اپنی دنیا کی تخلیق کرتا ھے - اس صورت میں اپنے ماحول کے ساتھہ اس کا میل نہیں ھوتا - ھمارا غصہ ' ھمارا لالچ اپنے چاروں طرف اسی طرح کی تمام خرابیوں کو پیدا کر لیتے ھیں جن سے چھوٹی چیز بڑی اور بڑی چیز چھوٹی دکھائی دیتی ھے - تھوڑی دیر رھنے والی

چیز همیشه رهنے والی نظر آتی هے اور همیشه رهنے والی چیز پر نظر هی نہیں پڑتی - همارے دل میں جس چیز کا لالچ پیدا هوجاتا هے هم اُس چیز کو اسقدر غلط اهمیت دیتے هیں که وہ دنیا کی بڑی بڑی سچائیوں کو ڈھانک لیتی هے ؛ چاند، سورج اور تاروں کو ماند کردیتی هے - اس طرح هماری مخلوق خدا کے ساتھه مخالفت کیا کرتی هے —

خیال کیجئے که ایک ندی بهه رهی هے اگرچه اس کی هر ایک موج آزادی سے سر اُٹھاتی هے پھر بھی یه سب موجیں آپس میں مل کر ایک هی سمندر کی طرف گاتی هوی جارهی هیں، کوئی کسی کو نہیں روکتی - لیکن اسی اثنا میں اگر کہیں بھنور پڑجائے تو یه سب موجیں ایک هی جگه ٹھیر کر پاگل کی طرح گھومنے لگتی هیں - چلنے میں رکاوٹ ڈال کر ڈبونے کی کوشش کرتی هیں، تمام ندی کا جو بہاؤ هے اور جو اُس کا عین مقصد هے اس میں رکاوٹ پیدا کرکے وہ ایک جگه ٹھیرتی بھی نہیں اور آگے بھی نہیں بڑہ سکتی —

اگر همارا میلان دیوانه هوجائے تو وہ همیں تمام رجحانات سے هٹاکر ایک هی نقطے کے اطراف پھرا کر مار ڈالتا هے - همارا دل اُسی ایک مرکز کے اطراف پابند هوکر سب کچھه اُسی کی نذر کردینا چاهتا هے اور دوسری هر چیز کو برباد کر دینا چاهتا هے - اسی دیوانگی میں بعض لوگ ایک قسم کا حسن دیکھتے هیں - اتنا هی کیوں، هم تو سمجھتے هیں که یورپ کا ادبیات اسی بھنور کے رقص دواری کا قیامت خیز جلسه هے جس کا کوئی انجام نہیں، جسے کہیں اطمینان نہیں ملتا، گویا اسی حالت میں اُسے ایک خاص راحت معلوم هوتی هے، لیکن اِسے هم تعلیم کی تکمیل نہیں که سکتے یه فطرت کا بگاڑ هے - ایک تنگ دائرے کے اندر دیکھنے سے جس چیز کو

ہم نہایت خوبصورت سمجھتے ہیں اُسے جب ہم دنیا کی دوسری چیزوں کے ساتھہ ملاکر دیکھتے ہیں تو اُس کا بھداپن نظر آجاتا ہے - شرابی شراب خانے میں تمام دنیا کو بھول کر اپنی مجلس کو جنت سمجھہ لیتا ہے لیکن ایک ہوشمند ناظر جب اُس مجلس کو تمام دنیا سے مقابلہ کرکے دیکھتا ہے تو اُسے اس کی گندگی کا علم ہوسکتا ہے - ہمارا میلان جب ضد کرتا ہے تو باوجودیکہ اُس میں ایک مصنوعی حسن پیدا ہوجاتا ہے پھر بھی اگر ہم اُسے وسیع دنیا کے ساتھہ ملاکر دیکھیں تو اس کے بھدے پن کو دیکھنے میں دیر نہیں لگتی - اس طرح جو شخص غور بین نگاہوں سے بڑی چیز کے ساتھہ چھوٹی کو سب کے ساتھہ ملاکر نہیں دیکھہ سکتا وہ جوش ہی کو مسرت اور عیب ہی کو حسن سمجھنے میں غلطی کرتا ہے - اسی لئے احساس حسن کو کامل طور پر حاصل کرنے کے لئے اطمینان قلب کی ضرورت ہے اور وہ نفس کشی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا —

احساس حسن کی تکمیل کا کیا مقصد ہے ؟ ہمیں اب اس پر سوچنا چاہئے - یہ دیکھا جاتا ہے کہ جنگلی قومیں جس چیز کو خوبصورت سمجھہ کر اُس کی قدر کرتی ہیں متمدن اقوام اُسے نظر انداز کردیتی ہیں - اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ جنگلی لوگوں کا دل جتنا تنگ ہوتا ہے اتنا متمدن لوگوں کا دل تنگ نہیں ہوتا - اندر اور باہر ، مقام اور وقت میں متمدن اقوام کی دنیا وسیع ہے اور اس کا ہر ایک حصہ عجیب ہوتا ہے - اسی وجہ سے جنگلی لوگوں کی دنیا میں اور متمدن لوگوں کی دنیا میں ایک چیز کا ناپ اور تول ایک نہیں ہوسکتا -

فن مصوری کے بارے میں جو لوگ اناڑی ہیں وہ ایک تصویر کے پردے پر تصویر کی بھڑک ، رنگ اور گول گول شکل کو دیکھہ کر ہی خوش ہوجاتے ہیں - وہ تصویر کو وسیع میدان میں رکھہ کر نہیں دیکھتے - اس

بارے میں اُن میں کوئی اس طرح کی اعلیٰ قوت ادراک نہیں ہے جو اُن کے حواس کی لگام کو تھامے رکھے - ابتدا میں جو چیزیں اُنھیں اپنی طرف متوجه کرتی ھیں وہ خود کو انھیں حوالے کردیتے ھیں - شاھی محل کی ڈیوڑھی کے دربان جی کی چپراس اور بھری ھوی ڈاڑھی کو دیکھه کر وہ اُسی کو سب سے بڑی شخصیت سمجھه کر مبهوت هوجاتے ھیں - ڈیوڑھی کو پار کرکے دربار میں جانے کی ضرورت اُنھیں محسوس نہیں ھوتی - لیکن جو لوگ اتنے کاودی نہیں ھیں وہ اتنا جلد مبهوت نہیں ھوتے - وہ جانتے ھیں که دربان جی کی ظاھری شان خوب بڑھی چڑھی ہے - اس کے سوا اس میں اور کچھه بھی نہیں - راجه کا بڑاپن صرف نظر آجانے کی چیز نہیں ہے ' اُسے بڑے غور سے دیکھنا پڑتا ہے - اسی وجه سے راجه کے بڑے پن میں ایک قسم کی طاقت ' اطمینان اور متانت ہے —

اس لئے جو شخص سمجھدار ہے وہ تصویر میں رنگ کی بھڑک کو دیکھه کر مبهوت نہیں ھوجاتا ' وہ غیر معمولی چیز کے ساتھه معمولی چیز کا ' بیچ کی چیز کے ساتھه چاروں طرف کی چیزوں کا اور آگے کی چیزوں کے ساتھه پیچھے کی چیزوں کا تناسب ڈھونڈھا کرتا ہے - رنگ نظر کو اپنی طرف کھینچتا ہے لیکن تناسب کی خوبصورتی دیکھنے کے لئے دل کی ضرورت ہے اُسے نہایت غور سے دیکھنا پڑتا ہے - اس لئے اس کی مسرت بھی زیادہ گھری ھوتی ہے —

یھی وجه ہے که صاحبان فن نمود و نمائش کو پسند نہیں کرتے اور اسی لئے ان کی تصنیف میں ایک قسم کی درشتی پائی جاتی ہے - ان کے دھرپت میں خیال کی تان نہیں ھوتی - معمولی آدمی ان کی تصنیف کو بیرونی نمائش سے خالی دیکھه کر ھاتھه سے رکھه دیتے ھیں ' لیکن خاص لوگوں کے دل

کو اُسی سادگی کی اندرونی عظمت بڑا مزہ دیتی ہے —

اس لئے اگر صرف آنکھوں ہی سے دیکھا جاے اور دل کی نظر ساتھہ نہ ہو تو حسن اچھی طرح نہیں دیکھا جاسکتا - اس اندرونی نظر کو حاصل کرنا خاص قسم کی تعلیم کا کام ہے -

پھر دل کے بھی کئی طبقات ہیں- صرف عقل اور ادراک کے ذریعے ہم جو کچھہ دیکھہ سکتے ہیں اس کے ساتھہ اگر ہم دلی جذبات کو شریک کردیں تو ہماری نظر کی وسعت کچھہ اور بڑہ جاتی ہے — اخلاقی عقل کو ساتھہ کردینے سے آنکھیں بہت دورتک دیکھنے لگتی ہیں اور جب روحانی آنکھیں کھل جاتی ہیں تو پھر منظر کی وسعت غیر محدود ہو جاتی ہے -

اس لئے دیکھنے میں جو چیز ہمارے دل کے بڑے حصے پر قبضہ کرلیتی ہے اُس کو دیکھنے سے ہمیں گہرا اطمینان حاصل ہوتا ہے- پھول کےحسن کی نسبت انسانی چہرہ ہمیں اپنی طرف زیادہ متوجہ کرتا ہے کیونکہ انسانی چہرے میں صرف شکل ہی کا حسن نہیں ہوتا - اُس میں شرار زندگی ' جودت عقل اور دل کا جمال بھی شامل ہوتا ہے - وہ ہماری ہستی ' عقل اور دل پر قبضہ کر لیتا ہے —

انسانوں میں جو اچھے انسان ہیں ' روے زمین پر جو خدا کی شان کرم کے مظہر ہیں وہ ہمارے دل کو اس حد تک اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں کہ ہم خود کو نہیں پاتے ؟ اسی لئے جس شاہزادے (بدھ) نے انسانوں کو دکھہ سے نجات دینے کے لئے راج پاٹ تج دیا اس کی اس خوبی پر انسان نے اتنی نظمیں لکھہ ڈالیں اور اتنی تصویریں بنا ڈالیں کہ جس کی کوئی حد نہیں -

اس جگہہ پر کئی شکی لوگ کہیں گے کہ حسن کی بحث سے یہ تو اخلاق کی طرف نکل گئے - دونوں کو ملانے کی کیا ضرورت ہے - جو اچھا ہے

وہ اچھا ہے اور جو خوبصورت ہے وہ خوبصورت ہے - اچھی چیز ہمارے دل کو ایک طرح کھینچتی ہے اور خوبصورت چیز دوسری طرح - دونوں کا طریقۂ کشش جدا گانہ ہے - اسی لئے زبان میں ان دونوں کے دو نام ہیں - جو چیز اچھی ہے اس کے فوائد ہمیں اس کی طرف مائل کردیتے ہیں اور جو چیز خوبصورت ہے وہ ہمیں کیوں موہ لیتی ہے یہ ہم نہیں جانتے —

اس بارے میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک سود مند چیز ہمارا بھلا کرتی ہے اس لئے ہم اسے بھلی کہتے ہیں لیکن اتنا کہہ دینے سے پوری بات نہیں ہوتی - دراصل جو چیز بھلا کرنے والی ہوتی ہے وہ ہماری ضرورت کو پورا کرتی ہے اور خوبصورت بھی ہوتی ہے - یعنی سود مندی ہونے کے علاوہ بھی اس میں ایک قسم کی کشش ہوتی ہے جس کا کوئی سبب نہیں ہوتا - علمائے اخلاق اس سود مند چیز کو دنیا میں اخلاقی نقطۂ نظر سے شائع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور شاعر اسے اس کی ناممکن‌البیان حسن کی شکل میں لوگوں میں شائع کرتے ہیں —

در اصل ہم جو بہبودی کو خوبصورت کہتے ہیں وہ ضرورت کو پورا کرنے کے خیال سے نہیں - خشکہ ہمارے استعمال میں آتا ہے ' کپڑا ' چھتری اور جوتے وغیرہ بھی ہمارے استعمال میں آتے ہیں ' لیکن وہ ہمارے دل میں حسن کا احساس پیدا نہیں کرتے لیکن لچھمن کا رام کے ساتھ ساتھ بن کو جانا ہمارے دل میں بین کے تاروں کے مانند ایک نغمہ پیدا کردیتا ہے - اسے میٹھی زبان میں ' اچھے اوزان میں خوبصورتی سے سجا کر رکھنا لازمی ہے - اگر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کی خدمت کرے تو ایسا نہیں کہتے کہ اس سے سماج کا بھلا ہوتا ہے بلکہ اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں ایک حسن ہے - یہ بات کیوں خوبصورت ہے ؟ اس لئے کہ جتنی سود مند چیزیں

ہیں تمام دنیا کے ساتھہ ان کی ایک بڑی گہری مناسبت ہے - تمام انسانوں کے دلوں کے ساتھہ ان کا ایک پوشیدہ تعلق ہے - اگر ہم سچائی کے ساتھہ سودمند چیزوں کی مکمل مناسبت کو دیکھہ سکیں تو پھر حسن ہماری نظروں سے اوجھل نہیں رہتا - رحمدلی خوبصورت ہے ، معافی خوبصورت ہے ، محبت خوبصورت ہے - صدبرگ کنول یا بدر کامل کے ساتھہ اُس سچائی کا مقابلہ کیاجاتا ہے - صدبرگ کنول اور بدر کامل کے مانند اُس میں اور اس کے اطراف کی دنیا میں اس کا حسن سب کیلئے دلکش ہے - وہ سب کے موافق ہے اور سب اُس کے موافق ہیں - ہمارے پرانوں میں لچھمی صرف حسن اور جاہ و حشم کی ہی دیوی نہیں ہے وہ منگل (رفاہ) کی بھی دیوی ہے - حسن کی شکل ہی منگل بہبودی کی شکل ہے اور منگل کی شکل ہی حسن کا جلوۂ کامل ہے —

اب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ حسن اور بہبودی کا کہاں میل ہوتا ہے - ہم پہلے ہی دکھا چکے ہیں کہ حسن غرض سے بالا ہے - اسی لئے ہم اُسے الوہیت کہتے ہیں - اسی سبب سے وہ ہمیں محبت میں خود غرضی کے دلدر سے ، چھڑا کر نجات دلاتی ہے —

بہبودی میں ہمیں وہی الوہیت نظر آتی ہے - جب ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بہادر آدمی نے مذہب کیلئے اپنی تمام خواہشات ترک کردی ہیں ، جان دیدی ہے تب یہ دیکھہ کر ہماری آنکھوں میں ایک حیرت سما جاتی ہے جو ہمارے سکھہ دکھہ سے اور ہماری غرض سے کہیں بڑی ہوتی ہے بلکہ ہمارے پرانوں کے مقابلے میں بھی بڑی ہوتی ہے - بہبودی اپنے اسی الوہیت کے بل پر نقصان اور تکلیف کی پروا نہیں کرتی - غرض کے فوت ہونے سے اُس کا کچھہ نقصان نہیں ہوتا - اس لئے جس طرح حسن ہم کو اپنی خواہشات سے الگ

ہونے کی ترغیب دیتا ہے' بہبودی بھی یہی کرتی ہے - حسن دنیا کے مختلف واقعات میں الوہیت دکھاتا ہے - بہبودی بھی انسانی زندگی میں وہی کام کرتی رہتی ہے - بہبودی حسن کو صرف آنکھوں سے نہیں دکھاتی' صرف عقل کے ذریعے سے نہیں سمجھاتی بلکہ وہ اُسے بے انتہا وسیع اور عظیم الشان بنا کر انسان کے سامنے لے آتی ہے - بہبودی دراصل قایم رہنے والا اندرونی حسن ہے - اسی وجہ سے اکثر ہم اُسے آسانی سے خوبصورت شکل میں نہیں سمجھہ سکتے - لیکن جب سمجھتے جاتے ہیں تو ہماری روح ایک طوفانی ندی کی طرح متلاطم ہو جاتی ہے - اس وقت ہمیں اس کے مقابلے میں کوئی بھی چیز زیادہ خوبصورت نہیں معلوم ہوتی —

پھول کی پنکھڑیوں' چراغوں کی قطاروں اور چاندی سونے کی تھالیوں سے اگر کھانے کا کمرہ آراستہ ہے تو اچھا ہے لیکن اگر مہمان کو میزبان کی مدارات میں خلوص نظر نہ آے اور اُسے اس دعوت سے کسی قسم کی مسرت نہ ہو تو اُسے یہ تمام آرائش اور زیبائش کبھی اچھی معلوم نہوگی کیونکہ یہی مسرت ہی تو اندرونی الوہیت ہے - مسرت کی میٹھی ہنسی' میٹھے بول اور میٹھا برتاؤ اتنے دلکش ہوتے ہیں کہ اُس شخص کے نزدیک کیلے کے پتے کی قدر سونے کی تھالی سے بڑہ جاتی ہے - یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ہر ایک کے نزدیک اس کیلے کے پتے کی قدر ایسی ہی ہے - بہت سے لوگ دھوم دھام کی دعوت میں بے عزتی سے بھی شامل ہونے کے لئے تیار نظر آتے ہیں اس لئے کہ وہ کھانے سے بڑھکر کسی اعلی حسن کو نہیں جانتے - دراصل کھانا اور آرائش ہی دعوت کے اصلی اجزا نہیں ہیں - کلی کی پنکھڑیاں جس طرح اپنے اندر ہی بند رہتی ہیں اُسی طرح غرض مند انسان کی طاقتیں ہمیشہ اپنی ذات تک محدود رہتی ہیں - ایک دن اُس غرض کے بندھن

کو تھیلا کرکے اُن طاقتوں کا رخ جب ہم دوسروں کی طرف پھیر دیتے ہیں تو کھلے ہوے پھول کی مانند دنیا پر اُس کی محبت آمیز وسعت چھا جاتی ہے - جو شخص دعوت کے اُس اندرونی ' عظیم‌الشان حسن کو پوری طرح نہیں دیکھہ سکتا وہ کھانے اور پینے کی چیزوں کی کثرت اور آرائش کی نمود ہی کو بڑا سمجھہ لیتا ہے - اس کا بے قابو میلان ' نذرانہ اور کھانے پینے کا بے انتہا لالچ دعوت کے اعلی حسن کو اچھی طرح دیکھنے نہیں دیتا -

شاستر میں کہا ہے " شکتتسي بھو شنم اکشما " یعنی عفوہی طاقتور انسان کا زیور ہے لیکن اظہار عفو میں حسن کو محسوس کرنا ہر ایک کا کام نہیں ہے بلکہ عام اور بے وقوت شخص طاقت کی ہیبت دیکھہ کر ہی اس کے گرویدہ ہوجاتے ہیں - حیا عورت کا زیور ہے لیکن سنگار کے مقابلے میں اس حیا کے حسن کو کون دیکھہ سکتا ہے ' اُسے وہی آدمی دیکھہ سکتا ہے جو حسن کا تنگ نظری سے مطالعہ نہیں کرتا - روشنی کی قلیل شعاعیں جب وسیع روشنی میں مل کر خاموش ہوجاتی ہیں تو اس کے عظیم‌الشان حسن کو دیکھنے کے لیے کسی اونچی جگہ کی ضرورت ہے ' حسن کے اِس طرح دیکھنے کے لئے انسان کو تعلیم کی ضرورت ہے - سنجیدگی کی ضرورت ہے اور اطمینان قلب کی ضرورت ہے -

ہمارے ملک کے قدیم شعرا نے حاملہ عورت کے حسن کے اظہار میں کہیں بھی تکلف نہیں کیا ہے لیکن یورپ کے شاعر اس بارے میں کچھہ شرم اور اخلاقی کمزوری محسوس کرتے ہیں - دراصل حاملہ عورت کا جو حسن ہے اس میں آنکھوں کے لیے کوئی جاذبیت نہیں ہوتی لیکن عورت کی تخلیق کا منشا جب تکمیل کے قریب پہنچتا ہے تب اُس کا انتظار ہی عورت کی شکل میں ایک شان پیدا کردیتا ہے - اس نظارے سے آنکھوں کی مسرّت اندوزی میں جس قدر کمی ہوجاتی ہے انسانی

عظمت کا خیال اس کی تلافی کر دیتا ھے - جو ھلکے بادل برسات کے پورے موسم میں برس کر شردرت (برسات کے ایک دم بعد کا موسم) میں بے وجہ ھوا سے اُڑتے پھرتے ھیں اُن پر جب ڈوبنے والے سورج کی کرنیں پڑتی ھیں تو مختلف رنگوں کے سمے سے آنکھیں چوندھیا جاتی ھیں لیکن اساڑھ کے نئے کھلے بادل جو پر شیر سیاہ کائے کی طرح جلد برسنے والے پانی کے بوجھ سے بالکل سست ھوجاتے ھیں' جن کے الغاروں پانی میں مختلف رنگوں کا چلبلا پن کہیں دکھائی نہیں دیتا - وہ ھمارے دل کو چاروں طرف سے اس طرح بھر دیتے ھیں کہ اُس میں کہیں خلا نہیں رھتا - ان کے چمکدار نیلے پن میں زمین کی حرارت کا ٹھنڈے پڑ جانے' دھان کے کھیتوں کی بے مائگی کا دور ھوجانے اور دریاؤں اور تالابوں کی خشکی کے رفع ھونے کی ایک بڑی امید جھلکتی ھے - یہ امید کامل بہبودی کے حسن بے پایاں میں ساکت و صامت رھتی ھے - کالی داس چاھتا تو اپنی نظم "میگھہ دوتھہ" میں بسنت کی ھوا کو مہجور "یکش" کا قاصد بنا سکتا تھا - دنیا میں مشہور ھے کہ وہ اس خصوصیت میں ماھر تھا اور خاص طور پر شمال کی طرف جانے کے لیے جنوبی ھوا کو مخالف سمت اختیار نہ کرنی پڑتی لیکن شاعر نے اساڑھ کے پہلے دن کے نئے بادل ھی کو منتخب کیا - اُس بادل کو جو دنیا کی تپش کو دور کرتا ھے کیا وہ صرف عاشق کا سندیسہ ھی معشوقہ کے کان میں کہے گا - وہ تو سارے راستے کی ندیوں' پہاڑوں اور جنگلوں پر ایک عجیب سکون اور تکمیل کی اشاعت کرتا ھوا چلا جائے گا - کدمب (*) پھولیں گے' جامنوں کے درخت بارہ ار ھو جائیں

(*) ایک قسم کا درخت جس کے متعلق سنسکرت کے شاعر کہتے ھیں کہ بادل گرجنے سے اُس میں پھول نکل آتے ھیں —

گے ' بگلوں کی قاریں اُڑ چلیں گی ' ندی کا پانی اچھل اچھل کر کنارے کے بید کے جنگل کے ساتھہ ٹکرائے گا اور گانو کی عورتوں کی خالی از غمزہ اور محبت آلود نگاھوں سے اساڑہ کا آسمان اور بھی ٹھنڈا ھوجائے گا - شاعر نے عاشق مہجور کی پیام رسانی کو جب تمام دنیا کی عام بہبودی کے ساتھہ قدم قدم پر کانٹھہ لیا ھے تب اُس کے حسن سے لذت اندوز ہونے والے دل کی خواھش کو اطمینان حاصل ھوا ھے —

" کمار سنبھو " (کالی داس کی ایک دوسری نظم) میں شاعر نے بےوقت موسم بسنت کی غیر متوقع مسرت اور "کام دیو" (عشق کا دیوتا) کی عشق کی سحر آفرینی کے وقت « مہادیو » اور « پاربتی » کے ملاپ کو آخری حد تک نہیں پہنچایا ھے ' عورت اور مرد کے مستانہ ملاپ کے ذریعے جو آگ جل اُٹھتی ھے اس قیامت کی آگ پر پہلے شاعر نے سکون کی بارش کی ھے تب ان دونوں کو ملا سکا ھے - شاعر نے پاربتی کے پریم کی سب سے زیادہ نازک اور حسین شکل ریاضت ھی کی آگ سے روشن کرکے دکھائی ھے - اُس کے آگے بسنت کے تمام پھولوں کا حسن ماند پڑ گیا ھے اور کوئل کے منہ پر مہر خاموشی لگ گئی ھے - « ابھگیان شاکنتل » (کالیداس کا مشہور ڈرامہ شکنتلا) میں بھی معشوقہ جہاں ماں بن گئی ھے ' نفسانی خواھش کا چلبلا پن جہاں پے درپے خلفشار میں ساکن ھو گیا ھے ' جہاں ملامت کے ساتھہ معافی بھی شامل ھو گئی ھے وھیں راجہ اور رانی کا ملاپ نتیجہ خیز ثابت ھوا ھے - پہلے ملاپ میں قیامت ھے اور دوسرے ملاپ میں نجات ھے - ان دونوں نظموں میں سکون میں ' بہبودی میں جہاں بڑی شاعر نے حسن کا کمال دکھایا ھے وھاں اُس کے رنگ کار برش کی رنگینی میں پھیکا پن آگیا ھے اور بین میں مستی نہیں رھی ھے —

اصل میں حسن جہاں پورے طور پر نشو و نما پاتا ہے وہاں اپنی شوخیاں ترک کردیتا ہے - وہیں پر پھول اپنے رنگ اور خوشبو کی زیادتی کو پھل کے حسن کی گہرائی میں بدل دیتا ہے اور اسی تبدیلی میں، اسی کمال ترقی میں حسن اور منگل (بہبودی) کا ملاپ ہوجاتا ہے-

جنھوں نے حسن اور منگل (بہبودی) کے اس ملاپ کو دیکھا ہے وہ تعیش کے ساتھہ حسن کو کبھی نہیں ملا سکتے - ان کے زندگی گزارنے کے اسباب معمولی ہوتے ہیں اور وہ احساس حسن کی کمی کے سبب سے نہیں بلکہ زیادتی کی وجہ سے ہوتے ہیں- اشوک کا نشاط باغ کہاں تھا - آج اُس کے شاہی محل کی دیواروں کا نشان تک نظر نہیں آتا لیکن اس کے بنوائے ہوئے لات اور استوپ (گنبد نما عمارت) "بدھ گیا" کے "بودھی بت" (برگد کا ایک پیڑ) کے پاس کھڑے ہوئے ہیں- ان کی صنعت معمولی نہیں ہے- جس مقدس مقام پر مہاتما بدھ نے انسانوں کو دکھہ سے نجات دلانے کا راستہ نکالا تھا شہنشاہ اشوک نے وہیں مفید عام بڑے منگل کے یادگار مقام میں صنعت کے حسن کو قائم کیا ہے - اُس نے اپنے عیش کو اس طرح پرستش کی بھینٹ نہیں چڑھایا - اس ہندوستان میں سینکڑوں پہاڑوں کی بلند چوٹیوں اور غیر آباد سمندروں کے کناروں پر کتنے مندر اور حسن کے کتنے مقدس شاہکار نظر آتے ہیں - لیکن ہندو راجاؤں کے نشاط محلوں کا نشان تک نہیں رہا - دارالسلطنت کے شہروں کو چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں ان تمام صنعتوں اور خوبیوں کے قائم کرنے کا کیا سبب ہے ؟ سبب یہ ہے کہ وہاں انسان نے اپنی تخلیق حسن سے اپنے سے بزرگ ہستی کے متعلق اپنی حیرت انگیز عبادت کا اظہار کیا ہے - انسان کا پیدا کیا ہوا حسن اپنے سے بڑے حسن کو دونوں ہاتھہ جوڑ کر کھڑے ہوئے سلام کر رہا ہے اور اپنی

پوری عظمت کے ذریعے اپنے سے بہت بڑی ہستی کی خاموشی سے اشاعت کر رہا ہے - انسان اپنی پر صنعت خاموش زبان سے کہہ رہا ہے : دیکھو ! اچھی طرح دیکھو !! جو سندر ہے اُسے دیکھو !!! اور جو عظیم الشان ہے اُسے دیکھو !!!! وہ یہ نہیں کہنا چاہتا کہ میں کتنا بڑا عیاش ہوں اسے دیکھو، وہ یہ نہیں کہتا کہ میں اپنی زندگی کے زمانے میں جہاں عیش کرتا تھا اُس جگہ کو دیکھو اور مرنے کے بعد میں جس جگہ مٹی میں مل گیا ہوں اُس جگہ کو دیکھو - ہم نہیں کہہ سکتے کہ قدیم ہندو راجا اپنے نشاط محل اس طرح سجاتے تھے یا نہیں - مگر یہ بات یقینی ہے کہ ہندو قوم نے ان مقامات کی عزت کے ساتھ حفاظت نہیں کی - جن کی عظمت کو پھیلانے کے لئے نشاط محل بنے تھے انہیں کے ساتھ وہ خاک میں مل گئے لیکن جہاں انسانی طاقت اور عبادت اپنے حسن کی تخلیق کو خدا کی شان بھبودی کے بائیں طرف بٹھا کر متبرک ہوئی ہے وہاں دشوار گزار مقامات میں بھی ہم نے اُن حقیر مندروں کی حفاظت کرنے کی کوشش کی ہے - منگل (بھبودی) کے ساتھ ہی حسن کا اور وشنو کے ساتھ ہی لچھمی کا ملاپ کامل ہوتا ہے - دنیا کی تمام تہذیبوں میں یہی جذبہ پوشیدہ ہے - ایک دن ضرور آے گا جب حسن ذاتی خود غرضی میں بندھا ہوا حسد سے زخمی اور تعیشات سے فرسودہ نہیں ہوگا بلکہ اطمینان اور منگل میں بے لاگ ہوکر جاگ اُٹھے گا - اگر حسن کو ہم اپنی نفسانی خواہش اور لالچ سے ہٹا کر نہ دیکھیں تو ہم اسے پورے طور پر نہیں دیکھ سکتے - بلا تربیت اور بے قابو ہوکر ہم جس حسن کو کامل طور پر نہیں دیکھتے اس سے ہمیں اطمینان نہیں ہوتا بلکہ ہماری نفسانی خواہش بڑھ جاتی ہے - کھانا نہیں ملتا، شراب نوشی سے صحت بخش غذا کی طرف سے بھی

ہماری خواہش ہٹ جاتی ہے ـــ

اسی قدر سے اخلاق کے معلم حسن کو دور ہی سے سلام کرنے کی نصیحت کرتے ہیں اور راہ راست پر چلنے سے بھی اس لئے منع کرتے ہیں کہ بعد میں نقصان نہ ہو۔ لیکن سچی نصیحت یہی ہے کہ حسن سے کامل طور پر لذت اندوز ہونے کے لئے ریاضت پیہم کی ضرورت ہے ۔ برھمچریہ کے قیام کی بھی اسی لئے ضرورت ہے نہ کہ زاہد خشک بننے کے لئے ـــ

جب ریاضت کی بحث چھڑ گئی ہے تو یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ اس ریاضت کا مقصد کیا ہے؟ اور اس کی انتہا کہاں تک پہنچتی ہے ۔ ہم اپنے ظاہری و باطنی حواس کے مقاصد کو سمجھہ سکتے ہیں لیکن احساس حسن نے ہمارے دل میں کیوں جگہ پائی ہے؟

اس سوال کا جواب دینے کے لئے حسن کا راستہ کدھر کو جارہا ہے اس پر پھر ایک مرتبہ اختصار کے ساتھہ غور کرنے کی ضرورت ہے۔

حسن کا احساس جب صرف ہمارے حواس ہی کے ذریعے ہوتا ہے تو ہم جسے حسین کہتے ہیں وہ بالکل صاف معلوم ہونے لگتا ہے یعنی صرف دیکھنے سے ہی آنکھیں اسے سمجھہ لیتی ہیں۔ وہاں ہمارے سامنے ایک طرف حسن اور دوسری طرف عدم حسن دو متضاد چیزوں کا جوڑا صاف نظر آتا ہے۔ اس کے بعد جب عقل بھی احساس حسن کی مددگار بن جاتی ہے تب حسن اور عدم حسن کا فرق نہیں رہتا ۔ تب جو چیز ہمارے دل کو کھینچتی ہے' وہ پہلی نظر میں ناقابل توجہ معلوم ہوئی ہو۔ آغاز کے ساتھہ انجام کا' اہم کے ساتھہ غیر اہم کا اور ایک حصے کے ساتھہ دوسرے حصے کا گہرا تطابق دیکھنے سے ہمیں جہاں مسرت حاصل ہوتی ہے وہاں ہم نظر فریب حسن کے خط غلامی کو نہیں

مانتے - اس کے بعد جب مفید عام عقل کا میل ہوجاتا ہے تو ہمارے دل کی حکومت کا دائرہ اور وسیع ہوجاتا ہے اور حسین اور غیر حسین کا فرق اور بھی کم ہوجاتا ہے - اس وقت خیر خواہ عالم ستی عورت حسین نظر آتی ہے صرف شکیل عورت ہی نہیں - جہاں استقلال ' طاقت' معافی اور محبت کی روشنی ہوتی ہے وہاں رنگوں کی نمائش کی ضرورت ہمیں محسوس نہیں ہوتی - "کمارسنبھو" (کالی داس کی ایک نظم) میں بھیس بدلے ہوے "مہادیو" نے ریاضت کرنے والی "پاربتی" کے پاس جب "شنکر مہادیو" کی شکل' عادات اور عمر وغیرہ کی مذمت کی تو "پاربتی" نے کہا :- مماتر بھا و ئیک رسم منہہ اِستِہم" (میرا دل ان کے اندرونی محاسن پر شیدا ہے) اس لئے مسرت کے واسطے کسی اور ذریعے کی ضرورت ہی نہیں - اندرونی محاسن کے رس میں حسین اور غیر حسین کا تفاوت دور ہوجاتا ہے —

تو بھی منگل (افادے یا بہبودی) میں ایک طرح کے دو متضاد پہلو ہیں - منگل کے علم کے لئے اچھے اور برے کے تصادم کی ضرورت ہے لیکن اس طرح کے دو مقابل جوڑوں میں کوئی بھی ختم نہیں ہوسکتا دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے دو نہیں - جب تک ندی چلتی ہے تب تک دونوں کناروں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جہاں اس کا چلنا ختم ہو جاتا ہے وہاں صرف بغیر کنارے کا غیر محدود سمندر ہوتا ہے - جب تک دریا رواں ہے تب تک دو مقابل کنارے ہیں لیکن جب اس کی روانی ختم ہوجاتی ہے تو دونوں کناروں کی جوڑی بھی ختم ہو جاتی ہے - آگ جلانے کے وقت دو لکڑیوں کو رگڑنا پڑتا ہے لیکن جب آگ جل اٹھتی ہے تو اِن دونوں لکڑیوں کی آپس کی رگڑ بھی ختم ہوجاتی ہے - ہمارا

احساس حسن بھی ٹھیک اسی طرح اگر احساسات کے مسرت افزا اور رنج دہ اور زندگی کے مفید اور غیر مفید ان دونوں قسم کے تصادم کی دو مقابل جوڑیوں میں چنگاریاں اُڑاتے اُڑاتے اگر ایک دن پوری طرح جل اٹھے تو اس کی جزئیت اور تصادم ختم ہوجاتا ہے۔

تب کیا ہوتا ہے؟ اُس وقت مقابل جوڑیوں کا فرق ناپید ہوجاتا ہے اور سب کچھہ حسین ہوجاتا ہے، تب سچ اور حسین ایک ہی ہو جاتے ہیں۔ تب ہم سمجھہ سکتے ہیں کہ در اصل سچ کی حقیقی تحصیل ہی مسرت ہے۔ یہی سب سے بڑا اور آخری حسن ہے۔

اس غیر مستقل دنیا میں ہمیں سچ کا مزہ کس جگہ ملتا ہے؟ جہاں ہمارا دل رہتا ہے۔ راستے کے لوگ آتے جاتے رہتے ہیں وہ ہمارے نزدیک سایہ ہیں ہمیں ان کا علم بہت کم ہے اس لئے ہمیں ان کے بارے میں مسرت نہیں ہوتی۔ بھائی ہونے کی حقیقت ہمارے نزدیک اہم ہوتی ہے اور یہی حقیقت ہمارے دل کو سہارا دیتی ہے۔ بھائی کو جس قدر سچائی کے روپ میں ہم جانتے ہیں وہ ہمیں اتنا ہی مسرت دیتا ہے۔ جو ملک ہمارے لئے جغرافیہ کے نام کی حیثیت رکھتا ہے اُس ملک کے لوگ اِس ملک کے لئے جان دےدیتے ہیں۔ وہ ملک کو بہت بڑی سچائی کی شکل میں جان سکتے ہیں اس لئے اس پر جان دے سکتے ہیں۔ جس علم سے ایک جاہل کو ڈر معلوم ہوتا ہے ایک عالم اس میں اپنی پوری زندگی وقف کردیتا ہے۔ بات یہ ہے جہاں ہمیں سچائی حاصل ہوتی ہے وہیں ہم مسرت کو دیکھہ سکتے ہیں جہاں ہمیں سچائی پورے طور پر حاصل نہیں ہوتی وہیں مسرت کا فقدان نظر آتا ہے۔ جس سچائی میں ہمیں مسرت حاصل نہیں ہوتی اُسے ہم جانتے تو ہیں مگر اُسے ہم نے حاصل نہیں کیا ہے۔

جو سچائی ہمارے لئے پوری طرح سچ ہوتی ہے اسی سے ہمیں محبت ہوتی ہے اور اُسی میں ہمیں مسرت حاصل ہوتی ہے۔

اس طرح سمجھنے سے احساس حق اور احساس حسن ایک ہو جاتے ہیں۔

انسان کا تمام ادبیات' موسیقی اور فنون لطیفہ دانستہ اور نادانستہ طور پر اسی طرف جا رہے ہیں۔ انسان اپنی نظموں میں؛ تصویروں میں اور صنعت میں سچائی کو نمایاں کر کے پیش کر رہا ہے۔ پہلے جو چیز آنکھوں میں کشش نہیں پیدا کرتی تھی اور اس لئے جس کی ہستی ہمارے لئے حقیقی نہیں تھی شاعر اُسے ہماری نظر کے سامنے لاکر ہماری سچائی اور مسرت کی حکومت کی حد کو وسیع کردیتے ہیں۔ بالکل معمولی اور حقیر چیزوں کو انسان کا ادبیات روز بروز سچائی کی شان میں نمایاں کر کے حسن صنعت سے انہیں اہم بناتا جاتا ہے - جو صرف روشناس تھا اُسے بھائی بنارہا ہے' جو صرف نظر کے سامنے آتا تھا اس کی طرف دل کو کھینچ رہا ہے —

آج کل کے شاعر کہتے ہیں - (Truth is beauty , beauty truth.) صداقت حسن ہے اور حسن صداقت ہے۔ ہماری سفید لباس والی ' کنول میں رہنے والی دیوی سرسوتی (علم کی دیوی) ایک ہی ساتھ Truth (صداقت) اور Beauty (حسن) کی تصویر ہے - اُپنشد (ویدانت کی کتابیں) بھی کہتی ہیں " آنند روپم امرتم یدوِ بھاتی" یعنی جو کچھ نمایاں ہو رہا ہے وہ اسی کی مسرت کی شکل ہے ' اُسی کی بقا کی شکل ہے - ہمارے پانو کی خاک سے لیکر آسمان کے تاروں تک سب کچھ ہی Truth اور سب کچھ ہی Beauty ہے سب کچھ ہی مسرت اور بقا (آنند روپم امرتم)ہے۔

سچ کے اسی آنند روپ اور امرت روپ کو دیکھ کر اُس مسرت کو نمایاں کرنا ہی ادبیات شعری کا مقصد ہے۔ جب ہم سچائی کو صرف آنکھوں سے

دیکھتے ھیں، عقل کے ذریعے حاصل کرتے ھیں تب نہیں بلکه جب اُسے دل کے ذریعے حاصل کر لیتے ھیں تب اسے ادبیات میں نمایاں کر سکتے ھیں - تو کیا ادبیات باکمال صنعت کی تخلیق نہیں ھے؟ وہ کیا صرف دل کی ایجاد ھے؟ اس میں تخلیق کا بھی ایک حصه ھے؛ اسی ایجاد کی حیرت کو، اُسی ایجاد کی مسرت کو دل اپنی الوھیت کے ذریعے زبان میں، آواز میں یا رنگوں میں مخصوص کرلیتا ھے- اسی میں تخلیق کی مہارت ھے - یہی ادبیات ھے یہی موسیقی ھے اور یہی فن مصوری ھے-

ریگستان کے وسیع ریتلے میدان میں کھڑے ھوکر انسان نے اُس ریگستان کو "دو اھراموں" سے جو اُس کی حیرت کی علامتیں ھیں، نشان زدہ (مخصوص) کر لیا ھے - سندسان جزیرے کے ساحل سمندر کو انسان نے پہاڑ کے جسم میں ایسے غار کھود کر مخصوص بنا دیا ھے جو باکمال صنعت سے پر ھیں اور کہا ھے که اِس سے میرے دل کو تسکین ھوی ھے - یہی علامت بمبئی کے "ایلفنٹا کیوز" ھیں- مشرق کی طرف کھڑے ھوکر انسان نے سمندر میں طلوع آفتاب کی عظمت کو دیکھا اور کئی سو کوسوں کے فاصلے سے پتھر لاکر وھاں اپنے ھاتھه جوڑنے کی علامت قائم کردی- یہی "کنارک" کا مندر ھے- سچ کو جہاں انسان نمایاں شکل میں یعنی مسرت اور حیات ابدی کی شکل میں حاصل کرتا ھے وھیں ایک علامت قائم کردیتا ھے یہی علامت کہیں مورتی کہیں، مندر، کہیں تیرتھه اور کہیں راجدھانی ھو جاتی ھے - ادبیات بھی اسی قسم کی علامت ھے - تمام دنیا کے جس کسی گھاٹ پر انسان کا دل آکر ٹکراتا ھے وھیں وہ زبان کے ذریعے ایک ھمیشه رھنے والے تیرتھه کو بنانے کی کوشش کرتا ھے اور اس طرح ساحل دنیا کے تمام مقامات کو وہ مسافروں کے دل کے لیے استعمال

کرنے اور پہنچنے کے قابل بنا دیتا ہے - اس طرح انسان سمندر ' زمین اور آسمان میں ' گرمی بسنت اور برسات میں ' مذھب' اس کے کارناموں اور تاریخ میں نا ممکن البیان حسین علامتیں قائم کرکے انسان کے دل کو سچ کی حسین صورت کی طرف لگاتار بلا رھا ہے - ہر ملک میں ہر وقت یہی علامت ' یہی آواز وسیع ہوتی چلی جارھی ہے - دنیا میں ہر جگہ اگر انسان ادبیات کے ذریعے دل کی ان علامتوں کو قائم نہ کرتا تو یہ دنیا ھمارے لئے کتنی تنگ ہوتی- اس کا ہم خیال بھی نہیں کرسکتے- آج جو یہ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی دنیا وسیع دائرے میں ھمارے دل کی دنیا بن گئی ہے اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کے انسان کی ادبیات نے دل کی ایجاد کی علامتوں سے دنیا کو آراستہ کردیا ہے —

سچ تمام دنیا کی چیزوں میں سکون اور حرکت کا تناسب ہے - سچ فعل اور علت کا سلسلہ ہے - اس بات کے بتانے کے لئے دوسرے شاستر ہیں لیکن ادبیات بتلاتا ہے : سچ ھی مسرت ہے ' سچ ھی حیات ابدی ہے - ادبیات اُپنشد کے اس منتر کی آئے دن تشہیر کررھا ہے :- " رسووئی سبھ رسم ھییے وایم لب دھوانندی بُھوتی " یعنی وہ (خدا) رس کی شکل ہے اسی رس کو پاکر انسان مسرور ہوتا ہے —

مرحوم دهلی کالج

از

(جناب پنڈت منوہر لال زتشی صاحب ایم اے)

مکرمی مولوی عبدالحق صاحب نے رسالۂ اُردو کے سنہ ۱۹۳۳ کے چار نمبروں میں قدیم دهلی کالج کے حالات شائع کرکے اس رسالے کے پڑھنے والوں پر بڑا احسان کیا ہے- ان مضامین میں اس مشہور درسگاہ کے مفصل حالات درج ہیں- دهلی کالج کی تاریخ اُس کے قواعد انتظام، اُس کے مختلف شعبوں کا نصاب تعلیم، اُس کے اساتذہ، اُس کے طلبا، غرض کہ ان مضامین سے کالج کے ہر صیغے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے - چوتھے مضمون میں دهلی کالج کے چند ممتاز طلبا کا ذکر ہے اور اسی کی بابتہ مجھے دو تین باتیں عرض کرنی ہیں —

۱ - رسوم هند کے دو حصے الگ الگ چھپے ہیں- ہر حصے میں چار باب ہیں- پہلے دو باب هندؤں سے متعلق ہیں اور آخری دو باب مسلمانوں سے - ان میں دونوں گروهوں کے حالات، رسم و رواج اور عقائد کا ذکر قصوں کے پیرایے میں ہے- جو قصے مسلمانوں سے متعلق ہیں وہ ڈاکٹر ضیاء الدین کی تصنیف ہیں اور جن کا هندؤں سے تعلق ہے وہ ماسٹر پیارے لال نے لکھے ہیں —

۲ - صفحہ ۶۳۶ میں قدیم طلبا کے ضمن میں " دھرم نرائن ابن بشن نرائن" کا ذکر ھے - پنڈت دھرم نرائن صاحب عرف ھاکسر دھلی کالج کے ممتاز طلبا میں تھے- ملازمت کے سلسلے سے اندور میں اور پھر گوالیار میں رھے- گوالیار میں آپ مہاراجہ صاحب مرحوم کے اتالیق تھے- پنڈت دھرم نرائن ھاکسر کے پوتے' کیلاس نرائن ھاکسر ھیں- آپ ریاست گوالیار کے عہائد اعلیٰ میں سے ھیں اور ھندوستانی ریاستوں کے معاملات میں ایک سچے اور خوش فکر مدبر سمجھے جاتے ھیں - پنڈت دھرم نراین نے پولیٹکل اکانومی کی دو کتابوں کا ترجمہ کیا تھا - ایک زمانۂ طالب علمی میں دھلی کالج کی ورنیکلر ٹرانسلیشن سوسائٹی کے واسطے اور دوسرا سنہ ۱۸۶۸ع میں علی گڈھ کی سائنٹفک سوسائٹی کے لئے جو انسٹیٹیوٹ پریس سے سنہ ۱۸۶۹ میں شائع ھوا - اس دوسری کتاب کا نام اُصول سیاست مدن ھے اور اس کے دیباچے میں پنڈت دھرم نرائن فرماتے ھیں —

" ارباب سخن نے جو براہ مہربانی میرے رسالے اُصول حکومت * کو زیادہ اس سے کہ توقع تھی پسند فرمایا اس لئے جرأت ھوئی کہ ایک رسالہ اُصول انتظام مدن میں ترتیب دیا جاے- اس فن شریف کی ضرورت صرف انہیں لوگوں کو نہیں ھے جو اپنے ملک کی ملکی اور معاشرت کی حالت کو بہتر کرنا چاھتے ھیں بلکہ ان کو بھی جو انتظام امور خانہ داری میں کامیاب ھونے کی تمنا رکھتے ھیں- باوجوہ اس قدر بکار آمد ھونے اس علم کے ملک ایشیا میں اس کو وہ وسعت حاصل

* Principles of Government.

نہیں ہوئی جو ہونی چاہئے تھی - راقم نے بہ ایام طالب علمی ویلنڈ صاحب کے مختصر رسالے کا ترجمہ زبان اُردو میں کیا تھا اور اس کو سوسائٹی اشاعت علوم مفیدہ نے کہ بہ اعانت مدرسہ دھلی کے ترویج علوم میں مصروف تھی سنہ ۱۸۴۵ میں چھپوایا تھا مگر چونکہ اس زمانے میں ترقی کے ایسے مختصر رسالے سے رفع ہونا ضرورت کا نظر نہ آیا اس لئے راقم نے ارادہ کیا کہ کوئی ایسی کتاب تالیف کی جاے جو جمیع اُصول کو اس فن کے حاوی ہو .... اور چونکہ بعد مطالعہ چند کتابوں کے یہ یقین ہو گیا کہ موشگافی اور ترتیب میں کوئی مصنف مل صاحب * سے گوے سبقت نہیں لے گیا اس لیے انہیں کی کتاب کی ترتیب کا پابند رہنا قرین صواب نظر آیا اور انہیں کی کتاب کا مقالۂ اول کہ تیرہ باب کو مشتمل ہے نذر ارباب سخن کیا جاتا ہے "—

اس دیباچے کے پہلے فقرے سے جسے میں نے اوپر نقل کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ پنڈت دھرم نرائن نے کوئی کتاب اُصول حکومت پر بھی لکھی تھی اور جناب مولوی عبدالحق صاحب اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے "کچھہ حصہ تاریخ انگلستان کا بھی ترجمہ کیا" مگر یہ کتابیں میری نظر سے نہیں گذریں غالباً یہ اب نایاب ہیں - 'اُصول سیاست مدن' البتہ کچھہ عرصہ ہوا علی گدہ کالج کی ڈیوٹی شاپ سے مل جایا کرتی تھی - معلوم نہیں اب بھی مل سکتی ہے یا نہیں —

۳ - مجھے تعجب ہوا کہ دھلی کالج کے طلبا کے ضمن میں پنڈت موھن لال

* John Stuart Mill.

کا ذکر نہیں۔ پنڈت دھرم نراین اور پنڈت موتی لال کی طرح (جن کا ذکر مولوی عبدالحق صاحب کے مضمون میں ھے) پنڈت موھن لال بھی کشمیری پنڈت تھے۔ دھلی کالج میں سلسلۂ تعلیم ختم کرکے سرکار انگریزی کے ملازم ھوے۔ ان کے باپ کا نام راے بدھ سنگھ اور دادا کا نام راجہ منی رام تھا۔ ان کے والد ماونسٹوارٹ الفنسٹن کے ساتھہ پشاور گئے تھے اور پنڈت موھن لال نے نہ صرف پشاور، کابل، بلخ، بخارا اور ایران کا سفر کیا بلکہ وہ یورپ بھی تشریف لے گئے۔ ایران میں ان کو نائٹ آف دی پرشین آرڈر آف دی لائن اینڈ دی سن * کا خطاب ملا تھا۔ انگلستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کی طرف سے ان کی خاطر و مدارات کی گئی اور جرمنی میں ملک پرشیا کے بادشاہ فریڈرک ولیم چہارم کو اپنی ایک تصویر عنایت کی۔ بزرگوں سے سنا ھے کہ فرنگستان کے لوٹنے کے بعد دھلی کی کشمیری پنڈت برادری نے پنڈت موھن لال کو شامل کرنے میں کچھہ حجت کی اس تنگ خیالی کا نتیجہ وھی ھوا جو اس زمانے میں ھونا چاھئے تھا یعنی یہ کہ پنڈت موھن لال مسلمان ھوگئے اور اپنا نام آغا حسن خاں رکھہ لیا پنڈت کسی مسلمان گھرانے میں شادی بھی کی ان کے ایک لڑکے صوبجات متحدہ کے محکمۂ پولس میں ملازم تھے۔ پنڈت موھن لال کی دو انگریزی کتابوں سے میں واقف ھوں دونوں سنہ ۱۸۴۶ع میں لندن میں چھپی تھیں۔ ایک امیر دوست محمد خان والی کابل کی لائیف دو جلدوں میں اور دوسری ان کے سفر کی کہانی جس کا نام انگریزی میں Travels ھے اور جس کے شروع میں پنڈت موھن لال کے حالات مسٹر سی۔ ای۔

---

* Knight of the Persian Order of the Lion and the Sun.

ٹرے و لین کے لکھے ہوے درج ہیں —

دهلی کالج کے دو اور طلبا کا ذکر کر دوں- ایک سر تیج بہادر سپرو کے دادا پنڈت رادها کشن سپرو - پنڈت رادها کشن فارغ التحصیل ہونے کے بعد کچھہ دن تک دهلی کالج میں ریاضی کے ٹیچر تھے - اس کے بعد ڈپٹی کلکٹر ہوگئے - غدر سنہ ۵۷ ع کے زمانے میں آپ بجنور میں سید احمد خاں صاحب کے ساتھہ تھے پنشن پانے کے بعد دهلی میں اور پھر الہ‌آباد میں رہا کرتے تھے - دوسرے پنڈت بشمبھر ناتھہ صاحب — تعلیم ختم کرنے کے بعد پہلے آپ آگرہ کی بر صدر دیوانی عدالت میں اور پھر الہ‌آباد کے ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے اور اس زمانے کے ممتاز وکلا میں تھے کانگریس کے شریک تھے اور جب سنہ ۱۸۹۲ ع میں الہ‌آباد میں دوسری مرتبہ کانگرس کا اجلاس ہوا تو آپ استقبالی کمیٹی کے صدر تھے - کئی برس تک صوبجات متحدہ اور اس کے بعد وائسراے کی کونسل کے ممبر رہے - خوش قسمت تھا وہ کالج جس نے ایسے ایسے نامور طلبا پیدا کئے —

* C. E. Trevelyan.

لطیفۂ فرقت

از

(جناب محمد اظہار الحسن صاحب بی۔ اے، ال ال۔ بی (علیگ) وکیل غازی‌آباد)

مشرقی شاعری کی اصناف سخن میں سب سے زیادہ کارآمد صنف مثنوی ہے ۔ مسلسل نظم ہونے کے باعث اس میں ہر قسم کے جذبات، خیالات اور واقعات کی تصویر کھینچی جاسکتی ہے اور غزل قصیدہ، ہجو، مسدس، مخمس، ترجیع بند، غرض کہ جملہ اصناف سخن کا کام مثنوی سے لیا جاسکتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی بہترین نظمیں مثنوی میں لکھی گئیں ۔ سنسکرت کی مہابھارت، فارسی کا شاہنامہ اور اُردو کی سحرالبیان جیسی نظمیں اسی صنف میں ہیں ۔

اُردو شاعری کا غالب حصہ غزل تک محدود ہے اور شاید ہی کوئی شاعر ایسا گزرا ہو جس نے غزل نہ کہی ہو؛ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اردو شاعری کی ابتدا ہی غزل سے ہوتی ہے ۔ پھر بھی مثنوی لکھنے کا رواج اُردو شاعری میں بہت پرانا ہے ۔ چنانچہ اول اول دکن میں قطب شاہ وغیرہ اور دہلی میں آبرو جیسے بزرگوں نے مثنوی لکھنی شروع کی ۔ میر و سودا اور اثر نے بھی مثنویاں لکھیں جو کافی مشہور ہوئیں ۔ جعفر علی حسرت نے ایک مبسوط مثنوی "طوطی نامہ" لکھی جس میں رزم اور بزم دونوں کا امتزاج ہے مگر قبول عام نصیب نہ ہوا ۔

ان کے بعد میر حسن کا نمبر آتا ہے جن کی مشہور عالم مثنوی کی سحر بیانیاں آج بھی ارباب ادب اور اصحاب ذوق سلیم سے خراج تحسین وصول کرتی ہیں - لکھنؤ میں مثنوی کا رواج بہت بعد کو ہوا - لکھنؤ اسکول کی پہلی مثنوی پنڈت دیا شنکر نسیم کی گلزار نسیم ہے - گلزار نسیم کو وہ قبول عام نصیب ہوا کہ اس کی اشاعت کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد متعدد مثنویاں لکھی گئیں جن میں قلق کی طلسم الفت اور شوق کی زہر عشق کو بقاے دوام کا خلعت حاصل ہوا اور ماضی قریب میں منشی احمد علی شوق کی مثنویوں سے نسیم آنجہانی کی یاد تازہ ہوئی- اردو مثنوی کی ابتدا دکن سے ہوئی ' عروج دہلی میں ملا ' لیکن حق یہ ہے کہ اس صنف کو لکھنؤ نے اس کمال پر پہنچایا کہ مسدس (مرثیہ) کی طرح یہ بھی خاص لکھنو کی چیز بن گئی —

اس وقت جس چیز کو قارئین کرام کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ بھی ایک مثنوی ہے جو نسیم کے ایک ہم وطن اور ہم قوم بزرگ پنڈت دیبی پرشاد کول المتخلص بہ فرقت نے گلزار نسیم کی تصنیف کے ۱۹ برس بعد سنہ ۱۲۷۳ ہجری میں لکھی تھی اور جو مطبع مہدی میں طبع ہوئی تھی- پنڈت دیبی پرشاد کے والد کے کا نام پنڈت ٹھاکر پرشاد تھا - آپ کشمیریوں کے مشہور فرقے کے نونہال تھے جو اپنی علم دوستی اور اردو نوازی کے لئے مشہور ہے - امانت لکھنوی سے تلمذ حاصل تھا - افسوس ہے کہ اس سے زیادہ حالات فرقت کے دستیاب نہیں ہوے - بہار گلشن کشمیر اور بہار سخن دونوں میں نام ' ولدیت ' سکونت ' تخلص اور شاگردی کے بیان پر اکتفا کر لیا گیا ہے - بلکہ بہار سخن میں تو تخلص بھی فرقت کی جگہ فرحت لکھا ہے - مثنوی کے سرورق سے بھی بس اتنا ہی معلوم ہو سکا - خود

مثنوی میں کوئی ذکر ان کی اپنی ذات کے متعلق نہیں ملتا —

اردو میں مثنویاں تو متعدد لکھی گئیں لیکن عام طور پر محض تفریح طبع کے لئے۔ کسی کسی نے تصوف اور نعت و منقبت کی طرف بھی توجہ کی ورنہ زیادہ تر تو حسن و عشق کی داستانیں اور جن اور پریوں کے قصے ھی مثنویوں کے موضوع رہے - زیر نظر مثنوی شہر آشوب کے قسم کی چیز ھے - یہ ایک محروم تخت و تاج شہر یار واجد علی شاہ اختر کی خدمت میں عقیدت کے چند پھول اور لکھنؤ کے لٹتے ہوے سہاگ پر رنج و غم کے چند آنسو ھیں جو صفحات قرطاس پر ٹپک پڑے ھیں - لکھنؤ اور دھلی کی سلطنتوں کی بدانتظامیوں اور ان کے فرماں رواؤں کی غیر ذمہ داریوں کے متعلق کچھہ بھی کیوں نہ کہا جاے لیکن یہ واقعہ ھے کہ رعایا کے قلوب میں ان کے لئے عزت و احترام اور محبت و عقیدت کے جذبات موجزن تھے - اب بھی لکھنؤ میں ایسے لوگ موجود ھیں جو آصف الدولہ کا نام لےکر اپنی دوکانیں کھولتے ھیں - فرقت نے اپنی مثنوی میں ان لوگوں کی ترجمانی کی ھے جو واجد علی شاہ کی تباھی کو لکھنؤ کی تباھی سمجھتے تھے - فرقت کو دربار اختری سے کوئی تعلق نہ تھا - وہ سلطان عالم کے قریب پہنچنا ضرور چاھتے تھے لیکن یہ تمنا ان کے دل کے دل ھی میں رھی - چنانچہ لکھنؤ اور لکھنؤ والوں کی تباہ حالی کے ذکر کے بعد کہتے ھیں —

جو گزری سبھوں پر وہ میں نے کہی — و لیکن تمنا یہ دل میں رھی

زمانے کو حضرت نے بخشے خطاب — ھوا بزم شہ میں نہ میں باریاب

خیال قدمبوس ھر آن تھا — مجھے مدتوں سے یہ ارمان تھا

کہ سلطان عالم کے پہنچوں قریب — نہ دیدار گُل شد بہ بلبل نصیب

واجد علی شاہ کے محروم تخت و تاج ہونے سے ان کو اپنی نوکری کا الم نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ دربار سے متعلق نہ تھے' ہاں ایک غم تھا اور وہ یہ کہ اودھ کے اس بدنام حکمران کے زیر سایہ ہنسی خوشی گزر اوقات ہو جاتی تھی لیکن اس کے مہذب جانشینوں کے عہد میں آبرو سنبھالنا بھی دشوار ہو گیا تھا - یہی چیز تھی جس نے ان کو اپنے جذبات نظم کرنے پر مجبور کردیا —

سبھوں کو تو ہے نوکری کا الم ہمیں ہے فقط شہ کے جانے کا غم
کہ تھا کچھ تعلق نہ سرکار سے نہ واقف تھے ہم شہ کے دربار سے
مگر عیش و عشرت میں بایکدگر خوشی سے تھی اوقات ہوتی بسر
سو وہ اِس زمانے میں دشوار ہے خیال اپنی عزت کا ہر بار ہے

انتزاع سلطنت کے بعد یہ تجویز کی گئی کہ ایک شاہی ڈیپوٹیشن بسر کردگی جنابۂ عالیہ ملکہ کشور صاحبہ انگلستان جا کر کمپنی کے مظالم کی فریاد پارلیمنٹ کے ارکان اور وزراے سلطنت برطانیہ کے روبرو کرے اور خود فرماں رواے مملکت کے حضور میں شرف باریابی حاصل کر کے تخت و تاج کے لئے استغاثہ پیش کیا جاے - خیال یہ تھا کہ ملکۂ وکٹوریہ عورت ذات ہونے کی وجہ سے شاید جنابۂ عالیہ کے کہنے سننے سے متاثر ہو جائیں اور ظلم رسیدوں کی داد مل جاے - جنابۂ عالیہ سلطان عالم واجد علی شاہ کی والدۂ محترمہ بڑی عقل و فہم کی خاتون تھیں - امور سلطنت میں ہمیشہ جنابہ عالیہ سے مشورہ کیا جاتا تھا - غرض بڑے ارمانوں اور امیدوں سے شاہی فریادیوں کا یہ قافلہ لکھنؤ سے چلا - بنگال پہنچ کر سلطان عالم کو ناسازی مزاج کی وجہ سے کلکتہ ٹھیر جانا پڑا اور جنابۂ عالیہ' ولی عہد سلطنت (مرزا کیواں قدر ہمایوں جاہ قیصر حشم حامد علی بہادر) اور جرنیل صاحب

(مرزا سکندر حشمت دارا مرتبت محمد جواد علی بہادر سلطان عالم کے برادر اصغر) کے ہمراہ "بنگال" نامی جہاز پر سوار ہوکر جون سنہ ۱۸۵۶ ع میں انگلستان سدھاریں - سلطنت کے ایک قدیم وفادار ملازم میجر برڈ اور منشی مسیح الدین خاں بطور مہتمم و منتظم ساتھ تھے - غرض بڑے حشم و خدم اور کر و فر کے ساتھ یہ قافلہ عدن اور قاہرہ ہوتا ہوا انگلستان کے بندرگاہ سود ہمپٹن (Southampton) پہونچا - ساحل پر انگلستان والوں کا ایک جم غفیر زیارت کا مشتاق موجود تھا - اتفاقاً جس زمانے میں جنابۂ عالیہ کا ورود انگلستان میں ہوا ملکہ وکٹوریہ کو دارالحکومت سے باہر جانا تھا - چنانچہ جنابۂ عالیہ کو باریابی کے انتظار میں قیام کرنا پڑا- اس دوران میں اراکین پارلیمنٹ اور وزراے سلطنت سے جرنیل صاحب اور منشی مسیح الدین خاں کی ملاقاتیں استرداد سلطنت کے سلسلے میں ہوئیں - ملکہ معظمہ کی واپسی کے بعد جنابۂ عالیہ کو شرف باریابی عطا ہوا اور صاحب تخت و تاج ملکہ محروم افسر و اورنگ مہماں کے ساتھ بڑے لطف و مودت سے پیش آئیں اور تفصیلی ملاقات کا وعدہ فرمایا- دارالعوام میں مقدمے کی پیشی کی اجازت بھی مل گئی تھی کہ اتنے میں سنہ ۵۷ ع کی شورش کی خبریں پہنچیں جن سے اہل انگلستان کے طرز عمل میں یکایک انقلاب ہوگیا اور یہ خیال کیا جانے لگا کہ انتزاع سلطنت اودھ ہی غدر کا باعث ہوا - غرض سارا کیا ہوا خاک میں مل گیا —

فرقت نے اپنی مثنوی میں جنابۂ عالیہ کے ورود انگلستان اور اراکین دولت کے ساتھ جرنیل صاحب اور مرزا ولیعہد بہادر کی ملاقات کا بیان لکھا ہے - اس وقت تک ملکہ وکٹوریہ سے ملاقات نہ ہونے پائی تھی - اس زمانے میں اردو اخبارات کی ابتدا تھی - صحیح اور مفصل خبروں کی اشاعت

کا انتظام کیا ہوتا، فرقت نے جو کچھہ سنا اس کو نظم کردیا —

یہ مثنوی ایک مختصر سی نظم ہے کل ۲۹۴ اشعار ہیں جو ایک ہفتے میں موزوں ہوگئے تھے آخر میں چند قطعات تاریخ میں امانت نے بھی لائق شاگرد کی حوصلہ افزائی یوں کی ہے:

کہا شہر آشوب فرقت نے ایسا دو بالا ہوئی شوکت و شان عالم
اسے پڑھ کے ہر دل کو ہوتی ہے صحت پئے درد فرقت ہے درمان عالم
صفائی جو بندش کی دیکھی سراسر بنی آئینہ چشم حیران عالم
امانت نے کی سال کی فکر جس دم جگر ہل گیا بہر سلطان عالم
نکل آئی تاریخ اس طرح لب سے یہ پر درد ہے مثنوی جان عالم

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ محکوم میں حاکم کی تقلید کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے - دیکھہ لیجئے ہندوستانی تعلیم، تہذیب اور تمدن پر مغرب کا کتنا زبردست اثر پڑا ہے - تعلیم یافتہ اور 'مہذب' طبقے کی معاشرت بالکل انگریزی ہوگئی ہے - پرانے رسم و رواج قریب قریب مٹ گئے ہیں اور جو باقی ہیں وہ بھی دستبرد زمانہ کی نذر ہوتے جارہے ہیں- یہ حال تو اس وقت ہے جب موجودہ حکمران قوم محکوموں سے مجلسی اور معاشرتی تعلقات رکھنا پسند نہیں کرتی اور ہندوستان کو عارضی قیام کاہ سے زیادہ وقعت نہیں دیتی ہے - ظاہر ہے کہ ہندو تہذیب و معاشرت پر اسلامی تمدن کا اثر کتنا زبردست ہوا ہوگا جب کہ مسلمانوں نے صدیوں تک یہاں اس طرح حکمرانی کی کہ یہیں کی ایک قوم بن گئے اور ہندوؤں کے ساتھہ رہنے سہنے مرنے جینے اور شادی بیاہ کے تعلقات پیدا کر لئے - یہی وجہ تھی کہ اردو کے سرمایۂ مشترک ہونے کے باوجود اس زبان کی تصانیف میں اسلامی رنگ غالب ہوگیا تھا —

بالخصوص لکھنؤ میں تو بظاہر ہندو اور مسلمانوں میں کوئی امتیاز نہ تھا - اس زمانے کے مسلمان اہل قلم اپنی تصنیفات کو حمد و نعت سے شروع کیا کرتے تھے - ان کی تقلید میں غیر مسلم مصنفین نے بھی یہی روش اختیار کی - لطیفۂ فرقت کی ابتدا بھی حمد سے ہوتی ہے - بعض شعر اچھے نکالے ہیں —

وہ دانا وہ قادر وہ ستار ہے　　وہ ایزد وہ رحماں وہ غفار ہے

کوئی اس کی صنعت تو دیکھےذری　　ہوا پر رکھا چرخ نیلو فری

اس کے بعد حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں چند شعر ہیں - مثنوی لکھنے والوں کا ایک یہ قاعدہ بھی تھا کہ بادشاہ وقت کی تعریف میں بڑی چند شعر لکھا کرتے تھے - فرقت نے زوال سلطنت کے بعد مثنوی لکھی تھی اس لئے مدح بادشاہ کے بجاے " مناجات درگاہ جناب باری میں واسطے ترقی مدارج سلطان عالم کے " لکھی —

اس مثنوی کے متعلق ایک امر کسی قدر تعجب خیز ہے - فرقت امانت کے شاگرد تھے اور امانت رعایت لفظی اور ضلع جگت کے لئے بد نام ہیں - قدرتی طور پر فرقت کا رجحان طبع بھی اسی طرف ہونا چاہئے - اس کے علاوہ صنائع ' بدائع ' تکلف ' تصنع اور آورد لکھنؤ کے رنگ سخن کا امتیاز ہیں - لطیفۂ فرقت کی تصنیف سے صرف انیس سال قبل پنڈت دیا شنکر نسیم اسی طرز کلام میں گلزار نسیم لکھ کر اپنے معراج کمال کا ثبوت دے چکے تھے - اندریں حالات یہ توقع ہونی چاہئے تھی کہ فرقت گلزار نسیم کو پیش نظر رکھ کر مثنوی لکھنے کے لئے قلم اٹھائیں گے - لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ میر حسن کی سحرالبیان کو اپنا نمونہ

بنایا - سحرالبیان کا مطلع ہے:

کروں پہلے توحید یزداں رقم جھکا جس کے سجدے کو اول قلم

فرقت نے انہی دونوں قافیوں میں مطلع نکالا ہے —

صفت پہلے فرقت کر اس کی رقم کہ جو ہے خداوند لوح و قلم

مثنوی کی بحر بھی وہی رکھی ہے جو سحرالبیان کی ہے بلکہ کہیں کہیں میر حسن کے اشعار بھی داخل کر لئے ہیں -

مسلسل نظم کے لئے بیان کی صفائی ' سادگی اور تسلسل لازمی چیزیں ہیں - میر حسن کی سحرالبیان کی مقبولیت کا بڑا راز یہی ہے کہ اس کی زبان سادہ اور بیان مطابق فطرت ہے - تکلفات لایعنی کو اس میں دخل نہیں دیا گیا - دلکش اور صاف عبارت میں واقعات نظم کردیے ہیں جن کو ہر شخص پڑھتا اور سمجھتا ہے - صنایع بدائع کی الجھنوں سے دماغ پریشان نہیں ہوتا - فرقت نے اسی انداز سخن کے تتبع کی کوشش کی ہے - اور مثنوی کے بیشتر حصے میں یہ بات پائی جاتی ہے - مناجات کے اشعار جوش بیان اور سادگی زبان کی وجہ سے کافی دلکش ہوگئے ہیں - یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنی واردات اور محسوسات کو نظم کا جامہ پہنایا ہے - لفظ لفظ سے محبت و عقیدت ٹپکی پڑتی ہے - دیکھئے کس حسرت سے کہتے ہیں:

رعیت کی حالت بہت ہے تباہ شتابی سے آے مرا بادشاہ

پھرے باغ میں وہ شہ نامدار چمن سے خزاں جاے آے بہار

چمک پر جہاں کا ستارا رہے نہ گردش میں اختر ہمارا رہے

جلو میں وہی چتر شاہی رہے سدا سر پہ ظل الہی رہے

چھٹتے غم کی ظلمت سے وہ خوش صفات سکندر کو مل جائے آب حیات

کوئی شہ کے آنے کا پھر طور ہو نہ چرخ اختر کا پھر دور ہو

ولی عہد بہادر کی زبانی ملک کی تباہی کا نقشہ یوں کھینچا گیا ہے:-

ہمیں ہے جب اس درجہ حاصل ملال تو پھر کیا رعیت کا واں ہوگا حال
سفر کرکے ہم آے کس حال سے محرم وہاں ہوگا اک سال سے
ہزاروں نے پیشے دئے ہوں گے چھوڑ مرے ہوں گے لاکھوں ہی سر اپنے پھوڑ

... ...

ہمارے جو تھے عہد میں واں امیر یقیں ہے ہوے ہوں گے اب وہ فقیر
برا پہلے کہتے تھے جو بد نہاد کریں گے وہ اس عہد میں ہم کو یاد

کتنا موثر شعر ہے! سچ ہے آدمی کی قدر اُس کے بعد معلوم ہوتی ہے- اس ایک شعر میں انقلاب سے قبل اور اس کے بعد کی حالت کا موازنہ کس اختصار اور بلاغت سے کیا گیا ہے—

اگر پوری مثنوی اسی طرز میں لکھی جاتی تو یقیناً ایک بلند پایہ نظم ہوتی- لیکن لکھنوی رنگ اور اُستاد کا اثر بالکل زایل ہونے والی چیزیں نہ تھیں چنانچہ کہیں کہیں اس کی جھلک بھی موجود ہے- ولی عہد کے بیان میں آگے چل کر یہ شعر بھی ملتے ہیں :—

وہاں سب حسینوں کو ہوگا ملال نہ وہ حسن ہوگا نہ ان کا جمال
پڑی ہوگی نرگس کی آنکھوں میں خاک جگر ہوگا غنچے کا عبرت سے چاک
جو نہریں رواں تھیں وہاں آبدار بنی ہوں گی سکتے سے آئینہ دار
ستم ہوگا بلبل پہ صیاد کا سدا سامنا ہوگا جلاد کا
پریشاں کئے ہوں گے سنبل نے بال بہار اپنی ہوگی اُسے بھی وبال
بپا ہوگا محشر میان چمن کیا ہوگا سوسن نے نیلا بدن

زبان کی صفائی سے انکار نہیں- اعتراض یہ ہے کہ یہ اشعار شاعرانہ لطائف کی حیثیت رکھتے ہیں اور بس - ولی عہد کی زبان سے اپنے ملک کی تباہی کا حال اور اس انداز میں دل نہیں مانتا —

مثنوی نگار کے لئے محاکات پر قادر ہونا ضروری ہے - مناظر قدرت کا بیان ہو یا جذبات فطرت کا- ایک باکمال شاعر کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کا ذکر کرے اس کی ہو بہو تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دے- خارجی حالات کی مصوری کے لئے قوت مشاہدہ کی ضرورت ہے- اگر بیرونی مناظر کو غور سے دیکھہ کر ذہن میں جگہ دی جاے اور اس کے ساتھہ ہی بیان پر قدرت حاصل ہو' طرز کلام سادہ اور فطرتی ہو تو یقیناً خارجی مناظر کے عمدہ مرقع پیش کئے جا سکتے ہیں - واردات قلبی اور خیالات ذہنی کی نقاشی کے لئے نزاکت احساس' رفعت تخییل اور نگاہ عمیق چاہئے - لیکن دونوں صورتوں میں سلاست زبان ناگزیر ہے - لفظی اور معنوی صنعتوں کے پردے میں واقعہ نگاری کا حق ادا کرنا آسان کام نہیں - بزمیہ اور رزمیہ دونوں قسم کی مثنویوں میں شاعر کو خارجی مناظر اور ذہنی کیفیتوں کي تصویریں پیش کرنے کے موقع آتے ہیں- جس سے بہ احسن وجوہ عہدہ برآ ہونے میں اس کا کمال مضمر ہوتا ہے —

فرقت نے مناجات میں جہاں سلطان عالم کی واپسي کی تمنا کا اظہار کیا ہے وہاں ضمنی طور پر جلوس شاہی کا نقشہ بھی کھینچا ہے- سب سے آگے نوبت ہوتی تھی' اس کے پیچھے نقیب ترقی دولت و اقبال کی صدائیں لگاتے چلتے تھے جن کا پیچھے نیزہ بردار سواروں کے دستے ہوتے تھے پھر ارکان دولت کے نرغے میں خود جہاں پناہ ہوا دار پر سوار ہوتے تھے جس کو تیز رفتار کہار لیکر چلتے تھے —

سواری میں تنکا بجے جا بجا نقیب آکے دیں پھر جلو میں صدا
چلیں اپنے کندھوں پہ نیزے دھرے سواروں کے آگے پرے کے پرے
پروں کا کرے سایہ ھر ایک پری اگائے یہ خورشید چتر زری
قدمبوس اقبال ھو پھر شتاب فلک دوڑ کر چوم لے پھر نقاب
رھے حافظ اوج حق کا ولی ملایک پڑھیں سر پہ ناد علی
ھوادار لیکر چلیں پھر کہار وہ گھوڑوں پہ ھوں پھر ھوا کے سوار
برابر برابر تسلسل رھے مسلسل پرا شکل کاکل رھے
رھیں اس کو گھیرے امیر و وزیر ستاروں میں جیسے ھو بدر منیر

اختری جلوس کا اچھا خاصا عکس ھے لیکن افسوس ھے کے فرضی بیانات کے شوق میں شاعر کو یہ احاظ بھی نہ رھا کہ یہ اشعار خواہ مخواہ تسلسل بیان میں خلل انداز ھوتے ھیں —

دوسرا موقع انتزاع سلطنت کے بعد لکھنو کی تباھی ھے - الحاق اودہ تاریخ عالم میں انقلاب کی حیثیت رکھتا ھے - یوں تو کوئی جنگ ھوئی نہ ایک قطرہ خون کا گرا لیکن انقلاب بڑا زبردست تھا - جان عالم لکھنو سے کیا گئے ساری رونق اپنے ساتھ لے گئے - اول تو لکھنو کے قابل ذکر لوگوں کا ایک جم غفیر اودہ کے آخری تاجدار کے ھمراہ جلا وطن ھوگیا - اور جو رہ گئے وہ گردش آسمان کے ھاتھوں پریشان و تنگ حال تھے - پوتڑوں کے امیر دانے دانے کو محتاج ھو گئے تھے لکھنو واجد علی شاہ کے دم سے دلھن بنا ھوا تھا - واجد علی شاہ کی بربادی لکھنو کی تہذیب کی بربادی تھی- لکھنو والوں کے عیش و عشرت کی تباھی تھی- لکھنو کی سوسائٹی کی تاراجی تھی - بھرے پرے محلوں میں خاک اُڑنے لگی- شاھی محلات دربار اور کچھری کا پتا بھی نہ رھا - یہی حالت تھی جیسے

دیکھہ دیکھہ کر وابستگان دولت کے دلوں سے یہ صدا نکل جاتی تھی -

ہے لکھنو کی جان تو کلکتہ میں 'امیر'   خاک آے میری آنکھوں کو اب لکھنو پسند

اور اسی کیفیت کا نقشہ 'فرقت' نے یوں کھینچا ہے :—

جدھر جاؤ بازار سنسان ہیں   محل شہ کے دیکھو تو ویران ہیں
نظر آے یہ دل پہ کیوں کر نہ داغ   ہوا لکھنؤ یک بیک بے چراغ
نہ وہ لوگ ہیں اور نہ وہ ازدحام   نہ وہ صحبتیں ہیں نہ وہ دھوم دھام
مہ و مہر و انجم ہیں ثابت گواہ   ہوا شہر اختر کا سارا تباہ
غرض کو بکو اُڑ رہی خاک ہے   سحر کا گریباں تلک چاک ہے
عجب حال ہے شہ کی سرکار کا   پتا ہے کچہری نہ دربار کا
گھٹا سب کا چندے میں جاہ و جلال   جو تھا ماہ کامل ہوا وہ ہلال
قدم بھر نہ تھی جن کو چلنے کی تاب   ہوئی ان ضعیفوں کی مٹی خراب
بناوت کے مشہور تھے جو امیر   ہوے سال بھر میں وہ بالکل فقیر

کتنی صحیح تصویر ہے لیکن تھوڑی دور آگے بڑھیے تو وہی 'امانت' کی محبوب صنعت رعایت لفظی شاگرد کے یہاں بھی جلوہ ریز ہے :—

گئے باغ میں جب کئی وضع دار   تو سیر چمن سے ہوا دل کو خار
روش پر جو دانا اکھٹے ہوے   اناروں سے کیا دانت کھٹے ہوے
وہ کیلوں کی جھرمٹ جو دیکھی تباہ   اکیلے دوکیلے نے مانگی پناہ
نظارہ بلا ہو گیا سیب کا   بہی پر ہوا شبہ آسیب کا
بنا شاخ انگور دل داغ سے   شریفوں کو یہ پھل ملا باغ سے

یہاں تک تو ان حالات اور مناظر کی تصویریں تھیں جو شاعر کی نظر سے گزر چکے تھے- آگے اب ان کیفیتوں کا بیان آتا ہے جن کی بنیاد 'فرقت' کے تخیل اور تصور پر ہے- اس سلسلے میں سب سے پہلے جنابۂ

عالیہ کے سفر لندن کا ذکر ہے - چونکہ آنکھوں دیکھی بات نہیں اس لئے انداز بیان بھی سادہ اور فطرتی نہیں - لفظی صناعیوں کی نقاب شاہد معنی کے رخ پر ڈال دی گئی ہے - راستے میں مختلف منازل کا بیان کرتے ہوے لکھتے ہیں کہ :

غرض مصر میں جاکے سے باتمیز رہے پہلے یوسف کے سارے عزیز
پئے آبروسہ کے رنج و محن وہ سب در شہوار پہنچے عدن

تعجب ہے کے ' فرقت ' سے اتنی فاش غلطی کیوں ہوئی - ہندوستان سے انگلستان جانے کے لئے عدن ہوکر سواحل مصر سے گزرنا پڑتا ہے نہ کہ پہلے مصر جائیں پھر عدن پہنچیں - جہاز کی روانگی کا بیان بھی واقعیت سے دور اور غیر دلچسپ ہے :—

جہاز ان کا ہوتا نہ کیوں کر رواں کہ تھے چادر اشک کے بادباں
وہ موجوں سے کیوں کر نہ رکھتا گریز دھواں اس کو آہوں کا کرتا تھا تیز
کئی کوہ تمکیں تھے اس پر سوار وہی اس کے لنگر تھے وقت قرار

ہاں " بیان تلاطم دریاے شورکا " بہت خوب ہے اور ایجاز و اختصار کا اچھا نمونہ ہے :—

وہ گرمی کا موسم وہ آندھی کا ڈر وہ ہر جا تلاطم کا خوف وخطر
وہ موجوں کا ہلنا ہوا کا وہ زور وہ طوفاں کا اُٹھنا وہ دریا کا شور

لندن میں استقبال اور ولی‌عہد بہادر کی سواری کا بیان بھی چنداں قابل اعتنا نہیں - البتہ قیام گاہ شاہی کا ذکر سن لیجئے - یہ ملکہ وکٹوریہ کے ایک مکان کا نقشہ ہے جس میں جنابۂ عالیہ فروکش تھیں - فرماتے ہیں کہ :-

عجب ایک بنگلہ تھا وہ خوش نما کہ آتی تھی باغ جناں کی ہوا
سفید اس کے تھے جتنے دیوار ودر مصفا تھے مانند روے سحر

لگی تھیں وہ تصویریں اس میں تمام — کہ بہزاد ومانی کا روشن تھا نام
ستوں سارے تختے تھے کشمیر کے — نہال اس میں گلشن تھے تصویر کے
قرینے کا تھا فرش مسند سے تیز — کسی جاپہ کُرسی کسی جاپہ میز

اور اک سامنے نہر با آب و تاب — سبق بردہ بر چشمۂ آفتاب
چمن گرد تھے اس کے شاداب گُل — ولایت کے میوے نزاکت کے گل

محل کی آرایش کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ شہزادے کے پاس چند فرنگی " کہ تھا اُن کا رتبہ سبھوں سے بلند " گئے اور عرض کیا کہ :

ملال اپنے اب دور سب کیجئے — بدستور پھر سلطنت لیجئے
یہاں کیجئے آپ سیر چمن — پھرے جب تلک ملکۂ سیمتن
یقیں ہے جو ملکہ تلک جائیں گے — وہی ہوگا جوآپ فرمائیں گے

سیاست ودستور انگلستان سےبا خبر اصحاب کے لئے یہ بیان مضحکہ خیز معلوم ہوگا- جہاں کوئی کام بغیر پارلیمنٹ کی منظوری کے نہیں ہو سکتا وہاں چند ایسے لوگون کا " کہ تھا ان کا رتبہ سبھوں سے بلند " یا بالفاظ دیگر اراکین دولت کا خود آکر شہزادے سے یہ کہنا کہ " بدستور پھر سلطنت لیجئے" کیا معنی رکھتا ہے- اور اس یقین کے لئے کیا وجوہات تھے- ملکہ تک رسائی کے بعد " وہی ہوگا جو آپ فرمائین گے " ایسے معاملات پر خود ملکہ بھی صاحب اختیار نہ تھیں - لیکن فرقت اس قسم کے بیانات کے لئے معذور تھے - اس زمانے میں انگلستان کے متعلق اتنی معلومات ہی عوام کو نہ تھیں حتیٰ کہ اخبارات کی خبروں میں بھی افسانوی رنگ ہوتا تھا- چنانچہ یہی واقعہ لکھنؤ کے ہفتہ وار اخبار " سحر سامری " کی یکم دسمبر سنہ ۱۸۵۶ ع کی اشاعت میں بالفاظ ذیل شایع ہوا تھا :

خبر فرحت اثر

" جناب عالیه و مرزا ولی عهد بهادر مرزا سکندر حشمت بهادر، مرزا باقر صاحب، مرزا ولی عهد کے مصاحب سفر ولایت میں ولی نعمت کے همراه تھے- اقبال کی طرح مقبول بارگاه تھے- وهاں پونهچ کر ولی نعمت نے نامه بری کا منصب عنایت کیا- حضرت سلطان عالم کے پاس رخصت کیا- انگریزی ڈاک کے جهاز پر سوار هوے- ۱۶ ربیع الاول سنه ۲۷۳ ه کو دریا سے پار هوے- حضرت کے نام اپنے حضور کی تحریر لائے- گھڑی وغیره اور بهت تحائف دل پذیر لائے- ان کی زبانی سے دل چسپ کهانی هے که ابهی تک ملکۂ فرنگ مصروف سیر و شکار هیں- مسافران لندن محو انتظار هیں مگر تیر مدعا نشانے سے قریب تر هے- ملکۂ فرنگ کی شکار سے پلٹنے کی جلد خبر هے- بڑے بڑے انگریزان جلیل الشان اونچی اونچی کچهری پارلیمنٹ کے ارکان هم زبان هیں که داد گستر کے آنے تک تیغ انصاف کے جوهر نهاں هیں- ادهر ملکه شکار سے پھریں اُدهر برگشته طالعوں کے دن پھر جائیں گے- جتنے ستارے گردش کے هیں اشک ندامت کی طرح چشم فلک سے گر جائیں گے- پھر وهی شاه اوده کا دور دورا هوگا، وهی حشمت کا انداز، وهی سلطنت کا طور هوگا- شکسته خاطروں کو تسلی دیتے هیں، اراکین دولت تشفی دیتے هیں که گھبرانے کی بات نهیں هے- دنیا کی کسی بات کو ثبات نهیں هے- انهیں حکام پارلیمنٹ نے اپنے اپنے مکان خالی کردئے- ایک ایک کو آنکھوں میں جگه، دل میں گھر دئے- ملکۂ فرنگ نے پیام بھیجا- جناب عالیه کے نام بھیجا

که بادشاهی کوٹھی میں اتر لیجئیے هر طرح کا سامان آرام سرکار
سے بے خطر لیجئے - جناب عالیه نے جواب لکھا که ملکۂ عالم رونق
افروز هولیں پھر جہاں ارشاد هوگا رهیں گے اور جب تک دامن
دولت سے دور هیں عیش کیسے آرام کہاں کا هر طرح کے جور
سہیں گے ملکۂ عالم نے پھر تحریر فرمایا تشفی کا مضمون سنایا
که اضطراب کا مقام نہیں گھبرانے کا هنگام نہیں ڈیڑھ مہینے میں
هم آتے هیں تمہیں مراد کو پہنچاتے هیں- مرزا صاحب اس تحریر
کے آنے کے دس روز بعد گرم سفر هوے بائیس دن راہ میں بسر
هوے - اس حساب سے اب ملکۂ عالم ولایت میں آگئی هوں گی
جناب عالیه منه مانگی مراد پا گئی هوں گی" —

اور پھر فرقت نے تو سنی سنائی روایتیں نظم کردی تھیں " جو کچھه تو نے فرقت سنا سو کہا " - دروغ بر گردن راوی - اس زمانے میں بھی جب انگلستان کے ذمه دار ارباب سیاست هندوستان اور هندوستانیوں کی بابت مضحکه خیز باتیں کہدیا کرتے هیں اب سے پچھتر برس قبل انگلستان کے متعلق ایسے بیانات قابل تعجب نہیں -

سطور بالا میں مثنوی کے کافی اشعار نقل کئے گئے هیں جن سے اس کی شاعرانه حیثیت کا اندازہ کیا جا سکتا ھے - آخر میں فرقت کی تشبیہات اور تمثیلات کے متعلق اور عرض کرنا چاهتا هوں- نظم کی کامیابی کے لئے شگفته، بر محل اور حسین تشبیہوں کا استعمال نہایت ضروری ھے - اسی وادی میں ایک شاعر اور غیر شاعر کا امتیاز هوتا ھے - یوں تو روزمرہ گفتگو میں بھی تشبیہیں اور تمثیلیں استعمال کی جاتی هیں- انسانی ذهن کا خاصه ھے که وہ سیدھے سادھے بیان کے بجاے تشبیه و تمثیل

سے بات کو جلد تر سمجھتا اور پسند کرتا ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ جو تشبیہیں وہ استعمال کرے ان میں لطافت، جدت اور معنویت بدرجۂ اتم موجود ہو اور اس کے ساتھ ہی دور از کار نہ ہوں۔ لکھنو کی شاعری میں تشبیہوں کا وافر استعمال کیا گیا ہے۔ حسین سے حسین اور بھونڈی سے بھونڈی تشبیہ شعرائے لکھنؤ کے یہاں مل جائے گی۔ خصوصاً امانت کے یہاں تو اکثر تشبیہیں پھبتیوں کا کام دیتی ہیں۔ ذیل میں لطیفۂ فرقت کی بعض عمدہ تشبیہیں پیش کی جاتی ہیں –

واجد علی شاہ کی واپسی کی تمنا میں کہتے ہیں —

پھرے باغ میں وہ شہ نامدار چمن سے خزاں جائے آئے بہار

خزاں و بہار کہہ کر نوابی کے زمانے کی خوش حالی اور فارغ البالی اور الحاق اودھ کے بعد کی تباہی کا نقشہ کھینچ دیا ہے –

واجد علی شاہ کے لکھنؤ چھوڑنے کے بعد فضا کی غم آلودگی کا ذکر کرتے ہوے کہا ہے :-

نہیں ہے کرن گرد مہر منیر جگر پر یہ پیوست ہیں غم کے تیر

کرن کو مہر منیر کے جگر پر غم کا تیر کہنا لطیف و نادر تشبیہ ہے -

جنابۂ عالیہ بیٹے کی مفارقت میں کہتی ہیں ۔ پوتا پاس ہے –

قریں شاہزادے ہیں شہ دور ہے یہاں تو ہیں آنکھیں وہاں نور ہے

بیٹے اور پوتے کی محبت کا نازک فرق کتنی خوبصورتی سے دکھایا ہے -

جہاز سے اترنے کا سماں :

وہ نکلے جہاز اپنا یوں چھوڑ کر صدف سے نکل آے جیسے گہر

* ——

سودا کی حیات اور کلام کے متعلق غلط فہمیاں اور غلط بیانیاں

از

(جناب شیخ چاند صاحب ایم اے - ایل ایل بی -)

سودا کی حیات میں سب سے پہلی غلط فہمی اس کے خاندان کے متعلق ہے - آزاد اور اس کی تقلید میں بعد کے تمام تذکرہ نگاروں نے اس کے آباو اجداد کو سپاہی پیشہ لکھا ہے - قدیم تذکرہ نویسوں نے کہیں اس کی طرف اشارہ نہیں کیا - قایم سب سے پہلا تذکرہ نگار ہے جس نے سودا کے والد مرزا محمد شفیع کی نسبت لکھا ہے کہ بطریق تجارت ہندوستان آے اور عمل تجارت میں مشہور ہوے - اس بیان سے سودا کے آبای پیشے کا کہیں حال نہیں کھلتا، صرف اس کے والد کا تاجر ہونا ثابت ہوتا ہے - سودا آبائی سلسلے سے مغل تھا اور اس کے اجداد مغلوں کے پیر تھے جیسا کہ اس کے شاگرد حکیم اصلح الدین نے اپنے اس عقیدہ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے جو مصحفی کی ہجو میں تحریر ہوا ہے —

ہے ایک سبب یہ کہ وہ آپ مغل تھا

اور جتنے بزرگ اوس کے تھے مغلوں کے تھے وہ پیر

اس بیان سے بھی سودا کی آبای سپاہ گری کی تردید ہوتی ہے -

مادری سلسلہ بھی سپاھی پیشہ نہ تھا- شاہ کمال نے لکھا ھے کہ سودا کے نانا نعمت خاں عالی تھے جن کا آبای پیشہ طبابت تھا- خود اس کا ابتدائی تخلص ' حکیم ' بقول آزاد بلگرامی اس پیشے کی مناسبت کی قوی شہادت ھے - اس میں شبہ نہیں کہ نعمت خان نے بادشاھی نوکری اختیار کر لی تھی لیکن سپاھیوں کے زمرہ میں اس کا شمار نہیں ھو سکتا - ان شواھد کی موجودگی میں یہ کسی طرح صحیح نہیں ھو سکتا کہ سودا کا آبای یا مادری پیشہ سپاہ گری تھا- گردیزی کا یہ بیان صحیح معلوم ھوتا ھے کہ خود سودا نے سپاہ گری اختیار کر لی تھی- اس کا ثبوت اس کے کلام سے بھی ملتا ھے - لیکن بہت جلد اس سے سبک دوش ھو کر مصاحب پیشگی پر اتر آیا تھا جیسا کہ قایم نے لکھا ھے -

سودا کی عمر کا بوی ابھی تک صحیح تعین نہیں ھوا - آزاد نے پیدائش کا سنہ ۱۱۲۵ھ لکھا ھے' وفات ۱۱۹۵ میں ھوگی -اس لحاظ سے ستر (۷۰) سال کی عمر قیاس ھے یقینی نہیں - سنہ پیدائش کسی تذکرہ میں درج نہیں - قایم نے لکھا ھے کہ مرزا رفیع ' بہادر شاہ کی فوج کے ساتھ دکن گئے تھے - بہادر شاہ کا زمانہ ۱۱۱۹ تا ۱۱۲۴ ھجری ھے - سودا نے فوجی ملازمت کا ذکر کیا ھے لیکن زمانہ کا اظہار نہیں کیا - حضرت علی کی منقبت میں قصیدہ لکھا ھے جس کی تمہید میں مظالم گردوں کی شکایت کا آغاز اس طرح کیا ھے —

کہی جاتی نہیں وہ مجھہ سے' جو اُس ظالم نے
جس طرح کے میرے اوقات میں ڈالے ھیں خلل

لا بٹھا یا مجھے گھر بار چھڑا لشکر میں
پال بے چوب تلے اپنے بغیر از پرتل

اگر ہم قایم کے بیان کو صحیح تسلیم کریں اور سودا کے اس بیان سے بہادر شاہی فوجی ملازمت مان لیں تو ظاہر ہے کہ ۱۱۱۹ اور ۱۱۲۴ھ کے درمیان اس کی عمر فوجی ملازمت کے لئے کم سے کم اٹھارہ سال کی ہوگی- اس لحاظ سے اس کی ولادت کا سنہ ۱۱۰۶ھ سے قبل ہو سکتا ہے اور اس طرح اس کی عمر کم و بیش نوے سال ہوتی ہے- میر حسن نے ۱۱۸۵ اور ۱۱۸۸ (مدت قیام دربار اودھ بہ عہد شجاع الدولہ) کے مابین لکھا ہے کہ اس کی عمر ستر سال کی ہوگی-اس اعتبار سے اس کا سال ولادت ۱۱۱۵ اور ۱۱۱۸ھ کے درمیان پڑتا ہے اور عمر اسی سال کے لگ بھگ' لیکن یہ قیاسی ہے —

ان بیانات سے صاف ظاہر ہے کہ سودا کی عمر کا صحیح تعین اب تک نہیں ہوا اور ابھی ضرورت ہے کہ اس باب میں مزید تحقیق سے کام لیا جاے-

سودا کے تخلص کی وجہ بھی متحقق نہیں ہوی- آزاد نے "بعض" کا قول نقل کیا ہے کہ باپ کی سوداگری وجہ تخلص ہوی- حوالہ نہیں دیا- اسپرنگر نے بھی قایم کے حوالے سے یہی لکھا ہے' قایم کا تذکرہ چھپ چکا ہے اس میں یہ درج نہیں —

آزاد اور اس کے مقلدوں نے لکھا ہے کہ خان آرزو نے سودا کو مشورہ دیا کہ "مرزا! فارسی اب تمہاری زبان مادری نہیں اس میں ایسے نہیں ہو سکتے کہ تمہارا کلام اہل زبان کے مقابل میں قابل تعریف ہو - طبع موزوں ہے- شعر سے نہایت مناسبت رکھتی ہے- تم اردو کہا کرو تو یکتاے زمانہ ہو گے - مرزا بھی سمجھ گئے اور دیرینہ سال استاد کی نصیحت پر عمل کیا "-

تمام قدیم تذکرہ نگار اس بارے میں خاموش ہیں - آزاد کے بیان

کا ماخذ معلوم نہیں - سودا نے خود ایک قطعہ لکھا ہے جس میں ایک فارسی داں کا قول نقل کیا ہے - خان آرزو کے مشورہ کا ذکر نہیں —

میں ایک فارسی‌داں سے کہا کہ اب مجکو ہوئی ہے بندش اشعار فرس ذہن نشیں
جو آپ کیجے اصلاح شعر کی میرے نہ پائیے غلطی تو محاورہ میں کہیں
ہے اور زیر فلک ذات میرزا فاخر سلامت ان کو رکھے حق سدا بروے زمیں
سوکب انھوں کو ہے اصلاح کا کسو کی دماغ قبول کب کرے ان کی متانت رنگیں
کہا یہ بعد تامل کہ دوں جواب تجھے جو میری بات کا اے‌یارتجکو ہووے یقیں
جوچاہے یہ کہ کہے ہندکا زباں داں شعر تو بہتر اس کے لئے ریختہ کا ہے آئیں
و گرنہ کہہ کے وہ کیوں شعرفارسی ملحق ہمیشہ فارسی داں کا ہو مورد نفریں
کوئی زبان ہو لازم ہے خوبیء مضموں زبان فرس پہ کچھہ منحصرسخن تو نہیں
اگر فہیم ہے تو چشم دل سے کر تو نظر زبان کا مرتبہ سعدی سے لے کے تابہ حزیں
کہاں تک ان کی زبان تو درست بولیگا زبان اپنی میں تو باندہ معنی رنگیں
دیار ہند میں دو چار ایسے ہو گزرے جنھوں نے باز رکھا مضحکہ سے اپنے تئیں
چنانچہ خسرو، فیضی و آرزو و فقیر سخن انھوں کا مغل کے ہے قابل تحسیں
سواے ان کے کوئی اور بھی ہو پر شاعر سواد ہند میں وہ ہی ہیں بامزہ نمکیں

اس سے ظاہر ہے کہ خان آرزو کا مشورہ نہیں تھا - اگر وہ مشورہ دیتے تو اس طرح فخر سے مسلم‌الثبوت اساتذہ میں اپنا شمار نہ کرتے - اردو میں طبع آزمائی کے مشورہ کی اس زمانے میں کوئی ضرورت نہ تھی - خود اردو کی مقبولیت اور لوگوں کے بڑھتے ہوے عام رجحان نے فارسی کا بت توڑ دیا تھا - نو وارد سے نو وارد ایرانی بھی اس سے نہ بچ سکے - سودا تو ہندوستان میں پیدا ہوا تھا اور پورا ہندوستانی تھا - ماحول کے عام مذاق کے اثر سے اس نے بھی فارسی کو کم التفاتی سے دیکھا -

سودا کی استادی اور شاہ عالم بادشاہ کی شاگردی کے بارے میں ایک نہایت پر لطف افسانہ بیان کیاجاتا ہے - آب حیات میں لکھا ہے :-

" جب کلام کا شہرہ عالمگیر ہوا تو شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لئے دینے لگے اور فرمائشیں کرنے لگے - ایک دن کسی غزل کے لئے تقاضا کیا - انہوں نے عذر بیان کیا - حضور نے فرمایا - بھئی مرزا کے غزلیں روز کہہ لیتے ہو ؟ مرزا نے کہا پیر و مرشد جب طبیعت لگ جاتی ہے دو چار شعر کہہ لیتاهوں - حضور نے فرمایا بھئی ہم تو پائخانہ میں بیٹھے بیٹھے چار غزلیں کہہ لیتے ہیں - ہاتھ باندھ کر عرض کی ویسی بو بھی آتی ہے - یہ کہہ کر چلے آئے - بادشاہ نے پھر کئی دفعہ بلا بھیجا اور کہا کہ ہماری غزلیں بناؤ ہم تمہیں ملک الشعرا کر دیں گے ' یہ نہ گئے اور کہا کہ حضور کی ملک الشعرای سے کیا ہوتا ہے ' کرے گا تو میرا کلام ملک الشعراء کرے گا - پھر ایک بڑا مخمس شہر آشوب لکھا - (ع) کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے ڈانواں ڈول " —

یہ محض افسانہ ہے واقعات اس کی مطلق تائید نہیں کرتے - شاہ عالم بادشاہ سنہ ۱۱۷۳ ھ میں تخت نشین ہوے - اور سودا ۱۱۶۷ ھ میں دھلی کو خیر باد کہہ چکا تھا - وہ نواب عمادالملک غازی الدین خان کے ساتھ فرخ آباد گیا تھا - یہ وہ موقع ہے جب نواب عمادالملک ' احمد شاہ درانی کے ایماسے دو آبے سے زرتاوان وصول کرنے گئے تھے ' سودا ساتھ تھا - مہربان خاں رند دیوان احمد خاں بنگش والی فرخ آباد کے شدید اصرار سے وہاں ٹھیر گیا تھا - قائم نے سنہ ۱۱۶۸ ھ میں یہ واقعات لکھے ہیں - اس کے بعد سودا دھلی نہیں آیا بلکہ سنہ ۱۱۸۵ ھ کے قریب فیض آباد اور ۱۱۸۸ ھ میں لکھنو گیا اور

بالاخر لکھنو میں فوت ہو کر وہیں پیوند خاک ہوگیا - ایسی صورت میں شاہ عالم بادشاہ کی شاگردی محض افسانہ ہے - اس میں بھی صداقت کا شائبہ تک نہیں کہ شاہ عالم نے ملک الشعرای کے خطاب کی ترغیب و تحریص دلای تھی اس لئے کہ سودا شاہ عالم کی تخت نشینی سے کم سے کم آٹھہ سال قبل اس خطاب سے سرفراز ہوچکا تھا جیسا کہ میرتقی میر نے سنہ ۱۱۶۵ ھ میں لکھا ہے کہ " ملک الشعرای ریختہ او را شاید " اور قایم نے سنہ ۱۱۶۸ میں اس کی تائید اس طرح کی ہے —

" بالفعل بخطاب ملک الشعرای کہ ہمین پایۂ سخوران است اعزاز و امتیاز دارد "
خطاب ملک الشعرای کے متعلق ایک اور غلط بیانی کا ازالہ اس سلسلہ میں بے محل نہ ہوگا —

عام طور پر مشہور ہے کہ آصف الدولہ نے سودا کو یہ خطاب دیا تھا ' لیکن آج تک کسی نے کوئی معتبر سند اس کی نہیں پیش کی - نہ تو قدیم تذکروں میں اس کا ذکر ہے اور نہ خود سودا کے کلام میں اس کا کہیں حوالہ ہے - اس کے علاوہ میر اور قایم کے بیانات سے جن کو میں ابھی پیش کرچکا ہوں اس کی قوی شہادت ملتی ہے کہ آصف الدولہ کی تخت نشینی سے کم سے کم ۲۳ سال قبل سودا اس خطاب سے سرفراز ہوچکا تھا - اس میں شبہہ نہیں کہ میر اور قایم نے یہ نہیں بتایا کہ اس کو یہ خطاب کہاں سے ملا - اگر دربار دہلی سے ملا تو شاید احمد شاہ بادشاہ نے یہ خطاب دیا ہو اس لئے کہ اسی زمانے میں سودا کی شاعری چمکی - لیکن ایک مشہور روایت سے (جس کو محمد انوار حسین تسلیم سہسوانی نے بھی کلیات سودا مطبوعہ نولکشور ۱۲۸۹ ھ کے خاتمہ پر نقل کیا ہے) یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علی حزیں نے سودا کو یہ خطاب دیا تھا - جب شیخ ۱۱۴۶ ھ میں ہندوستان آیا

تو کچھہ عرصہ تک دھلی میں بھی رھا - ایک روز سودا ملنے گئے - شعر پڑھنے کی اجازت حاصل کی - اپنا یہ شعر پڑھا —

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ھے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

شیخ نے پوچھا تڑپے ھے کے کیا معنی؟ کہا "می تپد" شیخ نے پھر شعر پڑھوایا اور زانو پر ھاتھہ مار کر کہا "مرزا رفیع قیامت کر دی یک قبلہ نما باقی بود آں را هم نگذاشتی" یہ کہہ کر اُٹھہ کھڑے ھوے فرط مسرت سے بغل گیر ھوے اور اس خطاب سے سرفراز کیا - اس روایت کی ھلکی سی تائید سودا کے اس شعر سے بھی ھوتی ھے : —

ممکن نہیں یہ روح مقدس سے حزیں کے
ایسی جو غزل ھووے تو سودا صلہ دے چھوڑ

اگر یہ روایت صحیح ھے تو ظاھر ھے کہ سودا کو یہ خطاب محمد شاہ کے اخیر زمانے میں ملا اس لئے کہ شیخ کا قیام اس زمانے میں دھلی میں تھا - ممکن ھے کہ میرو قایم نے اسی واقعہ کی بنا پر لکھا ھو - لیکن شیخ سے ایسی توقع رکھنی بیجا ھے کہ اس نے ایک ریختہ گو ھندوستانی شاعر کو محض اس ایک شعر کے سننے پر اتنی عزت بخشی ھو - اس کی کتاب احوال حزیں اپنے وقت کی "مدر انڈیا" ھے - مصحفی کا بیان ان سب سے مختلف ھے اس نے لکھا ھے - "بعضے او را دریں فن بہ ملک الشعراے پرستش می کنند" ان قدیم مستند بیانات کی موجودگی میں مصحفی کا مبہم بیان کچھہ قابل لحاظ نہیں - بہر حال میرو قایم کے بیانات اور یہ روایت ثابت کرتے ھیں کہ سودا کو دربار اودھ سے یہ خطاب نہیں ملا تھا —

سودا کے ممدوحین دھلی میں ایک نام مہربان خاں کا بھی لیا جاتا ہے اس نام کا کوئی امیر اس زمانے میں دھلی میں مشہور نہیں ہوا ہے- دھلی کے ممدوحین میں اب تک شاہ عالم گیر ثانی، نواب عماد الملک، نواب سیف الدولہ احمد علی خاں، بسنت خاں خواجہ سرا کا ذکر ملتا ہے- بسنت خاں محمد شاھی عہد کا خواجہ سرا ہے- محمد شاھی عہد کے آخر میں سودا کی شاعری نے فروغ پایا جیسا کہ سودا نے رسالۂ سبیل ھدایت اور عبرۃ الغافلین میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے- اس زمانے میں صرف یہی خواجہ سرا سر پرست تھا- اس کے بعد احمد شاھی دور میں سیف الدولہ نے اور عالم گیر ثانی کے عہد میں خود بادشاہ اور اس کے وزیر نواب عماد الملک نے سر پرستی کی- ان کے سوا کوئی امیر مہربان خاں نام کا نہیں تھا- یہ مہربان خاں فرخ آبادی احمد خاں بنگش کا دیوان تھا جس کی سرکار میں سودا نے تقریبا اٹھارہ سال گزارے- ۱۱۶۷ ھ سے ۱۱۸۵ ھ تک یہ سودا کا سر پرست رھا ہے- کلیات میں جہاں جہاں یہ نام آیا ہے اس سے مراد فرخ آبادی مہربان خاں ہے- اس کی تعریف میں جو قصیدے موجود ھیں ان سے بھی کوئی قرینہ اس بات کا نہیں پایا جاتا کہ یہ دھلوی امیر ہے- اس کے سوا سنہ ۱۱۷۴ ھ کے مکتوبہ کلیات میں یہ قصیدے موجود نہیں- یہ وہ کلیات ہے جس میں صرف قیام دھلی کے دوران کا کلام مدون ھوا ہے- یہ نسخہ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کے کتب خانے میں محفوظ ہے—

یہ کہا جاتا ہے کہ دھلی کو چھوڑنا گوارا نہ تھا اس لئے شجاع الدولہ کی اشتیاق بھری طلبی پر لکھنؤ جانے سے انکار کر دیا اور معذرت میں ایک رباعی لکھ بھیجی—

سودا والیء ملک کی نااهلی و کم زوری اور اعیان حکومت کی سازشوں، خود غرضیوں اور ناعاقبت اندیشیوں سے بیزار تھا۔ اس لئے دهلی سے بھاگنا چاهتا تھا۔ اس کی شہادت میں وہ مخمس پیش کیا جا سکتا ھے جس میں سودا نے والیء ملک کی ناگفتہ بہ حالت اور مملکت کے زبوں حال کی تصویر کھینچی ھے۔ بادشاہ اور دربار داروں کی هجو تو کہی ھے لیکن دلی سے بیزاری کا رنگ بھی نمایاں ھے:—

امیر اب جو هیں دانا انھوں کی ھے یہ چال هوے هیں خانہ نشیں دیکھہ کر زمانے کا حال
بچھے ھے سوزنی خو جا کھڑے جھلے ھے روماں حضور بیٹھے هیں ایک دو ندیم اهل کمال
دھرے ھے روبرو اک پیک دان و اک تنبول

جو کوئی ملنے کو اُن کے انھوں کے گھر آیا ملے یہ اُس سے کر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکر سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا انھوں نے پھیر کے اُدھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھہ اور باتیں بول

جو مصلحت کے لئے جمع هوں صغیر و کبیر تو ملک و مال کا فکر اس طرح کریں هیں مشیر
وطن پہنچنے کی سوجھی ھے بخشی کو تدبیر کھڑا یہ اٹکلے دیوان خاص بیچ وزیر
کہ شامیانے کے بانسوں پہ نقرئی هیں جھول

غرض میں کیا کہوں یا روکہ دیکھہ کر یہ قہر کروڑ مرتبہ خاطر میں گذرے ھے یہ لہر
جو تک بھی اسی [illegible] کو دیوے گردش دھر تو بیٹھہ کر کہیں یہ روئیے کہ مردم شہر
گھروں سے پانی کو باهر کریں جھکول جھکول

یہ بین ثبوت اس امر کا ھے کہ سودا دل سے دهلی کو ترک کرنا چاهتا تھا لیکن کچھہ دنوں جو دهلی میں ان دلشکن حوادث و انقلابات کے باوجود ٹھیر گیا محض دوست احباب کے اصرار سے۔ چنانچہ ایک رباعی میں خود اس کی طرف اشارہ کیا ھے۔ خواجہ میر درد کا نام

خصوصیت سے لیا ہے :—

نادیدنی از بسکہ ہے روے عالم ہے کفر ملاقات جو کیجے باہم
کرتا ہوں کہیں جانے کا جس وقت میں عزم 'درد' آن کے 'سودا' میرے پکڑے ہے قدم

ان حالات میں اگر اس کو کہیں سے عزت آمیز دعوت پہنچتی تو وہ خوشی سے قبول کر لیتا - چنانچہ ایسا ہی ہوا جب سودا کے سرپرست نواب غازی الدین خاں عماد الملک احمد شاہ ابدالی کے ایما سے دوآبے جانے لگے اور راستہ میں فرخ آباد میں قیام کیا تو احمد خاں بنگش رئیس فرخ آباد کے دیوان مہربان خاں نے اصرار کیا تو سودا اُسے غنیمت جان کر ٹھیر گیا - اس کے سوا شجاع الدولہ کا سودا کے قیام دہلی کے زمانے میں دعوت دینا کئی وجوہ سے غیر صحیح معلوم ہوتا ہے - شجاع الدولہ ۱۱۶۶ ھ میں مسند نشین ہوے - یہ وہ زمانہ ہے جس میں ان کو اہم ملکی معاملات و مہمات سے سر کھجانے کی فرصت نہ تھی - دوسرے سودا کے سرپرست عماد الملک سے ان کی مخالفانہ چشمک تھی - اور ان کی تخت نشینی کے بعد ہی عماد الملک نے احمد شاہ ابدالی سے وعدہ کیا کہ وہ شجاع الدولہ سے زر خطیر وصول کر کے پیش کریں گے چنانچہ اسی غرض سے انھوں نے بڑے لاو لشکر کے ساتھ دو آبے کا سفر کیا - سودا بھی ساتھ تھا - فرخ آباد سے آگے مہربان کے اصرار نے اس کو بڑھنے نہ دیا - جس رباعی کو اس دعوت کی معذرت کے طور پر بیان کیا جاتا ہے وہ رباعی سنہ ۱۱۷۴ ھ کے مکتوبہ کلیات میں موجود نہیں ہے - ان حالات میں شجاع الدولہ کا دعوت دینا قرین صحت نہیں معلوم ہوتا - یہ ممکن ہے کہ قیام فرخ آباد کے دوران میں یہ طلبی ہوی ہو - اس لئے کہ اس وقت تک شجاع الدولہ کے حصے میں بڑی حد تک فرصت و فراغت آ چکی تھی - اور سودا نے حسن

معذرت کے طور پر یہ رباعی لکھ بھیجی ہو:

سودا پئے دنیا تو بھر سو کب تک　　آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ دنیا ہووے　　بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تو کب تک

اس رباعی کی کوئی تحریری سند نہیں صرف روایت ہے - اگر یہ صحیح مان لی جاے تو فرخ آباد سے لکھی ہوگی - اس لئے کہ سودا نے اس میں در بدر کی آوارگی کا اشارہ کیا ہے - فرخ آباد جانے سے پہلے اس کو تلاش معاش میں کسی دوسری جگہ جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا - یہاں سے دوسری جگہ جانا آوارگی تھی - شجاع الدولہ کے علاوہ محمد یار خاں خلف نواب علی محمد خاں والی ملک روہیل کھنڈ وغیرہ نے اس کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دی تھی - لیکن فرخ آباد میں اس قدر خوش تھا کہ اس دعوت کو بھی رد کردیا - اگر خوش نہ ہوتا تو ممکن تھا دونوں جگہ میں سے کہیں چلا جاتا - اس لئے کہ دونوں شعر و سخن کے قدر داں تھے - شجاع الدولہ کی سخاوت و قدردانی مشہور ہے - محمد یار خاں بھی صاحب ذوق امیر تھا - موسیقی کا بڑا ماہر تھا - خود شاعر تھا اور شاعروں کا زبردست پرستار - کئی مشہور شاعر اس کی سرکار میں تھے - یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ نواب احمد خاں بنگش کے انتقال پر سودا فرخ آباد سے فیض آباد چلا گیا - نواب احمد خاں اپنی وفات سے دو سال قبل بصارت سے محروم ہو گئے تھے - دو سال ان کے نہایت ابتری میں گزرے اور ان کو حکومت کے کاروبار کو پوری طرح دیکھنے بھالنے کا موقع نصیب نہ ہوا - سودا کا سرپرست امیر مہربان خان دیوان بھی نواب کے علاج معالجے میں اپنے سرکاری فرائض کی بہ نسبت زیادہ مصروف تھا - نواب کی بیماری اور ان کے اوہام پرستانہ معالجے نے فرخ آباد کے

پناہ گزیں شعرا کو نئی گردش کا پیغام سنا دیا تھا، یہی وجہ ہے کہ سودا نے احمد خاں کی وفات سے قبل نہ کہ بعد وفات فرخ آباد کو خیر باد کہا - اس کا ثبوت خود اس کے کلام میں موجود ہے - مہربان خان کے اشعار کی تعریف میں ایک مثنوی لکھی ہے اس میں اپنے رخصت ہونے کا ذکر کیا ہے اور دعا دی ہے کہ تو نواب کے سایہ میں پھولے پھلے اور سوز کی سفارش کی ہے کہ وہ ایک طائر خوش نوا ہے جو اتفاق سے تیری محبت کے جال میں گرفتار ہے اگر وہ یہاں سے چھوٹتا تو پھر کبھی ہاتھہ نہیں آے گا:

شعر کے بحر میں ترا اوستاد کشتیء ذہن کو ہے باد مراد
اس کو ہر طرح تو غنیمت جان پھر ملے گا نہ سوز سا انسان
کیسے ہی رام ہوں کسی کے ساتھہ پنچھی بھڑ کے ہوے نہ آویں ہاتھہ

کر چکا میں دعا پہ ختم کلام پہنچے رخصت کا میرے تجکو سلام
حشر تک زیر سایۂ نواب رہیو جوں آفتاب عالمتاب

ان اشعار سے صاف روشن ہے کہ نواب احمد خاں کی وفات سے قبل سودا نے فرخ آباد کو خیر باد کہا اور اس بنا پر سودا کا سنہ ۱۱۸۵ ھ میں فیض آباد پہنچنا صحیح نہیں - لیکن اس میں شبہ نہیں کہ وہ سنہ ۱۱۸۳ ھ تک تو ضرور فرخ آباد میں موجود تھا اس لئے کہ اس کے ایک خط کا ذکر شفیق اورنگ آبادی نے گل رعنا میں کیا ہے جو غرۂ ربیع الآخر سنہ ۱۱۸۳ کو فرخ آباد سے 'ذکا' کے نام لکھا تھا - ایسی صورت میں فیض آباد پہنچنے کی تاریخ ۱۱۸۳ اور ۱۱۸۵ ھ کے درمیان پڑتی ہے -

آزاد نے لکھا کہ فرخ آباد سے لکھنؤ گئے - یہ صحیح نہیں - پہلے

فیض آباد گیا جو شجاع الدولہ کی راج دھانی تھی۔ یہاں شجاع الدولہ کی وفات (سنہ ۱۱۸۸ ھ) تک رہا اس کے بعد جب آصف الدولہ نے لکھنؤ کو اپنا مرکز حکومت قرار دیا تو لکھنؤ گیا۔

آزاد کا بیان ہے جب سودا نے شجاع الدولہ کی ملازمت حاصل کی تو نواب بہت اعزاز سے ملے لیکن "یا تو بے تکلفی سے یا طنز سے کہا مرزا وہ رباعی تمھاری اب تک میرے دل پر نقش ہے اور اس کو مکرر پڑھا۔ انھیں اپنے حال پر بڑا رنج ہوا اور بپاس وضع داری پھر دربار نہ گئے یہاں تک شجاع الدولہ مر گئے اور آصف الدولہ مسند نشین ہوے"۔

آزاد کو رباعی کے مضمون پر رنگ چڑھانے کے لئے یہ قصہ گھڑنا پڑا۔ یہ بھی ایک افسانہ ہے جو صداقت سے سراسر خالی ہے۔ سودا شجاع الدولہ کی وفات تک برابر ان کے دربار میں رہا۔ اس کے تین ثبوت ہیں۔ پہلا تو خود سودا کا کلام ہے جس میں کئی قصیدے قطعے وغیرہ نواب کی مدح میں موجود ہیں۔ بعض تاریخی قطعے بھی ہیں۔ دوسرا ثبوت میر حسن کا بیان ہے جس نے لکھا ہے "الحال در سرکار نواب شجاع الدولہ بوسیلۂ شاعری سرفرازست"۔ تیسرا ثبوت مصحفی کا بیان ہے جس نے لکھا ہے —

"فقیر در عہد نواب شجاع الدولہ روزے برائے دیدن ایں بزرگ بخدمتش رسیدہ بود ...... آگے چل کر لکھتا ہے "نواب مرحوم و مغفور نیز بودن او را در سرکار خود بسیار غنیمت می دانستند"

لکھنؤ کے قیام کے متعلق بالاتفاق کہا جاتا ہے کہ والی ملک اور اہل لکھنؤ کی قدر دانی سے سودا ہر طرح فارغ البال رہا اور امن و اطمینان سے بسر کرتا رہا۔ یہ بڑی غلط فہمی ہے۔ شجاع الدولہ کے زمانے میں سودا بے شک آسودہ حال اور مطمئن تھا۔ لیکن آصف الدولہ کے زمانے میں وہ معاش

کی طرف سے زیادہ مطمئن نہ تھا۔ اسپرنگر اور علی لطف نے لکھا ہے کہ آصف الدولہ نے چھ ہزار سالانہ مقرر کردیے تھے۔ لیکن اس کو اس نقد رقم کے حاصل کرنے میں درباری کارکنوں اور عاملوں کی بڑی منت سماجت کرنی پڑتی تھی اور خزانے سے رقم اس دشواری اور ذلت سے ملتی تھی کہ سودا نے اس کی بار بار شکایت کی ہے۔ ایک قصیدہ میں آصف الدولہ سے ان دقتوں کی شکایت کی ہے اور نقد رقم کے عوض جاگیر سے سرفراز کرنے کی درخواست کی ہے —

اس نظم سے غرض ہے مجھے عرض مدعا — مقصد میرا قلیل ہے پہنچے باقصرام
اپنی تیری جناب میں اتنی ہی عرض ہے — کس کس کا ملتجی ہوں کہا کر ترا غلام
انصاف ہے کہ ہو وہ عطا اِس جناب کی — اور اُن کی میں سماجت ومنت کروں مدام
دیہات جو ہیں مصرف مطبخ کے اوس میں سے — اس نقدی کے عوض ہو مجھے صحنک طعام

حسن رضا خاں سرفراز الدولہ نائب سلطنت تھے۔ سودا کے شاگرد اور ممدوح تھے ان سے بھی اس نے یہی شکایت کی ہے۔

پھرا کروں میں لئے مشت استخواں اپنے — میانے میں پئے عمال زیر کہنہ رواق
سواب تو اس سے بھی نوبت گزر گئی ہے مگر — گلے میں کرتا بپا کفش ہاتھ میں چماق
سپرد تجکو ہے سررشتہ سب کی حرمت کا — کیا ہے اتنی وہ مخلوق کا ہے جو خلاق
سو طالب اتنی میں حرمت کا اب نہیں جس سے — کروں معاش بسر اپنا میں بہ تم و طراق
عوض میں دے مجھے اس نقدی کے توایسا گاؤں — بسر ہو عمر میری جس سے زیر کہنہ رواق
نہ شکل نور علی خاں ہوں کھا کے میں فربہ — نہ سوکھ کر ہوں طرح میرزا رفیع کے قاق
بہ نان و دال میں سازش کرایک گوشہ میں — مدام مدح میں تیری لکھا کروں اوراق

یہ وہ صحیح اور داخلی بیانات ہیں جن سے سودا کی لکھنؤی زندگی کا سچا سچا حال معلوم ہوتا ہے۔ اب تک ہم اس کی فارغ البالی اور آسودہ

خاطری کے حق میں عجب حسن ظن رکھتے تھے شاعر کی شکایتیں ہماری خوش عقیدگی کو بدل دیتی ہیں —

ممکن نہیں کہ سودا کا ذکر آئے اور اس میں اس کے غلام غنچہ کو جگہ نہ ملے - مشہور ہے کہ یہ اس کا خادم تھا جو قلمدان لئے ہمیشہ ساتھ رہتا تھا - کسی قدیم تذکرہ میں اس غنچہ کا نام دیکھنے میں نہیں آیا - آزاد اور اس کے مقلدین نے اس روایت کو نقل کیا ہے - سودا کے ساتھ اس کا ایک شاگرد ہمیشہ رہا کرتا تھا وہ شاعر بھی تھا اور اشرف علی خاں صاحب تذکرۂ فارسی کا بیٹا تھا - مرزا کے مسودات کی تبئیض وہی کرتا تھا - میر حسن اس کے متعلق لکھتا ہے " میر فخرالدین خلف اشرف علی خاں صاحبِ تذکرۂ فارسی اکثر ہمراہ مرزا می‌باشد وغزل ہاے ایشاں را ترقیم می نماید " —

مصحفی کا بیان ہے —

" فخرالدین ماہر ... مدتے بخدمت مرزا رفیع السودا اوقات عزیز خود را بہ کتابت دیوانش صرف ساختہ ...... ازیں جہت اکثر اوقات ' خود را از مصاحباں و مشیران مرزا می شمارد و فخریہ می گوید کہ مونس ہر وقت ایشاں بودہ ام و طرفہ ترایں کہ باوصف آگاہی فن اگر کلامش نگاہ کنی خالی از سخافت نیست دریں جا ایں مثل بسیار بموقع بیاد آمدہ - دوران با خبر در حضورو نزدیکان بے بصر دور " -

صرف ماہر کے متعلق تذکروں میں یہ ملتا ہے کہ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا ممکن ہے کہ اس وقت زندہ دلوں نے اس کی خدمت کے اعتبار سے یہ نام رکھدیا ہو - بہر حال اس کے سوا کسی تذکرہ یا تحریر میں غنچہ کا نام نہیں ملتا -

آزاد نے ایک بہت ہی پر لطف قصہ سودا اور میر جعفر زٹل کے بارے میں لکھا ہے کہ "جب مرزا رفیع لڑکے تھے اس وقت میر جعفر زٹل کا بڑھا پا تھا - اگلے وقتوں کے لوگ رنگیں جریبیں جن پر نقاشی کا کام ہوتا تھا اکثر ہاتھہ میں رکھا کرتے تھے - ایک دن شام کے قریب میر موصوف ایک سبز رنگ جریب ٹیکتے ٹہلنے کو باہر نکلے- مرزا بغل میں کتابوں کا جزدان لئے سامنے سے آتے تھے اس زمانے میں ادب کی بڑی پابندی تھی- بزرگوں کو سلام کرنا اور ان کی زبان سے دعا لینے کو بڑی نعمت سمجھتے تھے - مرزا نے جھک کر سلام کیا- انھوں نے خوش ہوکر دعا دی- چونکہ بچپن ہی میں مرزا کی موزونیء طبع کا چرچا تھا - میر صاحب کچھہ باتیں کرنے لگے- مرزا ساتھہ ہولئے- انھوں نے نو خیز طبیعت کو بڑھانے کے لئے کہا مرزا بھلا ایک مصرع پر مصرع تو لگاؤ ـــ

ع - لالہ در باغ داغ چون دارد ؟ مرزا نے سوچ کر کہا - ع - عمر کوتا است غم فزون دارد- میر صاحب نے فرمایا واہ مرزا دن بھر کے بھوکے تھے (٢) کہا گئے - مرزا نے پھر کہا - ع - از غم عشق سینہ خون دارد میر صاحب نے فرمایا واہ بھئی دل خون ہوتا ہے جگر ہوتا ہے بھلا سینہ کیا خون ہوگا - سینہ پر زخون ہوتا ہے- مرزا نے پھر ذرا فکر کیا اور کہا - ع - چہ کند سوزش دروں دارد - میر صاحب نے کہا ہاں ٹھیک ہے ذرا طبیعت پر زور دے کر کہو - مرزا دق ہوگئے جھٹ کہہ دیا ع - یک عصاء سبز زیر ...دارد - میر جعفر مرحوم ہنس پڑے اور جریب اٹھا کر کہا - کیوں ہم سے بھی - دیکھہ کہونگا - تیرے باپ سے - بازی بازی بریش بابا ہم بازی - مرزا تو لڑکے تھے ہی - بھاگ گئے " ـ

یہ لطیفہ کسی قدیم تذکرہ میں نہیں - میر حسن نے لکھا ہے- لیکن اس

اس کو سودا سے کوئی تعلق نہیں - اس میں میر جعفر زٹل اور سودا کے بجائے میرزا بیدل اور میر جعفر زٹل ہیں - میر حسن کے اصل الفاظ ہیں -

" نقل است کہ روزے (میر جعفر زٹلی) پیش مرزا بیدل رفت- مرزا در فکر مصرع مصروف بودند - ملتفت نہ شدند - پرسید صاحب وقبلہ کدام مصرع فرمودہ اند - گفت بلے و آن ایں مصرع بود ع : لالہ بر سینہ داغ چو دارد - میر مسطور گفت دریں تامل چیست :- چو بکے سبز زیر .... دارد - مرزا ازیں معنی بہم بر آمد زود چیزے دادہ رخصت نمود " -

میر حسن کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ یہ سب آزاد کی فسانہ آرائی کے شاخسانے ہیں -

آزاد نے میر تقی کی ایک راے سودا کے متعلق درج کی ہے - لکھا ہے " لکھنؤ میں کسی نے پوچھا کیوں حضرت آج کل کون کون شاعر ہے؟ کہا ایک تو سودا دوسرا یہ خاکسار ہے اور کچھ تامل کرکے کہا آدھے خواجہ میر درد - کوئی شخص بولا کہ حضرت ! اور میر سوز صاحب ؟ چیں بجبیں ہو کر کہا کہ میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آخر استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں- کہا خیر یہ ہے تو پونے تین سہی "

میر صاحب کی یہ راے کسی تحریر میں نہیں ملتی - ممکن ہے کہ آزاد کی نظر سے کہیں گزری ہو یا روایتاً کہیں سنی ہو لیکن اس کی صحت پر یقین نہیں کیا جا سکتا - میر صاحب سودا کی زندگی میں لکھنؤ نہیں گئے - بلکہ دو سال بعد جیسا کہ ذکر میر، گلزار ابراہیم اور گلشن ہند سے ثابت ہے - ایسی صورت میں آج کل والا فقرہ کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا - جب میر صاحب کا قصہ چھڑ گیا ہے تو ایک غلط فہمی کا ذکر کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے - بعض تذکرہ

نویسوں نے لکھا ہے اور اسے اکثر معتبر ادیبوں نے نقل کیا ہے کہ سودا نے میر تقی میر کے ایک مرثیے اور ایک سلام پر ناقدانہ اعتراضات کئے ہیں۔ اور ان کے فنی نقایص کی پردہ دری کی ہے - یہ منظوم اعتراضات دراصل ایک رسالہ ہے جس کا نام سبیل ہدایت ہے - حکیم اصلح الدین نے اس پر ایک نثری دیباچہ فارسی میں لکھا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ میر تقی میر نہیں بلکہ یہ بزرگ میر محمد المتخلص بہ تقی ہیں۔ سودا نے تقی کے جن اشعار پر اعتراض کئے ہیں ان میں تقی کا تخلص اکثر قلمی دیوانوں میں موجود ہے مرتب نے تقی کو میر کردیا ہے میں سبیل ہدایت سے ایک بند نقل کرتا ہوں -

تقی اس حکایت کو کوئی کیا کہیگا — یہ دو حرف ہیں اس کے جو میں ہوں بولا
کوئی مہرباں ہو کہے کر بلا جا — کہ وہاں جاکے مرنے کی دل کو طلب ہے

تمام قلمی دواوین میں یہی تخلص استعمال ہوا ہے- فہرست مخطوطات انڈیا آفس نشان ۱۴۷ میں سودا کے اُس دیواں کا ذکر ہے جس کی کتابت یقین کے بیٹے مقبول نبی خاں نے ۱۲۱۴ ھ میں شاہجہاں آباد میں کی ہے - اس نے صاف طور سے محمد تقی دہلوی عرف گھاسی شاگرد فخرالدین لکھا ہے- یہ وہی شاعر ہے جس کا ذکر میرحسن نے اپنے تذکرہ کے صفحہ (۷۰) پر کیا ہے ان شواہد کی موجودگی میں تقی کو میر سمجھہ لینا کسی طرح صحیح اور قابل قبول نہیں —

سودا اور ضاحک کی ہجویات کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ سودا ضاحک کے انتقال کے بعد ان کے فرزند میرحسن سے عزا پرسی کرنے گئے "دیوان اپنا ساتھہ لیتے گئے بعد رسم عزا پرسی کے اپنی یا وہ گوئی پر جو کہ اس مرحوم کے حق میں کی تھی بہت سے عذر کئے اور کہا کہ سید مرحوم نے دنیا سے انتقال فرمایا تم فرزند ہو جو کچھہ اس روسیاہ سے

گستاخی ہوئی معاف کرو۔ بعد اس کے نوکر سے دیوان منگا کر جو ہجویں ان کی کہی تھیں سب چاک کرڈالیں - میر حسن نے بمقتضاے علوء حوصلہ و سعادت مندی اس وقت دیوان باپ کا گھر سے منگایا اور جو ہجویں ان کی تھیں وہ پھاڑ ڈالیں" - میر ضاحک کا انتقال سنہ ۱۱۹۹ھ میں ہوا جیسا کہ خود آزاد نے گلزار ابراہیم کے حوالے سے لکھا ہے اور سودا کا انتقال ۱۱۹۵ھ میں - ان حالات کے تحت آزاد کا یہ بیان بالکل بے بنیاد اور سراسر غلط ہو جاتا ہے —

آزاد نے ایک لطیفہ لکھا ہے :—

" ایک ولایتی نے کہ زمرۂ اہل سیف سے تھا عجب تماشا کیا یعنی سودا نے اس کی ہجو کہی اور ایک محفل میں اس کے سامنے ہی پڑھنی شروع کردی - ولایتی بیٹھا سنا کیا - جب ہجو ختم ہوئی اٹھ کر سامنے آ بیٹھا اور ان کی کمر پکڑ کر مُسلسل و متواتر گالیوں کا جھاڑ باندھ دیا - انھیں بھی ایسا اتفاق آج تک نہ ہوا تھا حیران ہو کر کہا کہ خیر باشد !خیرباشد جناب آغا اقسام ایں مقالات شایان شان شما نیست - ولایتی نے پیش قبض کھینچ کر ان کے پیٹ پر رکھ دی اور کہا نظم خودت گفتی - حالا ایں نثر را گوش کن - ہرچہ تو گفتی نظم بود - نظم از ما نمی آید مابہ نثر ادا کردیم" —

یہ اور اس قسم کے چند لطیفے آزاد نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں- نہ تو کسی کتاب کا حوالہ دیا اور نہ کسی روایت کا ذکر کیا - ایسی حالت میں ان کی صداقت ہر طرح مشتبہ ہے - اوپر کی مثالوں سے واضح ہے کہ تاریخی حقایق کو تذکرہ سنجوں نے فسانہ آرائی سے

مسخ و مجروح کر دیا ہے اور واقعات و حالات کو بدل کر ان کی نوعیت کچھ کی کچھ کر دی ہے تو اس قسم کے خیالی قصے وضع کرنے میں کیا امر مانع ہے --

سودا کے حیات کے متعلق غلطیوں کو میں یہاں ختم کرتا ہے اور اب اس حصے کو لیتا ہوں جو اس کے کلام کے متعلق ہے ' سودا کا کلام کلیات کی شکل میں مدون ہوکر شایع ہوچکا ہے' اس کا سب سے زیادہ رائج ' متداول اور عام دسترس میں جو نسخہ ہے وہ نول کشور کا ہے - لیکن ایک تو یہ غلط ہے' دوسرے اس میں الحاقی کلام کثرت سے ہے جو دوسروں کا ہے - تیسرے اس میں بہت سا ایسا کلام موجود نہیں ہے جو سودا کا ہے اور قلمی نسخوں میں ملتا ہے - اس کا مرتب غلام احمد ہے جس نے کئی جگہ سے جمع کیا اور بے تحقیق و تفتیش سودا سے منسوب کر کے مرتب کر دیا - چنانچہ اس نے خود لکھا ہے -

" بندۂ غلام احمد کہ مولف کلیات هذا است می گوید کہ دیوانہاے افضل المتاخرین مرزا رفیع‌المتخلص بسودا بشوق تمام و ذوق مالا کلام بکمال محنت و دماغ سوزی از چند جا بہم رسانیدہ بترتیب دلپزیر مرتب ساختہ یادگار روزگار گذاشت چوں ایں کلیات جامع تر از دیگر دواوین مشہور است اکثر عزیزاں و صاحبان شوق بقیمت صدروپیہ طالب نسخۂ موصوفہ بودند لیکن دوری آں قبول طبع خاکسار نیفتاد خدا شاهد ایں مقال است "

غلام احمد کا مرتبہ نسخہ ہر طرح غیر معتبر ہے - یہ حال نہ صرف اس نسخہ کا ہے بلکہ اکثر قلمی نسخے اس عیب سے خالی نہیں - میرے پیش

نظر کلیات سودا کے کم و بیش چالیس قلمی نسخے ھیں اور متعدد تذکرے اور حوالے کی کتابیں - یہ ذخیرہ انجمن ترقی اردو کے مہربان معتمد نے اپنی عنایت سے میرے لئے فراھم کیا ھے - اس سواد کی مدد سے مجھے یہ تحقیق ھوا ھے کہ سودا کے کلیات میں کچھہ کلام ایسا بھی ھے جو دوسروں کا ھے اور غلطی سے اس سے منسوب ھو گیا ھے اور اس کا کچھہ کلام ایسا بھی ھے جو ابھی تک معرض اشاعت میں نہیں آیا - میں پہلے الحاقی کلام سے بحث کروں گا —

الحاقی کلام کے سلسلے میں سب سے پہلے قایم کا ذکر ضروری ھے - قایم سودا کا نامور شاگرد ھے ، اس کا حسب تفصیل ذیل کلام سودا کے کلیات میں داخل ھو گیا ھے —

(۱) مثنوی در شدت سرما - یہ چھپن شعر کی مثنوی ھے ، اس کا مطلع ھے —

سردی اب کی برس ھے اتنی شدید   صبح نکلے ھے کانپتا خورشید

یہ مثنوی قایم کی ھے اس کے کئی ثبوت ھیں - پہلا تو یہ کہ کلیات قایم کے ایک قدیم قلمی نسخے میں یہ مثنوی موجود ھے - دوسرا ثبوت یہ ھے کہ میر حسن اور قدرت اللہ شوق نے اس مثنوی کو قایم ھی سے منسوب کیا ھے اور اس کے انتخابی اشعار بھی دیے ھیں - یہ دونوں تذکرے سودا کی زندگی ھی میں لکھے گئے ھیں - اس کے علاوہ سودا کے قلمی دواوین میں یہ مثنوی موجود نہیں ھے - ان قلمی نسخوں میں سے بعض سودا کی زندگی میں لکھے گئے ھیں اور اکثر اس کی وفات کے پس و پیش - سودا کے مروجہ کلیات میں یہ مثنوی ھے لیکن قایم کے کلیات کی مندرجہ مثنوی سے مقابلہ کیجیے تو اکثر اشعار

میں جگہ جگہ الفاظ و تراکیب کا فرق ہے - سودا کے کلیات میں یہ اصلاح یافتہ شکل میں پائی جاتی ہے - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سودا کے پاس بغرض اصلاح یہ مثنوی آئی سودا نے اصلاح تو کردی لیکن واپس نہیں ہوی اور جب غلام احمد نے دیوان مرتب کیا تو اس میں اس کو بھی داخل کردیا - یہی حال قایم اور سودا کے دوسرے شاگردوں کے کلام کا ہے - جن کی تفصیل آگے آئے گی - خلط ملط اور الحاق و اتصال کا یہ سلسلہ سودا کے کلام کے متعلق اب تک جاری ہے - چنانچہ حکیم اصلح الدین کا وہ قصیدہ جو مصحفی کی ہجو میں تحریر ہے سید مطلب حسین ہالی بی - اے لکھنوی نے سودا سے منسوب کردیا ہے اور اپنے انتخاب میں اس کو شامل کردیا ہے - حالانکہ قصیدے کے ہر شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا لکھنے والا سودا کا حمایتی اور شاگرد ہے —

(۲) قایم کی دوسری مثنوی " ہجو طفل پتنگ باز ' سودا کے کلیات میں ملتی ہے - یہ ۵٦ اشعار پر مشتمل ہے —

ایک لونڈا ہے پتنگ کا کھلار

قایم کی مصنفہ مثنوی ہونے کے وہی ثبوت ہیں جو اس سے قبل بیان ہوچکے ہیں - کلیات سودا کے قلمی نسخوں میں یہ درج نہیں - شوق نے اپنے تذکرہ میں اسے قایم ہی سے منسوب کیا ہے اور اس کے ۲۴ انتخابی شعر بھی نقل کیے ہیں - اس میں بھی الفاظ و تراکیب کا اختلاف ہے اور یہ بھی اصلاح کی غرض سے سودا کے پاس آئی تھی اور اصلاح پاکر دھری رہی اور بالآخر سودا کے کلیات میں مرتب نے داخل کردی —

(۳) گیارہ شعر کی ایک حکایت بطرز مثنوی ہے جس کا مطلع ہے —

سنا ہے کہ ایک مرد اہل طریق نہایت ہی واقع ہوا تھا خلیق

یه بھی قایم کے کلیات کے قلمی نسخے میں ہے اور کلیات سودا کے قلمی نسخوں میں درج نہیں —

(۴) ۲۳ شعر کی ایک اور حکایت ہے جس کا مطلع ہے —

سلف کے زمانے کا تاریخ داں یہ لکھتا ہے احوال وار فتگاں

(۵) ۱۶ شعر کی ایک تیسری حکایت ہے جس کا مطلع ہے —

سنا ہے کہ ایک مرد آزادہ طور جز اپنے نرکھتا تھا اسباب اور

(۶) ۱۲ شعر کی ایک چوتھی حکایت ہے اس کا مطلع یہ ہے —

سنا جاے ہے ایک مہوس کا حال کہ رکھتا تھا نت کیمیا کا خیال

یہ سب حکایتیں قایم کی ہیں' یہ سودا کے قلمی دواوین میں موجود نہیں اور قایم کے قلمی کلیات میں درج ہیں - ان کی تراکیب اور الفاظ وغیرہ میں اختلات موجود ہے -

(۷) ۳۵۹ شعر کی ایک طویل عشقیہ مثنوی "حکایت مرد درویش پنجاب'' سودا کے مروجہ کلیات میں داخل ہے جس کا مطلع ہے -

الٰہی شعلہ زن کر آتش دل تب دل دے بقدر خواہش دل

یہ بھی قایم کے کلیات میں موجود ہے مگر کلیات سودا کے قلمی نسخوں میں درج نہیں - سپرنگر کے بیان کے مطابق ۱۱۹۷ ہجری کے ایک مکتوبہ کلیات قایم میں یہ مثنوی ۱۰۶ صفحوں پر موجود ہے - ہردو کلیات میں اکثر مقامات پر اختلات پایا جاتا ہے - سودا کے کلیات میں مثنوی کی اصلاح یافتہ شکل ہے اور قایم کے ہاں غیر اصلاح یافتہ - قایم کی ان کل الحاقی نظموں کے اشعار کی تعداد (۵۳۳) ہے - یہ اشعار حقیقتاً سودا کے نہیں ہیں اس میں شبہہ نہیں کہ ان سب پر سودا کی اصلاح ہے لیکن اصلاح کرنے سے سودا کی تصنیف میں شمار ہونا لازم نہیں آتا - یہ مرتب کی غلطی سے داخل

ہوگئے ہیں - ان پر سودا کو مصنفانہ حق نہیں پہنچتا - البتہ یہ ضرور ہے کہ اس سے سودا کی استادانہ اصلاح اور شاعرانہ مہارت کا اندازہ ہوتا ہے —

اسی طرح سودا کے اور شاگردوں کا کلام بھی اس کے کلیات میں داخل ہوگیا ہے - ان میں ایک فتح علی شیدا ہے - شیدا کی ایک مثنوی "بوم و بقال" ہے جو فدوی لاہوری کی ہجو میں لکھی گئی ہے میر حسن اور قدرت اللہ شوق نے اس کو فتح علی شیدا کی مصنفہ بتایا ہے - شیدا میر سوز کا متبنٰی تھا اور سودا کا شاگرد جب فدوی نے احمد نگر عرف فرخ آباد میں سودا سے شاعرانہ مجادلہ کیا تو شیدا نے اس کی ہجو لکھی - میر حسن اور شوق کے بیانات کے سوا خود مثنوی کے اشعار اس خیال کی تائید کرتے ہیں —

وارد احمد نگر ایک ہیں سرد عزیز فہم میں سرتا قدم اور سراپا تمیز
شعر پر ہر ایک کے کرتے ہیں وہ اعتراض جامی کے دیواں سے خوب جانیں ہیں اپنی بیاض
حضرت سودا تلک جو میرے استاد ہیں شعر پہ ان کے بھی اب ان کے یہ ایراد ہیں

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ ان کا لکھنے والا سودا کا شاگرد ہے - مقطع میں بھی شیدا کا تخلص صاف طور سے موجود ہے - سودا کے اکثر قلمی نسخوں میں یہ مثنوی موجود نہیں اس کی بھی وہی شکل ہے جو دوسری الحاقی نظموں کی ہے - یعنی یہ اصلاح یافتہ صورت میں سودا کے کلیات میں داخل ہے - سودا کے ایک ترجیع بند کا اقتباس پیش کرتا ہوں جس سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے کہ مثنوی بوم و بقال شیدا کی مصنفہ ہے —

فدویا بولے ہے میں ہوں اوستاد میں کیا فن شاعری ایجاد
آکے شیدا جو ہو مرا شاگرد گوش دل سے سنے مرا ارشاد

مرتبہ اس کے شعر کا ہو یہ　　سخن اس کا سخن کے ہو استاد
رفتہ رفتہ سنا یہ شیدا نے　　کہا اس نے کہ خانماں بر باد
معنی کے گھر کو تونے ویران کر　　پھینک دی اس کی کھود کر بنیاد
کس طرح سے میں ہوں ترا شاگرد　　بیت سعدی کی یہ مجھے ہے یاد

کس نیاید بزیر سایۂ بوم
ورھما از جہاں شود معدوم

سودا کے ایک اور شاگرد فضل علی ممتاز کی ایک نظم " مثنوی در توصیف چھڑی " سودا کے کلیات میں داخل ہوگئی ہے - میر حسن نے اس کو ممتاز سے منسوب کیا ہے اور اس کے انتخابی اشعار بھی نقل کئے ہیں - میر حسن کا بیان ہے " ممتاز ...... یک مثنوی مسمی بہ لاٹھی نامہ خوب گفتہ کہ سلسلۂ اورابہ عصاے کلیم رسانیدہ و بسے ما نند شاخ گل برو گلہاے فکر د وانیدہ چند ازان بیادست - من مثنوی :—

ہوتی ہے دنیا میں جو کچھ تحفہ چیز
سب سے ہے ممتاز کو لاٹھی عزیز

سودا کے کلیات میں مصرعہ ثانی اس طرح درج ہے -
سب سے ہے سودا کو یہ لاٹھی عزیز

یہ مثنوی بھی سودا کے کلیات میں اصلاح یافتہ شکل میں ہے - قلمی دواوین میں موجود نہیں —

بندرابن راقم سودا کا شاگرد تھا - اس کا ایک ہجویہ قصیدہ (۱۴) شعر کا سودا کے قدیم مطبوعہ کلیات میں داخل ہے حالانکہ راقم کا تخلص مقطع میں صاف طور سے موجود ہے -

راقم نے ہجو از بس غصے میں جو کہی ہے
اُڑ جاویگا یہ تیرے اب منہ کا نور بھڑوے

الحاقی کلام کے سلسلے میں سودا کے مرثیوں پر نظر ڈالنی بڑی ضروری ہے - سودا کے مرثیوں کا دیوان ہی الگ ہے - جس میں ۹۱ مرثیے ہیں - لیکن ان میں ۱۸ ایسے ہیں جن میں مہربان کا تخلص موجود ہے - منشی کریم الدین کا بیان ہے کہ سودا مرثیوں میں مہربان تخلص کرتا تھا - یہ ممکن ہے کہ لفظ سودا کو منحوس خیال کر کے ازراہ ادب اس کا استعمال نہ کرتا ہو لیکن بقیہ (۷۳) مرثیوں میں اس کا تخلص سودا ہی درج ہے - اس لحاظ سے یہ توجیہ کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتی - اس کے سوا نہ تو سودا نے کہیں اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مرثیوں میں اس کا تخلص مہربان ہے اور نہ اس کے تذکرہ نویسوں نے - ایک مرثیہ میں مہربان خان آیا ہے ظاہر ہے کہ سودا اپنے آپ کو " خان " نہیں لکھہ سکتا تھا -

سنا احوال تم نے اے عزیزاں
کہے کیا تم سے آگے مہرباں خاں

ہمارا خیال ہے کہ یہ مرثیے بھی الحاقی ہیں اور یہ بھی اس کے ایک شاگرد اور ممدوح نواب مہربان خاں فرخ آبادی کی تصنیف سے ہیں - مہربان خاں کا تخلص رند تھا لیکن شوق کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مہربان بھی تخلص کرتا تھا چنانچہ شوق نے اس کے جو انتخابی اشعار نقل کئے ہیں ان میں دو جگہ مہربان تخلص موجود ہے - رند کے متعلق یہ توجیہ ہوسکتی ہے کہ مرثیے کے غم انگیز مضامین نیز بے ادبی کے خیال سے " رند " جیسے تخلص کا استعمال کرنا مناسب نہ تھا - اس لئے مہربان اس کی جگہ رکھہ دیا - سودا کے کسی اور شاگرد یا شمالی ہند کے ہم عصر شاعر کا تخلص مہربان نہ تھا - صرف مہربان خاں سودا کا شاگرد ہے جس نے مہربان بھی اپنا تخلص استعمال کیا ہے - مصحفی نے لکھا ہے کہ مہرباں خاں مرثیے بھی

کہتا تھا- اس بنا پر یہ خلاف قیاس نہیں که یه اسی مهربان خاں کے مرثیے هیں جو سودا سے منسوب هوگئے هیں- سودا نے ایک قصیدہ میں جو مهربان خاں کی مدح میں هے لکھا هے که مهربان خاں نے اس قسم کی نظمیں شوق اور عقیدت سے لکھی هیں -

هوکے مصروف دل و جان سے کہے هیں اون نے
بسکه در منقبت حیدر صفدر اشعار

اس شعر سے ظاهر هے که اس نے اس قسم کی نظمیں لکھی هیں - ان مرثیوں کے الحاقی هونے کی بھی وهی صورت هے جو اوپر بیان هوی هے - یه الحاقی مرثیے سودا کے قلمی نسخوں میں موجود نہیں هیں - یه تعداد میں اٹھارہ هیں اور سودا کے مطبوعه دیوان مراثی میں بقید تخلص "مهربان" موجود هیں مهربان خاں کے سلسلے میں ایک ضروری بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم هوتا هے - مهربان خاں کےاُستاد میر سوز تھے - سودا سے بھی وہ مشورہ کرتا تھا- کئی غزلیں ایسی هیں جو سوز اور سودا دونوں کے کلیات میں ملتی هیں- جن کے متعلق شوق نے لکھا هے که "اکثر اشعار در دیوان او (مهربان خاں) یافته شد که آں را میر سوز نسبت بطرف خود می کند و بعضے گویند که از مرزا رفیع است " - مصحفی نے بھی لکھا که مهر بان خاں کے دیوان میں سودا کے اشعار داخل هیں جو بہت قبیح امر هے - سوز اور سودا کے کلیات کے متعدد نسخوں کا هم نے مقابله کیا هے - بیسیوں غزلیں مشترک هیں - ان کی نسبت یه فیصله کرنا دشوار هے که در اصل کس کی هیں- آیا سوز کی یا سودا کی یا خود مهربان خان کی -مهربان خاں کے دیوان میں بقول شوق پچاس هزار اشعار هیں- اس وقت وہ همارے پیش نظر نہیں ورنه ممکن تھا که اس کے حل کی صورت نکل آتی- سودا اور سوز کے طرز و انداز

اور رنگ طبع سے بھی مصنف کا پتہ چل سکتا ہے لیکن یہ یقینی نہیں۔ شوق نے مشتبہ کلام سے سترہ غزلوں کا انتخاب درج کرنے کے بعد لکھا ہے :—

" علیٰ ھذاالقیاس اکثر غزلیات مضبوط و مربوط کہ داخل دیوان او (مہربان خان) ست آں را بمرزا رفیع و میر سوز وغیرہ نسبت می کنند خدا داند کہ در واقع از کیست " —

اس عبارت میں لفظ "وغیرہ" سے معلوم ہوتا ہے کہ 'سودا اور سوز کے علاوہ دوسرے شاعروں کا کلام بھی اس کے دیوان میں شامل ہے۔ ایسی صورت میں یہ بحث اور بھی پیچیدہ ہو جاتی ہے انجمن ترقی اُردو کلیات 'سودا' اور کلیات سوز کو خاص تحقیق سے مرتب کرا رہی ہے - ان کی اشاعت سے یہ بحث صاف ہو جائے گی —

سودا کا بہت سا کلام ایسا بھی ہے جو اب تک معرض طبع میں نہیں آیا اور عام دسترس سے باہر ہے - غیر مطبوعہ کلام میں سب سے پہلے قصائد پر نظر پڑتی ہے۔ مطبوعہ کلیات میں صرف ۴۴ قصیدے ہیں - ان کے علاوہ گیارہ قصیدے اور ہیں جو ہمیں قلمی نسخوں میں دستیاب ہوئے ہیں - ان کی تفصیل یہ ہے —

(۱) ایک قصیدہ حضرت فاطمۃ الزہرا کی مدح میں ہے جو ۸۶ شعر کا ہے اس کا مطلع ہے :—

مکھڑے سے اپنے زلف کے پردے کو تو اوٹھا
ابر سیہ میں ماہ درخشاں کو مت چھپا

(۲) دوسرا قصیدہ حضرت علی کی منقبت میں ہے (۳۴) اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کا مطلع ہے :—

لخت دل بکھرے ھیں یوں آہ سے ھنگام قلق
جنبش باد سے جوں گل کے پریشاں ھوں ورق

(۳) تیسرا قصیدہ "خلاصۃ الاوراد" ھے - یہ حضرت امام زین العابدین کی مدح میں ھے- اس کے ۶۳ شعر ھیں - مطلع یہ ھے :—

کہا میں ایک دن اُس سے کہ اے ستم ایجاد
جفا و جور کہاں تک کہاں تئیں بیداد

(۴) چوتھا قصیدہ حضرت امام حسن کی مدح میں ھے- (۲۰) شعر ھیں- مطلع یہ ھے :—

ھوا ھے دشت برنگ چمن طرب مانوس
نگہ غزال کی جوں شاخ سبز ھے محسوس

(۵) پانچواں قصیدہ حضرت امام باقر کی مدح میں ھے- اس کے ۸۳ شعر ھیں - مطلع یہ ھے :—

ھزار شکر گئے وہ خزاں کے رنج و الم
رسیدہ مژدہ کہ آمد بہار فیض قدم

(۶) چھٹا قصیدہ "صبح صادق" ھے- یہ امام جعفر صادق کی مدح میں ھے (۳۸) شعر ھیں مطلع یہ ھے :—

فلک بتا دے مجھے اپنے عیش و غم کی طرح
کرم کی کون طرح کون سی ستم کی طرح

(۷) ساتواں قصیدہ حضرت امام تقی کی مدح میں ھے- ۳۱ شعر ھیں مطلع یہ ھے :—

ھووے جو قطرہ ریز یہ چشم تر آب میں
پیدا ھو پھر بجاے گہر اخگر آب میں

(۸) آٹھویں قصیدہ کے ممدوح بھی امام تقی ھیں - ۲۲ شعر ھیں مطلع یہ ھے :—

هوا کے فیض سے ایسا ھے سبز باغ جہاں
شبیہ سنبل تر سے ھے موج ریگ رواں

(۹) نواں قصیدہ دربار اودہ کے انگریز رزیڈنٹ رچرڈ جانسن کی مدح میں ھے اس کے ۲۳ شعر ھیں - مطلع یہ ھے :—

دیکھا نہ جائے اس سے رخ گلر خاں پہ رنگ
غنچه کے بھی دھن کی ھے چشم زمانہ تنگ

(۱۰) دسواں قصیدہ شیخ جی کی ھجو میں ھے ۲۰ شعر ھیں مطلع یہ ھے :-

شیخ جی گول ھیں دستار بھی اون کا ھے گول
چھپ رھا ریش مبارک کے تلے پیٹ کا جھول

(۱۱) گیارھواں قصیدہ "مضحکه دھر" بریلی کے شیخ کی ھجو میں ۴۷ شعر کا ھے - مطلع ھے :—

لکھتا ھوں میں ایک شیخ بریلی کی حکایت
ھر چند زباں خامہ کی قاصر ھے نہایت

قصائد کے علاوہ دیگر اصناف سخن میں بھی مستقل نظمیں اور متفرق اشعار اور بند ایسے ھیں جو مطبوعہ کلیات میں موجود نہیں اور قلمی نسخوں میں ملتے ھیں - ان کی تفصیل یہاں طوالت کا باعث ھوگی - انجمن ترقی اردو کلیات سودا کو خاص تحقیق کے ساتھ شایع کرنے کا ارادہ رکھتی ھے - اس کی اشاعت سے بہت سا غیر مطبوعہ کلام روشنی میں آجائے گا —

-‡✻‡-

دہ مجلس کا اردو ترجمہ

از

(جناب کاشی پریاگی صاحب)

کوئی صاحب تھے "محمد رحمت اللہ نام قوم انصاری متخلص قیدی" جنھوں نے اپنی سکونت اور پتہ یوں لکھا ہے " ساکن شہر بیکسی مقیم محلۂ تنہائی " انھوں نے دہ مجاس کا ترجمہ فارسی سے اُردو میں کیا ہے ' ترجمہ آزاد ہے سلیس ہے ' بامحاورہ ہے اور پر اثر ہے- زبان ایسی صاف ہے کہ اب سے تیس چالیس سال ادھر کی معلوم ہوتی ہے —

" شہر بیکسی " اور " محلہ تنہائی" کی صرف یہی وجہ سمجھہ میں آتی ہے کہ بے چارے بہت زیادہ منکسر اور خاکسار تھے ورنہ موضوع ایسا نہ تھا کہ کسی نقاب کی ضرورت ہوتی —

وجہ تالیف (بہ معنی ترجمہ) یہ کی گئی ہے کہ "اکثر مومنین محرم کی چاند رات سے تعزیہ داری کی مجلس میں کتاب سننے کو اس غریب بیکس کے یہاں آتے تھے لیکن سچ یوں ہے کہ اُن میں جو صرف اشخاص (؟) یا اہل علم تھے ان کو تو احوال کتاب غم کا ظاہر ہی تھا مگر

بعض عوام الناس که بے علم محض تھے ان کے تئیں فقط تردد خاطر ھی تھا - اگرچه پڑھنے والا عبارت کی ساتھه مکرراً معنی بھی کہتا تھا تسپر بھی بسبب فارسیت کے مضمون مدعا کا سمجھنے سے رھتا تھا تو اسی واسطه اس ھیچمدان نے ترجمه دہ مجلس کا عبارت نثر میں بیچ ریختہ زبان کے لکھا " —

میرے پاس جو نسخه ھے وہ علی حافظ صاحب کا نقل کیا ھوا ھے - جس پر سنه ۱۲۲۸ ھ درج ھے -

یه ترجمه سنه ۱۲۲۳ ھ میں کیا گیا تھا اور اس کا تاریخی نام تھا " ترجمه مجلس ماتم کا " -

پرانی قلمی کتابوں میں اکثر یہی روش نظر آتی ھے که نه سنه ھوتا ھے نه مصنف یا مولف کا نام ھوتا ھے - کہیں کہیں نقل کرنے والے البته اپنی معلومات اور تحقیق سے کچھه لکھه دیا کرتے ھیں - قیدی صاحب نے بڑی ھمت کی - سنه ترجمه بھی لکھه دیا اور اپنا نام بھی مگر سکونت نه لکھی اسی لئے نه تو ان کے متعلق اور کچھه حالات مل سکے نه یه معلوم ھوسکا که یه کتاب علی حافظ کے پاس سنه ۱۲۲۸ ھ میں یعنی ختم ترجمه کے بعد پانچ ھی برس کے اندر کیسے پہنچ گئی -

غور کرنے کے بعد میں صرف دو ھی نتیجوں پر پہونچ سکا ھوں -

۱ - یا تو یه کتاب اس قدر مقبول اور مشہور ھوئی که پانچ ھی برس میں کانوں کانوں پہونچ گئی -

۲ - یا یه که بالکل مشہور نہیں ھوئی اور کانوں کی کانوں ھی میں رہ گئی -

پہلا نظریه نگاھوں میں اس لئے نہیں جچتا که اگر اس کتاب کو

قبول عام کا خلعہ مل گیا ہوتا تو "منشورات" میں اس کا ذکر ہوتا، تذکروں میں آتا - مگر ایسا نہیں ہوا -

عدم قبول کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ترجمے کی زبان اچھی نہیں یا کچھ داخلی موانع ہیں - میرے نزدیک عام طور پر مشہور ہونے کے اسباب کچھ اس طور پر رہے ہوں گے -

۱ - ایک تو قیدی صاحب ایسے "بیکس" تھے کہ بار بار اپنے کو "غریب بیکس" کہتے ہیں -

۲ - اردو پریس کا ابتدائی زمانہ تھا، نشر و اشاعت، طباعت و کتابت آسان چیزیں نہ تھیں -

۳ - خود قیدی صاحب زیادہ نشر کے متمنی نہ تھے - انہوں نے تالیف کی غرض اتنی ہی بتائی ہے کہ جو لوگ فارسی نہیں جانتے وہ بھی سلیس زبان میں مطالب سمجھ لیں اور خود مولف داخل حسنات ہوجائے - چونکہ رونے رلانے کی چیز تھی اور ایک خاص فرقے سے مخصوص تھی لہذا اس کی شہرت کچھ ایسی زیادہ نہ ہوسکی -

مگر آج سنہ ۱۳۵۰ ھ میں جب ہم سنہ ۱۲۲۳ ھ کی زبان دیکھتے ہیں تو تصویر ہوجاتے ہیں - خصوصاً اس زمانے کے اور نثر کے ادبی کارناموں کے سامنے جب ہم اس کی عبارت کو رکھ دیتے ہیں تو آنکھیں کھل جاتی ہیں -

اس ترجمے میں نہ تو آورد ہے نہ تصنع نہ پر شکوہ الفاظ ہیں، نہ سجی ہوئی تشبیہیں، نہ خلاف فطرت عناصر کی چاشنی ہے، نہ رومانیت کا غلبہ - سیدھی سادی بات ہے مگر بلا کا اثر اور غضب کی سادگی ہے -

دوسرے نظریے میں موافق اور خلاف دونوں عنصر ہیں -

سید علی حافظ صاحب (کاتب) نے سنہ ۱۲۳۶ ھ میں یہ قلمی نسخہ

میرے پر دادا میر باقر علی صاحب کے امام باڑے میں نذر کیا تھا - سر کتاب پر یہ عبارت ہے -

" بتاریخ غرہ محرم الحرام سنہ ۱۲۳۶ ھجری قد سے ایں کتاب مصیبت انتساب را سر گشتہ وادی عصیاں احقر الناس علی حافظ برائے داخل شدن ثواب جماعۃ مومنین در امام باڑہ سیدی سندی میر باقر علی صاحب نذر نمود"..

یہ امام باڑہ موضع مگرسن تحصیل ھنڈیہ ضلع الہ آباد میں تھا - پندرہ برس ھوے کہ میر عابد علی صاحب ایڈوکیٹ مرحوم نے اسی جگھہ خام امام باڑے کو منہدم کرا کے پختہ بنوا دیا ھے - رونے رلانے کی چیز تھی امام باڑے میں نذر ھو کر اسی چار دیواری میں نظر بند ھو گئی-

گانوں کے بڑے بوڑھوں سے اور مقامی حضرات کے خاندانی شجروں سے علی حافظ صاحب کا دھندلا سا پتہ تو چلتا ھے مگر قیدی صاحب کا کچھہ پتہ نہیں چلتا - کیا عجب ھے کہ پردیسی رھے ھوں اور چلتی پھرتی چھانوں کی طرح اس گانوں میں بھی آ نکلے ھوں- بھر کیف یہ کام صاحبان نظر کا ھے ' اُمید ھے کہ ادبیات میں بال کی کھال کھینچنے والے حضرات قیدی صاحب کا پتہ بھی لگا لیں گے اور اس ترجمے کو شایع کر کے اس زمانے کے نثری صف میں اس کی جگھہ بھی نکال لیں گے -

قیدی صاحب نے اپنے ترجمے کے پڑھنے کے متعلق چند ھدایتیں بھی لکھی ھیں جو میں انھیں کے الفاظ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاھتا ھوں - ممکن ھے کہ مولف کی وسعت نگاہ ' علم تقریر اور فن کتابت کے متعلق بھی کچھہ مدد مل سکے - ان ھدایات کا التزام ساری کتاب میں بسم اللہ سے تمت تک ھے - نشانات سب سرخ روشنائی سے ھیں -

" جو کوئی اس کے تئیں بشرط آئین کے بڈھے تو البتہ احوال واضح

ھوے اور سب کی فہم میں آوے اور آئین اس کے بڈھنے کا یہ ھے کہ آخر ھر فقرے کے حرف فا (ف) سرخی سے لکھا ھے وہ علامت فقرے کی ھے اور جہاں کہیں نقاط (∴) ھے اشارہ نظم کے مصرعہ کا ھے اور جس جگھہ کہ خط تب (ـــ) کا کھینچا ھے تو وہ کنایہ ھے کہ وھاں سے مطلب عبارت اور مضمون کا علعدہ ھے - پس فقرے کے تئیں ابتدا سرخی انتہا تلک بدوں سکتہ بڈھے موجب یہ کہ عبارت جو نسر ھے اگر فقرہ مل جاوے تو عبارت نہ رل جاوے اسی واسطے نشان مقرر رکھے اگرچہ کچھہ صنعت تو نہیں " -

خود اپنی عبارت کے متعلق لکھتے ھیں -

" کہ عبارت سلیس ھے اور صنایع و بدایع سے عاری محض اور رنگینی و انشا پردازی سے خالی مطلق اگر اصلاح فرماوے (پڑھنے والا) تو سزا وار ھے باقی مختار ھے والسلام علی اھل الکلام -

ساری کتاب ایک سو ستر صفحات کی ھے - ھر صفحے میں ۱۳ سطریں ھیں - پندرہ سولہ الفاظ في سطر کا اوسط ھے - ھر باب سے ایک نئی شہادت شروع ھوتی ھے ۱۶۰ صفحہ تک دس شہادتیں یا مجلسیں ختم ھوجاتی ھیں اس کے بعد " شمہ از حالات بعد شہادت حضرت سیدالشہدا امام حسین علیہ السلام " ھے —

ساری سرخیاں سرخ روشنائی سے ھیں اور فارسی میں ھیں —

اب میں کہیں کہیں سے نثر و نظم کے نمونے دے کر اس مضمون کو ختم کرتا ھوں - صفحہ ۲ پر حمد خدا میں لکھتے ھیں —

ھے وہ خداے پاک جہاں آفرید کار		جس نے بناے سب یہ نہاں اور آشکار
ب یہ سیہ سپید ھے قدرت کے رنگ سے		یعنی دو رنگ دیکھو جو ھو لیل اور نہار

ہے سب ظہور اس کا یہ کیا ارض کیا سما صحراے خار خار یہ دامان کو هسار
صنعت سے اس کی خالی نہیں ہے کوئی جگہ یا گُل زمیں ہے یا کہ کہیں ہے یہ شورہ زار
جبر و قدر کا سارا یہاں ہے معاملہ تابع ہیں اس کے امر کے جبر اور اختیار
قیدی ہے اس کے امر کا جو کچھ ہے جلوہ گر خلاق ذوالجلال خداوند کردہ کار

سر دست میں قیدی صاحب کی کتاب کے نمونے دے دوں گا اور تنقید نہ کروں گا- اگر خدا کے فضل سے وہ دن بھی آیا کہ یہ مکمل تصنیف شایع ہوکر اہل نظر کے سامنے آگئی اس وقت موازنہ اور تبصرے کا لطف ہوگا- ابھی تو بے فصل کا راگ معلوم ہوتا ہے -

صفحہ ۳ نعت میں کہتے ہیں -

ہے ہم سے روسیاهوں کو اس سے ہی کچھ پناہ
یعنی شفیع حشر ہے وہ مرسل اللہ
غمخواری عاصیوں کی رہی زیست بھر تمام
اُمت کے واسطے ہی تھی ساری یہ رسم و راہ

اصحاب رسول کی منقبت میں فرماتے ہیں -

مرتبہ اصحاب کا کس سے بیاں کچھ ہو سکے
ہے حدیث آیت سبھی بس حق میں ان کے سب نزول
اے معاذاللہ جو کوئی دشمن اصحاب ہو
دین احمد سے مخالف ہے سراسر وہ فضول

صفحات ۱۰ سے ۱۵ تک -

مجلس اول در ذکر وفات جناب رسول عالم شفیع اُمم حضرت احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ (صلعم) -

باد صبا نے سر پہ اُڑا یا ہے کیوں غبار ہے جیب چاک کس لئے یہ صبح ایکبار

ہے کس کے غم میں ہائے بھلا شام ماتمی دھونی سی کیوں لگائے ہیں بیٹھے یہ کوہسار
چادر ہے آہ ابر کی یوں تیرہ رنگ سی نعرہ زناں ہے رعد تو ہے برق بے قرار

ایک دن جناب رسول خدا بیماری کے عالم میں حجرۂ مبارک سے باہر نکلے اور بلال کیتئیں ارشاد کیا کہ جانا مسلمانوں کے تئیں کہہ آنا کہ آج سبب جمعہ کے مسجد جمع ہو کر آویں... ... ... بعد فراغت نماز کے منبر پر چڑہ کر خطبہ حمد الہی کا ادا کیا اسکے بعد فرمایا ... ... اب تم سے جدا ہوتا ہوں .... جس شخص کا تم میں سے کچھہ قرض میری طرف ہو تو اس کی لشان (؟) لے یا بخش دے اور جسکوکہ میں نے کسی ڈھب آزردہ کیا ہو وہ اب آوے اور اس کا بدلہ مجھہ سے لے جاوے کیونکہ آسودہ اور سبکبار واصل خدا ہوں ... . ایک شخص کہ اس کا عکاسہ نام تھا اُٹھہ کر یوں عرض کرنے لگا ... ... آپ نے تبوک کے سفر میں ناقہ کو غضب سے کوڑا اُٹھایا تھا - ضرب اس کوڑے کی سرے کاندھے پر ایسی لگی کہ بہت آزار دیا سو اب بدلہ اس کوڑے کا چاہتا ہوں تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اے عکاسہ تو جانتا ہے کہ وہ کون سا کوڑا تھا اس نے عرض کیا .... وہ جو کوڑا گندھا ہے اور خفران کے چوب کے دستہ میں ٹنکا ہے- یہ سنتے ہی حضرت رسول خدا نے سلمان کیتئیں ارشاد کیا کہ جاوہ کوڑا فاطمہ کے یہاں سے لے آ .... سلمان نے جو کوڑا حضور پر نور میں لا کر رکھا تو دیکھتے ہی اس کے دفعتاً تمام صحابہ سے غل وادریغا کا اٹھا ہائے کیا کہئے کہ ایک شور قیامت کا سا پڑا اسوقت ہر ایک اصحاب نے افسوس کھایا اور اسکے پاس جاکر سمجھایا کہ اے عزیز تو جانتا ہے کہ پیغمبر خدا نہایت رنجور رہے اور کوڑا کھانے سے معذور ہے پس یہ خیال جانے دے اور ہم سب کو دس دس کوڑے لگالے اوسنے

کہا یہ سب خلاف ہے مجھے نہیں قبول ... ... یہ سن کے حضرت رسول نے فرمایا کہ ہرگاہ میں نے کسی کے کوڑا بذات اپنی مارا ہو تو پھر قصاص اسکا تم سے کیونکر ہو سکتا ہے ... ... اس وقت آپ نے عکاسہ کیتئیں تاکید سے فرمایا کہ اب قصاص کیوں نہیں جلد لیتا ہے ... ... عکاسہ نے التماس کی کہ جس وقت کوڑا مرے لگا تھا تو بدن میرا ننگا تھا ... ... یہ سنتے ہی جناب رسول نے پیرھن بدن مبارک سے نکال لیا اور کاندھا اپنا ننگا کیا - جو ہیں نظر عکاسہ کی مہر نبوت پر پڑی ووہیں کوڑا ہاتھہ سے ڈال کر مہر چوم لی اور چہرہ اپنا آپ کے شانوں سے مل کر عرض کی کہ یا رسول‌اللہ غرض غلام کی یہ نہ‌تھی کہ آپ سے قصاص لیجئے بلکہ خصوص مراد اپنے دل کی یوں تھی کہ مہرنبوت کو چوم لیجئے - کیوں کہ آپ نے فرمایا ہے کہ من مس جلدي فلا تمسہ النار یعنی جو کوئی چھوئے مرے بدن کیتئیں پس نہ جلے گا وہ دوزخ کی آگ میں —

شیخ ملا نصرتی ملک الشعراے بیجاپور

(۲)

علی نامہ

ماہ ذیحجہ سنہ ۱۰۴۵ ھ (۱۶۳۶ ع) میں جب مغلوں اور سلطان بیجاپور میں مصالحت ہوگئی اور جنگ و پیکار کا خاتمہ ہوگیا تو سلطان محمد عادل شاہ کو اپنی حکومت کی توسیع اور فروغ کا موقع ملا - اس نے بیس سال کے عرصے میں اپنی حکومت کو انتہاے عروج تک پہنچا دیا اور اس کی قلمرو بحیرۂ عرب سے خلیج بنگال تک جا پہنچی - جب محمد عادل شاہ کا انتقال (سنہ ۱۰۶۷ ھ ۱۶۵۶ ع) ہوا تو اس کے ملک کا سالانہ محاصل ۷ کروڑ ۸۴ لاکھ تھا اور اس کے علاوہ باجگزار ریاستوں سے سوا پانچ کروڑ روپیہ سالانہ بطور خراج کے اور وصول ہوتا تھا - فوج میں اسی ہزار سوار اور اڑھائی لاکھ پیدل اور ۵۳۰ جنگی ہاتھی تھے - اگر باجگزار ریاستوں کو بھی ملا لیا جاے تو ایک طرف اس کے علاقے میں بمبئی کے اضلاع کنارا اور دھارواڑ تھے اور دوسری طرف مدراس کے اضلاع کرنول اور بلاری اور ریاست میسور کا بہت سا حصہ - اس سے عادل شاہ کی قلمرو کی عظمت و شان کا اندازہ ہو سکتا ہے —

باپ کی وفات پر علی عادل شاہ ثانی کی عمر ۱۸ سال کی تھی -

امرا میں حسد و رقابت کی آگ بھڑک رهی تھی ' سرحدی صوبوں پر بغاوتیں نمودار هو رهی تھیں ' اس پر اورنگ زیب کی چڑھائی اور بعض عادل شاهی امرا کی غداری نے طرح طرح کی پیچیدگیاں اور پریشانیاں پیدا کردی تھیں' تاهم بیجاپور برابر مقابلہ کرتا رها - اتنے میں اورنگ زیب کو دکن کی مہم چھوڑ کر دهلی جانا پڑا - وهاں تخت و تاج اس کے انتظار میں تھے - اس سے بیجاپور کو دم لینے کا موقع مل گیا - علی عادل شاہ نے بڑی همت اور هوشیاری سے کام لیا اور اپنی حکومت کو سنبھال لیا - وہ خود میدان جنگ میں آیا ' شیواجی کی بڑھتی هوئی قوت کو روکا ' کرنول کے حبشی سرداروں کو نیچا دکھایا ' راجہ بدنور کی سرکوبی کی اور آخر میں مغلوں کے فوجی سیلاب کو جو جےسنگھ کی سرکردگی میں بڑھتا هوا چلا آرها تھا ' پیچھے هٹایا —

اِس مثنوی میں جو علی نامہ کے نام سے مشہور هے اِنهیں مہمات کے کارنامے هیں —

نصرتی کا بڑا کمال یہ هے کہ اس نے تاریخی واقعات کو صحیح ترتیب ' بڑی احتیاط اور صحت کے ساتھ بیان کیا هے - حسن بیان اور زور کلام کے تمام اسلوب هوتے هوے کہیں تاریخی صحت سے تجاوز نہیں کیا - تاریخ سے واقعات کو ملا لیجئے کہیں فرق نہ پائیے گا بلکہ بعض باتیں شاید اس میں ایسی ملیں گی جن کے بیان سے تاریخ قاصر هے - باوجود اس کے واقعات کی تفصیل ' مناظر قدرت کی کیفیت ' رزم و بزم کی داستان اور جنگ کا نقشہ کمال فصاحت و بلاغت اور صناعی سے کھینچا هے - اردو زبان یونہیں رزمیہ نظموں سے خالی هے اور اگر ایک آدہ رزمیہ نظم جو اس سے قبل لکھی گئی هے وہ هرگز اس کو نہیں پہنچتی - یہ رزمیہ مثنوی هر لحاظ سے

ہماری زبان میں بے نظیر ہے —

اس نظم کے تفصیلی بیان سے قبل ایک بات اور لکھہ دینی چاہتا ہوں جس کا جاننا ضروری ہے - وہ یہ کہ مغلوں اور بیجاپوریوں کی اس جنگ میں شیواجی کو بہت بڑا دخل ہے - جب بیجاپوری حکومت نے اس کا قافیہ تنگ کیا تو مغلوں کی منت سماجت کرکے ان سے جا ملا اور بیجاپور کی فتح کا سبز باغ دکھایا اور جب کسی قدر آزادی ملی اور پھر لوٹ مار شروع کی اور مغلوں نے دبایا تو بیجاپوریوں سے سازباز کرلیا - بعد میں حکومت بیجاپور اور مغلوں میں اتحاد تو ہوگیا مگر پھر بھی وہ ایک دوسرے سے بدگمان رہے - حکومت بیجاپور کو یہ بدگمانی تھی کہ مغل شیواجی سے در پردہ ساز رکھتے ہیں اور مغل یہ سمجھتے تھے کہ حکومت بیجاپور خلاف معاہدہ پوشیدہ طور سے شیواجی کی امداد کرتی ہے - ان دونوں کی بدگمانیاں کچھہ بیجا نہ تھیں اور اس کی وجہ سے انھوں نے بہت کچھہ نقصان اٹھایا - ان تاریخی الجھیڑوں کو چھوڑ کر اب ہم اصل کتاب کی طرف رجوع کرتے ہیں -

اس مثنوی میں بھی نصرتی نے وہی اهتمام کیا ہے جو گلشن عشق میں پایا جاتا ہے - یعنے ہر باب کا عنوان ایک شعر ہے جس میں اس باب کے اصل واقعے کا خلاصہ یا اشارہ اس شعر میں آجاتا ہے - عنوان کے یہ تمام شعر ایک بحر اور قافیے میں ہیں - ان تمام اشعار کو یک جا جمع کرلیا جاے تو لامیہ قصیدہ ہوجاے گا جس میں مثنوی کا سارا مضمون آجاے گا - کتاب کا عنوان یہ دو شعر ہیں —

حمد اول ہے خدا کا کہ جنے روز ازل
دیا ہے همت مرداں کو جو توفیق سوں بل

رکھا اس نامۂ نامی کا علی نامہ نانوں

تا جنم جگ یو زمانے کے گلے ہوے ہیکل *

اس کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے - حسب معمول اول حمد ہے - نصرتی کے حقیقی شاعر ہونے میں کلام نہیں' اس نے یہ التزام رکھا ہے کہ جس رنگ کی مثنوی ہے اسی رنگ کی حمد بھی ہو یعنے عشقیہ مثنوی کی حمد عاشقانہ ہے جیسا کہ گلشن عشق کے بیان میں ذکر ہو چکا ہے اور رزمیہ مثنوی کی حمد شان رزم رکھتی ہے - چند ابتدائی شعر ملاحظہ ہوں

سرانا سرے اس سکت دار کوں
کہ آدھار ہے جن نرادھار کوں
سکندر کوں دارا پہ جن جس دیا
ادک کج تھے شرزے کے ہت کس دیا
دیا یوں توں رستم کے پنجے میں زور
پڑیا ڈر تھے جس دل میں دیواں کے شور
نھنا ساچ ہیرا نپا کھن منے
بڑا بل دیا پیسنے کھن منے
دکھت سرکش آتش میں باد غرور
چھنے ہت تھے پانی کے تس مکھہ تھے نور
کرنہار غالب کوں مغلوب وے
طلب کی ہے طالب کا مطلوب وے

تعریف اس قوی قادر کو زیبا ہے
کہ جو بے آسراؤں کا آسرا ہے
جس نے سکندر کو دارا پہ غلبہ دیا
اور شیر کے پنجے کو ہاتھی سے زیادہ قوت بخشی
تو نے رستم کے دست و بازو میں وہ زور دیا'
کہ اس سے دیووں کے دلوں میں دہشت بیٹھ گئی
ننھا سا ہیرا کان میں پیدا کیا
اسے گھن میں پیسنے کو کتنی بڑی قوت دی
سرکش آگ میں کس قدر باد غرور نظر آتی ہے
آخر اس کے منہ کا نور پانی کے ہاتھوں چھینا گیا
وہی غالب کو مغلوب کرنے والا ہے
اور وہی طالب کی طلب کا مطلوب ہے

---

* ایک دوسرے نسخے میں یہ مصرع یوں ہے

" جس کی ہر رزمیہ رستم کے گلے کا ہو ہیکل "

الہی قوی توں سرے تجھہ سکت الہی تو قوی ہے اور قوت تجھی کو سزاوار ہے
نہ دیتا توں بہاتا رتی کس کے ہت تو اگر نہ دیتا تو کسی کے ہاتھہ کچھہ نہ آتا
ننہے اور بڑے میں تہیں حد بندیا چھوٹے اور بڑے میں تونے حد باندھی
دونو میں توں شمشیر کا سد بندیا اور دونوں میں تلوار کي دیوار کھڑی کردي
کہ کوی کس اوپر داٹ آنا سکے تا کہ ایک دوسرے کو دبا نہ سکے
گر آوے اچھوتا وو جانا سکے اور جو دباے تو اچھوتا نہ بچ نکلے
سکت پاے کوی دیس موذی اگر اگر کچھہ دن کسی موذی کو زور حاصل ہو بہی گیا
وبال اس پہ دے جیونکہ چمٹی کوں پر تو چیونٹی کی طرح اسے پرد ے کر وبال نازل کرتا ہے

اس کے بعد خدا کے عدل کی تعریف کرتا ہے کہ کس طرح موذیوں کو قابو میں رکھتا ہے اور موقع موقع سے غضب اور کرم کرتا ہے - چونکہ یہ رزمیہ نظم ہے اس میں تلوار کی تعریف کرتا ہے کہ خدا نے اس میں کیا کیا جوہر رکھے ہیں اور اسے وہ قوت دی ہے کہ ایک ایک کونے سے لاکھوں خزانے باہر نکال لاتی ہے - اور آخر میں کہتا ہے

کیا توں لوہا نامۂ صلح کل

یعنے تلوار ہی صلح کا نامہ ہے' اس کے بغیر امن نہیں ہوتا ـــ

لوہے کوں کیا توں سفر کا رفیق لوہا نیں تو زر دشمن ہر طریق
لوہے بن نکوی یار جانی ہے ہور لوہے تھیچ ہے یار جانی کوں زور

پھر بڑی خوبی سے لکھتا ہے کہ ہر شے جسے خدا نے بڑائی دی ہے اسے اس کی حفاظت کے لیے ہتیار بھی دیے ہیں

توں سر جا ہے جے شے بزرگی کے کاج تو نے جس کسی کو بڑای کے لیے پیدا کیا ہے
کیا نین بڑا اُس کو ہتیار باج اُسے بغیر ہتیار کے نہیں رکھا
فلک کوں جو تاریاں کی جوشن دیا آسماں کو تو نے تاروں کا جوشن دیا

ملمع سے چندنی کے روشن کیا
اور اُسے چاندنی کی جگمگاھٹ سے روشن کیا

دیا تس کھڑک سورساتابدار
اور اُسے سورج سی چمکتی ہوی تلوار دی

سورج کوں دیا خنجر آبدار
اور سورج کو خنجر آبدار عطا کیا

سمند ر میں موجاں ھتیاراں کی فوج
سمندر کی موجیں گویا ھتیاروں کی فوج ھے

جواھر کے ھتیار پانی کی موج
اور جواھر کے ھتیار پانی کی موج ھے (آب)

دیا آگ کے ھت توں خنجر ھزار
تونے آگ کو ھزاروں خنجر دیے ھیں

کرے باؤ پر دمبدم تیز دھار
جوھر دم ھوا پر اپنی دھار تیز کرتی رھتی ھے

نہ کرنے برس ابر عالم کو غرق
مبادا بادل برس برس کر دنیا کو غرق کردے

دیا رعد کے ھات توں تیغ برق
تونے رعد کو برق کی تلوار دی

سورج کي تہیں روز کھڑ سان کاڑ
توھر روزسورج کی سان (فسان) کو باھر نکالتاھے

دیوے نور کي مہ کے خنجر کو باڑ
تاکہ چاند کے خنجر کو نور کی باڑ دے

سپر کی تو صورت دیا پھول میں
پھول کو تونے سپر کی صورت دي

نشاں بھال کا غنچہ مقبول میں
اور غنچہ میں بھال کا نشان رکھا ھے

توں باگاں کوں خنجر سوں چڑنکہ دیا
تونے شیروں کو خنجر سے بڑھکر ناخن دیے

دسن گج کوں کر گرز بیشک دیا
اور ھاتھی کوں دانت ساگرز دیا

کیا خنجر مار پر زھر توں
سانپ کو زھر بھرا خنجر دیا

بچھو ھت دیا نیزۂ قھر کوں
اور بچھو کو نیزۂ قھر عطا کیا

نظر میں توں خوباں کوں تیزی دیا
تونے معشوقوں کی نظر میں تیزی رکھی ھے

توں چھب کی کھڑگ میں ستیزی دیا
اور چھب کی تلوار کو جنگ کی قوت دی

صباحت میں دے توں ملاحت کا آب
صباحت میں ملاحت کی رونق ملاکر

رکھیا حسن کی تیغ کا جگ پہ داب
تونے دنیا میں حسن کی تلوار کو شوکت بخشی

لینے ملک جاں خوبرویاں کی نین
اقلیم جان کی تسخیر کے لئے تونے خوبرویوں

دیا ہے توں تیر و کماں ان کوں عین کی آنکھوں کو تیر و کمان عنایت کیے
جنوں کا پلک مارنا بھوں چڑا جن کا بھویں تان کر پلک مارنا
خدنگ ناز کا دل میں چھوڑیں گڑا گویا ناز کے تیر کا دلوں میں گڑونا ہے

غرض شاعر نے ہر شے میں اس کی اپنی حفاظت یا دوسروں کے بچاؤ یا تسخیر کے لیے طرح طرح کے ہتیار پیدا کیے ہیں - حمد کے دو چار شعر اور لکھتا ہوں جس سے نصرتی کے شاعرانہ کمال کا اندازہ ہو گا —

سکت تجھے دریا کوں ماٹی میں داب یہ تیری ہی قدرت ہے کہ سمندر کو مٹی میں دباکر
پون پر نپانا گگن کا حباب ہوا میں آسماں کا حباب بنایا
سبھوں کا سمجھ تھک رہا ہے یہاں سب کی عقل حیران ہے کہ ایک
کہ یک بڑ بڑے میں بسا یا جہاں بلبلے میں یہ سارا جہان کیونکر بسا دیا
لکھن ہار ہر نقش توں بے قلم تو بغیر قلم کے نقش و نگار کرنے والا ہے
سفیدی سوں کے رنگ پنپھاے جم اور سفیدی سے بیسیوں رنگ پیدا کرتا ہے
ہمن عقل تجہ حکمتاں پاس یوں ہماری عقل تیری حکمت کے سامنے ایسی ہے
سوا لاک پربت پہ چمٹی ہے جوں جیسے سوا لاکھ پہاڑوں پر ایک چیونٹی
ترے یک پنے پر دھریں اتفاق تیری وحدت پر سب کو اتفاق ہے
موحد و ملحد میں نین یہاں نفاق اس میں ملحد و موحد کا اختلاف نہیں
دھنی تونچ ہے مسجد و دیر کا مسجد و دیر کا مالک توہی ہے
تہیں سب سبب صلح ہور بیر کا اور توہی صلح و عداوت کا سبب ہے

یہ آخری شعر کس قدر بلیغ ہے - یعنے مسجد و دیر سب ترے ہی ہیں اور یہ جو آپس میں صلح یا عناد ہے وہ تیری ہی وجہ سے تو ہے - یعنے تیری ہی ذات و صفات کی بحث اور جھگڑے کی وجہ سے اختلافات پیدا

ہوے اور ملتوں میں تفرقہ ہوا- غرض اتفاق ہو یا نفاق وہ تیری ہی تلاش میں ہے اور اس لئے تیرا ہی ان سب میں ظہور ہے۔ اس کے آگے کہتا ہے -

ترا انت پانے میں سب جگ ہے غرق تیری انتہا پانے میں سارا زمانہ منہمک ہے

بڑا پن پچھانت میں فرقیاں میں فرق البتہ تیری عظمت کے پہچاننے میں بہت کچھ فرق ہے

نہ پاے تری ذات کوی جز صفات سواے صفات کے تیری ذات کو کوئی نہ پاسکا

ہرایک گھٹ میں گھٹ ہو یو یک دھات بات اصل یہ ہے کہ تو ہر جگہ ساری ہے

نظر کر کہ میں دیکھتا ہوں جیسے جب میں غور سے دیکھتا ہوں

تو ہر گھٹ کے گھر میں دوا توں دسے توہر جسم کے گھر میں توھی ایک چراغ نظر آتاھے

اگر دین حق کے نہ قابل اہیں جو دین حق کی صلاحیت نہیں رکھتے

ولے تیری وحدت کے قائل اہیں وہ بھی تیری وحدت کے قائل ہیں -

اب مناجات میں سے چند شعر نقل کرتا ہوں ' چونکہ یہ شعر آسان ہیں اس لئے ان کے معانی یا مطلب لکھنے کی ضرورت نہیں —

پلا مجھ محبت کا ایسا شراب کہ ہو مست بسروں دو جگ کا حساب

مرے مکھ تے کاڑ * اس اثر کا کلام کہ ہر بول ہوے ہے پرستاں کوں جام

دھرنہار اثر حال کا قال دے دلاں کوں جم اس قال تے حال دے

بھر یا رکھ مرے دم میں افسوں سدا کہ جگ ہوے مسخر یو سن کر ندا

مرے شعر سوں زندہ کر ہر شعور سمج مجھ بچن تے توں کر جگ میں پور

مری بات انگیں + بعث کر سب کی رد سخن کر مرا عارفاں میں سند

سیاہی کوں کر میری ظلمات دھات ‡ قلم میں مرے خضر کی دے صفات

کہ ظلمات میں اِس جو یو خضر جاے برسنے کوں امرت ابھال ¶ ہو کہ آے

* نکال - + آگے - ‡ طرح - ¶ بادل -

(یعنے جب یہ خضر (قلم) ظلمات (دوات کی روشنائی) میں جاے تو
امرت' برسنے کے لیے ابر ہو کر آے —

مرے فن کے بن کوں عطا کر او آب کہ ہر پھول ہوے چشمۂ پر گلاب
ہر ایک پھول کوں دے توں اس دھات رنگ کہ ہوے ہر صبح دیکھ خورشید دنگ
خیالاں کوں مجھہ باؤ کی اوج دے طبیعت کوں دریا کی نت موج دے

(یعنے میرے خیالات کو ہوا کی سی بلندی عطا کر اور میری طبیعت کو
دریا کی سی موج دے)

مری جیب کوں سیف کر آبدار عنایت کی رکھہ دم سوں نت تیز دھار

(میری زبان کو شمشیر آبدار بنادے اور اپنی عنایت کے دم (سان)
سے اس کی دھار ہمیشہ تیز رکھہ)

کہ ٹک جس طرت آبھے وو زباں گزر جاے کر موشگافی وہاں

(تاکہ جس طرت وہ (زبان) ذرا پھر جاے تو وہاں سے موشگافی کرتی ہوی نکل جاے)

ذکر معراج کی تمہید شب معراج کے وصف سے اس طرح شروع کی ہے

مرصع کی کسوت سوں یک نس سنوار رات نے زرق برق مرصع لباس پہنا
رکھی آرسی چاند کی بر منجھار اور چاند کا آئینہ بغل میں لیا
جگا جوت نا دیکھہ تس ابرھن اُس زرق برق لباس کو دیکھہ کر سورج چکا چوند
اندھارے لیا موچ سورج نیں ا میں آگیا اور اپنی آنکھیں میچ لیں

تیسرا شعر کیا اچھا لکھا ہے -

جو خوش مُکھہ پہ زلفاں پریشاں کرے
ہر یک سیام بادل کو گریاں کرے

یعنے اگر وہ رخ زیبا پر زلفیں پریشاں کردے تو کالے بادل اُسے دیکھہ
کر پانی پانی ہو جائیں —

جب صاحب لولاک عرش کے مقام خاص پر پہنچتے ہیں تو لکھتا ہے۔

دسیا روپ پردے میں وو بے حجاب — کہ جس نور کے ذرہ کئی آفتاب
سمجھنے کی ہے بات کر دل کوں جمع — کہ فانوس میں کئیں بھی چھپتی ہے شمع

اسی بیان کے آخر میں اس نے چاروں اصحاب کا ذکر ضمناً اس طرح کر دیا ہے کہ جب آنحضرت معراج سے واپس آے تو اپنے چاروں اصحاب سے اس کا ذکر کیا اور ہر ایک صحابی کے ساتھہ صرف ایک ایک لفظ تعریف کا لکھہ دیا ہے - لیکن حضرت علی کی منقبت اس نے الگ لکھی ہے —

اس منقبت کے ضمن میں حضرت بندہ نواز کی مدح بھی لکھہ گیا ہے - وہ شعر یہ ہیں —

مجھہ اپنے کرم ساتھہ کر شاد کام — کہ ہوں تجھہ کہینہ خلف کا غلام
جسے ناؤں عالم میں بندہ نواز — محمد حسینی ہے گیسو دراز
محبت سوں اپنے تو فرزند کی — توں دلجوی کارن یو دلبند کی
بنجھانے کو اِس تشنگی تھے جلا — محبت کا یک جام ایسا پلا
جو سب تن میں حق عشق کا چڑ اثر — قیامت کی رہوں ہول تھے بے خبر

اب سلطان علی عادل شاہ ثانی کی مدح شروع کرتا ہے

بکھانوں اِتا مدح شاہ زماں — اب میں شاہ زماں کی مدح بیان کرتا ہوں
کہ ثانی سکندر ہے صاحب قراں — جو صاحب قران اور سکندر ثانی ہے
قلم آج جو مجھ جہانگیر ہے — یہ بادشاہ کی صفت لکھنے کی تاثیر ہے
صفت شہ کے لکھنے کی تاثیر ہے — کہ میرا قلم آج جہان پر چھایا ہوا ہے
زہے شاہ عادل سمی ولی
علی ابن سلطاں محمد بلی

جو میں ورد تجھ اسم اعظم کیا	جب سے میں نے تیرے اسم اعظم کا ورد کیا ھے
بچن سوں مسخر کیو عالم کیا	میرے کلام نے سارے عالم کو مسخر کر لیا ھے
دکھن نت ھے اس فخر تھے باغ باغ	دکھن اس فخر سے پھولا نہیں سماتا
کہ تس گھر ھے تجھ سا گھر شبچراغ	کہ اس کے گھر میں تجھ سا لعل شبچراغ ھے
ھر ایک دیپ تجھ دیپ آنا ضرور	ھر چراغ کا تیرے چراغ کے پاس آنا لازم ھے
کہ سب ملک اندھارا دکون پر ھے نور	کیونکہ سارے ملک میں اندھیرا ھے اور صرف دکن روشن ھے
تیرا چتر خورشید کا سایہ باں	تیرا چتر آفتاب کا سایہ باں ھے
منگے تجھ علم کا پناہ آسماں	اور آسماں تک تیرے جھنڈے کی پناہ مانگتا ھے
تری ذات تھے ھے شجاعت کو ناؤں	شجاعت کا نام تیری ذات سے ھے
کہ پالیا ھے کر تیغ کی جس پہ چھاؤں	کیونکہ تو نے اسے تلوار کی چھاوں تلے پالا ھے
صفت تجھ کھڑگ صف میں کرتیں بیاں	اپنی صفوں میں تیری تلوار کی صفت کرتے کرتے
پڑے موں میں چھتی کے آڑی زباں	چیونٹیوں کی زبان لال ھے
ترے ھت تھے نت آبرو پائے تیغ	تیرے ھاتھہ سے تلوار ھمیشہ اس طرح آبرو پاتا ھے
کہ جوں فیض پاتا ھے دریا تھے میغ	جیسے بادل دریا سے فیض پاتا ھے
شرارے تری تیغ کے بے شمار	تیری تلوار کے بے شمار شرارے
کریں دل کے بادل میں بجلیاں ھزار	بادل کے دل میں ھزاروں بجلیاں پیدا کرتے ھیں
سورج کانپتا نت ترے بیم میں	سورج ھمیشہ تیرے خوف سے کانپتا ھے اور
فلک سر نگوں تیری تعظیم میں	فلک تیری تعظیم میں ھمیشہ سر نگوں ھے
ترے قھر کے بحر کا تیغ موج	تیرے قھر کے بحر کی موج تلوار ھے
ترے خنگ تل گرد دشمن کی فوج	تیرے گھوڑے کے نیچے دشمن کی فوج گرد ھے
پون تھے سبک سیر تیرا ترنگ	تیرا گھوڑا ھوا سے زیادہ تیز ھے
چندر جس کی جلدی انگیں کھنے لنگ	اور اس کی تیزی کے آگے چاند لنگڑا ھے

دس آوے جدھر فتح کا تجہ نشاں	تیرا فتح کا نشاں جہاں کہیں نظر آتا ھے
کہے الاماں تب زمین آسماں	تو زمیں آسماں اس سے امان مانگتے ھیں
دندی دیکھ تجہ مکھ انکھیاں موچتا	دشمن تیرا چہرہ دیکھ آنکھیں میچ لیتا ھے
کہ توں مار اول پچھیں پوچھتا	کہ تو پہلے مارتا اور بعد میں پوچھتا ھے
کھڑک جب توں جھلکاے صف میں نکال	جب تو صف فوج میں اپنی تلوار نکال کر چمکاتا ھے
دس آوے ھو ٹکڑے گگن جیوں ابھال	تو آسماں بادل کی طرح ٹکڑے ٹکڑے نظر آتا ھے

اسی نہج سے بادشاہ کی شجاعت اور دلیری کی تعریف کرتا چلا جاتا ھے- اس کے بعد اس کی سخن سنجی اور علم پروری کا ذکر کرتا ھے - نمونے کے طور پر چند شعر نقل کیے جاتے ھیں

تری بات تھے نیشکر رس بھرے	تیری باتوں سے نیشکر رس حاصل کرتا ھے
تجہ انکھیاں تھے سے مست ھو سد ھرے	اور تیری آنکھیں دیکھ شراب مست ھوکر ھوش و حواس کھو بیٹھتی ھے
ترا ذھن نرمل تیرا طبع صاف	تیرا ذھن پاک اور تیری طبع صاف ھے
سخن سنج باریک بیں موشگاف	تو سخن سنج، باریک بیں اور موشگاف ھے
ترے دل کے دریا کا' شعر ایک ھے موج	شعر تیرے دل کے دریا کی ایک موج ھے
فلک پست جاں تجہ خیالاں کی فوج	جہاں تیرے خیالات کا لشکر پہنچتا ھے وھاں فلک پست ھے
ترا شعر ھر مردہ دل کو جنم	تیرا شعر ھر مردہ دل کو زندہ کرتا ھے
کرے خضر بھر خوش مسیحا کا دم	اور خود خضر ایسے مسیحا کا دم بھر کر خوش ھوتا ھے
سکے شاعراں شعر تھے تجہ شعور	شاعروں نے تیرے شعر سے شعور سیکھا ھے
دھریا طبع موزوں تھے تجہ نظم نور	اور نظم نے تیری طبع موزوں سے نور حاصل کیا ھے

مدح شاہ کے بعد سبب نظم کتاب کی باری آتی ھے- اسے بھی نصرتی نے کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ھے- چاندنی رات کا سماں ھے' بادشاہ کا دربار لگا ھوا ھے' فضلا و شعرا جمع ھیں جن میں خاصکر یہ صاحب

کہاں قابل ذکر ہیں —

قاضی کریم اللہ ' جنھوں نے سب سے پہلے نصرتی سے اس مثنوی کے لکھنے کی فرمائش کی - چنانچہ وہ لکھتا ہے

زہے حاکم شرع والا نژاد　　سو قاضی کریم اللہ فرخ نہاد
خلاصے سوں رکھہ مجہ رخن ان نظر　　کیا ریز یوں خوش سخن کے گہر
کہ* نپجیا ہے جد تھے جہاں میں کھڑگ†　　مغل کی پتی فوج کوں آج لگ
علی نرپتی شاہ عادل کے بن　　کھڑگ جل میں یوں نین توبایا ہے کن
دسیا سو تماشا نظر کی حضور　　ہوا نصرتی پر تو لکھنا ضرور

دوسرے صاحب شاہ نوراللہ ہیں جنھوں نے فارسی نثر میں اس عہد کی تاریخ لکھی ہے - نصرتی نے ان کی بہت تعریف کی ہے ' چند شعر نقل کیے جاتے ہیں —

مدبر بڑا راے زن دوربیں　　قوی رکن ہے سلطنت کا یقیں
مقرب بڑا شہ کی درگاہ کا　　بڑا معتبر معتمد شاہ کا
زہے شاہ نوراللہ فرخندہ نام　　منور ہے جس فضل تھے جگ تمام
کہ جب شاہ عادل علی کا مکار　　جو بے مثل کرنیاں ‡ کیا نا مدار
وہ سب لکھہ کے تاریخ میں خوب دھات　　کیا نت حوالے زمانے کے ہات
کیا جیوں وہ تاریخ لکھنی شروع　　ہوا فیض حق تس کی جانب رجوع
سفینہ جو تاریخ کا لکھہ کے پاس　　دسے یوں جو دیکھیں تو اہل قیاس
مضامین کی ایک سطران کی موج　　عبارت کے دریا نے پکڑیا ہے اوج
سلاست میں پانی کی صافی دھرے　　فصاحت میں امرت کی شیری دھرے

---

* پیدا ہوا ہے　　† تلوار　　‡ کام

نظر میں اگر سنبلستاں دسے حقیقت میں رنگیں گلستاں دسے

تیسرے صاحب شاہ ابوالمعالی ہیں —

نسب میں سیادت سوں عالی اہے تو تس ناؤں شا ابولمعالی اہے

اس باب کی تمہید بہت خوب ہے وہ چند شعر یہاں نقل کرتا ہوں -

جویک نس ستاریاں کی مجلس ہو جمع	ایک رات ستاروں کی مجلس جمع تھی
اتھی بیچ روشن سپورن کی شمع	اوران کے بیچ میں ماہ کامل کی شمع روشن تھی
اجالے سوں تس خانۂ آسماں	
رہیا تھا ہو پر نور خوش تابداں	
ہوا کی تھی سالو کی کسوت یقیں	ہوا نے سالو کا لباس پہن رکھا تھا
تکت اورہ بیٹھی تھی ساری زمیں	اور ساری زمین بادلے میں مبلوس تھی
دیا چاند گاراں کو ہیریاں کی تاب	چاند نے (گار) پتھروں میں ہیروں کی سی چمک پیدا کردی تھی
کیا سنگریزیاں کو بلورناب	اور سنگریزے خالص بلور معلوم ہوتے تھے
نظر میں جو لیانا لگے آب کوں	پانی کی یہ حالت تھی کہ اُسے دیکھ کر
بسرنا پڑے صات سیماب کوں	آدمی سیماب کو بھول جاے
نظارے میں نظراں دھرے گلشنی	اس نظارے سے نظروں میں گلشن کا ساسماں تھا
صفای سوں پکڑے دلاں روشنی	اوراس کی صفای سے دلوں میں روشنی آتی تھی

اس تمہید کے بعد دربار کی خوبی اور اُن چند صاحبوں کی تعریف کی ہے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے - رات کا جلسہ برخاست ہوتا ہے، مگر نصرتی کو رات بھر بے چینی رہتی ہے کہ کتاب لکھنے کی کیسی کرلگی اور یہ مشکل کیونکر حل ہوگی —

مرے پر تو اے فکر مشکل پڑی طبیعت چلانے کو ادکھل کھڑی
رہیا تھا اسی آکہ حیرت میں جیوں کرن مشکل آساں منگیا حق نے یوں

صبح ہوتے ہی بارگاہ شاہی میں پہنچتا ہے اور وہی رات کا تذکرہ پیش آتا ہے —

ٹلی رات بعد از ہوا صبح ویں اتہا تب تلک شہ کی درگاہ میں
دکھت مجھہ رخن شاہ عالم نواز کرن لیکے خدمت بڑے سرفراز
معمے سے ظاہر اشارت کیے ولے دل کوں دل سوں بشارت دیے
کہا میں کہ بندے میں یو کاں ہے حد کہوں تب جو اُستاد کا ہوے مدد

(یعنے مجھہ میں اتنی سکت کہاں ہے البتہ استاد (یعنے بادشاہ) کی مدد ہو تو یہ کام سر انجام ہوسکتا ہے) —

اس کے بعد اپنے کلام کی تعریف اور کچھہ تعلی کرتا ہے اور فخریہ کہتا ہے کہ میں نے اس حقیر زبان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ ان باتوں کا ذکر کسی دوسرے مقام پر آئے گا —

اب کتاب کا اصل مضمون شروع ہوتا ہے۔ پہلے بادشاہ کی تخت نشینی کے جشن، شہر کی آرائش اور رعایا کی خوشی کا ذکر کرتا ہے —

گھرے گھر نوی شاد مانی ہوی
زمانے کوں پھر نو جوانی ہوی

اور اس جشن کے بیان کو دعا پر ختم کرتا ہے —

جشن کے بعد نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں اول وہ دکن کی بادشاہت پر نظر ڈالتا ہے اور لکھتا ہے کہ جب اس ملک میں کوی نیا بادشاہ تخت پر جلوہ گر ہوتا ہے تو سلطنت کی حالت بھی دگرگوں ہوجاتی ہے۔ دوست دشمن، مخالف موافق تاک میں رہتے ہیں اور بادشاہ کو اپنی سلطنت سنبھالنے کے لیے بڑی ہوشیاری، مصلحت اندیشی اور احتیاط سے کام کرنا پڑتا ہے۔ بادشاہت بھی شطرنج کی سی

بازی ہے - ہر شاطر کی چال جدا جدا ہے - جب کوئی کھیلتے کھیلتے بازی چھوڑ کے چل دیتا ہے تو دوسرے کو وہی بازی کھیلنی پڑتی ہے اور جب تک وہ اُسے پورے طور سے نہیں سمجھ لیتا اس کا کھیلنا سخت دشوار ہوتا ہے - (یعنے جب ایک بادشاہ کے بعد دوسرا بادشاہ آتا ہے تو جب تک وہ امور سلطنت کے اسرار سے کما حقہ واقفیت حاصل نہیں کرلیتا اُسے سخت مشکل پیش آتی ہے) - اس میں بڑی دور اندیشی اور احتیاط سے کام کرنا پڑتا ہے - جو کہیں سے مخالف کو ھٹانا ہو تو اپنا ایک آدہ مہرہ کھونا پڑتا ہے - ہر طرف نظر رکھنی پڑتی ہے کہ دشمن دھوکا ندے جاے - جو کوئی اس طرح کھیل پر قابو حاصل کرلے تو وہ "پیاد مات" (پیدل مات) دے سکتا ہے - اس عام حالت کا نقشہ کھینچنے کے بعد وہ بتاتا ہے کہ محمد عادل شاہ کے مرنے اور علی عادل شاہ ثانی کی تخت نشینی پر ملک کی کیا حالت تھی - میں یہ کیفیت ابتدا ہی میں چند سطروں میں لکھ چکا ہوں - اب میں اِسی کو نصرتی کے الفاظ میں دکھانا چاہتا ہوں - نصرتی نے جو کچھ لکھا ہے تاریخوں سے اس کی حرف بحرف تصدیق ہوتی ہے -

کہ القصہ یو پادشاہی کے کام	غرض امورسلطنت کی اصلاح ہونےتک تمام
درست ہوئیں لگ او غنیماں تمام	بدنہاد مخالفوں نے (خواہ چھوٹے خواہ
نہنے ہور بڑے تھے سو سب بدنہاد	بڑے) چاروں طرف سے
اُچاے وہ چارو طرف تھے فساد	فساد برپا کردیا -
مخالف تو اکثر منافق ہوے	جو منافق تھے وہ تو خیر مخالف ہو ہی گئے
موافق بی کے ناموافق ہوے	لیکن بعض موافق بھی مخالف بن گئے
بڑی رج کی شہ اپنے کم سن منے	اس کم سنی پر بھی بادشاہ نے بڑی ھمت کی
نوی بادشاہی نوے دن منے	(حالانکہ) اس کی نئی نئی بادشاہی اور نیا زمانہ تھا

کُبل سخت بازیانچ پڑنے لگیاں بیڈھب اور سخت بازیاں پڑنے لگیں
بڑیاں شدّتاں روز گھڑنے لگیاں اور ہر روز شدید سانحے پیش آنے لگے
ولے شاہ ہمت سوں رکھہ دل قوی لیکن بادشاہ نے ہمت کرکے دل قوی رکھا
نوے کام پر کر تردد نوی اور ان نئی مشکلات کی فکر کرنے لگا
یک یک کام لگ بل سوں سادن لگیا ایک ایک کام کو وہ اپنی قوت سے سدھارنے لگا
یک یک تہ تردد سوں باندن لگیا اور ایک ایک پیچیدگی کو سلجھانا شروع کیا

اگن پن وو فتنے کی چوندھیر سوں لیکن فتنے کی وہ آگ جو تلوار کی آب
اٹھی تھی وو شمشیر کے نیر سوں سے ہر طرف بھڑکی ہوئی تھی
اُسے یک طرف تے بجاویں تلگ ابھی ایک طرف سے بجھنے نہ پاتی تھی
اٹھے بھی وہ دُسرے رخن تے سلگ کہ دوسری طرف سے سلگ اٹھتی تھی
بزرگی جسے ات خدا داد ہے لیکن خدا جسے بزرگی دیتا ہے
دل اُس کا نبڑ پن میں پولاد ہے لڑکپن میں بھی اس کا دل فولاد ہوتا ہے۔

جب شیواجی کی فتنہ انگیزی حد سے بڑھی تو علی عادل شاہ نے افضل خاں کو اس کی سرکوبی کے لیے متعین کیا - افضل خاں نے جب اپنے دلیرانہ حملوں سے اس کا قافیہ تنگ کیا تو عاجز ہوکر اس نے صلح و عفو کی خواہش کی - افضل خاں نے صاف دلی سے اسے منظور کرلیا اور پھر جس طرح شیواجی نے دغا سے افضل خاں کو قتل کیا ہے وہ ایک تاریخی واقعہ ہے جس کی تفصیل کی ضرورت نہیں - اس واقعہ سے علی عادل شاہ کو سخت رنج اور صدمہ ہوا اور اس نے اپنے ایک امیر سیدی جوہر کو صلابت خاں کے خطاب سے سر افراز کرکے اس مہم پر روانہ کیا —

ان واقعات کو نصرتی کی زبان سے سننا بہتر ہوگا - یہ واقعات نصرتی

کی آنکھوں کے سامنے پیش آے ھیں' وہ بیجاپوری ہے اور بادشاہ کا ملازم خاص' اس لیے وہ اپنے مخالفوں کی شان میں جو کچھہ کہتا ہے اُسے تحمل سے سننا چاھئیے —

شیواجی کی فتنہ انگیزی اور اس کی عام سیرت کے متعلق اس کا بیان سنئیے :—

جو کوئی کار بد کا جو پاپی ھے بد — جو پاپی برے کام کا بانی ھوتا ھے
ھوا ناؤں تس لعنتی تا ابد — اُس کے نام پر قیامت تک لعنت پڑتی رھتی ھے
خدا پاس نا اس کوں بہبود ھے — خلقت میں وہ مردود ھے اور خدا
خلائق کنے تو وہ مردود ھے — کے ھاں بھی اس کی بخشائش نہیں۔
اتا بات کوں کاڑ موذی کا نام — اب اُس موذی کا نام لو
کہ قائم ھوا فتنہ جس تھے تمام — جس سے یہ تمام فتنہ برپا ھوا
سیویا کر جو ایک فتنہ انگیز تھا — سیوا نامی جو ایک فتنہ انگیز تھا
بڑا چور موذی و خونریز تھا — وہ بڑا چور موذی اور خونریز تھا
دکن کی زمیں بیچ تخم فساد — دکن کی سر زمین میں اول اول جس نے
جو پیریا سو اول یہی بد نہاد — فساد کا بیج بویا وہ یہی بدنہاد تھا
رعیت جتا خوار اوس شوم — رعیت اس شقی سے پریشان و خوار تھی
ھوا ملک ویرانہ تس بوم تھے — اور مُلک اُس بوم سے ویرانہ ھو گیا تھا
جو بد اصل تھا سو بڑا ھور نہنا — جتنے چھوٹے بڑے کم اصل تھے
سکیا اِس تھے صاحب سے باغی پنا | اُن سب نے اپنے آقا سے بغاوت اِسی سے سیکھی۔

ذیل کے پہلے شعر میں وہ اس کے مقام سکونت کو بتاتا ہے ۔

دکھن ھور مغلائی کے درمیان — دکھن اور سلطنت مغلیہ کے درمیانی
وطن دھر کُہستان میں تھا نہاں — کوھستان میں اس نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا

بھریا تھا سب اُس ذات میں مکرو ریو — اس کی ذات مکر و دغا سے بھری ہوی تھی
دسے آدمی روپ پر نسل دیو — دیکھنے میں انسان شکل تھا مگر اصل میں نسل دیو تھا
دکھاوے جو ٹک اپنی تلبیس کوں — اگر ذرا اپنی شیطنت دکھاے
لگے ورد لاحول ابلیس کوں — تو ابلیس لاحول پڑھنے لگے
فرنگی تے تھا کفر میں اتا شد — کفر میں فرنگی سے بھی اشد تھا
کرے دین سوں دشمنی سخت بد — اور دین سے سخت دشمنی رکھتا تھا
نہ اس قتل حج تھی عبادت نہنی — قتل اس کے نزدیک حج سے بھی بڑی عبادت تھی
حرم میں بی سنپڑے تو تھا کشتنی — یہ حرم میں بھی ہاتھ لگے تو گردن زدنی ہے۔

آخری شعر کے دوسرے مصرع کی حیثیت تاریخی ہو گئی ہے - روایت یہ ہے کہ سکندر عادل شاہ کے عہد میں جب اورنگ زیب کی فوج نے اہل بیجاپور کو بالکل تنگ اور عاجز کر دیا تو وہاں کے چند علما لشکر عالم گیری میں حاضر ہوے اور عرض کی کہ جہاں پناہ عالم با عمل، زاہد و متقی، متشرع و متدین ہیں اور پیشگاہ خلافت سے کوئی امر خلاف قانون و شرع صادر نہیں ہوتا - پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ باوجودیکہ اس شہرو ملک کا حاکم اور یہاں والے کلمہ گو مسلمان ہیں، بادشاہی لشکر کا قہر ان پر نازل کیا گیا ہے جس سے بے قصور رعایا سخت عذاب میں مبتلا ہے - اورنگ زیب نے اس کے جواب میں یہ کہلا بھیجا کہ تمھارا کہنا درست ہے، لیکن ہمیں تم سے اور تمھارے شہر اور ملک سے سروکار نہیں اور نہ تم سے ہم جنگ و قتال کا قصد رکھتے ہیں - مگر بات یہ ہے کہ ایک کافر فاجر حربی شقی کہ جس پر یہ قول صادق آتا ہے

حرم میں اچھے تو بھی ہے کشتنی

تمھاری بغل میں پناہ لیے ہوے ہے اور فساد برپا کر رکھا ہے جس سے اسلامی بلاد اور اہل اسلام سخت ایذا میں ہیں- اس فساد کا استیصال ہم پر واجب ہے * —

اورنگ زیب کے جواب میں اس مصرع کا منقول ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ نصرتی کا یہ مصرع عام و خاص میں بطور ضرب المثل کے مشہور ہو گیا تھا —

غرض شیواجی کی سرکوبی کے لیے علی عادل شاہ نے افضل خاں کو بھیجا ' مگر جب شیواجی نے اسے دغا سے قتل کر ڈالا تو بادشاہ بہت متفکر اور پریشان ہوا - اس اثنا میں سیدی جوہر نے جو کچھ عرصے سے سرکش ہوکر محمد نگر کرنول میں خود مختار بن بیٹھا تھا ' عذر خواہی اور معافی کی عرض داشت بھیجی- بادشاہ نے اس کا قصور معاف کیا اور صلابت خاں کے خطاب سے سرافراز کر کے شیواجی کے مقابلے کے لیے بھیجا - بیجاپوری فوج کی روانگی کو نصرتی اس شان سے بیان کرتا ہے —

چلیا دُھم پہ دُھم ات ترنگ ہور حشم
ہوے آسماں ہور زمیں بیش کم
لگا نیر دسنے گھنسے جا زمیں
ہوا کوں ہوا جسم پیدا یقیں

(لشکر خیل و حشم کے ساتھ اس دھوم دھام اور زور شور سے چلا کہ زمین کم اور آسمان زیادہ ہو گیا ' یعنے اس قدر گرد وغبار پڑا کہ زمین کا کچھ حصہ آسمان سے جا ملا - پانی زمیں میں دھسا جاتا تھا اور گرد کی کثرت کی وجہ سے

* بساتین السلاطین صفحہ ۵۴۲ - ۵۴۳

ہوا جو پہلے بے جسم تھی اب مجسم نظر آتی تھی)

شیواجی صلابت خاں کے مقابلے کی تاب نہ لا سکا - صلابت خاں نے اسے اس قدر رگیدا اور پریشان کیا کہ اور جب کچھہ بن نہ پڑا تو تنگ آکر قلعۂ پنالا میں محصور ہو گیا - صلابت خاں نے اس موقع کو غنیمت سمجھہ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیا - اب اس نے مجبور اور عاجز ہو کر خان موصوف سے خفیہ خط و کتابت شروع کی - یہ اس کی پرانی چال تھی - اور خوشامد اور چاپلوسی سے صلابت خاں کو اپنی وفاداری اور عقیدتمندی کا ایسا یقین دلایا کہ وہ بالکل اُس کا ہو گیا - چنانچہ آدھی رات کو ملاقات کے لیے آیا ' صلابت خاں بہت عزت و تکریم سے پیش آیا - دونوں میں اتحاد باہمی کا پختہ عہد ہو گیا - جب علی عادل شاہ کو اس کی اطلاع پہنچی تو وہ بہت برہم ہوا اور فوراً فوج لے کر موقع پر جا پہنچا - اس موقع پر نصرتی صلابت خاں کی اس بدعہدی کو صاف اڑا گیا ہے اور یہ لکھتا ہے کہ جب پنالہ کے محاصرے میں دیر لگی تو بادشاہ نے بہ نفس نفیس چڑھائی کی - شیواجی نے جب یہ دیکھا تو ایک روز رات کے وقت اپنے اہل و عیال اور کچھہ فوج سمیت چپکے سے نکل بھاگا اور قلعہ علی عادل شاہ کے ہاتھہ آگیا ــــ

نصرتی نے اس فتح کی خوشی میں ایک قطعۂ تاریخ اور ایک زبردست اور پر زور قصیدہ لکھا ہے - تاریخ اس مصرع سے نکالی ہے

علی نے پل میں پنالہ لیا صلابت سوں

اس مصرعے سے سنہ ۱۰۷۰ ھ نکلتا ہے - قصیدے کا مطلع یہ ہے

جب تے فلک دیکھیا ادک سورج تری تروار کا
تب تھے لگیا تھر کاپنے ہو پر عرق یکبار کا

(یعنے جب سے فلک نے تیری تلوار کے چمکتے ہوے سورج کو دیکھا ہے تب سے وہ پسینے پسینے ہو رہا ہے اور تھر تھر کانپ رہا ہے)

مطلع ثانی ہے:

اے شاہ عادل توں علی صاحب ہے اب سینسار کا
کفار بھنجن جگ تھمن نیں سور کوی تجہ سار کا

(یعنے اے شاہ علی عادل اس وقت دنیا کا مالک تو ہی ہے اور تو ہی کفار شکن اور عالم پناہ ہے اور تجہ سا بہادر اب کوی نہیں ہے)

الفاظ کی شوکت اور قوت کو ملاحظہ فرمائیے —

قلعۂ پنالہ کی تعریف میں لکھتا ہے:

تھا یکہ یک جو جگ منے اوگڑ پنالے کا بلند
تھملے دھرت لنگر ہے ہور انبر کو تھام آدھار کا

(دنیا میں پنالے کا قلعہ اپنی بلندی و رفعت میں ایک ہی ہے، وہ دھرتی کا لنگر ہے اور آسمان کو سہارنے کا تھم ہے)

پونچے پون پیری میں جاکر گر جوانی میں چڑے
انپڑے نہ دوجی عمر لگ تس پر قیاس یک بار کا

(ہوا اگر جوانی میں اس پر چڑھے تو پیری میں جاکر پہنچے اور دوسری عمر تک بھی آخر تک نہ پہنچ سکے، اس سے قلعہ کی بلندی کا قیاس ہوسکتا ہے)

نیں بات کی لگ مکہ منے کے تھار پر پھسلے زباں
گر ناؤں کوی لینے منگے تس راہ ناھموار کا

(اگر اس کی ناھموار راہ کا نام لینا چاھیں تو اس کا نام

لیے لیے تک زبان کئی بار پھسل جاے گی)

گڑ پر بہتے پانی تھے ات ٹھر گھر تو ماءالنھر ہے

کرتا ہے رد کشمیر کوں انگن ہی ہر گلدار کا

(قلعہ پر پانی کی یہ افراط ہے کہ گویا گھر گھر ماءالنھر ہے اور اس کے ہر گلدار کا آنگن روکش کشمیر ہے)

اس قلعے کی بلندی، ناھمواری اور دشواری کی تعریف میں بہت سے شعر ھیں - یہ تین چار شعر صرف نمونے کے طور پر لکھے گئے ھیں —

اس قصیدے میں اس نے بڑا کمال یہ کیا ھے کہ ابتدا سے جو جو واقعات پیش آئے ھیں سب کو بیان کر گیا ھے - مثلاً سیواجی کی سرکشی، اس کی دغا بازی، قلعۂ پنالہ کی رفعت و بلندی اور دشوار گزاری، اس کا قلعے میں سامان اور ذخیرے اور فوج کے ساتھہ مضبوط ھوکر بیٹھہ رھنا، صلابت خاں کا بادشاہ کی خدمت میں حاضر ھونا، خطاب سے سرافراز کرکے سر لشکر بنانا اور شیواجی کے مقابلے کے لئے بھیجنا، جنگ کا خونخوار نقشہ، شیواجی کا قلعہ چھوڑ کر بھاگنا، بہادروں کی بہادری، علی عادل شاہ کی ھمت و دلیری، نمایاں فتح، جنگ سے بادشاہ کا مرتضی آباد آنا، وھاں سے دارالخلافت کو پہنچنا، فتح کی خوشی میں رعایا کے جشن اور شہر کی آراستگی کا تفصیلی بیان، بادشاہ کی مدح و ثنا اور دعا —

یہ تمام واقعات اور حالات خاص شاعرانہ انداز میں بڑے شکوہ و وقار کے ساتھہ بیان کئے ھیں - چونکہ میں نصرتی کے قصائد پر آگے چل کر الگ تبصرہ کرنے والا ھوں اس لیے اس مثنوی کے ضمن میں اس کے قصائد کے حسن و قبح سے بحث نہیں کروں گا - اس قصیدے میں ڈیڑہ سو سے

زائد شعر ہیں- آخر میں تعلی بھی کی ہے اور " شوقی " پر طنز کی ہے کہ اس رنگ میں دس پانچ شعر کہہ لینے سے کیا ہوتا ہے ' اتنا بڑا قصیدہ لکھتا تو حقیقت معلوم ہوتی —

دس پانچ بیت اس دھات میں کے ہیں تو شوقی کیا ہوا

معلوم ہوتا شعر اگر کہتے تو اس بستار کا

اس جنگ میں صلابت خاں کے علاوہ ایک سردار مسعود خاں * کی بہادری کا بھی ذکر کیا ہے - لیکن شیواجی سے صلابت خان کے خفیہ عہد و پیمان کا کہیں اشارہ نہیں کیا - اس کا ذکر وہ آگے کرے گا —

دارالخلافت میں واپس آنے کے بعد علی عادل شاہ نے ملناڑ کے زمیندار کی تنبیہ کا ارادہ کیا ' کیونکہ ایک مدت سے اس نے خراج ادا نہیں کیا تھا اور طرح طرح کے فساد اور شرارتیں کر رہا تھا - اس لشکر کشی کے لیے سامان تیار ہو رہا تھا کہ اتنے میں خبر آئی کہ صلابت خاں نے پھر غداری شروع کردی ہے - بادشاہ نے اُسے ایک نصیحت آمیز خط لکھا اور اپنے امرائے دولت ابراهیم خاں ' شاہ ابوالحسن اور ملا احمد کے ہاتھ اس کے پاس بھیجا - ان لوگوں نے اسے بہت کچھ سمجھایا اور نشیب و فروز سجھا کر اطاعت کی ترغیب دی اور اس بات پر راضی کر لیا کہ بادشاہ دارالخلافت سے چھلگی میں جو دریائے کرشنا کے کنارے واقع ہے رونق افراز ہونے والے ہیں- تم اس وقت تک اپنی جگہ سے کہیں نہ جانا- بادشاہ کی یہ تکلیف فرمائی محض تمہاری تسکین خاطر کے لیے ہے - بادشاہ کو اس کی اطلاع دی گئی ' اس نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور اس طرف

---

* اس سے مراد سیدی مسعود ہے جو صلابت خاں کا داماد تھا —

روانہ ہوے - پہنچنے پر سیدی مسعود داماد صلابت خاں اور شرزہ خاں نے حضور میں حاضر ہوکر صلابت خاں کی معافی اور امان کی درخواست کی - علی عادل شاہ نے درخواست منظور کی اور ایک فرمان صلابت خاں کی معافی کا لکھہ دیا —

نصرتی نے خط کے لکھنے اور امرا کے بھیجنے کا ذکر نہیں کیا - صرف اتنا لکھا ہے کہ بادشاہ نے ملناڑ کی طرف کوچ کیا اور جب کشنا پہ پہنچا تو صلابت خاں (جو سرکشی پر تلا ہوا تھا) یہ سن کر خوف زدہ ہوا اور حاضر ہوکر معافی کا طلب گار ہوا - بادشاہ نے اُسے معاف کر دیا —

فرمان معافی پانے کے بعد صلابت خاں چھلگی میں حاضر ہوا اور منصب اور علاقہ کی بحالی سے سرفرازی پائی - بادشاہ نے اُسے نواب عبدالرحیم بہلول خاں کے همراہ کرناٹک کی مہم پر جانے کا حکم دیا —

ادکہ کرہ ٹاپاں تے دھرتی ھدر	گھوڑوں کے ٹاپوں سے زمیں میں ایسا تہلکہ
ٹپکنے لگے ڈونگراں جیوں کنکر	مچا کہ چٹانیں کنکروں کی طرح ٹپکنے لگیں
دمامے کریں بادلاں کو ندا	دمامے بادلوں کو آوازیں دے رہے تھے
جواباں میں اترے فلک دھر صدا	جن کے جواب میں آسمان سے صدائیں آرھی تھیں
گگن دھمدھمیاں کن دسے بے شکوہ	آسماں دمدموں کے آگے بے شکوہ نظر آتا تھا
بچے ھو دسیں اُن کے گوداں میں کوہ	پہاڑ ان کی گودوں میں بچے معلوم ھوتے تھے

اس جنگ کی فتح پر بھی قصیدہ لکھا ھے جس کا مطلع یہ ھے -

علی عادل شہ غازی یو شاہ بوالمظفر کوں
دیا ھے جس خدا ایسا کہ تھا جیسا سکندر کوں

آخر میں ایک مصرعے سے تاریخ بھی نکالی ھے -

منگیاں تاریخ کہنے میں یو جب نصرت کی، ہاتف وئیں
کہیا دل سوں «کھنڈل مارے علی یک پل میں جوہرکوں»

صلابت خاں شکست کھا کر جو بھاگا تو رائچور میں جاکر پناہ لی - وہاں سخت بیمار ہوکر کرنول جا پہنچا - علی عادل شاہ نے رائچور کی طرف کوچ کیا - قلعہ دار سیدی جوہر، صلابت خاں کے متوسلین میں سے تھا، غداری کرنا چاہتا تھا لیکن جماعت احتشام کے سرداروں نے اُسے گرفتار کر کے قید کر دیا اور قلعہ کی کنجیاں بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیں —

شاہی فوج حسب فرمان بادشاہ دریاے تنگ بھدرا سے عبور کر کے اس طرف پہنچ گئی - سیدی مسعود (داماد صلابت خاں) نے اس پر شبخون مارا - لیکن شاہی لشکر کو پہلے سے اطلاع ہو گئی تھی، خوب لڑائی ہوئی - سیدی مسعود کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا - صلابت خاں کو اس کا ایسا صدمہ ہوا کہ جانبر نہوسکا —

نصرتی نے اس کی موت پر ایک تاریخی قطعہ لکھا ہے - آخری شعر یہ ہے —

تس مرگ کے سبب کی جو تاریخ کوئی پوچھے
اے نصرتی توں بول کہ باغی ہوا موا

آخری مصرع سے سنہ وفات نکلتا ہے جو سنہ ۱۰۷۲ ھ ہے —

صلابت کے بیٹے (عبدالعزیز) اور داماد (سیدی مسعود) نے جب رنگ بدلا ہوا دیکھا تو معافی اور جان بخشی کے لیے حاضر ہوے - بادشاہ نے عبدالمحمد بہلول خاں کی سفارش پر ان دونوں کو معاف کرکے خلعت و منصب عطا فرمایا —

اب بادشاہ نے دارالخلافے کی طرف مراجعت کی - اس مراجعت

پر نصرتی نے ایک زبردست اور پر شکوہ قصیدہ (ذو مطلعین) لکھا ہے - جس کا پہلا مطلع یہ ہے —

اے شہ توں ہم نام علی شاہاں پہ تیری سروری
دلدل فلک کا رام تجہ کرتا زمانہ قنبری

اسی قصیدے کے ضمن میں موسم زمستان کے حال میں ایک پر زور قصیدہ لکھا ہے - بحر وہی ہے مگر ردیف و قافیہ دوسرا ہے - اس کے ختم ہوتے ہی وہ پہلا قصیدہ مطلع ثانی لکھہ کر پھر شروع کرتا ہے اور فتح کی خوشی اور بادشاہ کی واپسی پر شہر میں جو چہل پہل اور جشن ہوے تھے ان کا ذکر کیا ہے - اس میں شہر کے ضابطہ حوالہ دار (کوتوال) منجھلے شاہ کے انتظام و بیدار مغزی کی بھی تعریف کی ہے —

بادشاہ نے کچھہ روز سیر و شکار کیا اور پھر دریا سے عبور کرکے قلعۂ تورگل کا رخ کیا - یہ سلطنت کے مستحکم قلعوں میں سے تھا - وہاں کے قلعدار کی کجروی اور سرکشی کی خبریں پہنچ چکی تھیں ' اس لیے اس کی تنبیہ ضروری تھی —

نصرتی اس قلعہ کی مضبوطی اور استحکام کے متعلق لکھتا ہے

تُبل تورگل تھا ندی کے کنار اتھا شہ کے کوٹاں میں نامی حصار
اتھی کوٹ کے ڈونگراں پر زمیں بلندی میں افلاک سوں ہم نشیں
قوی کوٹ و محل و بروج استوار ندی یک طرف جس کے خندق منجھار
قدم در قدم یوں کراڑے تُبل فلک نا دسے گر پڑے پگ پھسل
فرشتیاں کا ہونا سکے جاں گزر شیاطین کوں چھپ رہنے وہاں نظر

اس قلعدار کا نام سیدی یاقوت تھا - اُسے جب بادشاہ کے آنے

کی خبر ہوی تو مقابلے کے لیے تیار ہوگیا - بادشاہ نے محاصرے کا حکم دیا - اس اثنا میں یہ اطلاع ملی کہ صلابت خاں نے قلعدار سے ساز باز رکھا ہے اور گولے بارود وغیرہ سے اُسے مدد پہنچا رہا ہے- یہ سنتے ہی محاصرے کے اٹھا لینے کا حکم دیا اور صلابت خاں کی سرکوبی کے لیے کوچ کیا - جب قلعۂ بہنود کے نزدیک پہنچے تو معلوم ہوا کہ صلابت مقابلے کے عزم سے قریب ہی میں آ پہنچا ہے - غرض لڑائی ہوی اور صلابت کو شکست ہوی - فوج کی بھگدڑ میں وہ گھوڑے پر سے گر پڑا اور ایک سپاہی کے گھوڑے پر سوار ہوکر فرار ہوگیا —

نصرتی نے اس لڑائی کا بیان یوں ہی لکھا ہے - تو رگل کے محاصرے کے لیے جب فوج چلتی ہے تو لکھتا ہے

ہوی یوں کہستاں میں گھوڑیاں کی چل کوہستان میں گھوڑوں کی ایسی ہل چل ہوی کہ بلوں
دیکھو ڑی ہُتاں میں تے نکلے ابل میں سے مکوڑے ابل پڑے

اس مہم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ دن بادشاہ نے دارالخلافت میں عیش و آرام سے گزارے، اتنے میں محرم آگیا - اس موقع پر شاعر نے "قصیدۂ ذوالمطلعین در وصف مجلس آرائی عاشور" لکھا ہے - پہلے حصے میں شہادت کا کچھ ذکر ہے اور دوسرے حصہ میں بیجاپور کے محرم کا حال ہے ' جس میں شہر کی آراستگی' حسینی محل کی شان و شوکت ' مجالس ماتم اور بادشاہ کی مدح بیان کی ہے- اس قصیدے کا پہلا مطلع یہ ہے —

کہتا ہوں اول حمد میں عالم کے سر جنہار کا
افلاک کا اونچا چھجا باندیا ہے کس بستار کا

یہ بڑی شان کا قصیدہ ہے اور (۱۴۰) اشعار پر مشتمل ہے —

اس کے بعد ملناڑ کی فتح کی داستاں یوں شروع ہوتی ہے

اماماں کا کر عرس شه پا کے جس رکھے ملک گیری کی دل میں هوس
شجاعت کی جب داد اپس داد آی مہم ملک ملناڑ کی یاد آی
که ملناڑ کا راج دھر عقل کچ بھروسے سوں جھاڑی کے تھا مست گج

یعنے ملناڑ کا کج عقل راجا گھنے جنگل کے بھروسے پر مست هاتھی بنا ہوا تھا - اس مست هاتھی کے فتح کرنے کو شرزہ خاں بھیجے گئے جنھوں نے اس کی ساری مستی نکال دی - (پہلے بادشاہ نے ملا خرم کو بھیج کر راجه کو بہت کچھه سمجھایا مگر وہ سرکشی سے باز نه آیا تب یہ لشکر شرزہ خاں کی سرگردگی میں بھیجا گیا اور اس کے بعد بادشاہ خود بھی لشکر لے کر اس طرف پہنچے) —

اب نصرتی کے زبانی اس کا ذکر سنئے —

بسرجا و شررے کے اودھان کوں ضروری سوں چھوڑیا نہیں مان کوں
تلک شرزہ انپڑیا چه سوکر کے لاگ لگا یا جلالت سوں جنگل کوں آگ
وهیں شه کیتک دن پچھیں ساؤ چیت چلے گئے دھر اپنے بزرگاں کی ریت
گئے وهاں که نه جا سکے جاں خیال کیے کام جو تھا سو امر محال
سکندر هو صاحب قرانی کیے سکندر کی سیوت نشانی کیے
لیے تخت لگ ملک اس کا تمام پھیر املک دے بھی رکھے کر غلام

اس کے بعد اس لڑائی کے حال اور فتح کی مبارک باد میں ایک زبردست قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے

هوا ہے کون عالم کے شہاں میں شه ترے بل کا
سچا توں نائوں کاری ہے وصیئی شاہ مرسل کا

یه قصیدہ (۲۲۰) شعر کا ہے اور حقیقت یه ہے که اس شان اور کمال

کا قصیدہ ہماری زبان میں مشکل سے ملے گا - قصیدہ کیا ہے جنگنامہ ہے - اس میں بیشک بادشاہ کی مدح ہے لیکن مدح سے کہیں زیادہ اس جنگ کے تفصیلی حالات موجود ہیں - مثلاً راجۂ ملناڑ کی سرکشی، سرکشی کے اسباب، شرزے خاں کا فوج لیکر سرکوبی کے لیے روانہ ہونا، بادشاہ کا بھی خود لشکر لیکر کوچ کرنا، برسات آجانے سے کچھہ دن قیام کرکے انتظام کرنا، برسات کی بدولت جل تھل ہوجانا، جنگل کی بہار، درختوں کی رونق، آسمان و زمین کا نیا رنگ روپ، فوج کا دھاوا، لڑائی کا ڈھنگ، شرزے خاں اور عبدالمحمد کی شجاعت و دلیری، مظفر خاں، سید محمد علی، مولوی احمد کے کارنمایاں، رستے میں قلعۂ سوندہ کا فتح کرنا، پھر راجۂ ملناڑ کی راجدھانی بدنور کی تسخیر، راجا کا مغلوب اور عاجز ہوکر جان کی امان مانگنا اور شفاعت کے لیے حاجیوں کو بھیجنا اور بادشاہ کا فرط رحم و کرم سے معاف کرنا - نصرتی نے بدنور میں مسجد کی تعمیر کا بھی ذکر کیا ہے جس کا حوالہ تاریخ میں نہیں ملتا —

یہ ایسا بے مثل قصیدہ ہے کہ جی چاہتا ہے کہ پورا نقل کردوں - لیکن ڈرتا ہوں کہ پرانی زبان ہونے کی وجہ سے پڑھنے والوں کو لطف نہ آے گا اور وہ بیزار ہوجائیں گے - شرح کرتا ہوں تو وہ لطف بیان اور زور کلام کہاں سے آئے - حقیقت یہ ہے کہ ایسے معرکۃالارا قصیدے ہماری زبان میں سواے سودا کے کہیں نظر نہیں آتے —

جب علی عادل شاہ نے شیواجی کو مار بھگایا تھا اور قلعۂ پنالہ پر قبضہ کرلیا تھا، اُسی زمانے میں شمال کی طرف اورنگ آباد کے صوبہ دار اور افواج مغلیہ کے سپہ سالار شایستہ خاں نے اس کو شکست پر شکست دی اور پونا اور دوسرے قلعے اس سے چھین لیے - شیواجی

نے ایک شب کو محل میں گھس کر شایستہ خاں کو مجروح کیا - اورنگ زیب کو اس واقعہ سے سخت رنج ہوا اور اس نے اس مہم پر جسونت کو مقرر کیا - شیواجی نے اتنے میں سورت پر دھاوا کیا اور کئی روز تک اس متمول شہر کو دل کھول کے لوٹا - اورنگ زیب نے اس پر سخت پیچ و تاب کھایا اور جے سنگھ کو اس کام پر متعین کیا —

نصرتی نے شایستہ خاں کے مجروح ہونے اور سورت کے قتل و غارت کے واقعات کو تفصیل سے نظم کیا ہے - لکھتا ہے —

نظر باز ہنگامۂ راز کا لکھے کھیل یوں چرخ کجباز کا
کہ جس وقت عادل علی بادشاہ کیے تھے بلکا پور کوں تخت گاہ

... ...

سیویا دیکھ میدان خالی بچار کُہستاں سے بیشک نکل آکے بھار
کھپایوں آپس دل میں ہونے شکیب نظامی ہے شیطاں ستے پر فریب

... ...

بڑا جس کوں شاہ مغل مانتا قوی بازوے سلطنت جانتا
بڑا راے زن دور اندیش اچھے بڑے کام پر تس قدم پیش اچھے
بلند شان کا جس کی دھلی پہ داب اتھا اُس کوں شایستہ خاں کر خطاب
نہوی جے مہم جنگ و شر شور سوں کرنہار اونے عقل کے زور سوں
سیویا کھیل اُس سات کرنے لگا سہیانے کوں فن سوں سنترنے لگا
ملایا مکھندۃ چور خونخوار کئی آپس سار کے رندو عیار کئی

اس کے بعد رات کا سماں اس واقعہ کی مناسبت سے کھینچتا ہے اور شایستہ پر حملے کا حال لکھتا ہے —

سورج وہ کہ جس سامنے ہو زبوں چھپاتے ہیں چوراں بچالی میں موں

اوتر تخت وہ جب گیا گھر منجھار بیٹھا تب ہو حاکم چندر اُس کی ٹھار
گیا عیش میں کر سہیلیاں سوں میل ہوا راج میں اس کے چوراں کا کھیل

(یعنے وہ سورج کہ جس کے سامنے چور بچالي میں منہ چھپا لیتے ہیں جب وہ تخت سے اُتر کر اپنے گھر میں چلا گیا تو چاند اس کی جگہ حاکم بن کر بیٹھا اور اپنے ھمجو لیوں کے ساتھہ رنگ رلیاں منانے لگا اس کے راج میں چور کُھل کھیلے) -

جب رات زیادہ ھوئی تو شیواجی کو دغا بازی کی سوجھی اور اپنی جماعت کو لے کر شایشتہ خاں کے محل کی طرف چلا

جو شایستہ خاں تب سہیلیاں میں تھا کر نہار سکھ خوش رنگیلیاں میں تھا
کہ تھے گھر کے چوندھر نگہباں کیتے ہر یک ٹھار انگے بلک و دریاں کیتے
نہ اُس ٹھار ابلیس کوں تھا مجال گیا وھاں تلک بیس لھو کا کھلال
سوتا تھا سو تس نیند جانی اُچٹ او چاہا کھڑک آب ات موں پہ ست
نہ اوس کوں مقابل پہ آنے دیا نہ ھتیار پر ھات بھانے دیا
کھیا کھپ کیہے جلد واراں پہ وار کہ گھاواں پہ گھاواں لگے تن منجھار
سرنگ سیج ھوئی لھوسوں سب بےدرنگ رنگیلیاں کیا سب سہیلیاں کوں رنگ
اتھیاں کئی سہیلیاں جو رجھو تنیاں اپس ست بنھانے کوں اودھو تڈیاں
دھنی پر بھڑکتے دیکھت آگ یتی یک یک دھن لگی آگ پڑنے ستي
بنھانے کو جیو آپنے پیو کا سپر تن کریں آپ تس جیو کا
کٹا لئی سو ھر سروقد گلعذار رواں جوئے خونی ھوی موج مار
بھوت گرچہ گھائل ھو بانچیا جیا جیسے لگ ولے جیو کوں زخمی کیا
کہ تس سامنے تس کے پیاریاں کو کاٹ چلیا اوٹ سب شرم پھر اپنی باٹ
گیا دے کے یوں داغ شرمندہ گي کہ جھتا ہے لگ موت ھوئی زندگی

گیا پل میں ایسے کالے ننگ و نام کیا سب بچھاریا جو تھا دل میں کام
وھیں شرق تے غرب لگ دم منیں یو ھوئی بات مشہور عالم منیں

(شایستہ خاں اُس وقت تک اپنی نازنینوں کے ساتھہ لطف عیش اُڑا رہا تھا - گھر کی چاروں طرف نگہباں اور دربان تھے - جہاں شیطان کو بھی رسائی کا یارا نہ تھا وھاں اس (شیوا) نے خون خرابا کیا - جو سو رھا تھا اُس نے جانا نیند اچاٹ ھو گئی اور آنکھہ کھلتے ھی تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا - نہ اُسے مقابلے پر آنے کا موقع دیا نہ ھتیار پر ھاتھہ ڈالنے کی مہلت دی - جلدی جلدی وار پہ وار کیے اور گھاؤ پہ گھاؤ لگائے - تمام سیج خون آلودہ ھو گئی اور نازنینوں کو خون سے رنگ دیا - اُن میں جو راجپوتنیاں تھیں انھوں نے جب آقا پر آگ بھڑکتی دیکھی تو آگ میں گر کر ستی ھونے پر آمادہ ھو گئیں اور بڑی بہادری سے اپنے آقا کو بچانے کے لیے سپر بن گئیں - وہ سروقد نازنینیں بھی اس قدر زخمی یا ھلاک ھوئیں کہ خون کی ندی بہنے لگی - اگرچہ (شایستہ خاں) بہت کچھہ گھائل ھو کر بچ نکلا مگر جب تک زندہ رھا اُس کا دل زخمی رھا - وہ اپنے پیاروں کو اپنے سامنے کٹتے دیکھہ کر مارے شرم کے وھاں سے چلا گیا - اُسے ایسا داغ شرمندگی نصیب ھوا کہ جیتے جی موت آگئی - وہ (شیوا) پل بھر میں ننگ و نام لوٹ لے گیا اور جو وہ سوچ کر آیا تھا وہ کر گیا - آناً فاناً شرق سے غرب تک یہ بات مشہور ھو گئی) -

جب یہ خبر دھلی پہنچی تو بادشاہ کا خون خشک ھو گیا اور کہا کہ "آل تیمور کی ایسی بدنامی کبھی نہیں ھوئی - جب تک اس کا انتقام نہ لوں گا بادشاھی مجھہ پر حرام ھے" -

اب جسونت سنگھہ اس مہم پر متعین ھوتا ھے -

که جسونت سنگھه کر کے رجھوت تھا
جتنے رج کے پوتاں میں اودھوت تھا

سورت بندر کا ذکر اِن الفاظ میں کیا ہے —

که سورت ککر ملک گجرات میں بندر یک اتھا خوب سب بات میں
رهویں بحر و خشکی کے تجار وهاں ملے بست جے نهیں سو عالم میں وهاں
یک یک کونچھه یک شهر معمور اچھے هر یک گھر میں کئی گنج بھر پور اچھے
لیوے هند نت فیض اس تھے نول که جوں ابر کوں آب دریا تے بل
او پچ جگ هوئی جب تے وو بوستاں نه دیکھی تھی چک تب تے باد خزاں

(سورت نامی جو گجرات میں ایک بندر ہے وہ هر بات میں خوب ہے - بحری اور بری هر قسم کے تاجر وهاں رهتے هیں اور جو چیز دنیا میں کہیں نه ملے وہ وهاں مل جاتی ہے - هندوستان همیشه اس سے نیا فیض حاصل کرتا ہے جیسے ابر کو آب دریا سے قوت پهنچتی رهتی ہے - جب سے یه بوستاں دنیا میں پھولا پھلا اس نے کبھی باد خزاں کا جھوکا نه دیکھا تھا) -

سورت کی غارت گری کے حال میں لکھتا ہے -

کیا لوٹ یوں پل میں بندر کوں پاک که جوں آگ لگتیں نرهے باج راک
پھیری خوب صورت کی صورت نے یوں جوانی تھے محبوب پیری میں جیوں

(یعنے لوٹ لاٹ کر بندر کا پل بھر میں اس طرح صفا یا کر دیا جیسے آگ لگنے پر سوائے راکھه کے کچھه نهیں رهتا - خوبصورتوں کی صورت ایسی بدل گئی جیسے جوانی کے محبوب کی صورت بڑھاپے میں بدل جاتی ہے) —

اس واقعه کے بعد جے سنگھه دکھن کی مہم پر آتا ہے —

نصرتی آخر علی عادل شاہ کا ملازم اور درباری شاعر ہے - وہ یہ اپنا فرض سمجھتا ہے کہ اپنے بادشاہ کی شان بڑھائے اور اس کے مقابل میں دوسروں کو گھٹائے، اس لیے وہ کہیں کہیں واقعات کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتا ہے - چنانچہ لکھتا ہے کہ جب سورت بندر کے لٹنے کی خبر اورنگ زیب کو پہنچی تو وہ سخت پریشان ہوا اور کہنے لگا کہ جب تک علی عادل شاہ کی مدد نہوگی یہ مہم سر نہیں ہوسکتی - اس کا بیان دیکھیے —

پکڑ اپنے دانتوں میں حیرت سوں بونٹ کہیا چابتا سخت غصے سوں ہونٹ
مگر کچھ ہے یہ آسمانی بلا کہ ہو لادوا یوں کرے مبتلا
دس آتا ہے ناہوے ہمن تے علاج علی کی طرف سے مدد پائے باج

(یعنے اورنگ زیب نے (واقعۂ سورت پر) حیرت سے انگلی دانتوں میں دبا لی اور غصے سے ہونٹ چابنے لگا اور کہنے لگا کہ یہ آسمانی بلا ہے جس کا کوئی علاج نہیں - معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب تک علی (علی عادل شاہ) کی مدد نہ ہوگی اس کا علاج نہوسکے گا) -

یہ سوچ کر اس نے اپنے وکیل بیجاپور بھیجے اور انھوں نے اورنگ زیب کی طرف سے باہمی صلاح اور امداد کا پیغام دیا - اس کا جواب جو علی عادل شاہ نے دیا ہے وہ نصرتی کی زبانی سنئے، کیا شان برستی ہے - گویا اورنگ زیب اس کے سامنے ایک معمولی بادشاہ تھا -

کہ ہوں میں سمیء نبی کا خلف دو جا تس پہ ہمنام شاہ نجف
لقب کفر بھنجن ہے مجھ بے گماں صفت دست گیر فرو ماند گاں
میرے کام پر میں ہوں حاضر سدا تماری بی کرنی کرو ابتدا
مدد میں ہوں سوڈی پہ چل بیگ آؤ لڑو مت تماشا ولے دیکھ جاؤ

کہ مجھ فوج دشمن سوں لڑتی ھے کیوں ستی جا کے آتش پہ پڑتی ھے کیوں
جو ساواں سوں کیوں دزدگم نام نے لڑے صف بہ صف آمنے سامنے
نبھانا اپس عہد پر آپ جم کہ مرداں ھیں وعدے پہ ثابت قدم
سنیا شاہ عادل تے جب یو جواب وھیں خوش ہو شاہ مغل بے حساب
کھیا مجھ ھوا اب تے ھادی فلک کہ وو نرپتی نے قبولیا کو مک

اب جو عادل شاہ کی امداد کا اطمینان ھوگیا تو اورنگ زیب نے بڑا دربار کیا اور دکھن کی مہم کے لئے جے سنگھ کا انتخاب کیا۔ نصرتی نے اس موقع پر جے سنگھ کی تعریف تو کی ھے مگر اس کی مکاری اور حیلہ بازی کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کیا ھے - یہ گویا آنے والے واقعات کی پیش بندی ھے —

ادھر علی عادل شاہ اپنا دربار کرتا ھے - اس دربار کی شان و شوکت ھی اور ھے - سب سے پہلے چاندنی رات کا سماں کھینچا ھے - یہ سماں بالکل فرضی ھے ' شروع سے آخر تک تشبیہات و استعارات سے کام لیا ھے - یہ فارسی شاعری کی پوری نقالی ھے - یہ چودھویں شب ھے - ماہ کامل جلوہ گر ھوتا ھے شفق' ھوا' ثوابت' جوزا' میزان' سنبلہ سب اپنی اپنی خدمت انجام دے رھے ھیں - قاضیء آسماں کا اجلاس عدالت ھے اور عطارد کارفرمای کے لیے حاضر ھے - اس تمام شان و شوکت کے ساتھ علی عادل شاہ کا دربار ھوتا ھے - زھرا کا نا کاتی ھے جس سے فلکی اور خاکی دونوں وجد میں آجاتے ھیں - وغیرہ وغیرہ

چاندنی کی تعریف میں ایک شعر اچھا کہا ھے

صفای انگے مہ کی شرمندہ سور
دسے روئے خوباں تے تس نرم نور

(یعنے چاند کی صفای کے سامنے سورج بھی شرمندہ تھا اور وہ صفای روئے خوباں سے بھی زیادہ نرم معلوم ہوتی تھی)

یہاں نرم کا لفظ کیا خوب استعمال کیا ہے —

اسی دربار میں بادشاہ اپنے امیر خواص خاں کو شیواجی کے مقابلے اور مغلوں کی امداد کے لیے انتخاب کرتا ہے —

شہنشہ سوں ہمراز خاصاں میں خاص
جسے نام نامی ہے خان خواص

نصرتی نے خواص خاں کی خوب تعریف کی ہے - اس کے بعد سرافرازی کا حال سنئیے

سرافراز خلعت سوں کر بے درنگ عنایت کیے ہت تے اپنے فرنگ
مگر فتح کی وے بشارت دیے مہم بیگ کرنے اشارت دیے

(خلعت سے سرافراز کرنے کے بعد اپنے ہاتھ سے اپنی تلوار عنایت فرمای - گویا یہ فتح کی بشارت اور جلد مہم کرنے کا اشارہ تھا)

بشارت یو پایا چہ سو مہبلی اوتھیالے فرنگ کہہ مدد یا علی

(اُس بہادر نے جو بشارت پائی تو تلوار اٹھا کر "یا علی مدد" کی آواز لگائی)

اور کیا کہتا ہے

کہ میں کھا بدیا ہوں علی کا نمک مغل آئے لگ وہاں مجھے کیا اٹک
کرے آسرے پاے کے تڑکی کار ولے باگ اپنگ مارتا ہے شکار
یکیلاچ انپڑ یوں دھینکانا کروں پہلی پھوڑ ایسا بھنکانا کروں

(میں نے علی (عادل شاہ) کا نمک کھایا ہے میں مغلوں کے آنے تک کیوں رکا رہوں - چڑی مار آسرا پا کے شکار کرتے ہیں لیکن شیر

علانیہ شکار مارتا ہے - میں اکیلا پہنچ کر حلہ کروں گا اور اس کی فوج کو توڑ پھوڑ کر تہس نہس کردوں گا) —

اس کے بعد کیا اچھا شعر لکھا ہے جس میں رزم کے ساتھ بزم کا مزہ آجاتا ہے

کہ باغی کی مجلس و وساقی نہ رہے
مغل آئے لگ دور باقی نہ رہے

غرض یہ بہادر افواج مغل کا انتظار کیے بغیر چل پڑا اور کوچ پر کوچ کرتا ہوا اور گنجان اور خطرناک جنگلوں کو طے کرتا ہوا ایک گھاٹ پر پہنچا جو بہت دشوار گذار تھا اور شیواجی کے سرحد کے قرب ہی میں تھا - لیکن اس سے بےخبر تھا کہ شیواجی کہاں اور کس طرف ہے - رات کے وقت فوج نے اس جنگل میں جو پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا ' پڑاؤ کیا - شیواجی نے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر کہ یہ فوج قلیل ہے اور مغلوں کے آنے میں ابھی دیر ہے ' رات کو شبخون مارا - بیجاپوریوں کے اوسان جاتے رہے لیکن خواص خاں نے بڑی ہمت و دلیری سے کام لیا - فوج کی ہمت افزائی کی اور خود تلوار لے کر آگے بڑھا ' سپاہیوں نے یہ دیکھا تو ہمت کرکے ٹوٹ پڑے اور شیواجی کو مار بھگایا —

نصرتی نے اس لڑائی کا حال بڑی خوبی سے لکھا ہے اور ہیبت ناک کوہستان اور جنگل کی عظمت اندھیرے اور چاندنی کا سماں دکھانے میں بڑا کمال ظاہر کیا ہے - لکھتا ہے

کوبل تھا کہستاں کے مکھ پہ گھاٹ کوہستان کے منہ پر نہایت دشوار گزار
معمے سے موہوم تھی جس پہ باٹ گھاٹ تھا جس کا تنگ رستہ معمے سے بھی زیادہ مرہوم تھا

که جس بات مشکل کا لینے میں نانوں   اس دشوار رستے کا نام لیتے ہوے زبان کا
زبان کا پھسلتا ہے جم مکھ میں پانوں   پاؤں ہمیشہ منہ میں پھسل پھسل جاتا ہے
ہور اس گھاٹ کے تل جو ہے کوہ کن   اور اس گھاٹ کے نیچے جو کوکن کا علاقہ ہے
رہوے روز روشن ہو وہاں جو رین   وہاں روز روشن رات کی طرح نظر آتا ہے
اندھارا ملیا یوں دسے نور سوں   اندھیرا نور سے یوں ملا جلا نظر آتا ہے
که دن جفت ہے شام دیجور سوں   گویا دن شام دیجور کا جفت ہے
اندھارے سوں تارے دسیں دن تمام   اندھیرا اس غضب کا تھا که دن کو تارے
کریں بیٹھ نت وہاں رصد بند کام   نظر آتے ہیں اور رصد والے وہاں بیٹھ
کر کام کر سکتے تھے

وو روئے زمیں گرچہ محبوب ہے   اگرچہ وہ روئے زمیں محبوب ہے لیکن
نظر میں سورج کے بھی محجوب ہے   سورج کی نظروں سے بھی پوشیدہ ہے
زمیں استری ہے سو صاحب جمال   زمیں ایک صاحب جمال عورت ہے اور یہ قطع
کہے ہے یو قطع اپس مکھ کا خال   زمیں اس کے چہرے کا خال ہے
اندھارا تو عالم کا ہے وہانچ جمع   اگرچہ سارے عالم کا اندھیرا وہاں جمع ہے
ولے یک اندھارے میں کئی لکھ ہیں شمع   لیکن ایک اندھیرے میں کئی لاکھ شمعیں ہیں
ہزارا نچھ نکلے ہیں یک نس پہ سور   ایک رات میں ہزاروں سورج نکلے ہوے ہیں
که چربیا ہے یعنے گلستاں کا نور   اور گلستاں کا نور چھا یا ہے
بچھاوے ہو فراش نت نو بہار   نوبہار فراش بنی ہوی ہے اور رنگ برنگ
رنگا رنگ پھولاں تے صدراں ہزار   پھولوں کی ہزاروں مسندیں بچھا رکھی ہیں
پنکھیر و ہر یک بھات کے دلفریب   طرح طرح کے حسین پرندے اپنے رقص
دکھا وین سدا رقص و نغماں سوں زیب   اور نغموں سے عجب بہار دکھا رہے ہیں

جوڑے جھاڑ سب مل کے چھاے فلک	درخت آپس میں اس طرح جڑے ہوے ہیں کہ آسماں کو
ستاریاں کی پکڑی ہے جگ نے جھلک	چھپا لیا ہے اور زمیں پر ستاروں کی صرت جھلک نظر آتی ہے
یک یک بانس میں توڑ سٹنے کا خیال	ایک ایک بانس کا یہ حوصلہ ہے کہ وہ آسماں کی چھت
بلند سقف گردوں تے مکڑیاں کے جال	پر سے مکڑیوں کے جالے اتارنے کا خیال رکھتا ہے
فلک سوں دسیں بانس بھڑیوں اپار	بانس آسماں سے یوں بھڑے ہوے نظر آتے ہیں
کہ منصور یک ہور ہزاراں ہیں دار	کہ منصور تو ایک ہے اور داریں ہزاروں ہیں
گویاں بھوئیں چھجے خاص باکاں کے گھر	اس کی زمیں میں شیروں کے خاص گھر ہیں جن کے منہ
بندے بانس جالیاں سوں مون پر جھجر	پر بانسوں نے گھنی جالیاں بنا رکھی ہیں
دسیں جا بجا غار و خونریز خار	جا بجا غار اور خونریز کانٹے نظر آتے ہیں
قدم در قدم طشت و نشتر ہزار	اور ہر قدم پر ہزاروں طشت اور نشتر موجود ہیں

جنگ کا بیان بھی بڑی تفصیل اور بڑے جوش و خروش سے لکھا ہے مثلاً -

کھنا کھن تے کھڑ کاں کے یوں شور اُٹھیا	تلواروں کی کھنا کھن سے وہ شور اٹھا
جو تن میں پہاڑاں کے لرزا چھوٹیا	کہ پہاڑوں کے تن بدن میں لرزا پیدا ہو گیا
بلا نید میں تھے سو ہوشیار ہوئی	گویا بلا نیند میں سے ہوشیار ہو گئی
اجل خواب غفلت تے بیدار ہوئی	اور اجل خواب غفلت سے بیدار ہو گئی
سلاحاں میں کھڑ کاں جو دھسنے لگے	تلواریں جو اسلحہ میں گھسنے لگیں
اگن ہور رکت مل برسنے لگے	تو آگ اور خون مل کے برسنے لگے

هویاں لهوکیاں چهٹکاں هوا پر بخار	لهو کے چھینٹے هوا پر پہنچ کر بخار بن گئے
ستیں تیغ جیبهاں تے شعلے هزار	تلواروں کی زبانوں سے هزاروں شعلے نکلنے لگے
بهر یا نس کا کهڑکاں کی چنگیاں ے روپ	تلواروں کی چنگاریوں سے رات کا روپ هی کچهه اور هو گیا
هوا نرم چندنا سو سب گرم دهوپ	اور نرم نرم چاندنی گرم دهوپ هو گئی
هوا پر شراریاں کا ات کهیل تها	هوا پر شراروں کا تماشا نظر آتا تها
اوڑے لهو سو تس آگ پر تیل تها	اور لهو جو اڑ رها تها وه گویا آگ پر تیل کا کام دے رها تها۔
فرنگاں په لهو کے کهلالے دسیں	تلواروں پر لهو کے فوارے جاری تهے
انیاں پر تے دهاراں پنالے دسیں	اور انیوں پر سے خون کی دهاریں پرنالوں کی طرح به رهی تهیں
پون کوں سرنگ رنگ پیدا هوا	هوا کا رنگ سرخ هو گیا تها
شفق ابر پر سب هویدا هوا	اور ابر پر شفق نمودار تهی

یه چند شعر رزمیه بیان کی کیفیت دکهانے کے لیے کافی هیں۔ اس سے نصرتی کا کمال شاعری معلوم هوتا هے —

جنگل میں بهاگتوں کی حالت کو کیا خوب بیان کیا هے۔ صرف تین شعر نقل کئے جاتے هیں —

لیا نهاٹتیاں کا هو هر جهاڑ کال	بهاگتوں کا درختوں نے برا حال کیا
موندا ساچ کوی کوی سو جهونٹے کے بال	کسی درخت نے منڈا سا اتار لیا اور کسی نے سر کے بال
ستیا آنگ پر جس کے کانٹے نے هات	جس کسی کے بدن پر کانٹے نے هات مارا
لیا کاڑ کپڑیاں کوں چنبڑی سنگات	تو چمڑی سمیت کپڑے اتار لیے

جتا جھاڑ پینا دسیا اُس گھڑی اُ. دم درخت رنگ برنگ کے رنگا رنگ ٹکڑیاں کی یک گودڑی چیتھڑوں کی گودڑیاں پہنے نظر آتے تھے

ان اشعار میں درختوں سے الجھنے کی کیا اچھی اور صحیح تصویر کھینچی ہے - اس میں تھوڑا سا ظرافت کا پہلو بھی ہے -

اس لڑائی میں نصرتی نے شاہ حضرت ' سیدی سرور اور شیخ میراں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے —

اتنے میں جے سنگھہ کی سر کردگی میں مغلیہ فوج بھی آجاتی ہے اور قلعۂ پورندہ کو فتح کر لیتی ہے - نصرتی اس فتح کا ذکر بڑی حقارت سے کرتا ہے یعنے اصل جان جوکھوں کا کام تو بیجاپوری فوج نے کیا تھا اس میں مغل فوج کی کیا بہادری ہے - کہتا ہے -

تو فرصت مغل پا کیا گڑ کوں زیر
کہ اندلے نے جوں چانپ پکڑیا بٹیر

(یعنے مغلوں نے موقع دیکھہ کر قلعہ فتح کر لیا - گویا اندھے کے ھاتھہ بٹیر لگ گئی) —

جب شیواجی نے یہ رنگ دیکھا اور کوئی مفر نظر نہ آیا تو اس نے پھر دام تزویر بچھایا اور جے سنگھہ سے سازباز شروع کیا - شیواجی آدھی رات کو جے سنگھہ سے جا کر ملا اور بعض شرائط پر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں باہم صلح ہو گئی - نصرتی نے اس غداری پر بہت غم و غصہ کا اظہار کیا ہے - اس شکست کے بعد شیواجی کے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے اور مغلوں سے مل جانے کا جو منصوبہ سوچتا ہے اُسے بڑی خوبی سے بیان کیا ہے —

تا گھر تے ہت دھو	(شیواجی اپنے دل میں سوچتا ہے) کہ اب گھر
بلا ٹالنا	سے ھاتھہ دھو کر (یعنے ملک دے کر)

نظم	ترجمہ
نہ چپ گھر برابر	اس بلا کو ٹالنا چاھئیے - گھر کو جلتے
اپس جالنا	دیکھہ کر خود بھی جلنا مناسب نہیں -
* منڈا سا گلوانا بھلا سر کی ٹھار	سر کے بجاے منڈاسے کا کھو دینا بہتر ہے
کہ بانچیا تو یک سر منڈا سے ہزار	کہ اگر سر بچ رہا تو منڈا سے ہزاروں
مغل سوں تومیں سخت کیتا ہوں کھوڑ	میں نے مغلوں سے سخت دغا کی ہے وہ بغیر
وولے گھر مجے چپ نہ دیویں گے چھوڑ	گھر (ملک) لیے مجھے یونہیں نہ چھوڑدیں گے
طمع جیو بنچانے کوں ایسا دیکھانوں	اپنی جان بچانے کو ایسا لالچ دوں گا کہ
پڑیں شرم ست پھر وو میرے پچھ پانوں	وہ بے حیای سے الٹے میرے ھی پاؤں پڑیں گے
نہ نامرد کے دل پہ انکار آے	نامرد کو کچھہ بھی غیرت نہیں آتی
گنوا لاکھ عزت کوں یک جیو بچاے	وہ لاکھہ عزت کھو کر اپنی جان بچا لیتا ہے
نہ چھے قدر کچھ مال کی چور پاس	چور کے نزدیک مال کی کیا قدر
پھوکٹ لے گنوا وے پھوکٹ	مفت میں ھاتھہ آتا ہے اور مفت میں دوسرے
اور پاس	کو دے دیتا ہے -

اس کے بعد لکھتا ہے کہ شیواجی نے جےسنگھہ کو کیا پٹی پڑھائی -

نظم	ترجمہ
کہ تم آج اگر مجھہ پکڑتے ہیں ہات	اگر تم میری دستگیری کرو تو میں ایک
تو کرتا ہوں یک کام اس دھات سات	ایسا کام کرتا ہوں کہ آج تک کسی سے نہوسکا
نکوی آج لگ کر سکیا ہے وو کام	اور تمہارا نام دنیا میں ابدلآباد
تمہارے تے ہو آبدی جگ میں نام	تک رہے گا

---

* محمد ابراہیم زبیری نے اپنی تاریخ بساتین السلاطین میں اس موقع پر بالکل اسی شعر کا ترجمہ لکھہ دیا ہے - دراصل یہ پرانی کہاوت ہے - وہ لکھتا ہے « مثل مشہور است درمیان مردم کہ چوں سر سلامت باشد دستار کم نیست » (صفحہ ۴۰۳)

کدھیں فوج دھلی کی اس شان سوں دھلی کی فوج نے کبھی اس شان اور
چلی تھی نہ یو ساز و سامان سوں ساز و سامان سے کوچ نہیں کیا تھا -
رکھیں پیٹ میری تو کیا کرکہ فن اگر تم میری پشتی بانی کرو تو ایک چال
یدی لیکہ دیتا ھوں ملک دکن چل کر ملک دکن تمھیں دلا دیتا ھوں

شیواجی نے جب یہ سبز باغ دکھایا تو جے سنگھ پر کیا اثر ھوا

سنیا جب سیو یاتے یو جیسنگ لات جے سنگھ نے جب شیوا جی کی یہ لات سنی تو
اپس شہ کے وعدیاں کوں بادشاہ سے جو وعدے کییے تھے ان سب کو
کیتا خلات بھول گیا
قوی رابطہ مرد صادق مرد صادق سے قوی رشتے کو توڑ کر
سوں توڑ مفسد کے
ملیا کئے میں مفسد کے اخلاص جوڑ کہنے میں آگیا اور اُس سے رابطہ قائم کرلیا
کہ تھا اصل میں اس سے ھم کہ وہ دونوں اصل میں ایک ھی
جنس نیت جنس کے تھے
منگیا رکھنے کافر نے کافر کی پیت کافر نے کافر کی حمایت کی -
طمع ات منافق پہ طمع اس منافق پر اس قدر غالب
غالب ھوئی ھوی کہ ننگ و نام
ڈوبانے کوں تس ذاتوں طالب ھوئی ڈبونے پر آمادہ ھو گیا
سچے مرد سوں راست بازی مرد صادق سے راست بازی چھوڑ دی
کوں چھوڑ اور جھوٹے سے مل کر
منگیا کھیلنے ملکہ جھوٹے سوں ھوڑ فن فریب کھیلنے لگا
طمع اھل عزت کوں کرتی ھے خوار
کرے جگ میں بے قول و بے اعتبار وغیرہ وغیرہ

اب نیا دور شروع ہوتا ہے - مغلوں اور شیواجی کی باہم صلح ہوجاتی ہے اور علی عادل شاہ کا مغلوں سے مقابلہ ہوتا ہے —

علی عادل شاہ کو جب اس غداری کی خبر ملی تو سخت پریشان ہوا - مُلا خرم اور مُلا احمد کو بھیجا کہ وہ جے سنگھ سے گفتگو کرکے اُسے راہ پر لائیں لیکن اس گفت و شنید کا کچھہ اثر نہ ہوا - مجبوراً جنگ کی تیاری ہوی - آس پاس کے زمینداروں اور باج گزار سرداروں کو فوج وحشم لےکر حاضر ہونے کا حکم ہوا —

مواس و منیوار　عالی مقام عالی مرتبت مواس اور منیوار
لے آے اتھے پاے دل جو تمام　اپنی پیدل فوجوں کو لےکر حاضر ہوے
سلامت رھنا کر بڑا شہ کا گھر　تا کہ بادشاہ کا گھر سلامت رہے وہ
اوتھے تھے سو سب جیو پہ کرنے کھتر　جاں جوکھوں کے لیے آمادہ تھے
خوش اس دھات فوجاں پہ فوجاں چلیاں　فوجوں پہ فوجیں اس ڈھنگ سے چلیں
کھیے توں کہ دریا پہ موجاں چلیاں　گویا دریا پہ موجیں؟ چل رہی ہیں

بادشاہ نے ایک دور اندیشی یہ کی کہ شہر کے گرد جس قدر باغ، نہریں، حوض، تالاب اور پورے تھے ان سب کو مسمار کردینے اور توڑ دینے کا حکم دیا - اور باولیوں اور کنوؤں میں زہر ملا دینے کا انتظام کیا گیا - تاکہ غنیم کو نہ کوئی جاے پناہ ملے اور نہ پینے کو پانی نصیب ہو —

حوضوں اور تالابوں کے ٹوٹنے سے پانی جو ایک دم زور شور سے بہا ہے تو اُس کی کیفیت یوں لکھی ہے

دسے دور تے یوں وہ پانی جنجال
زمیں حوض ہوی ہور فلک تس کنجال

باغات کی بربادی کے متعلق لکھتا ہے —

تلف یوں یتے تازہ باغاں ہوے فلک پر گلاں جن کے داغاں ہوے
پرندیاں کوں کیں باغ و بن نہیں رھیا چرا کاہ ہور کیں وطن نہیں رھیا
نہ تھی دھوپ جہاں وہاں کھڑا آفتاب لگیا آب کی ٹہار بہنے سراب

(یعنے جہاں کبھی دھوپ کا گذر نہ تھا وہاں آفتاب کھڑا تھا اور پانی کی جگہ سراب بہ رہا تھا)

رھیا سب ہو برباد یوں بے قصور اوڑایا ہے گویا قیامت کا صور
کف دست بھوئیں یوں ہوئے سر بسر دیکھیں کوٹ پرتے نظر کر اگر
ڈھلے جس رخن گولہ بیضے کی ٹہار نہ ٹہارے لگے لگ فلک کے کنار

(یعنے قلعہ پر سے اگر نظر دوڑای جاے تو ساری زمین کف دست کی طرح صاف نظر آتی تھی - اگر قلعہ سے گولہ مارا جاے تو انڈے کی طرح لڑھکتا چلا جاے اور جب تک آسمان کے کنارے نہ لگ جاے س وقت تک نہ ٹھیرے)

یہ سارا انتظام میرزا یوسف کے سپرد تھا - مرزا کی نصرتی نے بہت تعریف لکھی ہے —

اس باب کی ابتدا نصرتی نے قلعۂ بیجاپور کی تعریف سے کی ہے اور اس کی شان و شوکت' اس کی سر سبزی و خوشحالی اور ثروت و عظمت کا بیان کرنے کے بعد بادشاہ کے حکم سے اس کے باغوں اور کھیتوں کے برباد کرنے' اُس کے پوروں اور آبادیوں کے مسمار کرنے اور اس کے نہروں اور حوضوں کے توڑ ڈالنے کا افسوس ناک ذکر کرتا ہے - اسے پڑھ کر افسوس ہونے لگتا ہے اور اہل بیجاپور اور اس کے سلطان سے ہمدردی ہو جاتی ہے - قلعہ کی تعریف کے صرف چند شعر نقل کرتا ہوں —

فلک یو جو دھرتا ہے دیدے ہزار ندیکھا ہے اتنا بڑا کیں حصار
زہے کوٹ عالی بجاپور کا کہ ہے برج بیت الشرت سور کا
کرے تت بلندی میں کیواں سوں بات کنگورے چھپنے بام ہفتم کوں ہات
(اس کی فصیل اتنی بلند ہے کہ زحل سے باتیں کرتی ہے اور اس کے کنگرے فلک ہفتم کو ہاتھ سے چھولیتے ہیں)
فلک دھوپ لگ کر پریشان ہوے کنگورا ہر یک تس سوریا پان ہوے
(فلک اگر دھوپ سے پریشان ہوجاے تو اس کا کنگرہ چھتری کا کام دے گا) -
یون چڑ سکیا نہیں کدھیں تت بلند دھویں کا بی ست کنگرے پر کمند
(دھنویں کی کمند ڈال کر بھی ہوا آج تک اس کی بلندی تک نہیں پہنچ سکی)
اگر آسرے تت کے نکلے تو چاند صبا ہوے چڑ آے لگ ویچھ کاند
(اگر چاند اس کی فصیل کے سہارے نکلے تو صبح ہوے تک اُسی ایک دیوار تک رہے)
بدل کاچ تکڑا کنگورا دسے کڑ کتی جو بجلی زنبورا دسے
(اس کی فصیل کا کنگرا بادل کا ٹکرا معلوم ہوتا ہے اورکڑکتی بجلی اس کنگرے پر کی بندوق ہے)
نہیں کوی کنگورا بی ڈونگرتے کم رنبورا ہر ایک افعیء تیز دم
(ہر کنگرا پہاڑ سے کم نہیں اور اس کی ہر ہر بندوق تیز دم افعی ہے)
زحل دیکھ جس کے عرابے کا پھیر دسیا لنگ ہو سیر کرنے تے سیر
(زحل اس کی توپوں کا زنجیرہ دیکھ کر سیر کرنے سے بیزار اور لنگڑا ہوگیا)
بزرگی میں جس پھیر کے آسماں دسے نقط جیوں دائرے کے میاں

(آسماں اس کے پھیر کی بڑای کے سامنے ایسا ھے جیسے دائرے کے بیچ میں نقطہ)

غرض یہ سب بیرونی انتظام کرنے کے بعد قلعہ کی شکست ریخت ' حصار کی درستی ' سامان رسد کی فراھمی وغیرہ کے تمام انتظام اندرون قلعہ کیے جاتے ھیں اور جنگ کے لیے تمام تیاریاں مکمل کرلی جاتی ھیں - اس کا بھی کسی قدر تفصیل سے ذکر ھے —

جب قلعہ کے اندر تمام انتظامات مکمل ھوگئے اور فوج کیل کانٹے سے لیس ھوگئی تو سلطان علی عادل شاہ نے اپنے خاص خاص امرا ووزرا اور فوجی سرداروں سے مشورہ کے لیے مجلس منعقد کی - جن میں (بقول نصرتی) عبدالمحمد ' محمد اخلاص خاں ' خان شرزا ' عبدالکریم ابن عبدالرحیم ' یکوجی فرزند شاہ جی شریک تھے - ان سب کی حسب لیاقت و درجہ تعریف کی ھے - ان سب سے مخاطب ھوکر سلطان نے فرمایا —

رھنا گھر دکن کا تمھارے تے تھانب   کہ ھیں سلطنت کے تمیں آج کھانب

(دکن کا گھر اب تمھارے ھی سنبھالے سنبھلے گا کیونکہ تمھیں اس سلطنت کے سہارا (کھم) ھو)

ھوا ھے مغل آج بد عہد کل   اوچانے پہ ھے یہاں تلک آکہ غل

اگر پیش رو اھل تلبیس ھے   اُسے رھنما نسل ابلیس ھے

دکھایا ھے دریا کوں کریک سراب   رکھیا نام زھر ھلاھل گلاب

اگیتی کوں سمجیا دیا لالہ زار   اناراں کے دانے دسے تس انگار

(مغل ھم سے بد عہد ھوگیا ھے - اُسے ابلیس نے ایسا بھکایا ھے کہ اُسے سراب دریا اور گلاب زھر ھلاھل نظر آتا ھے - گلخن لالہ زار اور انگارے

انار دانے دکھای دیتے هیں)

کیا سو سہم پا ھمن تے مدد هوا پھر ھمن سوں بد اندیش بد

(همیں سے مدد پا کے تو سہم سرکی اور اب همیں سے بدگمان ہو گیا ہے)

اگر متفق بد سوں بد جنس هے ولے مجہ مدد خالق انس هے

اوسے گرچہ بل بت پرستی اچھے همن قرب ربی کی مستی اچھے

(اگر بد اور بدجنس متفق ہوگئے هیں(مغلوں اور شیواجی کے اتفاق کی طرف اشارہ ہے)

تو همیں اپنے خالق سے مدد کی امید ہے ۔ اگر اُسے بت پرستی کا بھروسہ

ہے تو همیں قرب رب کی مستی کافی ہے)

غرض اس قسم کی تقریر سے اصل حقیقت بیان کرکے اپنے امرا اور بہادروں کو جوش دلاتا ہے ۔ تقریر کا آخری شعر یہ ہے

رکھو آج مردی سوں ہو مرد نام

تمن نام ہوے ہور ھمارا سو کام

(اے جواں مردو ! آج مردی کی لاج رکھہ لو، تمہارا نام ہو اور ھمارا کام ۔)

یہ لوگ اس کے جواب میں سلطان کی تعریف ، مغلوں کی بیوفائی کی مذمت کرتے هیں اور اپنی وفاداری اور جان نثاری کا اپنے آقا کو اطمینان دلاتے هیں ۔ اور اپنی اور مغلوں کی لڑائی کے ڈھنگ کا مقابلہ کرکے اپنی شجاعت اور ان کی بزدلی کا خاکہ کھینچتے هیں ۔ اس مقام کے چند شعر نقل کیے جاتے هیں —

زمانہ میں شاہ یگانہ تہیں حقیقت میں شاہ زمانہ تہیں

غریباں نوازی ہے تجہ بندگی تری بندگی مایۂ زندگی

تری نعمتاں کھا سکے ہم تمیز نمک او یہی وقت کرنا ہے چیز

شجاعت ہماری ہمیں سب پہ ور مغل اصل نامرد ہور حیلہ گر
ہمیں قبضہ جمدھار و کردا فرنگ مغل کا ہے ہتیار تیر و تفنگ
ہمیں بیس دَل میں کریں لوٹ پوٹ لڑیں چھپ مغل لے دِرابے کا اوٹ
ہمیں کو تہ ہتیار سوں جھوڑتے کہاں رہے پہ اوسان او چھوڑتے
دکھن کی لڑائی سے کندرائے ہیں مغل آکہ اول جو لت کھائے ہیں
کہے یاد رکھہ پوت اس پند کوں یکیک موت کے وقت فرزند کوں
کہ زنہار نیں او پھر آنے کی تھار دکھن کی سہم پر تجو روز کار
جو نپجے ہیں وو پوت عاق یہ آتے سو اکثر ہیں ماواں لیے پر طلاق

آخر کے تین شعر قطعہ بند ہیں - جن کے معنے یہ ہیں کہ مغلوں کا ہر سپاہی مرتے وقت اپنے بیٹے کو یہ وصیت کرتا ہے کہ یاد رکھو کہ جب کبھی دکھن کی سہم در پیش آے تو نوکری سے دست بردار رہو جانا کہ وہاں جانے کے بعد واپس آنے کی ہرگز کوئی توقع نہیں رہتی۔ (اس کے بعد کہتا ہے) کہ یہ جو نوجوان مغلوں کی فوج میں ہیں یہ وہ ہیں جنھیں ان کے باپوں نے عاق کر دیا ہے اور مطلقہ ماؤں کی اولاد ہیں)

اگلے بیان میں اس نے تمام قوموں اور ملتوں اور خیلوں اور قبیلوں کے نام گنوائے ہیں جن کے بہادر افراد فوج میں شریک ہیں - اِن میں ہندو اور مسلمان دونوں ہیں - کوچ سے پہلے پھر تمام فوج سے خطاب کرتا ہے اور اہل فوج اپنی جان نثاری کی تجدید کرتے ہیں -

اُدھر سے جے سنگھہ کی فوج نے عادل شاہی علاقے پر یورش کی اور قلعہ منگل بیڑ پر قبضہ کرکے سر افراز خاں کو پانچ ہزار سوار کے ساتھہ وہاں متعین کر دیا - جب اس کی خبر شرزہ خاں کو پہنچی تو اس نے فوراً ادھر کا رخ کیا - بیجاپوری فوج کے پہنچلے پر سر افرار خاں نے (خلاف

احکام جے سنگھ) قلعہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا - تھوڑی دیر خوب لڑائی ہوئی اور سرافراز خاں عین کارزار میں مارا گیا - مغلوں کی باقی فوج قلعے میں جاکر محصور ہو گئی - اور جب بیجاپوری بندوقوں کی زد میں آگئے تو گولیاں مار مار کر بھگا دیا - لیکن نصرتی اور عادل شاہی مورخ یہ لکھتے ہیں کہ شرزہ خاں نے قلعے پر تسلط کر لیا مگر اتنے میں عبدالمحمد اور محمد اخلاص خاں کا خط پہنچا کہ غنیم سے اِن کا دو تین دن میں بڑا معرکہ ہونے والا ہے فوراً چلے آؤ - شرزہ خاں نے اسی وقت منگل بیڑہ سے یلغار کی اور عادل شاہی لشکر سے جا ملا —

اصل لڑائی اب شروع ہوتی ہے - جے سنگھ اپنا لشکر لے کر بیجاپور کے قرب و جوار میں آ پہنچتا ہے اور بیجاپوری قلعے میں محصور ہو کر مقابلے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور کچھ فوج میدان میں لڑنے مرنے کے لیے جاتی ہے ' اور جو علاقہ مغلوں کے تصرف میں تھا اس پر حملہ شروع کرتی ہے —

ان لڑائیوں میں کبھی پسپائی ہوئی اور کبھی کامیابی - لیکن نصرتی ہر بار اپنی ہی فتح بتاتا ہے - ان کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے مگر ہر موقع پر اس نے جو رزمیہ بیان لکھے ہیں وہ بلا شبہ قابل تعریف ہیں - مثلاً جنگ کی طیاری ' بہادروں کی نبرد آزمائی ' ہتھیاروں کا چلنا ' گھوڑوں کی باد پیمائی ' ہاتھیوں کا جوش و خروش ' غرض پورا جنگ کا سماں دکھایا ہے - رزمیہ شاعری کا یہ کمال قدیم اردو زبان میں کہیں نہیں پایا جاتا اور ضمیر اور انیس سے قبل کسی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی - یہ سچ ہے کہ نصرتی میر انیس یا زمانۂ حال کے بعض رزمیہ نگار مرثیہ نویسوں کو نہیں پہنچتا لیکن یہ بھی دیکھنا چاہئے

کہ اس نے میر انیس وغیرہ سے سوا دو سو برس پہلے ان مضامین پر طبع آزمائی کی ہے —

یہاں بعض مقامات سے کچھہ کچھہ شعر نقل کئے جاتے ہیں - مثلاً وہ اپنی فوج کے ہتیاروں کا ذکر یوں کرتا ہے -

جو ہے تیر ہر یک اجل کی چیٹی ہر تیر اجل کا پروانہ ہے جو لگنے پر
لگے پر لیے جیو بن نہیں چھوٹی بغیر جان لیے نہیں چھوٹتا
بھوکا اژدھا رن پر بھالا دسے بھالا رن میں بھوکے اژدھے کی طرح ہے
دندی کاچ جیوتس دشمن کی جاں اس کا نوالا معلوم
نوالا دسے ہوتی ہے
جو برچی چھوٹی جا پرنہار ہے برچھی چلنے میں جان کی لیوا ہے
وو ہر ناگنی اُڑ لڑنہار ہے وہ ایک ناگن ہے جو اُڑ کے ڈستی ہے -
کمند ہار ہو جا پڑے جس گلے کمند جس گلے کا ہار ہو کر جا پڑے تو وہ
انکھیاں میں نہ جیو لیاے بن چپ ٹلے بغیر آنکھوں میں دم لاے نہیں ٹلتی
فرنگ ہر اجل کی ندی کا ہے پاٹ تلوار اجل کی ندی کا پاٹ ہے
ڈوباتا ہے جیو جس کے پانی جس کی آب کا کاٹ جانوں کو ڈبو
کا کاٹ دیتا ہے

یہ دو شعر خاص طور پر قابل ملاحظہ ہیں

پٹا رن کے دریا کا پٹا رن کے دریا کا نہنگ معلوم
دستا نہنگ ہوتا ہے
کرے دم کی جھڑپوں دو دھڑ جو اپنی دم کی جھڑپوں سے دھڑ دو
بے درنگ ٹکڑے کر دیتا ہے
دسے جیب اژدر کی سیف آبدار سیف آبدار اژدھے کی زبان معلوم ہوتی ہے

اوڑیں وار کرنے میں چنگیاں ہزار | جس سے وار کرتے وقت ہزاروں چنگاریاں اڑتی ہیں

قسم قسم کے گھوڑوں کی کیفیت، ان کے رنگوں اور ان کی سرعت کا بھی ذکر آتا ہے —

اچنبک کیتي بھانت اچپل ترنگ | سیکڑوں قسم کے تیز طرار گھوڑے کہ جن

پون پیچ کھاوے اتھیں پرنسنگ | کے چلنے پر ہوا پیچ و تاب کھاتی ہے

دریای جو دریا پر ستتے ہیں دھانوں | دریای (گھوڑے) جب وہ دریا پہ دھاوا

نہ دیتے ہیں لگنے کوں پانی پہ پانوں | کرتے ہیں تو پانو کو پانی نہیں لگنے دیتے

کنچی، روپ ونتی، چنچل، من ہرن | ایسے دل موہنے والے، چنچل، حسین، طرار

بھولے سد تھکاں اُن کی دیکوت پون | کہ جن کے ناز و انداز دیکھہ کر ہوا کے بھی ہوش جاتے رہتے ہیں -

سبک سیر ترکی ہ سیں گرد باد | سبک سیر ترکی بگولے معلوم ہوتے ہیں

گزر جائیں گلشن پہ بارے کے ناد | وہ گلشن پر سے ہوا کی طرح گزر جاتے ہیں

ہاتھی کے بیان میں بہت سے شعر لکھے ہیں، یہاں صرف چند لکھے جاتے ہیں —

چلیں پردسیں پاکھراں سوں سلور | جب پاکھروں سے سنورے سلورا ے چلتے ہیں تو یہ

فرشتے چھا وڑتے ہیں جیوں پھول پر | معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے پر کھولے اڑ رہے ہیں

سہیں کوہ البرز سے مست گج	ایک ایک آہنی برج سے سجے ہوے مست
یکیک آہنی برج قامت سوں سج	ہاتھی کوہ البرز معلوم ہوتے ہیں
لٹکتے چلیں پر لگیں	اگرچہ ناز سے چلتے ہیں تو بھی بگولا
گرد باد	معلوم ہوتے ہیں
دسیں ہال اتھنیں غلولے	دوڑتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے توپ کے
کی ناد	گولے ہیں
مخالف کے دل پر تو دریا کا لوٹ	مخالف کے لشکر پر دریا کا سا سیلاب ہیں
اپس فوج انگے پن وو چلتا	اور اپنی فوج کے آگے چلتے ہوئے
سو کوٹ	قلعے ہیں
دھریں ملک کی فتح یابی کا آڑ	ملک کے فتح باب کا سہارا ہیں
کلیداں سوں داتاں کی	اپنے دانتوں کی کنجیوں سے کواڑ
کھولیں کیواڑ	کھولتے ہیں
کریں پائیں سنمکہ تو یک دم	ن کی سونڈیں قیامت کا
میں دور	صور ہیں
دھریں سونڈ گویا قیامت کا صور	جو سامنے آیا اٹھا پھینکتے ہیں
نکوی باغ بن رکھہ دسے	جیسے کوئی باغ درختوں کے بغیر بھلا
دل فریب	نہیں معلوم ہوتا
نہ کچھ باج کوی دل پکڑتا	اسی طرح کوئی لشکر ہاتھی بغیر اچھا
ہے زیب	نہیں لگتا

فوج کے کوچ کو کس خوبی سے بیان کیا ہے

ہوئی فوج جیوں مستعد جس گھڑی	جس گھڑی فوج مستعد ہوی تو دماموں
دمامیاں پہ چوندھرتے لگڑی پڑی	پر چاروں طرف سے ضربیں پڑنے لگیں

گگن پر ستارے ہوے حال میں آسماں پر ستارے یوں ہلنے لگے
ھد رتا ہے سیماب جوں تھال میں جیسے پارہ تھال میں ہلتا ہے
جتنے بھیر و برغم جو بجنے لگے جتنے قرنا اور نقارے تھے سب بجنے لگے
سوا لاکھ پربت گرجنے لگے گویا سوا لاکھ پربت گرج رہے تھے
دسے فوج دریا نمن ہر طرف فوج ہر طرف دریا کی طرح نظر آتی تھی
لگیں رست چھتریاں کی اور چھتریوں کی قطار ایسی معلوم ہوتی
موجاں پہ کف تھی جیسے موجوں پر کف

اسی طرح بیان کرتے کرتے کہتا ہے کہ زمیں فوج کی رگڑ سے اس قدر پیسی گئی اور پائمال ہوئی کہ اس کی گرد کا ایک کرہ آسمان کے طبق میں جا جما- یا یوں کہو زمیں کے بستر خاک کو اونچا کردیا ہے اور اس کا پردہ افلاک پر جا باندھا ہے- آخر میں کہتا ہے —

کھیے کیا ابھال آکہ اوتریا ہے وھاں
بڈی ہے زمیں یا نویا آسماں

گویا وھاں ایک بادل اُتر آیا ہے: یا تو زمیں اونچی ہوگئی ہے یا آسمان نیچا ہوگیا ہے —

اس باب میں اُس نے دھلی کی فوج کا بیان بڑے لطف سے کیا ہے- لشکر کی بہتات، اس کی عظمت، ھندوستان و ایران و ترکستان کے مختلف اقوام اور قبائل کے لوگوں کی شرکت، ھاتھیوں کے پرے، اسلحہ کی کثرت وغیرہ تفصیل سے بیان کی ہے مگر ساتھ ساتھ چٹکیاں بھی لیتا جاتا ہے اور یہ سارا بیان اچھی خاصی ہجو ملیح ہوگیا ہے - یہاں میں اس کا اکثر حصہ نقل کیے دیتا ہوں —

کتا ہوں اتا فوج دھلی کی بات | اب میں دھلی کی فوج کا حال سناتا ہوں

چلے تھے دکن دل پہ کس دھات سات
کہ جس فوج کو دیکھنے میں سمج
دسے نا کسے انتہا ہور اوپج
ھتیاں کا عرابہ چلے میل میل
نہنا جس میں سردار
اصحاب فیل

کدو کس ڈھنگ سے دکن کے لشکر پر چڑھے تھے
ایسی فوج کہ جس کی انتہا اور
ابتدا سمجھہ میں نہیں آتی تھی
ھاتھوں کا پرا آھستہ آھستہ چلتا تھا
ان میں کا ھر ایک اصحاب فیل کے
ھاتھیوں کا سردار تھا

سراسر اگر بہار سارا دسے
تو یک فوجدار اُس
میں دارا دسے

اگر ساری فوج کو ایک سرے سے دوسرے سرے
تک دیکھا جائے تو ایک ایک فوجدار
دارا کے رتبے کا معلوم ھوتا تھا

سہک منصبی ہور بھاری کتے
اتھے کئی صدی ہور ہزاری کتے
یک یک ملک کے نام آور جواں
دو اسپہ سہ اسپہ سپہ بے گماں

کچھہ ان میں چھوٹے منصبدار تھے اور کچھہ بڑے
بڑے منصبدار ؛ کچھہ صدی تھے کچھہ ہزاری
ان میں ملک ملک کے نام آور جوان تھے
اور اس میں دو اسپہ سہ اسپہ سب قسم کے سپاھی تھے

اس کے بعد وہ ھر قوم اور قبیلے اور ھر ملک اور شہر کے لوگوں کو جو مغلوں کی فوج میں بھرتی ھوکر آے تھے، گنواتا ھے اور کہیں کہیں ان کے عادات و خصائل کو ھجو یہ رنگ میں بیان کرتا ھے —

مغولاں کیتے ملک و کے شہر کے
کیتے ھندو کوئی ماوراالنہر کے
چغتے قزل باش اذبک بلی
قندھاری کتے بلخی و کابلی
مروت کے مفلس محبت کے شوم
فراست کوں طوطی نحوست میں بوم
فریب ان کے فن میں بڑا برد ھے
جنم جن کا ابلیس شاگرد ھے
نچھے جن میں اصلا مروت کی بوے
کریں اُس سوں بد جس سے نیک اُن پھوے
تھکا نیچہ دنیا کو مادر کہیں
چھپا لوز ظاھر کوں خواھر کہیں

(ٹھگنے کے لیے دنیا کو مادر کہتے ہیں اور نفسانی خواہشات کو چھپا کر ظاہر میں خواہر کہتے ہیں یعنے بڑے ابن‌الوقت ہیں) -

بدی باپ سوں اپنی میراث جان برادر کا خوں شیر مادر پچھان
دیکھیں کچ ہے جہاں فائدہ آپ کوں نچھوڑیں سگے بھائی اور باپ کوں
اتھے میرزا اُن میں کشمیر کے غرائب سپاہی بی چوندھیر * کے
خراسانی اور اصفہانی کیتے دماوندی و دامغانی کیتے
کیتک سبز واری بخاری کیتے هراتی و طوسی و لاری کیتے
هویزای و هروی و همگری سجستانیاں اصل نسل آذری
کتک ترک گرجی کتک رومیاں سمر قندی شیر ازی جهرومیاں
کمنداز کوئي گرز بازی میں چست تیر انداز کوئی نیزہ بازاں درست
بھوکے هو کہ جھگڑے کوں پھرتے دلیر لوہے چابتیں دل نهوئیں ان کے سیر
خلال ان کے دانتاں کا بھالا دسے گراں گرز مکھہ کا نوالا دسے
کیتک ذات کے تھے روھیلے اد ت زبردست پنجابیاں دل کے گھٹ
بھوت راو رانے اتھے رج کے پوت † غروری میں شیطان جھگڑے پہ بھوت
سسودی و کچھوی و کابی جنوار سورج و نس و سرسات و گوھل پنوار
امت دیوڑی چندراوت چنڈیل سیندھل سوم بنسی و کھینچی پونچھیل
سوري جیٹھوی هور جھالے کیتے سو لنکی و پر مارو هالے کیتے
کدم کوڑ و کوڑی و کاڑی کیتے کتک چاوڑی هور هاڑی کیتے
بئیس اور کھیلوت کے دھاندلاں چوهاناں و سورها کیتے باچھلاں
کیتے بھرئی واجھی واکھیلے بھٹے ٹانک و بھاٹی کیتے واڑلے

* چوطرف - † راجپوت -

تھرانا و کسمونیاں بڑ گجر کھر وار و بوندیل وجادھو تنور
اھیران و کھاچر و آسیل تھے دھوری ہور راٹھور و تومیل تھے
براڑی کیتے خاندیسی کیتے بنگالی کی کوتاں بھیستی کتے

غرض اس طرح وہ فوج کی ہر ذات اور قبیلے اور ملک و دیار کے باشندوں کا شمار کرتا چلا جاتا ہے —

ان کے لباس کے متعلق لکھتا ہے —

کئی کسوتاں تنکی کوئی آھنی سلاحاں بندی یعنے روئیں تنی
تپاونی کیسے جامہ کوئی کیسری کئے کسوتاں صاف کوی زر زری
جرت * کے طرے سر پہ کلگیاں لگاے مہن مال + کوی گل ‡ مکت سال بھاے ††

لیکن آخر تان اس پر توڑتا ہے -

مغل ہر ہنر میں برا کارساز
لڑائی کے فن پر تو ات ‡‡ حیلہ ساز

اس کے بعد شاعر مغلیہ فوج کی حالت اور شان کا نقشہ کھینچتا ہے

چلے سات لے دل کا چلتاچ کوٹ	فوج کا چلتا ہوا کوٹ (قلعہ) ساتھ لے کر
سرپ فوج دارو سوں آتش کی موت	چلے اور تمام فوج گولے بارود کی وجہ سے آگ کا خزانہ بنی ہوئی تھی
زنجیرے کا حلقے سوں باندے حصار	زنجیروں کے حلقے سے حصار باندھا ہوا تھا
رچیں جوڑ گج مست برجاں کی تھار	اور اس حصار کے برج مست ھاتھی تھے
فرنگ نال او تم چیں کے بوم کے	اعلیٰ درجے کی بندوقیں چین کے ملک کی
فرنگی فرنگ داز کوی روم کے	اور ان کے چلانے والے روم کے تھے

---

* جڑاؤ - + موھن مالا - ‡ گلا - †† ڈالے ہوے - ‡‡ بہت، نہایت -

متن	ترجمہ
کریں یک رنجکہ کر جو گولیاں کی ریز ہوا ہوے اگیٹی انگاریاں کی تیز	جب یک بارگی گولیاں چلائیں تو ہوا جلتے ہوے انگاروں کی انگیٹھی بن جاتی ہے -
قطاراں قطاراں شتر نال اچھے سب اوس کوٹ کوں ہو کہ سہکال اچھے	شتر نالوں (یعنے وہ بندوقیں جو اونٹوں پر رکھہ کر چلائی جاتی ہیں) کی سینکڑوں قطاریں تھی اور وہ سب اس کوٹ (فوج) کی زینت تھیں
چھوٹے مست ہاتھی تو ڈونگرتے چڑ فرنگیاں زنبوریچ چوڈل سو کڑ	مست ہاتھی جو پہاڑوں سے بھی بڑہ چڑہ کر تھے چھٹے ہوے تھے اور چھوٹی بڑی توپوں سے قلعہ آراستہ تھا
یکیک بستہ دارو کا یک کوہ جان صندوقانچ گولیاں کی ششیاں کی کھان	گولے بارود کا ایک ایک ڈھیر ایک ایک پہاڑ تھا اور صندوقوں، گولیوں اور شیشوں کی کان تھے
بڑا توپ خانہ یکیک جس کی توپ غلولے سوں دھرتی کا ہوے سینہ کوپ	بڑا توپ خانہ تھا جس کی ایک ایک توپ ایسی تھی کہ اس کے گولے سے زمین کا سینہ شق تھا
دیکھت گولہ بسرے کرہ بھویں کا ناز تھکیے دیکھہ بھانڈے فلک حقہ باز	ان گولوں کو دیکھہ کر کرۂ ارض اپنا ناز بھول جاتا ہے اور فلک حقہ باز دیکھہ کر ششدر رہ جاتا ہے
ہر یک توپ بادل ہے بن برق بار برستی اگن جل میں گولیاں کے گار	ہر ایک توپ برق بار بادل تھی جس کے گولے جل میں برستی ہوی آگ تھے
جو یکہ توپ دھرتی پہ جب کڑکڑے	اگر ایک توپ بھی اس زمین پر کڑکڑاے

سمدر کا دہشت سوں پانی پڑے	دہشت سے سمندر کا پانی اڑ جاے
شتر بار باناں ہزاراں قطار	اونٹوں کی ہزاروں قطاریں تیروں سے
دسے بانس پیکیا سو جیوں	لدی ہوی ایسی معلوم ہوتی تھیں گویا
کوہسار	کوہسار پر بانسوں کے کھیت اُگے ہوے ہیں
ہتی لئی مکوڑیاں تے چمٹیاں	ہاتھی، مکوڑوں اور چیونٹیوں کی
تے تار	قطار سے
پیاداں کے بہاراں ملم	بھی زیادہ تھے اور پیادہ فوج ٹڈی دل
تے اپار	سے بھی بڑھ کر تھی

غنیم کی فوج کا یہ ذکر بڑے زور شور سے کیا ہے - اپنی اس فوج کو دیکھ کر جے سنگھ کیا کہتا ہے

یو جب فوج جے سنگھ	سنگھ نے جب یہ آراستہ فوج
دیکھیا سنور	دیکھی تو
کیا لات ایسی خدا	وہ خدا کو بھول گیا اور ایسی لات
کوں بسر	مارنے لگا
مسلماں تکرار کرتے ڈر	کہ جیسے مسلمان کہتے ڈرتا ہے اور فرنگی
فرنگی سونے بی تو توبہ کر	سن پاے تو توبہ توبہ کرے -

دوسری طرف سے بیجاپوری فوج کوچ کرتی ہے اور ایک دوسرے کا آمنا سامنا ہوتا ہے - ان دونوں میں شیواجی کی حالت کو پاسنگ سے بڑی اچھی تشبیہ دی ہے، جو موقع پا کر کبھی اِدھر ہو جاتا ہے کبھی اُدھر —

دونو بہار ہم تول تھے یوں اگر	دونوں فوجیں برابر کی ہم پلہ تھیں
سیویا ان میں پاسنگ کا تھا پتھر	اور شیواجی اُن میں پاسنگ کا پتھر تھا

جو یک دل کھڑا رھے یہ یک اگر ایک لشکر کھڑا رھے یا
تک چلے　　ایک چلے
نوے یک طرت یک طرت تو یہ کبھی ایک طرت کو جھک جاتا ھے
ڈھلے　　اور کبھی دوسری طرت کو-
تو سنجیدہ لوگ اس کوں تو سنجیدہ لوگ اُسے پاسنگ
پاسنگ جان　　سمجھ کر
منگے ترت کرنے وو پلے فوراً اپنے پلے کو کان دیدیتے یعنے
کوں کان　　اجھکا دیتے ھیں -

اب لڑائی کا سماں شروع ھوتا ھے اور خان شرزا بہادری کے جوش میں آگے بڑھتا ھے - کیا دیکھتا ھے کہ مغلیہ فوج توپوں کا حصار اپنے گرد کیسے کھڑی ھے - یہ رنگ دیکھ کر خان شرزا کہتا ھے —

کہ بیٹھا چ ھے لگ کنڈل مار سانپ　ستیکا چ بے فکر چھیڑے تو چھانپ
ھمیں ھو کہ ناچیکہ چھکارنا　لنبا کرکے اس مار کو مارنا

یعنے یہ سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ھے ' اگر ذرا بھی چھیڑا تو ڈس لے گا - تو ھم کیوں خواہ مخواہ اسے چھیڑیں ' مناسب یہ ھے کہ اُسے لمبا کرکے ماریں - یعنے ایسی ترکیب کریں کہ وہ کنڈلی کھول کر آگے بڑھے اور اس وقت ھمارا داؤ چل جائے گا - توپوں کے زنجیرے سے محصور ھونے کو سانپ کی کنڈلی مارنے سے کیا اچھی تشبیہ دی ھے —

غرض بیجاپوری فوج اپنا داؤ کرتی ھے اور پیچھے ھٹتے ھٹتے غنیم کو دور کھینچ لاتی ھے اور پھر مقابلہ کرتی ھے —

اب جنگ کا میدان گرم ھوتا ھے

هوا پل میں پیدا کری بے مثال	ہوا نے ایک پل میں آگ کا آسماں
اگن کا گگن ہور دھوئیں کا ابھال	اور دھوئیں کا عجیب و غریب بادل پیدا کر دیا
فنیاں کے بھیجیاں کوں کھانے شتاب	دشمنوں کے بھیجے کھانے کے لیے تلواروں کے
خوش آنے لگیا سوں میں کھڑکاں کے آب	منہ میں پانی بھر بھر آتا تھا -
کھاناں رکھیاں دل کشاکش منیں	کھانوں نے دلوں کو کشمکش میں ڈال رکھا تھا
اوبلنے لگے تیر ترکش منیں	اور تیر ترکش سے اُبلے پڑتے تھے -
پھوکیا تیزیوں سخت بھالیاں کا انگ	سخت بھالوں کا جسم اس طرح پھنک رہا تھا
کہ پھکتا ہے جیوں باؤ لے کر بھوجنگ	جیسے اژدہا ہوا کھاکر پھنکارے مارتا ہے
بھڑکتے ترنگان ہو آکاں دسے	بھڑکتے گھوڑے آگ بگولا نظر آتے تھے
سواراں بھوکے رن کے باکاں دسے	اور بھوکے سوار شیر معلوم ہوتے تھے
نشانی ہے جیوں میہنوں لانے کوں باؤ	جس طرح ہوا بارش لانے کی نشانی ہوتی ہے
دیویں یوں مھراتے لڑائی کوں تاؤ	سرہتے اسی طرح لڑائی کو گرما رہے تھے
نکلتے ہیں جیوں باگ نخچیر کوں	جس طرح شیر شکار پر لپکتا ہے اس طرح
نکل یوں مھراتے دونو ڈھیر سوں	دونوں طرف سے سرہتے لڑنے کو نکلتے تھے

اگے چل کر لکھتا ھے

ہر یک مُکھ تے آواز سن مار مار	ہر ایک کے منہ سے مار مار کی آواز سن کر
کیاجیونے دشمن کے ھونٹاں میں تھار	دشمنوں کے دل ھونٹوں میں آکر ٹھیر گئے تھے
دیکھیا جب بتی آکہ بازی یتی	جب مغلوں نے دیکھا کہ بات یہاں تک بڑھ گئی ھے
مغل وئیں عرابے کو دیتا بتی	تو اس نے توپوں کے زنجیرے کو آگ دکھای
جو یک دم چھوٹی توپ ہر فرد فرد	جب ایک دم توپیں چھٹیں تو ھوا نے آگ
اوچا یا دھواں باؤ ھو اگ کی گرد	کی گرد بنکر دھنواں بلند کیا
دسے تس میں ترو ار جھلکے جتی	تلواراس میں جھلکتی ھوی ایسی معلوم ھوتی تھی
مگر گرد میں اوڑ رھی ھے پتی	جیسے گرد میں اُڑتی ھوی پتی
ھوا آسماں گرم جیوں لگ کے تلب	اس کی حرارت سے آسمان گرم ھوگیا
سوکا اوت جا چشمۂ آفتاب	اور چشمۂ آفتاب خشک ھوگیا
ھوا پر فرنگیاں کے گولیاں کا تھات	بندوقوں کی گولیاں کا ھوا پر یہ ھجوم تھا
نظر کی گزر کا ستیا باند باٹ	کہ نظر کا رستہ بند ھوگیا تھا (یعنی کچھ سجھائی ندیتا تھا)
کہے دیکھ حیران ھو اھل عرش	اھل عرش یہ دیکھ کر حیران ھوکے کہتے تھے
معلق ھوا پر بندیا کون فرش	کہ ھوا پر کس نے یہ فرش معلق کردیا ھے
دلیراں کریں نعرہ یوں ھو کے آگ	دلیر آگ ھوکر یوں نعرہ کرتے تھے
نیستاں میں جیوں گرجتے ھیں باگ	جیسے نیستان میں شیر گرجتے ھیں
جھلکنے لگی کھڑگ بھالیاں میں یوں	تلوار بھالوں میں یوں جھلکتی تھی
لگے ھے نیستان کوں آگ جوں	جیسے نیستان میں آگ لگی ھو
پڑے تُٹ کہ واراں تلیں ہر رخن	ھاتھی دانت گنے کی پوریوں کی
ھتی دانت کانڈے کی پیریاں نمن	طرح کٹ کٹ کر گر رھے تھے

اس طرح لکھتے لکھتے ایک شعر لکھتا ھے

رگت کت تے بھالیاں کے نکلیا اپار
لراں جیوں نکلتیاں ھیں جالیاں کے بہار

یعنی خون بھالوں کے کناروں سے اس طرح بہ نکلا تھا جیسے پانی کی لہریں جالیوں میں سے ھوکر بہہ نکلتی ھیں —

ینی یک کہم تے سینتیاں چھوٹیاں یوں ھزار	ایک ایک ھاتھی پر سے جو ھزاروں برچھیاں
کہ برسیاں ھیں بجلیاں نج	چلیں تو یہ معلوم ھوتا تھا کہ بجائے بوندوں
بونداں کی تھار	کے بجلیاں برس رھی ھیں
نکوی کس مدد کرسکے تس کوڑی	اُس گھڑی کوی کسی کی مدد نہیں کرسکتا تھا ھر ایک
ھر یک سر پہ اپنیچہ اپسیں پڑی	اپنی اپنی مصیبت میں مبتلا تھا
اوٹھیا جیوں کھنا کھن کا آواز زور	کھنا کھن کی آواز اس زور سے اٹھی کہ فلک
فلک کان مونچیا نہ سن سک کہ شور	اُس شور کی تاب نہ لاسکا اور اپنے کان بند کرلیے
کھڑک کڑکڑاتی سورج ٹھانوں ٹھانوں	چمکتی تلوار جگہ جگہ سورج بنی ھوئی تھی اور
سپر بن نہ تھی کچھہ بی کس سر پہ چھانوں	کسی کے سر پر سوائے سپر کے کوی چھانو نہ تھی
و وڑا و وڑ میں آگ کھڑگاں تے جھڑ	تلواروں سے مسلسل آگ برس رھی تھی
سپر جر سوتی جیوں بھونے سو پھڑ	اور ڈھالیں اس کی حرارت سے ایسی ھوگئی تھیں جیسے بھنے پاپڑ
جمیا کوی کھڑے راگ ھنکار کا	کوی کھڑا آہ و فریاد کا راگ الاپ رھا تھا
رھیا سر کھنا کھن کے جھنکار کا	اور ادھر کھنا کھن کی جھنکار کا سُر جاری تھا
زمیں ھور فلک ھوکہ یک حال میں	زمیں اور فلک ایک حال میں ھوکر
لگے ناچنے تیغ کی تال میں	تیغ کی تال پر ناچنے لگے
ھوا رنڈ جن تک کھڑا پانوں گاڑ	جو ذرا قدم جماکے کھڑا ھوا وہ رنڈ منڈ
دسے کھونٹ جیوں ڈال توڑے سو جھاڑ	ھوگیا جیسے درخت کا ٹھنڈ

جنگ کا یہ بیان بہت طویل ھے - میں نے کہیں کہیں سے چند چند

شعر لکھہ دیے ھیں کہ شاعر کی قوت بیان کا اندازہ ھو سکے - چند شعر اسی
بیان سے متعلق اور نقل کرتا ھوں

سلح کوٹ گرز مرد اسلحہ، فصیل، قلعہ مرد کی حفاظت
اوپرال ہے کے لیے ھیں

اجل آے پر و یچھ لیکن جب اجل آتی ہے تو یہی پھونچھال
بھنونچھال ہے ھو جاتے ھیں

اجل کا جو جس مرد پر ذوق ہے جس شخص پر اجل کی نظر ھوتی ہے
زرہ کی کڑی سو بھو تو زرہ کی کڑیاں اس کے لیے طوق
طوق ہے بن جاتی ھیں

ھوا بار سفرہ یتا مرگ کا موت کا خوان اس قدر بھرپور تھا کہ
پھریا سوں نوالیاں تلیں کھڑگ کا تلوار کا منہ کھاتے کھاتے پھر گیا -

اس کے ساتھہ وہ مغلوں کی شکستہ حالی اور درماندگی کا بھی ذکر
کرتا ہے - اس میں مبالغہ کے ساتھہ تکلف اور تصنع پایا جاتا ہے - مثلاً
وہ لکھتا ہے کہ مغل ھمارے گھر مہمان آے ھیں، ھم نے اُن کی خاطر
مدارات کا سامان یہ کیا ہے - زمین ان کی مسند رنگین ہے (یعنے خون
سے) اور اجل کی شراب ان کی تفریح کے لیے ہے - نقل کے لیے دانت
بجاے مغز بادام اور لب بجاے انگور ھیں - سر کے کاسوں میں بھیجے
ان کے کھانے کے لیے اور غم کے پینے کے لیے ھیں وغیرہ وغیرہ - اس
کے بعد لکھتا ہے —

اجل کی کیتے خواب میں خُر خُرائیں بہت سے خواب اجل میں غرق خراٹے لے رہے تھے
کیتے ھوئیں آسودہ کوئی بہت سے ٹھنڈے ھو گئے تھے اور بہت سے
تڑ پھڑائیں تڑپ رہے تھے

ہوے ہو سلم گرم	اسلحہ کی گرمی سے سینے تنور ہو رہے
سینے تنور	تھے اور پسلیوں
اگن دھک کے جلتی تھی پھنسلیا ہو چور	کے ایندھن سے آگ دھک دھک جل رہی تھی
تنوراں تے سینیاں کے اُڑ لہو کی دھار	سینوں کے تنوروں سے لہو کی دھاریں
ہوے رن میں طوفاں ادک	اُڑ رہی تھیں اور اُس سے میدان جنگ میں
تہار تہار	جگہ جگہ طوفان بپا تھا
زمیں پر رکت کا اکھنڈ حوض بھر	زمین پر خون کا مسلسل حوض بھرا ہوا تھا
یکا یک جو چڑیا چلیا پور بھر	اس سے جو یکا یک سیلاب چڑھتا چلا تو
سورج سخت طوفاں کا دیکھ اوبال	سورج نے اس شدید طوفان کا اُبال دیکھ
منگیا چڑنے چندر کی	کر سواری کے لیے چاند کی کشتی کو
کشتی نکال	نکالنے کا حکم دیا۔
ہلاوے جو ہر زور آنے لگے	اب جو پر زور ریلے آنے لگے تو
ہتی تول میں ڈلہلانے لگے	ہاتھی بے قابو ہو کر ڈگمگانے لگے
نقارے رکت پر جو	نقارے جو خون کے اس سیلاب پر
اولٹے پڑے	اُلٹے پڑے تھے
دسے بڑ ہوڑے باو اوندے کھڑے	وہ ایسے نظر آتے تھے جیسے حباب
دسیں یوں زرہ پوش لہو میں جنجال	زرہ پوش لہو میں لتھڑے اس طرح نظر آتے تھے
مچھی جیوں توڑا لیکہ نہاتی ہے جال	جیسے مچھلی جال توڑا کر بھاگ جاتی ہے
رکت جل میں تکڑے زرہ	خون کے سیلاب میں زرہ کے ٹکڑے مثل
کے کنجال	کائی کے تھے
گونگے خود و دستانہ	خود مثل گھونگے کی تھی اور دستانے
سینپیاں مثال	مثل سیپیوں کے۔

کماناں پڑیاں تُٹ کہ چلّے انوپ کمانوں کے چلے اس طرح ٹوٹتے پڑے تھے جیسے
کہ جیوں دھامنیاں بھار لیتیاں دھامنیاں دھوپ کھانے کے لیے باھر
ہیں دھوپ آ پڑتی ہیں

ملے یوں وو چلّے رگت بیچ میں خون میں وہ چلے اس طرح لتھڑے پڑے تھے
ہزاراں ہیں جیوں کیچھوے کیچ میں جیسے کیچڑ میں کیچھوے -

موت کا وہ بازار گرم ہوا کہ

ملایک کے ہت گیا فرشتوں کی قدرت سے یہ کام باھر
کام بھار ہو گیا اس لیۓ
کہ آتے تھے جیو یک کے کہ ایک ایک کی تقسیم میں ہزار ہزار
بانٹنے ہزار جانیں آتی تھیں

ہوا سب یہ ارواح سوں بھر رہی تمام ہوا ارواح سے بھرگئی تھی اور ہوا میں
پوں پر ادک مارتے پر رہی زور زور سے پر مار رہی تھیں

چھوٹا زور ارواح کا باوجب ارواح کی آندھی جب زور سے چلی تو
فلک کی یو فانوس گرداں اس ڈر سے کہ فلک کے فانوس گرداں
میں میں سورج کی
یو شمع سورج نا کہ ہوے کر بڑی شمع تاریک نہو جاے فوراً
لیا پردۂ ابر اوتار اس گھڑی ابر کا پردہ ڈال دیا گیا

مخالفین کی حالت ملاحظہ ہو

مخالف نے دیکھیا کہ یوں رن پڑیا غنیم نے جب ان کی یہ کیفیت دیکھی تو
اپس کا تو لوک اس میں اوگن پڑیا اس کی حالت بہت زبون اور بری ہو گئی
دسے نیمہ فوج آئی تھی جو عظیم وہ فوج عظیم جو آگی تھی اب آدھی رہ گئی
رھی سو بی زخموں سے ہوے نیمہ نیم اور اس آدھی میں سے بھی آدھے زخمی پڑے تھے

ہوے تھے سو آدیاں تے سب جان اوڑیا	آدھے تو ایسے تھے جو جان کھو چکے تھے
جو سارے ا تھے اُن تے اوسان اوڑیا	اور باقی جو سالم تھے اُن کے اوسان جاچکے تھے
کھڑے تھے جو ھمت سوں جہاں پانوں گاڑ	جو ھمت کرکے پانو گاڑے کھڑے تھے اُن میں
نا طاقت رھی پانوں لینے اُکھاڑ	اتنی سکت نہ رھی کہ وھاں سے پانو اٹھا لیں
سب اعضا نے قوت کوں ساری ستے	ب اعضا نے ھمت ھار دی اور ھتیاروں نے
ھتیاراں بی ھر ھت تے یاری ستے	بھی ھتیار بندوں کی دستگیری چھوڑ دی
نوایاں کماناں نے سرمان ھا	کمانوں نے ھار مان کر اپنے سر جھکا دیے
تھکے تیر سوفار کے موں پسار	تیروں کے سوفاروں نے تھک کر منہ پسار دیے
اوڑیاں بانک داراں جھڑے ھت تے سانگ	خنجر اور نیزے ھاتھوں سے گر گر پڑے
سلح ڈھل پڑے ڈرسوں پتلے ہو آنگ	سپاھی ڈر سے ایسے دبلے ھوگئے تھے کہ ھتیار خود بخود بدن پر سے گرے پڑتے تھے
ہوے ٹٹ علی بند آوارہ ڈھال	علی بند اور ڈھالیں ٹوٹ کر اس طرح
ٹوٹی بیل پرپات ھوئیں جوں نڈھال	رہ گئیں جیسے ٹوٹی بیل کے پتے نڈھال ھوجاتے ھیں
بسر رج کوں رجپوت داتنوں مجھار	راجپوت بے غیرتی سے دانتوں میں تنکوں
دھرں آے برچھیاں کوں کاڑی کے ٹھار	کی بجاے برچھیاں رکھے ھوے تھے
گئے بھول قانون اپنا قدیم	اپنا پرانا قاعدہ سب بھول گئے اور
نہ کچھ کام آیا عرابہ عظیم	ان کے بڑے توپ خانے کچھ بھی کام نہ آے

مغل فوج کو شکست ھوی اور جب وہ میدان چھوڑ بھاگ نکلے تو شاعر نے ایک نیا سماں دکھایا ھے - میدان جنگ میں ایک بڑا جشن ھوتا ھے یعنے بہت بڑی ضیافت درندوں اور جانوروں کی ھوتی ھے - اس موقع پر شاعر نے بڑی جدت سے کام لیا ھے - میدان جنگ جو خون سے بھرا ھوا تھا درندوں کی مسند اور فرش تھا - شیر بڑے رعب داب

اور شان و شوکت سے درندوں کی فوج لے کر آتا ھے اور تخت شاھی پر جلوہ افروز ھوتا ھے۔اس کے بعد شاعر نے ہر درندے کی خصوصیت اور اس کے لباس وغیرہ کی کیفیت بڑے مزے سے بیان کی ھے۔ مثلاً بادشاہ (شیر) کے کرسی نشین ھوتے ھی ریچھہ اپنی خاکی (دھنویں کے رنگ کی) وردی پہن کر چوبداروں کی طرح آکھڑے ھوے۔ پلنگ اور چیتے اپنی اپنی خوشنما بیل بوٹوں کی پوشاک پہن کر آے۔ بھیڑیے صوت کے چل قد زیر بر کیے ھوے تھے۔خارپشت ترکش لگاے آیا۔ لومڑی خوب بن سنور کر آی اور اپنی چوٹی کی دم کو پھندنے سے اراستہ کیے ھوے تھی۔ سیہ گوش کلاہ پہنے اور صوت پوش نظر آتے تھے۔ خدا ترس ترس (چرخ) ھڈیاں ڈھونڈتے ھوے تشریف لاے۔ جب سب جمع ھوگئے تو نقیبان شغال نے صلاے دعوت دی اور اب کوے، کتے، چیلیں، گدیں وغیرہ بھی حاضر ھوگئے۔ میدان جنگ جو مغل فوج کی لاشوں سے سفرۂ عام بنا ھوا تھا، اس پر وہ سب ٹوٹ پڑے۔ شاعر نے اس مقام پر اُن کی کلیلوں اور خوش فعلیوں کی بھی تصویر کھینچی ھے اور یہ بھی دکھایا ھے کہ کون کیا کیا کھاتا اور کس کس طرح سے کھاتا ھے۔ جب گوشت اور ھڈیاں بھنبوڑ بھنبوڑ کر اور خون پی پی کر بدمست ھوے تو گانے بجانے اور رقص وسرود کی سوجھی۔ سروں کے کانسوں کے طنبورے بناے اور اُن پر رودوں کے تانت باندھے۔ اونٹ کی پسلیوں سے کھانچے تیار کیے، غرض اس طرح بہت سے ساز بنا لیے۔ کووں نے اپنی خوش آوازی سے اور گیدڑوں نے اپنی الاپ سے محفل کو خوب رجھایا۔ ناچ کے لیے بھتنیاں آتی ھیں۔ اپنے کپڑے اتار کر نیا لباس اور زیور پہنا۔ پھریروں کی چنریاں بنائیں، جھنڈوں کے کپڑے کھول کر تد بند بناے۔ ھاتھی

دانت کے کڑے اور ناخنوں کی چوڑیاں بنائیں - کچھ موتی چن چن کر گلے میں پہنے - خون کا غازہ منہ پر ملا - پاکھروں سے آئینے نکال کر آرسیاں بنائیں ' بہادروں کے طرے سروں پر لگائے اور اُن کی مالائیں گلوں میں پہنیں - القصہ اسی طرح آراستہ ہوکر انہوں نے اپنے رقص کا کمال دکھایا ہے - کیا خوب شعر کہا ہے —

سراپا اگن ہو بھڑکتی چلی
اِدک بیجلیاں تے کڑکتی چلی

یعنی وہ سر سے پانو تک آگ ہوکر بھڑک رہی تھی اور بجلیوں سے بھی زیادہ کڑکتی ہوی چلی —

اس رقص کو دیکھ کر تمام جانور اور درندے بیخود ہوگئے - ریچھ مستی سے آپے سے باہر ہوگیا اور حال میں آکر ہر تال پر قدم چومنے لگا - چیتے کے ہوش جاتے رہے - لومڑیوں کے ہنسی کے مارے پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے - ببر نے ناچنے والوں پر (لاشوں کی) آنکھوں کے گوہر نثار کیے - کتوں نے انتڑیوں کے ہار ان کے گلے میں ڈالے - گیدڑوں نے چربیوں کی شالیں اُڑھائیں - شیر نے خوش ہوکر سرخ مخمل کی مسند انعام میں بخش دی - جب جشن قریب ختم ہوا تو سب نے بادشاہ (علی عادل شاہ) کے اقبال و دولت کے گیت گائے —

یہ بیان بہت پر لطف اور جدت آمیز ہے اور اس سے نصرتی کی ظرافت طبع اور بیان کی خوش اسلوبی ظاہر ہوتی ہے - رزم میں اس نے جا بجا بزم کا لطف دکھایا ہے مگر یہ بیان بہت ہی ظرافت آمیز ہے -

اس فتح کی خبر لکھنے ملک کے ذریعے سے بادشاہ کے پاس بھیجی جاتی ہے - وہ وزرا کا نامہ لےکر جاتا ہے اور زبانی بھی حالات عرض

کرتا ہے - یہ نامہ دربار میں پنڈت دھرماجی پڑھ کر سناتا ہے - اس پر بہت خوشیاں منائی جاتی ہیں اور جشن کیا جاتا ہے - اور خاص خاص لوگوں یعنے شاہ ابراہیم خلف شاہ منجلے' علی رضا وغیرہ کو خلعت سے سرافراز کیا گیا —

اس کے بعد کے باب میں مغلیہ فوج کی بے سرو سامانی' تنگی' اور بد دلی اور جے سنگھہ کی پریشانی کا نقشہ کھینچا ہے - ہر طرف سے رستے بند ہیں اور رسد کے نہ پہنچنے سے سب بد دل اور پریشان ہیں —

لیا کوند چوندھر تے فوجاں مسند
ہوا بات تے باؤ آنے کوں بند

یعنے فوجوں نے چاروں طرف سے رستے اس سختی سے بند کر رکھے تھے کہ اس رستے سے ہوا تک نہیں آسکتی تھی —

اس بیان میں نصرتی نے سپاہیوں' بھیر و بنگاہ' گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کی شکستہ حالی پر خوب خوب پھبتیاں کہی ہیں-

اس پریشان حالی میں جے سنگھہ کو یہ خوش خبری پہنچتی ہے کہ رسد کا بہت بڑا سامان آرہا ہے اور ہزاروں اونٹ' گدھے اور بیل لدے چلے آرہے ہیں - اس رسد کا پہنچانے والا صلابت خان (دھلوی) تھا -

سکندر ککر تھا اول نانوں جس
خطاب آج خان صلابت ہے تس

یعنے پہلے اس کا نام سکندر تھا اور اب صلابت خان کے خطاب سے مشہور ہے —

شرزہ خان کے جاسوس ہر طرف لگے ہوئے تھے

پھریا جا بجا جیوں ہے جگ میں پون
پھریں تس کے جاسوس یوں ہر رخن

یعنی جس طرح دنیا میں ہوا جا بجا پھرتی ہے اسی طرح اس کے جاسوس ہر گوشے میں پھرتے تھے —

جب شرزہ خاں نے یہ کیفیت سنی تو وہ فوج لے یلغار کرتا ہوا دشمن کے سر پر جا پہنچا - دشمن کے ہاتھ پانو پھول گئے

یدی آی کر فوج عادل سوای	سارے لشکر میں دھای مچ گئی کہ عادل
ہوی سارے لشکر میں چوندھر اوای	شاہ کی فوج آ پہنچی
پڑیا غلبلا ہو کہ یک بات میں	بات کی بات میں ایک غلغلہ پڑ گیا
منڈا سا یکس سر کا یک ہات میں	ایک کی پگڑی دوسرے کے ہاتھہ میں تھی
ترنگاں پہ الٹے	کیتک گھبراہٹ میں بہت سوں نے گھوڑوں پر
زین بہاے	الٹی زینیں
لگاماں بسر موں میں	باندھ دیں اور لگاموں کی جگہ دمچیاں
دمچیاں لگا	منہ میں لگا دیں
نہ فرصت کمر باندنے پاے کوں	نہ کسی کو کمر باندھنے کی فرصت ملی اور
نہ ہتیار لے ساندنے پاے کوں	نہ ہتیار باندھنے کا موقع ملا -

غرض بڑی گھمسان کی لڑای ہوی اور دونوں طرف کے بہادروں نے داد شجاعت دی - اس لڑای کا حال نصرتی نے بہت طویل لکھا ہے - دو ایک مقامات سے چند چند شعر نقل کیے جاتے ہیں

نچھل دھوپ میں ملکہ کھڑکاں	روشن دھوپ سے تلواروں کی چمک نے
کی تاب	مل کر یہ

هوا موج زن هو که	کیفیت پیدا کی که گویا سراب کا دریا
دریا سراب	لهریں مار رها هے -
هوا کا پهریا عکس کهڑکاں تے روپ	تلواروں کی چمک کا عکس جو هوا پر پڑا تو یه
مگر کسوت ابرک لیے	معلوم هوتا تها که دهوپ نے ابرک کا
پین دهوپ	لباس پهن رکها هے
ترنگاں کے تل تے دهولا راں اوتهیا	گهوڑوں کے نیچے سے گرد و غبار اٹها
هکاتاں کی هردم تے بارا چهوٹیا	اور پیهم نعروں سے ایک آندهی اُٹهی
گگن کی اگیٹی په جا پڑ که گرد	آسماں کی انگیٹهی پر اتنی گرد جا کر پڑی
کری داب انگارے کوں سورج کے سرد	که سورج کا انگارا دب کر ٹهنڈا پڑ گیا

لڑائی کا سماں دیکهئے

دو نوں صف کے میانے بڑا دهم هوا	دونوں صفوں کے درمیان بڑا تهلکه پڑا
ادک دیکه غوغا فلک	کثرت شور و غوغا سے فلک کے کان
کم هوا	بهرے هو گئے
غاولیاں کے جهینڈ و زنبوریاں کوں داٹ	گولوں اور توپوں کے هجوم کی وجه سے
لپت دم نکلنا رهیا موں کی باٹ	منه کے رستے صرف دم نکلنا باقی تها
دسے عکس جوشن تے ابلق هوا	جوشن کے عکس سے هوا ابلق نظر آتی تهی
فرنگاں کے پرتو تے هوی شق هوا	اور تلواروں کے پرتو سے هوا شق هوگئی۔
برسنے لگے ماکه ات تیر و تیغ	تیر و تیغ ' برق و بادل
رگت کا چ برسات هو برق و میغ	بن کر خون کی بارش برسانے لگے
هر یک تیغ تے آگ جهڑ بے شمار	هر ایک تلوار سے بے شمار آگ جهڑنے لگی
سلاحاں هوے لعل جلبل انگار	اور هتیار جل بل کے لال انگارے هو گئے
لیے آگ چنگیاں تے بهالیاں کے بانس	بهالوں کے بانسوں میں چنگاریوں سے آگ لگ اٹهی

جلیں تیر دستے ہو پولیاں کی گھانس	اور تیر گھاس کے پولوں کی طرح جل رہے تھے
ہوا پر کھڑے تونگراں ہو کہ دھول	پہاڑ ہوا پر دھول بن کے کوڑے تھے
شراریاں کے رُکھ لہو کی	شراروں کے روکھ لہو کی چھینٹوں سے
چھٹکاں سوں پھول	پھول بن گئے تھے
رگت بھوئیں پہ جم جا ہوا پر دھواں	خون زمین پر جم گیا اور دھنواں ہوا پر
زمیناں ہویاں آٹھ	اس سے زمینیں آٹھ ہوگئی تھیں اور
دس آسماں	آسمان دس۔

چند اشعار کے بعد تیغ کی دو رنگی کو کیا خوب بیان کیا ہے۔

جو ہے تیغ میں آب و آتش نہاں	تیغ میں آب و آتش کی جو دونوں خاصیتیں
دونوں کی بی صورت ہوئی تب عیاں	پوشیدہ ہیں وہ اب ظاہر ہوئیں
کریں وار تو تب جھڑے آگ دات	وار کرنے میں اس سے آگ جھڑتی ہے اور آب کی
ڈبے جیو پانی نے کرنے میں کات	کاٹ سے جانیں ڈوب جاتی ہیں

تلوار ہی کے متعلق پھر لکھتا ہے

فرنگ اژدھا ہو دم آتشیں	تلوار اژدھا ہوکر اپنے دم آتشیں سے
چھٹکنے لگیا اگ دندیاں پر یقیں	دشمنوں پر آگ برسانے لگی
برستے وجوداں پہ کھڑکاں کا آب	تلواروں کا پانی جب غنیم پر برسنے لگا تو
رگاں تے لراں بہ چلیا خون ناب	ان کی رگوں سے خون ناب کی لہریں چلنے لگیں
لگے دینے سنمکہ ہو شمشیر و تیر	تلوار اور تیر ایک دوسرے کے روبرو ہوکر
سوالاں جواباں یکس یک توں پھیر	ایک ایک کے سوال کا جواب دینے لگے۔

اس خونخوار جنگ کا نتیجہ یہ ہوا کہ دھلی کی فوج کو شکست ہوی اور صلابت خاں میدان جنگ میں قتل ہوا۔ یہ سن کر جے سدھ کے دل پر جو بنی وہ نصرتی اِن الفاظ میں بیان کرتا ہے —

سونیا سوچ یو بات بیٹھی کمر — یہ سنتے ہی اس کی کمر ٹوٹ گئی، افیوں
گئی موں کھٹا ہو کہ افیوں اتر — کا نشہ اُتر گیا اور منہ سیٹھا ہو گیا
چھپیا روز روشن اندھارا پڑیا — روز روشن چھپ گیا اور اندھیرا چھا گیا
فلک تُٹ کہ جیوں سر پہ سارا پڑیا — اور اس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا
رین دل میں ہو یک تارے دوٹے — دل میں رات چھا گئی، آنکھوں سے تارے ٹوٹ کے
سلگ آگ انجو تھار انگارے توٹے — گرے اور بجائے آنسووں کے انگارے گرنے لگے
ہوا حال جیوں رکہ کے توڑے پہ بیم — اس کا حال اُس درخت کا سا ہو گیا جسے جڑ سے
طنابان ستے سب اوکھاڑے پہ بیم — اُکھاڑ ڈالیں یا اُن طنابوں کا سا جن کی میخیں اُکھڑ جائیں
نہ ڈیرا کوڑا رہ سکے پانو گاڑ — ایسی حالت میں ڈیرا کھڑا رہ سکتا ہے
نہ قائم رہوے تول اپس لے کہ جھاڑ — اور نہ درخت اپنے آپ کو قائم رکھہ سکتا ہے

اس جنگ میں نصرتی نے شرزہ خاں کے نوجوان بیٹے مخدوم شاہ کا بھی ذکر کیا ہے جو میدان جنگ میں بڑی بہادری سے لڑا —

مغلوں اور بیجاپوریوں کی جنگ میں اب ایک نیا واقعہ پیش آتا ہے - سلطان عبداللہ قطب شاہ نے سلطان علی عادل شاہ ثانی کو خط لکھا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ راجہ (جے سنگھ) آپ کی قلمرو میں گھس آیا ہے اور شرارت و فساد اور نا سزاوار حرکتیں کر رہا ہے لہذا ہم چاہتے ہیں کہ آپ کی مدد کے لیے اپنی فوجیں بھیجیں- علی عادل شاہ نے اس مدد کو قبول کیا- چنانچہ جواب پہنچتے ہی گولکنڈہ سے نیکنام خاں کی سرکردگی میں قطب شاہی لشکر روانہ ہوا - جب بیجاپور کے قریب پہنچا تو وزیر سلطنت عبدالمحمد ممتاز سرداروں اور چیدہ سپاہ کے ساتھہ استقبال

کے لیے چلا - قطب شاہی اور عادل شاہی لشکر باہم ملتے ہیں اور ہر دو لشکر کے سردار ملاقات کرتے ہیں - عبدالمحمد نے بادشاہ کی طرف سے نیک نام خاں اور دوسرے سرداروں کو خلعت ہائے فاخرہ دیے - دونوں لشکر مل کر بلدۂ بیجاپور کی طرف چلے - سلطان نے علی برج سے ان کا نظارہ کیا اور سلامی لی - اس کے بعد بادشاہ نے عبدالمحمد کو حکم دیا کہ نیک نام خاں کو بارگاہ سلطانی میں حاضر کرے - چنانچہ نیک نام خاں اور اس کے ساتھ کے سرداروں نے حضوری کی عزت حاصل کی اور شاہی نوازشوں اور خلعتوں سے سرافراز ہوے —

نصرتی نے اس واقعہ کو بڑے دھوم دھام سے بیان کیا ہے —

اب دونوں لشکر متحد ہوکر جے سنگھ پر دو طرف سے حملہ کرتے ہیں اور اسے پائمال کرنے پر تلے ہوے ہیں - جے سنگھ کی حالت بڑے خطرے میں —

نصرتی نے اس باب کی تمہید طلوع آفتاب اور صبح کے ظہور سے شروع کی ہے جو بہت دلکش شاعرانہ انداز میں ہے - (اسے میں کسی دوسرے موقع پر نقل کروں گا) - بادشاہ تخت پر جلوہ افروز ہوتا ہے ' تمام وزیران مملکت و سرداران لشکر حاضر ہوتے ہیں - بادشاہ مخاطب ہوکر اُن کو لڑنے مرنے ' شجاعت اور جان نثاری دکھانے اور غنیم کی فوج کو تباہ و برباد کرنے کی ترغیب دیتا ہے - وہ وفاداری اور جان نثاری کا ادعا کرتے ہیں اور دشمن کو شکست دینے اور ملک سے نکال دینے پر کمر ہمت باندھتے ہیں - اس کے بعد شاعر دونوں فوجوں کے کوچ کی شان دکھاتا ہے - مگر اس کے ساتھ ہی وہ مغلوں کی فوج اور شجاع سپاہیوں کی شکل و صورت اور بہادری کا نقشہ

بھی کھینچتا ہے - مثلاً لکھتا ہے —

که هر مرد جیون کوہ البرز ہے تبر کس کے هت کس کے جم گرز ہے
کتیاں کا توتیر و کماں اصل ساز کمنداز کوی نیزہ کوی تیغ باز
دھرنہار هر مرد کو نہ امید دل رستم و جسم دیو سفید
نہ آتش کدہ تے شکم اُن کے کم جو لکھہ میں پڑیا سو گیا هو بھسم
شراب ان کوں یک مشک تھوڑا دسے سہج نقل دنبیے کا جوڑا دسے
تراش اپنی داڑی مچھیاں دے کہ چھوڑ کریں سوں بچھو ڈانک ڈالی سوں توڑ
کمان آپکڑنے کے سکنا ہے فن اینو پاس تے ارجن ولچھمن
تو کا ہے جنن تیر کا تیر بخش جنن خنگ کن کرہ رستم کا رخش
کریں گر کشش رستمی لے کماں رگ و پے توٹیں کڑکڑیں استخواں

یہ درپردہ اپنی بہادری کی تعریف ہے جو ایسے بہادروں کو شکست دیتا ہے —

یہ بہت سخت لڑائی تھی اور حقیقت میں جے سنگھہ کو بڑی مشکل پڑ گئی تھی - نصرتی نے بھی اس کا بیان بڑی شان سے لکھا ہے - اگرچہ نصرتی اور عادل شاهی مورخوں نے اپنی فتح لکھی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بڑی شدید جنگ هوی دونوں طرف کے لشکروں نے داد مردانگی دی ' آخر میں جے سنگھہ کی فوج نے دکھنی لشکر کو مار کر بھگا دیا - مگر اس میں جے سنگھہ کی بھی کوئی نمایاں فتح نہیں پای جاتی ہے یعنے دشمن کو ہٹا کر بھگا تو دیا مگر اس سے اُسے کچھہ حاصل نہ هوا —

نصرتی مغلوں کی نامردی اور دکھنیوں کی بہادری کو اس طرح بیان کرتا ہے —

مغل کی ہے تلوار دکھنیاں مغلوں کی تلوار دکھنیوں کے سامنے
پھ یوں یسی ہے
تبر سامنے جیونکہ انگلی کے نھنوں جیسے تبر کے سامنے انگلی کا ناخن -
لگت دس ہتوڑیاں کھڑی کر سونار سنار تان تان کر دس ہتوڑیاں
ادک دس تے ھوے یک جو مارتا ہے لیکن لوہار کی ایک اُس کی دس
مارے لوہار سے بڑھ جاتی ہے -

اگرچہ نصرتی نے فتح دکھنیوں ھی کی لکھی ہے لیکن اس جنگ کی شدت اور دکھنی فوج کی بپتا کا اُس نے بھی اعتراف کیا ہے - چنانچہ لکھتا ہے کہ جب جے سنگھ کی فوج نے زور سے حملہ کیا اور میدان جنگ میں قیامت برپا کر دی تو دکھنیوں کے اوسان خطا ہوگئے

بہت آپڑی اہل اسلام پر کوڑی ذکر ادک خاص ہور عام پر
کٹھن حال پا خان شرزا نوی کر اپنی کھڑک کو عصا موسوی

جے سنگھ کی فوج میں جادو راؤ اور کیسری سنگھ کا اور عادل شاھی فوج میں شرزہ خاں، خواص خاں، بہلول خاں اور عبدالمحمد کا خاص طور پر ذکر کیا ہے —

بہر حال نصرتی اور عادل شاھی مورخوں کے بیان کے موافق دکھنیوں کی فتح ہوی - آخر میں میدان جنگ میں درندوں کے آنے اور لاشوں کے کھانے کا تماشا دکھایا ہے —

اس کے بعد ایک اور لڑائی ہوتی ہے - بہلول خاں، شرزہ خاں، خواص خاں فوجیں لے کر جاتے ہیں - بہلول خاں ایک طرف لڑ رہے تھے اور شرزہ خاں اور خواص خاں دوسری طرف - ان دونوں کے مدنظر غنیم کے خاصے کی فوج تھی

ولے خان شرزا و خان خواص
نظر میں رکھے فوج خاصے کی خاص

دونوں طرف کے لشکر ایک دوسرے کے انتظار میں تھے - یہ چاہتے تھے کہ غنیم بڑھ کر میدان میں آے اور وہ اس کے منتظر تھے کہ دکھنی آگے آکر حملہ کریں - غرض اس انتظار انتظار میں شام ہوگئی تو شرزہ خاں اور خواص خاں ناچار اپنے ڈیروں کو واپس چلے - دونوں ساتھہ ساتھہ جا رہے تھے - جہاں جہاں میدان ھموار آتا یہ دونوں برابر برابر رہتے اور جہاں نشیب و فراز اور درخت آجاتے وہاں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے - ایک ایسے ھی موقع پر جب خواص خاں اپنے لشکر کے ساتھہ ایک طرف چلا گیا اور شرزہ خاں دوسری سمت تو اتفاق سے لشکر غنیم کی ایک جماعت اُدھر سے گزر رہی تھی - شرزہ خاں کے بیٹے سید حبیب کی نظر اُن پر پڑی - اگرچہ خورد سال تھا لیکن بہادری اور شجاعت میں کسی سے کم نہ تھا' بے کہے سنے جھٹ اُن پر جا پڑا اور شمشیر زنی کے جوہر دکھانے لگا - شرزہ خاں نے جو نعرۂ جنگ کی آواز سنی تو گھوڑا جھپٹا کر پہنچا - دونوں نے لڑ بھڑ کر اس جماعت کو بھگا دیا - دونوں خوشی خوشی پھر اپنے ڈیروں کی طرف روانہ ہوے - تھوڑی دور چلے تھے کہ یک بیک شرزہ خاں اپنے گھوڑے سے گر کر زمین پر آ پڑا - دیکھا تو روح پرواز کر چکی تھی —

شجاعتؔ کے تب گھر میں ماتم ھوا اس سے شجاعت کے گھر میں ماتم بپا ھوا - اس
جنم میں بڑا جس پہ یے غم ھوا پر کبھی ایسی آفت نہیں آی تھی
کھڑگ میان کے بیٹھہ کونے منیں تلوار میان کے کونے میں بیٹھہ

گنوانے لگیا آب رونے منیں رو روکر اپنی آب گنوانے لگی
زرہ کے پڑے دل پہ کئی دکھہ کے چھید زرہ کے دل میں دکھہ سے چھید پڑ گئے
کیا رو کہ جوشن نے دیدے سفید اور جوشن کی آنکھیں روتےروتے سفید ھوگئیں
ترنگاں کو پیدا ہوا عذر لنگ گھوڑوں کو عذر لنگ پیدا ھوا
پکڑنے منگے نعل سینیاں میں زنگ اور نعلوں کے سینوں پر زنگ لگ گیا
رھیا سوں میں عالم کے ھو تلخ آب اهل دنیا کے منہ میں پانی کڑوا معلوم ھونے لگا
لگے زھر چاکھے تو کوئی شھد ناب | اور خالص شھد زھر لگنے لگا -

اسی رنگ میں اور چند شعر خان مرحوم کے ماتم میں لکھے ھیں - لیکن ان سب میں تصنع اور آورد پای جاتی ھے - خصوصاً " ترنگاں کو پیدا ھوا عذر لنگ " بہت ھی بے محل اور متبذل ھے —

علی عادل شاہ کو جب اس حادثے کی خبر پہنچی تو بہت افسوس ھوا اور اُسی وقت خان مرحوم کے دونوں بیٹوں (سید مخدوم و سید حبیب) کو خطاب شرزہ خانی اور منصب و دولت سے سرافراز کیا -

اس کے بعد آخری جنگ کا بیان ھے جس میں بہلول خاں اور شرزہ خاں کے دونوں بیٹوں نے بڑی بہادری دکھائی - اس جنگ کی کیفیت بھی ویسی ھی ھے جیسے اس سے پہلے کی لڑائیوں میں بیان ھو چکی ھے - فوج کے کوچ کے متعلق لکھتا ھے

چڑیا ھم سوں جھگڑے کے لینے میں باؤ ترنگاں میں تیزی سواراں میں تاؤ
گرجتیں و بجتیں نقارے و بوبیر گرجنے لگے مست ھو نرہ شیر
فلک پر صدا تے ھوا کاج باج زمیں پائی خوش نقش نعلاں کی تاج
رنگا رنگ ڈھالاں دیکھت اھل ھوش کہے آج ھوی ھے ھوا دلق پوش

پھر لڑائی کا ذکر اسی زور شور سے ھے اور غنیم کی شکست پر

خاتمہ ہے - نصرتی اور عادل شاہی مورخوں کا بیان ہے کہ اس هزیمت کے بعد جے سنگھہ نے مقابلے کی همت نہ کی اور اپنے ملک کو واپس چلا گیا -

چلے کہا کے اوس دن توایسی شکست　　لگے ملک دھلی تلک یک وو رست

نہ آب اون کوں میداں میں پینے دیے　　سراب اون پہ جمنا کا پانی کیے

مغلوں سے یہ لڑائی علی عادل شاہ ثانی کے عہد کی آخری جنگ تھی- اس کے بعد هی علی عادل شاہ کا انتقال هوگیا - یہ لڑائی سنہ ۱۰۷۶ میں هوی اور علی عادل شاہ کی وفات سنہ ۱۰۷۸ ع میں -

آخری باب میں جو کتاب کا خاتمہ ہے بادشاہ کی مدح اور علی نامہ کا ذکر خیر ہے - باب کے عنوان کا شعر یہ ہے

صفت شعر علی نامہ و خوش ختم کتاب

مدح عادل کا کہ ہے جس پہ عطا جس یو نول

اس کے بعد بادشاہ کی مدح میں دو شعر لکھنے کے بعد لکھتا ہے کہ

فلک پر نوا کام جیوں خواب ہے　　نر ہے یاد جو نقش بر آب ہے

هنر مند هوتا ہے تا بے نظیر　　کرے نقش کوں اُس پتھر پر کی کیر

(کیسا هی نیا کام هو وہ مثل خواب کے ہے - جو بات یا کام یاد نر ہے (محفوظ نر ہے) وہ نقش بر آب ہے - مگر جب کوئی باکمال هنر مند آتا ہے تو اُسے پتھر کی لکیر بنادیتا ہے)—

روش ہے کہ گرچہ طبائع کا رکھہ　　کریں بار ور دیکھہ شاهاں سکھہ

ولے تا ابد اس کے پھل کا سواد　　دیوے ان کے جینے کی خوبی کی داد

(اگرچہ یہ عام قاعدہ ہے کہ طبیعت کا شجر بادشاهوں سے آسائش پاکر بارآور هوتا ہے لیکن اس کے پھل کا مزہ ابد تک رهتا ہے اور همیشہ ان کی زندگی کے کاموں کی داد ملتی رهتی ہے)

اُسی بختور کے هیں طالع دوگن که صاحب سخن کوں منگیا سب تے چن
سخن ورنه ملتا هے بختوں کے باج ملیا جس سو پایا ابد لگ رواج

(اُسی صاحب نصیب (بادشاه) کے طالع بڑے هیں جس نے سب لوگوں میں سے صاحب سخن کو انتخاب کیا یعنے جس نے شاعر کو اپنا منظور نظر بنایا - ورنه سخن نصیبوں سے ملتا هے اور جسے ملا اُس کا نام ابد تک قائم رها)-

بزرگی تو هے جان هور جسم کی بڑائی پن استے ادک اسم کی
سخن ور تے ره گئے زمانے میں یاد فریدوں کیا نہیں تو کیا کیقباد
صفت کر گیا کر سخن آفریں اجهوں لگ هے رستم په نت آفریں

(یوں تو بزرگی جسم و جان سے هے لیکن اس سے بهی بڑه کر بزرگی نام کی هے - فریدوں اور کیقباد کے کارنمایاں سخنور کی بدولت زمانے میں یادگار ره گئے - یه سخنور کی هی تعریف کا طفیل هے که اب تک رستم پر همیشه آفریں کی جاتی هے)-

اس کے بعد کہتا هے که اس جنگ نامه میں میں نے هر ایک کے کام کی داد دی اور ان کی محنت و مشقت کو سراها هے اور جن جن کا نام میں نے لکهه دیا هے وه دنیا میں ابد تک مقبول و معزز رهیں گے -

لیا ناؤں جس بختور کا نواز رهیا تا ابد جگ میں وو سرفراز
معزز جو تهے لوگ شه کے پسند کرم هور عنایت سوں اقبال مند
اوسی نامداراں میں میں ٹهانوں ٹهانوں لیا هوں کیتک نیک بختاں کے ناؤں
بهوت ٹهار تجویز سوں کر تمیز مشقت کیا کام کاراں کی چیز

پهر چند شعر اس تاریخ کی تحریر کے متعلق لکهتا هے اور کہتا هے

کہ میں نے اکثر بڑے کام نہیں چھپائے اور جو جو ضروری باتیں تھیں وہ سب بیان کردیں - اس میں میں نے کسی کی رو رعایت نہیں کی بلکہ ہمیشہ حق کو پیش نظر رکھا اور کسی کے کام کو ضائع نہیں کیا، خصوصاً شرزا خاں شہید کے نمایاں کام، جس نے بہت بڑی جاں نثاری کی - اس بیان کو نصرتی کے اشعار میں ملاحظہ کیجئے -

بڑے کام اکثر رکھیا نہیں نہاں　　ضروری جو تھے سو کیا کر بیاں
نظر میں خدا کاچ نت حق رکھیا　　رعایت تے دور اپسے مطلق رکھیا
جکچھ تھا سو اکثر کہیا بے ریا　　نہ ضائع کیا کام کس کا کیا
میرے شعر کے گھول امرت میں بات　　دلیراں کے ناںواں کو بخشیا حیات
خصوصاً لکھیا جو یہ نامہ سعید　　کہ تو خان شرزا ہوا تھا شہید
فدا تھا وو گر شہ کے نت کام میں　　نبھا کر گیا کر ذکو نام میں
رہنے تا ابد پاک تس روح شاد　　رکھیا تس کی کرتی کوں عالم میں یاد

اس کے بعد اِس مثنوی اور اپنے کلام کی تعریف میں چند شعر لکھتا ہے -

جب فن کی بولیاں ہوں یہ مثنوی　　یہ مثنوی میں نے عجیب و غریب لکھی ہے اور
کہ کئی بھانت ہے اس ہنر میں نوی　　اس صنف میں یہ کئی لحاظ سے نئی ہے
سنواریاں ہوں کئی بزم کی انجمن　　اس میں میں نے کئی طرح کی بزم میں آراستہ کی ہیں
کھیلا یا ہوں خوش رزم کے پھولبن　　اور رزم کے کئی چمن کھلائے ہیں
بھریا ہوں ہنر سوں سراسر کتاب　　یہ کتاب سراسر کمالات سے بھری ہوی ہے
رکھیا ہوں نزاکت سوں سب بھر کتاب　　اور نزاکت سے بھرپور ہے
قصائد لڑایاں کے کئی معتبر　　جنگ کے کئی بڑے بڑے قصیدے لکھے ہیں اور ان میں
یکیک وقت بولیا جو تھا سربسر　　وہی لکھا جو حقیقت میں واقع ہوا تھا
نوی طرز کوں میں جو تزئیں دیا　　میں نے جدید طرز کو زینت دی ہے

کیتک بر محل ووچ تضمین کیا   اور اسے بر محل استعمال کیا ہے
پکڑ اصل تاریخ لکھتیاں کی چال   میں نے مورخیں کے اصول کی پیروی میں
لکھیا قصہ در قصہ میں حسب حال   واقعات کو حالات کے مطابق لکھا ہے
لڑای کی ہر بیت یو بے گماں   اس میں لڑائی کی ہر بیت بلا شبہ
سپاہی کو تعلیم خانہ ہے جان   سپاہی کے لیے گھر بیٹھے تعلیم کا کام دیتی ہے
ملوکاں کی مجلس کا یو ساز ہے   یہ بادشاہوں کی مجلس کی زینت ہے
وزیراں کوں سوندل کا انداز ہے   اور وزیروں کے لیے جنگ کا انداز ہے
نہیں کس لطافت میں یو بات کم   یہ کسی خوبی میں کم نہیں ' خدا
الہی اچھو پن یہ مقبول جم   کرے یہ ہمیشہ مقبول ہو -
کہیں سب بی معشوق کا حسن و ساز   کہیں میں نے معشوق کے حسن و آرائش کو
دکھا یاھوں میں دھن کا صورت میں ناز   دکھا یا ہے اور اس کی صورت میں ناز کا نقشہ کھینچا ہے
طبیعت کا ہر تھار دکھلا کے کس   ہر مقام پر میں نے طبیعت کا زور دکھا یا
ستیا لیکے کا نڈے کا رس سب بکس   ہے اور گنے کا رس لے کر باقی پھوک پھینک دیا ہے
نظر رکھ کے ہر بات کے نغز میں   میں نے ہر بات کی لطافت پر نظر رکھی ہے
لیا بھید معنیاں   اور معنی کے مغز میں پہنچ کر اس کے اسرار
جا مغز میں   کو حاصل کیا ہے
گلاں سیتی گفتار کی بے حساب   میں نے پھولوں کا بہت کچھ ذکر کیا ہے
خلاصہ لیا کاڑ یعنے گلاب   اور ان کا نچوڑ یعنے گلاب نکال لیا ہے -
خیالاں میں ات مو شگافی کیا   خیالات میں میں نے بڑی مو شگافی کی ہے
جو باریک تھا اُس میں صافی کیا   اور جو بہت دقیق تھے انہیں صاف کردیا ہے
مضامین سوں جا بجا بات بول   میں نے جا بجا مضامین پیدا کیے ہیں
دیکھایا سکت فیض کا حق کی کھول   اور فیض حق کی قدرت کو کھول کر دکھایا ہے -

اسی ضمن میں نصرتی نے ایک بات خوب نکالی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ محمود غزنوی نے بہت بڑی مثنوی لکھوائی لیکن خود محمود میں وہ کمالات اور جوہر نہ تھے جو دنیا کے نامور لوگوں میں ہوتے ہیں اس لیے دوسروں کی مدح لکھوانی پڑی۔ لیکن میرا بادشاہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے کارنمایاں لکھوانے کے لیے فرمایا اور اب مجھ پر لازم ہے کہ میں اپنا ہنر ایسا دکھاؤں کہ ہر بیت پر لاکھوں خزانے ملیں۔ تب عجب نہیں کہ یہ دیکھ کر فردوسی کی روح شاد ہو اور اپنا غم بھول جائے —

عجب کیا کہ فردوسیٔ پاک زاد
اپس غم بسراب کرے روح شاد

پھر بڑے فخر کے ساتھ اس مثنوی کو (جسے وہ شاہنامہ کے نام سے موسوم کرتا ہے) دکن کی جان کہتا ہے

کتا ہوں سخن مختصر بے گمان
کہ یو شاہنامہ دکن کا ہے جان

جن صاحبوں نے اپنی تحقیق میں اسے "شاہنامۂ دکن" لکھا ہے وہ نصرتی کے اس شعر کو نہیں سمجھے —

آخر میں خود ہی کتاب کا سنہ تصنیف بتا دیا ہے

لکھیا شہ کا میں جس جو یو کر اوس
ہزار یک ہو ستر پہ تھے چھ برس

یعنی ۱۰۷۶ ھجری —

اگرچہ نصرتی نے کئی بار کتاب کے دوران میں اس مثنوی کو "فتح نامہ" سے موسوم کیا ہے لیکن درحقیقت اس کا نام "علی نامہ"

ھی ھے - سب سے ابتدای دو شعروں میں جو کتاب کا عنوان ھیں نیز آخری باب کے عنوان میں وہ اسے "علی نامہ" کہتا ھے —

اس میں شبہ نہیں کہ نصرتی کی یہ مثنوی نہ صرف قدیم دکھنی اردو میں بلکہ تمام اردو ادب میں اپنی نظیر نہیں رکھتی - اس پر جو اس نے بار بار فخر کیا ھے تو کچھ بیجا نہیں - خاتمے پر میں اس کے چند فخریہ اشعار سنا دینا چاھتا ھوں —

کیا میں بچن بیل کو یوں بڑی
بڈی سو فلک کاچ منڈوا چڑی
چندر ھور ستارے رھے دیکھ بھول
مضامین معنیاں کے مجھ پھل و پھول
یک یک قصہ بولیا ھوں جس ٹھار آ
دکھایا ھوں مجلس وو نظراں میں لا
سنواریا ھوں کر فہم کی حاتمی
ھر یک رزمیہ بزمیہ رستمی
سنے پر یو خوش طرز مردانہ قال
أبل شوق ھوے شیر مرداں کو حال
سخن میں نہ ھوے یو کرامت جالک
کوانا نہ ھرگز سخنور تلک
میری بات میں لات نیں بے خلات
کہ نادان کا ھے ھنر عین لات
کہ یو شعر میں آج اس دھات سات
کہیا سو بڑے دبدبے کے سنگات

میں نے سخن کی بیل کو یہاں تک بڑھایا کہ وہ فلک کے منڈوے پر جا چڑھی چاند اور ستارے میرے مضامین معانی کے پھل اور پھول دیکھ کر دنگ رہ گئے جس جس مقام پر جو جو قصہ میں نے کہا ھے اس کی تصویر نظروں کے سامنے کھینچ دی ھے میں نے فہم و فراست سے ھر رزم و بزم کو بڑی شان سے سنوارا ھے اس خوش طرز مردانہ قال کے سننے پر فرط شوق سے شیر مردوں پر حالت طاری ھوگی کلام میں جب تک یہ کرامت نہو اس وقت تک اپنے کو سخنور کہلانا سزاوار نہیں - میری بات میں ھرگز لات نہیں ھے، لات مارنا نادان کا ھنر ھے - کہ میں نے آج اس طرز کے شعر بڑی شان کے ساتھ کہے ھیں

کسی کا بی نا هات انپڑ نا کنکر | میں نے انهیں طاق گردوں پر لیجا کر رکھا هے
رکھیا هوں بی طاق گردوں اُپر | جہاں کسی کی رسائی نہیں هو سکتی

دیکھئے ذیل کے اشعار میں وہ هندی اور فارسی رزمیہ کا ذکر کس عنوان سے کرتا هے —

کیا میں تو قطع نظر لات سوں | میں نے تو خیر لات سے قطع نظر کی هے لیکن
ولے داد هے اهل انصات سوں | اب انصات اهل انصات کے هاتھہ میں هے
کہ کیوں میں پکڑ آج بهانت ایک نوی | کہ کیوں میں نے آج ایک نئی طرز اختیار کی
زبوں بات کوں کر دکھایا قوی | اور ادنیٰ بات کو اعلیٰ کر دکھایا
اگر کوئی معنی کوں کروا رسی | اگر کوئی مغز معنی کو پہنچے اور هندی
پڑے رزمیہ هندی و فارسی | اور فارسی رزمیہ مثنویوں کو پڑھے
اگر اوهے کامل سمج کا دهنی | اور اگر وہ فہم و ذوق میں کامل هے تو
تو اس یک سوں هوے دو هنر کا غنی | اِسے پڑہ کر دونوں کی خوبیوں کا مزہ پاے گا
کہ دونوں کی خوبی مجهہ انکهیاں میں آن | دونوں کی خوبیاں میری نظر میں هیں اور
خلاصہ نکالیا هوں خوش مایہ چھان | میں نے دونوں کی خوبیوں کا عطر نکال لیا هے
رتن دیکھہ لیتے هیں صاحب نظر | صاحب نظر جواهر کو پرکھہ لیتے هیں
کہ اندهلے کنے کیا رتن کیا پتهر | اندهے کے آگے پتهر اور جواهرات دونوں برابر هیں

فصاحت کے ساتھہ مضمون یا خیال کے هونے کو لازم قرار دیتا هے کہ اس میں کلام کا حسن هے اور پھر کہتا هے کہ میں نے اِس مثنوی میں دونوں کا خیال رکھا هے —

بزرگی هے هندی میں اکثر سکای | هندی میں اکثر بزرگی سکھائی گئی هے
وگر نیں تو مضمون کی | اگر یہ نہیں تو مضمون کی بڑائی کہاں رهی،
کا بڑای | یعنی مضمون هی کی بلندی سے نظم هندی کی بزرگی هے

فصاحت ہے گر شعر کے بن کا روپ
ولے شعر کا جیو ہے مضمون انوپ
معزز ہے تن جیو دھرتا ہے جو
نہ بیجاں کی صورت کوں پینا ہے دھو
اچھے کاٹ کا گرچہ پتلا سد نگ
نہ کام آدمی کے سکے کر اپنگ
کہ میں فتح نامہ لکھیا ہوں سو آج
نہ اکثر کیا بات مضمون باج
نظر میں سری جاں دسیا کچھہ بھی کام
سخن کی کیا دیکھہ جھڑتی تمام
گھڑیا ہوں سلامت سوں یک یک بچن
مضامین کی مد میں اوتیا رتن
نکالیا ہوں کے نگ طبیعت کے اوت
دیا خوب سورج کے مہرے کی جوت

اگرچہ فصاحت شعر کے چمن کا روپ ہے لیکن مضمون کی ندرت اس کی جان ہے جسم وہی معزز ہے جس میں جان بھی ہے ورنہ بیجان صورت کوی دھو کے پیے ؟ کاٹ کا پتلا کیسا ہی خوبصورت ہو وہ آدمی کے سے نادر کام نہیں کر سکتا میں نے جو یہ فتح نامہ لکھا ہے، اس میں میں نے اکثر بغیر مضمون کے بات نہیں کی جہاں کہیں میں نے کوئی کام کی بات دیکھی تو سخن کا پورا جائزہ لے کر اُسے ادا کیا ایک ایک بات میں نے بڑی سلامتی سے کی ہے اور مضامین کی مد میں جواہرات ڈھونڈ کے نکالے ہیں طبیعت کے جواہر کھود کھود کے نکالے ہیں اور انہیں سورج کے مہرے کی جوت دی ہے۔

(باقی آیندہ)

کھڑی بولی

از

(جناب پنڈت منوہر لال زتشی صاحب ایم-اے)

رسالۂ اردو کے جنوری سنہ ۱۹۳۴ کے نمبر میں میرا ایک مضمون " بعض غلط فہمیاں " کے عنوان سے شایع ہوا ہے- اس میں میں نے کھڑی بولی کے متعلق لکھا تھا کہ یہ ہندی کی ایک شاخ ہے اور اس بیان کے ثبوت میں پریم ساگر کا ایک اقتباس پیش کیا تھا اور ہندی کی چار مستند تصانیف کا حوالہ دیا تھا - میرے مضمون کے آخر میں اڈیٹر صاحب کا ایک نوٹ شایع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں —

" اردو کے تبصرہ نگار کی راے میں کھڑی بولی سے مراد وہ بولی ہے جو شستہ اور ادبی زبان نہیں - یعنی اس لفظ کا استعمال شستہ اور ادبی زبان کے مقابلہ میں ہوتا ہے- آج کل بھی یہ لفظ انہیں معنوں میں یعنی گنواری بولی کے لیے بولا جاتا ہے- یہ کوئی خاص زبان یا کسی زبان کی شاخ نہیں ہے - للوجی لال نے بھی غالباً انہی معنوں میں یہ لفظ استعمال کیا ہے یعنی وہ بولی جو شستہ نہ تھی اور شاعری

میں استعمال نہیں ہوتی تھی - یورپی محققوں کو اس سے
مغالطہ ہوا اور انھوں نے اسے ایک خاص زبان قرار دیا ۔
جن مصنفوں کا حوالہ فاضل مضمون نگار نے دیا ہے انھوں نے
بھی یورپی محققوں کی تقلید کی ہے "

مجھے یہ نوٹ پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی اس واسطے کہ جو طالب علم اسکولوں میں ہندی پڑھتے ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ برج بھاشا کی طرح کھڑی بولی ہندی کی ایک مستقل شاخ ہے - اگر کوئی ہندی کا طالب علم کلاس میں یہ کہے کہ "کھڑی بولی" کے معنی ہیں گنواری بولی تو غالباً وہ اپنے استاد کے ہاتھ سے سزا پائے - مجھے اس نوٹ کے بارہ میں چند باتیں عرض کرنی ہیں

۱ - اردو کے تبصرہ نگار کی "رائے" کو واقعات کے مقابلہ میں کس طرح مانا جائے - ہندی کے جاننے والے کھڑی بولی سے ہندی کی ایک خاص اور مستقل شاخ مراد لیتے ہیں - یہ طرز بیان برج بھاشا سے جدا اور مختلف ہے

۲ - "کھڑی بولی" کے معنی گنواری بولی نہ کبھی تھے اور اب ہیں

۳ - جو اقتباس میں نے پریم ساگر سے پیش کیا ہے اس کے یہ نہ معنی کسی طرح نہیں ہو سکتے کہ للوجی لال پریم ساگر گنواری بولی میں یا غیر شستہ زبان میں لکھ رہے ہیں - اس کا مطلب صاف ہے - اس میں لکھا ہے کہ پہلے چتر بھج سرنے بھاگوت کے دسویں اسکند کو دوہے چوپائی میں برج بھاشا کیا اور اب للوجی لال نے دلی آگرے کی کھڑی بولی میں کہہ نام پریم ساگر رکھا - اس سے صاف ظاہر ہے کہ "کھڑی بولی" دلی اور آگرے کی بولی ہے اور برج بھاشا

سے مختلف ہے تبصرہ نگار صاحب اگر پریم ساگر کے پڑھنے کی تکلیف اُٹھائیں تو اُن کو معلوم ہو کہ پریم ساگر کی زبان نہ گنواری ہے نہ غیر شستہ —

۴ - جن مصنفوں کا حوالہ میں نے دیا تھا اور جن کتابوں کے نام میں نے لکھے تھے ان کو پڑھنے کی تبصرہ نگار صاحب نے تکلیف نہیں اُٹھائی، بغیر پڑھے فرما دیا کہ انھوں نے یورپی محققوں کی تقلید کی ہے - ان کی زبردستی دیکھ کر ہندی کے شاعر کا قول یاد آیا -

نیاو نہ کین کین ٹھکرائی

بن کیئے لکھہ دین برائی

بابو شام سندر داس نے ہندی زبان اور ہندی لٹریچر کی تحقیق میں عمر صرف کر دی، برسوں نہیں جگوں بنارس کی ناگری پرچارنی سبھا کے سکرٹری رہے اوراب ہندو یونیورسٹی میں ہندی کے پروفیسر ہیں - بابو دھیرندر ورما الہ آباد یونیورسٹی میں ہندی کے شعبہ کے صدر ہیں "ہندی بھاشا کا اتہاس" ان کی مشہور کتاب ہے - کوئی اردو کے تبصرہ نگار کی رائے کس طرح مان لے کہ یہ لوگ ہندی زبان کے معاملہ میں خود تفتیش اور تحقیق کرنے کے اہل نہیں ہیں محض فرنگیوں کے مقلد ہیں - ان صاحبوں کی زندگی اسی دشت کی سیاحی میں صرف ہوئی اور ہو رہی ہے - ان کے مضامین ہیں، ان کی کتابیں ہیں، ہندی کے جاننے والوں میں ہندی کے لکھنے والوں میں ان کا پایہ عالی ہے، بلا کسی ثبوت اور بلا کسی دلیل کے یہ کہہ دینا کہ انھوں نے "یورپی محققوں کی تقلید کی ہے" بہادری کی بات ہے —

آخر میں صرف اس قدر عرض کروں گا کہ برج بھاشا اور اودھی

کی طرح کھڑی بولی ہندی زبان کی ایک مستقل شاخ ہے اور اس
بات کو صوبجات متحدہ کے مدارس کا ہر ہندی طالب علم جانتا ہے
اور ہندی کے محققوں کا اس پر اتفاق ہے اردو اسی کھڑی بولی سے
نکلی ہے - اگر اردو کے تبصرہ نگار اپنی ضد پر قائم ہیں اور کھڑی
بولی کو گنواری بولی قرار دیتے ہیں تو اُن کی بہادری پر اوران
کی ہمت پر صد ہزار آفریں —

کھڑی بولی

از

(جناب پنڈت ونشی دھر صاحب ودیا النکار)

بولیوں کے اکثر نام جو پڑ جاتے ھیں وہ یا تو اُس جگہ کے نام پر ھوتے ھیں جہاں وہ بولی جاتی ھیں یا اُن قوموں کے نام پر ھوتے ھیں جو انھیں بولتی ھیں - برج والوں کی بولی کو ھم برج بھاشا کہتے ھیں - پورب والوں کی بولی کو پوربی اور بنگال کی بولی کو بنگالی کہتے ھیں - اسی طرح ھم انگریزوں کی بولی کو انگریزی اور فرانسیسیوں کی بولی کو فرانسیسی کہتے ھیں —

جب ھم کھڑی بولی کا لفظ کہتے ھیں تو اس سے صاف معلوم ھوتا ھے کہ یہ لفظ نہ تو کسی جگہ کے نام سے تعلق رکھتا ھے اور نہ کسی قوم کے نام سے - پھر اس لفظ کے کیا معنی ھیں ؟

بعض لوگ انگریز محققوں کی دیکھا دیکھی اس لفظ کو کھری کہتے ھیں اور اس طرح اِس کے معنی سچی اور حقیقی لیتے ھیں - اگر یہ بولی حقیقی اور سچی مانی جاے تو پھر پرانی ھندی کے اندر اس کا ادب بہت ھی کم کیوں ملتا ھے ؟ اور پھر اگر یہ کھڑی بولی برج بھاشا وغیرہ زبانوں کی طرح ادبی حلقے میں رائج تھی تو ھندی کے قدیم شعرا

نے اِس کا ذکر تک کیوں نہیں کیا؟ امیر خسرو نے ہندوی زبان کا تو ذکر کیا ہے لیکن اُس نے اس کھڑی بولی کے نام کا ذکر نہیں کیا - اور نہ کسی قدیم ہندی شاعر کے کلام میں کھڑی بولی کا لفظ پایا جاتا ہے - کھڑی بولی کے لفظ کا استعمال پہلے پہل ہم للو لال جی کے "پریم ساگر" میں دیکھتے ہیں - اگر کھڑی بولی کے معنی حقیقی اور سچی زبان مان لئے جائیں تو پھر قدیم شعرا کے کلام میں اِس کا کچھہ نہ کچھہ ذکر تو ضرور ملنا چاھئے تھا —

جناب بابو شیام سندر داس صاحب نے ہندی شبد ساگر میں "کھڑی بولی" کے بارہ میں جو کچھہ بھی لکھا ہے اُس میں یہ کہیں دکھانے کی کوشش نہیں کی کہ لفظ "کھڑی" کے کیا معنی ہیں - صاحب موصوف نے صرف کھڑی لفظ کے مخرج کو انگریزی محققوں کی طرح "کھڑی" لفظ کے محاذي سوالیہ علامت ڈال کر استعمال کیا ہے - اُنھوں نے اپنی طرف سے اِس بارہ میں کُچھہ بھی نہیں لکھا - اور نہ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ اُس وقت کی "ہندی" کا "کھڑی بولی" نام کیسے پڑ گیا - یہ سچ ہے کہ جناب بابو شیام سندر داس صاحب نے اپنی عمر ہندی کی خدمت میں صرف کی ہے اور اُن کی خدمات کی ہمارے دل میں عزت ہے - لیکن اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ اُنھوں نے جو کُچھہ بھی لکھا ہے اس میں غلطی کا امکان نہیں - ہماری زبانوں کے بارے میں جو کُچھہ بھی تحقیقات ہو رہی ہے اُس میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جنھیں با وثوق ماخذوں سے ثابت کرنا ازحد مُشکل ہے - افسوس تو اس امر کا ہے کہ یہاں کے اکثر محققین بعض اوقات آنکھہ بند کر کے وہی لکھہ دیتے ہیں جو کہ انگریزی محققوں نے لکھہ دیا ہے - اور اگر کوئی نئی بات ضبط تحریر میں لاتے بھی ہیں

تو اُس کے لیے کوئی معتبر سند پیش نہیں کرتے - تحقیق میں جب تک کسی مستند ماخذ کا حوالہ نہ دیا جاے وہ آسانی سے تسلیم نہیں کی جا سکتی -

جناب بابو شیام سندر داس صاحب نے اپنے تحقیقی مضامین میں جن بیانات کو پیش کیا ہے ان میں سے اکثر حوالہ و سند کے محتاج ہیں - تحقیق کا شعبہ ہے بھی ایسا کہ جو بات کل مسلم تھی آج غلط ثابت ہوی - مثلاً صاحب ممدوح نے دیباچۂ ہندی شبد ساگر کے صفحہ ۴۱ پر تحریر کیا ہے کہ " اِسی طرح سمت ۱۶۸۰ میں جٹمل نے " گورا بادل کی کہانی " اِس زبان کی اُس وقت کی مروجہ نثر میں لکھی ہے "—

دسمبر سنہ ۱۹۳۳ع کے وشال بھارت میں جناب پورن چند صاحب ناہر ایم اے بی ایل کا " کونیں بھانگ " ایک مضمون شایع ہوا ہے جس میں اُنھوں نے حوالوں کے ساتھہ تفصیل سے اِس امر کو ثابت کیا ہے کہ جٹمل نے " گورا بادل کی کہانی " کو نثر میں لکھا ہی نہیں - وہ لکھتے ہیں " شاید بابو صاحب (شیام سندر داس صاحب) نے اِس کتاب کا مطالعہ خود نہیں کیا ورنہ اتنی بڑی غلطی ہونی ممکن نہ تھی (وشال بھارت دسمبر سنہ ۳۳ ع صفحہ ۷۳۳) - ہم نے نمونے کے طور پر یہ صرف ایک مثال لکھی ہے جس سے معلوم ہوگا کہ جناب شیام سندر داس صاحب کی تحقیق بھی غلط ثابت ہو سکتی ہے -

جناب بابو شیام سندر داس صاحب نے ہندی شبد ساگر کے دیباچہ میں یہ کہیں بھی بتانے کی کوشش نہیں کی کہ آخر اس زبان کا نام "کھڑی" کیوں پڑا —

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اس وقت اس زبان کا نام " کھڑی بولی " تھا اور اِس بات کو ثابت کرنے کی

ضرورت ھی نہیں ھے اور یہ تسلیم کرکے وہ آگے چلے ھیں - اگر اُس وقت کی اِس بولی کا نام " کھڑی " بولی تھا تو کوی ثبوت تو اس کے لیے دینا چاھئے تھا - لیکن انھوں نے ایسا کوی ثبوت نہیں دیا ھے —

اس میں شبہہ نہیں کہ آج کل کی مروجہ ھندی کو ' جو پڑھے لکھے لوگوں کی بولنے اور لکھنے کی عام زبان بن گئی ھے ' کھڑی بولی کہتے ھیں - لیکن اس بولی کو کھڑی بولی کہنے کے کیا معنی ھیں ؟ کھڑی کا لفظ سنسکرت کے لفظ کھر سے بنا ھے جس کے معنی سخت ' کٹھور اور کُھردرا ھیں ' جس میں کسی طرح کی نرمی اور نزاکت نہ ھو - اس کھر لفظ سے کھڑی بنا ھے - کھری کے معنی سچی یا حقیقی بھی اس لیے ھوتے ھیں کہ سچی بات اکثر سخت ھوتی ھے —

یہ مانا جا سکتا ھے کہ جو ھندی دلی میرٹھہ وغیرہ میں پرانے زمانے میں بولی جاتی تھی اس سے اردو پیدا ھوی - لیکن اس زمانے کے ھندی شاعروں اور مصنفوں کو وہ زبان برج بھاشا کے مقابلے میں شیریں' لطیف اور بامزہ نہیں معلوم ھوتی تھی - برج بھاشا کی بے مثل شیرینی کے سینکڑوں قصے اور کہانیاں آج بھی مشہور ھیں - برج بھاشا کی مٹھاس کے سامنے یہ ھندی جس سے اردو پیدا ھوی اُس زمانے کے لوگوں کو " کھڑی " یعنی سخت معلوم ھوتی تھی اور اسی لیے برج کا چلن ھوتے ھوے بھی اس کا استعمال کثرت سے اردو داں طبقے ھی نے کیا - ھندی داں طبقے نے اس کا استعمال بہت ھی کم کیا - آج بھی ھندی زبان کے اندر ایک ایسا اسکول (مذھب) ھے جو یہ مانتا ھے کہ ھندی شاعری تو برج بھاشا ھی میں ھونی چاھئے - اور آج بھی برج بھاشا کی شاعری میں جو مٹھاس ھے وہ کھڑی بولی میں کہاں ؟ برج بھاشا کی مٹھاس '

اس کا لوچ، اس کی نزاکت اور لطافت آج بھی ایسی ھے کہ زمانۂ حال کی مروجہ هندی بھی اس کے سامنے سخت، اکھڑ اور کانوں کو گراں معلوم هوتی هے —

لیکن جب نثر کا چرچا زیادہ هوا اس وقت بول چال کی کھڑی بولی کو اهمیت ملی اور تب یہ کھڑی بولی استعمال میں آنے لگی - پہلے پہل زیادہ تر یہ نثر هی میں استعمال هوی اور پھر رفتہ رفتہ بول چال کی بولی هونے کی وجہ سے نظم میں اس کا چلن هوا - شروع میں لوگ کھڑی بولی کی هندی نظم کو سن کر ناک بھوں چڑھاتے تھے اور آج بھی هندی کے بہت سے ایسے صاحب دل عالم موجود هیں جنھیں برج بھاشا کی نظم کے آگے کھڑی بولی کی نظم پھیکی معلوم هوتی هے —

لیکن چونکہ اب مروجہ زبان کا چلن بڑھتا جاتا هے اس لیے کھڑی بولی کی نظم کا چرچا بھی بڑھ رها هے اور برسوں کی کوشش کے بعد اس کی شاعری میں بھی اب کچھ رسیلا پن آچلا هے —

اسی طرح آج کی هندی جو کھڑی بولی کہلاتی هے پرانے زمانے میں حقارت کے طور پر کھڑی بولی کہلاتی تھی - بذات خود یہ کوی علحدہ زبان یا هندی کی کوی مستقل شاخ نہیں تھی —

" کھڑی بولی " کا نام برج بھاشا کی متھاس کے مقابلہ هی میں پڑا هے - اس کے یہ معنی نہیں هیں کہ وہ در اصل غیر مہذب اور ناشائستہ لوگوں کی زبان تھی - اس کا صرف یہی مطلب هے کہ اس زبان کو اس زمانے کے هندی داں برج بھاشا کے مقابلے میں نہ تو میٹھا سمجھتے تھے اور نہ اس میں وہ صلاحیت تھی جو برج بھاشا میں تھی - اس کا غیر شستہ پن اور کرختگی برج بھاشا کے مقابلے هی میں تھی - للو لال جی

جہاں کے رہنے والے تھے وہاں 'کھڑی'' کے لفظ سے یہی معنی لیے جاتے ہیں - دہلی آگرہ کے علاقوں میں آج بھی ''کھڑی'' کا لفظ غیر شائستہ اور کرخت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے - اس لیے اگر انہوں نے اس لفظ کو انہی معنوں میں استعمال کیا ہو تو کچھہ تعجب کی بات نہیں —

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اُن کا "پریم ساگر" گنوارو زبان میں لکھا گیا ہے - دنیا کی کوئی زبان، جسے زبان کا درجہ حاصل ہے اور جس میں کچھہ نہ کچھہ ادب موجود ہے، گنوارو نہیں کہی جا سکتی - اس قسم کے الفاظ مقابلتاً ہی استعمال کیے جاتے ہیں - اگر کوئی کہے کہ فرانسیسی کے مقابلے میں انگریزی پھیکی اور گنوارو سی معلوم ہوتی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہوں گے کہ انگریزی ایک گنوارو زبان ہے اور اس میں کسی قسم کی خوبی نہیں ہے - آج یہ ہندی جسے کسی زمانے میں کھڑی بولی کہا جاتا تھا، نثر اور نظم میں ہر جگہ ایسی رائج ہو چکی ہے کہ اس میں معقول ادب پیدا ہو رہا ہے - اب ہم اس بولی میں ایسے رچ پچ گئے ہیں کہ ہمیں اب یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ کسی وقت اسے اس معنی میں کھڑی بولی کہتے تھے —

ہم تو سمجھتے ہیں کہ "کھڑی بولی" کے یہی ایک معنی ہیں جو سمجھہ میں آسکتے ہیں اور اس کے معنی سچی اور حقیقی لینا ایک قسم کی کھینچ تان معلوم ہوتی ہے کیونکہ اگر یہ حقیقی ہوتی تو پرانے ہندی کے شاعر اس میں اتنا ہی ادب پیدا کرتے جتنا اردو زبان کے لکھنے والوں نے پیدا کیا ہے - اس زبان کا نام کھڑی اسی لیے پڑ گیا تھا کہ اسے اس وقت کے ہندی مصنفین برج بھاشا کے مقابلہ میں غیر

شستہ اور کرخت سمجھتے تھے اور دراصل یہ وہی ہندی ہے جو اردو کی شکل میں نظر آتی ہے اور اردو والوں ہی نے اسے پروان چڑھایا - اُس وقت تک اِس زبان کو ہندوی یا ہندی کہتے تھے - کھڑی بولی تو اسے حقارت سے کہتے تھے ورنہ دراصل یہ ہندی کی کوئی الگ شاخ نہیں ہے - لیکن آج کل بہت سے لوگ اس کھڑی بولی کو ہندی کی شاخ لکھنے لگے ہیں جو قابل قبول نہیں معلوم ہوتا —

ادب

تاریخ و سیر

متفرقات

اردو کے جدید رسالے

ضروریات الادب اردو

(مولفہ غلام الدین صاحب، بی - او - ایل - مدرس نارمل اسکول
آگرہ - چھوٹی تقطیع - صفحات ۲۴۸ قیمت ایک روپیہ)

—

یہ کتاب طلبہ کے لیے تالیف کی گئی ہے اور اس میں شک نہیں کہ طالب علموں کے لیے بہت کارآمد ہے - اس میں مفصلۂ ذیل مضامین پر بحث کی گئی ہے - (۱) مرکب الفاظ کی تشریح (۲) نظم و نثر کی اقسام مع امثلہ (۳) صنائع بدائع لفظی و معنوی (۴) الفاظ متضاد یا متقابل المعنی (۵) فارسی کلمات جو مرکبات میں کارآمد ہیں (۶) حروف کا باہمی بدل (۷) فقرات و اشعار کی نحوی ترکیب (۸) محاورات اردو زبان (۹) واحد عربی الفاظ کی جمع (۱۰) فصاحت و بلاغت، تشبیہ و استعارہ کا مختصر بیان —

تقویم العروض و القافیہ

(مولفۂ غلام محی الدین صاحب بی - او - ایل سابق مدرس
نارمل اسکول آگرہ - مفتی تولہ مرادآباد - قیمت آتھہ آنے)

عروض و قافیہ نیز علم بدیع پر مختصر کتاب ہے لیکن با وجود اختصار کے تمام ضروری مسائل تشریح اور مثالوں کے ساتھہ آگئے ہیں - طلبہ اور عام شائقین کے لیے بہت اچھی کتاب ہے —

افسانہاے عشق

(مترجمۂ حامد علی خاں صاحب بی - اے ' جائنٹ اڈیٹر
ہمایوں قیمت مجلد ایک روپیہ - دفتر ہمایوں لاہور)

حامد علی خاں صاحب اردو نثر اور نظم دونوں پر اچھی قدرت رکھتے ہیں - ان کے بیان میں دلکشی ہے - اس مجموعے میں سات فسانے ہیں اور ساتوں کے ساتوں ترجمہ ہیں - جن میں سے تین ٹھکور کے ' ایک سرت چٹرجی اور ایک سیتا چٹرجی کا - باقی دوسرے فسانہ نویسوں کے —

ترجمہ بہت ستھرا اور پاک صاف ہے - کتاب چھوٹی تقطیع پر مجلد ہے اور بہت اچھی چھپی ہے —

شریک اخلاص (قیمت آتھہ آنے)

یہ نظم مولانا محمد علی مرحوم کا مرثیہ ہے جو مرزا احسان احمد

بی - اے ' ال ال - بی (علیگ) وکیل اعظم گڑھ نے لکھا ہے - اس میں مرحوم کی خوبیوں، اپنے درد دل اور قومی نقصان کو بڑے سوز و گداز سے بیان کیا ہے -

---

رموز العارفین

(نوشتۂ سید احمد اللہ صاحب قادری - حیدرآباد دکن قیمت دو روپے)

یہ میر حسن مصنف سحرالبیان کی ایک مثنوی ہے - اس میں ابراہیم ادہم بادشاہ بلخ کے ترک دنیا اور فقر اختیار کرنے کا بیان ہے - اس میں جابجا مثنوی مولانا روم کے اشعار تضمین کے طور پر آ گئے ہیں - اس مثنوی کو مثنویٔ سحرالبیان سے کچھ نسبت نہیں - بہت معمولی نظم ہے - شروع میں مرتب صاحب نے ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں میر حسن کی زندگی کے حالات اور تصانیف وغیرہ کا مفصل ذکر ہے —

میری ناتمام محبت اور دوسرے رومان (۲) لاش اور دوسرے ہیبت ناک قصے —

(مصنفۂ حجاب اسمعیل صاحبہ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے اور ایک روپیہ چار آنے دارالاشاعت پنجاب لاہور)

اس میں چار فسانے ہیں - "میری ناتمام محبت" کسی قدر طویل ہے باقی تین چھوٹے چھوٹے ہیں - قصے معمولی ہیں - تصنیف میں کچھ ترجمے

کا رنگ پایا جاتا ہے - یہ قصے مشاہدے اور ذاتی تجربے کے اس قدر ممنون نہیں جتنے کتابوں اور مطالعہ کے ہیں - تاہم قابل نوجوان مصنفہ کو لکھنے کا ڈھنگ خوب آتا ہے اور انہیں لکھنے پڑھنے اور مطالعہ اور تصنیف و تالیف کا شوق معلوم ہوتا ہے —

دوسری کتاب میں لاش اور اس کے ساتھ کے دوسرے قصے حقیقت میں ہیبت ناک ہیں -

"سخنوران ایران در عصر حاضر"

(مولفہ جناب پروفیسر محمد اسحاق صاحب ' کلکتہ یونیورسٹی)

(حجم ۱۸ + ۴۵۵ ص - تعداد تصاویر ۴۳ - کاغذ چکنا و دبیز - ملنے کا پتہ : عبدالحلیم صاحب نمبر ۱۵۷ چاندنی چوک اسٹریٹ کلکتہ)

—— × ——

اگرچہ اردو زبان ہمیشہ سے فارسی کی خوشہ چین رہی ہے ' خصوصاً اس کا سرمایۂ شعر ' تمام تر ' فارسی مضامین ' الفاظ ' اور تشبیہات کا ممنون احسان رہا ہے ' بقول خواجہ حافظ —

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

لیکن مقام حیرت ہے کہ اس قریبی تعلق کے باوجود ' ہندوستان کا فارسی دان طبقہ جدید ایرانی ادبیات کی روش اور رجحانات سے قطعاً ناآشنا ہے - آج ہمارے ملک میں فارسی زبان کے ایسے "فارغ التحصیل" اصحاب

موجود ھیں ۰ جو جدید ادبیات سے نہ صرف ناواقف ھیں' بلکہ اس کے سمجھنے سے بھی قاصر ھیں - ان حضرات کی راے میں ایرانی شاعری کا چراغ گویا جامی کی شمع حیات کے ساتھہ گل ھوگیا' اور قاآنی اور یغما کی جگمگاھت اس شعلہ کی آخری بھڑک تھی - بقول پروفیسر براؤن :-

" اغلب مستشرقین کہ زحمت تتبع ادبیات جدیدۂ ایران را بخود نہ دادہ اند' چنین تصور می کنند کہ طوطی شکر گفتار طبع شعرا و اُدباے اعصار گزشتۂ ایران از نطق فرو ماندہ' و چندیں قرن است کہ دریں چمن خزان دیدہ' بلبلے بہ ترنم نیامدہ' و شاید ھم ھیچ نخواھد آمد " *

جن حضرات نے پروفیسر براؤن کی کتاب " Press and Poetry in modern Persia " (چاپ خانہ و شعر ایران کنونی) ملاحظہ فرمای ھے' انھیں ایران کی جدید' خصوصاً دورۂ انقلاب کی شاعری کا کسی قدر اندازہ ھوا ھوگا' ھندوستان کے فارسی دان طبقہ کو پروفیسر محمد اسحاق صاحب کا نہایت ممنون ھونا چاھئے کہ صاحب موصوف نے محض اس مقصد کے لئے چھہ ماہ تک ایران میں قیام کیا اور خود وھاں کے شعرا سے ملے اور ان کا کلام اور حالات زندگی حاصل کئے اور اس طرح جدید ادبیات فارسی کے متعلق ایک ایسی مفید اور دیدہ زیب کتاب ملک کے سامنے پیش کی جس کی نظیر اردو طباعت میں مشکل سے ملے گی . فاضل مولف کے ساتھہ ساتھہ ھم چاپخانہ جامعہ ملیہ' دھلی کو بھی مبارکباد دیتے ھیں کہ اس نے کمال

---

* مقدمۂ فارسی از قلم پروفیسر براؤن بر کتاب Press & Poctry in modern Persia
۱۲ - راقم -

اهتمام کے ساتھہ اس کتاب کو طبع کیا - جس طرح یہ کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے لاجواب ہے ' اسی طرح اپنی طباعت کے اعتبار سے بھی (کم از کم هندوستان میں) بے نظیر ہے -

فاضل مولف نے اس موضوع پر تین جلدیں شائع کرنے کا مقصد ظاهر فرمایا ہے ' جن میں سے دو شعر جدید پر اور تیسری جلد نثر جدید پر ہوگی - زیر تبصرہ کتاب اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے ' جس میں ردیف وار ' ۳۳ شعرا کے حالات زندگی ' ان کی تصاویر اور ان کا منتخب کلام پیش کیا گیا ہے - کتاب کے شروع میں ' آقاے جمال زادہ کا لکھا ہوا ۱۲ صفحات کا " تقریظ و تشکر " ہے - پھر خود فاضل مولف نے چھہ صفحات کا مقدمہ لکھا ہے ' جس میں سرسری طور پر آج کل کی ایرانی شاعری پر تبصرہ فرمایا ہے - کتاب کے آخر میں پانچ نہایت مفید فہرستیں : فہرست هجای ' اسماء رجال ' اسماء اماکن ؛ اسماے ملل و قبائل و فرق ' اور اسماے کتب و جرائد کی ہیں - حصۂ انگریزی میں سر زاهد سہروردی کی ایک مختصر تقریب ' اور فاضل مولف کا دیباچہ اور مقدمہ ہے - غرض کہ پروفیسر اسحاق صاحب اپنی سیاحت ایران سے ایک ایسا گلدستہ " رہ آورد سفر '' کے طور پر لاے ہیں ' جو بجاے خود ایک گلستان همیشہ بہار ہے - یہ تینوں جلدیں جب شایع ہوجائیں گی ' تو پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران جلد چہارم کا بہترین اور مکمل ترین ضمیمہ ثابت ہوں گی —

اگرچہ فاضل مولف نے مجملاً اپنے مقدمہ میں آج کل کی فارسی شاعری کی بعض نمایاں خصوصیات کو واضح فرمایا ہے ' لیکن اس میں تاریخی مواد کافی نہیں ہے اور اس کو پڑھ کر ناظرین ان حالات کا اندازہ نہیں

لگا سکتے جنھوں نے جدید شاعری کو آب و رنگ دیا ھے - ھمیں امید ھے کہ آئندہ جلدوں میں اس کی تلافی ھو جائے گی - تجدد ادبی کی مثالوں کے ساتھہ ساتھہ اگر اس تجدد کے اسباب و علل سے بھی بحث کی جائے تو وہ زبانیں جن کی ادبیات ھنوز معرض تشکیل میں ھے ' بہت کچھہ فائدہ اٹھا سکتی ھیں - اکثر اھل قلم جدید ایرانی ادبیات کو دورۂ انقلاب کی پیداوار قرار دیتے ھیں ؛ اور اس کا سیاسی حصہ بے شک براہ راست اُسی کا نتیجہ ھے ' لیکن دوسری حیثیتوں سے بھی یہ تجدد کچھہ کم جالب توجہ نہیں ھے ' اور ھم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ھیں جن سیاسی اور معاشری ھیجانات نے ترکی میں نامق کمال ' شناسی آفندی اور ضیاء پاشاہ کو پیدا کیا ' جو مصر میں عربی پاشا کی تحریک کی صورت میں ظاھر ھوے ' وھی در اصل ایرانی ادب کے تجدد کا سبب بھی بنے - مرزا محمد رضا کرمانی نے ناصرالدین شاہ قاچار کو قتل کیا ' مرزا آقاخاں کرمانی نے اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا اور یہ پر جوش اشعار لکھے :-

بایران مباد آن چنان روز بد که کشور به بیگانگان اوفتد
نخواهم زمانے که این نو عروس بیفتد بزیر جوانان روس
بگیتی مباد آنکه این حور ویس شود همسرے لردے از انگلیس

ذھنی تحریک دونوں صورتوں میں وھی ایک تھی ' صرف طریقۂ عمل میں فرق تھا - اس تحریک کو سمجھے بغیر ' جدید ایرانی ادبیات کی روح کو سمجھنا مشکل ھے —

سخنوران ایران در عصر حاضر کے مطالعہ سے ناظرین کو ایرانی افکار کا ایک نیا عالم نظر آے گا - شاہ پرستی کی جگہ جمہور پرستی ' خوشامدانہ

اغراق کی جگہ تلخ حقیقت نگاری ' صنائع و بدائع پر زور طبع صرف کرنے کی بجاے وطنی اور ملی ترانے انہیں سنائی دیں گے ' اور انہیں حیرت ہوگی کہ جس فارسی شاعری کی کورانہ تقلید وہ آج تک اپنا شعار بنائے ہوے ہیں ' اس میں اب ایک نیا اُبال اور نیا جوش پیدا ہوگیا ہے۔ زندگی تبدیلیء پیہم کا نام ہے ' اور ادبیات جو زندگی کا آئینہ ہوتی ہے ' یا ہونی چاہئے ' وہ بھی ہمیشہ مسلسل انقلاب و ارتقاء بلی رہتی ہے - قدیم شاعری ' قدیم ایرانی معاشرت کی طرح حالت جمود میں تھی ' لیکن قوم کی نئی امنگوں کے ساتھہ قومی ادبیات نے بھی ہاتھہ پاؤں نکالے ہیں ' جس کی مثالیں ناظرین کو اس کتاب کے ہر صفحے پر نظر آئیں گی —

سب سے پہلی تبدیلی ناظرین کو انتخاب موضوعات میں نظر آے گی - مدایح پادشاہان و بزرگان ' غزلیات و اخلاق و فلسفہ و تصوف کی جگہ اب معاشری اور سیاسی موضوعوں نے لے لی ہے - اس میں شک نہیں کہ غزلیں اب بھی کہی جاتی ہیں - اس لئے کہ ایرانی آب و ہوا میں جو قدرتی رنگ تغزل ہے ' وہ ظاہر ہوے بغیر نہیں رہ سکتا ' لیکن اب ان کی حیثیت محض ادبی گل کاریوں کی سی ہے - آج کل کی شاعری یا تو " وطنیاتی " ہے ' یا معاشری - چنانچہ اس جلد میں بھی ناظرین کو پردہ ' اصلاح طریقۂ نکاح ' تعدد ازواج ' تساوی حقوق مرد وزن ' ستائش زارع ' راہ آہن اور ایسے ہی نئے عنوانات پر متعدد نظمیں نظر آئیں گی ' جن سے ظاہر ہوگا کہ آج کل ایرانی ادبیات کا معیار محض تفریح و تفنن طبع ہی نہیں ہے ' بلکہ اس سے وطن خواہی کی تحریک ' اور اصلاح اور تبلیغ کا کام بھی لیا جاتا ہے - جو طبیعتیں پہلے ہلال نو سے ممدوح کا حلقہ رکاب تراشا کرتی تھیں وہی اب شاہوں کے تاج کے گوہر تابناک کو ' اشک یتیم سے

تشبیہہ دیتی ھیں :-

روزے گزشت پادشہے از گزر گہے　　فریاد شوق بر سر ہر کوے و بام خاست
پرسید زان میانہ یکے کودک یتیم　　کین تابناک چیست کہ بر تاج بادشاہ است
نزدیک رفت پیرزنے، کوز پشت وگفت　　کین اشک دیدۂ من و خون دل شماست

(پروین خانم اعتصامی)

جو ہمت پہلے شاہوں کی مدح میں صرف ہوتی تھی، وہ اب پہلے سے زیادہ جوش اور خلوص کے ساتھہ وطن کے ترانے گانے میں صرف ہوتی ھے :-

تا بندہ چو خورشید، و فروزان چو ستارہ
در صفحۂ پہنا ور ایں چرخ محدب
اے آئینہ شرق پدید از تو ہمارہ
فرزند بلند اختر و مردان مہذب
از خلد برین خوب تری اے چمن عشق
گہوارۂ علم و ہنری، اے وطن عشق

(فرہنگ)

گردید وطن غرقۂ اندوہ و محن واے - ایواے وطن واے
خیزید و دوید از پے تابوت وکفن واے، ایواے وطن واے
از خون جوانان کہ شدہ کشتہ درین راہ، رنگین طبق ماہ
خونین شدہ صحرا وتل و دشت و دمن واے، ایواے وطن واے

(اشرف)

مولانا حالی مرحوم نے انھی کلیات پر جو مقدمہ لکھا تھا، اس میں

انہوں نے یہ خیال ظاہر فرمایا تھا کہ خیالات کی تبدیلی کے ساتھہ ' ادائے مطالب کے سانچے نہیں بدلتے۔ " محمل وہی ہیں لیکن محمل نشین دوسرے۔ پیالے وہی ہیں' لیکن شراب اور "۔ ایرانی ادبیات میں جو انقلاب ہوا ہے ' اس کا اندازہ ناظرین اسی سے لگا سکتے ہیں کہ موضوعات اور خیالات کی تبدیلی کے ساتھہ ساتھہ فارسی زبان کے سانچے بھی بدلتے جاتے ہیں - جس حد تک اصناف سخن کا تعلق ہے' حمد' نعت' منقبت مراثی' قدیم طرز کے قصاید' یہ آج ایرانی ادبیات میں آثار قدیمہ کا حکم رکھتے ہیں - آج کل کی فضا میں تغزلانہ " حدیث دلبری " اور " آب و رنگ شاعری' کی گنجائش بہت کم ہے - مسمّط اور مستزاد جسے قاآنی اور دادری نے زندہ کیا تھا آج کل زیادہ مقبول ہے' جس کی وجہ یہ ہے کہ سرود ملی کے لئے مسمط کی بحریں نہایت موزوں ہوتی ہیں - قطعات آج کل بھی لکھے جاتے ہیں' جن میں کوئی اخلاقی یا فلسفیانہ نکتہ بیان کیا جاتا ہے - چنانچہ اس کتاب میں بھی ناظرین کو ایرج مرزا کا قطعہ " قلب مادر "۔ اور " مادر "۔ حبیب یغمائی کا قطعہ " وطن " رشید یا سمی کا " آئینہ سیال " ملک الشعرا بہار کا " قلب شاعر " اور اے تاگر (ٹیگور سے خطاب نہایت عمدہ قطعات ملیں گے ۔ ہم صرف ایرج مرزا کا قطعہ " مادر " یہاں نقل کرتے ہیں' جو صفائی اور شیرینی اور خلوص جذبات کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہے :-

گویند مرا چو زاد مادر پستان بدهن گرفتن آموخت
شب ها بر گاهوارهٔ من بیدار نشست و خفتن آموخت
لب خند نهاد بر لب من بر غنچهٔ گل شگفتن آموخت
یک حرف دو حرف بر دهانم الفاظ نهاد و گفتن آموخت
دستم بگرفت و پا بپا برد تا شیوهٔ راه رفتن آموخت

پس ہستی من ز ہستی اوست تا ہستم و ہست دارمش دوست

اصناف سخن میں آج کل " تصنیف " بہت مقبول ہے - یہ وہی چیز ہے جسے انگریزی میں (Ballad) کہتے ہیں - اسے عموماً پیانو کے پردوں پر گایا جاتا ہے' اور اس کی بحروں میں موسیقی کے بولوں کا خیال زیادہ رکھا جاتا ہے - تصنیف گویوں میں عارف قزوینی سب سے زیادہ مشہور ہیں - یہ عموماً اپنی پرجوش تصانیف خود ہی گا کر سناتے ہیں - ہم ذیل میں ان کی تصنیف کا ایک بند نقل کرتے ہیں' جس سے ناظرین کو اس صنف شعر کا اندازہ ہو جائے گا :-

گریہ کن کہ گر سیل خون گری' ثمر ندارد

نالۂ کہ ناید زنائے دل' اثر ندارد

ہر کس کہ نیست اہل دل ز دل' خبر ندارد

دل ز دست غم مفر ندارد دیدہ غیر اشک تر ندارد

این محرم و صفر ندارد

گر زنیم چاک جیب جان چہ باک مرد جز ہلاک

ہیچ چارۂ دگر ندارد زندگی دگر ثمر ندارد

جس حد تک الفاظ و اصطلاحات کا تعلق ہے' آج کل ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو اپنے اشعار میں بےتکلف فرانسیسی الفاظ استعمال کرتا ہے - یہ عیب (افسوس ہے کہ ہم اسے عیب ہی کہنے پر مجبور ہیں) اکثر مشہور شعرا کے کلام میں بھی نظر آتا ہے - سمجھ میں نہیں آتا کہ ان مدعیان تجدد کو اس فرانسیسی پرستی سے کس اصلاح کی امید ہے -

عشقی مرحوم کی ایک نظم کا عنوان ہے "ایدہ آل عشقی" اسے پڑھ کر یہ سمجھ میں نہیں آسکتا کہ یہ ہے کیا چیز۔ خدا بھلا کرے فاضل مولف کا کہ انہوں نے حاشیہ میں اس کا مرادف "Ideal" لکھدیا، اور ہمیں اس عنوان پر ہنسی بھی آئی اور افسوس بھی ہوا۔ تابلو (Tableaux) ' بسمارمان پارلمان، یہ الفاظ مذاق پر بہت بار ہوتے ہیں - اکثر مشہور شعرا مثلاً ایرج مرزا، بہار، پورداؤد وغیرہ ان کانٹوں سے اپنا دامن بچاتے ہیں، لیکن کہیں کہیں ایک یا دو فرانسیسی لفظ ان کے کلام میں بھی آهی جاتے ہیں۔

الفاظ کے بارے میں ایک خاص اور ذی اثر طبقہ پاکیٔ زبان کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ عربی الفاظ کو نکال باہر کیا جائے، خواہ فرانسیسی الفاظ ہی کیوں نہ استعمال کرنے پڑیں۔اس "فارسی خالص" کی تحریک کے لوا بردار "پور داؤد" ہیں۔انہیں حافظ کے اس شعر پر

اگر چہ عرض هنر پیش یار بے ادبی است

زباں خموش ولیکن دهاں پر از عربی است

بڑا اعتراض یہ ہے کہ "عربی دانی" کو جز و هنر کیوں سمجھا گیا - ملک الشعرا بہار اپنے "چہار خطابۂ پہلوی" میں کہتے ہیں :

نصف زباں را عرب از بین برد

نصف دگر لہجہ بہ ترکاں سپرد

افسوس ہے کہ عربی کی یہ مخالفت صرف زبان ہی کی حد تک نہیں ہے - عصر حاضر کی ایرانی ادبیات میں عربی اثر اور عربی تمدن پر شدید حملے نظر آتے ہیں۔ ساسانی تہذیب کے احیاء کا جوش اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ عربوں اور ترکوں حتیٰ کہ قاچاریوں پر بھی شدید تبرا بازی کی جاتی ہے جو اکثر صورتوں میں دل آزاری کی حد تک پہنچ جاتی ہے - پورداؤد

اس طرح زہر اگلتے ہیں

از پیک نوید آمد، ہاں گوش فرادار که حمدشه ایران شد از تخت نگونسار

اورنگ شہی پاک شد از دیو تبه کار وز راهزن و ترمکن و دودهٔ قاچار

زین مژده بدرگاه خداوند سپاس آر

کز خجلت آن ننگ بجستیم دگر بار

یہ وہی راہزن (عرب) اور ترک ہیں جنھوں نے اپنی نوبت میں ایران کی خدمتیں کیں اور اسے سنوارا اور احمد شاہ کی تخت نشینی کے وقت تو بہت پر جوش قصاید بھی لکھے گئے تھے لیکن اس کی شکایت ہی کیا ' سیاسی حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے اور پھر انقلاب اسی کا نام ہے - ساسانیت کی یہ تحریک اب اس حد تک ایرانی ذہن پر حاوی ہوگئی ہے کہ نوجوان شعرا ' "روان زرتشت" سے مدد طلب کرتے ہیں اور داریوش و کورس کو قومی ہیرو بناتے ہیں - مجتہدین کا طبقہ جس کا سیاسی اثر صفویہ کے زمانے میں اور خود دورۂ قاچاریہ میں نہایت زبردست تھا ' آج کل مردود خلائق ہے اور ان کی بجاے قوم کی آنکھیں و کلاے مشروطہ پر لگی ہوی ہیں - عشقی مرحوم کہتے ہیں :-

زردشت ایران خرابست - اے روان پاک زردشت - این کشتی در گردابست

حیف ازین آب و خاک - زردشت

اے پیمبر آسمانی - زردشت تو برایران و ایرانی ' پیک نہانی - زردشت

الخ

چونکہ موجودہ ایرانی شاعری کا مخاطب طبقۂ خواص نہیں بلکہ ' طبقۂ عوام ' ہوتا ہے ' اس لیے اب اس میں مغلق الفاظ و تراکیب کی

بجائے سادہ و سلیس زبان استعمال کی جاتی ہے، اور در حقیقت بغیر اس کے شاعری سے اصلاحی اور تبلیغی کام لیا بھی نہیں جا سکتا - بقول پروفیسر براؤن ایرانی طبیعت اس قدر "مجذوب شعر" ہے کہ جو کام اخبارات کے مضامین اور مقرروں کی دھواں دھار تقریریں نہیں کرسکتیں، وہ ایک ظریفانہ یا پر جوش نظم سے پورا ہوجاتا ہے - کسی زبان کی ادبیات پر سیاسیات کا اثر، خواہ اور حیثیتوں سے قابل اعتراض ہو، لیکن کم از کم صفائی اور سادگی زبان پیدا کرنے میں بہت کارآمد ہوتا ہے - ہندوستان میں تقریباً پچاس سال سے سیاسی تحریکات ملک میں جاری ہیں، لیکن ادب پر اس کا کوئی نمایاں اثر نظر نہیں آتا، لیکن ایران میں صرف دس سال کی سیاسی تحریکات نے ان کی ادبیات میں بڑا تغیر پیدا کردیا ہے جو ان کی قومی زندگی کا ثبوت ہے - آج کل کی شاعری صرف گوش شاہاں کے لئے اور حصول ستائش کے خیال سے نہیں ہوتی - اب اس میں ایک پوری ملت سے خطاب ہوتا ہے- اس لئے زبان بھی ایسی ہوتی ہے جسے عالم و عامی، مرد و زن، بچے اور بوڑھے سب سمجھ سکیں- جن محاوروں کو متقدمین سوقیانہ سمجھ کر کبھی استعمال بھی نہ کرتے، آج کل وہ ہر نظم میں نظر آتے ہیں۔ اکثر نظمیں تو مخصوص علاقوں کی مقامی بولیوں میں کہی جاتی ہیں- اس حیثیت سے اردو ادبیات جدید ایرانی شاعری سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے - اس کتاب میں بعض نہایت سادہ اور پر اثر وطنی نظمیں اطفال مدارس کے لئے بھی موجود ہیں - حبیب یغمائی کی نظم وطن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

کشور ایران کہ زید جاودان هست وطن برهمه ایرانیان

ای پسر با ادب و هوشیار ازدل و جان خاک وطن دوست دار

حب وطن مهر و وفا آورد حب وطن صدق و صفا آورد
محترم این ملک چو مادر بدار هم وطن خویش برادر شمار
چشم به همراهی بیگانه پوش خویش به آبادی این خانه کوش

علی هذا حسام زادہ کی نظم "چند کلمه به پسران امروز" نهایت دل پذیر اور مهیج نظم هے —

اے غنچهٔ ناشگفته در باغ اے نوگل زیب بوستانی
اے جلوهٔ باغ و رونق راغ واے همدم روح آسمانی
واے قلب تو پاک تر ز گوهر
وز عطر صفاے دل معطر

در راهبری قوم گمراه داد سخن و مقال دادم
از شعلهٔ نالهاے جان کاه بلگداخت و سوخت بس نهادم
فریاد من از سپهر برشد
عقل از سروجان زتن بدرشد

چشم همه خیره خیره بر تو است بر خیز کنون نه وقت خوابست
آن گوهر شاهوار در تو است دیگر که نه طاقت و نه تاب است
در پوست چه چلهی ؟ برون آ
و آن گوهر و اصل خویش بنماے

مذکورهٔ بالا انتخابات اشعار کو پڑہ کر شاید ناظرین یه راے قایم کرلیں که آج کل کی شاعری میں فنی حیثیت کچهه بهی نهیں هے بلکه صرف

افادیت ہے - یہ خیال صحیح نہیں ہے - ایرانی مزاج وہی ہے جو ہمیشہ تھا' البتہ تعلیم مغربی کی میقل اور سیاسی حالات کے تصادم سے اس آئینۂ طبیعت پر اب ایک جلا نئی پیدا ہوگئی ہے - پروفیسر براؤن نے کتنی سچی بات لکھی ہے :-

"آن طبع گہر بار ایرانی کہ اشعار آبدار قدیمہ را بوجود درآوردہ نمردہ است" —

"ہنوز گویندگان ہستند اندر عراق کہ قوت ناطقہ مدد از ایشان برد بلکہ از زیر آن ہمہ ابر ہاے تاریک کہ صفحات این مملکت را فرا گرفتہ' باز آن روح فنا ناپذیر مانند آفتابے کہ زیر ابر نہفتہ پس از چندے با یک پرتو عالم فروزی دیگر جلوہ گر گشتہ است" -

چنانچہ شعریت کی اس روح فنا ناپذیر کے جلوے ناظرین کو آج کل کی ادبیات میں بھی بکثرت نظر آئیں گے - دور از کار تشبیہات و استعارات کی جگہ نئی اور سچی تمثیلات انہیں ملیں گی - مناظر فطرت کو جس حسن و خوبی کے ساتھ آج کل کے شاعر بیان کرتے ہیں' اس کی مثال قدماء کے یہاں بھی مشکل سے ملے گی - شب مہتاب کے ایک منظر کی تصویر ملاحظہ ہو :-

اوائل گل سرخ است وانتہاے بہار نشستہ ام سرسنگے کنار یک دیوار
جوار دژہ در بلند دامن کہسار فضاے شمیران اندک ز قرب مغرب تار

ہنوز بد اثر روز بر فراز اوین

چو آفتاب پس کوہسار پنہان شد ز شرق از پس اشجار مہ نمایان شد
ہنوز شب نہ شدہ آسمان چراغان شد جہان ز پرتو مہتاب نور باران شد

چو نو عروس سفید آب کردہ روے زمین

(عشقی)

رشید یاسمی نے چشمہ پر ایک نظم "آئینۂ سیال" کے عنوان سے لکھی ہے جو سر تا سر لطیف ترین تشبیہات سے مملو ہے ' ہم ذیل میں صرف چند بند ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

چہ خوش باشد بروے آب دیدن بر او رقصیدن مہتاب دیدن
بہ بیداری چنان خاطر فریبد کہ شام وصل یاران خواب دیدن

نسیم آید از و پر چین شود آب بلرزد قرص مہ چون لوح سیماب
دژم گردد چو روے مہ جبینے کہ ناگاہش برانگیزند از خواب

بجنبد بید را در آب سایہ چو طفلے خفتہ در آغوش دایہ
بود این سایہ را آن لطف و آن حال کہ در گفتار شیرینان کنایہ

چو ناگہ بر جہد در آب ماہی ز حیرت بیخود از جا جست خواہی
گمانت عکس مہتاب از دم باد روان بگرفت و شد در آب راہی

اسی طرح سے ملک الشعرا بہار کا ایک قصیدہ "دماوندیہ" ہے جس میں کوہ دماوند سے خطاب ہے ' ملاحظہ فرمائیے کہ کس قدر لاجواب تشبیہات سے کام لیا گیا ہے :-

اے دیو سپید پاے در بند اے گنبد گیتی اے دماوند
از سیم بسر یکے کلہ خود ز آہن بمیان یکے کمر بند

چون گشت زمین ز جور گردوں سرد و خفہ و خموش و آوند

بنواخت ز خشم بر فلک مشت آں مشت توی تو اے دماوند
تو مشت درشت روزگاری از گردش قرنہا پس افگند

پہاڑ کی چوٹی پر سفید برف کی چادر کی اس سے لطیف تر تشبیہ اور کیا ہو سکتی ہے:-

تو قلب فسردۂ زمینی از درد ورم نمودہ یک چند
تا درد و ورم فرو نشیند کافور برآن ضماد کردند

یا پھر گل نرگس کی یہ تشبیہ:-

بر دامن دشت بنگر آن نرگس مست چشمے برہ و سبز عصائے در دست
گوئی مجنون در انتظار لیلے از گور برون آمد و بر سبزہ نشست

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، قدیم طرز کی شاعری آج کل بھی ہوتی ہے لیکن بہت کم، چنانچہ اس مجموعہ میں بھی ناظرین کو اکثر شعراء کی غزلیات نظر آئیں گی - شوریدہ شیرازی، اور غمام ہمدانی کی بعض غزلیں اچھی بھی ہیں، لیکن حق یہ ہے کہ اس صنف شاعری میں قدماء جو کچھ کر گئے ہیں اس پر اضافہ ممکن نہیں ہے - غزلوں پر تجدد کا کچھ اثر ہوا ہے تو الفاظ کی حد تک - آج کل کی زبان نسبتاً آسان اور عام فہم ہے، لیکن اس میں وہ "رنگ تغزل" وہ شیرینی نہیں ہے - شوریدہ کی ایک غزل کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں تاکہ ناظرین اس کا اندازہ لگا لیں —

ہرچہ کنی بکن مکن ترک من اے نگار من ہر چہ بری ببر مبر سنگدلی بہ کار من
ہرچہ کشی بکش مکش بادہ بہ بزم مدعی ہرچہ خوری بخور مخور خون دل فگار من

هرچه دهی بده مده ' زلف بباد اے صنم   هرچه نہی' بنه منه ' دام برهگزار من
هرچه بری ' ببر' مبر ' رشتۂ الفت مرا   هرچه کنی' بکن' مکن' خانۂ اختیار من
هرچه هلی' بهل' مهل پردہ زروے چوں پری   هرچه دری بدر' مدر' پردۂ اعتبار من
هرچه روی ' برو' مرو ' راه خلاف دوستی   هرچه زنی ' بزن ' مزن ' طعنه بروزگار من
هرچه کشی ' بکش' مکش صید حرم که نیست خوش   هرچه شوی' بشو' مشو تشنه بخون زار من

بہار کے یہ اشعار بھی تغزل کا اچھا نمونہ ھیں :-

رخے تو دخلے بہ مہ نہ دارد   کہ مہ دو زلف سیہ نہ دارد
بہ ھیچ و جہت قمر نہ خوانم   کہ ھیچ وجہ شبہ نہ دارد
بیا بہ ملک دل ار توانی   کہ ملک دل پادشہ نہ دارد
لطافتے نیست' سیاستے نیست   عسس نہ دارد' سپہ نہ دارد
رفیق کم ظرف' زروے معنے   بود سبوے کہ تہ نہ دارد

یکے بہ گوید بہ آں ستمگر
بہار مسکیں گلہ نہ دارد

اسی سلسلہ میں ہم ملک الشعرا بہار کی ایک " پولٹیکل غزل " بھی نقل کئے دیتے ھیں ' جس سے ھمارے ناظرین یقیناً محظوظ ھوں گے - اس غزل میں خوب خوب سیاسی کلائے ھیں' اور نئی اصطلاحات کا استعمال کیا گیا ہے -

دل فریباں کہ بہ کابینۂ جاں جا دارند   مستبدانہ چرا قصد دل ما دارند

معشوق کی بیسویں صدی کی سیاسی تشبیہ ملاحظہ ہو :-

دلبران خودسر و هرجائی و روسی صفتند   ورنہ در خانہ غیر از چہ سبب جا دارند
گاہ لطف است و خوشی' گاہ عتابست و خطاب   تا چہ ازایں همہ پلتیک تقاضا دارند

(Politics)

خوبرویان اروپا * زچه در مردن ما حیله سازند کہ اعجاز مسیحا دارند
گرچه در قاعدۂ حسن سیاسات جمال مسلک آنست که خوبان اروپا دارند
عاشقان را سر آزادی و استقلال است کے ز پلتیک سر زلف تو پروا دارند
صف مژگان ترا دست سیاسی است دراز بانفوذیکه که بمعمورۂ دلها دارند

آج کل کے سیاسی قرضوں کی اس سے بہتر تشریح اور کیا ہو گی -

دل مسکین من از قرض یکے بوسہ گزشت باشروطے که لبان تو مہیا دارند
بچہ قانون، سیہ نازتوا ے ترک پسر در حدود دل یاران سر یغما دارند
این چہ صلحے است که در داخلۂ کشور دل خیل قزاق اشارات تو ماوا دارند
بکمیسیون † عرائض چه کلم شکوه ز تو که همه حال من بے دل شیدا دارند
ما بکوشیم دو چشمان تو قانع نه شویم زان که با خارجهان الفت و نجوا دارند
در پناه سر زلف تو بهار ستانے است که دراو هیئت دل مجلس شورا دارند
حکم فرمائے که در محکمۂ حسن و جمال هر چه آں حکم تو باشد همه مجرے دارند
رازداران تو در انجمن سرّی دل نطقے از رمز دهان تو تمنا دارند
دل غارت شده در محضر عدلیه ‡ عشق متظلم شد و چشمان تو حاشا دارند

سخن تازه عجب نیست ز طبعے تو بہار
که همه مشرقیاں منطق گویا دارند -

منقولۂ بالا غزل سے ناظرین کو ایرانی ظرافت کا بھی اندازہ ہوگا - ایرانی مزاج بالطبع ظریف و ظرافت پسند واقع ہوا ہے ' یہی وجہ ہے کہ ظریفانہ نظمیں اور اشعار انقلاب ایران کے بڑی حد تک محرک ہوئے ہیں -

* یورپ -

† کمیشن -

‡ ہای کورٹ -

اس تالیف میں بھی اس کے نمونے جا بجا نظر آتے ھیں' اشرف الدین اشرف کے کلام کی جہاں ایک خصوصیت یہ ھے کہ سادہ ترین الفاظ میں عوام کے جذبات کو تحریک دیتے ھیں ' وھیں ظرافت بھی ان کے اشعار کی ایک خصوصیت خاصہ ھے - اس مجموعہ میں ان کی ایک نظم " خطاب بفرنگیاں " ھے جو طنز اور ظرافت کا اچھا نمونہ ھے —

اے فرنگی ما مسلمانیم ' جنت مال ماست
در قیامت حور و غلمان ناز و نعمت مال ماست

گر زنی بے سیم از دریا بہ ساحل تلگراف
گر کنی خلق فرامافون و سلما توگراف
ور نمای بحر خود ازاطلس و مخمل لحاف
سندس و استبرق اندر باغ جنت مال ماست

خواب راحت، عیش و عشرت ' نازو نعمت مال ماست

شیخی ازما ' بابی ازما پطر و ناپلیون * زتو
دھری ازما ' صوفی ازما ' مکتب و قانون زتو
خرقہ و عمامہ ازما ' کشتی و بالون † زتو
گم شواے احمق ' مجاز از تو حقیقت مال ماست

حور و غلمان باغ رضوان ' عیش و عشرت مال ماست

مذکورۂ بالا سطور میں ھم نے جو اقتباسات دیے ھیں ' ان سے ناظرین کو جدید ایرانی ادبیات کا بخوبی اندازہ ھوجاے گا' اور یہی اس طول کلامی کے لیے ھمارا عذر ھے - فاضل مولف سے ھمیں صرف یہ شکایت ھے کہ

---

* Peter نپولین - † بے لون -

انہوں نے اس قابل قدر تالیف میں ادبی تنقید سے قصداً دریغ کیا ہے، اور محض شعرا کے حالات و کلام کو پیش کردیا ہے تاکہ ناظرین خود اپنی ذاتی راے قائم کرلیں۔ اگر وہ آزادی کے ساتھہ آج کل کی شاعری پر نقد و تبصرہ فرماتے، تو ہمارا خیال ہے کہ اس کتاب کے ایرانی ناظرین کو اس کا اندازہ ہوتا کہ ان کی ادبیات دوسرے ممالک میں کس نظر سے دیکھی جاتی ہے - دوسری شکایت یہ ہے کہ شعرا کے انتخاب میں کوئی معیار قائم نہیں کیا گیا، ہم کئی ایسے شعرا کا نام بتا سکتے ہیں جنہیں اس مجموعہ میں جگہ پانے کا کوئی حق ہی نہیں ہے، اور جو بقول آقاے جمال زادہ :—

" مکسان معرکہ و نخود ہمہ آشے می باشند، نام و نشان آنہا عموماً .
با خود ایشان و گاہے نیز خوش بختانہ قبل از خود شان بگور می رود "

" سخنوران ایران در عصر حاضر " فارسی زبان میں ہے، اور حق یہ ہے کہ آج کل کی ایرانی انشا پردازی کی بہترین خصوصیات کی حامل ہے - اس کو پڑھ کر ہندوستان کے فارسی دان طبقہ کو معلوم ہوگا کہ آج کل کی فارسی نثر کا رتبہ کیا ہے، اور قدیم مرصع اور مقفیٰ عبارت کی بجاے اب صفائی اور سلاست کس حد تک اس کا جزو ہے - ہمیں فخر ہے کہ ہمارے ملک کا ایک اہل قلم فارسی نگاری میں اس قدر بلند پایہ رکھتا ہے '

ہمیں امید ہے کہ ہندوستان کے ہر کتب خانہ میں اس تالیف کا نسخہ ضرور خریدا جاے گا اور صاحب ذوق حضرات فاضل مولف کی ہمت افزائی فرمائیں گے - کتاب کی قیمت ۱۹ روپیہ ہے، جو اس کے مواد، فاضل مولف کی محنت اور اعلیٰ درجہ کی طباعت کو دیکھتے ہوے کچھہ زیادہ نہیں ہے - (و-ہ-ا-ج)

مراۃ المثنوی

(مرتبۂ قاضی تلمذ حسین صاحب ایم اے - رکن دارالترجمہ، حیدرآباد دکن)

مولوی رومی رحمۃ اللہ علیہ کی شہرۂ آفاق مثنوی دنیا کے ادبیات میں نہایت ممتاز مرتبہ رکھتی ہے اور اخلاق و معارف دینیہ کی لطیف و دلنشین تشریح کرنے میں اس کا کوی مثل و عدیل نہیں نظر آتا - صرف ڈینٹی کي نظم "ڈوائن کومیڈیا" کو بعض مستشرقین مثنوی کے مقابلے میں پیش کرتے ہیں لیکن ادبی محاسن سے قطع نظر کرلی جاے، تو معنوی خوبی اور جامعیت کے اعتبار سے یہ کتاب مثنوی کے سامنے کچھہ وزن نہیں رکھتی- اور صرف اسی کتاب کا مثنوی کے مقابلے میں پیش کیا جانا مولوی رومی رح کے ثبوت افضلیت کو زیادہ آسان بنادیتا ہے ..

ہندوستان کے مسلمانوں میں فارسی سے روز افزوں بیگانگی کے باوجود، غالباً اس زبان کی کوی کتاب مثنوی کے برابر مقبول نہیں ہے لیکن حق یہ ہے کہ ابھی اس کے افادے کو عام اور مطالب کو سہل و دلپسند پیرایوں میں مروج کرنے کی بہت ضرورت باقی ہے - پچھلی دو تین صدی میں اس کی جو شرحیں لکھی گئیں، اُن کی وجہ سے مثنوی اور بھی دشوار شے سمجھی جانے لگی - دوسرے اس کی ضخامت اور بیان کی پیچیدگی قبول عام پانے میں حائل رہی - یہی سبب ہے کہ ہمیں یہ دیکھہ کر نہایت خوشی ہوی کہ ہمارے فاضل دوست قاضی تلمذ حسین صاحب نے مذکورۂ بالا ضروریات کا بالکل صحیح اندازہ کیا اور مثنوی کی ترتیب کو بدل کر ایسی

عمدہ صورت میں پیش کیا کہ اس سے بہتر آج تک کسی نے اُسے مرتب نہ کیا ہوگا - مولوی رومی رح کا بڑا کمال بلکہ اعجاز، حکایات و تمثیلات ہیں لیکن اکثر حکایتوں کے درمیان کوی دوسری حکایت یا بحث چھڑ جاتی ہے اور اصل حکایت کا تسلسل قائم نہیں رہتا - جو لوگ مثنوی شریف کا عقیدت مندی اور باقاعدہ محنت کے ساتھہ مطالعہ کرنا چاہتے ہیں، ان کے لئے اس گسستہ بیانی سے کچھہ حرج نہیں مگر عام ناظرین کو ضرور پریشانی لاحق ہوتی ہے اور وہ کتاب سے پورا استفادہ نہیں کرسکتے - اس لئے پہلے بھی بعض بزرگوں نے مثنوی کے معارف و حکم اور حکایات کو علیحدہ علیحدہ جمع کرنے کی کوشش کی ہے مگر ہم خیال کرتے ہیں کہ اس معاملے میں قاضی تلمذ حسین صاحب کی سالہا سال کی محنت کا یہ نتیجہ سب سے زیادہ مفید و مکمل ہے - انہوں نے تمام حکایات کو مسلسل کردینے کے علاوہ، مولوی رومی رح کی اخلاقی تعلیمات کو تفصیلی عنوانات کے تحت میں علیحدہ جمع کیا ہے - پھر آیات قرانی اور احادیث نبوی (ص) کے مستقل ابواب مرتب کئے ہیں - سورۂ فاتحہ سے لے کر ترتیب قرآن کے مطابق کتاب اللہ کے جو اقتباسات مثنوی میں آے ہیں، انہیں سلسلہ وار نقل کیا ہے - اور "لآلی سلن" میں ہر حدیث کے پہلے لفظ کو لیکر بہ ترتیب حروف تہجی یہ احادیث اور متعلقہ اشعار درج کئے ہیں - آخر میں بسیط فہرستیں اور لغات مثنوی کی نہایت کارآمد فرہنگ لگائی ہے اور اس طرح عام کتابی تقطیع کے گیارہ سو صفحات پر اپنی اسم بامسمی کتاب مراۃ المثنوی کو پایۂ اتمام کو پہنچایا ہے - اسے بھی جناب قاضی صاحب کی کرامت یا مولوی رومی رح کا روحانی تصرف سمجھنا چاہئے کہ اتنی بڑی کتاب حیدرآباد کے ایک مطبع میں ایسی خوشخط اور دیدہ زیب چھپی ہے کہ اردو کی

بہترین مطبوعات میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ اعلی درجے کی چرمی جلد پر مطلا حروف میں کتاب کا نام چھپا ہوا ہے اور ان سب اوصاف کے باوجود اس کی قیمت صرف دس روپیہ کلدار رکھی گئی ہے جو کچھ بھی نامناسب نہیں معلوم ہوتی' اس سلسلے میں صاحب مثنوی رح کی سیرت اور شاعری پر دو اور مبسوط کتابیں زیر طبع ہیں اور چونکہ یہ سب کام فاضل مرتب کی پر شوق و خلوص عرق ریزی کے علاوہ مصارف کثیر چاہتے ہیں' اس لئے اور بھی ضروری ہے کہ اہل ذوق میں مراۃ المثنوی کو وہ اشاعت اور قبول عام حاصل ہو جس کی وہ ہر طرح مستحق ہے —

(ش)

مصحفی کے تذکرے

(۱) تذکرۂ ہندی' صفحات علاوہ مقدمۂ مرتب ۲۸۳
قیمت غیر مجلد ایک روپیہ دس آنے مجلد دو روپے

(۲) ریاض الفصحا صفحات علاوہ مقدمۂ مرتب ۳۷۹
قیمت غیر مجلد دو روپے آٹھ آنے مجلد تین روپے

(۳) عقد ثریا صفحات علاوہ مقدمۂ مرتب ۹۴
قیمت غیر مجلد ۱۲ آنے مجلد ایک روپیہ دو آنے

ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اردو- اورنگ آباد دکن

مصحفی اردو زبان کا مشہور استاد اور پختہ گو شاعر ہے۔ اس کی تصانیف بکثرت ہیں جن میں شاعروں کے تین تذکرے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ اب تک گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے اور عام دسترس سے باہر تھے۔ انجمن ترقی اردو نے ان تینوں تذکروں کو خاص اہتمام سے طبع کرکے

شایع ہوا ہے - ان میں پہلا تذکرہ تقریباً دوسو اردو گو شعرا کا ہے جو ابتدا سے لے کر شاہ عالم ثانی کے زمانے تک ہوے ہیں - ان میں سے اکثر شاعر مولف کے ہم عصر تھے اس لئے ان کی نسبت جو اطلاعات اس میں درج ہیں وہ بڑی حد تک مستند اور معتبر ہیں - یہ تذکرہ سنہ ۱۲۰۱ ھ سے قبل لکھا جانا شروع ہوگیا تھا اور ۱۲۰۹ ھ میں ختم ہوگیا تھا —

دوسرا تذکرہ ریاض الفصحا ان اردو گو شاعروں کے حالات اور کلام پر مشتمل ہے جن کا ذکر تذکرۂ ہندی میں نہیں ہے ' اس کی وجہ تالیف جدید موزوں طبع شاعروں کی کثرت ہے - اس میں تقریباً سوا تین سو شاعروں کا ذکر ہے ' یہ تذکرہ ۱۲۲۱ اور ۱۲۳۶ کے مابین لکھا گیا ہے -

تیسرا تذکرہ عقد ثریا ہے ' اس کا سنہ تالیف اول الذکر دونوں تذکروں سے قبل یعنی ۱۱۹۸ ہجری ہے - یہ تقریباً ڈیڑھ سو فارسی گو شاعروں کا تذکرہ ہے جس میں تین قسم کے شاعر ہیں - (۱) وہ ایرانی شعرا جو کبھی ہندوستان نہیں آے - (۲) وہ شعراے ایران جو ہندوستان آے (۳) ہندوستانی فارسی گو شعرا -

اس تذکرہ میں مصحفی نے ہر شاعر کے کلام کا انتخاب بھی درج کیا تھا لیکن غالباً فارسی کلام کو غیر ضروری سمجھ کر اور بخوف طوالت اس کو یہاں حذف کردیا ہے تاہم تمام شاعروں کے حالات بے کم و کاست درج کئے گئے ہیں —

مصحفی حاتم سے لے کر آتش تک ذاتی ملاقات رکھتا تھا گویا اردو شاعری کے تین ممتاز دوروں کے شاعروں کو اس نے دیکھا ہے - اس لئے اس کی معلومات خاص اہمیت رکھتی ہیں - ان تذکروں میں مصحفی نے جگہ جگہ شاعروں کے خانگی حالات اور اس زمانے کے معاشرتی و تاریخی

واقعات بھی لکھہ دیے ھیں - یہ صرف مصحفی ھی لکھہ سکتا تھا اس لئے کہ اس نے بڑی طویل عمر پائی اور مختلف دوروں کے شاعروں سے ذاتی واقفیت بھی رکھتا تھا - ان تذکروں میں جا بجا شاعروں کے کلام پر تنقیدیں بھی ھیں جو صاف صاف بیان کردی گئی ھیں - ان میں بعض ایسی ھوسکتی ھیں کہ جن سے آج اختلاف ھوسکتا ھے لیکن بعض اساتذہ کے متعلق اس نے جو غور و تامل کے بعد رائیں دی ھیں وہ نہایت سنجیدہ اور قابل قبول ھیں - قدیم یعنی عہد محمد شاہ سے قبل کے اردو گو شاعروں کو مصحفی نے تقریباً نظر انداز کردیا ھے - صرف چند شاعروں کا ذکر لکھا ھے لیکن عہد محمد شاہ سے لے کر شاہ عالم اور آصف الدولہ کے زمانے تک کے شاعروں کے حالات اس نے قلم بند کیے ھیں - کہیں کہیں حالات و واقعات کی صحت مشتبہ نظر آتی ھے - یہ صرف مصحفی کے ساتھہ مخصوص نہیں ھمارے اکثر تذکروں کا یہی حال ھے —

پہلے دو تذکرے اردو شاعروں کے حالات پر مشتمل ھیں جن سے بہت سے شاعروں کے حالات روشنی میں آتے ھیں اور بہت سی نئی اطلاعات ملتی ھیں اور جن شاعروں کے کلام محفوظ نہیں ھیں ان کا منتخب کلام ھمیں ان تذکروں میں آسانی سے مل جاتا ھے - عقد ثریا حالانکہ فارسی گو شاعروں کا تذکرہ ھے لیکن اس میں اکثر ایسے شاعروں کا ذکر ھے جو اردو میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے - اس لئے یہ تینوں تذکرے اردو ادب کی تاریخ میں بہت سی باتوں کا اضافہ کرتے ھیں - اردو ادب سے ذوق رکھنے والوں کے لئے ان کا مطالعہ ناگزیر ھے —

ان تینوں تذکروں کو مولوی عبدالحق صاحب مد ظلہ نے نہایت صحت و عمدگی سے مرتب کیا ھے اور ایک مقدمہ لکھا ھے جس میں مصحفی کے

سوانح حیات وغیرہ نہایت تحقیق کے ساتھہ قلم بند ہوے ہیں۔ مصحفی کے حالات اب تک اتنی صحت کے ساتھہ نہیں لکھے گئے تھے مقدمے میں تذکروں پر بھی تنقید کی ہے اس میں ضمناً بہت سی دلچسپ اور مفید باتیں آگئی ہیں - تذکروں کی طباعت و کتابت بھی نہایت خوشنما ور پاکیزہ ہے —

انجمن ترقی اردو نے تذکروں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے چنانچہ اب تک کئی تذکرے خاص تلاش سے فراہم کرکے شایع کیے جا چکے ہیں - اب انجمن کے پیش نظر قدرت اللہ شوق اور فتوت اورنگ آبادی کے تذکرے ہیں جن کو انجمن مرتب کرچکی ہے اور عنقریب شایع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے - مصحفی کے تذکروں کے ساتھہ انجمن نے گلزار ابراہیم کو بھی شایع کیا ہے —

(چ)

گلزار ابراہیم

صفحات مع مقدمات وغیرہ ۳۷۰ لکھائی چھپائی اور کاغذ نہایت عمدہ

قیمت مجلد دو روپے آٹھہ آنے غیر مجلد دو روپے

ملنے کا پتہ :- انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن

یہ ۳۲۰ اردو گو شاعروں کا تذکرہ ہے جو ۱۱۹۸ ھ کے پس و پیش زمانے میں تحریر ہوا ہے - اس کے مولف نواب علی ابراہیم خاں خلیل ہیں جو وارن ہیسٹنگز کے زمانے میں بنارس کے چیف مجسٹریٹ تھے اور بعد کو

گورنر بھی ہوگئے تھے - انہوں نے اپنے ذاتی شوق اور عہدہ کے اثر سے بہت سے شاعروں کے حالات اور کلام کو یکجا جمع کیا اور حتی الامکان بقید سنین اپنے تذکرہ کو مرتب کیا ہے - اس تذکرہ کی بناء پر جان گلکرسٹ کی فرمایش پر علی لطف نے ۱۲۱۵ ھ میں اپنا تذکرہ گلشن ہند لکھا جو ۲۸ سال قبل مولوی شبلی مرحوم کی تصحیح وتحشیہ اور مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کے مقدمہ کے ساتھہ شایع ہوچکا ہے - گلشن ہند میں صرف ۶۸ شاعروں کا حال ہے جو گلزار ابراہیم سے انتخاب کرکے اردو میں منتقل کیا گیا ہے - ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور نے گلزار ابراہیم کو مرتب کیا ہے - اس کی ترتیب میں یہ التزام رکھا ہے کہ گلشن ہند میں جن شاعروں کا حال تھا اس کو اردو میں علی لطف ہی کے الفاظ میں درج کیا ہے اور جہاں جہاں علی لطف نے حذف یا اضافہ اور ترمیم و تبدیل کی تھی اس کو بتا دیا ہے - بقیہ ۲۵۲ شاعروں کے حالات علی ابراہیم کی فارسی عبارت میں ہیں - صرف ۶۸ شاعروں کے حالات اردو میں علی لطف کے تحریر کردہ ہیں - اسی طریقے سے گلشن ہند اور گلزار ابراہیم دونوں ایک جلد میں آگئے ہیں اور اسی بناء پر مرتب نے مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کا مقدمۂ گلشن ہند اس میں شریک کردیا ہے اور خود گلزار ابراہیم پر ایک علحدہ مقدمہ لکھا ہے جس میں دونوں تذکروں کے بیانوں کے اختلاف وغیرہ کی نوعیت پر بہت جامعیت سے بحث کی ہے - فاضل مرتب نے کتاب کے آخر میں اشاریہ (انڈکس) لگا کر اسے اور زیادہ مفید بنا دیا ہے - ڈاکٹر صاحب اگر مولف کے مختصر حالات تحریر فرما دیتے تو اچھا تھا —

گلزار ابراہیم کے مولف نے بڑی تلاش و جستجو اور محنت و استقلال سے کام لیا ہے لیکن اس پر بھی وہ تمام فروگذاشتیں اس میں موجود

میں جو عام طور سے ہمارے تذکروں میں پائی جاتی ہیں - ڈاکٹر صاحب نے اس کی اہمیت کو طرح طرح سے جتایا ہے اور لکھا ہے کہ کئی اطلاعیں اس میں ایسی ملتی ہیں جو دوسرے تذکروں میں مفقود ہیں ' ان کا بیان ہے کہ مرثیہ گوئی کی ترقی کے "جس قدر ثبوت گلزار ابراہیم سے حاصل ہوتے ہیں اس زمانے کے شاید ہی کسی اور تذکرہ سے مل سکیں " مثلاً مرتب نے انسان، خلیفہ ' شاہی، صبر وغیرہ مرثیہ گویوں کے نام پیش کیے ہیں جن کا اس تذکرہ میں ذکر ہے - لایق مرتب کو غالباً یہ علم نہیں کہ ان شاعروں کی مرثیہ گوئی کی نسبت میر حسن شوق وغیرہ علی ابراہیم سے قبل لکھ چکے ہیں ' چنانچہ اس سے قبل کے تذکروں میں کئی مرثیہ گویوں کے نام ملتے ہیں - اسی طرح مثنویوں اور دیگر نظموں کے متعلق بھی مرتب نے یہی خیال ظاہر کیا ہے اور مختلف نو نظموں کے نام درج کیے ہیں - حالانکہ ان میں کوئی نظم بھی ایسی نہیں جن کا ذکر اس سے قبل کے تذکروں میں درج نہ ہو -

ہر تذکرے میں کچھ نہ کچھ خامیاں ضرور نظر آتی ہیں لیکن علی ابراہیم کی بعض فرو گذاشتیں تعجب خیز ہیں ' مثلاً وہ بے کل دولت آبادی کو عزلت کا شاگرد بتاتے ہیں حالانکہ وہ آزاد بلگرامی کا شاگرد تھا اس نے خود اپنے تذکرہ نالیف بے نظیر میں اس کا ذکر فخریہ کیا ہے - اس تذکرہ میں عزلت کے بھی حالات درج ہیں لیکن صرف ایک ملاقات کا حوالہ ہے جو اتفاقاً مولف سے دولت آباد میں ہوئی تھی- اس طرح اپنے ایک ملاقاتی فقیر درد مند کا نام فقیر لکھا ہے اور اس کو عظیم آبادی لکھا ہے حالانکہ درد مند اودگیر (دکن) کا باشندہ تھا اور مظہر کا خاص شاگرد - مرزا عارف الدین خاں عاجز اورنگ آبادی کو عارف علی خاں اکبر آبادی لکھا ہے - حالانکہ عارف اکبر آبادی ایک دوسرا شاعر ہے جس کا ذکر میر وغیرہ نے کیا ہے -

مولف نے کئی گم نام اور کم حیثیت شاعروں کو اپنے تذکرے میں جگہ دی ہے لیکن بعض مشہور شاعروں کو چھوڑ دیا ہے - اسی طرح اور کئی فرو گذاشتیں ہیں - اگر مرتب ان کا مقابلہ دوسرے تذکروں سے کر لیتے تو بہت آسانی سے یہ چیزیں معلوم ہو جاتیں —

گلزار ابراہیم کے مستند ہونے میں شبہہ نہیں - اس میں معاصرین کے حالات بہت عمدگی سے مدون ہوے ہیں اور ان کے متعلق بہت سی کار آمد باتیں ملتی ہیں - غلطیوں سے تو شاید ہی کوئی تذکرہ بچا ہو - انجمن کے پیش نظر چند اور تذکرے بھی ہیں ان کی اشاعت کے بعد کیا اچھا ہو اگر ان سب کا ایک انڈکس تیار ہو جاے اور ان کی غلطیوں اور اختلاف کو ایک علحدہ جلد میں شائع کیا جاے - یہ بہت کام کی چیز ہوگی اور انجمن کو ضرور اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے —

(چ)

تاریخ اسلام (جلد سوم)

(مصنفۂ اکبرشاہ خاں صاحب نجیب آبادی - مطبوعۂ منیجر صاحب رسالۂ صوفی)

اس تاریخ کے پہلے دو ابواب (۱۱ و ۱۲) میں اسلامی اُندلس کی تاریخ ہے - ایک ایک باب میں ممالک افریقیہ ' چنگیزی مغول اور پھر دولت عثمانیہ کے حالات (سلطان سلیم فاتح کی وفات تک) تحریر کئے

ھیں - خاتمہ کے عنوان سے اقوام اسلامی کے اسباب انحطاط پر اجمالی بحث اور پھر ایک پر جوش مناجات (نثر میں) لکھہ کر اس جلد کو ختم کردیا ھے - فاضل مصنف کا بیان کافی سلیس و شگفتہ اور پر مغز ھے اور ھمیں امید ھے کہ مسلمان طلبہ جنھیں اسلامی تاریخ سے دلچسپی ھے ' اس کتاب سے بخوبی استفادہ کرسکیں گے - اگرچہ اس کا طرز عہد جدید کی تاریخ نویسی سے مطابقت نہیں رکھتا - لائق مصنف نے اپنے کسی ماخذ کا حوالہ نہیں دیا - نہ کہیں یہ اعتراف کیا کہ کن کتابوں سے عبارتیں کی عبارتیں نقل یا تلخیص کی گئی ھیں - وہ واقعات کو غور و تجسس سے سمجھہ کر لکھنے یا دل نشین کرنے کی بجائے اختصار و تسلسل تاریخی کے ساتھہ لکھتے چلے گئے ھیں - البتہ کہیں کہیں فرنگی مورخوں کی تردید کی ھے اور اپنے ھم قوموں کو عبرت و غیرت دلانے کا موقع ھاتھہ سے نہیں دیا ھے - خدا کرے ان کی سعی مشکور ھو - کتاب چار سو صفحات پر چھپی ھے - قلم باریک اور کاغذ ادنی درجے کا ھے - تین روپیہ قیمت پر دارالاشاعت صوفی - پنڈی بہاءالدین (پنجاب) سے طلب کی جاسکتی ھے -

(ھ)

حیات نادر

(تالیف جناب محمد حسین خاں صاحب سابق رئیس
تدریسات عمومی افغانستان - مطبوعۂ مانڈہ پریس جالندھر)

محمد حسین خاں صاحب بی - اے (علیگ) مشہور مصنف اور ماھر تعلیمات ھیں - افغانستان میں اکیس سال تک سررشتۂ تعلیمات کے اعلی افسر رہے-

جو واقفیت ان کو اس مملکت اور وہاں کے مختلف حالات سے ہے وہ شاید ہی ہندوستان کے کسی باشندے کو ہو۔ افغانستان کے متعلق وہ اس سے قبل بہت کچھہ لکھہ چکے ہیں - اور ان کا لکھا ہوا بلا شبہہ مستند اور قابل اعتماد ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے نادرشاہ مرحوم کی زندگی کے حالات' ان کے خصائل و عادات اور ملک میں ان کی وجہ سے جو امن اور ترقیاں ہوئیں ان سب کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے - اور ضمناً شاہ مرحوم کے بھائیوں اور ان کے فرزند و جانشین محمد ظاہر شاہ کے حالات بھی آگئے ہیں - کتاب پڑھنے کے قابل ہے -

تاریخ سلطنت خداداد

(مولفۂ جناب محمود خان محمود بنگلوری صفحات ۴۹۱ - قیمت چار روپے - ملنے کا پتا : محمد سراج الدین نمبر ۹۴ بلا کھلی روڈ ' بنگلور)

ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے انحطاط پر ایک عام پریشانی اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی - ہر صوبہ اور علاقہ انانیت کا دم بھر رہا تھا اور خود مختاری کے خواب دیکھہ رہا تھا - سارے ملک میں کش مکش' جد و جہد اور جنگ وجدل کا بازار گرم تھا - اس ہماہمی کے عالم میں جنوبی ہند میں دو ایسے جوانمرد' شیردل بہادر نمودار ہوے جن کے نام اور کام تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے - اور جوں جوں تاریخ کے چہرے سے تعصب و ناانصافی کے پردے اٹھتے جائیں گے' اِن کی بے مثل شجاعت و دلیری' ان کی حب وطن' ان کا انصاف و بے تعصبی' ان کے انتظام کی خوبیاں

اور دو راندیشیاں روز بروز اجا گر ہوتی جائیں گی —

محمود خاں صاحب محمود نے تعصب اور بے انصافی کے اس تاریک پردے کے اٹھانے کی کوشش کی ہے - فاضل مولف نے نہایت تحقیق اور کاوش سے نیز مختلف زبانوں کی تاریخوں کے مطالعہ کے بعد اس کتاب میں نواب حیدر علی خاں اور ٹیپو سلطان کے حالات و انتظامات اور جنگ آزمائیاں تفصیل سے بیان کی ہیں اور اُن غلط اور بے بنیاد اتہامات کے محققانہ جواب دیے ہیں جو مخالفوں نے اِن بہادر اور جری باپ بیٹوں کے نسبت کتابوں میں لکھہ لکھہ کر مشہور کر رکھے ہیں اور بسا اوقات انہیں کے ہم قوم مورخوں اور مدبروں کے بیانات پیش کرکے ان کے الزامات کی تغلیط کی ہے - مجھے خوب یاد ہے مولوی بشیرالدین احمد (بانیء اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ) ایک مدت سے بیتاب تھے کہ کیوں کوئی حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے حالات تحقیق و صحت کے ساتھہ نہیں لکھتا - آج ان کے صدہا ہم خیال بزرگوں کی دیرینہ آرزو پوری ہوگئی - حقیقت یہ ہے کہ محمود صاحب نے ایسا اچھا اور بڑا کام کیا ہے کہ اُس کی جتنی تعریف کی جاے کم ہے - نواب حیدر علی اور سلطان شہید کے حالات و انتظامات کا کوئی شعبہ اور ادنیٰ سا ادنیٰ اور جزوی سا جزوی صیغہ بھی ایسا نہیں جو مصنف کی نظر سے بچا ہو - نبرد آزمائی اور جنگ جوی کے ساتھہ اُن کے مالی ' فوجی ' بحری انتظامات ' ان کی رواداری اور بے تعصبی ' ان کی عمارات اور سکے ' ان کی قدردانیاں ' ان کی دوراندیشیاں اور پیش بینیاں ' ان کا تدبر اور مصلحت اندیشی ' اُن کے حریف ان کے وزرا و امرا غیرہ سب کا ذکر آگیا ہے —

ان کی شجاعت و دلیری ' انتظامی قابلیت ' انصاف پسندی اور

تدبر و دور اندیشی کو دیکھہ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان کی حکومت کو کیوں زوال ہوگیا - جنھیں کسی لڑائی میں شکست نہوئی ہو ' جنھوں نے ایک ہی وقت میں تین تین دشمنوں کی فوجوں کو پسپا اور پامال کیا ہو ' جن کی رعایا ان کی جاں نثار ہو ' جن کے انتظام سے ہندو مسلمان سب (بقول انگریزی مورخوں کے) اس قدر خوش‌حال اور فارغ البال ہوں کہ انگریزی رعایا کے خواب میں بھی کبھی ایسی خوش حالی نہ آئی ہو وہ کیوں مٹ گئے ؟

یہ صحیح نہیں ہے کہ قومی زوال کے زمانے میں شجاع اور فدائے قوم و ملت یا صاحب دماغ لوگ نہیں ہوتے : ضرور ہوتے ہیں اور اکثر بے مثل اور بے نظیر ہوتے ہیں - لیکن قومی اخلاق میں اس قدر پستی اور انحطاط پیدا ہوجاتا ہے کہ لوگ اُن کا ساتھہ نہیں دیتے یا نہیں دے سکتے- یہی نہیں بلکہ ان میں خود غرضی اور حسد کا ایسا قوی مادہ پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ ان مخلصوں کے ہر کام کو مٹانے اور ان کے وجود کو فنا کرنے میں مصروف ہوجاتے ہیں —

سلطنت خداداد کا زوال غداری کی صورت میں نازل ہوا - دنیا میں جب تک تاریخ کا وجود ہے میر صادق ' میر غلام علی ' میر قمرالدین ' بدرالزماں نائطہ اور پورنیا پر لعنت برستی رہے گی - جو اصل حقیقت سے واقف ہونا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں —

کتاب بہت اچھے کاغذ پر چھپی ہے اور ۱۴ تصویریں اس میں شامل ہیں جن میں بعض بہت عبرتناک ہیں —

ایکناتھ

(مولفۂ شیخ چاند صاحب ایم۔ اے' ایل ایل - بی' ری سرچ
سکالر عثمانیہ یونیورسٹی - صفحات ۱۳۰ قیمت ۱۲ آنے
انجمن ترقی اردو سے مل سکتی ہے)

پٹن دریاے گوداوری کے کنارے ممالک محروسہ سرکار عالی کا نہایت قدیم شہر ہے' کسی زمانے میں یہ پنڈتوں کا استھان' علوم سنسکرت کا گھر اور ہندؤں کا بڑا تیرتھ تھا - اب ایک معمولی قصبہ ہے - اس وقت بھی تاریخ کے دلدادہ اس اجڑے گانو کی زیارت کو جا پہنچتے ہیں -

ایکناتھ کا جنم بھوم بھی پٹن تھا - شیخ چاند صاحب نے اپنے اس ہم وطن سادھو شاعر کے حالات اور کلام پر یہ کتاب لکھ کر اپنی حب وطن ہی کا ثبوت نہیں دیا بلکہ اردو ادب میں بھی اضافہ کیا ہے —

ایکناتھ بڑے پایہ کا سادھو اور مصلح ہوا ہے اور اس کے ساتھ ہی مرہٹی کا بہت بڑا شاعر بھی ہے - یوں تو اس کی کئی کتابیں ہیں لیکن اس کی سب سے بڑی تصنیف بھاگوت ہے - ایکناتھ نے دنانیشور کے بعد مرہٹی زبان کے زندہ کرنے اور رواج دینے میں بڑا کام کیا ہے - اس کا اثر مرہٹی شاعری اور مرہٹی سادھوؤں اور مہاراشٹر کی اخلاقی اور مذہبی زندگی پر اب تک ہے —

مسلمانوں میں بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی مادری زبان کے

علاوہ ہندوستان کی دوسری زبانوں میں بھی مہارت حاصل کرتے ہوں اور وہاں کے معلومات سے اپنی زبان کو فیض پہنچاتے ہوں - اس لحاظ سے شیخ چاند صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے مرہٹی زبان کے ایک اعلی شاعر اور مہاراشٹر کے بہت بڑے سادھو' معلم اور مصلح کے حالات و تعلیمات کو ایسی پاک صاف اور اچھی اردو میں بیان کیا ہے —

سیر الصحابہ

(جلد ششم و ہفتم - تالیف مولوی شاہ معین الدین احمد رفیق دار المصنفین)

صحابۂ رسول (صلی اللہ علیہ و سلم) کے حالات کو اردو میں چھاپنے کا جو مفید سلسلہ دارالمصنفین اعظم گڑہ نے شروع کیا تھا ' اس کی یہ آخری دو جلدیں ہیں - جلد ششم میں حسنین ' امیر معاویہ ' اور عبداللہ ابن زبیر (رضی اللہ عنہم) کے حالات لکھے ہیں اور ہفتم میں ڈیڑہ سو ایسے صحابہ کے تراجم ہیں جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوے یا عہد رسالت میں صغیرالسن تھے - مگر ان حضرات کے اوصاف و اخلاق پڑھکر شاید اور بھی بہتر اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُس چشمۂ نور و ہدایت کا اثر کتنا انقلاب انگیز تھا کہ جنہیں صرف چند جرعے میسر آے' انہیں بھی عمر بھر کیف و سرشاری رہی -

چہ مستی ست ندانم کہ روبما آورد
کہ بود ساقی و ایں بادہ از کجا آورد

لیکن حصۂ ہفتم کی نسبت ' جلد ششم کو لکھنا رس اعتبار سے دشوار تر تھا کہ اس جلد میں بہت سے ایسے تاریخی اور "اعتقادی" واقعات سے

بحث کرنی پڑی جن کی بدولت ملت اسلامی میں نسل هانسل تک خانہ جنگی رهی اور خون کی ندیاں بہای گئیں- حتیٰ کہ آج تک نہ صرف اختلاف بلکہ بعض اسلامی فرقوں میں دوسروں سے کینہ و عناد موجود ہے - نظر براین فاضل مولف همارے نزدیک مبارک باد کے مستحق هیں کہ هر جگہ ایک راسخ‌العقیدہ سنی مسلمان رهنے کے باوصف انہوں نے انصاف و معقولیت کا دامن هاتھہ سے جانے نہیں دیا اور کہیں بھی ایسی شدت اختیار نہیں کی جو اختلاف راے کے باوجود کسی فریق کی دل آزاری کا موجب هو - باقی ' ان کی خوش اعتقادی کی مثال میں یہی لکھنا کافی هوگا کہ واقعۂ کربلا کی انہوں نے جملہ تفصیلات اور انفرادی مقابلوں تک کے حالات ڈھونڈ ڈھونڈ کر جمع کر دیے هیں بحالیکہ مدینۂ مبارکہ کے سقوط اور غارتگری کو صرف چند سطروں میں ختم کر دیا ہے - اگرچہ همارے خیال میں سیاسی اور تاریخی اهمیت کے علاوہ ' اعتقادی نظر سے بھی یہ واقعہ کچھہ الم ناک نہ تھا اور غالباً یزید کی ذاتی شقاوت کا کربلا سے بھی بڑھ کر یقینی ثبوت بہم پہنچا سکتا ہے - لیکن کسی ایسے فروعی اختلاف راے سے ان کتابوں کی مجموعی قدر و قیمت میں کچھہ کمی نہیں آتی اور حق یہ ہے کہ یہ پورا سلسلہ اردو خواں مسلمانوں کی ضیافت کا بہترین سامان ہے جسے دارالمصنفین نے اسلامی تاریخ و تراجم سے ذوق رکھنے والوں کے لئے بہت قرینے سے مہیا کردیا ہے -

کتابوں کی زبان صاف و شگفتہ ' لکھائی چھپائی مطبع معارف کے معیار کے مطابق اور هر حصے کی قیمت تین تین روپے ہے -

(ھ)

متفرقات

خزینۂ معلومات

(ایجوکیشنل بک هاؤس، سہول لائنز، علی گڑھ قیمت دو روپے)

(ملنے کا پتا: انجمن ترقی اردو اورنگ آباد دکن)

—

یہ کتاب فی الحقیقت اسم با مسمی ہے - اس میں ہر قسم کی ضروری اور کارآمد معلومات جمع کر دی گئی ہیں - مثلاً ڈاک خانہ، تار برقی، ریڈیو، ہوائی جہاز کا سفر، ریلوے، تجارت، بحری سفر، قوانین کسٹم، پروانۂ راہداری، طبعی معلومات، پبلک، دائمی جنتری، عدالت، مال، فوجداری وغیرہ کے متعلق تفصیلی اطلاعات درج ہیں - کتاب ضخیم ہے اور ۵۲۸ صفحے پر ہے —

(۱) اعادۂ شباب و درازیٔ عمر (۲) تجدید شباب کے چند مغربی طریقے (۳) اعادۂ شباب کا ایک سہل طریقہ (۴) درون افرازیات (۵) بڑھاپے سے مقابلہ (۶) عمر گھٹنے

کے اسباب (۷) نفسیاتی علاج (۸) قوائے جسمانی پر غذا کا

اثر (۹) وٹامائنس

(تالیفات لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب قلعہ گولکنڈہ ' حیدرآباد دکن)

یہ چھوٹی چھوٹی مگر مفید اور قابل مطالعہ کتابیں جن کی قیمت چار چار آنے اور بعض کی دو آنے اور چھ آنے ہے لفٹنٹ کرنل ڈاکٹر محمد اشرف الحق صاحب کے متواتر مطالعہ ' عمل اور محنت کا نتیجہ ہیں - پہلی چار کتابوں میں انہوں نے ان اعمال کی تشریح کی ہے جن کے رو سے شباب پھر عود کر آتا ہے اور بڈھوں میں جوانی کا دم خم پیدا ہوجاتا ہے - ڈاکٹر صاحب کا علم محض کتابی نہیں بلکہ وہ خود اس کے عامل ہیں اور بیسیوں مریضوں پر کامیابی کے ساتھہ عمل کرچکے ہیں - جو لوگ اپنے قوی کو تازہ کرنا اور اپنی کھوئی ہوی قوت کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ان کتابوں کا ضرور مطالعہ کریں اور ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کریں انہوں نے حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں اعادۂ شباب وغیرہ علاجوں کی کیفیت ان کتابوں میں بیان کردی ہے —

دو کتابیں غذا اور اس کے اثر کے متعلق ہیں - انہیں ہر شخص پڑھ کر فائدہ اتھا سکتا ہے - اس زمانے میں جب کہ ادویہ کا استعمال خبط کی حد تک پہنچ گیا ہے اور لوگوں کے قوی میں انحطاط پیدا ہورہا ہے ' ان کتابوں کا مطالعہ بیحد مفید ہوگا - غذا کی اصلاح اور اس کا صحیح استعمال اکثر و بیشتر حالات میں صحت و درازیء عمر کا ضامن ہوتا ہے

اور بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے - ان چھوٹی چھوٹی کتابوں میں فاضل ڈاکٹر نے جامع طور سے نہایت کارآمد اور ضروری معلومات جمع کردی ہیں - جن کا پڑھنا ہر ایسے شخص پر فرض ہے جو صحت اور مسرت اور کامیابی سے اپنی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے —

اُردُو کے جدید رسالے

یہ خوشی کی بات ہے کہ ہر سال بلکہ ہر مہینے اردو زبان میں نئے نئے رسالے شایع ہوتے رہتے ہیں' لیکن جب کچھہ دنوں کے بعد بند ہوجاتے ہیں تو اسی قدر افسوس بھی ہوتا ہے - ایسے مقامات سے رسالے شایع کرنا جہاں پہلے سے کوئی رسالہ نہیں نہایت ضروری ہے' وہاں اردو زبان اور ادب کا شوق پیدا کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں ہوسکتا - لیکن ایک ہی مقام سے بہت سے رسالے شایع کرنا خصوصاً جب کہ کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہے' غیر ضروری ہی نہیں نقصان رساں بھی ہے - ابھی نہ اچھے لکھنے والوں کی تعداد کثیر ہے اور نہ پڑھنے والوں کی' نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب کو نقصان پہنچتا ہے - ایسی صورت میں یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ جو رسالے پہلے سے موجود ہیں اور اردو زبان کی معقول اور خاطر خواہ خدمت کررہے ہیں انہیں کو مدد دی جاے اور ان کو زیادہ بہتر اور مفید بنایا جاے - بہرحال ان صاحبوں کی اولوالعزمی قابل تعریف ہے جو

باوجود گونا گوں رکاوٹوں کے اپنا روپیہ، محنت اور وقت صرف کرکے اردو زبان کی خدمت کا شوق رکھتے ھیں - ان ایام میں جو جدید رسالے شایع ہوئے ھیں ان کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ھے —

جاوید

ماھانہ رسالہ ھے جسے عبدالوحید صدیقی صاحب اور محمد ادریس صاحب میرٹھی مرتب کرتے ھیں - دھلی سے شایع ہوتا ھے —

شباب

اسی سال لکھنؤ سے نکلا ھے- شوکت تھانوی صاحب اس کے اڈیٹر ھیں، جن کے بیان کی شوخی اور دلکشی محتاج بیان نہیں -

---

انتخاب

یہ بھی لکھنؤ سے سیفی ندوی صاحب کی ایڈیٹری میں شایع ہوا ھے -

شہاب

یہ جوناگڑھ سے شایع ہوتا ھے - اس کے مرتب مولوی سید ابوظفر ندوی صاحب اور قاضی احمد میاں اختر صاحب ھیں - دونوں صاحب علم اور صاحب ذوق ھیں - جوناگڑھ میں بلاشبہ ایک ایسے ادبی رسالے کی ضرورت تھی اور امید ھے کہ یہ ضرور مفید خدمت انجام دے گا -

بانو

یہ بھوپال سے نکلا ہے۔ نام سے ظاہر ہے کہ عورتوں کے لئے ہے۔ اس کی اڈیٹر خاتون ارشد صاحبہ (ظہور فاطمہ بیگم) ہیں -

---

پھول باغ

پٹیالہ سے شایع ہوتا ہے - صاحبزادہ کوشاں سنگت پوری اڈیٹر ہیں -

---

فلم لائٹ

یہ رسالہ علی گڑہ کا ہے - اڈیٹر محمد مزمل اللہ خاں صاحب تلقین اور محمد شریف اللہ خاں صاحب عابر ہیں' اس میں فلم کی بعض عورتوں کی تصویریں ہیں اور کچھہ معمولی مضامین -

شفق

ظفر تاباں صاحب اور رشید طلعت صاحب کی ادارات میں دھلی سے شایع ہوتا ہے -

---

نرگس

یہ رسالہ لاھور کا ہے - فضل حسین صاحب اس کے مرتب ہیں - سر ورق سادہ اور دلکش ہے - ادبی اور تاریخی مضامین ہیں اور سلیقے سے لکھے گئے ہیں - اگرچہ لاھور میں رسالوں کی کچھہ کمی نہیں مگر اس کا رنگ ڈھنگ کچھہ الگ معلوم ہوتا ہے - اور یقین ہے کہ یہ ذوق صحیح کی اشاعت میں اچھا کام کرے گا —

ہم نے ان رسالوں پر تفصیلی تبصرہ نہیں کیا اس لئے کہ سب کا

مقصد واحد ہے یعنی اُردو زبان اور ادب کی خدمت ' اور سب کے سب تقریباً ایک سے ہیں - انہیں بہیں کا فرق ضرور ہے - ان میں نرگس ' شفق اور شہاب ہونہار معلوم ہوتے ہیں - ان کی ترتیب اور چھپائی وغیرہ میں بھی صفائی اور سلیقہ نظر آتا ہے —

رہنمائے تعلیم کا فسانہ نمبر

رہنمائے تعلیم نے اپنے خاص نمبروں سے خاصی شہرت حاصل کرلی ہے - یہ نمبر بھی بہت ضخیم ہے اور ۴۵۶ صفحے کا ہے - اس میں ہر قسم کے فسانے موجود ہیں اور کچھہ نظمیں بھی ہیں - دلچسپی کا بہت اچھا مجموعہ ہے - رسالہ کے اڈیٹر نیز ماسٹر جگت سنگہ صاحب مینجنگ پروپرائٹر کی محنت قابل تحسین ہے —

,, خیابان ،، لکھنؤ

ہندوستان کا واحد اُردو مصور ریسرچ رسالہ - زیر ادارت مسٹر شہنشاہ حسین رضوی - ایم اے ایل ایل - بی (علیگ)

ایم - آر - اے - ایس (لندن) ایڈووکیٹ

——— § * § ———

جس کا نصب العین حسب ذیل ہے —

اردو زبان و ادب کی تحقیق و تدقیق - اردو میں علوم مغربیہ و مشرقیہ کی ترویج - سلف الصالحین کے علمی کارناموں کا احیاء - باقیات الصالحات کے علمی تحقیقات کی اشاعت - دوسری زبانوں کے علمی تراجم و اقتباسات - مطبوعات جدیدہ پر تنقید و تبصرہ —

——— o)*(o ———

سائنس

انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اُردو دانوں میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہونگے ان کو کسی قدر تفصیل کے بیان کیا جائے - ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے - اس سے اُردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

رسالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ سات روپے سکۂ انگریزی (آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ) نمونہ کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ انگریزی (یا دو روپے سکۂ عثمانیہ) — طلباء کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق پرنسپل صاحب (یا هیڈ ماسٹر صاحب) انھیں پانچ روپے چار آنے سکۂ انگریزی (چھ روپے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندہ میں دیا جاتا ہے —

اُمید ہے کہ اُردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد دکن

اردو

حصہ ۵۵	جولائی سنہ ۱۹۳۴ ع	جلد ۱۴

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اورنگ آباد (دکن)

شیخ ملا نصرتی ملک الشعرائے بیجاپور

از

(اڈیٹر)

عادل شاهي حکومت دکن کی ان یادگار زمانہ حکومتوں میں سے ہے جسے تاریخ کبھی نہیں بھلا سکتی - بہمنی سلطنت کے ضعف و زوال پر یوسف عادل شاہ نے بیجاپور میں اپني خود مختار حکومت قائم کرلی (سنہ ۸۹۵ ھ ' ۱۴۸۹ ع) جس کي حدود مغرب ساحل پر گوا تک پہنچتي تھیں - اس کي وفات پر اس کا بیٹا اسمعیل عادل شاہ تخت پر بیٹھا (سنہ ۹۱۶ ھ ۱۵۱۱ ع) - اس کے زمانے میں حکومت کو خوب فروغ ہوا - یہ دونوں فارسي کے اچھے شاعر تھے اور ان کے کلام کے نمونے تذکرہ نویسوں اور مورخوں نے اپني کتابوں میں نقل کیے ہیں - اسمعیل کے بعد ابراهیم عادل شاہ اول (سنہ ۹۴۱ ھ) اور اس کا جانشین علی عادل شاہ (سنہ ۹۶۵ ھ ۱۵۵۷ ع) اول ہوا - یہ بادشاہ بڑا الوالعزم اور قدردان علم و ہنر تھا - بیجاپور کا قلعہ ' جامع مسجد ' آب رساني کي نہریں اور دوسري کئي خوبصورت عمارتیں اس کي تعمیر کی ہوئی ہیں - اس کے جانشین ابراهیم عادل شاہ ثاني (سنہ ۹۸۸ ھ ۱۵۷۹ ع) کے وقت ملک کا عروج و فروغ ' رعیت کی خوش حالي اور علم و کمال کی سرپرستی برابر قائم رهی - علمي دنیا میں نورس نامہ اس کي بڑی یادگار ہے - لیکن اس کے بعد محمد عادل شاہ کے عہد (سنہ ۱۰۳۷ ھ ۱۶۲۸ ع) میں

ایک طرف مرهٹوں نے شیواجی کي سرکردگي میں اُبهرنا شروع کیا اوردوسری طرف شاهجهان کي هوس هولناک صورت میں نمودارهوتي نظر آئي - اس کے عهد میں بهی اردو کے اچهے اچهے شاعر گزرے هیں - محمد عادل شاہ کي وفات پر علی عادل شاہ ثاني تخت پر بیٹها (سنه ۱۰۶۷ ھ ۱۶۵۶ ع) اور جب اس کا وقت آپهنچا تو حکومت اس کے شیرخوار بیٹے سکندر عادل شاہ کو پهنچي اور اس نام کے سکندر پر بادشاهت کا خاتمه هوگیا —

بیجاپور اس وقت شهر کي حیثیت سے کچهه بهي نهیں لیکن اس میں ایسے تاریخی اور شاندار آثار اور بے مثل یادگاریں موجود هیں که دلي اور آگرہ کے بعد اس کا درجه هے - سلطان محمد عادل شاہ کا مقبرہ جو گول گنبد یا بول گنبد کے نام سے مشهور هے دنیا میں اپنی نظیر نهیں رکهتا ' کهتے هیں که اتنا عظیم‌الشان گنبد تمام عالم میں کهیں نهیں - ابراهیم عادل شاہ ثاني کا مقبرہ جو عام طور پر ابراهیم روضه کهلاتا هے ' روضۂ تاج محل کے بعد دنیا کي سب سے خوبصورت عمارت هے - مشهور توپ ملک میدان جو دنیا کي سب سے بڑی توپ هے اب تک وهاں موجود هے - ان کے علاوہ قلعه ' فصیل ' برج و بارہ ' بے شمار مقبرے ' مسجدیں ' کاروانسرائیں ' محلات جو اب تک زمانے کے انقلاب اور حوادث کی دست برد کا مقابله کرتے رهے هیں ' اب بهی کسي نه کسي صورت میں گزشته عظمت و شان کي شاهد هیں - وہ محلسرائیں اور عشرت کدے جهاں کبهي مال و منال ' حسن و جمال اور عروج و اقبال کے جهمکتے تهے اب جنگلی کبوتروں کا بسیرا هیں جن کي غٹرغوں سے بهیانک گونجیں پیدا هوتی هیں —

علي عادل شاہ ثاني کے زمانے میں شعر و سخن کا گھر گھر چرچا تھا - فارسي کا رواج تو خیر تھا هي اور سالہا سال سے چلا آرها تھا لیکن دکني کو اس عهد میں اور زیادہ فروغ هوا - بادشاہ خود بہت بڑا سخن سنج اور موزوں طبع تھا اور خوش کلام شعرا کی قدر کرتا تھا - اور بڑی بات یہ تھی کہ اپنی ملکي زبان یعنے دکنی کی طرف زیادہ میلان تھا اور اس کے کلام سے جو همیں دستیاب هوا هے اس کے صحیح ذوق کا پتا لگتا هے - صاحب بساتین السلاطین لکھتے هیں —

" در عهد همایونش سخنوران فارسي گو چند فرد نادر روزگار بودند ' اما چوں طبع همایون بادشاہ اکثر میل بجانب لغت خاص خویش یعنے زبان دکنی داشت بر طبق الناس علی دین ملوکهم ' شعراے هندی گو بسیار از خاک بیجاپوری بر خواسته اند خانه بخانه هنگامۂ شعر تازہ گوئی گرم داشته اند " —

" لغت خاص خویش " کے الفاظ قابل توجه هیں - شخصی حکومتوں میں اکثر اوقات بادشاہ جدت و بدعت کا سرچشمه هو جاتا هے - جدهر اس کا میلان دیکھتے هیں سب اسي طرف ڈھل جاتے هیں اور اس کي مرضی ' مذهب ' رسم و رواج وغیرہ پر سبقت لے جاتي هے - بادشاہ کی ادب پروری نیز شاعری کي داد خود نصرتی نے ان اشعار میں دی هے :

بساریا * فصاحت نے حسان کوں چھپایا بلاغت نے سحباں کوں
سخن سنج کامل هنرور تُہیں زباں آوراں کا بھي داور تُہیں
تُرے شعر تے شاعراں کوں هے نور مضامین معنانیاں کے گردوں کا نور
مضامین کے گل دکھایا تُہیں ارت + کاچ میوہ چکھایا تہیں
جگت گُر ÷ کے نورس کو نورس دیا هر یک رس چکھانے توں سورس دیا

---

* بھلایا + معنی ÷ اس سے مراد ابراهیم عادل شاہ هے جس کا نورس نامه مشهور هے اور جو جگت گرو کے لقب سے یاد کیا جاتا هے —

اس میں شبہ نہیں کہ دکنی زبان کو کبھی اس قدر فروغ نہوتا اگر قطب شاہی اور عادل شاہی بادشاہ اس طرف توجہ نہ کرتے اور خود اس زبان میں شعر کہہ کر اس کی قدر و منزلت نہ بڑھاتے۔ علی عادل شاہ کا یہ رجحان دیکھہ کر لوگوں کا اور شوق بڑھا اور دکنی شاعری ملک میں عام ہو گئی۔ علی عادل شاہ ثانی کے عہد میں دکنی زبان کے بہت اچھے اچھے شاعر گذرے ہیں لیکن ان سب میں ملا نصرتی کا پایہ بہت بڑھا ہوا ہے —

مصنف تذکرۂ شعراے دکن نے نصرتی کا نام محمد نصرت لکھا ہے اور چمنستان شعرا کی پیروی میں یہ بھی لکھا ہے کہ وہ حاکم کرناٹک کے قرابت داروں میں سے تھا لیکن کوئی حوالہ یا ثبوت اس کے لیے پیش نہیں کیا۔ بغیر سند کے اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہے۔ تخلص کی مناسبت سے محمد نصرت نام ہونا قرین قیاس تو ہے مگر یقینی نہیں —

گارساں دتاسی نے گلشن عشق کے ایک قلمی نسخے کی سند پر جو کانجی ورم میں لکھا گیا تھا اُسے برہمن بتایا ہے۔ یہ بیان بھی مبہم ہے۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ خود کتاب میں اس قسم کا کوئی اشارہ ہے یا کاتب نے آخر میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے۔ بعد کے بعض تذکرہ نویسوں نے بھی گارساں دتاسی کے اس بیان کی بنیاد پر اُسے برہمن لکھہ دیا ہے۔ اس کتاب کے متعدد نسخے میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان میں کہیں اشارتاً بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے جس سے یہ استنباط کیا جاے کہ نصرتی برہمن تھا بلکہ خود نصرتی نے اپنے متعلق گلشن عشق میں ایک آدہ جگہ جو سرسری سا ذکر کیا ہے اُس سے اِس قول کی تردید ہوتی ہے۔ حضرت بندہ نواز گیسو دراز کی مدح میں

لکھتے لکھتے ایک شعر لکھا ہے :

بحمد اللہ گرسی بہ کرسی مری
چلی آئی ہے بندگی میں تری

یہاں کرسی سے مراد پیڑھی یا پشت ہے یعنی میں پشت در پشت یا نسلاً بعد نسلٍ تیری بندگی میں ہوں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس کے باپ دادا مسلمان تھے —

بادشاہ کی مدح کے آخر میں دو چار شعر اپنے متعلق یہ لکھے ہیں :

کہ میں اصل میں یک سپاہی اتھا فدا درگہ بادشاہی اتھا
مجھے تربیت کرتوں ظاہر کیا شعور اس ہنر کادے شاعر کیا
وگرنہ نہ تھا مجھہ یہ کسب کمال کتا ہوں اتایو سخن حسب حال

ان اشعار سے اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ نصرتی سپاہی زادہ تھا اور اس کا تعلق فوج سے تھا ۔ آگے چل کر اس تعلق کو اُس نے اور بھی صاف کردیا ہے ۔ "حسب حال" کے تحت میں لکھتا ہے :

کہ تھا مجھہ پدر سو شجاعت مآب قدیم یک ساعدار جمع رکاب
وو شہ کام پر زندگانی منے کمر بستہ تھا جانفشانی منے

علی نامے میں بھی ایک جگہ اس نے اس کا اشارہ کیا ہے کہ شاعری میرا آبائی پیشہ نہیں ہے —

اے شاہ رتن کاکھن ہوا مجھہ من سو تیرا فیض ہے
کچھہ کسب موروثی نہ ہوئی حقا کہ مجھہ یو شاعری

مصنف تذکرہ شعراے دکن نے جو یہ لکھا ہے کہ "مدت تک کرناٹک میں رہا پھر سیر کرتے ہوے بیجاپور میں آیا اس وقت علی عادل شاہ کا زمانہ شباب پر تھا، باریاب ہوا، عمدہ منصب سے سرفراز ہوا"

صحیح نہیں معلوم ہوتا - خصوصاً آگے چل کر نصرتی نے اپنے بچپن اور ابتدائي زمانے اور بادشاہ کي شہزادگی کا ذکر کیا ہے - اس سے اس واقعہ کي صحت اور بڑی مشتبہ ہوجاتی ہے - چنانچہ وہ کہتا ہے کہ بادشاہ عالم شہزادگی ہی سے میرا خریدار تھا :

میرا شہ جو بوجک * اہے جوہری — وو شہزادگي میں اتھا مشتري
نوی چاند ساشہ یو بالا اتھا — چڑت بُد + کا دن دن اجالا اتھا
دسے گرچہ ظاہر نہنپے سن میں سخت — اتھے پن ازل تے عطا اسکوں بخت
میری طبع کی کھن کو قابل پچھان — نکوی کھن ہے کر اس مقابل پچھان
دھر نہار اکثر اثر مہر کی — رکھیا مجھہ دُوت نت نظر مہر کي

گلشن عشق میں نصرتي نے اپنی تعلیم و تربیت کا بھی ذکر کیا ہے جس کے لیے وہ اپنے والد کي شفقت و تربیت کا ممنون ہے - ذیل کے اشعار میں بڑی سادگی سے اس کا بیان لکھا ہے :

کہ تھا مجھہ پدر سو شجاعت ماب — قدیم یک ساعدار جمع رکاب
وو شام کام پر زندگاني منے — کھر بستہ تھا جانفشاني منے
بجانے جنم آپنا ننگ و نام — اپس زندگی میں کیا خوب کام
ادک تھي لگ مجھہ میں نہنو ادگی $ — میرے حق میں اندیش استادگی
نظر دھر کہ مجھہ تربیت میں سدا — رکھیا نہیں کہ ہیں مجھہ اپس تے جدا
سکھ § مجھہ تے جانے کوں دن نس منے — پھرے لے بزرگاں کي مجلس منے
معلم جو میرے جتے خاص تھے — دھر نہار وو مجھہ سوں اخلاص تھے
نجانے سبق کوئي میرا بار دل — دھر نہار تھے پیار ہو یار دل

---

* پرکھنے والا - + بڑھتي ہوی عقل - $ لڑکپن - § حجاب ، یعنے میرے دل سے حجاب دور کرنے کے لیے —

کچھ یک میں سنبھا لیا جب اپنا شعور کیا کر کتابان پو اکثر عبور

نصرتی نے اپنی تصانیف میں اپنے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا۔ لیکن روضۃ الاولیا بیجاپور مولفہ محمد ابراہم صاحب بیجاپوری (سنہ تالیف ۱۲۴۱ ھ) میں شیخ منصور کے حالات میں یہ لکھا ہے کہ شیخ نصرتی ملک الشعرا اُن کے برادر عینی تھے۔ اس کتاب کا ترجمہ شاہ سیف اللہ صاحب ایک بزرگ نے کیا ہے جس کا قلمی نسخہ ایک دوست کی عنایت سے میری نظر سے گذرا ہے۔ انھوں نے شیخ منصور کے حالات میں اپنی معلومات سے یہ اضافہ کیا ہے * :

"آپ کے دو برادر مولانا شیخ ملا نصرتی ملک الشعرا اور شیخ عبدالرحمن سپاہی تھے۔ یہ ہر سہ برادران حقیقی ہیں۔ ہر ایک صاحب ایک ایک فن میں کمال رکھتے تھے۔ شیخ منصور علم دعوت میں، شیخ عبدالرحمن سپاہ گری میں اور شیخ ملا نصرتی شاعری میں۔ مولانا شیخ منصور اور شیخ عبدالرحمن دونوں کو اولاد صلبی نہیں ہے۔ مولانا شیخ ملا نصرتی ملک الشعرا کو آل ہے اولاد نہیں اور ان کی آل سے پانچ چادر والے، گھڑیال والے، ملور والے، ہاشم پیر والے، مقبل والے، گولسنگی والے، نگینہ باغ والے ہم ساگر والے موجود ہیں"

بیجاپور جاکر میں نے مزید حالات کی تحقیق و تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ مولانا نصرتی کی اولاد اب تک موجود ہے۔ ایک مہربان کی بدولت محمد ملتانی قادری صاحب عرف جعفر صاحب جاگیردار

---

* اس ترجمہ کا مطبوعہ نسخہ بھی موجود ہے جو مطبعہ صبغۃ اللہی رائچور میں سنہ ۱۳۱۴ ھ میں طبع ہوا تھا۔ اس میں یہ عبارت درج نہیں —

گولسنگي (ضلع بیجاپور) سے ملاقات ہوئي اور انہوں نے اپني عنایت سے اپنے خاندان کي سند جاگیر جس میں خاندان کا شجرہ بھی ہے میرے حوالے کردی - یہ سند انعام شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد کی ہے اور اس پر امانت خاں عالمگیر شاہی اور محمد کاظم مرید شاہ عالمگیر کی مہریں ثبت ہیں- یہ درحقیقت قدیم عادل شاہي سند کی تجدید ہے - چنانچہ خود اس سند میں اس کا حوالہ ان الفاظ میں موجود ہے :

" باغ مذکور مع درختہائے و چاہ ہا بشیخ پیر محمد بطریق انعام ابدی باولاد و احفاد دادہ شد و محضرے کہ برگم شدن سند انعام ابدی باغ مذکور بمہر علي عادل خاں بیجاپوری بنام شیخ منصور بدست دارد صحیح و از لوث تجعیل و تلبیس مبرا ست ' -

چونکہ شیخ منصور لاولد مرے اس لیے ان کی معاش موقوعہ نگینہ باغ ان کے خواہر زادہ شیخ پیر محمد صدیقي (قادری) کو ملي - سند مذکور میں ان کا شجرہ ضمناً آگیا ہے - وہ عبارت یہاں نقل کی جاتي ہے —

" کہ یک قطعہ باغ نگینہ کہ موازی نوازدہ بیگہ محدودہ و معروفہ و معلومہ متصل باغ و مسجد ملک جہاں اندرون قلعہ است بموجب اسناد احکام سابق در قبض و تصرف مالکان شیخ پیر محمد قادري ابن شیخ برہان الدین بن شیخ علي خواہر زادہ شیخ منصور بن شیخ مخدوم بن شیخ ملک بود و شیخ پیر محمد مذکور حي و قائم است " —

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ملا نصرتي نسلاً بعد نسلٍ مسلمان تھے اور

قبر ملّا نصرتی

ان کی بہن کی اولاد اب تک موجود اور ان کے بھائی شیخ منصور کی جاگیر پر قابض و متصرف ہے - یہ معاش شیخ پیر محمد صدیقی کے انتقال پر ان کی بیوی اور تین لڑکیوں پر تقسیم ہوئی - جیسا کہ پہلے بحوالۂ ترجمۂ روضۃ الاولیا ذکر ہوچکا ہے ملا نصرتی کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی البتہ بیٹی تھی جس کی * اولاد سے جعفر صاحب اور صاحب حسنی نگینہ باغ والے گولسنگی میں موجود ہیں ' ٭ —

میں نے بیجا پور میں نصرتی کی قبر کا پتا لگایا ' یہ اسی نگینہ باغ میں ہے جس کا ذکر سند انعام میں آیا ہے اور اب یہ زمین گورنمنٹ ہائی اسکول کے احاطے میں ہے - قبر کا عکس اسی صفحے کے مقابل دیا گیا ہے - مقبرے کے جاے وقوع کی تصدیق روضۃ لاولیا سے بھی ہوتی - چنانچہ شیخ منصور کے حالات میں لکھا ہے :

خدمت شریفش اہل اللہ و از کاملان اہل دعوت است و در تصرف دعوت و تکسیر ممتاز وقت بود - سلطان عادل شاہ و اسکندر شاہ اعزاز و اکرام ایشاں می کردند - قبرش در نگینہ باغ است و شیخ نصرتی ملک‌الشعرا کہ برادر عینیء ایشاں می شود ہم دراں جا مقبور است " —

غرض ان تمام واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ ملا نصرتی بیجا پور کے معززین میں سے تھے اور یہ اور ان کے دونوں بھائی اپنے اپنے فن اور کمال کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے تھے اور مقبول بارگاہ شاہی تھے —

بادشاہ کے دربار میں پہنچنے کا واقعہ اس نے اس طرح لکھا ہے کہ جب میں تعلیم و تربیت پا چکا تو میری تقدیر چمکی - بادشاہ شہزادگی ہی کے زمانے سے اس پر مہربان تھا - اب جو تخت پر بیٹھا اور عین کامرانی و جہانبانی کا عالم تھا تو :

بلا بھیج بندے کو اس حال میں نظر کر مرے بے بہا مال میں

٭ ترجمۂ روضۃ الاولیا (مطبوعہ) صفحہ ۲۱۹ —

پرکھنا چلیا یو رتن سر بسر نھکے پارکھہ * یو اهل نظر
و هیں جگ میں بندہ رھنے بے نیاز رکھیا اپنی خدمت میں کر سرفراز

میں ابھی اوپر لکھہ آیا هوں کہ بجز ان چند مقامات کے جو نقل هوچکے هیں نصرتی نے اپنی تصانیف میں اپنے متعلق اور کچھہ نہیں لکھا۔ البتہ علی نامے کے ایک قصیدے میں ضمناً بادشاہ سے اپنی بےسر و سامانی کی شکایت کی هے اور عرض کیا هے کہ جس گھر میں میں رهتا هوں وہ بہت تنگ هے - پڑوس بہت نا معقول هے ' آس پاس سب اراذل و انفار آباد هیں- گھر کی یہ حالت هے کہ بارش هوئی تو صحن حوض بن جاتا هے اور اب کی برسات میں تو غضب هی هوگیا کہ پانی کی رو گھر کا سارا ساماں بہا لے گئی - آخر میں التجا کی هے کہ کوئی ایسا مکان عنایت فرمایا جاے جو میری طبیعت کے مناسب هو اور جہاں میں اطمینان اور فراغت سے کام کرسکوں- ان اشعار کا یہاں نقل کرنا لطف سے خالی نہ هو گا - پہلے وہ اپنی شاعری کے متعلق تعلی کرتا هے اور اس کے بعد کہتا هے :

پن کیا کروں اے شاہ میں کئی باب بے سامان هوں
اول تو ایسا گھر نہیں جہاں تھار هوے راحت بھری

گھر بی نهنا یک هے ولے دائم هے علت لئی اوسے
لڑکا نہ سوں همسایہ بد ویسیچہ بھویں کی بد تری

مطلق اراذل قوم اوهیں گرد ایسے بے حیا
سمجیں وو گالی کھاؤ کوں سہجیں گمت هور مسخری

جن کی زبان تے لام کاف آتا هے شیطان سیکنے
سانچے پنے سوں جب کریں تعلیم جنگ زرگری

* پرکھنے والے ' جوهری —

ہنگام پر برسات تک پڑنے میں لرکا نہر بھر
گھر حوض ہوکر کیچھ کے رہے دھوپ کالے لگ تری

اِس سال تو لر * کا ستم سامان گھر کالے گیا
اوبر یا ہے یک نہالی لعات یعنے گگن ہور دھر تری

بندے کی آخر عرض یو ہے اے جہاں کے سایہ باں
یا کر پڑے گھر کو کوڑا یا کر کرم سے یاوری

فرماں سوں عالی حکم کے بخشش مجھ ایسا گھر دلا
جو صاف تر سچ طبع کوں جہاں ہوے صفائی بہتری

ایک دوسرا واقعہ علی نامہ کی تمہید میں نصرتی نے ضمناً بیان کردیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دونوں بھائی اس کی زندگی ہی میں وفات پاچکے تھے ۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :

دو بازو میرے دین و دنیا کے زور توڑی تھے سوتھا جیو میں مجھ سخت شور
جلم جگ دیکھت دل کوں سچ باغ باغ دیا تھا فلک داغ بالاے داغ

صاحب بساتین السلاطین نے نصرتی کی بد یہہ گوئی کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز بادشاہ محل میں رونق افروز تھے اور حوض میں فوارہ عجیب بہار دے رہا تھا ، بادشاہ کی زبان سے بے ساختہ یہ مصرع نکلا ـــ

اُڑتا سو یو فوارہ پانی کا کیا نچھل ہے

ملا نصرتی نے فوراً جواب میں یہ مصرع کہا :

---

* یہ لفظ لر لہر کا بگاڑ ہے ۔ بعض صاحبوں نے اسے " لرکا " پڑھا ہے اور مطلب یہ پیدا کیا ہے کہ اس کا لرکا بہت نالایق اور اوباش تھا حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ملا نصرتی کے لڑکا تھا ہی نہیں ۔ نیز سیاق و سباق عبارت سے اس کا کوئی قرینہ نہیں پایا جاتا ـــ

تجھہ شاہ پر اڑانے موتی کا سور جل ہے

بادشاہ چونکہ خود ایک خوش مذاق اور خوشگو شاعر تھا اس لیے نصرتی جگھہ جگھہ اپنے تئیں بادشاہ کا شاگرد ظاہر کرتا ہے - اسے نصرتی کی شاہی عقید تمندی یا انکسار پر محمول کرنا چاہئے ورنہ وہ کسی کا شاگرد نہ تھا اور فطرتاً شاعر تھا - بادشاہ کی مدح میں پہلے ہی دو شعر یہ ہیں —

مجے یو سخن بادشاہ یاد ہے پچھیں پیر کے وصف استاد ہے
مجھہ استاد اُستاد عالم اچھے جتا علم از بر جسے جم اچھے
بحمد اللہ کیا مجھہ بڑے بخت آج نہ اُستاد کوئی مجھہ علی شہ کے باج

اس قسم کا خیال اس نے کئی جگھہ ظاہر کیا ہے - لیکن اصل حقیقت بھی وہ ایک جگھہ لکھہ گیا ہے —

نہ کچھہ شاعری کسب کا کام ہے کہ یو حق کی بخشش تے الہام ہے

نصرتی نے تین بادشاہوں یعنی محمد عادل شاہ ' علی عادل شاہ ثانی اور سکندر عادل شاہ کا زمانہ دیکھا - فتوت نے اپنے تذکرہ ریاض حسنی میں لکھا ہے کہ جب شاہ اورنگ زیب عالمگیر نے دکن فتح کیا تو وہاں کے شعرا کو حاضر کرنے کا حکم دیا - ان میں نصرتی بھی تھے اور ان کے کلام کو سب سے افضل تسلیم کیا اور خطاب ملک الشعرائے ہند سے سر افراز فرمایا - مولوی عبدالجبار مرحوم نے تذکرۂ شعرائے دکن میں ان کا سنہ وفات ۱۰۹۵ ھ لکھا ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ یہ اطلاع انہیں کہاں سے حاصل ہوئی - اگر یہ سنہ وفات صحیح ہے تو فتوت کا بیان صحیح نہیں ہوسکتا کیونکہ عالمگیر نے بیجا پور کو سنہ ۱۰۹۷ ھ میں فتح کیا تھا —

نصرتی کی تصانیف

نصرتی کی تصانیف جو اب تک ہمیں دستیاب ہوی ہیں وہ یہ ہیں :

۱ - گلشن عشق - ۲ - علی نامہ - ۳ - تاریخ اسکندری - ۴ - قصائد و غزلیات —

اور غالباً ان کے سوا نصرتی کی اور کوئی تصنیف ہے بھی نہیں - اب ان میں سے ہر ایک کا ذکر الگ الگ کیا جاتا ہے اور آخر میں نصرتی کے کلام کی خصوصیات پر ایک نظر ڈالی جائے گی —

گلشن عشق یہ نصرتی کی سب سے پہلی تصنیف ہے اور ایک عشقیہ مثنوی ہے - جس میں منوہر و مدمالتی کے عشق کا فسانہ بیان کیا گیا ہے - قصہ کہاں سے لیا گیا ہے اس کا معلوم کرنا دشوار ہے کیونکہ نصرتی نے اس کا کہیں اشارہ نہیں کیا - صرف اس قدر لکھا ہے کہ ان کے ایک دوست " مسمی نبی ابن عبدالصمد " نے اس قصے کے لکھنے کی ترغیب دی - تحقیق سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس سے قبل بھی تحریر میں آچکا تھا - ایک صاحب شیخ منجھن فاسی نے اسے ہندی میں لکھا تھا - یہ کتاب اب تک کہیں دستیاب نہیں ہوئی - اس کا حوالہ ایک دوسری کتاب مسمی " قصۂ کنور منوہر و مد مالت " * میں ملتا ہے - یہ فارسی مثنوی ہے - مصنف کا نام معلوم نہیں ہوا' البتہ سنہ تصنیف سنہ ۱۰۵۱ ہے - اس میں مصنف نے شیخ منجھن کی ہندی کتاب کا ذکر کیا ہے اور اپنے قصے کی بنیاد اسی پر رکھی ہے - تیسری کتاب عاقل خاں رازی عالمگیری کی مثنوی مہر و ماہ ہے جو سنہ ۱۰۶۵ کی تصنیف ہے - اس میں بھی یہی قصہ ہے - نصرتی کی گلشن عشق کے بعد بھی بعض شعرا نے اس فسانے کو نظم کیا ہے - ان میں سے ایک حسام الدین حصار کا رہنے والا عالمگیر کے عہد میں ہوا ہے یہ بھی فارسی مثنوی ہے - کتاب کا نام حسن و عشق اور اس کا سنہ تصنیف ۱۰۷۱ ہجری ہے - یہ کتاب میرے پاس موجود ہے - اگرچہ ان سب کتابوں میں قصہ ایک ہے لیکن ہر مصنف نے کسی قدر رد و بدل یا اختصار سے بیان کیا ہے - ان سب میں گلشن عشق بہت جامع اور ضخیم ہے - نصرتی نے اصل قصے میں چمپاوتی اور چندرسین کی داستان ضمنی طور پر بڑی خوبی سے ملائی ہے - یہ کہنا دشوار ہے

---

* فہرست مخطوطات فارسی برٹش میوزیم جلد دوم صفحہ ۸۰۳ —

ہے کہ کس نے کس سے اس قصے کو لیا - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانے میں یہ قصہ بہت مقبول اور مشہور تھا اور ہر مصنف نے اسے اسی طرح بیان کردیا ہے جیسا کہ مقامی طور مشہور چلا آرہا تھا - یہ ممکن ہے کہ نصرتی کے نظر سے عاقل خاں کی مثنوی مہر و ماہ گزری ہو اور اس نے تصرف کر کے اسے زیادہ پر لطف بنا دیا ہو یا جس طرح اس نے اپنے وطن میں یہ داستان سنی ہو اسی کو کسی قدر درست کر کے نظم کردیا ہو - قصے کا خلاصہ یہ ہے —

ایک راجا تھا ' اس کا نام تھا بکرم - اس کا پاے تخت کنک گیر تھا - کوئی بیٹا نہ تھا اس غم سے دل فگار رہتا تھا - ایک دن راجا رسوی پر بیٹھا تھا کہ ایک فقیر نے صدا دی - راجا ویسے ہی کھانے کا تھال اٹھا کر اس کے پاس لے گیا - جب آنکھیں چار ہوئیں تو وہ کچھ لئے بغیر چل دیا - راجا کو اس کا بہت دکھ ہوا اور فقیر سے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ میں بانجھ کے گھر سے کچھ نہیں لینا چاہتا - یہ سننا تھا کہ راجا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور وہ غم و رنج سے نڈھال ہوگیا - رانی نے سمجھایا کہ اس طرح رنج کرنے سے کیا حاصل : اس فقیر کو ڈھونڈو اور جو وہ کہے وہ کرو - شاید در مقصود ہاتھ آجاے - میں تمھاری غیر حاضری میں راج پاٹ سنبھال لوں گی - غرض راجا سدھارا اور جنگل بیابان بستی اور آبادی میں مارا مارا پھرا - اتفاق سے ایک بن میں حوض کے کنارے پہنچا - وہاں کچھ پریاں نہا رہی تھیں ' ان کے کپڑے لے کر درختوں میں چھپ گیا - پریاں بہت پریشان ہوئیں اور روی دھوئیں تو یہ نکلا اور اپنی واردات سنائی - پریوں نے اسے درویش تک پہنچانے کا وعدہ کیا اور اپنا ایک بال بھی دیا - کپڑے پہن وہ اسے اڑا کر اس بن میں لے گئیں جہاں وہ درویش رہتا - وہاں پہنچا تو فقیر اسے دیکھ کر سمجھ گیا اور کہنے لگا ' دیکھ یہ درخت ہے اس کا پھل توڑ لے اور اپنی رانی کو لے جا کر کھلادے ' خدا تجھے بیٹا دے گا - راجا نے باہر آکر جونہیں پریوں کے بال

جلائے کہ پریاں حاضر ہو گئیں اور اسے اڑا کر لے چلیں اور محل پر لاکر چھوڑ دیا ۔ راجا رانی سے ملا اور اسے وہ پھل کھلا دیا ۔ نو مہینے کے بعد بیٹا ہوا ۔ سارے ملک میں خوشی اور مسرت کے شادیانے بجنے لگے ۔ نجومیوں نے زائچہ دیکھا اور اس کا نام منوہر رکھا اور کہا کہ یہ بڑا خوش نصیب اور با اقبال ہو گا ۔ لیکن چودہ برس پر گیارہ مہینے گذرنے پر اس کے لئے خطرہ ہے ۔ اس وقت اس پر بڑی بپتا پڑے گی لیکن وہ پھر ہر بلا کو بھگت کر صحیح سلامت آجائے گا ۔ اس مصیبت کو کوئی دور نہیں کرسکتا ، اس کا آنا اٹل ہے ۔ راجا یہ سن کر بہت رنجیدہ ہوا اور حکیموں کو بلا کر پوچھا کہ وہ کونسی ایسی بلا ہے ۔ انھوں نے سوچ کر جواب دیا کہ وہ عشق ہے ۔ پوچھا اس کا علاج ؟ کہا کہ اُس وقت تک ایسی جگہہ رکھا جائے کہ آسمان تک نہ دیکھہ سکے تو اس کا بچنا ممکن ہے ۔ چنانچہ اس مشورے کے مطابق اس کے لئے ایک بہت پر فضا اور خوش نما محل تیار ہوا اور اس میں وہ پلنے لگا ۔ جب چار برس چار ماہ چار دن کا ہوا تو پڑھنے بٹھایا اور ضروری علوم و فنون کی تحصیل کرنے لگا ۔ یہ سارے انتظام ہوے لیکن جو وقت آنے والا تھا وہ نہ ٹلا ـــ

چودھویں رات ہے چاندنی کا نور سارے عالم پر چھایا ہوا ہے کچھہ پریاں سیر کو نکلیں ، اس محل اور باغ کو دیکھہ کر ایسی ریجھیں کہ آسمان سے اتر کر وہاں آگئیں ۔ اب جو محل میں داخل ہوئیں تو کنور کے حسن و جمال کو دیکھہ دنگ رہ گئیں ۔ آپس میں کہنے لگیں کہ ایسا حسین دنیا میں کوئی نہیں ، اس کا جوڑا بھلا کہاں مل سکتا ہے ۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ خالق نے ہر ایک کا جوڑا بنایا ہے اور وہ کہیں نہ کہیں ضرور ہو گا ۔ دوسریوں نے کہا کہ ہماری تمھاری شرط کہ یہ انسان بے جوڑ ہے ۔ یہ سن کر وہ پری ملول ہوئی اور کہنے لگی اچھا ہم ایک کام کریں کہ ہم نو پریاں ہیں نو کھنڈ میں جائیں اور اس کا جوڑا تلاش کریں ۔ غرض ہر ایک ایک جانب کو چلی ۔ آٹھوں تو ڈھونڈھ ڈھانڈ کے چلی آئیں اور ناکام رہیں۔

نویں کا انتظار کرنے لگیں۔ اتنے میں وہ آئی اور کہنے لگی شکر ہے کہ میں نے اس کا جوڑا پالیا، سات دریا پار ایک دیس ہے مہارس نگر نام، اس کا راجا دھرم راج ہے اور اس کی بیٹی (مدمالتی) چاند سے آفتاب چندے ماہتاب ہے۔ اگر تم کو شک ہو تو آؤ چلو دیکھ لو۔ غرض انہوں نے آپس میں صلاح کر کے منوہر کا پلنگ اٹھایا اور مہارس نگر کے محل میں لے آئیں۔ اور جہاں مدمالتی سو رہی تھی وہیں لا کے رکھ دیا۔ اتنے میں منوہر کی آنکھ جو کھلی تو حیران ہو کے دیکھنے لگا کہ میں کہاں آگیا۔ پھر جو دوسری طرف نگاہ کی تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک ماہ رو نازنین سو رہی ہے جس کے حسن کی تاب سے سارا محل جگمگا رہا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سو جان سے عاشق ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں مدمالتی کی بھی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ پلنگ پر ایک حسین نوجوان لیٹا ہوا ہے بگڑ کر کہنے لگی کہ تو کون؟ کیا تو جان سے بیزار ہے جو یہاں آیا ہے۔ منوہر نے کہا یہ تو میرا محل ہے، راجا بکرم کا بیٹا اور کلنک گیر کا کنور ہوں۔ یہ سن کر وہ بہت ہنسی کہ تو دیوانہ ہے، یہ مہارس نگر ہے اور اس محل میں میں رہتی ہوں۔ میرا باپ دھرم راج یہاں کا راجا ہے۔ دونوں حیران و ششدر رہے۔ آخر آپس میں ملتے ہیں اور ایک دوسرے پر فدا ہو جاتے ہیں۔ ایک پلنگ پر آجاتے ہیں اور ایک دوسرے سے انگوٹھی بدلتے ہیں۔ بات چیت کرتے کرتے آنکھ لگ جاتی ہے۔ اتنے میں سیر کر کے پریاں واپس آجاتی ہیں۔ ان کو ایک جگہ دیکھ کر جدا کرتے ہوئے جی کڑھتا ہے۔ پھر یہ خیال آتا ہے کہ اگر واپس نہیں لے جاتیں تو اس کے ماں باپ رو رو کے جان دیدیں گے۔

اور خدا سے دعا مانگتی ہیں کہ ہم اسے لے تو جاتے ہیں لیکن اے کارساز تو انہیں پھر ملا دے - منوہر کو اٹھا کر اس کے محل میں پہنچا دیتی ہیں - جب صبح کو آنکھ کھلتی ہے تو سخت بیچین ہوتا ہے اور حالت روز بروز ابتر ہونے لگتی ہے - راجا یہ دیکھ کر بہت پریشان ہوتا ہے - نجومیوں کو بلا کر پوچھتا ہے وہ کچھ نہیں بتا سکتے - منوہر کی ایک دائی تھی جسے وہ اپنی ماں کی برابر سمجھتا تھا اور بہت محبت کرتا تھا - وہ مہر و محبت کی باتیں کر کے منوہر سے اس کا حال پوچھتی ہے - وہ سارا قصہ بیان کرتا ہے - دائی بہت تسلی تشفی دیتی ہے اور پھر راجا سے ساری کیفیت بیان کرتی ہے - راجا بہت سے ہوشیار اور طرار شاطر لوگوں کو مہارس نگر کی تلاش میں بھیجتا ہے - وہ ملک ملک پھرتے ہیں مگر مہارس نگر کا کہیں پتا نہیں لگتا اور مایوس ہو کر واپس آجاتے ہیں - تب راجا بیٹے سے کہتا ہے کہ مہارس نگر کا کہیں پتا نہیں ملتا یہ تیرا وہم ہے یا سایہ ہے ' اس خیال کو چھوڑ دے - منوہر نہیں مانتا اور کہتا ہے کہ تم مجھے جانے دو میں خود ہی اپنی محبوبہ کو تلاش کروں گا - باپ نے چار و ناچار منظور کر لیا اور کہا اچھا جاتے ہو تو بادشاہوں کی طرح جاؤ کہ تمہاری عزت بھی ہو ــ

سامان سفر تیار ہوتا ہے اور کئی جہاز پر تمام ساز و سامان اور مصاحبوں اور ملازموں کو لے کر روانہ ہوتا ہے - رستے میں ایک بڑا اژدہا ملتا ہے وہ جہاز کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتا ہے - سب ساتھی ڈوب جاتے ہیں اور یہ بمشکل کنارے پہنچتا ہے - پھر ایک صحرائے آتشیں ملتا ہے - وہاں ایک بزرگ سے ملاقات ہوتی ہے - وہ اسے رستہ بتاتے ہیں اور ایک چکر دیتے ہیں جو سب آفات

کو دفع کرتا ہے - چلتے چلتے ایک عظیم الشان باغ میں جا پہنچتا ہے جہاں وہ ایک عالیشان مکان دیکھتا ہے اور دروازہ کھول کر اندر جاتا ہے - کیا دیکھتا ہے کہ اندر ایک حسین نازنین لیٹی ہے - تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھ کھلتی ہے تو اس اجنبی کو دیکھ کر حیرت کرتی ہے اور پوچھتی ہے کہ تو کون ہے اور یہاں کیسے آیا - وہ اپنا سارا حال بیان کرتا ہے - یہ حال سن کر وہ حسینہ ہنسی اور پھر روئی - اس نے سبب پوچھا تو کہا کہ تیرے نصیب میں سکھ ہے اور میرے نصیبوں میں دکھ - میں تجھے خوش خبری دیتی ہوں کہ تو اپنی محبوبہ سے ملے گا - میں مدمالتی کی بڑی عزیز سہیلی ہوں - میرا نام چنپاوتی ہے اور میرا باپ سورمل ہے اور اپنے ملک کا راجا ہے - ہم میں اور دھرم راج میں بڑا اتفاق و اتحاد ہے اور مجھ میں اور مدمالتی میں بہنا پا ہے - میں ایک روز اپنی سہیلیوں کے ساتھ باغ کی سیر کر رہی تھی کہ یکایک ایک آندھی آئی - اس آندھی میں سے ایک دیوزاد نکلا اور مجھے اُڑا کر لے گیا - اب اس کے پھندے میں ہوں - یہ کہہ کر وہ رونے لگی - منوھر نے کہا رو مت ' میں تجھے اس کے پنجے سے چھڑاؤں گا - اُس نے کہا وہ بڑا قوی اور زبردست دیوزاد ہے ' بنی آدم کی کیا مجال کہ اس کا مقابلہ کرے - اتنے میں دیو کی آمد کا غلغلہ ہوا - اُس نازنین نے کہا کہ چھپ جا ورنہ ہلاک کر ڈالے گا اور میں بھی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤں گی - وہ نہ مانا اور لڑنے پر مستعد ہو گیا - اور دیو کو ہلاک کر کے چنپاوتی کو ساتھ لے روانہ ہوا - چلتے چلتے وہ کنچن نگر میں پہنچے اور ایک باغ میں جاکر ٹھہر گئے - مگر دیکھا کہ سارے شہر پر اُداسی چھائی

ہوئی ہے، ہر شخص اداس ہے اور ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آتی ہے - کنور نے یہ حال دیکھ کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہاں کے راجا کی ایک لڑکی تھی وہ یکایک غائب ہوگئی، اُس وقت سے راجا پرجا سب مغموم اور پریشان ہیں - آخر جب کنور نے چنپاوتی کو ماں باپ سے ملایا تو ان کی جان میں جان آئی اور سارے شہر میں خوشیاں منائی گئیں - راجا اور رانی نے کنور کی بڑی خاطر و مدارات کی اور حال معلوم ہونے پر اُسے بہت تسلی دی اور کہا کہ غم نہ کر، تو جس لیے پریشان ہے وہ تجھے بہت جلد مل جائے گی -

چنپاوتی کی ماں نے مدمالتی کو بلا بھیجا - وہ اپنی سہیلی سے مل کر بہت خوش ہوئی - چنپاوتی کی ماں نے ترکیب سے مدمالتی کا حال پوچھا اور ایسی ہمدردی سے باتیں کیں کہ اُس نے اپنی ساری حقیقت کہہ سنائی - تب اس نے چپکے سے مدمالتی اور منوہر کو ملا دیا - یہ دونوں بچھڑے ہوے آپس میں ملے تو دنیا و مافیہا کو بھول گئے - جب مدمالتی کو بہت دن ہوگئے تو اس کی ماں نے مدمالتی کو بلانے کے لیے اُس کی ایک سہیلی کو بھیجا - چنپاوتی کی ماں نے اُسے کسی کام پر لگا دیا - پھر دوسری آئی پھر تیسری - مگر وہ ٹالتی رہی - یہ حال دیکھ کر مدمالتی کی ماں کو طرح طرح کے وسواس آنے لگے - آخر اُس سے صبر نہ ہوسکا اور خود پہنچی - آتے ہی کہنے لگی بہن! مالتی کہاں ہے، مجھے اس کی صورت دیکھے بغیر چین نہیں - اس نے کہا چترسال میں ہے - میں ابھی بلائے لاتی ہوں - ماں سے صبر نہ ہوسکا خود بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لی - جب چنپاوتی کی ماں نے چترسال کے دروازے پر مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتی ہے کہ سریکا

(مدمالتی کی ماں) بھی آ پہنچی ہے - اس نے کہا بہن تمہیں تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں میں بلا لاتی ہوں - سریکا کو شبہ ہوا کہ دال میں کچھہ کالا کالا ہے ' وہ بھی اندر گھسی چلی آئی - دیکھا کہ مدمالتی اور منوہر گلے میں بانہیں ڈالے بیٹھے ہیں - دیکھتے ہی تن بدن میں آگ لگ گئی - گلاب کا شیشہ قریب ہی رکھا تھا ' اس میں سے کچھہ گلاب نکال ایک ایسا منتر پڑہ کر مدمالتی پر چھینٹا مارا کہ وہ طوطی بن کر اُڑ گئی - اب جو دیکھا کہ چڑیا اُڑ گئی تو رونے پیٹنے لگی - مگر اب کیا ہوتا ہے —

یہ طوطی فراق کی ماری جنگلوں میں پھرتی اور چھپ چھپ کر رہنے لگی - اتفاق سے جس روز یہ ایک باغ میں جاکر اُتری وہاں ایک راجا کا بیٹا جس کا نام چندر سین تھا شکار کھیلتا ہوا پہنچا - اس کی نظر جو طوطی پر پڑی تو وہ اسے بہت بھائی اور اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جیتی پکڑ لو ' خبردار جو اسے کچھہ بھی ایذا پہنچی - ان لوگوں نے بہتیری کوشش کی - کسی طرح دام میں نہ پھنسی - آخر خود کنور نے ایک خوبصورت جال لگایا - طوطی کو اس کی محبت پر رحم آیا اور خود جال میں آگئی - اب چندر سین کو طوطی سے اس قدر الفت ہوگئی کہ کسی وقت اپنے سے جدا نہ کرتا تھا - مگر اسے مغموم دیکھہ کر خود بھی مغموم رہتا تھا - ہر چند وہ اسے کھلانا پلانا چاہتا تھا مگر وہ کچھہ کھاتی پیتی نہ تھی - آخر کنور نے بھی کھانا پینا چھوڑ دیا - جب طوطی نے یہ دیکھا تو ناچار اس نے زبان کھولی اور سمجھانا شروع کیا - وہ کسی طرح نہ مانا اور کہا کہ تو سچ سچ اپنا حال بتا ورنہ میں اپنی جان دیدوں گا - تب طوطی نے اپنا سارا حال جو گزرا تھا بیان کر دیا - اس سے وہ اس قدر متاثر ہوا کہ

اس نے کہا کہ میں تیرے کنور کو جہاں کہیں بھی ہوگا ڈھونڈھ کر لاؤں گا اور تجھہ سے ملاؤں گا - دوسرے هي دن اس نے باپ سے پردیس مین شکار کھیلنے کي اجازت لي اور فوج اور ساز و سامان لے کر نکلا - طوطي کا پنجرہ ساتھہ تھا - چلتے چلتے مہارس نگر پہنچے - دیکھا کہ اس دیس کي حالت بہت خراب اور ویران ھے - شہر سنسان اور لوگ پریشان حال ھیں - ایک باغ میں پہنچ کر جو جنگل سے بدتر تھا ایک بوڑھي مالن سے دریافت کرنے پر معلوم ھوا کہ راجا کي کنیا غائب ھوگئي ھے ' راجا رانی اور سارے لوگ غم و الم میں مبتلا ھیں - یہ کہہ کر وہ ضعیفہ رونے لگي - چندرسین نے بہت کچھہ تسلي دی اور پنجرہ کھول کر اس کا نام و نشان بتایا - وہ خوشی سے باغ باغ ھوگئي اور خبر لے کر راجا کے پاس پہنچي - دونوں دوڑے آئے اور چندرسین سے ملے اور بڑی خاطر تواضع کے ساتھہ گھر لے گئے - اور طوطي کا جادو اتارا اور وہ پھر انسان ھوگئي - بچھڑے ھوے ملے اور اس کے ماں باپ چندرسین کے بہت ھي ممنون ھوے - لیکن مدمالتي پر عشق کا جنون سوار تھا اور وہ منوھر کے فراق میں سخت بے تاب اور بے قرار تھي اور روز بروز اس کي حالت خراب ھوتي جاتي تھی - چندرسین نے جب یہ دیکھا تو اس کے ماں باپ سے کہا کہ اگر تم کہو تو میں منوھر کو ڈھونڈھ لاؤں ورنہ مدمالتي کا جینا دشوار ھے - وہ اس بات سے بہت خوش ھوے اور اقرار کیا کہ ھم اس معاملے میں ھرگز خلاف نہ کریں گے —

مدمالتي کے گم ھو جانے کے بعد سے دھرم راج اور سورمل کے دلوں میں نفاق پیدا ھوگیا تھا اب جو مدمالتی آگئي تو دل سے کینہ جاتا

رہا اور ایک خط لکھہ کر چندرسین کے ہاتھہ بھیجا - چندرسین جب خط لےکر سورمل کے پاس پہنچا تو وہ خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا اور چندرسین کو راجا اور رانی نے اپنی آنکھوں پر بٹھایا - وہاں جاکر معلوم ہوا کہ مدمالتی کے جاتے ہي منوہر کی حالت ابتر ہوگئی اور جنون کی حالت میں کہیں نکل گیا بہتیرا ڈھونڈا کہیں پتا نہ لگا - یہ لوگ افسوس کے ساتھہ یہ ذکر کر ہي رہے تھے کہ ایک ملازم دوڑتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ منوہر بازار میں دیوانہ وار پھرتا ہوا نظر آیا ہے - لڑکے اس کے پیچھے تالیاں بجاتے ہیں اور لوگوں کا آس پاس هجوم ہے - یہ سنتے ہی سورمل اور چندرسین دوڑتے ہوے گئے اور اسے لےکر آے - جب اسے مدمالتی کی واپسي کی خبر سنائی تو وہ ان کے پانووں پر گر پڑا - تب اسے نہلا دھلا کر کپڑے پہنائے اور سورمل اور چندرسین منوہر کو لےکر مہارس نگر چلے - اُن کے آنے کي خبر ہوئي تو دھرم راج پیشوائی کے لیے گیا اور بڑی تعظیم و تکریم سے لےکر آیا - سارے شہر میں خوشی کي لہر دوڑ گئی - شادی کي تو ٹھیر ہي چکي تھي ' خوب خوب جلسے ہوے - شادی کے بعد منوہر اپني دلہن کو لےکر کنچن نگر کي طرف روانہ ہوگیا - وہاں یہ عیش و عشرت سے رہنے لگے - مدمالتي چندرسین سے بےحجابانہ ملتي تھي لیکن چنپاوتي چہرے پر نقاب ڈالے رہتي تھي - اتفاق سے ایک روز اس نے چنپاوتي کو دیکھہ لیا - دل و جان سے عاشق ہوگیا - اور حالت کچھہ سے کچھہ ہوگئي - جب یہ کیفیت مدمالتي اور منوہر پر ظاہر ہوئي تو انھوں نے چنپاوتي کے والدین سے گفتگو کرکے ان دونوں کي شادی کردی —

اب منوہر اور چندرسین کو اپنے اپنے وطن کی یاد آئي اور اجازت

لے کر روانہ ہوے۔ منوھر اور مدمالتی بہت سے شہر اور ملک طے کرکے کنک گیر کے قریب پہنچے۔ بکرم کو جو معلوم ہوا کہ کوئی راجا لاؤ لشکر لیے چلا آرھا ہے تو اس نے جنگ کی تیاری کی۔ جب اس کا قاصد غنیم کے کیمپ میں خبر لینے کو پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ تو کنور ہیں۔ پھر کیا تھا جنگ کا سامان سامان عیش و عشرت ہوگیا اور بچھڑے باپ بیٹے ملے، ماں کے پاس آئے اور وہ دونوں کو دیکھ کر باغ باغ ہوگئی اور سارے ملک میں خوشی و خرمی کا سماں نظر آنے لگا —

اس مثنوی میں بھی اردو فارسی کی اکثر مثنویوں کی طرح دیووں اور پریوں اور سحر و طلسمات وغیرہ کا ذکر پایا جاتا ہے۔ قطع نظر اس کے یہ مثنوی دکنی اردو میں خاص امتیاز رکھتی ہے —

علاوہ حسن شاعری اور زور کلام کے جس کا ذکر آگے آئے گا اس میں بعض ایسی خصوصیتیں ہیں جو اس سے قبل کی مثنویوں میں کم پائی جاتی ہیں۔ مثلاً وہ ہر عنوان کے شروع میں ایک شعر لکھتا ہے جس میں اس باب کے مطالب کا خلاصہ آجاتا ہے۔ تمام عنوانات کے اشعار ایک ہی بحر اور قافیے میں ہیں۔ اگر ان تمام اشعار کو ایک جاکر لیا جاے تو ایک قصیدہ ہوجاتا ہے جس میں سارے قصے کا خلاصہ آجاتا ہے۔ مومن اور وجدی وغیرہ نے بھی اپنی مثنویوں میں اس طرز کی پیروی کی ہے۔ مثال کے طور پر ابتدا کے دو شعر یہاں لکھے جاتے ہیں:

ثنا صانع کی ہے جن اس کتاب عشق کا بانی
دیا ہے حسن کوں خلعت کے ہر یک جز پہ عنوانی
رکھیا ہوں گلشن عشق اسم اس رنگیں قصے کا میں
کرے جس چھب کے پھولاں پر فلک شوقوں سے گلدانی

اکثر باب کے شروع میں مختلف قدرتی مناظر کا جلوہ دکھاتا ہے اور قصے کے ضمن میں جو بعض حالات اور واقعات پیش آتے ہیں ان کی تصویر خوب کھینچتا ہے - مثلاً جہاز کے سفر میں کشتی کا حال ' باغ اور پرندوں کی کیفیت ' شادی بیاہ کا حال ' برف باری کی کیفیت' کھانوں کی تفصیل وغیرہ - اسی طرح طلوع و غروب آفتاب ' چاندنی کا سماں موقع موقع سے خوب بیان کیا ہے —

انسانی جذبات کی کیفیت بھی ہر موقع پر بڑی خوبی سے دکھائی ہے —

اکثر ابواب کے خاتمے پر نصیحت آمیز اشعار لکھے جاتا ہے —

کلام میں طول ضرور ہے - وہ ایک ابلتا ہوا چشمہ ہے جس کا روکنا مشکل ہے —

یہاں اس مثنوی کے بعض مقامات کا انتخاب دیا جاتا ہے - اس مثنوی نیز اس کے بعد علی نامے اور تاریخ اسکندری کے انتخابات میں نے کسی قدر ضرورت سے زیادہ دے دئے ہیں - اس سے مضمون طویل ہوگیا ہے لیکن اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ چونکہ یہ کتابیں عام طور پر دستیاب نہیں ہوتیں. خاص کر آخری دو کتابیں ' جن میں سے علی نامہ کا ایک آدھ نسخہ تو خیر یورپ میں کہیں مل بھی جاتا ہے لیکن تاریخ اسکندری کا نسخہ سوائے میرے کتب خانے کے کہیں نہیں ہے - اس لیے ان انتخابات سے نصرتی کے کلام اور زور بیان کے صحیح اندازہ کرنے میں بہت مدد ملے گی —

نصرتی کا قاعدہ ہے کہ وہ اپنی مثنویوں میں حمد بھی اسی ڈھنگ کی لکھتا ہے جس رنگ کی مثنوی ہوتی ہے - چونکہ گلشن عشق ایک

عشقیہ مثنوی ہے اس لیے حمد کے اشعار بھی اُسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں —

صفت اس کی قدرت کی اول سراؤں دھریا جس نے یو گلشن عشق ناؤں
کیا کر گرم عشق کا تس ابھال * یو باغ آفرینش کا پکڑیا جمال
عجب کوئی توں اے باغبان جہاں کہ صنعت میں تجھہ چل سکے نا زباں
رنگا رنگ جے گل یو بن باس ہے او ہر گل میں تجھہ عشق کی باس ہے
اپس حسن دیکھلا ہر یک تہار ہور ہریک دل میں پاڑیا † ہے کئی بھانت شور
کدھیں نور یوسف کوں دے شب چراغ دیا عشق کا تس زلیخا پہ داغ
کدھیں پاڑ شیریں سوں خسرو کو کام کیا کوہ کن کوں وفا میں تمام
کدھیں نیہ لیلی کے الٹی ‡ دل میں بیس § پھریا ہو کے مجنوں گنوا بد کو قیس
کھیتے پھول ایسے کھلا یا ہے ہور اجھوں $ بن میں تس بلبلاں کا ہے شور
دیا عشق کوں تونچہ عزت کہاں تہیں ہے جمیلٌ وہ یحب الجمال
نظارے میں ہارت نظر باز کوں دسے ہر طرت تیری قدرت کا سوں
زمیں توں قطعۂ مصور کیا فلک کا توں انور مرقع کیا
فلک کے زنگاری یو صفحے کو توں دیوے زیب نت سرخ سر لوح سوں
کدھیں تس میں بوٹا سونیری ؟ دھرے کدھیں تس میں لیا گل روپیری ** بھرے
نہ کس سار †† توں کوی نہ تجھہ سار ہے صفت بھی تری مثل تھے ‡‡ بھار §§ ہے
توں باقی فنا جگ یو لاریب ہے توانا تہیں عالم الغیب ہے
اتھا تونچ $$ اول ہور آخر تہینچ سمجتا سو مخفی و ظاہر تہینچ

---

* ابر - † ڈالا ہے - ‡ بہت - § کھسا - $ ابھی - ؟ سنہری - ** روپہلی -
†† مانند - ‡‡ سے - §§ باہر - $$ توہی —

ترے نور کا شعلہ ھر† گھٹ اچھے — گپت تونچ ‡ ھور تونچ پر گٹ $ اچھے
ھمیں کیا جو ھمنا تھی کچھہ ھوے بات — کہ جو اصل جیو ھے سوو تیرے ھات
تہیں دل کے عالم کو کیتا وسیع — فلک عقل کا تونچ کیتا وسیع
دیا عقل سا جیو کوں یار شفیق — اُسے تیں دیا پانچ حس کر رفیق
جہاں پر وری میں کرم کے اوپر — دھرے دوست دشمن پہ توں یک نظر
سیویں § مسجد ھور دیری تجھے — منگیں دل سوں سب میت ¶ وبیری تجھے
توں جگ میت** ھے ھورناتے سوں پاک — توں مطلوب طالب ترے لاک لاک

مناجات کے چند شعر ملاحظہ کیجیے

الٰہی تہیں جگ کوں داتار ھے — کرم محض تجھہ پر سزاوار ھے
غریباں پہ بخشش میں نیارا سوتونچ — منگے تے †† بھی لئی ‡‡ دینہارا سوتونچ
الٰہی میں اس جگ میں گم نام تھا — ادک $$ پختہ کاراں میں ات §§ خام تھا
عنایت کیا آسمانی ¶¶ مجھے — بچن کی دیا در فشانی مجھے
ھر یک در بھی شاھاں کے لائق دیا — بہا نورتن تے بھی فائق دیا
رتن دیکھتے لوک لیا تا سو میں — سمجتے ھیں کوی کان تے پایا سو میں
میرا سینہ خالیچ یک کھن * ھے پن — بھرے فیض تجہ پل میں کئی لک رتن
میرے من کا طوطی تو بے کام ھے — کرانا تو بات اِس کو الہام ھے
سخن دل میں اُپجا نہارا ††† تہیں — زبان پر اُسے لیا نہارا تہیں
میرا من توتھا خار زار یک جنگل — کیا باغ تیرے عطا کا چ جل
رنگا رنگ پھلبن جو ھیں بے قیاس — وو ھر گل کوں دے معرفت کی سُباس ‡‡‡

---

† وجود - ‡ پوشیدہ - $ ظاھر - § پوجیں - ¶ دوست - ** عالم دوست - †† سے -
‡‡ بہت - $$ ' §§ نہایت - ¶¶ بلندی - * کان - ††† پیدا کرنے والا - ‡‡‡ خوشبو -

نہالاں خیالاں کے بن کے تمام تو لنہار رکہ تجہ ہوا میں مدام
رنگیلا یو ہر یک نزاکت کا پات پسارya جو ہے تیری رحمت کوں ہات
او ہر ہات رحمت سوں کر پورتوں عطا کر سو نورؒ و ۲ علی نور توں
دے ایسا سخن کے جہاں میں قلم جو الہام کی فوج کا ہوے علم
دیکھاؤں جو تجہ تھے جے خیال کہ اُس شعر کو عین سحر حلال
ہر یک حرت تیں کر دیکھا جام جم معانی میں تس بھر مسیحا کا دم

نعت

زہے نامور سید المرسلیں کہ آخر ہے وے شافع المذنبیں
عجب آفرینش کے دریا کا در کہ جس نور تھے بحر ہستی ہے پر
نول * رکھہ † پہ خلقت کے ایدل توریج ‡ وہی پہل ہے آخر جو اول ہے بیچ
تہیں حق سے نت ہمزباں ہمکلام تجے قاب قوسیں ادنی مقام
تہیں لامکاں کے دھنی کا انیس توں بے مثل بے شبہ کا ہم جلیس
زباں سوں امولک گہر سنچ تونچ دھرے سینہ حق راز کا گنج تونچ
جتے مرسلاں میں تو اپروپ ہے او طالب ہے تو حق کا مطلوب ہے

منقبت کے بعد حضرت بندہ نواز کی تعریف بھی بڑی عقیدت سے کی ہے - چند اشعار یہاں لکھے جاتے ہیں —

زباں دھو کے پھل نیر * سوں مکھہ میں لاؤں
یو سید محمد حسینی کا ناؤں

---

* نہا ' جدید - † درخت - ‡ فریفتہ ہو - * عرق گلاب —

جتے عاشقاں میں اچھے سر فراز
جتے جگ کا مخدوم بندہ نواز

نصرت تجھے مخزن عین کا
پروتا † ہے توں آس دارین کا

کیا پل میں فیروز شاہ کو قباہ
گھڑی مہنچھ سلطان احمد کوں شاہ

جو کوئی تجھہ محبت کے ماتے اھیں
وہ دنیا میں رہ دین پاتے اھیں

دکن کي عجب بختور خاک ہے
کہ جس بیچ تجھہ خوابگہ پاک ہے

اس کے بعد علی عادل شاہ کي مدح ہے ' پہلے ھي شعر میں اُسے اپنا اُستاد کہتا ہے " پیچھے پیر کے وصف اُستاد ہے " - اسي میں بادشاہ کي سخن سنجي اور سخن گوئی کي بھي تعریف ہے - وہ اشعار اس سے پہلے نقل ہو چکے ھیں —

رکھنہار ناموس عزت کوں تونچ بڑا سب تے اب عقل و ھمت کوں تونچ
زہے نوجوان عقل میں پیرتوں بڑا دوربیں نیک تدبیر توں
زمانے کا سررشتہ ساندیا ‡ تہیں توٹا چرخ کا تھاٹ باندیا تہیں
اتھا عشق ذرہ ھوا تجھ تھے سور ھر یک شے میں اپنا دیکھا یا ظہور
دیا عشق کي بات کوں توں سواد کیا کہنہ قصہ زمانے نے یاد
زمانے کی میں یادگاري بدل لکھیا قصہ تجھ ناؤں سوں میں نول

---

† پورا کرتا ہے - ‡ جوڑا —

حسب حال میں لکھتے ہیں —

سخن کا محل ہے زہے پائدار رہنہار ہے جگ میں جم برقرار

بندیا جن عمارت یو بنیاد سوں قیامت تلک نہ ڈھلے باد سوں

اس کے بعد اپنے والد اور اپنی تربیت اور بادشاہ کی قدر دانی وغیرہ کا ذکر ہے جس کا بیاں اس سے قبل آچکا ہے —

حسب حال کے بعد عقل کی تعریف میں کچھہ اشعار لکھے ہیں

بزرگاں کا یو نقل حجت اہے کہ العقل نصف الکرامت اہے

کنا بلکہ فوق الکرامت سدا کہ اس عقل سوں ہم پچھانے خدا

اچھے عقل یک دولت ناپدید اچھے عقل مشکل کی حل کی کلید

چلے عقل تے دین دنیا کے کام دونو جگ میں عاقل دسے نیک نام

آگے چل کر کہتا ہے کہ شعر و سخن کی روشنی عقل ہی کے طفیل میں ہے ۔ یہ سب تعریفیں کرتے کرتے آخر میں کہتا ہے :

اتّل عقل کا گرچہ گنج مست ہے ولے عشق شرزہ زبردست ہے

کہ جس تھار پر ہوے شرزے کی چال تو اس تھار گنج کا چلے کیا مجال

یہیں سے دوسرا باب عشق کی مدح میں شروع ہوجاتا ہے اور اس کے اوصات اور کارستانیوں کے بیان میں خوب خوب شعر کہے ہیں —

کر نہار امرت کو شرمندہ عشق

دھرے نانوں سو جگ میں نت زندہ عشق

بقا کی جسے جگ میں شاہی اچھے

اجل جس کے گھر کا سپاہی اچھے

اتھے داغ میں جس کے مرھم سوں درد
اگن جوش انگے * جس کے لگتی ھے سرد

سدا فکر نو سکھہ † ھو جس پاس اچھے
رگت ‡ نیر § ھور ان جسے ماس اچھے

دلاں کا ھے اے عشق توں بادشاہ
جہاں تر ھے سو وانچہ تجھہ تخت گاہ

دوا راہ کا تجھہ سو کالا دسے
اندھا راچ ¶ تیرا اوجالا دسے

کیا سر خوشی جگ میں مشہور تونچہ
خرابات عالم کیا پور $ تونچہ

تیرا خار بہتر ھے گلذار تھے
تیرا ور †† ھے دیوانہ هشیار تھے

دلاں کوں اگن کھیل تجھہ تے ھوا
انجو ‡‡ تس اپر تیل تجھہ تے ھوا

چڑاوے ستی کوں ترا سے مدن
دیکھا وے تسے آگ کر پھولبن

جلانا ھوس سوں مرا دھیان ھے
سورج تجھہ ھوا کا سوریا §§ پان ھے

نصیحت کو تجھہ شہر میں غدر ھے
ترے ملک میں صبر بے قدر ھے

---

* آگے - † نو آموز - ‡ خون - § پاني - ¶ اندھیرا - $ معمور - †† غالب -
‡‡ آنسو - §§ آفتابي —

اب میں نصرتی کے کلام سے ایسے نمونے دیتا ہوں جن سے اس کی واقعہ نگاری یا جذبات و کیفیات کی قدرت معلوم ہو۔ قصے کی رو داد تو آپ پڑھ چکے ہیں ' اس مقام کا خیال کیجئے جب درویش راجا کی بھیک لینے سے انکار کرتا ہے اور خالی چلا جاتا ہے اور راجا فقیرانہ لباس پہن کر اس کی تلاش میں نکلتا ہے —

پھرا کر * سو شاہی کرے + بھیس کوں
چلیا یوں سنیاسی ہو پردیس کوں

اب فقیری کے لوازمات اُس نے اسی نوعیت کے بیان کیے ہیں جو دیا شنکر نسیم کا رنگ ہے۔اگر وہ اس بیان کو لکھتے تو یقیناً اسی طرح لکھتے - یعنی محنت کی گدڑی زیب بدن کی ' توکل کی کچکول ہاتھ میں لی ' قناعت کی راکھ بدن پر ملی اور آہ کا سنکھ ساتھ لیا وغیرہ وغیرہ —

کلتھا ‡ سخت محنت اب گل § کیا — سو کچکول ثابت توکل کیا
چڑایا سو تن پر قناعت کی راک $ — سنکے ¶ کر لیا آہ کے دم کی ہاک **
صبوری کے مدرے دیا گوش کوں — کیا حلم زنبیل ادک ++ ہوش سوں
یو راحت کوں دنیا کی مرکان ‡‡ کر — لیا راکھنے پگ تلیں آن کر
لیا حرص کے پھاوڑے کوں بغل — جلانے ہوس کی دھونی نت سکل
کمر بستہ ہمت کا بھاری کیا — اتل قصد کے ہت $$ موتاری ¶¶ لیا
دھرن جلد ہر کام میں تیز ہات — لیا خوش خیالاں کے چیلے سنگات

* بدل کر - + کے - ‡ گدڑی - § گلے - $ راکھہ - ¶ سنکھہ - ** آواز ' شور
++ بہت ‡‡ مرگ چھالا - $$ ہاتھہ - ¶¶ ڈنڈا —

راجا ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے جب درویش تک پہنچتا ہے تو اُس پر فضا مقام کا سماں کھینچتا ہے - کہ اس سبز زمین میں حوض بھرے بھرے ایسے پیارے معلوم ہوتے تھے جیسے ہرے طبق میں شراب بھرے پیالے - چمنوں میں چوطرت پانی نہیں بہہ رہا تھا بلکہ جام سے شراب سے لبریز ہورہا تھا اور وہ شراب بہہ بہہ کر درختوں کے رگ و پے میں پہنچ رہی تھی جس کی مستی سے درخت مدھوشی کے عالم میں جھوم رہے تھے - کنول کی خوبصورت کلیاں ایسی بھلی معلوم ہوتی تھیں جیسے چینی شیشوں میں رنگ برنگ شراب - زمین جا بجا خوبصورت پیالوں سے بھری ہوئی تھی گویا صبا کے ساقی نے ان سے بزم کو آراستہ کر رکھا تھا - سنبل نے اپنی زلفیں چھوڑ رکھی تھیں اور پھولوں کی ڈالیاں معشوقوں کی طرح مست جھوم رہی تھیں - جب سارا بن (باغ) مستی سے بے حس ہوگیا تو باد صبا نے ازراہ تفنن خاص ادا سے کلیوں پر ٹھنڈا پانی چھڑکا اور وہ مخمور (چمن) کھلکھلا کر ہنس پڑا - پھر بزم از سر نو تازہ ہوگئی اور راگ رنگ کا دور شروع ہوا - ہوا نے مطرب بن کر پتوں کا دف بجانا شروع کیا اور کوئلیں اور پپیہے تانیں اڑانے لگے - مور ناچنے لگے، کبوتروں نے قلابازیاں کھائیں ' فاختہ کو کو کرنے لگی ' وغیرہ وغیرہ ' اب نصرتی کے اصل اشعار سنیے —

شہیں حوض پر ہر چمن میں ہرے طبق سبز میں جام جوں مے بھرے

بہتا تھا نہ چمناں میں چو گرد آب او لبریز تھا جام تے تس شراب

وہی ہو ہر یک رکھ کے تن میں اثر متے * ہو کے جھولتے تھے ات بے خبر

* مست

سہاویں کلیاں یوں کنول کیاں سرنگ کوپیاں چین کیاں مے بھریاں رنگ رنگ
پیالیاں سے خوش بھوئیں چنپی جا بجا رکھی بزم میں بھر او ساقی صبا
لٹاں چھوڑ سنبل کی خوش بال کیاں نگاراں ڈولیں مست پھل ڈال کیاں
رهی تھک ہو جب بن خماری کے سات صبا باؤ کے هت سوں هنسنے کے دهات
کلیاں پر ٹھنڈا نیرست چوپ سوں وہاں هنسا تس مکدر اُنیلدیاں کی تمیں
کریں بزم کو تازہ پھر بیدرنگ دهرے جشن میں سر تے*خوش راگ رنگ
هو مطرب پون برگ کا دت بجائی پپیا و کوڈل نوی تان اُچائی
سو سرخاں دیویں کھینچ سر خوش گلا کریں کوک کوکے دلاں مبتلا
لگے ناچنے مھور + هو بے خبر کریں حال لوٹن نکل رقص پر
هوا دهر کبوتر ‡ کلاٹاں میں آے پراں جوڑ تالیاں سوں دستک بجاے

دیکھئے طلوع آفتاب اور دن کے نکلنے کو کس طرح بیان کرتا ھے - صبح نے جب شرق کے پل کے بند کا (جو دریاے طلا پر بندھا ھوا تھا) ڈٹا کھولا تو نور کا سیلاب اُبلتا ھوا نکلا اور دنیا میں چاروں طرف پھیل گیا - اس عالم کا حوض غدیر جو خالی پڑا تھا' اس میں ھر طرف سے سونے کا پانی بھر گیا - فلک نے اپنے چھاتی سے سیاھی کو دھویا اور زرین لباس سے جگمگانے لگا - خلقت کی آنکھوں کے کواڑ کھلے اور رات بھر کے جو مخمور تھے انھوں نے اپنے ھوش حواس درست کیے —

صبح شرق کے پال کے پل تے ٹھوک نکالیا جو کنچن کے جب تم تے کوک
اُبلتا نکل نور کا نیر تب ھو آمیز عالم میں چوندھیر سب
تھی تھا سو یو جگ کا حوض غدیر بھریا شش جہت بیچ کنچن کا نیر
سیاھی کوں چھاتی تے دھویا فلک زر افشان کسوت سوں پکڑیا جھلک

* از سر نو - + مور - ‡ قلا بازیاں -

کواڑاں کھولے خلق کی نین کے دھری سدہ جو مخمور تھے ریں کے

سورج کا طلوع تو آپ نے دیکھہ لیا اب چاند کي جلوہ فرمائي ملاحظہ کیجئے - اس میں نصرتي نے اپني شاعری کا زور دکھایا ہے —

ڈوباتي او نیلاب مغرب میں رخش	راتنے اپنا مشکي گھوڑا مغرب کے دریامیں ڈالا
نکل آئی نس * ہو ھتو† فیض بخش	اور فیض بخش دوست بن کر نکلي
چندر پاک چھاتي تے دھو یا غبار	پاک چاند نے اپني چھاتي سے غبار دھویا
سورج کا ہوا آئینہ تا بدا	اور سورج کا آئینہ (بدر) روشن ہوا
دیے جلوہ خوش نسپتي ‡ کے حضور	تاجدارشب کے حضور میں جلوہ دکھانے کے لئے
کیا پردہ پردہ نشیناں تھے دور	سب پردہ نشینوں نے پردے اٹھا دیے
دینے جوش پر نور سیلاب کا	پر نور سیلاب کے جوش دینے کے لیے
ہوا تھا کوا چاند سیماب کا	چاند سیماب کا کنواں بن گیا تھا
گگن پر نہ ہر تھار تارا دسے	آسماں پر کہیں کوئي تارا نظر نہ آتا
کٹورے بھریا او یارا	وہ بالکل ایک پارا بھرا کٹورا معلوم ہوتا تھا
صفائی سوں چندنے کے چارو رخن	چاندني کي براقي سے چاروں طرف
جھلکتی تھي بھوئیں صاف ابرک ذمن	زمین ابرک کي طرح چمک رھي تھي
فلک اورزمین پر اتھي نور میں	زمین اور آسماں نور سے بھر پور تھے
چھپیا تھا جتا مشک کافور میں	جس قدر بھی سیاھی تھی وہ سب کافور میں چھپ گئی تھی
مگر کھم پہ چادر مرصع کي ست	ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آسمانپر مرصع چادر تان دی ہے اور زمین پر صاف شفاف چادر بچھی ہوی تھی
زمین پر بچھاے تھے اجلا تکت	
پوں اپ وطن میں دھریا تھا قرار	اُس وقت کوئي پتا تک نہیں ھلتا تھا
نہ کوئي پات ھلتا اتھا اس سنجھار	شاید ہوا وھاں سے رخصت ہوگئی تھي

* رات - † دوست - ‡ سردار شب -

سہاتے تھے یوں پھول پھل ڈال پر　　ڈالیوں پر پھول پھل ایسے بھلے معلوم
پیالے ہیں چینی کے جوں دود بھر　　ہوتے تھے جیسے دود بھرے چینی کے پیالے
کھڑا تھا سب اس دھات حوضاں میں نیر　　حوضوں میں پانی اس طرح ساکت کھڑا تھا
مگر دود کا کر رکھے تھے پنیر　　گویا دودھ کا پنیر بنا کر رکھ چھوڑا ہے

کنور کے ہجر کی حالت بہت تفصیل سے بیان کی ہے ' بعض وقت طول عیب کی حد تک پہنچ جاتا ہے - چند شعر اس مقام کے لکھے جاتے ہیں —

نہ کس سات کہنا مجھے بات بھاے　　نہ کسی سے بات کرنے کو جی چاہتا ہے
نہ کوئی بات بولے تو سن خوش لگاے　　نہ کسی کی بات سن کر جی خوش ہوتا ہے
دسے دیس تو نس اندھاری مجھے　　دن رات سے بھی زیادہ کالا معلوم ہوتا ہے
رین کالے دوزخ تھے کاری مجھے　　اور رات دوزخ سے بھی زیادہ تاریک
انکھیاں کھولتا ہوں تو یک تل نہ بھاے　　آنکھیں کھولنا ایک لحظے کے لیے بھی نہیں
وگر مونچتا ہوں تو یوں خوف آئے　　بھاتا اور اگر بند کرتا ہوں تو ڈر ہے کہ
کہ مت پھر پڑے خواب دندی سوں سنگ　　پھر وہی دشمن جان خواب میں نہ آجاے
سٹے پھر کے خرمن میں من کے انگ　　اور میرے دل کے خرمن میں آگ نہ لگا دے
پڑیا آہ ماہی نمن مجہ رہنا　　مجھے مچھلی کی طرح پڑا رہنا پڑتا ہے
گنواتا زباں ہور نہ چک مونچنا　　زبان بند آنکھیں کھلی ہوئی

جب کنور اپنے ساتھیوں کو لے کر کشتی میں سوار ہوتا ہے تو دریا پر کشتی کی روانی کی کیفیت کسی قدر تفصیل سے بیان کرتا ہے - چند شعر نقل کیے جاتے ہیں —

چلیاں جل پہ کشتیاں ڈھل اس حال میں　|　کشتیاں پانی پہ اس طرح جا رہی تھیں
ڈھلاتے ہیں پارے کو جوں تھال میں　|　جیسے کوئی پارے کو تھال میں رکھ ڈھلکاتا

کبھیں بحر کو خلق کالا بدل ہے گویا یہ بحر کالا بادل ہے
ہور اس تیز کشتیاں کو بجلیاں چپل اور کشتیاں تیز بجلیاں - جس طرح بحر
سبک مہ کی کشتی فلک بحر پر فلک پر چاند کی ہلکی پھلکی کشتی
چلے کیا کہ اس تے بھی یو جلد تر چلتی ہے یہ اس سے بھی تیز تھی - اگر موج
اُٹھے موج گر نہاسنے کف بکف اس سے دوڑ کی شرط باندہ کر دوڑے تو تو تک
کنارے پڑے لیا اپس مکہ میں کف کر کنارے پر جا پڑے گی اور منہ میں کف
بندے باؤ جب یک یکس سوں پھریاں آجائیں گے - ہوا جب زور سے چلتی ہے تو
بلند موج سوں چڑ اتر کہاں سڑیاں اونچی موجیں چڑھنے اترنے کی سیڑھیاں
چڑ میں تو چڑتی چلیں ماہ لگ | بن جاتی ہیں چڑھتے وقت وہ (کشتیاں) ماہ
اترنے میں اتریں سو ماھی تلگ تک پہنچ جاتی ہیں اور اترتے وقت ماھی تک
جتیا کچھہ جو کشتی کو جھولا لگے
وہ جھولا دریا کوں ہنڈولا لگے
دس آوے سو دیکھیں تو جو پھیر جب | جب دیکھتے ہیں تو چاروں طرف کیا
اُپر آسماں ہور تایں نیر سب نظر آتا ہے - اوپر آسماں اور نیچے پانی

اس کے بعد شاعر نے سمندر کی مخلوق کا حال بیان کیا ہے اور طرح طرح کے جاندار جو اس میں آباد ہیں ان کا ذکر نام لے لے کر کیا ہے —

اسی مسافرت میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں انتہا درجے کی سردی تھی اور برف باری اور غضب تھی - اس سمے کا بیان طول طویل ہے صرف چند شعر لکھے جاتے ہیں :

اتھا نزع میں جیو ہر بات کا ہر پتے کی جان نزع کی حالت میں تھی
کلیاں میں نہ تھا خندہ خوش دھات کا کلیوں میں بھی اب ہنسی کا کوں نشاں باقی نہ تھا

نه سکتي تهي هو کونپلي سر فراز
کونپلوں میں اتنا دم نه تها که سر اُٹھا سکیں

نه تک هوسکے بیل کا هت دراز
اور نه بیل هاتهه دراز کر سکتي تهي

چهپیاں سو کلیاں اور تُوپن لهات
کلیوں نے تُوپ اور لهات اوڑھ رکھا تھا (یعنے پتوں میں

هوا تها سو اس پر بهي یخ کا غلات
چھپ گئی تھیں) اور ان پر یخ کا غلاف چڑھا هوا تها

بندی تهی هوا راه پر یخ کي سد
هوا نے رستے میں یخ کی سد باندھ رکھي تهی

اسے دات جانے نه تها کس بهی حد
اور کسی کي قدرت نه تهي که ادھر جاے

مگر سور کے نور کے تیں گگن
شاید سورج کی گرمی سے آسمان نے

نپایا اتها اصل نورے نمن
چونے کی ایک بهتی پیدا کر دی تهی

نکل تستهے جا سب هریالی کے بال
جس کي وجه سے سبزی کے سب بال اُڑ گئے تهے

اتها بهوئیں کی سر چاے چاتیے کا حال
اور زمیں کا حال گنجے سر کا سا هو گیا تها

پڑیا تها نه دریامیں موجاں سوں شور
یه دریا میں موجوں کا شور نه تها بلکه

اتها نیر اوبلتا هو بهوئیں گرم زور
زمیں کے سطح گرم هوجانے سے پانی اُبل رها تها

اسی عنوان سے شاعر گرمی کی شدت بیان کرتا چلا جاتا هے ور طرح طرح کے استعارے اور تشبیهیں استعمال کرتا هے - کنور جب چنپاوتی کے باغ میں جاتا هے تو باغ کے حسن و خوبی ' پهولوں کی بهار ' اور پرندوں کے چهچهانے کا ذکر تقریباً آٹهه صفحوں میں کرتا هے اور شاعری کا پورا زور دکهاتا هے۔ اس میں مختلف قسم کے پهولوں اور طرح طرح کے پرندوں کے نام لیتا اور ان کے حسن و جمال کا بیان تا هے - اس طویل بیان کا انتخاب بهت مشکل هے - صرف چند ر لکهتا هوں —

ح بهشت یک سبز تر باغ تها
کو هر یک پهول جس داغ تها

ستہں عکس سوتس سلور چمن	اگر یہ نورانی چمن اپنا عکس ڈالیں
ستارے بھر یا ہوے ہریا گگن	تو ستاروں بھرا آسماں ہرا ہو جاے
دیکھت مسکتیں گلرخاں ہر کلی	جس کی ہر کلی کو دیکھ کر گلرخ مسکرانے لگیں
کریں دل کو خوباں کی گل گد گلی	اور جس کے پھول حسینوں کے دل میں گد گدی پیدا کریں
چندر گل تے چندر کی چھاتی پہ داغ	گل چاندنی سے چاند کی چھاتی پر داغ تھا
گل سور تے سور کا زرد باغ	اور سورج مکھی سے سورج کا باغ زرد
گل اورنگ کا تختہ یوں روت کا	گل اورنگ کا تختے پر ایسی بہار تھی
کہ جوں پاچ میں کام یا قوت کا	کہ جیسے زمرد میں یاقوت کا کام
اوڑے تو پنکھی تس کدھن پر جھٹک	اگر کوئی پرندہ اُس طرف اُڑنے
پڑے ہرت سوں پر ہو کولا اٹک	کاقصد کرے تو اس کے پر برت سے گل کے گر پڑیں
سو ویسے پہ کیوں آدمی جاے چل	سو ایسی حالت میں آدمی کیونکر چل سکتا ہے
پڑے پانوں دھر تیچ سر لگ پگل	وہاں پانو رکھتے ہی بھیجا تک پگل جاتا ہے

س کے مقابلے میں تمازت اور دھوپ کا رنگ ملاحظہ کیجئے —

جوانی سوں تھی دھوپ بھر روت میں	گرمی کا آغاز شباب تھا شاید
سورج تھا مگر آخر حوت میں	سورج حوت کے آخری درجے میں تھا
نہ کہہ سوربل اگ کا بادل اتھا	اسے سورج نہ کہو بلکہ وہ آگ کا بادل تھا
نہ وو دھوپ یک آتشیں جل اتھا	وہ دھوپ نہ تھی بلکہ آگ کا پانی تھا
مگر کھیلیچ دوزخ کے دریاتے نیر	شاید دوزخ کے دریا سے کھولتا ہوا پانی کھنچ آیا تھا
ہرستا اتھا جگ پہ جلتاچ تھیر	جو متواتر اس دنیا پر برس رہا تھا
کرن ہیں سوسب جل کی دھاریاں دسیں	کرنیں سب اُس پانی کی دھاریاں معلوم ہوتی ہیں
ہریک ذرہ قطرات باراں دسیں	اور ہر ذرہ بارش کا قطرہ

زمیں تے فلک لگ سب یک دھات سوں
زمیں سے آسماں تک ایک وضع پر

بھرے سرور آتش کی برسات سوں
آگ کی برسات سے تالاب بھرے ہوئے تھے

لگی مارنے جب سراباں کی موج
جب سرابوں کی موج چلنے لگی تو

چلی چوکدھیں تپ حرارت کی فوج
ہر طرف حرارت کی فوج چلنے لگی

بھری یوں حرارت ہر یک تن منجھار
ہر ایک کے تن بدن میں حرارت اسطرح بھر گئی

نہ ستلا سہا سک اوبل آئی بھار
کہ سیتلا اندر نہ سما سکی اور باہر نکل آئی

پڑی تھی نہ کیں چھاؤں ہر تن تے ڈھل
یہ جو بدن پر چھانو سی نظر آتی تھی یہ چھانو نہ تھی

او نکلی سو ستلا بھٹی تے اگل
بلکہ سیتلا تھی جو بھٹی یعنی بدن سے باہر نکل آئی تھی

دھڑک دھک ادک اگ کے ہر صبح و شام
ہر صبح و شام آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے

گگن سرخ تانبے نمن ہوے تمام
اور آسماں سرخ تانبا ہو رہے تھے

برستی تھی یوں دھوپ جگ پر کڑک
جہاں پر دھوپ یوں کڑک کر برس رہی تھی

سو کوہ و زمیں رہے تھے چھاتی تڑک
کہ پہاڑ اور زمین کی چھاتی تڑقی جاتی تھی

اس کے بعد پرندوں کا ذکر، ایک ایک کا نام لے کر، بڑی تفصیل سے کیا ہے اور ان کے رنگ روپ اور دوسری خصوصیتوں کو عجب شاعرانہ رنگ میں بیان کیا ہے۔ نمونے کے طور پر صرف چند شعر نقل کیے جاتے ہیں —

پتمبر بندی زرد پیلک نے کھول
پیلک نے زرد ریشم کے کپڑے پہنے

پتیاں کھوت اوڑی دھنور شال کھول
اور کنگھی کر کے (طوس) شال اوڑھی

سلونی خوش الحان کویل سیاہ
کالی سلونی اور خوش الحان کویل نے

کری شام کسوت ادک خوش نگاہ
سیاہ دلفریب لباس پہنا

تیتوری رنگی پاؤں مہندی سوں سب
تتیری نے پانوں مہندی سے رنگے

کری پان طوطی نے کہا لعل لب — اور طوطی نے پان کہا کر لب رنگیں کیے
کوا چور کشتی کہل تازہ اوز — چور کوا لیا کالا کہل اوڑہ کر
کرے گشت الکاں کو نا جاے چھوڑ — دیواروں کے ارد گرد گشت لگا رہا ہے
پلکھیرو پہ سٹنے کو رنگ صبحکا — صبح ہوتے پرندوں پر رنگ پھینکنے کے لئے
کہتیے گل کے کاسے بھر یا رنگ ماہ — چاند نے شب کے وقت کتنے ہی پھولوں کے کاسے بھردیے (یعنی شبنم سے)

اب ہر پرندے کے رنگ بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ رنگ انہیں کہاں سے ملے۔ مثلاً

لے لالہ کے کاسے کسنبا بھرے — لالے کے کاسے لے کر اس میں کسنبا بھرا
سرنگ اپنی سرخاب چولی کرے — اور اس سے سرخاب نے اپنی چولی سرخ رنگی
لے شب گوش تے صندل و ارگجا — شب گوش (پرندہ) سے صندل اور ارگجا لیا
لیا کہک قمریاں نے کسوت بھجا — اور اسسے کہک اور قمری نے اپنا لباس بھگویا (رنگا)
پیا لیاں میں بلبل ہوئی پیشہ ست — پیالہ نوشوں میں بلبل پیش پیش تھی
سہیں سرخ کے نین لالی سوں مست — اور سرخے کی آنکھیں لالی سے مست تھیں
اتھے کوئلاں مست ہو ہانک مار — کوئلیں مست ہو ہو کر چہچہا رہی تھیں
اتھی کوک کوکیاں تے بے اختیار — اور کوکے بے اختیار ہوکر کوک رہے تھے
سر آنکھ کا جادم کوں بھڑنے لگیا — لقا کبوتر کا سر دم سے جا لگا
گدوا ہوش اوٹن نے لڑنے لگیا — اور لوٹن مدہوش ہوکر لڑنے لگا
کولاتے پراں سات دستک بجا — گرہ باز پروں سے دستک بجا رہے تھے
کولا تیاں لگے مارنے جا بجا — اور جگہ جگہ قلابازیاں کہا رہے تھے
کلافر کے گل کیاں فلونیاں جو کہاے — طوطے قرنفل کے پھولوں کے حبوب
فصاحت سوں رانویاں نے پاتاں میں آے — کہا کہا کر بڑی فصاحت سے باتیں کر رہے تھے

اس بیان میں نصرتی نے بیسیوں ایسے پرندوں کے دکنی نام لکھے ہیں جن کی شناخت میں بڑی مشکل پڑتی ہے۔ لیکن یہ بیان تصنع اور آورد سے خالی نہیں ــ

اب میں ایک ایسے مقام کے اشعار نقل کرتا ہوں جسے پڑھ کر نصرتی کے شاعرانہ کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ جب کنور چنپاوتی کو دیو کی قید سے چھڑا کر اُس کے گھر لے آتا ہے اور یہ خوشخبری سن کر مدمالتی اور اس کی ماں چنپاوتی کے ہاں آتی ہیں۔ ایک دن چنپاوتی کی ماں (جو مدمالتی کی خالہ ہے) مدمالتی کو باغ میں الگ لے جاتی ہے اور باتوں باتوں میں کہتی ہے کہ ہمیں جو بیٹی کے درشن نصیب ہوے یہ سب تیرے قدموں کی بدولت ہے اور ہم تیرے بہت ہی ممنون احسان ہیں۔ مدمالتی یہ سنکر اس کا منہ دیکھنے لگی کہ یہ آپ کیا کہتی ہیں، میرا اس سے کیا تعلق! ۔ اس نے کہا میں قسم کھاتی ہوں کہ جو کچھہ میں نے کہا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ اس پر مدمالتی نے کہا کہ آخر یہ کیا معما ہے فرمائیے تو سہی۔ تب اس نے کہا اچھا پہلے میں تم سے ایک بات پوچھتی ہوں اس کا سچ سچ جواب دینا اور کوئی بات مجھہ سے چھپانا نہیں، اس کے بعد میں یہ معما حل کروں گی۔ مدمالتی نے کہا پوچھئے۔ اس نے پوچھا کہ کچھہ دن ہوے کسی رات کو یکایک تمھاری سیج پر ایک حسین جوان آگیا تھا اور پھر تم میں باہم محبت ہوگئی تھی۔ یہ کیا بات تھی، ذرا مجھہ سے کھول کے بیان کرو۔ مدمالتی یہ سن کر بہت برہم ہوی اور کہا آپ میری بڑی ہیں اور ماں کی برابر ہیں۔ آپ کو ایسی باتیں نہیں کہنی چاہئیں۔

اس پر اس نے کہا میں خدا نخواستہ تجھے الزام نہیں دیتی ' تو بڑی نیک دل نیک صفات ہے - مگر تو کیا مجھے دلالہ سمجھی ہے جو اس قدر بگڑ بیٹھی - تو نے جو وعدہ اپنے چاہنے والے سے کیا ہے اسے پورا کر وہ ہزاروں مصیبتیں اور آفتیں جھیل کر یہاں آیا ہے - اس دکھی کے حال پر رحم کر - کیا تم نے ایک دوسرے کو نشانی نہیں دی تھی ؟ اب سچی بات سے کیوں مکرتی ہو ؟ مدمالتی اور بگڑتی ہے اور کہتی ہے کسی کي کیا مجال کہ مجھہ تک پہنچ سکے - تمہیں جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی - شاید بیگانی لڑکي سمجھہ کر یہ جرأت کی ہے - اور اُٹھہ کر چلنے لگی تو خالہ نے جھٹ اس کا دامن پکڑ لیا اور کہا او ھوری مکار! مجھے جل دیتی ہے - اچھا بتا تو یہ موتیوں کی مالا کس کی ہے ؟ پھر ایک انگوٹھی دکھا کر پوچھتی ہے کہ پہچان تو یہ کس کی ہے ؟ پھر وہ سارا قصہ بیان کرتی ہے کہ کنور نے کس شجاعت اور بہادری سے دیو کو مارا اور چنپاوتی کو چھڑا کر لایا - ہم اس کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے - اب تو اپنا وعدہ پورا کر اور اپنے وصل سے اسے شاد کام کر - مدمالتی کا دل تو پہلے ھی سے بھرا ھوا تھا ' شرم کو بالاے طاق رکھہ اپنے درد دل کو بیان کرتی ہے - یہاں نصرتی نے بلا شبہہ اپنی شاعری کا کمال دکھایا ہے اور ایسی حالت میں دل پر جو گزرتی ہے اس کیفیت کو اس خوبی اور سچائی کے ساتھہ لکھا ہے کہ بے اختیار تعریف کرنے کو جی چاہتا ہے - کہیں تو اس نے فطرت انسانی کی اس صداقت کو دکھایا ہے جو میر حسن کی مثنوی میں نظر آتی ہے اور کہیں وہ نسیم کی طرح تصنع اور تکلف سے کام لیتا ہے - گلشن عشق

میں یہ دونوں رنگ نظر آتے ہیں ۔ کہتا ہے کہ جب اُس پر یہ بات
کھل گئی کہ خالہ کو سارا راز معلوم ہے تو اس کی یہ حالت ہو گئی —

ہتوتے او جب ہت کا بارا چھٹا   جب دوست کی یاری کا ذکر چھڑا
سو تن من میں تب سر تے دھڑ کا اٹھا   تو اس کے تن من میں آگ بھڑک اٹھی
نچھل سوم با تہاں نوں استخواں   ہڈیاں خالص موم بتیوں کی طرح سے
سلگ تن کے فانوس میں رہے نہاں   تن کے فانوس میں جلنے لگیں
سو پر تاب ادک روپ سارا ہوا   اس کا جمال گرمی سے چمکنے لگا
سرب سرخ تن جو انگارا ہوا   اور اس کا سرخ بدن انگارے جیسا ہو گیا
دھری جوش دھک سوں درونے کی دیگ   اس آگ سے دل کی دیگ ابلنے لگی
سو پکنے لگیا دل کلیجے سوں بیگ   ور کلیجا پکنے لگا
نکل بھار جلنے او ساساں کی بھاپ   آہوں کی بھاپ باہر نکلنے لگی
چلیا جل اوبل چک سوں آپس تے آپ   اور آنکھوں سے آنسو خود بخود بہنے لگے
کیتک وقت پر جوش جروا کے سب   تھوڑی دیر تک اس نے اپنے جوش کو ضبط کیا
کہی کھول پھل پھا لک سے نرم لب   اور پھر برگ گل سے نرم لبوں سے کہنا شروع کیا

اب اپنا درد دل اس طرح بیان کرتی ہے

کہ اے مائی کیا ری کری اب توں گھات   اے اماں ! تونے مجھے یہ کیا دکھ دیا ہے
جو کاڑی میرے پاس دشمن کی بات   کہ اس دشمن کا ذکر چھیڑ دیا
نہ کہہ ساؤ اس بل کھنوری اہے   اسے ساہو نہ کہو وہ تو غارتگر لٹیرا ہے
دلاں کی پھبے اس کوں چوری اہے   دلوں کی چوری اسے سزاوار ہے
چھپے چھند سوں کیتا اچنبک پچھاں   مخفی فریب سے نادر مال کو پہچان کر
ادی رات کوں بھاگے جاتا ہے کہاں   آدھی رات کے وقت لوٹ کے لے گیا

سمجتا هے ایسی وہ جادو گری
تھتا جس کا شاگرد اچھے سامری
نھانوں که کیا سحر کرنے نظیر
یکایک دوڑا سٹیا مجھ منڈھیر
جگا کر اپس مکہ کی مشعل کی تاب
ستم چھیں لیتا میٹھی مجتے خواب
دو جیتی هو جب کھول دیکھی نین
هوا تس اجالے سوں بے تاب من
وهیں عشق کی سوز لا بار بار
میرے دل کوں کیتا ادک بے قرار
پھرم بھر کی ہاکر میرے بس منے
بھولا کر لیا کھینچ آپس منے
یو مجھ دل کا دھن میلیچ مجھ ھات سوں
اسے کارتی سوز کے گھات سوں
گھلوری پن اس" دھات حالی کیا
سرب لوٹ من تن کوں خالی کیا
پڑی نھند یکایک وو جب بھول ذات
صبا هوے پہ جب کھول دیکھی نین
دسیا نھیں سو یک تل بھی مجھ تن میں من
لوٹے جاکے تن من کا کھنا سگل
بیٹھی هو کے مفلس دیوالا نکل

وہ جادوگری کا ماهر هے
سامری اس کا ادنیٰ شاگرد هے
نه معلوم کیسا عجیب جادوگر کے
اس نے یکایک میرے محل پر دھاوا کیا
اپنے مکھ کی مشعل کی روشنی سے
اس نے عمداً میری خواب شیریں چھین لی
پریشان هو کر جب میں نے آنکھ کھولی
تو اس کے اجالے سے میرا من بے تاب هوگیا
فوراً عشق کا سوز بار بار لگا کر
میرے دل کو نہایت بے قرار کردیا
میرے دل میں کچھ ایسا جادو ڈال دیا
که مجھے خود فراموش کر کے اپنی طرف
کھینچ لیا میرے دل کی دولت میرے هاتھ
سے سوز کا دکھ دے کر چھین لی
فی الحال اس طرح غارت گری کی
که سب کچھ لوٹ میرا تن من خالی کردیا
جب آنکھ لگ گئی اور بھول غالب آگئی
صبح هوئے پر جب آنکھ کھول کے دیکھا
تو تن میں دل کا نام و نشان نه تھا
تن من کی ساری دولت لٹ گئی
اور میں مفلس دیوالیا هوکر رہ گئی

ولے آن لگایا سو مشعل کی سوز
لیکن وہ جس نے یہ آگ لگائی تھی

ادک ہوے پلپل کوں مجھ تن میں روز
وہ لحظہ بہ لحظہ میرے دل میں کھبا جاتا تھا

ہر یک کی او بالاں جو ہے تن منجھار
جدائی کی آگ جو تن بدن میں لگی ہوئی ہے

ادک جوش سوں جیو کوں ہوے کونڈ بار
اس کے بیحد جوش سے دل منقبض رہتا ہے

اوسا ساں نہ کچھ مک سکتی بہاسکوں
نہ منہ سے آہ نکال سکتی ہوں

نہ چک تے انجھو بہار تک لیا سکوں
اور آنکھ سے آنسو باہر لاسکتی ہوں

یکت نت رہوں غم سوں کر سر تلار
ہمیشہ تنہا اور غم سے سرنگوں رہتی ہوں

نہ کوئی بانٹ لیوے میرے دل کا بار
کوئی ایسا نہیں جو میرے دل کے بوجھ کو بانٹ لے

تلے دن تو ہرکیوں سہیلیاں سنگات
دن تو جوں توں سہیلیوں کے ساتھ کٹ جاتا ہے

پڑے بن بجر سل ہو سینے پہ رات
لیکن رات چھاتی پر پہاڑ ہو جاتی ہے

زرایں اگن تن پہ سارے لگیں
لباس وغیرہ بدن پر آگ معلوم ہوتے ہیں

گلاں سیج کے مجھ انکارے لگیں
اور سیج کے پھول انگارے

چندر مجھ اوپر زہر کا ہوا یاغ
چاند میرے لیے زہر کا پیالہ ہے

دیوے ہر ستارا میرے دل پہ داغ
اور ہر ہر ستارا میرے دل پر داغ دیتا ہے

ادک سوز لگ مجھ تاپنا پڑے
سوزش دروں سے میں تڑپتی رہتی ہوں

اُسی گھات کے باج تپ نا پڑے
اور اس دکھ بغیر مجھے قرار بھی نہیں

نسنگ زور سوں چھٹ اُسا ساں کا باؤ
آہوں کا طوفان اس زور سے چلتا ہے

دیوے جوش سوں دل کے دریا کوں تاؤ
کہ دل کا دریا اس سے سخت جوش میں آجاتا ہے

تریاں نیں کی تب ابلنے لگیں
تب آنکھوں کی مچھلیاں (آنسو) ابلنے لگتی ہیں

اسلق تن کی خشکی پہ چلنے لگیں
اور اسلق کر تن کی خشکی پر چلنے لگتی ہیں

ہوی سیج بھر جل سمندر نمن
اس سے ساری سیج سمندر کے پانی کی طرح ہو جاتی ہے

پڑے تس گھڑی سخت غوطے میں سن
اس وقت دل سخت غوطے کھانے لگتا ہے

بھاری صبا دیکھتے دوڑ آئے	یہ دیکھتے ہی بھاری صبح دوڑتی آتی ہے
پکڑ ہات ڈبتے کوں کڑ کے لائے	اور ہاتھ پکڑ کر ڈوبتے کو کنارے لگا دیتی ہے
رین کل مکھی سنگ تو برآئے نا	سیاہ رو شب سے صحبت گوارا نہیں
دیکھن زرد رو دن کوں بھی بھائے نا	اور نہ زرد رو دن کا دیکھنا بھاتا ہے
اچھے نس تو دوزخ تے کالی کٹھن	رات دوزخ سے بھی زیادہ تاریک اور کٹھن ہے
دسے دن تو روز قیامت کا دن	اور دن قیامت کا دن ہے
مرے سر تلیں یوں کٹھن ماہ و سال	یہ کٹھن زمانہ اس طرح مجھ پر گزرتا ہے
خدا ہی کہوں کس سوں مجھ دل کا حال	خدا کے سوا اپنے دل کا حال کس سے کہوں
کہ ناچار اچھے رو ریا کے بدل	ناچار پاس خاطر کے لیے
سو ہنس کھیل کھنا سکیاں میں سگل	میں سہیلیوں میں ہنس کھیل کے وقت گزار دیتی ہوں
جو دیکھوں نجھا تو دسے نین میں	غور سے دیکھتی ہوں تو آنکھوں میں نظر آتا ہے
جو بولوں بچن تو بسے بین میں	اور جو بات کرتی ہوں تو آواز میں دکھائی پڑتا ہے
گرا چھتا تو کچھ بھی مرے ہاتھ بس	اگر میرے بس میں کچھ بھی ہوتا
تو اس وقت یک تل لے ناکر الس	تو میں اسی وقت بلا تامل
سودھر کیوں وو دل چور کا کھوج پوچ	کسی نہ کسی طرح اس دل کے چور کا سراغ لگاتی
پھر اُس لوٹ لیتی محبت سوں ووچ	اور محبت کے زور سے اُسے لوٹ لیتی

ایک دوسرے مقام پر بھی اسی کیفیت فراق کو بیان کیا ہے جس کے چند شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں —

نہ سکتی تھی رہ جو جنی باج تل	وہ جو ماں کے بغیر ایک لحظہ نہ رہ سکتی تھی
نہ بھاوے سکیاں وو جو بیٹھیں تو مل	اور سہیلیوں کے بغیر جسے چین نہ آتا تھا
بچن ان کے دل پر اُسے بار ہوئے	اب ان کی باتیں اُسے ناگوار ہوتی تھیں
جو تستے خال ذکر دلدار ہوے	کہ اس سے ذکر دلدار میں خلل آتا تھا

ہو باول ادک جوں پئے پر شراب
جیسے کوئی شراب پی کر پاگل ہو جاتا ہے

پوچھے کوئی اُسے کچھ تو دے کچھ جواب
اُس سے پوچھتے کچھ ہیں اور جواب کچھ دیتا ہے

رکھے گرچہ تس ٹھار ناچار تن
اگرچہ وہ بظاہر یہاں ہے

دھرے جیوں کوں پن آپنے یار کن
لیکن جی اس کا یار میں ہے

دوجا دھیان تس دل انگے پست اچھے
کوئی دوسرا خیال اس کے سامنے ہیچ تھا

نت اپنیچ اپیں حال میں مست اچھے
اور وہ ہمیشہ اپنے حال میں آپ مست تھی

لبہ میں وہی یاد کرتیں بچن
لبوں پر اُسی کی باتیں تھیں

اوٹھے بول یکا یک سوتا جوں سپن
جیسے کوئی خواب میں سوتے سے بول اٹھے

دھرے بانہہ اپس اپنے سینے سوں تنگ
وہ اپنے بازو اپنے سینے سے لپٹائے رکھتی تھی

کہ گلہار تھے وصل کے یار سنگ
کہ وصل کے روز یہ یار کے گلے کے ہار تھے

چوسے لب کا اپنیچ اپن رنگ رس
اپنے لبوں کو خود ہی چوم چوم کر مزہ لیتی

شکر ہوے تھے امرت تے شربت سرس
کہ وہ آب حیات سے بھی زیادہ شیریں تھے

زباں سے ہووے اس کوں کر ہمکلام
وہ اُسی سے ہمکلام رہتی تھی

نکالے نہ چک غیر کا مکھ تے نام
اور بھولکر بھی زبانسے کسی دوسریکا نام نہ لیتی تھی

لگیا تھا کر اپنا سو تس تن کو تن
چونکہ اپنا بدن اس کے بدن کو لگا تھا

اپس چھاؤں کوں نا لگن دے چرن
اس لئے وہ اپنے سایہ کو بھی اپنا قدم نہیں لگنے دیتی تھی

رھیا تھا کہ اس روپ اپس چک بھتر
چونکہ اسکا جمال کبھی اپنی آنکھوں میں رہتا تھا

نہ لگنے دیوے آرسی کی نظر
اِسلیے آئینے کی نظر بھی اُسے نہ لگنے دیتی تھی

تس اوکلتی ناکل پڑے چک اُسے
اُس بیقرار کو بھولے سے بھی قرار نہ آتا تھا

اُسی بیچ تھا روز سکھ دکھ اُسے
اسی میں روز اس کا سکھ دکھ تھا

پیا باج سنگار کام آے نا
بغیر محبوب کے سنگار بیکار ہے

نہ کچھ غم کے پیرایہ بن بھاے نا
اور غم کے پیرایہ بغیرکوئی چیز نہ بھاتی تھی

نہ کوئی یک علاج اُس کو صحت کرے — اُسے کوئی علاج کارگر نہ تھا
دوگنی درد کوں پھر نصیحت کرے — نصیحت سے اس کا درد اور بڑھتا تھا
کتی تھی سو او کچھ بھی اول بچن — پہلے وہ کچھ کچھ باتیں بھی کرلیتی تھی
سنے پر سہیلیاں کا بھرتا تھا من — جن کو سن کر اس کی سہیلیوں کا دل بھر آتا تھا
وہ سب بات سے طرح دیتی چلی — اب وہ بھی موقوف ہو گئیں
چپی کے چپ دل تے لیتی چلی — اور اب خاموش دل ہی دل میں گھٹتی تھی

شادی کی مجلس میں راگ رنگ کا ذکر کیا ہے - چند شعر اس مقام کے بھی نقل کئے جاتے ہیں —

طرب بخش مطرب میٹھے تان اُچائیں — سرور بخش مطربوں نے میٹھی تانیں لینی شروع کیں
سوگیانی بجا گیان ہور گن سے گائیں — اور گویوں نے گیان اور گن سے گانا بجانا شروع کیا
یتا کچھ بلندی دھری خوش سبد — خوش آواز کی بلندی ایسی تھی
دیکھیں پھاڑ پردے کو زہرہ لبد — کہ زہرہ جبینیں پردے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی
چتر نازنیں پاتراں چھند باز — پر ہنر جادو کار نازنین ناچنے والیاں
جو تھیاں لاکہ خوبی سوں عاشق نواز — ہزارہا خوبیوں سے عاشق کا دل چھینے والی تھیں
لٹکتیاں چلیں چھب کی جب چاؤ سوں — جب وہ ناز و ادا سے مٹکتی چلتی تھیں
خمیں قد جو بن بار کے تاؤ سوں — تو جوبن کے بار سے ان کے قد خم ہوجاتے تھے
لبد سحر کا حقہ لبد انہار — جادو کار لب فریفتہ کرنے والے تھے
سبد بد کوں افسوں ہو لیجا نہار — اور آواز کے افسوں سے عقل گم تھی
ہریک چھب میں دھرتیاں ہزاراں سو زیب — ایک ایک ادا میں ہزاروں زیبائشیں
ہر یک فن میں کرتیاں ہزاراں فریب — اور ایک ایک فن میں ہزاروں جادو تھے
وو کس کاس تھاریاں رہیاں چین بند — وہ کسی کسائی آراستہ کھڑی تھیں
دکھانے ارت بھاؤ سوں چوپ کے چھند — اور ارت بھاؤ سے ادا کے ہنر دکھا رہی تھیں

لگی ناچنے آجو ہر گن بھری
اپس فن میں اُڑتی دسے جوں پری
کہاں یوں میٹھا راگ رنگ رس بھرا
بسر سد سبک سیر چند ر ہو ریا
فلک چرخ کھانے کی گت بھول گیا
سورج کے جھریاں کا بہتا جل رہیا
پون کا ترنگ ہو رہیا کھند لنگ
ہوا کند تر تیز اگن کا فرنگ
دیا سوز گانے سے ققنوس کوں
رولایاں دیکھا ناچ طاؤس کوں
لجایاں تماشے سوں گیانیاں کے من
بھولایاں نزاکت سوں سب انجمن

ہر ایک گن بھری جب ناچنے لگی
تو اپنے فن کے زور میں پری کی طرح اُڑتی دکھائی دیتی تھی
جب میٹھا رسیلا راگ گایا
تو سبک سیر چاند کی بھی عقل گم ہو گئی
آسمان گھومنے کی گت بھول گیا (کھڑا رہ گیا)
اور سورج کے جھرنوں سے بہتا جل رک گیا (بہتا جل سے مراد شعاعیں ہیں)
ہوا کا گھوڑا لنگڑا ہو کے رہ گیا
اور آگ کی تیز تلوار کند ہو گئی
گانے سے ققنوس کے دل میں سوز پیدا کردیا
اور ناچ دکھا کر طاؤس کو رلا دیا
ان کے تماشے سے اہل ہنر شرمندہ
اور انکی نزاکت سے اہل انجمن خود فراموش ہو گئے

اس کے بعد دعوت کے کھانوں کا ذکر کیا ہے ' شاید ہی کوئی کھانا ' ترکاری ' پکوان اور پھل بچا ہو - یہ بیان طویل ہے اور اس کا نقل کرنا بے مزہ ہوگا - کھانوں کے بعد آتش بازی کا نمبر آتا ہے ۔ یہاں بھی نصرتی حسب عادت تمام آتش بازیوں کا بیان نام لے لے کر کرتا ہے۔ غرض شادی کے جتنے لوازم اور رسوم ہیں ان سب کا ذکر دل کھول کر کیا ہے ۔ اس میں اُس نے ہر موقع کے مناسب اس قدر الفاظ استعمال کئے ہیں کہ اس سے اس کی وسعت معلومات اور قدرت زبان کا اندازہ ہوتا ہے ۔ جی تو چاہتا ہے کہ بعض بعض حصے نقل کیے جائیں لیکن طوالت کے خوف سے نظر انداز کرتا ہوں —

قصہ ختم ہونے کے بعد خاتمۂ کتاب ہے جس میں بادشاہ کی مدح اور اپنی مثنوی کی تعریف اور اس کی خصوصیت بیان کی ہے۔ اپنی کتاب کی خوبی اور بادشاہ کی قدردانی کا ذکر اس طرح کرتا ہے —

کیا ہوں کتاب اب یو تصنیف میں
بھریا تس میں تیری جو تعریف میں

درونے * کات † فکر سوں کھود کھن ‡
نکا لیا ہوں کئی رنگ برنگی رتن

یتے جوہراں میں جو کاڑیاں ہوں آج
سمج لیو نہ پایا ہوں دقت اکے باج

جو سب نس § فلک کھاے خونی جگر
تو یک بہار لاتا ہے روشن گہر

رھنا کر مشقت کی اپنی پچھاں
شفق کر دکھاتا ہے لہو کی نشان

کتا ہوں مشقت مری کھول میں
گہر کیں نہ رکھتا ہوں بے ڈول میں

ہر یک سفت الماس کوں کر تلاش
بنایا ہوں کئی بار پھر پھر تراش

ہر یک نگ پہ جڑنے رتن ہو معن
کیا ہوں کتی بار اپس لہوکا جل

ہر یک سطر ہے گرچہ نیلم کی لڑ
معانی کے ہیں لعل یکس یک تے $ چڑ

مرا لعل ہر یک دیکھت نامدار
کیے ہیں رتن پارکھی ** سب قرار

اچھا لے ¶ تو جیتا یہ جاوے بلند
وثائقہ دڈینا بی ہے سوہ مند

دیکھو مول اس لعل کا کیا چڑیا
اچھا لیا سو طاق فلک پر جڑیا

اتا شاہ بن مول کن لے سکے
جو ہر لعل کا یوں بہا دے سکے۔

---

* دل ' باطن - † نہایت - ‡ کان - § رات - $ بڑہ چڑہ کر -
** پرکھنے والا ¶ جوہریوں کا یہ قاعدہ ہے کہ لعل کو ناخن سے حرکت دیتے ہیں اور جس قدر وہ زیادہ اوپر کو جاتا ہے اسی قدر اس کی زیادہ قیمت ہوتی ہے —

تھا کوئی متاع اس کے نا سار * اچھے یونت جگ میں جگ رھنہار اچھے

اس کے بعد بتاتا ھے کہ میں نے اس کتاب کے لکھنے میں کیا کیا ہنر اور حکمتیں کی ھیں —

خصوصاً جو میں قصۂ بے مثال کہ الحق ھے مجھ فہم کا یک خیال
مری طرح کے تیز تازی کے تیں پوں سوں کرنہار بازی کے تیں
اُبلتا سو دیگ آپ نے تہان میں لے آیا سو قصے کے میدان میں
نہ مجھ دل منگیا تیوں پورا یا اوسے نہ جوں تھا دکھانا دکہایا اوسے
نہ ھر تھار دیتا ھوں جولان میں توپک چپ چلایاں ھوں گردان میں
دھر اس شعر کی اصل خوبی کا بھاؤ نکا لیا ھوں قصہ کی شاخاں تے تاؤ
للبی بات کوکیں کیا مختصر کہیں مختصر کوں بڈھایا سدور
کہیں چپ روایت کیا حسب حال کہیں طبع کے لے چلیا خوش خیال
کہیں بول گت مینچ صافی کیا کہیں دقت موشکافی کیا
بندیا ارت کیں ھر کسی فہم کا رکھیا بھاؤ کیں بادشہ وھم کا
بکت فن ھے آسان شہ تجہ اکل کہ ھے توں کر نہار مشکل کوں حل

آخر میں کتاب کا نام اور سنہ تالیف کو نظم کیا ھے

محبت کی پا باس ھر تہاؤں میں رکھیا گلشن عشق کر ناؤں میں
دھریا اس کی تاریخ یوں ھجرتی مبارک یو ھے ھدیۂ نصرتی

اس سے سنہ ۱۰۶۸ ھجری نکلتے ھیں —

مجھے یو تو ھے جیوتے پیاری کتاب کہ ھے عشق سوں پر یہ ساری کتاب

اور اس کے بعد دعا پر کتاب کا خاتمہ ھو جاتا ھے —

---

* مانند —

میرے پاس اس کتاب کے کئی نسخے ہیں لیکن سب سے قدیم سنہ ۱۰۹۴ ھ یعنی تالیف سے ۲۵ سال بعد کا ہے۔ اس میں کتاب کے ختم پر ایک رباعی بھی درج ہے جو بلا شبہ نصرتی کی ہے اور اس مثنوی کی تعریف میں ہے —

جے گل ہے نزاکت کا نول اس بن میں یک رنگ پیالا اہے اپس فن میں
ہو طبع معطر دسے رنگین نظر جن سیر کرے عشق کے اس گلشن میں

(باقی)
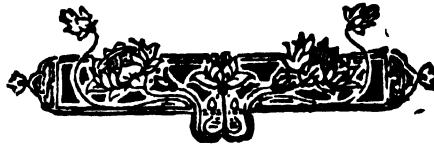
أردو شاعری کا مطالعہ

از

(مولوی وحید الدین سلیم مرحوم)

اگر آپ أردو شاعري کے تمام دفتر کا مطالعہ کریں تو أس میں سب سے زیادہ آپ کو غزلوں کا انبار نظر آئے گا - اس کے بعد مسدسوں کا ایک بڑا ذخیرہ ملے گا - پھر مثنویوں کا اور اس کے بعد آپ قصیدوں کا ایک مجموعہ دیکھیں گے - مگر اس تمام دفتر کو اگر آپ غور و فکر سے دیکھیں تو ہر زمانے کے شعرا کے کلام میں آپ کو کچھہ ایسي خصوصیات ملیں گي جو ایک کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں - انھیں خاص اور مابہ الامتیاز باتوں کا مطالعہ درحقیقت أردو شاعري کا مطالعہ ہے —

سب سے پہلے آپ کو شاعر کے کلام کا بیروني مطالعہ کرنا چاہیے - یعني یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کلام کی ظاہری ساخت کیسي ہے - أس کي شکل کس قسم کی ہے - آپ أس کے لفظي تار و پود ' نحوی ' عروضي و بیاني خصوصیات پر بھي نظر ڈالیں —

اس کے بعد آپ اس کلام کا اندروني مطالعہ کریں - یعنی یہ دیکھیں کہ وہ کلام کس قسم کے خیالات پر حاوی ہے شاعر کن خاص معاني کا بار بار اعادہ کرتا ہے اور وہ اکثر کن خاص افکار کے دایرہ کے اندر گھومتا ہے —

اندرونی مطالعہ کے بعد اس بات پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اس کلام کا تعلق شاعر کے ذہن سے کیا ہے - یعنی عام طور پر شاعر اپنے کلام کو کیونکر سر انجام کرتا ہے - اس منزل پر پہنچ کر آپ کو معلوم ہوگا کہ یورپ کے شعرا کی نفسیات سے ہمارے شعرا کی نفسیات جدا گانہ ہے - پھر خود ہمارے شعرا اپنی اپنی خاص ذہنیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے جدا ہیں —

اس کے بعد آپ کو غور سے دیکھنا چاہیے کہ زیر مطالعہ کلام پر ملکی یا غیر ملکی ادبیات کا کیا اثر پڑا ہے - یعنی اس بات کی جستجو کرنی چاہیے کہ شاعر کے خیالات و افکار میں بیرونی اثر کہاں تک ہے اور اس کا ماخذ کیا ہے —

اس کے علاوہ آپ کو اس بات کا سراغ بھی لگانا چاہیے کہ شعر کا تعلق شاعر کی زندگی سے کیا ہے - یعنی شاعر کی سیرت کی جھلکیاں شعر میں کہاں تک ہیں - اس مطالعہ کے لیے ضروری ہے کہ آپ شاعر کی سوانح زندگی کا بھی مطالعہ کریں - اور شاعر کی سیرت اور اس کے کلام میں مطابقت کی تلاش کریں —

سب سے آخر میں اس امر پر غور کی نظر ڈالنی چاہیے کہ شعر کا تعلق شاعر کے زمانہ اور اس کے ماحول سے کیا ہے —

اگر اس طریقہ سے آپ تمام اُردو شعرا کے کلام کا زمانۂ قدیم سے زمانۂ حال تک مطالعہ کریں اور اُن کی خصوصیات قلمبند کرتے جائیں تو آپ براے ایقان دیکھیں گے کہ کس طرح رفتہ رفتہ زبان میں انقلاب ہوتا گیا ہے - کس طرح گرامر بدلتی گئی ہے - کس طرح خیالات میں تغیر ہوتا گیا ہے - کس طرح شاعری کی عروضی اور بیانی خصوصیات منقلب ہوتی

گئی ھیں۔ کس طرح ایک ادب کا اثر دوسرے ادب پر دوڑتا گیا ھے۔ کس طرح ماحول کے بدلنے سے شاعروں کی نفسیات بدلتی گئی ھیں۔ یہ مطالعہ درحقیقت نہایت دلچسپ ھے —

مثال کے طور سے اول بیرونی مطالعہ کو لیجئے۔ فرض کیجیے کہ آپ ولی کے کلام کا مطالعہ کررھے ھیں۔ آپ کو صاف طور سے نظر آئے گا کہ اس کے کلام میں ھندی الفاظ کا استعمال بمقابلہ آج کل کی شاعری کے بہت زیادہ ھے۔ وہ بہادر کی جگہ جودھا، طاقت کی جگہ پران۔ آنکھ کی جگہ نین۔ دکھائی دینا کی جگہ دسنا۔ دیدار کی جگہ درس اور درسن۔ آنسو کی جگہ انجھو۔ آئنہ کی جگہ درپن۔ جدائی کی جگہ برہ۔ سورج کے جگہ سور۔ محبت کی جگہ پریم۔ پانوں کی جگہ پگ۔ تسبیح کی جگہ سمرن۔ بھولنا کی جگہ بسرنا۔ کھانے کی جگہ بھوجن۔ دنیا کی جگہ سنسار۔ آگ کی جگہ اگن۔ رات کی جگہ رین وغیرہ الفاظ بے تکلف استعمال کرتا ھے۔ وہ معشوق کے لیے سجن موھن۔ پیتم۔ سندر۔ پی۔ پیو۔ پیا۔ سریجن۔ ساجن۔ لالن وغیرہ الفاظ لاتا ھے —

آپ دیکھیں گے کہ ولی کے زمانہ کی گرامر آج کل کی گرامر سے مختلف ھے۔ وہ ابتدا۔ فضیلت۔ روا۔ قدر۔ شہرت۔ زنجیر۔ رسید وغیرہ کو مذکر اورتار اور خواب مخمل وغیرہ الفاظ کو مونث لاتا ھے۔ فعلوں کے گردان کے علاوہ ضمایر اور روابط میں بھی فرق ھے۔ وہ ھم کی جگہ ھمن کہتا۔ تم کی جگہ تمن، تملا، میں کی جگہ موں۔ منیں۔ سے کی جگہ سیں۔ سوں۔ ستی۔ یہ کی جگہ یو۔ اور کی جگہ ھور۔ اندر یا میں کی جگہ بھیتر۔ دوسرا کی جگہ دوجا۔ اپنے کی جگہ اپس۔ مجھ کو۔ میرا اور تجھ کو۔ تیرا کی جگہ مجھ

اور تجھہ ۔ جس نے کی جگہ جن نے ۔ تبھی کی جگہ تدھاں ۔ کبھی کی جگہ کدھیں ۔ تجھہ جیسا کی جگہ تجھہ سارکا ۔ جس طرح کی جگہ جیونکو اتنا کی جگہ اینا ساتھہ کی جگہ سنگات وغیرہ الفاظ لاتا ھے ۔ فاعل کی علامت نے اس کے کلام میں اکثر نہیں آتی ۔ ایک خاص بات ولی کے کلام میں آپ کو یہ بھی نظر آئے گی کہ وہ فارسی عربی الفاظ کے ساتھہ ھندی لفظوں کو مضاف کر دیتا ھے ۔ مثلاً فتنۂ مکھہ ۔ جام نینؔ ۔ نور نین آب نین ۔ روز نہان وغیرہ ۔ ترکیب توصیفی میں بھی وہ اسی قسم کے الفاظ کو بے تکلف جوڑ دیتا ھے ۔ مثلاً شہریں بچن ۔ شکر بچن ۔ گلدستہ خوش باس ۔ عطف کی فارسی واو دو ھندی لفظوں کے درمیان لے آتا ھے مثلاً دن و رات —

اس زمانہ کا املا بھی آج کل کے املا سے علیحدہ ھے ۔ مثلاً کو کو کوں سا کو سیا ۔ نکلا کو نکلیا ۔ کرنا کو کرناں ۔ تو کو توں ۔ جوں کو جیوں اور اتنا کو اتناں لکھتے تھے —

ایک خصوصیت ولی کے کلام میں آپ کو یہ نظر آئے گی کہ وہ بہت سے متحرک الفاظ کو ساکن اور ساکن کو متحرک کر دیتا ھے ۔ مثلاً رین اور نین کو رَین اور نَین ۔ زلف کو زلَف شمع کو شَمع ۔ فکر کو فَکر ۔ قفل کو قَفل ۔ غرض کو غُرض وغیرہ —

ھندی ادب کے تلمیحی الفاظ بھی آپ کو ولی کے کلام میں نظر آئیں گے ۔ مثلاً پاتال ۔ باسک ۔ رام ۔ لچھمن ۔ سیتا ۔ کشن ۔ بدری ۔ ارجن کا بان ۔ کامروپ کا جادو ۔ لیلاوتی وغیرہ —

ایک خصوصیت ولی کے کلام میں آپ کو یہ دکھائی دے گی کہ وہ وزن شعر میں بعض حروف کو اکثر گرا دیتا ھے ۔ مثلاً کئی کی جگہ کی ۔

ہوئی کی جگہ ئی ۔ اے کی جگہ آ ۔ انکھیاں کی جگہ اکھاں ۔ صفحہ کی جگہ صفا ۔ نزیک = نزدیک کی جگہ نزک ۔ انجھو کی جگہ اجھو ۔ نہیں کی جگہ نی ۔ اندھیاری کی جگہ ادھاری ۔ پوجن ھاری کی جگہ پجن ھاری ۔ کہوں کی جگہ کوں ۔ دوجے کی جگہ دجے ۔ دنیا کی جگہ دنا ۔ ہوے کی جگہ ہو ۔ سورج کی جگہ سرج ۔ گھونگھٹ کی جگہ گھگھٹ ۔ معلوم کی جگہ معلم ۔ دیکھے کی جگہ دکھے ۔ کوئی کی جگہ کی ۔ میٹھے کی جگہ مٹھے ۔ سوتے کی جگہ سُتے ۔ ٹوٹا کی جگہ ٹٹا ۔ پھیکا کی جگہ پھکا ۔ بھیتر کی جگہ بھتر ۔ رھتا ھے کی جگہ رتا ھے ۔ جنگل کی جگہ جگل ۔ غصہ کی جگہ غَصَہ ۔ زنجیر کی جگہ زجیر لاتا ھے ۔ ع اور ح اور ہ بھی وزن میں بعض موقعوں پر بے تکلف گرا دیتا ھے ۔ مثلاً عاشق کی عین حیرت کی ح اور ھوا کی ہ —

قافیہ ردیف کے لحاظ سے اگر آپ ولی کے کلام پر نظر ڈالیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اس میں سنگلاخ زمینیں بھی موجود ھیں جس کو لکھنؤ میں انشا اور مصحفی نے اور دھلی میں نصیر اور ذوق نے زیادہ رواج دیا ۔ غزلوں کے بعض مجموعے آپ کو ایسے نظر آئیں گے کہ ان کے قافیے ردیفوں کے ساتھہ حروف تہجی کی ترتیب سے بالقصد جوڑے گئے ھیں اور وہ زمینیں محض مشق سخن کے لیے اختیار کی گئی ھیں ۔ مثلاً ی کی جو ردیف دیوان میں ھے اس میں ے کو ردیف قرار دے کر اول ایسا قافیہ اختیار کیا گیا ھے جس کے آخر میں الف ھے ۔ مثلاً ادا ھے ۔ ھوا ھے ۔ پھر ایسے قافیے کے ساتھہ اس ردیف کو جوڑا ھے جس کے آخر میں ب ھے ۔ مثلاً کمخواب ھے ۔ سیراب ھے ۔ اسی طرح بالترتیب ت ۔ ج ۔ د ۔ ر ۔ س وغیرہ کے قافیے ی تک لائے گئے ھیں —

کے عادی ہیں اور اُن کا اثر ذوق پر بھی پڑا۔ مگر ذوق اور ظفر نے محاورہ بندی کا خاص شیوہ اختیار کیا ہے۔ اُن کی شاعری کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ عام بول چال اور محاورات کو روشناس کریں۔ اس بنا پر اُن کے کلام میں جس قدر محاورے اور ضرب المثلیں پائی جاتی ہیں اتنی کسی شاعر کے کلام میں نہیں۔ لغت نویس اُنہیں کے کلام سے ان چیزوں کی سند پیش کرتے ہیں۔ مگر ذوق کے شاگرد داغ نے آخر زمانے میں محاورہ بندی کو اپنی شاعری کا مقصد نہیں رکھا تھا۔ وہ قدیم شاعر جرأت کی طرح واردات معاشقہ کو سیدھی سادھی عام بول چال میں روانی کے ساتھ ادا کرنا پسند کرتے تھے۔ اُن کے کلام میں بجائے محاورات کے روزمرہ کا استعمال زیادہ ہے۔ مومن خاں عام بول چال اور محاورات کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اُن کے کلام میں محذوفات زیادہ ہیں۔ وہ آدھی بات زبان سے نکالتے ہیں اور آدھی دل میں رکھتے ہیں۔ اس لیے اُن کا کلام سمجھنے میں اکثر لوگوں کو دقت پیش آتی ہے۔ اُن کے اس خاص انداز کی پیروی کسی سے نہ ہوسکی اگرچہ کوشش بہت لوگوں نے کی۔ غالب بھی زبان کے عام محاوارت کی پروا نہیں کرتے۔ وہ خیال کو مقدم سمجھتے ہیں اور اس کے لیے زبان خود تیار کرتے ہیں۔ عام بول چال کا لباس اپنے خیال کو پہنانا نہیں چاہتے۔ ان کے قدیم انداز میں فارسیت غالب ہے اور خیال بند شاعروں کی ترکیبیں بار بار آتی ہیں۔ اضافتوں کی بھرمار ہے۔ مگر جب وہ اس طرز کو ترک کرتے ہیں اور صاف بیانی پر آمادہ ہوتے ہیں تو پھر بھی ذوق کی طرح محاورہ اور بول چال کو اپنی شاعری کا مقصد نہیں بناتے۔ اُن کا ہر خیال خود بخود ایک مناسب اور موزوں سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور جو زبان اس

طرح پیدا ہوتی ہے وہ عام لوگوں کی بول چال سے جداگانہ نظر آتی ہے - غالب کے بعد حالی بھی عام بول چال اور محاورات کے پھندے میں گرفتار نہیں ہوے - ان کی شاعری کا محور بھی خاص خیالات کا اظہار ہے اور ان کے خیالات ایسی زبان اختیار کرتے ہیں جو عام بول چال سے ممتاز ہے - حالی مستقل نظمیں ترکیب بندوں ترجیع بندوں قطعوں اور مثنویوں کی شکل میں اکثر لکھتے ہیں اور ان کے ہاں برخلاف دیگر شعرا کے مسلسل غزلیں بھی ہیں - حالی کے بعد سب سے زیادہ شہرت اقبال کی ہوئی ہے - اقبال نے فارسی زبان کی تعلیم معقول حاصل کی ہے - اُن کی زبان پر فارسی ترکیبیں بہت چڑھی ہوئی ہیں - وہ اپنے خیالات کو زیادہ تر استعاروں اور تشبیہوں میں ادا کرتے ہیں - اُن کے کلام میں جو فارسی ترکیبیں بار بار آتی ہیں وہ نہایت دلکش اور موزوں ہیں - اردو زبان کی عام بول چال کی وہ بھی پروا نہیں کرتے - اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کے خیالات کی دنیا نرالی ہے - وہ غالب کی طرح گہرے فلسفیانہ خیالات ادا کرنا چاہتے ہیں جن کے قدوقامت پر عام بول چال کا لباس ٹھیک نہیں اُترتا - ناواقف لوگ الزام لگاتے ہیں کہ اُن کو اُردو زبان نہیں آتی - غالب اور اقبال میں فرق یہ ہے کہ فارسی ترکیبیں غالب کے قدیم کلام میں جس قدر ہیں اس قدر اُن کے بعد کے کلام میں نہیں ہیں - مگر قدیم کلام میں فارسی ترکیبیں حداعتدال سے زیادہ ہیں اور ان کی زیادتی کے سبب اُردو کلام بالکل فارسی ہوگیا ہے اور اس کے لیے ایک آدھ لفظ کی تبدیلی کی ضرورت ہوتی ہے - برخلاف اس کے اقبال کے کلام میں فارسی ترکیبیں اس قدر افراط

سے نہیں ہیں کہ ان کے کلام کو اردویت سے خارج کردیں - اُن کا کلام بدستور اردو رہتا ہے اور وہ ترکیبیں بجائے خود نہایت خوشنما اور موزوں معلوم ہوتی ہیں - اضافتوں کی بھیڑ بھی غالب کے قدیم کلام میں جس قدر ہے اس قدر اقبال کے کلام میں نہیں ہے اس لیے بھی ان کا کلام اردویت کے دایرہ سے نہیں نکلا - غالب کے کلام اور اقبال کے کلام دونوں کو بالمقابل رکھہ کر اگر ان کی فارسی ترکیبیں چن لی جائیں تو اقبال کی فرہنگ غالب کی فرہنگ سے زیادہ سیر اور وسیع ہوگی - چنانچہ دنوں کے کلام سے اس قسم کی ترکیبیں چن لی گئی ہیں اور دونوں کی فرہنگیں تیار کرلی ہیں —

زمانۂ حال کے دیگر شعرا کے کلام میں جن کا کلام اخباروں اور رسالوں میں چھپتا رہتا ہے شکل و ساخت کے لحاظ سے کوئی خاص بات نہیں ہے - البتہ ایک شاعر آزاد انصاری ہیں جو مولانا حالی کے شاگردوں میں ہیں - ان کے کلام کا ایک خاص انداز ہے - وہ دودو شعروں کا ایسا جوڑ رکھتے ہیں جس میں پہلے شعر کے پہلے مصرع کا قافیہ دوسرے شعر کے پہلے مصرع کے قافیہ سے ملتا ہے اور دوسرے مصرعوں کا قافیہ وہی ہوتا ہے جو غزل کی اصلی زمین کے مطابق ہے اور یہ ان کے کلام کا عام انداز ہے - یہاں مثال کے طور پر اُن کے چار شعر لکھے جاتے ہیں جن میں سے پہلے دو شعروں کا ایک جوڑ ہے اور دوسرے دو شعروں کا دوسرا جوڑ ہے - غزل کی عام زمین ہے بسمل دیکھتے جاؤ - مایل دیکھتے جاؤ —

وہ نظریں جو کبھی اک بیوفا سے لڑکے نازاں تھیں
اب ان کو اپنی بدبختی کا قایل دیکھتے جاؤ

وہ آنکھیں جو کبھی پروانۂ رخسار جاناں تھیں
اب اُن کو گریۂ حسرت میں شاغل دیکھتے جاؤ

وہ الفت جس کے استحکام پر دنیا کو حیرت تھی
اب اُس کو مثل رنگ خام زایل دیکھتے جاؤ
وہ بدبخت محبت جس کی فطرت ہی محبت تھی
اب اُس کو صبر کرلینے کے قابل دیکھتے جاؤ

بیک نظر معلوم ہوگا کہ علاوہ اس خاص انداز کے جس کا اشارہ کیا گیا ہے ان اشعار میں تشابہ ترکیب بھی ہے۔ یعنی پہلے شعر کے پہلے مصرع کی ترکیب دوسرے شعر کے پہلے مصرع کی ترکیب سے ملتی جلتی ہے۔ اسی طرح پہلے شعر کے دوسرے مصرع کی ترکیب دوسرے شعر کے دوسرے مصرع کی ترکیب سے مشابہ ہے۔ آزاد کا خاص انداز جو عام طور سے اُن کے کلام میں پایا جاتا ہے حالی سے ماخوذ ہے۔ یہ انداز حالی کے کلام میں کہیں کہیں ہے۔ آزاد نے اس انداز کو پسند کرکے اُس پر اپنے عام کلام کی بنیاد رکھی ہے۔ اسی طرح تشابہ ترکیب کا انداز غالب کے کلام میں کہیں کہیں پایا جاتا ہے —

انھیں سوال پہ زعم جنوں ہے کیوں لڑیے   ہمیں جواب سے قطع نظر ہے کیا کہیے
حسد سزائے کمال سخن ہے کیا کیجے   ستم بہائے متاع ہنر ہے کیا کہیے

تعقید سے کوئی شاعر نہیں بچا۔ یعنی لفظوں کو ہیر پھیر کر نظم میں اس طرح رکھنا کہ عام بول چال کی ترکیب سے اُس کی ترکیب مختلف

ہو جائے ۔ مگر آزاد انصاری حتی الوسع تعقید سے بھی بچتے ہیں اور اکثر ایسی طرحیں اپنے لیے تجویز کرتے ہیں جن میں تعقید کی ضرورت نہ پڑے ۔ مشاعروں میں جو طرحیں اُن کے منشا کے مطابق نہیں ہوتیں اُن پر طبع آزمائی نہیں کرتے ۔ ان قیود کے اختیار کرنے سے آزاد کا کلام بہت مقبول ہوا ہے ۔ مگر افسوس یہ ہے کہ خیال کو اُنہوں نے اپنی شاعری میں مقدم نہیں رکھا ۔ اس بنا پر ان کا اکثر کلام لفظوں کا کھلونا ہے ۔ شکل و ترکیب اُن کے کلام کی عام شعرا کے کلام کی شکل و ترکیب سے بے شک جدا گانہ ہے ۔ مگر خیال کی گہرائی اور بلندی کا پتہ نہیں ہے ۔ زمانۂ حال کے دیگر شعرا میں شکل و ترکیب کے لحاظ سے بھی کوئی ندرت نہیں ہے ۔ البتہ بعض شعرا ایسے ہیں جنہوں نے اپنے ہر خیال کو استعاروں اور تشبیہوں کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے ۔ مگر اُن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اگر کلام کی شکل و ترکیب پر استعارہ و تشبیہ کا ملمع چڑھانا چاہتے ہیں تو خیال میں بھی بلند پروازی دکھائیں ۔ ورنہ اُن کا کلام زندہ نہیں رہ سکتا —

اگر آپ مثال کے طور پر شعر کا اندرونی مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ سودا مدح و قدح کا استاد ہے ۔ اُس کے قصاید اس مضمون کے لحاظ سے اس قدر بلندی پر واقع ہوے ہیں کہ اُردو کا کوئی شاعر اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا ۔ ذوق نے آخر زمانے میں قصاید لکھنے میں ضرور شہرت حاصل کی ۔ مگر سودا سے اُس کا مقابلہ نہیں ہوسکتا ۔ قصاید کی تمہیدیں اُن کا اہم جز ہیں ۔ انہیں تمہیدوں میں قصیدہ گو شاعر اپنا کمال دکھاتے ہیں ۔ چونکہ قصیدوں میں خارجی شاعری اور داخلی شاعری دونوں ہوسکتی ہیں اس لیے یا تو ان میں سوسائٹی کے حالات کا مرقع کھینچ کر

دکھایا جاتا ہے۔ یا حکیمانہ خیالات بیان کیے جاتے ہیں۔ ذوق کے ایک آدھ قصیدہ کے سوا کسی قصیدہ کی تمہید میں حکیمانہ خیالات کا اظہار نہیں ہوا۔ مگر سودا کے قصاید میں یہ عنصر زبان ہے۔ اس کے قصاید کی اکثر تمہیدیں ان بلند خیالات سے لبریز ہیں۔ ذوق کو خارجی شاعری کی ہوا بھی نہیں لگی۔ برخلاف اس کے سودا نے اپنے قصاید میں متعدد موقعوں پر خارجی شاعری کا کمال دکھایا ہے۔ میر سب سے زیادہ ممتاز شاعر ہے جس نے اپنی شاعری میں اپنے اندرونی اور قلبی واردات کی سچی تصویریں کھینچی ہیں۔ اس باب میں کوئی شاعر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اسی سبب سے غزل جو داخلی شاعری کے لیے موزوں سانچہ ہے اس میں آج تک اس شاعر کا جواب پیدا نہیں ہوا۔ میر حسن نے مثنوی میں اور ان کے پوتے انیس نے مرثیہ میں خارجی اور داخلی شاعری کے ایسے کمال دکھاے ہیں کہ ان دونوں قسم کی شاعریوں کا اُن پر خاتمہ ہوگیا۔ غزل گو شعرا میں آتش خود داری اور فقیر منشی کے خیالات اپنے کلام میں زیادہ تر ادا کرتا ہے۔ ناسخ روکھے پھیکے انداز میں اخلاقی خیالات کو صایب کی مثالیہ شاعری کا لباس پہناتا ہے۔ رند عاشقانہ جذبات کی جھلکیاں دکھاتا ہے۔ امیر نے آخر زندگی میں عاشقانہ جذبات کی تصویر کھینچنی چاہی اور داغ کی تقلید میں اپنے رستے سے ہٹ کر دوسرے رستے پر چلنا چاہا۔ مگر کامیاب نہ ہوے کیونکہ یہ خیالات اُن کی زندگی اور سیرت کے خلاف تھے۔ امیر نہایت مقدس آدمی تھے۔ اور جو کچھ وہ داغ کی تقلید میں کہتے تھے اُن کی زبان پر زیب نہیں دیتا تھا۔ ایک شخص نے اُن کے کلام میں سے جو آخری دیوان سے انتخاب کیا گیا ہے ایسے اشعار کثرت سے چنے ہیں جن میں معشوقوں کی چھاتیوں کا ذکر ہے۔ ان اشعار میں جو شوخ اشارے ہیں وہ بازاری لوگوں کی زبان سے

البتہ موزوں معلوم ہوتے ہیں ۔ امیر کے چہرہ پر مطلق نہیں کھلتے ۔
اُن کے شاگردوں سے ریاض نے خاص شہرت رندانہ خیالات میں حاصل کی ہے
اور اس کے اشعار اکثر لوگوں کی زبان پر ہیں۔ ریاض کی زندگی میں لا
اُبالی پن ہے۔ وہ امیر کی طرح مقدس زندگی نہیں رکھتا اس لیے جو
رندانہ جذبات اُس نے ظاہر کیے ہیں وہ اُس کی زندگی سے لگ بھگ ہیں۔
جرأت کے کلام میں معاملہ بندی ہے اور اس صنف سخن میں اس کو
خاص شہرت ہوئی ہے ۔ نظیر اکبر آبادی نے عام لوگوں کے میلوں
ٹھیلوں اور ان کے حالات و خیالات اور مشاغل زندگی کی ایسی سچی اور
صحیح تصویریں کھینچی ہیں کہ کوئی شاعر اس کا مقابلہ اس باب میں
نہیں کر سکتا ۔ عام شعرا نے اس کی زبان کو تسلیم نہیں کیا ۔ مگر یہ اُن
کی غلطی ہے ۔ کیونکہ جب وہ عوام کی زندگی کا نقشہ کھینچنا چاہتا ہے
تو بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ وہ انہیں کی زبان اور انہیں کی
بول چال اختیار کرے ۔ اگر کبھی ہمارے تنقید نگاروں کی آنکھیں کھلیں
تو اس شاعر پر اس قدر تبصرے لکھے جائیں گے جتنے کہ انگریزی زبان
کے مشہور شاعر و ڈراما نویس شکسپیر پر لکھے گئے ہیں ۔ ڈاکٹر فالن
نے نظیر کو ایشیا کا شکسپیر بتایا ہے اور اس صداقت میں شک کرنے
کی مجال نہیں —

دلی کے شعرا میں درد اور مظہر صوفیانہ خیالات اور مومن خاں رقابت
اور رشک کا مضمون خاص طور سے ادا کرتے میں ۔ ذوق اور نصیر کا کوئی
خاص مضمون نہیں جس کو انہوں نے اپنے کلام کا محور بنایا ہو ۔ غالب
بھی رشک کا مضمون مومن کے طرح اکثر جگہ ادا کرتے ہیں ۔ مگر زیادہ
تر ان کا وہ کلام مقبول ہوا ہے جس میں اُنہوں نے اپنے بلند خیالات خود

داری اور جذبی آزادی کے ادا کیے ہیں اور ان کو فلسفیانہ لباس
پہنایا ہے۔ داغ معاملہ بندی کا استاد ہے - وہ روزمرہ کے پیرایے میں
عاشقانہ واردات کو اس خوبی سے ادا کرتا ہے کہ اُس کی تعریف نہیں
ہوسکتی ہے۔ اس کا اکثر کلام لوگوں کی زبانوں پر ہے اور اس کی قبولیت
کا گُر یہی ہے کہ اُس نے اس خاص صنف میں جو کچھ کہا ہے وہ اُس
کی اصلی زندگی کا پرتو ہے اور وہ اس کے دلی جذبات ہیں جو عام
زبان کا سانچہ اختیار کرکے لوگوں کے سامنے پیش ہوے ہیں۔ حالی مصلحانہ
دماغ رکھتے ہیں۔ اُن کی طبیعت حساس ہے۔ وہ اپنی قوم کی موجودہ
تباہی کا خاص اثر اپنے دل میں محسوس کرتے ہیں۔ وہ جب قوم کی
ذلت اور نکبت کا کوئی واقعہ سنتے ہیں تو بیتاب ہوتے ہیں اور جس
طرح آنسو آنکھوں سے بے اختیار ٹپکتے ہیں اسی طرح درد آلود الفاظ
اُن کی زبان سے بے اختیار نکلتے ہیں۔ اُنہوں نے تمام عمر اپنی قوم کا
دکھڑا رویا اور اس دردناک لے میں اس راگ کو بار بار گایا کہ اُن
کی آواز نے تمام قوم کو تڑپا دیا اور افراد قوم میں عام طور سے
کہرام برپا کردیا اور اُن کو اپنی زندگی کے بدلنے اور زمانہ کے
مطابق اپنے تئیں نئے سانچے میں ڈھالنے پر مجبور کردیا۔ حالی کی مثال
ترکی شاعر نامق کمال کی ہے جس نے اُنہیں کی طرح اپنی قوم کو
ترکوں کا گذشتہ عروج اور موجودہ تنزل دکھا کر زندہ رہنے اور بیدار
ہونے پر کمربستہ کردیا۔ اب تک جو ترکی قوم باوجود صدیوں کی
کشمکش اور مصیبت کے اپنے پاؤں پر کھڑی ہے یہ اسی شاعر کی شاعری
کا پرتو ہے۔ ہماری قوم میں بھی ہندوستان کے اس سرے سے اس سرے
تک خیالات کا جو تلاطم برپا ہے وہ حالی کے زندہ کن کلام کا فیض ہے۔

فامق کمال نے ترکی شاعری میں انقلاب پیدا کر دیا تھا پہلے ترکی شعرا یا تو عاشقانہ جذبات ادا کیا کرتے تھے یا تصوف کے رنگ میں غرق تھے۔ اس شاعر کے بعد یکایک ترکی شعرا بیدار ہوے۔ انھوں نے بھی فامق کمال کی طرح قومیت کی روح پھونکنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہی حال حالی کا ہے۔ اُن کے کلام نے بھی اردو شاعری میں نئی زندگی پیدا کر دی۔ سیکڑوں چھوٹے موٹے شاعر انہیں کے نغموں کو دھرانے لگے۔ مگر ان شعرا میں سے صرف دو شاعروں نے اپنے زندہ رہنے کا سامان مہیا کیا۔ باقی کسی شاعر کے کلام میں زندہ رہنے کی قابلیت نہیں تھی۔ ان دو شاعروں میں ایک تو اکبر الہ آبادی ہیں جنھوں نے قوم کی زندگی پر ظریفانہ انداز میں تنقید کی۔ دوسرے اقبال ہیں جنھوں نے فلسفیانہ انداز اختیار کیا اور اس پیرایہ میں قوم کو بیدار کرنے کا تہیہ کیا۔ چونکہ ان دونوں شاعروں کے انداز کلام مخصوص تھے اور حالی سے جداگانہ تھے اس لیے ان کے کلام کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان ناسور شعرا کی شاعری کبھی مر نہیں سکتی۔ ان میں سے اکبر کا کلام اس سبب سے کہ ظریفانہ انداز میں ہے اس نے عام و خاص سب کے دلوں کو گھیر لیا ہے۔ مگر اقبال کا کلام خاص تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان پر ہے کیونکہ وہ فلسفیانہ پر مغز خیالات ہیں اور عام لوگوں کی پرواز خیال ان کے بلند افکار تک نہیں پہنچ سکتی۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اکبر نے عام بول چال میں اپنے خیالات ادا کیے ہیں اور اقبال نے ایسی زبان میں شاعری کی ہے جو فارسی نما ہے اور جس سے عوام آشنا نہیں۔ اقبال نے اب اب اردو کو چھوڑ کر فارسی زبان ہی میں شاعری شروع کر دی ہے تاکہ ہندوستان کے علاوہ دیگر ملکوں کے مسلمان

بھی ان کے خیالات کو سمجھہ سکیں اور اس سے متاثر ہو سکیں۔ ہندوستان کے فارسی داں مسلمان ان کے اس کلام کو سمجھتے ہیں۔ عام مسلمان جو فارسی نہیں جانتے ان کی سمجھہ سے یہ کلام باہر ہے۔ مگر افغانستان اور ایران کے لوگ عام طور سے اس کلام سے اثر پذیر ہو سکتے ہیں اور ترک اور تاتاری بھی ان کے کلام کے صحیح مخاطب ہو سکتے ہیں۔ اقبال کا فارسی انداز بیان اختیار کرنا اردو زبان کے لیے سراسر بد قسمتی ہے۔ مگر وہ اپنی مصلحت کو خود ہی بہتر جانتے ہیں —

خاص خاص شعرا کے کلام کی اندرونی خصوصیات کے علاوہ اگر لکھنؤ اور دہلی کے شعرا کا کلام مجموعی طور پر اٹھاکر دیکھو تو ان دونوں مقامات کی شاعری میں ایک خاص امتیاز نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کے شعرا زیادہ تر خارجی مضامین غزل میں باندھتے رہے ہیں اور دہلی کے شعرا عام طور پر داخلی مضامین کی طرف متوجہ رہے ہیں۔ اس وقت نہ دہلی میں کوئی بڑا شاعر ہے۔ نہ لکھنؤ میں۔ ابھی چند روز ہوے ہیں کہ داغ کی دہلی میں اور امیر مینائی کی لکھنؤ میں شہرت تھی۔ ان دونوں کے روپوش ہونے کے بعد لکھنؤ میں صفی اور عزیز اور دہلی میں بیخود اور سایل رہ گئے ہیں اور یہ چاروں شاعر داغ اور امیر کے درجے پر نہیں ہیں سایل اور بیخود دونوں داغ کے انداز میں شاعری کرتے ہیں۔ مگر عزیز اور صفی نے لکھنؤ کے دبستان شاعری کو بالائے طاق رکھدیا ہے۔ لکھنؤ میں جو رعایت لفظی اور صنعت پرستی کا زور تھا اس کو ان شاعروں نے ترک کر دیا ہے۔ لکھنؤ کی شاعری میں جو پہلے خارجی مضامین کی بھر مار ہے اس سے بھی ان شعرا نے توبہ کر لی ہے۔ یہ دونوں شاعر اب غالب کے دبستان میں داخل ہو گئے۔

میں جب لکھنؤ میں مسلم گزٹ کی اڈیٹری کر رہا تھا تو لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک ہونے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا۔ میں اسی بات کو دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ وہاں عام طور پر تمام شعرا غالب کی پیروی کر رہے تھے اور اپنے تئیں اسی کے دبستان کا متعلم بتاتے تھے۔ تاہم دہلی کے شعرا کے مقابلہ میں ایک خصوصیت لکھنؤ کے شعر میں موجود تھی اور وہ یہ کہ موت، نزع کی حالت، جنازہ اور قبر کے متعلق مضامین ان کی غزلوں میں عام طور سے آتے تھے اور اب بھی یہ خصوصیت لکھنؤ کے شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اس کا اثر عام طور سے اودھ اور یوپی کے شعرا پر پڑا ہے۔ ان سب کے کلام میں بھی یہ مضامین خاص طور سے باندھے جاتے ہیں۔ کوئی شاعر ایسا نہیں جس کی ہر غزل میں دو تین شعر اس رنگ کے نہ ہوں۔ مشاعروں میں جب کوئی شاعر اپنا کلام پڑھتا ہے تو سب کی نظریں اس طرف لگی رہتی ہیں کہ کب کوئی شعر اس رنگ کا اس کے کلام میں آتا ہے اور جب ایسا شعر سنائی دیتا ہے تو شور و تحسین بلند ہوتا ہے۔ اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ لکھنؤ میں مرثیہ کی شاعری کو عروج ہوا۔ دہلی کے شعرا کو اس صنف شاعری سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ لکھنؤ میں اب مرثیہ کی شاعری کا زور گھٹ گیا ہے اور کوئی باکمال شاعر اب وہاں ایسا نہیں ہے جس نے اس صنف میں نام پیدا کیا ہو۔ حالانکہ وہاں کی پبلک اب بھی اُنہیں دردناک خیالات کے سننے کی طالب ہے۔ اسی طبعی خواہش کا اقتضا ہے کہ وہاں کے موجودہ شعرا نے غزل میں نزع اور موت کا دردناک منظر دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر میں یہاں لکھنؤ کے زندہ شاعر عزیز کے کلام کا اقتباس پیش کرتا ہوں:

نزع میں پھرتی ہوئی آنکھوں کو
ترا افسون نظر یاد آیا

ستم ہے لاش پر اُس بے وفا کا یہ کہنا
کہ آنے کا بھی کسی کے نہ انتظار کیا

کسی نے نزع کی یوں گتھیوں کو سلجھایا
سرھانے بیٹھہ کے ہر سانس کا شمار کیا

اب تک ہیں یاد روح کو آثار نزع کے
ماتھے پر اک شکن تھی کلیجے میں درد تھا

آکے دیکھے نزع میں کھنچتے جو میرے ھاتھہ پاؤں
اُس ری شوخی ایک انگڑائی سی لے کر رہ گیا

مری میت پہ کس دعوے سے وہ کہتے ہوے آے
ھٹا دینا ذرا ان رونے والوں کو ھٹا دینا

یہ کہہ کر قبر پر پھر یاد اپنی کر گئے تازہ
ارے اے مرنے والے اب مجھے دل سے بھلا دینا

ھجوم عام ہے بالیں پہ سب غمخوار بیٹھے ھیں
وہ خود جب سے قریب بستر بیمار بیٹھے ھیں

ھر اک ھچکی میں کیوں کر کُھل رہے ھیں موت کے عقدے
فقط وہ دیکھنے یہ حالت بیمار بیٹھے ھیں

اُس کی شام غم پہ صدقے ھو مری صبح حیات
جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ھو گئیں

نہ پوچھو دم کے رکنے کا سبب تم نزع میں مجھہ سے
کہا ھو زندگی بھر ضبط جس نے رائگاں کیوں ھو

دم آخر مریض غم کے بالیں تک چلے آو
کسی کی عمر بھر کی جانفشانی رائگاں کیوں ہو

کھڑے بالیں پہ وہ ہنستے ہیں اپنا دم نکلتا ہے
برے وقت اے فلک کوئی کسی کا کم نکلتا ہے

شب غم نزع کی بھی سختیوں کا کرلیں اندازہ
نکل اے آہ یوں سینے سے جیسے دم نکلتا ہے

وداع دل ہجوم آرزو میں کیا کہوں تجھہ سے
بھرے گھر سے جنازہ جیسے اے ہمدم نکلتا ہے

وہ وقت آیا کہ اب سینے میں ہردم ہوک اٹھتی ہے
نفس کہتے ہیں جس کو وہ بہت ہی کم نکلتا ہے

بنا ہے مرکز تاثیر غم بیمار کا چہرہ
یہ عالم ہے کہ مونہہ پھیرے ہوے عالم نکلتا ہے

ہماری بیکسی کی موت تھی عبرت کا افسانہ
جسے دیکھو شریک مجلس ماتم نکلتا ہے

رگیں کھلنے سے جذب عشق کا اندازہ کرتے ہیں
وہ کیا جانیں ابھی کن مشکلوں سے دم نکلتا ہے

دیکھوں تو جذب حسرت دیدار وقت نزع
اے روح یوں نکل کہ تماشا کہیں جسے

کیا کہوں کیا نہ کہوں ہستی موہوم کا راز
نزع میں پوچھتے ہیں کیا ہے حقیقت تیری

نزع میں پرتو رخ تاں کہ روشن ہو نگاہ
اب دکھائی نہیں دیتی مجھے صورت تیری

جب کفن لائے ہیں بیمار محبت کے لیے
صبح اُس وقت ہوئی ہے شب فرقت تیری
دم اُکھڑتا ہے کسی کا اور وہ بیٹھے ہیں خموش
دیکھ لے یہ منظر عبرت کسے اب ہوش ہے

آئیے نزع کا ہنگام ہے اب
مشورہ آپ سے کچھ کرنا ہے
بالیں پہ میرے کھہ کے کسی نے یہ کھولے بال
دیکھیں تو امتیاز اسے شام و سحر میں ہے

گھبرائیے نہ ختم ہے بیمار شام عمر
بس تھوڑی دیر اور طلوع سحر میں ہے
کہتی ہے روح نزع میں رستہ دکھا چکے
جاتے ہیں ہم خود آپ وہاں وہ تو آچکے

یہ وصیت آخری ہے اسے سن لیں سب احبا
کوئی دل کا ذکر کرتا نہ سر مزار آئے
رگیں کھنچنے لگیں اب نزع کا ہنگام آتا ہے
وہ جاگیں ورنہ ان کے سر پہ سب الزام آتا ہے

یہ سناٹا یہ تاریکی یہ گورستان یہ ویرانی
تمہیں اے سونیوالو کس طرح آرام آتا ہے
یہ کیا تھا یوں تو وہ دیکھا کیے دم توڑنا میرا
مگر انگڑائی لی اک روح نکلی جب مرے دل سے

کہتے ہیں وقت نزع وہ بیمار ہجر سے
ختم اک نفس میں شرح تمنا کرے کوئی

بہت بیمار ہجراں دیکھنے سے فائدہ
نقش کچھ دھندلے سے ہیں بگڑی ہوئی تصویر کے

دیکھئے تو چہرۂ بیمار سر کا کر کفن
آج ہیں دشمن بھی شاکی آپ کی تاخیر کے

نزع میں کس کو بھلا تاب شکیبائی ہے
جب وہ آئے ہیں تو کچھ جان میں جان آئی ہے

تھی صبح اور ستارے کچھ جھلملا رہے تھے
بیمار شام فرقت دنیا سے جا رہے تھے

دم توڑتا نہیں کوئی بیمار اس طرح
شاید شریک موت کسی کی ادا بھی ہے

ہستی کے رخ کو پھیر دیا روزگار نے
کروٹ جو لی مریض شب انتظار نے

انگڑائی لے کے کس نے یہ چٹکائیں انگلیاں
دو ہچکیوں میں ختم جو بیمار ہو گئے

یہ کہہ کر سرہانے مرے آ کے بیٹھے
ہٹو چارہ سازو کہ اب وقت کم ہے

اگر کہیں وہ دم واپسیں چلے آتے
ہم ایک سانس میں تفصیل آرزو کرتے

کہتی ہے روح آئی ہیں جتنی کہ ہچکیاں
اتنی ہی میں نے ٹھوکریں کھائی ہیں راہ کی

غرض کہ آج کل لکھنؤ کا ہر شاعر اور موجودہ دبستان لکھنؤ کا ہر پیرو اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ غزل میں بجائے خارجی مضامین کے

جن کا لانا زمانۂ سابق میں ضروری تھا داخلی مضامین داخل کرے۔ مگر اس کے ساتھ ہی نزع، موت، جنازہ اور قبر وغیرہ کے متعلق خیالات بھی ضرور لائے۔ دہلی کے شعرا نے اپنے کلام میں اس قسم کا کوئی التزام نہیں رکھا —

لکھنؤ میں مرثیہ کی شاعری کو زوال آچکا ہے۔ اگرچہ موجودہ مرثیہ گو شاعر صبح کا منظر، گرمی کا سماں، اندھیری رات کی کیفیت، گھوڑے اور تلوار کے متعلق مبالغے، مدینہ سے کوچ کرنے کا عالم، رستے کی تکلیفیں، رفقائے امام کی جاں نثاریاں، فریق مخالف کی ستمگاریاں، اہل بیت کا عزیزوں کی موت پر بین وغیرہ مضامین اب بھی اپنے مرثیوں میں بیان کرتے ہیں؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام مضامین انیس اور ان کے دیگر معاصر شعرا کمال کے درجے کو پہنچا چکے ہیں۔ اب کوئی گوشہ ان مضامین میں باقی نہیں رہا۔ اس بنا پر آج کل کے زندہ مرثیہ گویوں نے اپنے لیے ساقی نامہ کا ایک نیا کھانچہ پیدا کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ ساقی نامہ میں اپنا کمال دکھائے۔ مگر یہ مضمون بھی چند روزہ ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ساقی نامہ کا ایک بند جو عارف کے مرثیہ سے لیا گیا ہے پیش کیا جاتا ہے —

ہاں ساقی مہرو کوئی جام آج پلا پھر
میں جس کا ہوں مشتاق وہ مے شیشے سے لا پھر

دے آگنۂ طبع مصفا کو جلا پھر
ہونٹوں سے چھلکتے ہوے ساغر کو ملا پھر

لکھتا ہوں وفا ساقی کوثر کے خلف کی
چھوٹی بھی اگر سے ہو تو رندان نجف کی

شعر کہنے کے وقت اردو شاعر کی نفسیات کیا ہوتی ہے اس پر توجہ کرنے سے پہلے یہ امر واضح ہونا چاہئے کہ یورپ کی شاعری کا اقتضا اور ہے اور ہماری شاعری کا اقتضا اور۔ یورپ میں شاعر کے نزدیک خیال قافیہ پر مقدم ہے۔ برخلاف اس کے ہمارے ہاں قافیہ خیال پر مقدم ہے۔ اس اختلاف کے سبب یورپ کے شاعر اور ہمارے شاعر کی نفسیات میں بڑا اختلاف ہوگیا ہے۔ یورپ کی قدیم زبانیں یونانی اور لاطینی بہت وسیع تھیں اور ان میں قافیے کے الفاظ کثرت سے مل سکتے تھے۔ تاہم انہوں نے ادائے خیال میں رکاوٹ پیدا ہونے کے لحاظ سے نظم عاری کو رواج دیا تھا۔ یورپ کی موجودہ زبانوں میں سے جرمنی، فرنچ اور انگریزی بھی وسیع ہیں اور ان میں بھی قافیے کے الفاظ بہت موجود ہیں۔ تاہم وہ بھی نظم عاری لکھے جاتے ہیں۔ لمبی نظمیں اکثر اسی رنگ میں ہیں۔ وسیع زبانوں میں قافیے کے الفاظ بکثرت ملنے سے خیال کے ادا کرنے میں بہت کم دشواری پیش آسکتی ہے۔ تاہم مسلسل اور طویل خیالات میں ایک گونہ رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور قافیے بہ تکلف لانے پڑتے ہیں۔ اس بنا پر باکمال شعرا نے ادائے خیال کو مقدم سمجھ کر ضرورت کے وقت اس رکاوٹ کو دور کر دیا ہے۔ عربی زبان میں بھی الفاظ کی کثرت ہے اور قافیے کثرت سے ملتے ہیں۔ یہاں تک کہ لغت نویسوں نے لغت کی ترتیب میں جہاں ابتدائی حروف کا خیال رکھا ہے وہاں آخری حروف کا بھی لحاظ

کیا ہے اور دنیا کی تمام ڈکشنریوں کے برخلاف عربی کی ڈکشنریوں میں آخر کا حرف باب بنایا گیا ہے اور ابتدائی حرف کو بطور فصل کے رکھا ہے - عربی کی لغت کو بہ یک نظر دیکھنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ ان کی زبان میں شاعری کرنا کس قدر آسان ہے - جو قافیہ آپ اختیار کریں اُس کے ہموزن الفاظ آپ کو آسانی سے بہت سے مل جائیں گے - ایام جاہلیت کی شاعری عام طور پر قصاید کی شکل میں ہے - ہر قصیدہ میں ایک قافیہ اول سے آخر تک ہے اور ادائے خیال میں جو روانی ان شعرا کے کلام میں ہے اس سے یہ نتیجہ صاف طور پر نکلتا ہے کہ ہر خیال کے ادا کرنے کے وقت مناسب قافیہ شاعر کے ذہن میں آسانی سے آجاتا ہے —

فارسی زبان میں الفاظ اس کثرت سے نہیں ہیں کہ مناسب قافیے آسانی سے ہر خیال کے ادا کرنے کے وقت مل جائیں - یہ زبان بذاتہ خود وسیع نہیں ہے - جب سے عربی زبان نے اس زبان پر اثر ڈالا ہے اُس میں الفاظ کی تعداد بڑھ گئی ہے - تاہم جس کثرت سے عربی زبان میں ہموزن الفاظ مل جاتے ہیں اُس کثرت سے اس زبان میں نہیں ملتے - یہی وجہ ہے کہ جس طرح اہل یورپ نے لمبی داستانوں کے لیے نظم عاری کا طریقہ اختیار کیا ہے اہل ایران نے ایسی داستانوں کو مثنوی کی شکل میں ادا کیا ہے - مثنوی میں ہر شعر کے لیے صرف دو قافیے تلاش کرنے پڑتے ہیں - جو اکثر آسانی سے مل جاتے ہیں —

ہندوستان کی قدیم شاعری میں بھی لمبی داستانوں کے لیے یہی شکل اختیار کی گئی ہے - قصیدہ کی شکل میں ایسے طویل واقعات ادا نہیں ہوسکتے کیونکہ اس کی بنیاد ایک قافیہ پر ہوتی ہے اور اگرچہ عربی

زبان میں هموزن الفاظ کثرت سے مل جاتے هیں تاهم یہ بات ممکن نہیں ہے کہ ایک قافیے پر ساری داستان کی بنیاد رکھی جائے - یہی سبب ہے کہ عربی زبان میں لمبی منظوم داستانیں نہیں ملتیں - مثنوی کی شکل ایرانیوں نے اختیار کی هے - عربی میں مثنویاں نہیں لکھی گئیں - اگر عربی زبان میں مثنوی کی شکل اختیار کی جاتی یا نظم عاری کا طریقہ چل پڑتا تو پھر اس زبان میں بھی الیڈ اور شاهنامہ جیسی منظوم داستانیں مل سکتی تھیں - عرب کی عشقیہ طویل شاعری بھی قصیدہ کی شکل میں هے - اگر ایرانی بھی اس قسم کی شاعری قصیدہ کی شکل میں کرتے اور تمام نظم کی بنیاد ایک قافیے پر رکھتے تو کام چل سکتا تھا - مگر افسوس هے کہ اُنھوں نے قافیہ کے ساتھ ردیف کا دم چھلا لگادیا - چونکہ غزلیں اکثر گانے کے کام میں آتی هیں اس بنا پر ایرانیوں نے خیال کیا کہ قافیہ کے ساتھ ردیف کا التزام نظم میں زیادہ موسیقیت پیدا کرے گا اور ردیف اور قافیہ هر شعر میں آکر سننے والوں کے کانوں میں زیادہ متوازن معلوم هوں گے - یہ لے یہاں تک بڑھی کہ بغیر ردیف کی غزلیں پسند نہیں آتی تھیں - اگر فارسی زبان کے دیوان اُٹھا کر دیکھو تو ایسی غزلیں بہت کم ملیں گی جن میں قافیہ هی قافیہ هو اور ردیف نہ هو - یہی باعث هے کہ عشقیہ خیالات کا مسلسل طور سے بیان کرنا غزل کی شکل میں مشکل هوگیا - قافیہ اور ردیف ادائے خیال پر مقدم هوگئے - ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر کے مضمون سے جداگانہ هونے لگا - یعنی ایک شعر سے دوسرے شعر کو کوئی تعلق نہیں رها - اگر ایک شعر میں معشوق کی جدائی کی شکایت هے تو دوسرے شعر میں وصال حاصل هونے پر خوشی

کا اظہار ہے۔ اگر ایک شعر میں دنیا کی مذمت بیان کی گئی ہے تو
دوسرے شعر میں اس کی تعریف ہے۔ نظم کی یہ ایسی عجیب شکل ہے
کہ دنیا کی کسی زبان میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ اس سے تمام
شعرا مجبور ہوگئے کہ مسلسل غزلیں نہ لکھیں۔ فارسی شعرا کے دیوانوں
میں مسلسل غزلیں اس قدر کم ملتی ہیں کہ اُن کا عدم وجود برابر
ہے۔ ایران کی شاعری اسی حالت میں تھی کہ وہ ہندوستان میں پہنچی۔
اول یہاں کے شعرا نے خود فارسی زبان میں اسی طریقہ کی غزلیں لکھنی
شروع کیں۔ پھر جب اُردو میں شاعری کا آغاز ہوا تو اسی طریقہ
کی نقل اس زبان میں بھی کی گئی۔ اب تک غزل کا یہی طریقہ ہمارے
ملک میں جاری ہے۔ اسی طریقہ کے سبب ہمارے شعرا جب غزل لکھنے
بیٹھتے ہیں تو پہلے اس غزل کے لیے بہت سے قافیے جمع کرکے ایک جگہ لکھ لیتے
ہیں پھر ایک قافیہ کو پکڑ کر اس پر شعر تیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قافیہ
جس خیال کے ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے اُسی خیال کو ادا کر دیتے
ہیں۔ پھر دوسرے قافیہ کو لیتے ہیں۔ یہ دوسرا قافیہ بھی جس خیال
کے ادا کرنے کا تقاضا کرتا ہے اُسی خیال کو ظاہر کرتے ہیں گو کہ یہ
خیال پہلے خیال کے برخلاف ہو۔ اگر ہماری غزل کے مضامین کا ترجمہ
دنیا کی کسی ترقی یافتہ زبان میں کیا جائے جس میں غیر مسلسل نظم
کا پتہ نہیں ہے تو اُس زبان کے بولنے والے نودس شعر کی غزل میں
ہمارے شاعر کے اس اختلاف خیال کو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔
ان کو اس بات پر اور بھی تعجب ہوتا ہے کہ ایک شعر میں جو
مضمون ادا کیا گیا ہے اُس کے ٹھیک برخلاف دوسرے شعر کا مضمون
ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا کہ شاعر کا اصلی خیال کیا ہے۔ وہ پہلے خیال

کو مانتا ہے یا دوسرے خیال کو - اُس کی قلبی صدا پہلے شعر میں ہے یا دوسرے شعر میں - مولانا حالی نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں خیالات شاعرانہ کے اس اختلاف و تناقض کا عذر کیا ہے - وہ لکھتے ہیں کہ "جس طرح ایک فلسفی یا مورخ کی تصنیف میں اختلاف پایا جانا اس تصنیف کو عیب لگاتا ہے اسی طرح شاعر کے کلام کو عیب نہیں لگاتا - بلکہ اس کا بیساختہ پن ظاہر کرتا ہے جس کو شاعری کا زیور سمجھنا چاہیے - فلسفی یا مورخ ہر ایک چیز پر اس کے تمام پہلو دیکھ کر ایک مستقل رائے قایم کرتا ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ اس کا بیان جامع و مانع ہو - لیکن شاعر کا یہ کام نہیں ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ ہر ایک شے کا جو پہلو اُس کے سامنے آئے اور اس سے کوئی خاص کیفیت پیدا ہوکر اُس کے دل کو بے چین کردے اُس کو اُسی طرح بیان کرے - پھر جب دوسرا پہلو دیکھ کر دوسری کیفیت پیدا ہو جو پہلی کیفیت کے خلاف ہو اُس کو اُس دوسری کیفیت کے موافق بیان کرے - وہ کوئی فلسفہ یا تاریخ کی کتاب نہیں لکھتا تاکہ اس کو حقایق و واقعات کے ہر ایک پہلو پر نظر رکھنی پڑے - بلکہ جس طرح ایک فوٹو گرافر ایک ہی عمارت کا کبھی روکار کا کبھی پچھیت کا کبھی اِس ضلع کا اور کبھی اُس ضلع کا جدا جدا نقشہ اُتارتا ہے اسی طرح شاعر حقایق و واقعات کے ہر ایک پہلو کو جدا جدا رنگ میں بیان کرتا ہے - پس ممکن ہے کہ شاعر ایک ہی چیز کی کبھی تعریف کرے اور کبھی مذمت اور ممکن ہے کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بری چیز کی تعریف کیونکہ خیر محض کے سوا ہر چیز میں شر کا پہلو اور شر محض کے سوا ہر شے میں خیر کا پہلو موجود ہے -

عقل ، علم ، زہد ، دولت ، عزت اور آبرو عموماً ممدوح و مقبول سمجھی جاتی ہیں۔ مگر شعرا نے اُن کی جا بجا مذمت کی ہے - اسی طرح دیوانگی، نادانی ، رندی، فقر، ذلت اور رسوائی عموماً مذموم و مردود گنی جاتی ہیں - لیکن شعرا اُن کے اکثر مداح رہتے ہیں، —

" شاعر ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتا ہے اور کبھی دوسری حیثیت سے اس سے نفرت دلاتا ہے ۔ وہ کبھی قدما کے مقابلے میں اس لیے کہ وہ استاد اور موجد فن تھے اپنے تئیں ناچیز و بے حقیقت بتاتا ہے اور کبھی اس لیے کہ اُس نے اُن کی دولت میں کسی قدر اپنی کمائی بھی شامل کی ہے جو اُن کے پاس نہ تھی اپنے تئیں اُن پر ترجیح دیتا ہے ۔ وہ کبھی دنیا کی اس لیے تحقیر کرتا ہے کہ وہ دارالغرور اور دارالمحن ہے اور کبھی اس کی بڑائی اور عظمت اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ مزرعۂ آخرت ہے ۔ وہ ایک ہی گورنمنٹ کی کبھی اس کی خوبیوں کے سبب سے ستایش کرتا ہے اور کبھی اس کی ناگوار کارروائیوں کے سبب شکایت " —

شاعرانہ خیالات کے اختلاف و تناقض کی اس توجیہہ کو جو مولانا حالی نے بیان کی ہے ہم صحیح خیال نہیں کرتے۔ یہ تو سچ ہے کہ شاعر کے سامنے ایک شے کا جو پہلو آے اور اس سے جو کیفیت اُس کے دل پر طاری ہو اُس کو ہو بہو بیان کرنا اس کا فرض ہے ۔ مگر یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ اس کیفیت کے طاری ہونے سے پانچ منٹ بعد اُسی شے کا دوسرا پہلو اُس کے سامنے اس طرح آے کہ ایک متضاد و متناقض کیفیت پیدا کردے اور اُس کو مجبور کردے کہ وہ فوراً دوسرا متناقض خیال اُسی زور اور اُسی جوش سے بیان کرے جس زور اور جوش سے کہ

اس نے پہلے خیال کو بیان کیا تھا - فوٹو گرافر اپنے کیمرے کو چشم زدن میں ایک طرف سے دوسری طرف موڑ دیتا ہے- اور دوسری پلیٹ پر دوسرا عکس اتار لیتا ہے - مگر ذہن انسانی کی یہ کیفیت نہیں ہے - اس پر ایک واقعے کا عکس جو سامنے ہے پڑتا ہے اور اس سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے- یہ کیفیت اس انسان کو بیتاب کرتی ہے کہ وہ اس کے متعلق اپنے جذبہ کو بیان کرے- جب تک یہ کیفیت اس کے ذہن سے محو نہ ہو جائے اس کے برخلاف دوسرے واقعے سے کوئی بے چین کرنے والی کیفیت اس کے ذہن میں پیدا نہیں ہوسکتی - ذہنی پلیٹ سے پہلے واقعے کا عکس یا تو مٹ جانا چاہئے - یا اس قدر دھندلا پڑ جانا چاہئے کہ گویا وہ کبھی محسوس ہی نہیں ہوا تھا - تب ممکن ہے کہ متضاد واقعہ اپنا عکس ڈال کر دوسری بیتابانہ کیفیت پیدا کر سکے - ایک ہی سانس میں دنیا کی مذمت اور اس کی مدح کسی شاعر کے ذہن میں ایسے جوش کے ساتھ پیدا نہیں ہوسکتی کہ وہ اس کو اظہار خیال پر مجبور کردے - ایک ہی غزل کے ایک شعر میں دنیا کی مذمت اور دوسرے شعر میں اس کی مدح اور اسی طرح کے اور متناقض و متضاد خیالات اس قدر جلد بیان کرنا شاعری کو بیشک عیب لگاتا ہے اور اس سے صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے کہ یہ دونوں خیال جو ایک دوسرے کے برخلاف ہیں اس کی ذہنی کیفیت کا پرتو نہیں ہیں - بلکہ یہ ایک مصنوعی اظہار خیال ہے جس پر شاعر قافیہ اور ردیف کے اقتضا سے مجبور ہوا ہے - یہ کیونکر ممکن ہے کہ شاعر ایک لمحہ میں ایک ہی چیز کی ترغیب دلا کر دوسرے لمحہ میں اس چیز سے نفرت دلائے - یہ انسان کی طبعی نفسیات کے برخلاف ہے - ہاں یہ بات بے شک ممکن ہے کہ ایک زمانہ میں شاعر مثلاً دنیا کو رغبت کی

نگاہ سے دیکھتا تھا اور اس کی ہر شے اس کے دل پر ایک دلفریب عکس
ڈالتی تھی اور اس کے جذبات کو رنگین کرتی رہتی تھی - اس زمانہ
میں اگر شاعر اپنی اس ذہنی کیفیت کو بیان کرتا تو اس کا بیان سرتاپا
دنیا کی دلکش کیفیتوں کی تصویر ہوتا - اور اس سے سامنے والوں کو
ترغیب ہوتی کہ وہ بھی شاعر کی طرح دنیا کے دلچسپ رنگوں کا نظارہ
کریں اور اس سے پورا لطف اٹھائیں - پھر اگر شاعر کو پے در پے ناکامیوں
سے اور دل شکن واقعات کے مسلسل پیش آنے سے دنیا کی طرف سے نفرت
ہو جاتی اور بیزاری کا جذبہ اس کے دل میں شد و مد سے پیدا ہو جاتا
تو اس دوسرے زمانہ میں وہ اپنی اس ذہنی کیفیت کو مایوسانہ
لہجہ میں بیان کرسکتا تھا اور اس کا اثر بھی سننے والوں پر ضرور
ہوتا - کیونکہ شاعر کا بیان اس حالت میں بھی اس کی ذہنی کیفیت
کی سچی تصویر ہوتا اور اس میں بھی صداقت اور جوش موجود
ہوتا - پس ایک لہجہ کے بعد دوسرے لہجہ میں شاعر کے اختلاف
بیان اور تناقض خیالات سے اس کا بیساختہ پن ظاہر نہیں ہوتا -
اور نہ یہ بات شاعری کا زیور ہے - بلکہ اس سے صداقت شعری پر
حرف آتا ہے اور اس کے دل کی اصلی کیفیت کا اظہار نہیں ہوتا -
بلکہ اس کی شاعری کے مصنوعی اور غیر حقیقی ہونے کی خبر دیتا ہے
اور بتاتا ہے کہ شاعر فقط نقال ہے - اس کی شاعری اس کی دل کی آواز
نہیں ہے - وہ مختلف خیالات کو جو شعرا نے زمانۂ سابق میں وقتاً
فوقتاً بیان کیے ہیں بغیر اس کے کہ اپنی ذہنی کیفیت کی مہر ان پر
لگائے محض نقل و تقلید کے انداز سے بیان کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ
یہ شاعری کا سخت عیب ہے اور اس سے شاعری کی زینت نہیں ہوتی

بلکہ تخریب ہوتی ہے ۔ یہ شاعری نہیں بلکہ قافیہ پیمائی ہے ۔ شاعر کسی فوری خیال یا اپنی کسی ذہنی کیفیت کو بیان کرنا نہیں چاہتا بلکہ ہر قافیہ جس خیال کے اظہار پر اس کو مجبور کرتا ہے بے پروائی سے اس کو باندھ جاتا ہے اور اس کی پروا نہیں کرتا کہ جو خیالات وہ جلد جلد بیان کررہا ہے ان میں کس قدر اختلات یا تناقض ہے۔ یہی مقام ہے جہاں ہمارے شاعر کی نفسیات یورپ کے شعرا کی نفسیات سے مختلف ہو جاتی ہے ۔ یعنی یہاں خیال پر قافیہ مقدم ہے اور وہاں قافیہ پر خیال کو مقدم سمجھتے ہیں —

یورپ اور ہندوستان کے شعرا کی عام نفسیات میں جو اختلات ہے اس کے علاوہ خاص خاص شعرا کی نفسیات بھی ہمارے ہاں جداگانہ ہے اور یہ ہر ایک شاعر کے طبعی اقتضا کے موافق ہے ۔ ایک گروہ شاعروں کا ہمارے ہاں ایسا ہے جو رات دن زبان باندھنے کے درپے رہتا ہے ۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو روز مرہ کی ترکیبوں اور زبان کے محاوروں کو روشناس کرے ۔ یہ ترکیبیں اور محاورے ظاہر ہے کہ بجز ان عام خیالات کے جو عام لوگوں کے دلوں میں گزرتے رہتے ہیں اور جن کے لیے وہ ترکیبیں اور محاورے وضع کیے گئے ہیں کسی نئے اور اعلیٰ خیال کو ادا نہیں کرسکتے ۔ اس بنا پر اس گروہ کے شعرا پیش پا افتادہ خیالات کو باندھنے پر مجبور ہیں ۔ ذوق انہیں شعرا کے گروہ میں داخل ہے جیسا کہ ایک مضمون نگار نے رسالۂ اردو میں اس کی اور غالب کی شاعری کا مقابلہ کرکے دکھایا ہے —

اس قسم کے شعرا دانستہ ایسی زمینیں غزلوں کے لیے انتخاب

کرتے ھیں جن میں ردیف کوئی فعل ھو یا فعل کے مشتقات میں سے ھو ۔ پھر کوشش کرتے ھیں که اس فعل کے ساتھه مختلف لفظوں کے ملانے سے جتنے محاورات بنتے ھیں حتی الوسع اُن سب کو باندھ دیں۔ مثلاً ایک شاعر نے غزل کی ردیف "اُٹھانا" اختیار کی ھے ۔ "اُٹھانا" کے ساتھه مختلف لفظوں کے ملانے سے جو محاورے بنے ھیں وہ حسب ذیل ھیں اور اس شاعر نے ان سب محاوروں کو اس غزل میں باندھ دیا ھے ۔ ۱۵ غ اُٹھانا ۔ فتنه اُٹھانا ۔ آنکھه اُٹھانا ۔ سر اُٹھانا ۔ قدم اُٹھانا ۔ ھاتھه اُٹھانا ۔ بیڑا اُٹھانا ۔ نقاب اُٹھانا ۔ ناز اُٹھانا ۔ باگ اُٹھانا ۔ ایذا اُٹھانا ۔ طوفان اُٹھانا ۔ لطف اُٹھانا ۔ مصیبت اُٹھانا ۔ موذیه اُٹھانا —

ایک غزل کی ردیف ھے "اُڑاتے"۔اس میں شاعر نے حسب ذیل محاورے کھپائے ھیں —

خاک اُڑانا۔ لطف اُڑانا ۔ نشانه اُڑانا ۔ رنگ اُڑانا ۔ پرزے اُڑانا۔ چٹکیوں میں اُڑانا۔ خاکا اُڑانا —

ایک غزل کی زمین ھے " بگڑا " ۔ اس میں یه محاورے لائے گئے ھیں ۔ کام بگڑنا ۔ موذیه بگڑنا ۔ نقشه بگڑنا ۔ مزاج بگڑنا ۔ چلن بگڑنا ۔ بدن بگڑنا —

"پکڑے" کی ردیف میں ایک شاعر نے حسب ذیل محاورے خرچ کیے ھیں ۔ گوشه پکڑنا ۔ زبان پکڑنا ۔ ھاتھه پکڑنا ۔ سر پکڑنا ۔ رات پکڑنا ۔ دو دن نه پکڑنا ۔ دل میں جگه پکڑنا ۔ دل پکڑنا ۔ کان پکڑنا ۔ بات پکڑنا ۔ دامن پکڑنا ۔ نذر پکڑنا ۔ "توڑے" کی ردیف میں ایک شاعر نے ان محاوروں کو استعمال کیا ھے ۔ توبه توڑنا ۔ دل توڑنا ۔ کمر توڑنا ۔ ھمت توڑنا ۔ پاؤں توڑنا ۔ بدن توڑنا ۔ عرش کے تارے توڑنا —

ایک غزل کی ردیف ہے "کھا چکے" - اس میں یہ محاورے کھپائے گئے ہیں - شکست کھانا - دھوپ کھانا - رحم کھانا - قسم کھانا - فریب کھانا - بل کھانا - پیچ و تاب کھانا - غصہ کھانا - غوطہ کھانا - مغز کھانا - تلوار کھانا - زخم کھانا - ٹھوکر کھانا - کان کھانا - رشک کھانا - جوش کھانا —

ایک مرثیہ گو شاعر نے اپنے سلام کی ردیف "کھینچتے ہیں" رکھی ہے - اس نے اس سلام میں ان محاوروں سے کام لیا ہے :-

خنجر کھینچنا - خمیازہ کھینچنا - دامن کھینچنا - ہاتھ کھینچنا - پاؤں کھینچنا - طول کھینچنا - تصویر کھینچنا - شکنجے میں کھینچنا - اپنے تئیں دور کھینچنا - سختیاں کھینچنا - سر کو آسمان تک کھینچنا - ایذا کھینچنا - رگ رگ سے جان کھینچنا - باگ کھینچنا - دار پر کھینچنا - انتظار کھینچنا - نقشہ کھینچنا - خجالت کھینچنا - کسی چیز پر قلم کھینچنا —

ایک غزل کی ردیف ہے "نکالیے" - اس میں شاعر نے یہ محاورے صرف کیے ہیں - ارمان نکالنا - دل کا بخار نکالنا - مونھہ سے اُف نہ نکالنا - اشاروں میں کام نکالنا - وحشت میں پاؤں نکالنا - عیب نکالنا - نام نکالنا - آنکھیں نکالنا - بل نکالنا - راہ نکالنا - تدبیر نکالنا - شعر کی زمین نکالنا - دل سے کھٹکا نکالنا - کسی کا ذکر نکالنا - آرزو نکالنا - بات بات میں شر نکالنا - جوہر نکالنا - پرپرزے نکالنا - قدم نکالنا - نیا رنگ نکالنا - مطلب نکالنا - سر نکالنا —

غرض کہ اس قسم کے شعرا ہمیشہ اس بات کے درپے رہتے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو زبان کے محاوروں، روز مرہ کی ترکیبوں اور ضرب المثلوں کو اپنے کلام میں کھپائیں - اُن کو شاعرانہ تخیل یا اعلی خیالات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا - ظفر کے چاروں دیوان اسی قسم کی شاعری

سے بھرے ہوے ہیں - آج کل کے بہت سے شاعر بھی جو مشاعروں میں شریک ہوتے ہیں رات دن اسی دھن میں مبتلا رہتے ہیں - بر خلاف اس کے دوسری قسم کے شعرا وہ ہیں جو باوجود ردیف قافیے کی پابندی کے اعلیٰ خیالات اور لطیف حسیات کے ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں - مگر یاد رکھنا چاھئیے کہ عام طور پر ایسے شعرا آسان ردیفیں اختیار کرتے ہیں اور ایسے قافیے لاتے ہیں جن میں خیالات کا ادا کرنا مشکل نہ ہو - میر ' درد اور غالب اسی گروہ میں داخل ہیں - اگرچہ اپنے زمانہ کے اقتضا سے وہ کبھی کبھی دوسری قسم کی زمینیں اختیار کرنے پر مجبور ہوے ہیں - مگر عام میلان ان کا وہی ہے جو بیان کیا گیا - حالی کے زمانہ سے جو شاعری میں انقلاب ہوا اس کے اقتضا سے فطرت نگار شاعروں نے قافیہ پیمائی چھوڑ دی ہے - وہ غزل کی طرح اکثر ایک ردیف پر قناعت نہیں کرتے - یا تو بغیر ردیف کے صرف قافیہ اپنی نظموں میں لاتے ہیں اور قافیہ ایسا اختیار کرتے ہیں جس کے ہم وزن الفاظ کثرت سے ہوں - مثلاً رواں - تہاں - زمیں جبیں - دریا - صہبا - لاتا ہے - کھاتا ہے - رفتار - گفتار - کہاں - جہاں - قلم - حرم - تحریر - تصویر - دیواں - عریاں - ملت - قدرت - بہار - غبار - چمن - سخن - بسمل - کامل وغیرہ - یا ردیف بہت چھوٹی اختیار کرتے ہیں جو اداے خیال میں خلل انداز نہ ہو مثلاً پر - میں - سے - کو - ہے - ہیں - ہو - تھا - تھی - تھے - کا - کے - کی - لے - تک وغیرہ - یا ترکیب بند کی شکل میں اپنے خیالات کو ادا کرتے ہیں اور ترکیب بند میں ہر بند کے اشعار کی تعداد برابر نہیں رکھتے - جو خیال ایک بند کے جتنے اشعار میں ادا ہو جائے اتنے اشعار پر قناعت

کرتے ہیں - یا مثنوی کے طرز میں اداے خیال کی کوشش کرتے ہیں - فارسی زبان کے شعرا نے مثنوی کی بحریں حسب ذیل رکھی ہیں اور اکثر مثنویاں انہیں بحروں میں لکھی گئی ہیں - (اول) ہزج مسدس مقصور جس کا وزن ہے مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل آخر کا رکن مفاعیل کی جگہ فعولن بھی ہو جاتا ہے - اس بحر میں جامی کی یوسف زلیخا' نظامی کی شیریں خسرو' زلالی کی مثنوی ' ناصر علی کی مثنوی اور غنیمت کی مثنوی نیرنگ عشق لکھی گئی ہے —

(دوم) ہزج مسدس اضرب مقبوض مکفوف جس کا وزن ہے مفعول مفاعلن مفاعیل اور مفاعیل کی جگہ فعولن لانا بھی جائز ہے - اس بحر میں فیضی کی مثنوی نلدمن ' خاقانی کی مثنوی تحفۃ العراقیین اور نظامی کی مثنوی لیلیٰ مجنوں لکھی گئی ہے —

(سوم) رمل مثمن جس میں صدر اور ابتدا سالم ہیں اور حشو مخبون ہے اور عروض اور ضرب مخبون و محذوف ہیں - اس کا وزن ہے فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن - اس بحر میں میر نجات کی مشہور مثنوی گُل کُشتی لکھی گئی ہے —

(چہارم) رمل مسدس محذوف جس کا وزن ہے - فاعلاتن فاعلاتن فاعلن - آخر رکن فاعلات بھی ہو جاتا ہے - اس بحر میں مولانا روم کی مثنوی معنوی ' شیخ فریدالدین عطار کی مثنوی منطق الطیر اور بہاءالدین آملی کی مثنوی نان و حلوا لکھی گئی ہے —

(پنجم) بحر سریع مطوی موقوف جس کا وزن ہے - مفتعلن مفتعلن فاعلان آخر کا رکن فاعلن بھی آسکتا ہے - اس بحر میں امیر خسرو کی مثنوی قران السعدین' نظامی کی مثنوی مخزن اسرار' نیز مثنوی مطلع الانوار

لکھی گئی ہے —

(ششم) بحر خفیف مسدس جس میں صدر و ابتدا سالم اور باقی مقطوع - اس میں اگر عروض فعلن آئے اور ضرب فعلات یا فعلان یا اس کے برعکس عروض فعلات یا فعلان آئے اور ضرب فعلن آئے تو دونوں صورتیں جایز ہیں - اس کا وزن ہے - فاعلاتن مفاعلن فعلن - فعلن کی جگہ فعلات یا فعلان بھی آسکتا ہے - اس بحر میں مثنوی نام حق ' مثنوی ماسقیماں ' نظامی کی مثنوی ہفت پیکر ' امیر خسرو کی مثنوی ہشت بہشت اور حکیم سنائی کا حدیقہ لکھا گیا ہے —

(ہفتم) بحر متقارب مثمن مقصور یا محذوف اس کا وزن ہے فعولن فعولن فعولن فعول - آخری رکن فعول کی جگہ فعل بھی لایا جا سکتا ہے - اس بحر میں فردوسی کی یوسف زلیخا ' فردوسی کا شاہنامہ ' سعدی کی کریما ' سعدی کی بوستاں ' نظامی کا سکندر نامہ اور ملا ہاتفی کا ظفر نامہ لکھا گیا ہے —

(ہشتم) بحر متدارک مثمن مقطوع جس کا وزن ہے فعلن فعلن فعلن فعلن - اس بحر میں میر کی مثنوی جوش عشق لکھی گئی ہے - مگر اس وزن میں میر نے طرح طرح کے تغیر کیے ہیں - کہیں تو بالکل یہی وزن رکھا ہے کہیں فعل فعولن فعل فعولن - کہیں فعلن فعلن فعل فعولن کہیں فعل فعولن فعلن فعلن - کہیں فعلن فعل فعولن فعلن - فارسی کی کوئی مثنوی اس بحر میں مشہور نہیں - مولانا حالی کی مثنوی مناجات بیوہ بھی اسی بحر میں ہے —

(نہم) بحر متقارب مثمن اثلم جس کا وزن ہے فعلن فعولن فعلن فعولن - اس بحر میں مولانا حالی نے اپنی مثنوی کلمۃ الحق لکھی ہے - فارسی میں کوئی مثنوی

اس بحر میں مشہور نہیں - مگر زمانۂ حال کے شاعرانہ انقلاب نے شعرا کو مثنوی کی ان بحروں پر محدود اور قانع نہیں رکھا - وہ تقریباً تمام بحروں میں مثنوی لکھتے ہیں - اس سے اظہار خیال کے لیے میدان بہت وسیع ہوگیا ہے - شاعر کو ہر شعر کے سرانجام کرنے میں صرف دو قافیے سوچنے پڑتے ہیں جو موقع پر نہایت آسانی سے خیال میں آجاتے ہیں اور خیال کے تسلسل اور روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی - یہ آخری طریقہ یعنی مثنوی کے پیرایہ میں ادائے خیالات آج کل زیادہ مقبول ہوتا جاتا ہے - اور چونکہ مثنوی کی اُن بحروں پر شاعروں نے ادائے خیال کو محدود نہیں رکھا جو قدیم زمانے سے مسلمہ ہیں اس لیے اس طریقہ میں وسعت اور گنجایش زیادہ نکل آئی ہے - مولانا حالی نے برکھارت ' نشاط امید ' حب وطن ' مناجات بیوہ ' کلمۃ الحق وغیرہ مثنویاں چھوٹی ہی بحروں میں لکھی ہیں - مگر آج کل مثنوی کے لیے طویل بحریں اختیار کرنے کا میلان پایا جاتا ہے —

یہاں مثال کے طور پر زمانۂ حال کی مثنویوں کے دو دو شعر درج کیے جاتے ہیں —

اُس ہال کے اندر حوض جو تھا فوارے اُس میں اچھلتے گئے
دھاریں جو ہوئیں پانی کی رواں دھاروں سے راگ نکلتے گئے
پھر گھنگروؤں کی چھم چھم کی صدا اُس ہال کے فرش سے آنے لگی
یہ ناچ کی دھن کچھ سازوں کو بجنے کے لیے اُکسانے لگی

تارے سے ہیں چمکتے ہوے یاسمن کے پھول
حیراں ہیں جن کو دیکھ کے سارے چمن کے پھول

ہیں لمبی لمبی ڈالیاں چھائی زمین پر
چھتری سی ہے جھاؤں نے بچھائی زمین پر

بعض اودے ہیں، مگر بعض ہیں پیلے شہتوت
کیا ہی قدرت نے بنائے یہ رسیلے شہتوت
لذت بادۂ کوثر ہے تو شہتوت میں ہے
شہد جنت کا مزا گر ہے تو شہتوت میں ہے

پیپل کے ہر درخت پہ طوطوں کے ہیں پرے
چونچیں ہیں لال لال بدن ہیں ہرے ہرے
چھوٹے پھلوں کو پھینکتے ہیں وہ کتر کتر
مینہ سا برس رہا ہے زمیں پر پتر پتر

یاں ہوا آزاد ہے موجیں یہاں آزاد ہیں
سب پرند آزاد ہیں سب مچھلیاں آزاد ہیں
حسن لیتا ہے یہاں ابھریں پڑا چاروں طرف
ہے خوشی چاروں طرف اور ہے ضیا چاروں طرف

میں ہوں شمع محفل زندگی میرا نام عہد شباب ہے
مرا سانس باد بہار ہے مری چال موج شراب ہے
مری عمر کی ہیں جو ساعتیں ہوئی عشرتوں میں تمام ہیں
یہی قہقہے یہی چہچہے مری زندگی کے پیام ہیں

ہے میرے دل میں بھی یہ تمنا یوں ہی رہوں بے نام و نشاں
اہل جہاں سے دور رہوں اور دور ہوں مجھ سے اہل جہاں
کشمکش جذبات سے مرا دامن عصمت چاک نہ ہو
پاک رہوں اور پاک ہی جاؤں گھر میں مرے گو خاک نہ ہو

شیکسپیر اے دل انساں کے مصور
فطرت کے مظاہر ترے دل پر ہوے ظاہر
وسعت میں تری روح سمندر سے بڑی ہے
رفعت میں نظر تیری ستارں سے لڑی ہے

ملک کا سرمایۂ بقا ہے انہیں سے
قوم کا سامان ارتقا ہے انہیں سے
گر ثمر شاخ آرزو ہیں تو یہ ہیں
جوہر شمشیر آبرو ہیں تو یہ ہیں

اے آریو آؤ قدم رکھو ان حسن بھرے گلزاروں میں
جنت کے مزے لوٹو کے سدا اس پاک زمیں کی بہاروں میں
تم گنگ و جمن کے کناروں پر شہر اپنے نئے آباد کرو
گاگا کے بھجن کر کرکے ہون ہو جاؤ مگن دل شاد کرو

وہ راگ جسے ہنگام سحر گاتی ہے ہوا گلزاروں میں
وہ راگ جسے چشموں کی زباں کرتی ہے ادا کہساروں میں

وہ راگ جو ہے موجوں کو رواں اس وحشت خیز سمندر میں
وہ راگ شراب تند بھری ہے جس کے بھنور کے ساغر میں
وہ راگ جسے کا کا کے سدا آتے ہیں پرندے مستی میں
وہ راگ چھپی ہے جس کی صدا ہر رینگنے والی ہستی میں
اُس راگ نے اپنی الاپوں سے لبریز کیے ہیں کان مرے
پھر جاگ اُٹھے ہیں مرے جذبے پھر زندہ ہوے ارمان مرے

خون اُس کی نگاہوں سے ہر لحظہ ٹپکتا ہے
ہے ہاتھ میں جو چاقو بجلی سا چمکتا ہے
ہے کاٹتا اک دم وہ سر سبز نہالوں کو
رحم اُن پہ نہ کیوں آئے سب دیکھنے والوں کو

جب نیم کی شاخیں ٹھنڈی ہوا کھا کھا کے تھرکنے لگتی ہیں
پھر زریں کرنیں سورج کی پتوں پہ چمکنے لگتی ہیں
پتوں کی رگوں میں نیم کا رس ہے دوڑتا پوری سرعت سے
یہ ریشہ دوانی دیکھ کے میں تصویر بنا ہوں حیرت سے

مرے دل میں اُٹھتے ہیں ولولے کہ ہوں کاش باد بہار میں
کبھی غنچے پر ہو مرا گزر کبھی پھول سے ہوں دوچار میں
کبھی گلشنوں کو بتاؤں میں وہ جو ضابطے ہیں سنگار کے
کبھی بلبلوں کو سکھاؤں میں وہ جو زمزمے ہیں بہار کے

ہے طبع رواں دب کر جھگھٹ میں کھل جاتی
ہرگوں کے تلے آکر ہے گھاس بھی جل جاتی
جو ذہن کہ خلوت میں کرسکتے تھے ایجادیں
جلوت میں وہ جب پہنچے سب گر گئیں بنیادیں

لطف ہوا سے بو پہ بو پھیل رہی فضا میں ہے
معجزہ نو بہار کا جلوہ گر اس ہوا میں ہے
عکس مشام ہر مگر جب نہ پڑے شمیم کا
کیجئے کس سے تذکرہ تازگی نسیم کا

سرھانے اک مریض سرے ہے شمع زرد جل رہی
برنگ مور ناتواں ہے نبض اس کی چل رہی
یکا یک اُس کے چہرے پر جھلک سی آکے رہ گئی
جو زندگی کی موج تھی وہ تلملا کے رہ گئی

وہ گُلوں کی روشنی سے نظاروں کا دنگ ہونا
وہ برنگ باغ رضواں چمنوں کا رنگ ہونا
وہ شمیم عطر گُل کا سر رہ گزر مہکنا
وہ نسیم مشک چین کا لب غنچہ سے لپکنا

کس قدر بلندی پر تھا کبھی مکاں میرا
شاخ سبز طوبیٰ پر تھا اک آشیاں میرا

حوریں کس مسرت سے گود میں بٹھاتی تھیں
زمزمے مرے سن کر خود بھی سر ہلاتی تھیں

یہ زمیں پر چمنستاں وہ بلندی پہ ستارے
مرے دل سے کوئی پوچھے تو یہ جلوے ہیں تمہارے
کبھی خوشبو کی اگر لہر سی پاتا ہوں فضا میں
تو سمجھتا ہوں کہ تم بال سکھاتے ہو ہوا میں

صبح یوں ہی آے گی شام یوں ہی آے گی
گردش دور زماں رنگ یوں ہی لاے گی
زمزمے مرغ چمن یوں ہی سدا گائیں گے
پھول یوں ہی باغ میں رنگ نیا لائیں گے

ہے حادثوں میں پنہاں حکمت کا اک اشارا
جراحیاں ہیں گویا قدرت کی آشکارا
نشتر سے حادثوں کے چیرے نہ گر وہ پھوڑے
فاسد مواد اُن کو زندہ کبھی نہ چھوڑے

سمندر اے دل خالق کے اضطراب سمندر
چھپے تو رکھتا ہے کیا انقلاب سینے کے اندر
غرور عقل بشر کے تو ہو چکا ہے تو لاشے
اب اور دیکھیے کیا کیا دکھائے گا تو تماشے

جولاں گہہ اظہار لیاقت اسے کہیے
گہوارۂ تعلیم فصاحت اسے کہیے
ذہنوں کی ترقی کا جو میداں ہے تو یہ ہے
آداب تمدن کا دبستاں ہے تو یہ ہے

ایک ہنگامہ تھا برپا مرے ارمانوں میں
برق مضطر کی تڑپ تھی مری شریانوں میں
صرصر رنج کے جھوکے جو گذر جاتے تھے
دفتر قلب کے اوراق بکھر جاتے تھے

کیا برق و باد کا طوفاں تھا تھی جس سے فضا میں پڑی ہل چل
اب تو ہی نشانی ہے باقی طوفاں کی اے تنہا بادل
دل تیری گرج سے دہلتے تھے لرزہ تھا پڑا جانداروں میں
گویا تھا سمندر ٹوٹ پڑا پانی کی اپکتی تھیں دھاریں

اس بہشت زندگی سے نوجواں غافل نہ ہوں
عیش کے مشتاق ہیں تو طیش پر مایل نہ ہوں
لذت اخلاق شیریں اُن کو چکھنی چاہیے
من و سلوا کی حفاظت ان کو رکھنی چاہیے

لہجۂ بلبل کو فریاد زغن ہونے نہ دیں
نغمۂ وحدت کو شور ما و من ہونے نہ دیں
سیل کی کھیتی پہ پانی سیل کا پھرنے نہ دیں
مہر کے خرمن پہ بجلی قہر کی گرنے نہ دیں

جس کو دیکھا تھا کبھی گلشن وہ گلخن ہو نہ جاے
جس کو سمجھے تھے کبھی مسکن وہ مدفن ہو نہ جاے

صرصر دوزخ کو اس فردوس میں چلنے نہ دیں
نخل طوبیٰ کی جگہ زقوم کو پھلنے نہ دیں

نوح کی کشتی پہ طوفاں کا اثر ہونے نہ دیں
جلمت آدم میں شیطاں کا گذر ہونے نہ دیں

تیوروں پر لطف کے غصے کے بل آنے نہ دیں
عہد میں الفت کے کلفت کا خلل آنے نہ دیں

روسی ناول

پہلا دور

فیوڈر میخائلووچ دستہ ئف سکی

از

(جناب محمد مجیب صاحب بی - اے 'آکسن')

دستہ ئف سکی کی شخصیت اور تصانیف کے خاص انداز کو نظر میں رکھیئے تو یہ واقعہ بھی معنی خیز ہے کہ وہ ایک ہسپتال میں پیدا ہوا، اور ایسے خاندان میں جس کی آمدنی اور خرچ کا تناسب کسی صورت سے اطمینان بخش نہیں تھا - اُس کے باپ کو، جو ہسپتال میں ایک معمولی عہدے پر نوکر تھا، اپنے افلاس کا بہت شدید احساس تھا، اور اسے آئندہ کے بارے میں اتنے اندیشے تھے کہ وہ ہمیشہ مایوس اور مغموم رہتا اور ایک لمحے کی خوشی اور بے فکری بھی اپنے اوپر حرام سمجھتا۔ بچوں کی تربیت اسی رنگ میں ہوئی، اور یہ بات شروع سے اُن کے ذہن نشین کردی گئی کہ زندگی کھیل نہیں ہے، اور اُنہیں اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ سنبھالنے اور دنیا کی مصیبتوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے - ماں کی زندہ دلی اور خوش مزاجی اس فضا کی افسردگی اور غمگینی کو جو باپ کے فلسفۂ زندگی

نے پیدا کی تھی کم نہ کرسکی - اور بچپن ہی سے دستہ ئف سکی کے مزاج کے توازن میں کچھ خلل پڑگیا - ممکن ہے اگر اسے ہم عمر بچوں کے ساتھ مل کر کھیلنے کا موقع ملتا تو اُس کے باپ کی تعلیم کا اثر کسی قدر زائل ہوجاتا، اور اس کی نشوو نما میں کوئی خاص رکاوٹ نہ ہوتی، مگر وہ اس نعمت سے بالکل محروم رہا - سوا ان چند دنوں کے جب سارا خاندان ماسکو کے قریب ایک گانوں میں چلا جاتا تھا ، دستہ ئف سکی کا سارا بچپن مکان کے چند کمروں میں گذرا - جب اسکول جانے کے دن آئے تب بھی اُسے قید سے رہائی نہیں ملی - وہ اپنے بھائی میخائیل کے ہمراہ اسکول جاتا - اُسی کے ساتھ واپس آتا ، اور اُسے دوسرے لڑکوں کی صحبت سے پرہیز کرنے کی سخت تاکید تھی - باپ نے جو کچھ کیا نیک نیتی سے کیا لیکن اس تربیت نے دستہ ئف سکی کے مزاج اور طبیعت میں ایسی خامیاں پیدا کردیں جنھیں وہ آگے چل کر بھی دور نہیں کرسکا -

اسکول کی تعلیم ختم کرنے کے بعد دستہ ئف سکی پیٹر برگ کے انجینیرنگ کالج میں داخل ہوا اور سنہ ۱۸۴۳ میں اس کو اسی محکمہ میں ملازمت مل گئی - لیکن ملازمت سے اس کی طبیعت بہت جلد گھبرا گئی - اسے انشاپردازی کی مطلق مشق نہیں تھی - اُس کی تعلیم سائنس اور ریاضیات میں ہوئی تھی - مگر اس کے باوجود اس نے انشاپردازی کو کسب معاش کا ذریعہ بنانے کا ارادہ کیا اور ناول لکھنے لگا - اس کی پہلی کوشش بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس کے پہلے ناول "غریب آدمی" (سنہ ۱۸۴۶) کا ادبی حلقوں میں بہت چرچا ہوا - دستہ ئف سکی نے اس کامیابی کی بنا پرجو امیدیں باندھیں وہ غلط ثابت ہوئیں اور "غریب آدمی" کے بعد

اس نے جو دو چار افسانے شایع کیے وہ عام طور سے اُس کے مداحوں کو بھی پسند نہیں آئے۔ اسی زمانہ میں وہ پتراشف سکی کے حلقے کا رکن بن گیا جس میں اشتراکیت کی تعلیم پر بحث ہوا کرتی تھی اور جس کے اراکین زیادہ تر اشتراکی تھے ۔ سنہ ۱۸۴۹ میں کسی جرم کی بنا پر جس سے ادارے کے نوجوان اراکین خود بھی واقف نہیں تھے ' سب کو موت کی سزا کا حکم دیا گیا ۔ آخر وقت میں جب ان بیچاروں کو گولی مارنے کی ساری تیاریاں ہو چکی تھیں انھیں اطلاع دی گئی کہ زار کی عنایت سے ان کے لیے موت کے بجاے سائی بی ریا میں جلا وطنی اور قید با مشقت کی سزا تجویز کی گئی ہے ۔ایک دو روز میں دستہ ئف سکی اور "مجرموں" کے ساتھ سائی بی ریا روانہ کر دیا گیا ۔ یہاں وہ چار سال قید خانے میں رہا ' اور اس کے بعد جبری فوج میں بھرتی کر دیا گیا ۔ پیٹر برگ آنے کی اجازت اسے سنہ ۱۸۵۹ ع کے آخر میں ملی ۔ دستہ ئف سکی کو بچپن میں جیب خرچ کے طور پر ایک پیسہ بھی نہیں دیا جاتا تھا ' اور جب وہ اسکول میں داخل ہوا تب بھی اس کی جیبیں ہمیشہ خالی رہیں۔ اس وجہ سے اسے خرچ کرنے کا ڈھنگ بالکل نہیں آیا۔ وہ اپنی آمدنی نہایت بے طریقے سے اڑا دیتا تھا ' اور زیادہ تر اسی سبب سے بہت تکلیفیں اُٹھاتا رہا ۔ قید اور جلا وطنی نے اس کے افلاس کو اور بھی بڑھا دیا ۔ جب وہ سائی بی ریا سے واپس ہوا تو اس پر بہت قرضہ ہو گیا تھا ' اور کتابیں لکھنے کے سوا قرض ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ سنہ ۱۸۶۰ ع کے دوران میں اس نے اپنا ناول "بیکسی اور مظلوم" لکھا اور سنہ ۱۸۶۱ ع میں اپنے بھائی میخائیل کی شرکت میں ایک ماہوار رسالہ "زمانہ" جاری کیا۔ اس رسالے میں اس نے اپنی قید

کے حالات "مُردوں کے گھر" کے عنوان سے بہ اقساط شائع کیے۔ اس وقت تک وہ خاصا مشہور ہوگیا تھا۔ "زمانہ" بہت جلد ہر دلعزیز ہوگیا، اور دستہ ئف سکی کو اتنی آمدنی ہونے لگی کہ وہ اپنے قرض کا کچھہ حصہ ادا کرے۔ مگر سنہ ۱۸۶۳ میں ریاست کے حکم سے رسالہ بند کرا دیا گیا۔ دستہ ئف سکی ایک نیا رسالہ جاری کرنے کا انتظام کر رہا تھا کہ اس کے بھائی کا انتقال ہوگیا اور علاوہ اس قرضے کے جو وہ چھوڑ گیا تھا اس کے بیوی بچوں کی پرورش بھی دستہ ئف سکی کے سر پڑ گئی۔ اس کی پریشانیوں اور ذمہ داریوں کی کوئی انتہا نہیں تھی، مگر اس نے کسی نہ کسی طرح سے رسالے کے لیے سرمایہ فراہم کیا اور سنہ ۱۸۶۴ میں "دور" کے نام سے اسے جاری کردیا۔ یہ رسالہ بھی ریاست نے ایک سال کے اندر بند کرا دیا، اور دستہ ئف سکی پر اس قدر قرضہ ہوگیا کہ قید خانے سے بچنے کے لیے وہ روس سے فرار ہوگیا۔ سنہ ۱۸۶۵ کی گرمیوں میں وہ جرمنی کے شہروں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ مگر افلاس نے وہاں رہنا بھی دشوار کردیا اور وہ اسی سال پھر روس واپس آگیا "جرم اور سزا" (۱۸۶۶) لکھہ کر اس نے اپنے قرضے کا بوجھہ کچھہ ہلکا کیا، مگر قرضداروں کے تقاضوں نے اسے ایسا تنگ کیا کہ اگلے سال وہ پھر یورپ چلا گیا۔ اگر وہ کفایت شعاری سے رہتا تو ممکن تھا اسے اس کا موقع ملتا کہ ایک دو سال میں ناولیں لکھہ کر اپنی مالی حالت کسی قدر ٹھیک کرلے، مگر جوا کھیلنے کی عادت نے اس کا امکان نہیں رہنے دیا۔ دستہ ئف سکی چار سال یورپ میں رہا، کبھی جرمنی، کبھی سوئسٹان، کبھی فرانس میں اور اس عرصہ میں دو لمبے ناول "مجذوب" (۱۸۶۸ - ۱۸۶۹) اور "بھوت

پریت " (۱۸۷۰ - ۷۱) لکھے - لیکن چاروں سال فاقہ مستی میں گذرے یہاں تک کہ اکثر کپڑے اور جوتے رہن رکھنے کی نوبت آجاتی تھی - اتفاق سے اس کی نئی بیوی جس سے اس نے یورپ جانے سے پہلے شادی کی تھی، ایسی باسلیقہ اور کفایت شعار نکلی کہ بری عادتوں کے باوجود دستہ ئفسکی کی حالت کسی قدر سنبھل گئی اور سنہ ۱۸۷۱ میں جب اسے روس میں گذر اوقات کرنے کی صورت نظر آئی تو وہ واپس چلا آیا - اسے صرف دس سال اور جینا نصیب ہوا، مگر بیوی کے حسن انتظام کی بدولت یہ عرصہ مقابلتاً آسودگی میں بسر ہوا - اس کے ناولوں نے اسے تالستائی کے دوش بدوش روسی انشاپردازوں کا سرتاج بنا دیا تھا - سنہ ۱۸۸۱ میں اس نے شاعر پشکن کی برسی میں ایک تقریر کی جس نے اس کی شہرت کو عروج پر پہونچا دیا - اسی سال موت نے اسے اچانک آگھیرا، اور اس کی عظمت کا یہ ایک ادنیٰ ثبوت تھا کہ اس کا جنازہ اس شان سے اٹھا جس پر بادشاہ بھی رشک کر سکتے تھے —

دستہ ئفسکی کی مزاجی کیفیات کا اثر اس کی تصانیف کے ہر صفحہ پر ظاہر ہوتا ہے اور انہیں سمجھنے کے لیے اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں سے واقف ہونا لازم ہے - بچپن میں وہ ہم عمر بچوں کی صحبت سے محروم رکھا گیا تھا - بڑے ہونے کے بعد بھی وہ اپنے ساتھیوں سے الگ رہتا تھا، کچھ اس وجہ سے نہیں کہ وہ غریب تھا اور اس کے ساتھی امیر، بلکہ محض اس لیے کہ وہ صحبت سے گھبراتا تھا، اور مہذب زندگی کے رسوم و آداب سے بالکل ناواقف تھا - اپنے بھائی میخائیل کے سوا اُس نے کبھی کسی سے دل کھول کر یا بے تکلفی سے باتیں نہیں کیں - اُس کے دل میں

دوسروں کی طرف سے بیجا شبہے پیدا ہوجایا کرتے تھے' اور اس میں صاف گوئی کا اتنا مادہ بھی نہیں تھا کہ اپنی بدگمانی کو ظاہر کرکے لوگوں کو اس کے رفع کرنے کا موقع دے۔ ایسے اشخاص بھی ہوتے ہیں جو تنہائی کی زندگی میں خوش رہتے ہیں' لیکن دستہ ئف سکی میں یہ بات بھی نہیں تھی' اس لیے کہ اسے اپنی طبیعت پر مطلق قابو نہیں تھا' خرچ کی تنگی کے باوجود جب کبھی اُس کے ہاتھہ میں روپیہ آتا تو وہ فضول چیزوں میں پانی کی طرح بہا دیتا' اور جب ضرورتیں ستاتیں تو کُڑھا کرتا یا اپنی قسمت کو روتا۔ ایسی وہمی اور کمزور طبیعت والے آدمی کو دوستی سے بہت سہارا مل سکتا ہے' اور عموماً ایسے لوگ دوستی پیدا بھی کرلیتے ہیں ۔ دستہ ئف سکی نے جب ملازمت ترک کرکے انشاپردازی شروع کی اور اپنا پہلا ناول لکھا تو ماسکو کے ادبی حلقوں میں اُس کے بہت سے ایسے قدر شناس تھے جو اُس سے دوستانہ تعلقات قائم کرنا چاہتے تھے' لیکن دستہ ئف سکی نے اُن کے لیے اس رشتے کا نباہنا بہت ہی دشوار کردیا ۔وہم کے ساتھہ ہی اس کی طبیعت میں خود پسندی بھی بہت تھی' وہ ذرا سا اختلاف بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا' اور ہر وقت ہر شخص کی نسبت یہ بدگمانی رکھتا تھا کہ وہ میرا مذاق اُڑا رہا ہے یا مجھہ پر رشک کرتا ہے یا میری رسوائی اور بدنامی چاہتا ہے ۔ بے لن سکی' جو دستہ ئف سکی کے پہلے ناول "غریب آدمی" کی اشاعت کے زمانے میں روس کا ادبی رہبر مانا جاتا تھا' دستہ ئف سکی کا بڑا مداح اور اُس کے ہنر کا سچا قدرداں تھا ۔ لیکن محض اس بنا پر کہ "غریب آدمی" کے بعد جو دو چار افسانے دستہ ئف سکی نے لکھے ان کی اُس نے حسب

دلخواہ تعریف نہیں کی' دستہ ئف سکی اس سے نہ صرف خفا ہوگیا بلکہ اُس کے تمام احسان بھلا کر لوگوں سے اس کی جھوٹی شکایتیں کرنے لگا۔ ماسکو کی ایک ادبی مجلس میں اُس کے ہم عصر ناول نویس تورگے نف نے جو اس کے طرز کو پسند نہیں کرتا تھا "غریب آدمی" کے ہیرو جے دوش کن کی ایسی نقل اتاری کہ وہ دستہ ئف سکی سے بہت مشابہ معلوم ہونے لگا' اور دستہ ئف سکی اس بات پر اتنا ناراض ہوا کہ اُس نے تورگے نف ہی سے نہیں بلکہ ان تمام لوگوں سے جو وہاں موجود تھے ملنا چھوڑ دیا' اور جب کبھی رستہ چلتے مڈبھیڑ ہوجاتی تو منھ پھیر لیتا۔ اگر اس معاملے میں وہ اپنی بات کا پکا ہوتا اور اپنی بے نیازی ثابت کردیتا تو نقصان کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کو کچھ فائدہ بھی پہنچتا' اور اس کی طبیعت میں مضبوطی اور خود داری پیدا ہوجاتی۔ لیکن فضول خرچی کی وجہ سے وہ ہمیشہ مالی دشواریوں میں مبتلا رہتا تھا' اور اکثر اُسے انہیں لوگوں سے مالی امداد لینا پڑتی تھی جن کی طرف سے اس کے دل میں ہزاروں بدگمانیاں اور شکایتیں تھیں۔ غیرت و حمیت اور مجبوری کی اس کشمکش نے دستہ ئف سکی کی طبیعت کا توازن بالکل بگاڑ دیا۔ اپنی بری عادتوں اور سیرت کی کمزوریوں کے احساس نے اُسے اپنی نظروں میں اتنا حقیر کردیا کہ گو دوسرے اسے بدمغ سمجھتے تھے مگر وہ خود اچھی طرح سے جانتا تھا کہ دنیا کی نگاہوں میں اپنی عزت قائم رکھنے کی جو کوشش میں کررہا ہوں وہ بے کار ہے لیکن اس کا اقرار کرنا اُسے کسی طرح گوارا نہیں تھا۔ سیرت اور مزاج کی ان خامیوں نے دستہ ئف سکی کے لیے چین سے رہنا دشوار کردیا' اور سوا عمر کے آخری دس بارہ

سال کے جب اس کی بیوی نے اُسے اپنے قابو میں کرلیا تھا ' بالکل اُسی طرح جیسے بچپن میں اُس کے ماں باپ نے ' دستہ ئف سکی کے لیے زندگی ایک عذاب تھی —

دستہ ئف سکی کی سیرت پر غور کرتے ہوے ہمیں دو باتوں کا اور خیال رکھنا چاہیے کیونکہ ان کا اس کے فلسفۂ حیات سے بہت گہرا تعلق ہے :- ایک تو موت سے وہ مڈبھیڑ جب اس کے قتل کا حکم دیا گیا تھا ' دوسرے اس کا مرگی کا مرض ' جس کے پہلے دورے سائی بی ریا میں ہوے - موت سے مڈبھیڑ کا قصہ دستہ ئف سکی نے اپنے بھائی کو ایک خط میں لکھا ہے :

" آج ۲۲ دسمبر * کو ' ہم سب سم یہ نوت سکی † چوراہے پر پہنچاے گئے - وہاں ہمیں سزا کا حکم سنایا گیا ' چومنے کے لیے صلیب دی گئی ہمارے سروں پر خنجر توڑے گئے اور اس کے بعد ہمیں وہ سفید قمیصیں پہنا دی گئیں جو ہمارا کفن ہونے والی تھیں - تب ہم میں سے تین کے ہاتھ کھمبوں سے باندھ دیے گئے اور وہ سزا کی تکمیل کے لیے کھڑے کیے گئے - میں صف میں چھٹا تھا ' ہم تین تین کرکے مارے جانے والے تھے ' اِس لیے میری زندگی کے صرف چند لمحے باقی تھے ... مجھے بس اتنی فرصت تھی کہ پلش چے ئف اور دو روت سے جو میرے پاس تھے گلے مل لوں ' اور رخصت ہو لوں - لیکن اسی وقت سپاہیوں کو (جو گولی چلانے والے تھے) واپسی کا حکم ملا ' وہ قیدیوں جن کے ہاتھ کھمبوں سے

---

* ۱۸۴۹ ع - † ایک مقام جہاں پر عموماً مجرموں کو گولی ماری جاتی تھی —

بند ھے تھے رھا کر دیے گئے اور ھمیں زار کا فرمان سنا یا گیا جس میں اُس نے ھماری جان بخشی کی تھی ...“ دستہ ئف سکی کے ساتھیوں میں سے ایک پاگل ھو گیا ' اور خود دستہ ئف سکی کی کیفیت جنون سے کچھہ کم نہیں تھی۔ ان چند لمحوں میں اس کے دل پر جو کچھہ گذری وہ اس نے کئی ناولوں میں ضمناً بیان کیا ھے ' اور اس سے ھم کو معلوم ھو جاتا ھے کہ اس حادثے کے بعد اس کی وھی حالت تھی جو ایک بڑے درخت کی ھوتی ھے جب کوئی زلزلہ اس کی جڑیں اس طرح سے ھلادے کہ وہ نہ تو اتنا کمزور ھو کہ گر پڑے یا غذا نہ پہنچنے سے سوکھہ جاے ' نہ اتنا مضبوط کہ زمین سے پوری غذا حاصل کرے اور پھر سر سبز اور شاداب ھو جاے۔ دستہ ئف سکی کا فلسفہ اور اس کے احساسات اس واقعہ کے بعد کبھی ایک ”طبعی“ انسان کے سے نہیں ھوسکتے تھے ' اور اس کی نظر میں زندگی کی کبھی وہ صورت نہیں ھو سکتی تھی جو ”طبعی“ انسان کی نگاھوں میں ھوتی ھے ۔ مرگی کے مرض نے اس کی ذھنیت کو طبعی حالت سے اور بھی دور کر دیا —

دستہ ئف سکی کے ناولوں میں کئی ایسے کیریکٹر ملتے ھیں جو اسی ”مقدس مرض“ میں مبتلا ھیں ' اور ان کے بیان سے اس کیفیت کا کچھہ اندازہ ھوتا ھے جو دستہ ئف سکی پر دورے سے پہلے گذرتی تھی ۔ ”بھوت پریت“ میں ایک شخص کہتا ھے : ”کچھہ ایسا معلوم ھوتا ھے کہ میں نے گویا یکبارگی کُل کائنات کا اندرونی نظام سمجھہ لیا اور کہا : ”ھاں ' یہ بالکل ٹھیک ھے !...... یہ محض ایک پُر اثر کیفیت نہیں ھے ' بلکہ ایک مسرت ھے جس کی کوئی انتہا نہیں ۔ دل پر سب سے زیادہ دیرپا نقش اِس بات کا ھوتا ھے کہ میں جو کچھہ دیکھتا ھوں

اور میرے جو احساسات ہوتے ہیں وہ بالکل صاف اور روشن ہوتے ہیں' اور ہر احساس ایک عجیب و غریب مسرت پیدا کرتا ہے۔ اگر یہ حالت پانچ سکنڈ سے زیادہ قایم رہے تو میری روح اس کی تاب نہ لا سکے اور یقیناً ہلاک ہو جاے "۔ دستہ ئف سکی کو ان دوروں کے آتے وقت کائنات اور وجوہ کی اصلیت جس شکل میں نظر آتی تھی' کائنات کے جو راز اس پر فاش ہو جاتے تھے' اُس کے فلسفے میں بہت اہمیت رکھتے ہیں' انھیں کی وجہ سے اسے اُس جستجو کا سودا ہوا جو اُس کے ناولوں کا اصل موضوع ہے' اور یہ جستجو اِس سوال سے شروع ہوتی ہے کہ آیا یہ کیفیت ایک بیماری ہے' یا ایک حقیقت جو کبھی کبھی اپنی ایک جھلک دکھلاجاتی ہے —

دستہ ئف سکی جس حقیقت کی تلاش میں نکلا وہ اس کے خیال میں خارجی زندگی اور بیرونی اثرات سے بہت کم تعلق رکھتی تھی۔ اسی وجہ سے اُس کے ناولوں میں " واقعات " کا بہت کم ذکر ہے ' انسان کی اندرونی کیفیات بہت تفصیل سے بیان کی گئی ہیں' ان کی اہمیت پر اتنا اصرار کیا گیا ہے کہ وہ ناول کی ساری فضا پر چھا جاتی ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سوا ہستی کا اور کوئی پہلو ہی نہیں۔ روزمرہ زندگی میں ان کیفیتوں کا جو دستہ ئف سکی کے ناولوں میں ایک معمولی چیز قرار دی گئی ہیں ' شاذ و نادر ہی تجربہ ہوتا ہے اور جس قسم کے انسانوں سے اس کی دنیا آباد ہے وہ ہمیں اپنی دنیا میں شاید ہی کبھی دکھائی دیتے ہوں - اس بنا پر بعض لوگ جو دستہ ئف سکی کی عظمت سے انکار نہیں کرتے اسے مزاج اور ذہن کی بیماریوں کا محقق اور " پاگل خانے کا شیکسپیر " ٹھیراتے ہیں۔ یہ ایک حد تک صحیح

ہے ' کیونکہ دستہ ئف سکی نے علم نفسیات میں بہت سی معلومات کا اضافہ کیا ہے ' اور نفسیات کے عالموں کو خوابوں کی ماہیت سمجھنے میں اس کی تصانیف سے بہت مدد ملی ہے - " دھری شخصیت " کا مظہر بھی سب سے پہلے اسی کی تصانیف میں نظر آتا ہے ' اور نفسیات کے ماہروں نے بعد کو اس کے متعلق جو کچھ معلوم کیا وہ محض دستہ ئف سکی کے بیان کی تصدیق ہے - خواب یا دھری شخصیت محض ایک مثال ہے ' دستہ ئف سکی نے " بیماری " کے بہانے سے نفس انسانی کے ہزار ہا راز فاش کیے ہیں - حقیقت کے ناگوار پہلو پر پردہ ڈالنا حفاظت نفس کی طرح انسان کی ایک جبلی خواہش ہے - اہل علم ان رازوں سے اس لیے نا واقف رہے ہیں کہ یہ انسانی شخصیت کی تہ میں چھپے رہتے ہیں ' ان کا احساس وجدان کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے ' علم کی ان تک رسائی نہیں —

نقادوں نے دستہ ئف سکی کو بیمار ذہن اور روگی فطرت کا محقق بنا کر اس کی تصانیف کو بالکل اور ہی حیثیت دے دی ہے ' دستہ ئف سکی خود حقیقت نگار ہونے کا دعوی کرتا تھا ' اور اسے یقین تھا کہ جو شخص بے معنی روز مرہ زندگی اور واقعات کا پردہ اٹھا کر دیکھے گا اسے حقیقت اسی شکل میں نظر آئے گی - اپنے خطوط میں اس نے جا بجا اس مسئلے پر اپنے خیالات ظاہر کیے ہیں-ایک جگہ وہ لکھتا ہے : " حقیقت نگاری کا مفہوم جو میرے ذہن میں ہے ہمارے معمولی " حقیقت نگاروں " اور نقادوں کے خیالات سے بالکل مختلف ہے - معاذ اللہ ! اگر کوئی وہ ساری کیفیتیں جو ان گذشتہ دس سالوں میں ہم روسیوں کے دلوں پر گزری ہیں صاف صاف بیان کردے ... تو یہی حقیقت نگار چیخ اٹھیں گے کہ یہ محض خبط ہے ! لیکن اس بیان کی حقیقت میں کلام نہیں ہوسکتا ! ایسی ہی حقیقت نگاری سچی اور کھری

ہو سکتی ہے' وہ جو عام طور سے رائج ہے محض سطحی اور حقیر ہے "۔
یوں ہم سمجھ سکتے ہیں کہ دستہ ئف سکی کے ناولوں پر " بیماری " کی
فضا کیوں چھائی رہتی ہے ۔ وہ عام نفسیات کے لیے ذخیرہ جمع کرنے
کی کوشش نہیں کرتا ۔ اسے اس کی فکر ہے کہ کسی طرح انسانی زندگی
اور انسانی ہستی کی اصل حقیقت معلوم کرے' اور جیسے ایک سائنس
کے عالم کو انسانی جسم کے نظام اور کاروبار کا پتہ اسی وقت چلتا
ہے جب اس نظام میں کوئی خلل پیدا ہو' دستہ ئف سکی بھی بیماری
اور بیماروں کو حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بناتا ہے ۔ انسان اگر
تندرست اور خوش حال ہو تو اپنی خواہشوں اور آرزؤں میں مبتلا
رہتا ہے اسے اتنی مہلت نہیں ملتی کہ اپنی ہستی کے معنوں پر غور
کرلے' اور وہ اس کی ضرورت محسوس ہی نہیں کرتا ۔ لیکن غربت'
مصیبت' اور بیماری میں اس کی توجہ جسمانی زندگی سے ہٹ جاتی
ہے اور تب وہ مجبور ہوتا ہے کہ اپنی ہستی کا مقصد' کائنات میں
اپنے وجود کا مصرف کسی طرح اپنے آپ کو سمجھائے' اور پھر اپنی
گذشتہ اور آئندہ زندگی کے متعلق کوئی فیصلہ کرے ۔ دستہ ئف سکی کا موضوع
ایسے ہی انسانوں کے خیالات اور احساسات ہیں' اور اسی وجہ سے
خود حقیقت نگاری کا یہ تقاضا تھا کہ اس کے کیرکٹر مصیبت زدہ یا
کسی نہ کسی لحاظ سے " بیمار " ہوں' سکون اور نجات حاصل کرنے
کو تڑپ رہے ہوں اور انہیں خارجی زندگی کے ان مسائل اور معاملات
سے کوئی سر و کار نہ ہو جو تندرست انسان کے ذہن پر حاوی ہوتے
ہیں ۔ دستہ ئف سکی کے فلسفۂ زندگی کا یہ اصول ذہن نشین کرکے ہم
اس کی تصانیف پر سلسلہ وار غور کرسکتے ہیں —

اس کا پہلا ناول " غریب آدمی " اور دوسرا " بیکس اور مظلوم " چند افسانے جو اس نے سنہ ۱۸۴۶ اور سنہ ۱۸۴۹ کے درمیان لکھے " سدا سہاگی " " ماموں جان کا خواب " اور " ستّے پان چی کووو " اس کی تصانیف کا ایک جداگانہ حصہ ہیں ' اور موضوع کے اعتبار سے اُن ناولوں سے بہت مختلف ہیں جن کا سلسلہ " مردوں کے گھر " سے شروع ہوتا ہے - لیکن دستہ ئف سکی کا طرز ان شروع کی تصانیف میں بھی وہی ہے جو بعد کے ناولوں میں پایا جاتا ہے ' اور ان میں بھی اس کی قوت ادراک اور انسانی سیرت کے وجدانی علم کا وہی عالم ہے - " غریب آدمی " گوگول کے افسانے " لبادے " سے ملتا جلتا ہے ' اس کا ہیرو بھی خاکسار اور مسکین ہے ' ایک " بیچارہ " جس کا حال سن کر ترس آتا ہے ' لیکن " غریب آدمیوں " کی اور " لبادے " کی حقیقت نگاری میں یہ بڑا فرق ہے کہ گوگول نے جگ بیتی سنائی ہے اور دستہ ئف سکی نے آپ بیتی ' گوگول نے مصوری کا کمال دکھایا ہے اور دستہ ئف سکی نے مشاہدۂ نفس کا ' گوگول کا ہیرو روسی قوم کا ایک فرد ہے ' دستہ ئف سکی کا ہیرو جے دوش کن ' جس کے دل پر خودی کا اتنا احساس بھی باقی نہیں رہا ہے کہ وہ اپنی سنگدل معشوقہ کی اجازت کے بغیر ہنسے یا خوش ہوسکے ' خود دستہ ئف سکی کی ایک خاص ذہنی کیفیت کا مجسمہ ہے - نقاد بے لی سکی نے " غریب آدمی " کو پڑھ کر ٹھیک کہا تھا ' جے دوش کن کی ہستی کوئی نادر شے نہیں ہے ' بلکہ روسی زندگی کا ایک عام اور عبرت انگیز مظہر ہے - " بیکس اور مظلوم " میں بھی دستہ ئف سکی نے بڑی حد تک آپ بیتی سنائی ہے ' اس کا ہیرو دانیا ایک ناول نویس ہے ' اور اس کی سیرت دستہ ئف سکی سے بہت

مشابہ ہے۔ ناول کا قصہ بہت دردناک ہے۔ ایک بڑے رئیس زمیندار وال خوت سکی نے، جو عیاش اور بدمعاش ہے اور جسے معصوم لڑکیوں کو دھوکا دے کر بے حرمت کرنے میں خاص لطف آتا ہے، اپنی جائداد کے مستعد اور ایماندار منتظم ایخ مے نف کو جھوٹے الزام لگا کر نکال دیا ہے اور اس پر کئی ہزار روبل غبن کرنے کا دعویٰ دائر کردیا ہے۔ بیچارہ ایخ مے نف مقدمے کی پیروی کے لیے پیٹر برگ آتا ہے، اور یہاں اس پر ایک اور مصیبت نازل ہوتی ہے۔ اُس کی لاڈلی بیٹی نتاشا گھر چھوڑ کر وال خوت سکی کے لڑکے ال یوشا کے ساتھ بغیر نکاح کئے بیوی کی طرح رہنے لگتی ہے۔ ناول نویس دانیا جس نے ایخ مے نف کے گھر میں پرورش پائی تھی اور جو خود نتاشا سے بہت محبت کرتا تھا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ نتاشا کے جذبۂ محبت کا احترام کرے اور اسے اس حرکت کے برے نتائج سے جہاں تک ہوسکے بچائے۔ نتاشا کے افسانے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ال یوشا اپنے باپ کے کہنے سے ایک مالدار لڑکی سے شادی کرلیتا ہے اور دانیا بڑی مشکل سے نتاشا کے ماں باپ کو اسے اپنے گھر واپس بلالینے پر آمادہ کرلیتا ہے۔ نتاشا اس معاملے میں پھر بھی خوش قسمت رہی "بیکس اور مظلوم" میں ایک اور لڑکی نے لی کا قصہ بھی ہے، جس کی عزت اور زندگی وال خوت سکی کے ہاتھوں تباہ ہوئی۔ اُس کے باپ نے مرتے دم تک اسے معاف نہیں کیا اور لڑکی بھی دل میں شکایت لیے ہوئے دنیا سے گئی —

"بیکس اور مظلوم" کی داستان میں دستہ ئف سکی نے ایک تو یہ دکھایا ہے کہ انسان فاعل مختار ہونے کا جو دعویٰ کرتا ہے، اُس کی دراصل کوئی حقیقت نہیں، اور دوسرے یہ کہ فلسفیوں نے جو

حکم لگایا ہے کہ ہر انسان اپنی بھلائی چاہتا ہے اکثر غلط ثابت ہوتا ہے، "بیکس اور مظلوم" ان بیچاری ہستیوں کے درد دل کی کہانی ہے جو اپنے پاک جذبات کو دنیاوی اغراض اور "بھلائی" کی خواہش پر نثار نہیں کرسکتی ہیں، اور محض اس وجہ سے کہ ان کے دل پاک ہیں اور اُن کے جذبات قوی، اُنہیں دنیا میں ہر طرح کی رسوائی اور ذلت اُٹھانا پڑتی ہے۔ یہی مجبوری کسی قدر ظریفانہ انداز سے "سدا سہاگی" میں دکھائی گئی ہے۔ تروسوت سکی، ایک خوش حال آدمی، فطرتاً شادی کرنے پر مجبور ہے، اس کی بیویاں اسے ہمیشہ دھوکا دیتی ہیں اور بیوفائی کرتی ہیں اور اسے یہ معلوم بھی ہے، لیکن پھر بھی وہ شادیاں کرتا رہتا ہے اور ایسی ہی عورتوں سے جن کی تلون مزاجی اور عیش پسندی انہیں وفادار نہیں رہنے دیتی*۔ علم نفسیات کے رو سے ایک خواب جو اس ناول میں بیان کیا گیا ہے، بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ ول چانی نوت، جس کا تروسوت سکی کی بیوی سے یارانہ تھا، تروسوت سکی کے ساتھ ایک کمرہ میں سو رہا تھا۔ اس نے خواب دیکھا کہ ایک شخص خنجر لیے ہوئے اس کے پلنگ کی طرف آہستہ آہستہ آرہا ہے۔ جب وہ پاس پہنچ گیا تو اُس نے ول چانی نوت کے گلے پر خنجر مارا،

---

* دستہ ئف سکی کی لڑکی لووبوف دستہ ئف سکیہ کا بیان ہے کہ اس ناول میں دستہ ئف سکی نے آپ بیتی سنائی ہے، اور اس کی پہلی بیوی جس سے اس کی سائی بیریا میں شادی ہوئی تھی، تروسوت سکی کی بیویوں کی طرح عیاش اور بیوفا تھی۔ لیکن لیوبوف دستہ ئف سکیہ نے اپنے باپ کی سوانح عمری میں اس قدر الٹی سیدھی باتیں لکھی ہیں کہ اس کے قول پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا ــــ

اور ول چانی نوت نے وار سے بچنے کے لیے اپنا ہاتھ سامنے کردیا ۔ اس وقت اس کی آنکھ کھل گئی ۔ اس نے دیکھا کہ اس کی انگلیوں سے خون بہ رہا ہے اور تروسوت سکی اس کے پاس کھڑا ہے ۔ اگر ول چانی نوت نے خواب نہ دیکھا ہوتا تو تروسوت سکی کا خنجر اُس کے گلے پر پھر جاتا —

"سدا سہاگی" دستہ ئف سکی نے سنہ ۱۸۷۰ میں لکھی ' اور یہ اس کے پہلے طرز کی آخری تصنیف ہے ۔ سنہ ۱۸۶۲ میں "مُردوں کے گھر" کی تصنیف کے ساتھ اس کی ناولوں کا وہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جس کا موضوع انسان کی شخصیت اور اُس وجود کے گہرے اور پیچیدہ مسائل ہیں ۔ وہ روحانی یا جذباتی مجبوری جو نتاشا جیسی شریف اور شائستہ لڑکی کو بداخلاق عورتوں کے زمرے میں شامل کردیتی ہے ان ناولوں میں بہت زیادہ شوخ رنگوں میں نظر آتی ہے ' اپنی بھلائی کی طرف سے بے پروائی اور دنیاوی اغراض کی تحقیر جو نتاشا اور نے لی کی ماں محسوس کرتی ہیں ایک شیطانی ضد اور تکبر میں منتقل ہوجاتی ہیں جو خیروشر کے معیار کو پلٹ دیتا ہے ۔ لیکن ہم ان مسائل کو اُسی وقت سمجھہ سکتے ہیں جب ہم دستہ ئف سکی کے فلسفے کی تدریجی نشوونما پر غور کرلیں —

دستہ ئف سکی کے خیالات کی محرک دراصل ان لوگوں کی شخصیتیں تھیں جن سے اس نے سائبیریا کا قیدخانہ یا "مردوں کا گھر" آباد پایا ۔ اس ناول کا ہیرو قید خانے سے رخصت ہوتے ہوئے کہتا ہے : "کتنوں کی زندگی ' کتنوں کی طاقت ان دیواروں میں دفن رہی اور بے کاری میں ضائع ہوئی ! ۔ اس جوانی اور اس قوت کو دنیا آخر کسی نہ کسی مصرف میں تو لا ہی سکتی تھی ۔ میں اس معاملے میں

اپنے خیالات ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتا : یہ بدقسمت لوگ غالباً ہماری قوم کے سب سے زیادہ مضبوط ارادہ رکھنے والے آدمی اور کسی نہ کسی لحاظ سے اس کے سب سے زیادہ ہونہار افراد تھے۔ ان کی ساری جسمانی اور روحانی طاقت ضائع ہورہی ہے - یہ آخر کس کی خطا ہے ؟ "۔ فقط یہ کہہ دینا کہ یہ لوگ مجرم ہیں اور اپنے جرم کی سزا بھگت رہے ہیں صرف ناکافی نہیں بلکہ غلط ہے ' یہ غلط نہ ہوتا تو اس مسئلے میں کوئی دشواری یا پیچیدگی نہ ہوتی ۔ دستہ ئف سکی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ ایسے مجرم جنھوں نے ضعیف بڈھوں اور معصوم بچوں کا انتہائی بے دردی سے خون بہایا تھا ' اپنی حرکتوں پر بالکل نادم نہیں ہوے ' بلکہ اکثر یہ محسوس ہی نہیں کرتے کہ انھوں نے کسی قسم کی غلطی کی ہے ' اور کبھی کبھی تو ان کا ضمیر انھیں یقین دلاتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ ٹھیک کیا - جب ان لوگوں کو اپنی معصومیت کا اتنا یقین ہے اور ان کی سزا ایسی بے تاثیر تو ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ مجرم ہیں یا قید خانے میں اپنے جرم کی سزا پا رہے ہیں۔ اور اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ یہ لوگ بالکل بے خطا ہیں یا اگر بے خطا نہیں تو انھیں سزا دینا ہمارے امکان سے باہر ہے ' تو پھر مظلوم معصوموں کی فریاد کو بیجا قرار دینا ہوگا ' یا اِس کا اقرار کرنا ہوگا کہ انسانی فطرت کسی قانون کی پابند نہیں کی جاسکتی ' قانون بنانا محض حماقت ہے اور کسی مذہبی یا اخلاقی معیار کا سہارا ڈھونڈھنا انسان کی ایک مضحک کمزوری —

دستہ ئف سکی کو علم اور عقل پر زیادہ اعتبار نہیں تھا۔ جرم و سزا کی منطق کے اس چکر نے اسے اور بھی یقین دلا دیا کہ زندگی کے گہرے

مسائل کا فیصلہ کرنا عقل کے امکان سے باہر ہے ۔ اگر ہم جرم کی حقیقت معلوم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں مجرم کی شخصیت ' اس کے جذبات سے ' اور اس کے شعور کے ان پوشیدہ محرکوں سے واقف ہونا چاہئے جو ان جذبات کو پیدا کرتے ہیں ۔ " پاتال کے مراسلات " میں جو اس نے ۱۸۶۴ میں شائع کی ' اس نے پہلی بار انسانی شعور پر بحث کی ' اور اس سوال کا ایک حد تک جواب دیا جو " مردوں کے گھر " میں رہنے سے اس کے دل میں پیدا ہوا تھا ۔ " مراسلات " کے دو حصے ہیں ' پہلے میں اس کا فرضی مصنف اپنا فلسفۂ حیات بیان کرتا ہے ؛ دوسرے میں اپنی زندگی کے چند واقعات جو اس کے فلسفے کو اور واضح کر دیتے ہیں —

" پاتال کے مراسلات " کا مصنف پوچھتا ہے : " وہ کون تھا جس نے پہلی بار یہ کہا ' پہلی بار اس بات کا اعلان کیا ' کہ انسان محض اس وجہ سے ذلیل اور مضر حرکتیں کرتا ہے کہ اُسے اپنی بھلائی کی تمیز نہیں ؛ اور اگر اس کا دماغ روشن کردیا جائے ' اس کی آنکھیں کھول دی جائیں ' کہ وہ اپنے حقیقی مقاصد ' اپنے سچے مفاد سے واقف ہو جائے تو وہ فوراً ذلیل اور مضر حرکتیں کرنا چھوڑ دے گا ' فوراً اچھا اور شریف بن جائےگا ... اس لیے کہ اچھائی میں اسے اپنا فائدہ نظر آئے گا ... یا یوں کہیے کہ اچھائی کرنا اس کے لیے ناگزیر ہوجائےگا ! ... مگر ان ہزارہا مثالوں کا کیا کیا جائے جو اس کی شہادت دیتی ہیں کہ انسان جان بوجھ کر ' یعنی اپنے مفاد کو پوری طرح سمجھتے ہوئے بھی اس سے قطع نظر کرکے ایک دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے ... ایک کٹھن نامعقول راستہ جس پر اسے اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر چلنا پڑتا ہے ۔ اس سے یہ

نتیجہ نکلتا ہے کہ اسے یہ خود سری اور خود رائی اپنے مفاد سے زیادہ پسند ہے ... مفاد! مفاد ہوتا کیا ہے؟ کیا اسے آپ ٹھیک سمجھانے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں کہ انسان کا مفاد کس بات میں ہے اور کس میں نہیں؟ ... کیا مفاد کی جو صورتیں تصور کی گئی ہیں وہ بالکل قابل اعتبار ہیں ؟ ... انسان ہمیشہ اور ہر جگہ ' خواہ وہ کوئی بھی ہو ' وہی کرنے سے خوش ہوتا رہا ہے ' جو اس کی طبیعت چاہتی ہے ' اس بات سے ہرگز نہیں جو اس کی عقل اس سے کہتی ہے یا جس میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے ؛ انسان کی ایسی خواہشیں بھی ہو سکتی ہیں جو اس کے مفاد کے خلاف ہوں بلکہ کبھی کبھی اپنا فائدہ نہ چاہنا اس کے لیے قطعاً ضروری ہو جاتا ہے ... انسان کو حاجت ہے ۔ آزاد اور خود مختار خواہشوں کی ' اس آزادی اور خود مختاری کی خواہ اسے کچھ بھی نثار کرنا ہو ' اس کا انجام چاہے کچھ ہی ہو ... عقل ' حضرات ' ایک اچھی چیز ہے ' اس میں کوئی کلام نہیں ' لیکن عقل محض عقل ہے ' اور وہ صرف انسان کی ذہنی قوت کو کام میں لاتی ہے ' لیکن خواہشوں میں انسان کی پوری شخصیت ' کا اظہار ہوتا ہے ' جس میں عقل مع اپنی تمام سرگردانیوں کے شامل ہے ... "

غرضکیہ انسان کا سب سے قوی جذبہ خودی کا اثبات اور کائنات میں اپنی اہمیت جتانے کی خواہش ہے ۔ یہ خواہش اس کے خیر و شر کے معیار کو تہ و بالا کر دیتی ہے ' اس کی عاقبت اندیشی ' اس کی عقل کا ملمہ چڑھاتی ہے ۔ " پاتال کے مراسلات " کا مصنف بھی دراصل اسی خواہش کا شکار بنا ہے ؛ زندگی کی نعمتوں سے محروم رہتے رہتے

اس کا مذاق اس قدر بگڑ گیا ہے کہ اسے اپنی ذلت اور رسوائی میں مزہ آنے لگا ہے ۔ وہ " مراسلات " کے دوسرے حصے میں یہ قصہ سناتا ہے کہ اس نے ایک مرتبہ چکلے میں جاکر ایک لڑکی کو سمجھایا کہ اسے اپنا پیشہ چھوڑ دینا چاہئیے ' اور جب وہ کچھہ روز بعد اس کے پاس آئی اور اپنا پیشہ ترک کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے لڑکی کو بے عزت کرکے چھوڑ دیا ۔ یہ کمینی حرکت کچھہ کلمی فلسفے کا نتیجہ نہیں تھی ' بلکہ اس جذباتی قوت کا اظہار جسے اپنے اثبات کی اور کوئی صورت نصیب نہیں ہوئی تھی ۔ " مراسلات " کے مصنف کو اپنی حرکت پر بہت سخت صدمہ ہوتا ہے ' لیکن اپنے نزدیک اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا ۔ دنیا بھر میں وہ ذلیل سمجھا جاتا تھا ' ایک بار اسے بھی اپنی شخصیت جتانے کا موقع ملا اور اس نے ایک ہستی کو اپنے سے بڑی زیادہ ذلیل کرکے اس موقع سے فائدہ اتھایا ۔ اگر اس کی حرکت سے ایک بیچاری لڑکی کے دل پر چوٹ لگی تو افسوس کی بات ہے مگر وہ بھی تو ایسے موقع کا انتظار کرتے کرتے عاجز آگیا تھا —

اسی طرح دستہ ئف سکی نے " مردوں کے گھر " میں ایک مجرم کا قصہ بیان کیا ہے جس نے اپنی نیکی ' فرماں برداری اور حلم کی بنا پر قید خانے میں شہرت حاصل کرلی تھی ' اور قید خانے کے حاکموں نے اسے قیدیوں کی ایک جماعت کا سردار بنا دیا تھا ۔ ایک دن اس پر یکایک جنون سا سوار ہو گیا ' اور اس نے ایسی حرکتیں کیں کہ اسے مجبوراً دیوانوں کی طرح زنجیروں سے جکڑ دینا پڑا ۔ دستہ ئف سکی اِس واقعے کی بس یہی تشریح کرسکا کہ اس مجرم نے برسوں اپنے جذبات کو دبایا تھا اور انھوں نے آخر کار اِس خطرناک طریقے پر

اپنا زور دکھایا - اس مجرم نے لوگوں کے سر پھوڑے' "پاقاں کے مراسلات" کے مصنف نے ایک غریب لڑکی کا دل دکھایا ' دونوں حرکتیں ایک سی ہیں ' ان کا محرک ایک ہی ہے . " مراسلات " کے مصنف نے تو کہدیا ہے کہ میں اس کا قائل نہیں کہ انسان اپنی بھلائی چاہتا ہے اور جو کوئی بھی اپنی شخصیت محسوس کرتا ہے اس کا قائل نہیں ہوسکتا - " مراسلات" کا مصنف کمزور کھسیانا آدمی تھا ' لیکن وہ " قوی شخصیتیں جو بیمار ہوکر مجرم بن جاتی ہیں " دراصل سب اسی کی طرح اپنی شخصیت ظاہر کرنے کی فکر میں مبتلا ہوتی ہیں - دستدیفسکی کو رفتہ رفتہ یقین ہوگیا کہ جرم کا مظہر جو مسائل ہمارے سامنے پیش کرتا ہے وہ دراصل نفسیات کے معمے نہیں ہیں - ان کا تعلق ایمان اور کفر ' تسلیم اور بغاوت سے ہے - خود دستہ ئفسکی دین عیسوی کا پیرو تھا ' وہ حضرت عیسیٰ کی شخصیت اور خیر و شر کے اِس معیار کو جو اُنھوں نے قایم کیا تھا معیار مطلق سمجھتا تھا - لیکن اس کے دل میں شکوک تھے ' ایسے شکوک جنھیں عقل اور دلیلیں دور نہیں کرسکتیں ' اور جب تک یہ موجود تھے اُسے کسی قسم کے روحانی سکون کی اُمید نہیں ہوسکتی تھی - وہ تمام روحانی کشمکش اور نزاع ؛ انسانی شخصیت کو نامعلوم راستوں سے درجۂ کمال تک پہنچانے کی وہ تمام کوششیں جن پر دستہ ئفسکی نے اپنے ناولوں میں بحث کی ہے دراصل عکس ہیں اُس کے اپنے شکوک کا - اور نتیجے میں اِس دنیا اور اُس کے مسلمہ اخلاق اور فلسفۂ حیات کو تہ و بالا کرکے ایک نئی دنیا اور نیا اخلاقی نظام قائم کرنے کی آرزؤں کا جو اس کے دل میں امنڈتی تھیں - سرگی کے دورے سے پہلے کائنات جس شان سے دستہ ئفسکی کو نظر آتی تھی

اس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ یہ اس کی بصیرت اور ادراک اور روشن ضمیری کی انتہا تھی، ایک دیدار جس کے لیے اس کی روح للچایا کرتی تھی؛ ایک کیفیت جس نے اس کی نگاہوں میں انسان کے مستقبل کو عجیب دلکش صورت دیدی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دستہ ئفسکی کو انتہائی پستی کا بھی تجربہ ہوا کرتا تھا، اس پر دیوانگی کے لمحے گذرتے تھے جب شیطانی خواہشیں اس کا دل ہلا دیتی تھیں اور وہ اپنی وحشت سے پناہ مانگتا تھا۔ وہ مظہر جو نفسیات کی اصطلاح میں "دہری شخصیت" کہلاتا ہے اور جسے دستہ ئفسکی نے دریافت کیا تھا، در اصل اُن متضاد کیفیتوں اور امنگوں کا مجسمہ ہے جو دستہ ئفسکی اپنی طبیعت میں محسوس کرتا تھا۔ بہرحال اس کے لیے کائنات اور انسانی سیرت کے اسرار معلوم کرنے کا یہی طریقہ ممکن تھا کہ وہ اپنے آپ کو جرم اور شک کا مجسمہ بنالے، جرم اور شک اور انکار میں تشکیل زندگی کی جو قوت ہو اُسے آزمائے، اور اس دنیا کو بگاڑ کر اگرکوئی بہتر دنیا بن سکتی ہو تو بنائے۔ چنانچہ "جرم اور سزا" اور "بھوت پریت" میں دستہ ئفسکی نے جرم اور انکار اور بغاوت کے فلسفۂ حیات پر غور کیا ہے، اور اپنے زمانے کے چند واقعات کو پلاٹ کے طور پر رکھ کر مجرم، منکر اور باغی لوگوں کی نفسی کیفیات اور ان کی جد و جہد کا انجام دکھایا ہے۔ انسانی شخصیت کے اظہار کا ایک رنگ یہ ہے، دوسرے پر "مجذوب" اور "برادران کرمازف" میں بحث کی جاتی ہے، اور ہمیں ان چار ناولوں پر اسی ترتیب سے نظر ڈالنا چاہئے —

۱۸۶۱ کے بعد منکریت (Nihilism) کی تحریک نے بہت زور پکڑا*

---

* اس پر ایک آئندہ باب میں بحث ہوگی۔

اور " سنکروں " نے عوام میں بیداری پیدا کرنے کے ساتھہ ھی روس کو اندرونی دشمنوں سے پاک کرنے کا سلسلہ بھی شروع کیا - معمولاً ریاست کے بڑے عہدہ داروں پر حملے کیے جاتے تھے ' لیکن ۱۸۶۵ میں ایک طالب علم نے کسی بوڑھی عورت کو جو سود پر قرضہ دیا کرتی تھی مار ڈالا اور عدالت میں بیان کیا کہ میں نے بڑھیا کو مار کر کوئی جرم نہیں کیا بلکہ ہزاروں غریب آدمیوں کو ایک بلا سے نجات دلائی ھے اور ایسے لوگوں کو مار ڈالنا جو اپنے ھم جنسوں کو تکلیف پہنچائیں قوم اور انسانیت کی ایک قابل قدر خدمت ھے - دستدئفسکی پر اس واقعے کا ' اور اس جرم کی منطق کا بہت اثر ھوا ' " جرم اور سزا " میں اصل بحث اسی پر ھے کہ جرم خیر کا ذریعہ ھو سکتا ھے یا نہیں ' اور اگر کوئی شخص انسانی مفاد کے ارادے سے خون بہائے تو وہ انسانیت کو ' اور اپنی ذات کو فروغ دے سکتا ھے یا نہیں —

" جرم و سزا " کا ھیرو راس کول نی کوف ایک ھونہار مگر بہت غریب طالب علم ھے جو یہ عقیدہ رکھتا ھے کہ کسی بلند نصب العین یا اعلی فلسفۂ حیات پر جانیں نثار کرنا کوئی جرم نہیں اور تاریخ میں اس کے ہزارھا ثبوت ملتے ھیں کہ جن شخصیتوں نے زندگی کو ایک بہتر شکل دی ھے کبھی خون بہانے سے نہیں ڈری ھیں - اپنی ذات کے لیے وہ اِس عام اصول سے یہ خاص نتیجہ نکالتا ھے کہ اُسے ایک بڑھیا کو جس کے پاس اُس نے کچھہ چیزیں گرو رکھائی تھیں اور جو بہت مالدار تھی ' مار کر نقد روپے پر قبضہ کرلینا چاھئیے ' اور یہ دولت حاصل کرکے ایک نئی زندگی شروع کرنا چاھئیے جس میں اسے اپنے حوصلے پورے کرنے کا بہتر موقع ملے - کچھہ کشمکش کے بعد وہ ایک دن جا کر کلھاڑی

سے اِس بڑھیا کا سر پھوڑ دیتا ہے اور اسی کے ساتھ اس کی چھوٹی بہن کا جو اتفاق سے کمرے میں آجاتی ہے۔ ان دونوں کو مار کر اور نوٹوں کی ایک تھیلی چرا کر وہ گھر بھاگ جاتا ہے۔ اس نے جرم نہایت بھونڈے طریقہ سے کیا تھا، اور یہ اُس کی خوش قسمتی تھی کہ کسی نے اسے دیکھا نہیں۔ لیکن وہ اپنے اصل ارادے کو عمل میں نہیں لا سکا، اُسے بہت جلد معلوم ہوگیا کہ جرم کرنا آسان ہے، مگر اسے ایک نئی زندگی کی بنیاد بنانا بہت مشکل ہے، اور جن تاریخی شخصیتوں نے خون بہاکر اپنی زندگی کو فروغ دیا ان کی سرشت ہی کچھ اور تھی۔ راس کول نی کوت کے جرم نے اُس کے حوصلوں کا خون چوس لیا، اس کے ارادے کی قوت چھین لی، منزل مقصود کو اس کی نظر سے چھپا دیا۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی۔ راس کول نی کوت دل سے اخلاقی خیر و شر کے معیار کا قائل نہیں تھا، جب تک اس کا جرم محض ایک ارادہ تھا اُسے یہ خیال رہا کہ میں ایک اصول کے ماتحت عمل کر رہا ہوں، میری کوششوں کا ایک مقصد ہے۔ بڑھیا کو قتل کرتے ہی اس کا مقصد پورا ہوگیا، اور وہ نئی زندگی جو دور سے اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد شروع ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی قریب پہنچنے پر سراب کی طرح فضائے نامحدود میں غرق ہوگئی —

قتل کے بعد راس کول نی کوت کے روحانی ڈراما کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ وہ اپنی منطق کا اس قدر قائل تھا کہ اس کے دل میں کسی قسم کی پشیمانی یا قصور کا احساس نہیں پیدا ہوا، لیکن اس کی وجہ سے اُس کی روحانی تکالیف اور بھی بڑھ گئیں، کیونکہ اگر وہ اپنے آپ کو مجرم نہیں مانتا تھا تو اس کے معنی یہ تھے کہ اخلاقی قانون اور خیر

و ھر کا وہ معیار جس کی خاطر اس نے بڑھیا کو قتل کیا تھا ' اور جسے وہ اپنی نئی زندگی کا سنگ بنیاد بنانا چاہتا تھا' دراصل کچھ بھی نہیں ؛ محض ایک خیال خام ہے ۔ اِس احساس نے اس کے نفس میں ایک روحانی اور اخلاقی خلا پیدا کردیا جسے برداشت کرنے کی اِس کول نکوف میں ہمت نہ تھی ' اور جسے دراصل کوئی بھی برداشت نہیں کرسکتا ۔ اِس خلا سے خوف کھاکر اس نے ان تاریخی ہستیوں میں شامل ہونے کا حوصلہ چھوڑ دیا جن کی پیروی میں اُس نے بڑھیا کو قتل کیا تھا ' اور اس کی آرزو کرنے لگا کہ کسی طرح سے عوام کی ذہنیت اختیار کرلے ' اور اپنے دل میں اِس معیار کو پھر قایم اور استوار کردے جس پر عوام کا فلسفۂ حیات مبنی ہوتا ہے ۔ اس نے سونیا سے اپنے جرم کا اقبال کیا ۔ سونیا ایک غریب ؛ مسکین اور پاک دل لڑکی تھی جس نے اپنی سوتیلی ماں اور بھائی بہنوں کو فاقے سے بچانے کے لیے مجبوراً ایک ذلیل پیشہ اختیار کیا تھا اور وہ نہ صرف ایثار کا ایک پر درد مجسمہ تھی بلکہ اُس عقیدت کا ایک اعلیٰ نمونہ جو انسان میں روحانی تکلیفیں برداشت کرنے کی حیرت انگیز قوت پیدا کردیتی ہے ۔ سونیا کے کہنے سے اِسکول نی کوف نے اپنے جرم کا اقبال کرلیا ' اور اُس کی سزا بھگتنے کے لیے بھی آمادہ ہوگیا ' لیکن پھر بھی وہ اپنے دل میں خطا کا احساس نہیں پیدا کرسکا ' اپنی منطق کی خامی کا قایل نہیں ہوا ' اور اپنی ناکامی کا الزام اپنی پست ہمتی اور اِس بڑھیا پر لگاتا رہا جسے اس نے قتل کیا تھا ۔ اس کی ذہنیت میں انقلاب اُس وقت ہوا جب وہ سائبیریا میں ڈیڑھ سال رہ چکا تھا ۔ اُس نے ایک خواب دیکھا کہ ایشیا کی طرف سے ایک نئے قسم کا طاعون آیا ہے جو ہزاروں بستیوں کو ویران کر رہا ہے '

اِس بیماری کے جراثیم بھی نئی قسم کے ہیں ' ان میں عقل اور ارادے کی قوت ہے اور جس کسی کے جسم میں وہ اپنا گھر کر لیتے ہیں وہ فوراً پاگل ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو سب سے عقلمند ' روشن ضمیر اور بلند حوصلہ سمجھنے لگتا ہے ۔ اس خبط میں مبتلا ہونے سے لوگوں میں ایک دوسرے کی بات سمجھنے ' ایک دوسرے کا احترام کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی ' وہ آپس میں لڑنا شروع کردیتے ہیں ' جانیں ضائع ہونے لگتی ہیں ؛ زندگی تہ و بالا ہو جاتی ہے اور چند برگزیدہ ہستیوں کے سوا دنیا میں کوئی باقی نہیں رہتا ۔ اِس خواب نے راس کول نی کوت کو اِس اصول کے آخری اور لازمی نتیجے سے آگاہ کردیا جس پر عمل کرنے کا اسے حوصلہ تھا ۔ اسے یقین ہوگیا کہ اگر ہر شخص اثبات خودی کو زندگی کا مقصد بنائے ' ایک برگزیدہ شخصیت بن بیٹھے اور ہر قسم کا جرم اپنے لیے روا رکھے تو انسانی زندگی ناممکن ہے ۔ اثبات خودی کا اصول غلط ہے ' اس پر زندگی تعمیر نہیں ہو سکتی ' بلکہ جو کچھ انسان نے اپنی محنت اور تکلیفوں سے تعمیر کیا ہے وہ بھی نیست و نابود ہو جائے گا ۔ اس خواب کے بعد راس کول نی کوت کا دل انسانی ہمدردی اور محبت سے لبریز ہو جاتا ہے ' اِس میں نہ غرور رہتا ہے نہ خود رائی ' اور سونیا اور وہ ایک نئی زندگی کے خوابوں سے اپنی مصیبت کے دن روشن کرتے ہیں —

اِس کول نی کوت کے اصول کی غلطی " جرم و سزا " کا ایک پہلو ہے ۔ اس کا دوسرا پہلو شعور اور جذبات کی وہ کیفیتیں ہیں جو ہر دلیل سے زیادہ اِس کول نی کوت کی گمراہی دیاں کرتی ہیں ۔ ناول کے شروع ہی میں ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ گو اِس کول نی کوت نے جرم کا پختہ ارادہ کرلیا ہے اور ہر وقت اپنے آپ

کو یہ یاد دلا کر کہ ایک مہم اُس کے درپیش ہے اپنے دل کو مضبوط کرتا رہتا ہے' نہ تو اُس کی ذہنیت ایک مجرم کی سی ہے نہ سرشت - بڑھیا کو قتل کرنے سے پہلے وہ ایک خواب دیکھتا ہے کہ بہت سے کسان نشے میں ایک دبلی کمزور گھوڑی کو بے دردی سے پیٹ رہے ہیں' اور بیچاری کو پیٹتے پیٹتے مار ڈالتے ہیں- اس خواب کے بعد وہ اپنا ارادہ ترک کر دیتا ہے' اور ارادہ ترک کرتے ہی اس کے دل پر سے ایک بوجھ اُتر جاتا ہے' اُس کی طبیعت صاف ہوجاتی ہے اور زندگی اس کی نظروں میں ایک دل فریب شکل اختیار کرلیتی ہے- لیکن سڑک پر جاتے ہوئے وہ کہیں سن لیتا ہے کہ بڑھیا چھ بجے شام کو گھر پر ہوگی' اور اس پر پھر قتل کے ذریعے سے اپنی شخصیت کو فروغ دینے کی آرزو اپنا جادو کردیتی ہے- وہ بڑھیا کو قتل کرتا ہے' مگر اس جرم کا اس پر جو اثر ہوا اور اس کے علاوہ سونیا اور اُس کے شرابی باپ اور دیوانی سوتیلی ماں کے ساتھ جو سلوک وہ کرتا ہے' یہ سب اس کا ثبوت ہیں کہ وہ طبیعتاً نہایت شریف' بھولا اور محبت والا آدمی ہے اور اس کے دل میں انسانی ہمدردی کا بہت قوی جذبہ ہے- مجرم میں یہ اوصاف نہیں ہوتے' اور جس میں یہ اوصاف ہوں اسے مجرم نہ بننا چاہیے - لیکن اِس کول نی کوت نے جرم کے فلسفۂ حیات کا اپنی طبیعت پر بہت گہرا رنگ چڑھا لیا تھا' اسے اپنی طبیعت کا اصل رنگ یاد ہی نہیں رہا' اور اس طرح وہ بھلائی کرنے کے باوجود اس مسرت اور اس روحانی تقویت سے محروم رہا جو بھلائی کرنے سے انسان کی شخصیت کو ہوتی ہے —

"جرم و سزا" میں سونیا کی شخصیت انسانی شعور کی تاریک

اور طوفانی فضا میں کچھہ روشنی پیدا کرتی ہے اور منزل مقصود کی ایک جھلک دکھا دیتی ہے' "بھوت پریت" میں اتنی تسکین بھی نہیں ملتی۔ "جرم و سزا" کی طرح اس ناول کا اصل قصہ بھی بہت مختصر ہے۔ ستات روگن' کریل لوت' ورخوونسکی اور شاتوت سربرآوردہ رکن ہیں ایک جماعت کے جو روس میں اخلاقی اور معاشی انقلاب پیدا کرنا چاہتی ہے۔ انقلاب پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں' مگر یہ نوجوان' جن کے اصل رہبر ستات روگن اور اس کا پٹھو ورخوونسکی ہیں' اپنے آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اُنہیں عنقریب کامیابی ہونے والی ہے' اور جب ستات روگن اور ورخوونسکی آخر میں دیکھتے ہیں کہ ان کی جماعت مایوس ہوکر منتشر ہونے والی ہے تو وہ شاتوت پر جس کے خیالات میں کچھہ تبدیلی ہوئی ہے' غداری کا الزام لگا کر اُسے بڑی بے دردی سے مار ڈالتے ہیں۔ کریل لوت پہلے ہی خودکشی کرچکا ہے۔ اس جرم کے بعد ورخوونسکی غائب ہوجاتا ہے اور ستات روگن بھی خودکشی کرلیتا ہے۔ دستئفسکی نے اس داستان کا جو پس منظر رکھا ہے اور جو ضمنی قصے اس میں جابجا چھڑتے جاتے ہیں' وہ اس کو بظاہر بہت پیچیدہ بنا دیتے ہیں' اور یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ساری رام کہانی محض ہذیان ہے۔ لیکن جو لوگ انقلابی جماعتوں کے اندرونی کاروبار سے ذرا بھی واقفیت رکھتے ہیں یا جن پر وہ کیفیتیں گذر چکی ہیں جب جذبات میں ہیجان ہوتا ہے' دل میں امنگیں جوش کرتی ہیں' انسان ہر وقت اپنی شخصیت کا پورا زور دکھانے پر تلا رہتا ہے' مگر اسے اپنی طاقت اور قابلیت دکھانے کا کوئی موقع نہیں ملتا' اور اس کے حوصلے اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کر رہ جاتے ہیں؛ ایسے لوگ فوراً تسلیم کرلیں گے

کہ دستہ ئف سکی نے حقیقت نگاری میں کمال دکھلایا ہے ' اور یہاں بھی انسانی شعور کي کیفیات کے علم کا خزانہ لٹایا ہے —

" بھوت پریت " منکریت کے فلسفۂ حیات اور ضمناً یورپ کی مادیت کا بھانڈا پھوڑنے کے لیے لکھی گئی تھی - دستہ ئف سکی نے اس مسئلے پر دو پہلوؤں سے غور کیا ہے ' ایک ظاہری ' دوسرا باطنی - ایک وہ جس کا تعلق عام تہذیب اور تمدن سے ' دوسرا وہ جس کا تعلق انسانی شعور اور انساني شخصیت کي گہری ذاتی ضروریات سے ہے - ستات روگن کریل نوت ' ورخوونسکی ' شاتوت سب باغی ہیں ' جن میں ورخوونسکی نے معاشرتی نظام کے خلاف بغاوت کا جھنڈا کھڑا کیا ہے ' اور کریل نوت اور ستات روگن نے انسان کے اخلاقی اور مذہبی معیار اور کائنات کے کل نظم و نسق کے خلاف اعلان جنگ کیا ہے - ورخوونسکی جیسے لوگ ہر انقلابی جماعت میں نظر آتے ہیں ' وہ ایک کمینی مگر مضبوط طبیعت کا آدمی ہے ' ایک مجرم جسے صرف ایذا پہونچانے میں نہیں بلکہ لوگوں کو دھوکا دینے میں اور اوہام میں مبتلا کرنے میں لطف آتا ہے ' جو ایک نظام کو تہ و بالا کر کے دوسرا کسی اعلیٰ غرض سے نہیں قائم کرنا چاہتا ' بلکہ محض تباہی اور بربادی کا منظر دیکھنے کے لیے - کریل نوت اور ستات روگن سرکشی اور اثبات خودی کی مثالیں ہیں ' اور ان کی روحانی سرگذشت اس ناول کا دوسرا اور گہرا پہلو ہے —

کریل نوت اور ستات روگن دونوں باغی ہیں ' دونوں نہ خدا کی خدائی تسلیم کرتے ہیں نہ انسان کی انسانیت - کریل نوت ایک موقع پر کہتا ہے : " اگر خدا ہے تو ہر بات اس کے حکم سے ہوتی ہے اور میں

اس کے احکام کی تعمیل پر مجبور ہوں - لیکن اگر خدا نہیں ہے تو میں قادر مطلق ہوں اور اپنی قدرت دکھانے پر مجبور ہوں" اور چونکہ اُسے خدا کا وجود تسلیم کرنا منظور نہیں وہ اپنی قدرت دکھانے کے خبط میں مبتلا ہو جاتا ہے - انسان کے وجود کا مقصد اس کے خیال میں یہ ہے کہ وہ اپنی قدرت کا اظہار کرے اور اسے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ عام طور سے اپنے اس اہم فرض سے غافل ہیں ' جب کہ " ساری دنیا محض ایک فریب ہے ' اور اس کی بنیاد فریب اور انسانی ہستی کی تحقیر پر ہے ' جب کہ دنیا کے سارے آئین جھوٹے ہیں اور شیطانوں کا تماشا" - خود کشی سے قبل وہ اپنی حرکت کو جائز اور خود داری کا صریحی تقاضا ثابت کرتا ہے " مجھے تعجب ہوتا ہے سب لوگ کیسے بلا تامل جیتے رہتے ہیں - کیا اس دنیا میں ایک بھی ایسا مرد آدمی نہیں ہے جو خدا کے وجود کا خاتمہ کر کے اور اپنی شخصیت کی آزادی کا معتقد ہو کر اپنی ہستی کے سب سے نازک معاملے میں خود مختاری جتانے کی ہمت کر سکے ؟ یہ تو ویسی ہی بات ہے جیسے کسی فقیر کو ورثے میں اشرفیوں کی تھیلی ملے ' اور وہ یہ یقین نہ کر سکے کہ وہ اس کا مالک بننے کے قابل ہے - میں اپنی خود مختاری ثابت کرنا چاہتا ہوں ' میں اسے ثابت کروں گا ' چاہے مجھے ایک بھی پیرو یا شریک کار نہ ملے - مجھ پر لازم ہے کہ اپنے گولی مار لوں ' کیونکہ اپنے ہاتھوں فنا ہونا خود مختاری کی انتہا ہے " - ستاف روگن کی شخصیت دوسرے قسم کی ہے ' اس کی بغاوت کا انداز کچھ اور ہے - اسے کسی وجود یا قوت کا احساس نہیں جو کائنات پر حاوی اور اس کے نظام کی روح و رواں قرار دی جا سکے ' وہ باغی ہے ' مگر اِس وجہ سے نہیں

کہ وہ کسی عقیدے یا اصول کی بنا پر سر تسلیم خم کرنا غلط سمجھتا ہے ' بلکہ محض اس وجہ سے کہ بغاوت اور سرکشی اس کی سرشت میں ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ستاف روگن کو اپنے دل میں اور کل کائنات میں ایک خلا نظر آتا ہے ' زندہ ہونے اور کل ہستی کا ایک جزو ہونے کا وہ شعور جو انسان کو کائنات سے وابستہ رکھتا ہے اور اس کی زندگی کو ایک خود رو عمل بنا دیتا ہے ستاف روگن کے ذہن میں معدوم ہو جاتا ہے ' اور وہ ایک ڈوبتے ہوئے آدمی کی طرح ہر طرف سہارے کے لیے ہاتھ پیر مارتا ہے ۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے روحانی خلا کو کسی قوت کا میدان عمل بنائے ' اپنی بے مقصد زندگی کے لیے کوئی مقصد تلاش کرے اور یوں انسانی زندگی اور کائنات سے اپنا ٹوٹا ہوا رشتہ دوبارہ قائم کر لے ' لیکن اسے کامیابی نہیں ہوتی ۔ اس کی باغی فطرت اسے اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی کو اپنا سردار یا شریک کار بنائے ' اس کا ادراک ہر وقت اسے بتاتا رہتا ہے کہ وہ تمام مقاصد جن میں وہ یا اور لوگ مصروف ہیں محض ڈھکوسلے ہیں ۔ یوں وہ اپنی قوت کو تعمیر کے کام میں نہیں لا سکتا اور چونکہ سکون فطرتاً ناممکن ہے اس لیے یہ قوت تباہی اور بربادی کا ایک خطرناک ذریعہ بن جاتی ہے لیکن شاعر لیرمنتوف کے شیطان کی طرح ستاف روگن کو برائی کرنے میں اور دوسروں کو دکھ پہونچانے میں کوئی لطف نہیں آتا ' اسے معلوم ہے کہ میرے مقاصد بھی ویسے ہی لغو اور ہیچ ہیں جیسے اچھے مقاصد ' اور اسے کسی قسم کی تسلی دینے کی طاقت نہیں رکھتے ۔ ستاف روگن نے پہلے شہوت پرستی اختیار کی ' اور یہ چاہا کہ اپنی پوری شخصیت کو اس میں محو کر دے ۔ لیکن اس کی شہوت پرستی زبردستی کی تھی

اس میں ستاف روگن کو نہ کسی قسم کی لذت حاصل ہوی نہ شہوانی حرکتوں پر کوئی ندامت ہوئی' اور وہ خلا جسے وہ اس طرح سے پر کرنا چاہتا تھا ویسا کا ویسا ہی رہا - اس ناکامی کے بعد ستاف روگن ملکروں میں شامل ہوگیا کہ شاید دوسروں کی طرح اس پر بھی کوئی بھوت سوار ہو جائے' یا وہ کسی خبط میں مبتلا ہو جائے - ملکریت کی تعلیم سے اسے مطلق کوئی عقیدت نہیں تھی' لیکن اس نے انتہائی عقیدت ظاہر کی اور اس کی بھی کوشش کی کہ دوسروں کا عقیدہ پختہ ہو جائے - یہاں بھی وہ ناکام رہا' اور اس کے عقیدت مندوں کے جوش اعتقاد کا اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوا - پھر اسے اپنی شخصیت کی قوت جتانے کی سوجھی' اس نے ایک لنگڑی' بد قطع اور مجنوں عورت سے شادی کرکے اس کا ہر جگہ اعلان کیا' اپنے آپ کو انتہائی سکون قلب کے ساتھ بھری محفل میں رسوا کرایا' بغیر آنکھ جھپکائے ایک حریف کے پستول کا سامنا کیا - یہ دوا بھی بے اثر رہی - اس کے بعد ستاف روگن نے عشق کے سایہ میں پناہ لینا چاہی' مگر اس جذبے میں بھی وہ روحانی خلا' جس سے وہ بھاگنا چاہتا تھا اسے ستاتا رہا - اب اس سے گریز کرنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی کیونکہ موت کے ذریعے سے نجات پانے کا خیال بھی اسے ایک ڈھکوسلا نظر آیا - اس نے اپنے آخری خط میں لکھا " مجھے معلوم ہے کہ یہ بھی شرمندگی کا باعث ہوگی - خود فریبی کی ترکیبوں میں ایک اور مہمل ترکیب " - مگر آخر کار اس نے رہائی کی یہی تدبیر اختیار کی —

" جرم و سزا " اور " بھوت پریت " میں دستئوفسکی نے دکھادیا کہ اثبات خودی سے' شخصیت کامل نہیں بن سکتی' کیونکہ

اس خط میں وہ تمام ذریعے جو انسان کو کامل بنا سکتے ہیں معدوم ہو جاتے ہیں، اور انسان یا تو اس کول نکوت کی طرح اپنی تنہائی برداشت نہیں کر پاتا اور خیر و شر کے معیار کی عدم موجودگی سے بے بس ہو جاتا ہے، یا اس کی زندگی اور خیالات میں ویسا ہی بھیانک خلا پیدا ہو جاتا ہے جیسے ستاف روگن کی زندگی میں، اور وہ دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر بھٹکنے لگتا ہے۔ لیکن اثبات خودی کے علاوہ بغاوت کی اور وجوہ بھی ہو سکتی ہیں، ایسے انسان بھی خدا کی خدائی اور کائنات کے نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کر سکتے ہیں جن کی بغاوت میں اپنی کوئی غرض نہیں، جو اپنی شخصیت کا بیجا فروغ نہیں چاہتے، جو تکبر کے زعم میں دوسروں کو اپنے مقاصد پر نثار کرنا منطق سے صحیح نہیں ثابت کرتے۔ یہ باغی دو قسم کے ہیں، ایک تو وہ جو مظلوم ہیں، دوسرے وہ جنھیں اوروں کی بیکسی اور مظلومیت کا احساس ہے۔" مجذوب " میں نستاسیافلی پوفنا اور " برادران کرمازوف " میں ایوان ان دونوں کی مثالیں ہیں —

نستاسیافلی پوفنا کا باپ ایک نہایت شریف آدمی تھا جس کی ساری عمر ناگہانی مصیبتوں کا سامنا کرتے گذری۔ اس کی تقدیر کا آخری وار یہ تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر میں آگ لگ گئی، اس کی دو بچیاں تو بچ گئیں مگر اس کی بیوی مع کل گھر گرہستی کے جل گئی۔ اس صدمہ نے اسے ہلاک کر دیا، اور اس کی دونوں بچیاں لاوارث ہو گئیں۔ توتسکی قریب کے ایک خوشحال زمیندار نے رحم کھا کر بچیوں کی پرورش اپنے ذمہ لے لی، اور ان کی تعلیم کا انتظام کر کے انھیں اپنی کسی غریب رشتہ دار کے سپرد

کردیا - بڑی بہن تو چند سال بعد مرگئی - چھوٹی نستاسیا زندہ رہی ' اور جب اس کی عمر بارہ سال کی ہوئی تو توتس‌کی نے دیکھا کہ وہ حسن اور ذہانت میں یکتا ہے ' اور اس سن رسیدہ عیاش کے منہ میں پانی آگیا - اس نے نستاسیا کی تعلیم کا اور بہتر انتظام کردیا' اور جب وہ سولہ سال کی ہوگئی تو اپنے ایک دور افتادہ گانو میں ایک مکان بنوایا ' اسے خوب آراستہ کیا ' اور اس میں نستاسیا کو اپنی مدخولہ بنا کر رکھہ لیا - اس کے خیال میں نستاسیا بہت خوش اور مطمئن تھی ' نستاسیا کے دل کی کیفیت کا پتہ اس کو تب چلا جب چار سال بعد اسے ایک شریف لڑکی سے شادی کرنے کا حوصلہ ہوا اور وہ نستاسیا سے پیچھا چھڑانے کی تدبیریں سوچنے لگا - نستاسیا اس کے ارادہ کی خبر سن کر تن تنہا گانو سے نکل کر پیٹربرگ پہنچی ' اور پہلی ہی گفتگو میں توتس‌کی کو معلوم ہوگیا کہ اسے ایک سیدھی سادی لڑکی سے نہیں بلکہ ایک بیحد چالاک اور بے باک عورت سے سابقہ ہے جس کے دل پر اتنے زخم لگ چکے ہیں کہ اب اسے زخموں کا کوئی خوف نہیں ' جو دکھہ سہتے سہتے دیوانی ہوگئی ہے ' اور جسے اپنی زندگی کے بگڑنے کی مطلق پروا نہیں ہے - توتس‌کی کو اندیشہ تو ضرور تھا کہ اب نستاسیا پر قابو رکھنا اس کے بس کی بات نہیں ' لیکن پھر بھی وہ نستاسیا کو راضی رکھنے کی کوشش کرتا رہا - جس وقت " مجذوب " کا قصہ شروع ہوتا ہے ' نستاسیا پیٹربرگ میں پانچ سال رہ چکی تھی ' توتس‌کی نے اس کے لیے ایک شوہر تلاش کیا تھا اور وہ اور اس کا دوست جنرل اے پانچن نستاسیا کو اس سے شادی کرنے پر آمادہ کر رہے تھے اور

پچھتر ہزار روبل جہیز میں دینے کا لالچ دے رہے تھے۔ نستاسیا کو معلوم تھا کہ وہ شخص جس سے یہ اس کا نکاح کرانا چاہتے ہیں محض روپیہ کی لالچ میں شادی کر رہا ہے اور جہیز کا روپیہ ان دنیاداروں کے خیال میں بڑی سے بڑی قیمت ہے جو ایک عورت کی عزت اور آبرو کی ہوسکتی ہے۔ یہ آخری بے حرمتی' ایک ایسا صدمہ تھی جسے وہ برداشت نہ کرسکی' اور اس دنیا اور ان اخلاقی معیاروں کا منہ چڑانے کے لیے جو ایسا ظلم روا رکھتے تھے اس نے اپنی پچیسویں سالگرہ کے دن ایک محفل میں جس میں توتس کی اور اے پانچن دونوں موجود تھے اپنے آپ کو ایک لاکھ روبل کے بدلے روگوژن' ایک خبطی تاجر کے ہاتھ بیچ دیا' اور توتس کی اور اس کی دی ہوئی دولت اور آسائش کو خیر باد کہہ کر روگوژن اور اس کے شہدوں کے ساتھ چل دی —

اسی محفل میں نواب لف نکولایوچ میشکن "مجذوب" کا ہیرو' جسے کوئی دماغی مرض تھا' اور جو اُسی دن اچھا ہوکر سوئسٹان سے واپس ہوا تھا' بن بلائے پہنچ گیا تھا۔ محفل میں جانے سے پہلے اس نے اتفاق سے نستاسیا فلی پوفنا کی تصویر دیکھ لی تھی' اور اتفاق سے دونوں کی ملاقات بھی ہوگئی تھی۔ میشکن کو نستاسیا کی آنکھوں میں ایک باغیرت دل کے درد' پاک آرزوؤں کی تباہی کے غم' اور انسانی فطرت کے کمینہ پن کی شکایت ایسی موثر شکل میں نظر آئی کہ اس کا دل بیتاب ہوگیا' اور اس نے اپنا فرض سمجھا کہ نستاسیا کے پاس جاکر اپنے سر کو اُس کے قدموں پر رکھ دے' اور اس کے درد اور غم اور شکایتوں کو رفع کرنے کے لیے وہ جو کچھ کرسکتا تھا اور کرنا چاہتا تھا اُس

کا وعدہ ایک ناچیز تحفے کے طور پر پیش کرے ۔ اس نے اپنا ارادہ
پورا کیا، نستاسیا کو یقین دلایا کہ باوجود توتسکی کی مدخولہ رہنے،
اور آوارگی اور بداخلاقی کی بنا پر بدنام ہونے کے وہ دراصل معصوم
اور بے گناہ ہے، اسے وہ واقعات یاد دلائے جب اس نے ایسی شرافت
اور غیرت دکھائی تھی جس کا شائبہ بھی اس کے معترضوں میں نہیں
تھا۔ اس کے ساتھ ھی میشکن نے کہا کہ میں شوہر کی حیثیت سے تمام
عمر آپ کی خدمت، عزت اور دل جوئی کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن نستاسیا
اب "بغاوت" پر تل چکی تھی، میشکن کی باتوں کا اور اس کے وعدے
کا اس کے دل پر بہت اثر ہوا، مگر اس نے میشکن کی تجویز منظور
نہیں کی۔ وہ بہت کچھ برداشت کرچکی تھی، اب اس نے تہیہ کرلیا
تھا کہ ہر صورت میں اپنی آزادی محفوظ رکھوں گی، اور جس دنیا
نے مجھے بے بس پاکر رسوا کیا اس میں طوفان برپا کرکے اپنی طاقت
دکھاؤں گی۔ محفل میں اپنے آپ کو روگوژن کے ہاتھ بیچنے کے بعد وہ
اس ارادے پر قائم رہی ۔ کچھ دن روگوژن کے ساتھ عیاشی کرکے
وہ پیٹر برگ سے بھاگ کر ماسکو میں رو پوش ہوگئی، کیونکہ روگوژن
اس سے شادی کرنا چاہتا تھا؛ پھر جب روگوژن نے اس کا پیچھا کیا
تو نستاسیا نے میشکن کے پاس پناہ لی، اور میشکن نے اس سے نکاح
کرنا چاہا تو آخر وقت میں اسے چھوڑ کر روگوژن کے پاس پھر بھاگ
گئی ۔یہی واقعہ دو بار پیش آیا، اور آخری دفعہ جب وہ روگوژن
کے قبضے میں آئی تو اس نے اسے مار ڈالا "مجذوب" کا آخری سین یہ
ہے کہ روگوژن، میشکن کو، جو نستاسیا کی تلاش میں ہے، اس کمرے میں
لے جاتا ہے جہاں اس نے نستاسیا کے سینے میں چاقو بھونک دیا تھا،

اور میشکن کو اس کی لاش دکھاتا ہے، پھر دونوں بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں؛ اور آخر میں جب دوسرے دن لوگ دروازہ توڑ کر اندر گھستے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ روگوژن اور میشکن دونوں پاس بیٹھے ہیں، روگوژن کو سرسام ہوگیا ہے اور وہ رہ رہ کر چلا اٹھتا ہے، میشکن پھر اِسی دماغی بیماری میں مبتلا ہوگیا ہے جس سے وہ اچھا ہوکر روس آیا تھا، اور اب بالکل پاگل ہے؛ یہ منظر اس قدر پر درد، وحشت انگیز اور دل ہلا دینے والا ہے کہ کوئی صاحب دل اسے پڑھ کر اپنے ہوش و حواس برقرار رکھنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا—

نواب میشکن کا دوبارہ پاگل ہوجانا دلیل ہے اس کی ناکامی کی، اور اس کی ناکامی میں خود دستہ ئف سکی بھی شریک ہے، کیونکہ میشکن انسان کامل کا پہلا مجسمہ ہے، جو دستہ ئف سکی نے بنایا اور بنا کر آزمائش کے لیے دنیا کے میدان عمل میں کھڑا کیا۔ میشکن آئیں عیسوی کا سچا پیرو ہے، گو وہ مذہب پر گفتگو نہیں کرتا، اس کے دل میں محبت اور ہمدردی کے سوا کسی اور جذبے کی گنجائش نہیں۔ اس کا سلوک بھی ہر وقت ہر ایک کے ساتھ ویسا ہی ہے جیسے حضرت عیسیٰ کے ایک سچے پیرو کا ہونا چاہیے۔ پہلے پہل اس کی انتہائی سادگی اور سادہ لوحی دیکھ کر لوگ اُسے دیوانہ سمجھتے ہیں، لیکن اسے اپنی پاک دلی، بے نفسی اور بے ریائی ثابت کرنے میں دیر نہیں لگتی اور لوگ خود بخود اس کا احترام کرنے لگتے ہیں۔ اس کی مردم شناسی اور موقع شناسی، دنیاوی نعمتوں سے بے نیازی، لوگوں کی فطرت اور ان کی نیت کا وجدانی علم اسے راست گوئی اور راست بازی کے نقصانات سے محفوظ رکھتا ہے، اور اس کا ذہن اس قدر قوی اور روشن ہے کہ

کبھی کوئی اسے بیوقوف نہیں بنا سکتا ' گو اس کی طبیعت ایسی ہے جس پر دنیا داروں کا خوالا مخواہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے - میشکن نے وہ تمام مرحلے بغیر کسی خاص دشواری کے طے کر لیے جن سے آئین عیسوی کے سچے پیرو کو گذرنا پڑتا ہے ' اس نے لوگوں کو ایک دوسرے سے محبت کرنا ' خطاؤں سے در گذر کرنا ' سچ بولنا ' دوسروں کا بھلا چاہنا سکھایا - اُس نے اپنے اعمال سے یہ ثابت کر دیا کہ اس کی پیروی دنیاوی اغراض کے لیے بھی مضر یا مفقود نہیں ' جیسا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے - لیکن نستاسیا پر اس کی شخصیت کا مطلق اثر نہ ہوا ' اور یہ ناکامی اس کی تباہی کا سبب ہوئی ' کیونکہ نستاسیا کو خدا سے اور دنیا سے خوش نہ کر سکنا گویا یہ تسلیم کرنا تھا کہ دل کے بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں جن کی دوا مسیحا کے پاس بھی نہیں - میشکن کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انسان کو اپنے اوپر پورا اختیار ہوتا ہے ' اور اسے کوئی اس پر بھی مجبور نہیں کر سکتا کہ اپنی بھلائی چاہے - عموماً انسان اپنے آپ کو مجبور سمجھتا ہے ' اور اس مجبوری کا احساس اس قدر قوی ہوتا ہے کہ اُسے اپنے اختیار کی مطلق خبر ہی نہیں ہوتی - لیکن اگر کسی انسان کو ویسے ہی روحانی صدمے پہنچیں جیسے نستاسیا نے برداشت کیے اور وہ بیزار ہو کر اپنے کل اختیار کو عمل میں لائے تو اُسے کوئی قابو میں نہیں لا سکتا ' پھر نہ مسیحی ایثار اور محبت کام آتی ہے نہ دنیاداروں کی نصیحتیں اور عقل سلیم کی ہدایتیں ٭ —

---

* دستائفسکی کے خیالات کو سلسلے سے بیان کرنے میں ہمیں " مجذوب "

(بقیہ نوٹ بر صفحۂ آئندہ)

انسان کا اپنے اختیار کو استعمال کرنا کوئی ایسی نادر بات نہیں ہے۔ نستاسیا فلی پوفنا کی طرح ہر اخلاقی پابندی کا انکار کرنے والے بہت کم ہوے ہیں، اور اختیار کی بدولت اپنی ذات کو نقصان پہنچانے والے اور بھی کم۔ عموماً انسان رسم و رواج، اخلاقی معیار اور مذہبی احکام کی پابندی سے اُسی وقت انکار کرتا ہے جب ان پر عمل کرنا اسے اپنی ذات کے لیے مضر معلوم ہوتا ہے۔ اس صورت میں ہم اس کی سرکشی کو غلط اور صحیح، جائز اور ناجائز قرار دے سکتے ہیں، لیکن جب اسے وہی شکایتیں ہوں جو نستاسیا کو تھیں، اس کا دل ویسا ہی ہو، آرزوئیں وہی، تو پھر ہر شخص جس میں ہمدردی کی ذرا بھی صلاحیت ہے، اس پر الزام لگانا، یا اس کے رویّے کو ناجائز قرار دینا ظلم

پر ناول کی حیثیت سے غور کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن در اصل "مجذوب" میں فلسفہ بہت کم نمایاں ہے۔ زندگی اور انسانی فطرت کی مصوری کے اعتبار سے وہ دستہ ئفسکی کا بہترین ناول قرار دیا جا سکتا ہے۔ جنرل اے پانچن کی لڑکی اگلایا شوخ، حسین، تنک مزاج، دلبر، جو میشکن سے شادی کرنا چاہتی ہے اور آخر میں نستاسیا فلی پوفنا کے ہاتھوں شکست کھاتی ہے، لے بجف، خوشامد خوروں کا سرتاج، جوہر رئیس کے نسب نامے اور کمزوریوں اور عیاشیوں سے کامل واقفیت رکھتا ہے؛ اپولت، ایک ذہنی باغی جو بڑی دھوم سے ثابت کرتا ہے کہ دنیا رہنے کے قابل جگہ نہیں۔ اور بڑے جوش اور عقیدت سے اعلان کرتا ہے کہ میں خودکشی کرنے والا ہوں، مگر آخر وقت میں اس کا پستول نہیں چلتا اور اسے لوگوں کو سمجھانا پڑتا ہے کہ مجھے ناکامیابی پستول کی خرابی سے ہوئی، اس میں میری ہمت کا قصور نہیں ہے؛ یہ اور ان کے علاوہ اور بہت سے کیرکٹر ہیں جن کی صورتوں اور مشاغل بیان کرنے میں دستہ ئفسکی نے مصوری کے کرشمے دکھائے ہیں۔ لیکن ان کرشموں کی عظمت کا پورا اندازہ ناول پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے، یہاں اُسے واضح کرنے کی گنجائش نہیں —

سمجھے گا۔ نواب میشکن ہمدردی اور ایثار کا مجسمہ تھا۔ اِس لیے اُس نے کبھی نستاسیا پر نکتہ چینی نہیں کی، ہمیشہ اس کے روبرو اپنے آپ کو اور ساری دنیا کو قصوروار بتاتا رہا؛ اور آخر میں جب نستاسیا نے اپنے اختیار کی بدولت جان کھوئی تو میشکن کو اس کی تباہی پر اتنا صدمہ ہوا کہ وہ خود بھی پاگل ہوگیا۔ "مجذوب" کا یہ انجام دستہ ئف سکی کی نزاکت احساس اور نکتہ رسی کی بہت گہری دلیل ہے، مگر گمراہ کا جان کھونا، اور رہنما کا دیوانہ ہوجانا جبر و اختیار کے اخلاقی معمے کو حل نہیں کرتا۔ "برادران کرمازوت" کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے خود دستہ ئف سکی کو یقین ہوگیا کہ اگر مفروضہ انسان کامل درد کی صدا سن کر اسی طرح تڑپ اُٹھے اور بد حواس ہوجائے جیسے نواب میشکن تو اس کا انجام دیوانگی کے سوا اور کچھ ہو نہیں سکتا۔ اس لیے اُس نے انسان کامل کا ایک اور مجسمہ بنایا، درد کی صدا ویسی ہی دلسوز رکھی، مگر اپنے ہیرو کے دل کو پگھل جانے کی کمزوری سے بچا لیا۔ "برادران کرمازوت" میں درد کی صدا اوان کرمازوت بلند کرتا ہے، اور وہی باغی بھی ہے، الک سے ئی (الیوشا) کرمازوت، اس کا چھوٹا بھائی مسیحی اوصاف کا نیا مجسمہ ہے —

"برادران کرمازوت" دستہ ئف سکی کا سب سے لمبا ناول ہے، لیکن پھر بھی اسے نامکمل سمجھنا چاہیے، کیونکہ دستہ ئف سکی کا ارادہ تھا کہ اُس کے سلسلے کو جاری رکھے، اور الیوشا (الک سے ئی) کرمازوت کی مفصل سرگذشت بیان کرے۔ دستہ ئف سکی کو موت نے آگھیرا اور وہ اپنا ارادہ پورا نہ کرسکا، جس کی وجہ سے الیوشا کی شخصیت کا صرف خاکہ سا بن کر رہ گیا، اور اس کے ذریعہ سے دستہ ئف سکی نے

تشکیل زندگی کے جو دل فریب منصوبے باندھے تھے وہ پورے نہیں ہوسکے - ناول کا دوسرا پہلو، جس میں شک اور بغاوت نئے رنگ میں دکھائی گئی ہے، بہت زیادہ مکمل ہے، اوان کرمازوت کا فلسفہ بہت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے، اور ناول کی موجودہ شکل میں وہی اس کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو ہے - الیوشا اور اوان کرمازوت کے علاوہ ان کا بڑا بھائی متیا (دمتری کرمازوت)، ان کا باپ، فیوتورپا فلووچ کرمازوت سمبر حیا کوت، فیوتورپا فلووچ کا حرامی لڑکا، اور ایک رہبان زوسیما ناول کے ممتاز کیرکٹر ہیں، اور ناول کا بہت بڑا حصہ ان کی سرگذشت سنانے میں صرف ہوتا ہے، اس ناول کے نسوانی کیرکٹر، بہت کمزور ہیں، اور نستاسیا فلی پوفنا، اگلایا، "بیکس و مظلوم" کی هیروئن نتاشا، یا "جرم و سزا" کی هیروئن سونیا کے مقابلے میں وہ مصنوعی اور بے جان معلوم ہوتے ہیں —

فیوتورپا فلووچ کرمازوت ایک عیاش، بدطینت، خود غرض اور بے حیا آدمی ہے - جس کے ساتھہ کسی قسم کی انسانیت برتنا محال ہے، اور وہ ایک کسوٹی ہے جس پر دستہ‌ئفسکی نے اس کے تینوں بیٹوں کی فطرت کا امتحان لیا ہے - متیا، اس کا سب سے بڑا لڑکا، دل کا بہت اچھا مگر آوارہ اور شرابی ہے، اُسے اپنی طبیعت پر مطلق قابو نہیں ہے، اور وہ شروع سے کھلم کھلا اپنے باپ کی جان لینے کی قسمیں کھاتا رہتا ہے - اوان کرمازوت کا بھی خیال ہے کہ ایسے آدمی کو جینے دینا ایک جرم ہے، لیکن وہ اپنے خیال کو بے تکے پن سے ظاہر نہیں کرتا، وہ متیا کی طرح فضول خرچ نہیں ہے، اِسے باپ سے روپیہ مانگنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لیے وہ اس مسئلہ پر خیر و شر

کے بلند تر مسائل کی تحت میں غور کرتا ہے۔ اس میں اتنا جوش نہیں ہے کہ اپنے خیالات پر عمل کرنے کے لیے بیتاب ہو، مگر جیسا کہ آگے چل کر بیان ہوگا؛ فیوتدور پاؤلووچ کے حق میں اس کے خیالات متیا کے ارادوں سے کچھ بہتر نہیں۔ الیوشا اپنے دونوں بھائیوں سے مختلف ہے۔ وہ باپ سے لڑتا جھگڑتا نہیں، اس کی نسبت اچھے یا برے خیالات نہیں رکھتا، اور گو اُسے بھی باپ کی حرکتوں پر بہت صدمہ ہوتا ہے، وہ خاموشی سے کنارہ کش ہوجاتا ہے۔ ایک روز اچانک فیوتدور پاؤلووچ اپنے کمرہ میں مراہوا پایا جاتا ہے، اور حالات کچھ ایسے ہیں کہ متیا پر شبہہ ہوتا ہے۔ متیا اس رات کو چھپ کر اس کے کمرہ تک آیا تھا، لیکن اُسے یکبارگی خیال ہوا کہ میں اپنے باپ سے اس قدر نفرت کرتا ہوں کہ اُسے مارڈالوں تو کوئی تعجب نہیں، اور اس خیال نے اس کے دل میں اتنی وحشت پیدا کردی کہ وہ بھاگ گیا۔ اُس کے لیے اپنی بیگناہی ثابت کرنا دشوار کیا ناممکن تھا، اور آخر میں اُسے سزا بھی ہوگئی، لیکن باپ کا قاتل وہ نہیں تھا بلکہ سمیرحیاکوف، فیوتدور کو پاؤلووچ کا حرامی لڑکا جو اس کے یہاں ملازم تھا۔ جرم کی منطق اور مجرم کی نیت کا ایوان کرمازوف کے خیالات سے بہت گہرا تعلق تھا۔

ایک مرتبہ سارا کرمازوف خاندان رھبان زوسیما کی کوٹھری میں جمع تھا۔ رھبان کو معلوم ہوا تھا کہ ایوان نے کچھ عرصہ پہلے ایک مضمون میں کلیسا اور ریاست کے باہمی تعلقات پر بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "اگر انسان کی روح کو بقا نہیں ہے تو نیکی کا بھی حقیقت میں کوئی وجود نہیں"۔ یہ سن کر رھبان زوسیما نے کہا کہ "اگر تمہارا یہی عقیدہ ہے تو تم یا تو بڑے خوش

نصیب ہو یا پھر بہت بدنصیب ... تمھارے دل میں ابھی اس مسئلے کا قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے' اور یہی بات تمھیں سب سے زیادہ دکھ پہنچائے گی' کیونکہ تم کو ہر وقت خیال رہے گا کہ اس مسئلے کا قطعی فیصلہ ہو جانا چاہئے"۔ دراصل یہ مسئلہ ایوان کو ہر لمحہ پیچ و تاب میں رکھتا ہے' اور اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھتا رہتا ہے۔ روح کی بقا کا سوال اور بہت سے مسئلوں سے وابستہ ہے جو ایوان کے دل اور دماغ کو مصروف رکھتے ہیں اور اُسے کسی عقیدے پر استقلال سے قائم رہنے کا موقع نہیں دیتے۔ ایوان کو اپنی عقل اور دانائی پر گھمنڈ نہیں' وہ خدا کے وجود پر بحث نہیں کرتا' بلکہ شروع ہی سے اُسے تسلیم کرلیتا ہے۔ وہ یہ بھی مان لیتا ہے کہ خدا کے وجود کی طرح تقدیر کی مصلحتوں کو سمجھنا عقل کے امکان سے باہر ہے۔ وہ یوم جزا کا معتقد ہے' اسے یقین ہے کہ اس روز انسان کے اعمال کا حساب ہوگا' اور خدا کے عدل و انصاف' اور اس کی رحمت کا جلوہ نظر آئے گا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو بغاوت پر' یا جیسے کہ وہ خود کہتا ہے "خدا کو نہایت ادب کے ساتھ اپنے داخلے کا ٹکٹ واپس دے دینے پر" مجبور پاتا ہے۔ اُسے منظور نہیں کہ انسانی اخلاق کو عذاب اور ثواب کے قانون پر منحصر کیا جائے' ثواب کی امید میں انسان سے بے شمار تکلیفیں اُٹھانے اور دکھ سہنے کو کہا جائے۔ اور پھر وہ گناہ کرے تو اُسے سزا دی جائے۔ ممکن ہے علت اور معلول کے نظریے سے ثابت کردیا جائے کہ انسان خود اپنی مصیبت اور دکھ کا ذمہ دار ہوتا ہے' مگر اس توضیح سے کسی کا دکھ درد رتی برابر بھی کم نہیں ہوتا' اور جس شخص کو دوسروں کے درد کا احساس ہو اور

جو اس درد کو بالکل مٹانا چاھتا ہو' اُسے علت و معلول کے نظریے سے کیا تسلی ہو سکتی ہے۔ ایوان کو اپنے اعتراضات کا کہیں بھی خاطر خواہ جواب نہیں ملا ہے پھر بھی وہ اس پر تیار ہے کہ اپنا دل مضبوط کر کے ان لوگوں کے دکھ درد کو نظر انداز کرے جو سزا و جزا کے قانون سے واقف ہیں جو کچھ کرتے ہیں جان بوجھ کر کرتے ہیں اور یوں سزا کے مستحق ہوتے ہیں' لیکن ایوان کہتا ہے کہ دنیا میں صرف سمجھدار لوگوں کو نہیں بلکہ معصوم اور بے گناہ بچوں کو بھی بے انتہا اذیتیں پہنچتی ہیں۔ ان کا کوئی سبب نہیں' اور انہیں دیکھتے ہوئے کوئی شخص بھی جس کے دل میں ذرہ بھر محبت اور درد ہے اس دنیا میں رہنا اور اس کے نظام کو تسلیم کرنا گوارا نہیں کر سکتا۔ "میں یہ سمجھ سکتا ہوں کہ لوگ سب یکساں گنہگار ہوتے ہیں' میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان کی مصیبتوں کا ان کے گناہوں سے بہت گہرا تعلق ہے' لیکن بچے تو مجرم اور گنہگار نہیں ہو سکتے' اور اگر دراصل وہ بھی اپنے والدین کی بدکرداریوں میں شریک ہوتے ہیں تو جس منطق سے یہ شرکت ثابت کی جاتی ہے وہ اس دنیا کی منطق نہیں اور میری سمجھ میں نہیں آ سکتی"۔ اس سے کچھ پہلے وہ کہہ چکا ہے: "اگر سب کو دکھ سہنا اس وجہ سے لازمی ہے کہ پھر دائمی مسرت حاصل کر سکیں اور زندگی میں کامل ہم آہنگی قایم ہو سکے• تو پھر براہ کرم

• عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ دین عیسوی کی سچی پیروی کی جائے تو دنیا میں کامل ہم آہنگی قایم ہوجائے گی۔ یہ بھی ایک عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز اُن نیک لوگوں کو جنھوں نے حق کے لیے اپنی ساری مصیبتیں صبر سے برداشت کی ہیں' خدا کی مشیت کے تمام راز معلوم ہو جائیں گے۔ اس روز گویا حق کی فرماں روائی ہوگی —

یہ تو بتاؤ کہ بچوں پر دکھ سہنا کیوں لازمی ہے؟" اوان نے ادھر ادھر سے واقعات یہ دکھانے کے لیے جمع کئے ہیں کہ بچوں کے ساتھ کیا کیا ظلم کیا جاتا ہے، وہ کس بے بسی سے خدا سے دعا مانگتے ہیں، اور ان کے معصوم دلوں کو کیسے کیسے صدمے پہنچتے ہیں۔ ان کے درد سے اوان کو اس قدر تکلیف ہوتی ہے کہ وہ روز جزا کو، اس بصیرت کو، جو قیامت کے دن مشیت کے کل راز واضح کردے گی اور ہر دل سے کدورت اور شکایت دھو ڈالے گی، اور اس وعدے کو کہ دنیا میں جو بیگناہ دکھ سہے گا اسے جنت کی مسرت اجر میں ملے گی، اپنے دل کی تسلی کے لیے کافی نہیں پاتا۔ وہ کہتا ہے: "میں تلافی چاہتا ہوں ... قیامت کے روز نہیں، جو خدا جانے کب ہوگا اور کہاں، بلکہ اسی دنیا میں اور ابھی، تاکہ میں اسے سمجھ سکوں، میری اپنی آنکھیں اسے دیکھ سکیں ..." اِس خوف میں کہ کہیں آخرکار قیامت کے روز پاک دلوں کی محبت کا جلوہ دیکھ کر وہ خود بھی خدا کی شان میں گیت گانے لگے، وہ کہتا ہے: "جب تک موقع ہے میں اپنے آپ کو ہر طرح سے بند اور محفوظ کرلوں گا، اور تب کہدوں گا کہ مجھے بلند روحانی ہم آہنگی کی حاجت نہیں۔ یہ بلند ہم آہنگی بہت گراں ہے۔ اگر یہ اُس ... مظلوم بچی * کے آنسوؤں کے مول ملے جس نے اپنی ننھی ننھی مٹھیاں سینے پر ماریں اور اس گندی کوٹھڑی میں ایسے

---

* اوان اس سے پہلے اسی بچی کا قصہ سنا چکا ہے۔ بچھونا گندا کرنے کی سزا میں ماں باپ نے سردی کے موسم میں اس کے کپڑے اتار کر اور اسی کے چہرے پر گو لیس کر پاخانے میں بند کر دیا، اور خود جا کر چین سے سو رہے —

آنسو بہا کر جن کا کسی نے بدلہ نہیں لیا! اپنے "پیارے اللہ میاں" سے دعائیں مانگیں کہ مجھے مصیبت سے چھڑاؤ، بہت گراں ملی، کیونکہ بچی کے آنسوؤں کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا - اور ان کا بدلہ اینا لازمی ہے، کیونکہ اس کے بغیر ہم آہنگی بھی نہیں ہوسکتی - لیکن ان کا بدلہ لیا جائے تو کس صورت سے ... کیا اس طرح سے کہ مجرموں کو سزا دی جائے، سزا دینے سے کیا فائدہ ... دوزخ کے عذاب سے کیا کام چل سکتا ہے جب یہ بچے جتنا دکھ سہہ سکتے تھے سہہ چکے ہیں - اور پھر یہ ہم آہنگی اور حق کی فرماں روائی کیسی جس کے ساتھ جہنم کا عذاب بھی ہے: میں تو چاہتا ہوں سب کی خطائیں معاف کرنا، سب کو محبت سے گلے لگانا، میں چاہتا ہوں دنیا سے دکھ کو مٹا دینا - اور اگر بڑوں کے دکھ کے ساتھ بچوں کا دکھ بھی شامل کرنا ضروری ہے کہ حق کی پوری قیمت دی جاسکے تو میں پہلے ہی سے باصرار کہے دیتا ہوں کہ حق کی ہرگز اتنی قیمت نہیں ہوسکتی - ... میں نہیں چاہتا، ہم آہنگی اور حق کی فرماں روائی، اور نہیں اس وجہ سے چاہتا کہ مجھے انسان سے محبت ہے - میں حق کی حکمرانی نہیں تسلیم کروں گا، میں اس دکھ میں محو رہوں گا جس کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا ہے - میں یہی بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے اس دکھ پر جس کا کوئی بدلہ نہیں لیا گیا ہے، اپنی شکایتوں، اور شکایتوں کے پیدا کیے ہوئے غصے پر قائم رہوں، چاہے میں غلطی ہی پر کیوں نہ ہوں - ہم آہنگی اور حق کی فرماں روائی کی قیمت بہت اونچی لگائی ہے - میری جیب میں اتنے دام نہیں کہ داخلے کا ٹکٹ خرید سکوں - اس لیے میں داخلے کا ٹکٹ بلا تامل فوراً واپس کردوں گا - اور اگر میں ایماندار آدمی ہوں تو جس قدر جلد ممکن ہو مجھے ٹکٹ واپس کردینا چاہئے - الیوشا،

میں خدا کے وجود سے انکار نہیں کرتا، صرف اپنا ٹکٹ نہایت ادب کے ساتھ واپس دے رہا ہوں "—

اوان کی بغاوت اور اس کی شکایتوں پر اگر واقعی غور کیا جائے تو اُس سکون اور اطمینان کو خیر باد کہنا ہوگا جو مذہب اور عقیدے کے ذریعے سے انسان حاصل کرتا ہے۔ الیوشا، اوان کا چھوٹا بھائی جس میں مذہب کا سچا جذبہ ہے، اور جو دین عیسوی کا مخلص پیرو ہے اپنے پختہ عقیدے کے باوجود اوان کی کسی دلیل کو رد نہیں کرتا اور نہیں کرسکتا۔ آخر میں، جب حضرت عیسیٰ کی شخصیت پر گفتگو ہوتی ہے، اور الیوشا حضرت عیسیٰ کے ایثار کو معصوموں کے درد کا کفارہ ثابت کرنا چاہتا ہے۔ تو اوان اسے ایک مضمون سناتا ہے جو اُس نے کچھ عرصے پہلے لکھا تھا۔ اس مضمون کا عنوان "اسقف اعظم" * ہے، اور اس میں رومن کیتھلک کلیسا کا ایک بڑا عہدہ دار حضرت عیسیٰ کو، جو دوبارہ دنیا میں آئے ہیں، قید کر دیتا ہے اور قید خانے میں جاکر اُنہیں سمجھاتا ہے کہ اُس نے اُنہیں کس وجہ سے قید کیا ہے اور دوسرے روز زندہ جلادینے کی سزا کیوں دے گا۔ اسقف کسی شبہے میں نہیں ہے، اسے بالکل یقین ہے کہ اُس کا قیدی حضرت مسیح کے سوا اور کوئی نہیں، مگر اس کی وجہ سے وہ اپنے قیدی کو سزا دینے پر اور بھی

---

* الک سے ئی کرمازوت، اوان کا چھوٹا بھائی جو اس تقریر میں اس کا مخاطب ہے —

* اس مضمون کا مفصل ترجمہ رسالہ "جامعہ" بابت سنہ ۱۹۲۸ میں شائع ہو چکا ہے —

تل جاتا ہے' اس لیے کہ اُسے دین عیسوی اور خود حضرت عیسیٰ کی ذات سے بہت شکایتیں ہیں - رات کو وہ اپنے قیدی حضرت عیسیٰ کے پاس جاتا ہے' اُنھیں وہ تین ترغیبیں * یاد دلاتا ہے جن سے شیطان نے اُنھیں بہکانے کی کوشش کی تھی' اور اس پر بہت لعنت ملامت کرتا ہے کہ انھوں نے شیطان کا کہنا نہیں مانا۔ پہلی ترغیب یاد دلاکر اسقف کہتا ہے: "تجھے معلوم ہے کہ صدیاں گذرتی جائیں گی اور نوع انسانی اپنی عقل اور علم کے ذریعے سے اس کا اعلان کرے گی کہ انسان مجرم نہیں ہوتے' اور ظاہر ہے گناہگار بھی نہیں' صرف بھوک کے مارے ہوتے ہیں" اور پھر "اگر روحانی غذا† کے نام سے تیرے پیرو ہزار اور دس ہزار ہوں گے تو ان لاکھوں اور کروڑوں ہستیوں کا کیا انجام ہوگا جن میں اتنی قوت نہیں کہ روحانی غذا کی فکر میں اپنے پیٹ کی بھوک بھول جائیں - یا تجھے صرف تیرے ہزار دس ہزار بلند حوصلے اور قوی ارادے والے پیرو عزیز تھے' اور باقی' کروڑ دو کروڑ'

---

* پہلی ترغیب یہ تھی کہ شیطان نے حضرت عیسیٰ سے کہا کہ "ان پتھروں کو حکم دے کہ روٹی بن جائیں" مگر حضرت عیسیٰ نے جواب دیا کہ "انسان صرف روٹی کے سہارے نہیں جیتا ہے" تب شیطان نے حضرت عیسیٰ کو ایک اونچے مینارے پر لے جاکر کھڑا کردیا اور کہا کہ اگر تجھے خدا پر بھروسہ ہے تو نیچے کود پڑ۔ حضرت عیسیٰ نے جواب دیا کہ خدا کی آزمائش کرنا منع ہے۔ آخر میں شیطان اُنھیں ایک اونچے پہاڑ کی چوٹی پر لے گیا اور کل روئے زمین کا منظر دکھا کر کہا کہ اگر تو میری پرستش کرنے پر راضی ہوجائے تو میں تجھے ساری دنیا کا بادشاہ بنادوں گا۔ حضرت عیسیٰ نے خفا ہوکر اُسے اپنے سامنے سے بھگا دیا —

† یعنی سچی روحانیت اور عقیدت جس کی طرف حضرت عیسیٰ نے اپنے جواب میں اشارہ کیا تھا کہ "انسان روٹی کے سہارے نہیں جیتا" —

بلکہ ساحل کی ریت کی طرح بے شمار انسانی ہستیاں جو کمزور ہیں مگر تجھہ سے محبت رکھتی ہیں، صرف اس مصرف کی ہیں کہ تیرے بلند حوصلے اور مضبوط ارادے والوں کا تختۂ مشق بنیں؟" اسقف کا عقیدہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ نے لوگوں کے پیٹ بھرنے کا ذمہ لیا ہوتا اور اُنہیں روحانی غذا پر پالنے کی فکر نہ کرتے تو بہت کامیابی ہوتی اور انھوں نے نوع انسانی کی محبت کا دعویٰ ثابت کر دیا ہوتا۔ لیکن اگر اُنہیں یہ منظور نہیں تھا تو انہیں انسان کی رہبری کا وہ دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیے تھا جس کی طرف شیطان نے اشارہ کیا تھا: یعنی معجزہ، اِس لیے کہ خدا کے برابر اگر انسان کی کوئی ضرورت ہے تو یہ کہ اُس کے ضمیر کا کوئی محافظ بن جائے۔ اور ضمیر کا محافظ وہ اسی کو بنائے گا جو معجزے کے ذریعے سے اس کے ذہن پر جادو کردے۔ اسقف حضرت عیسیٰ سے پوچھتا ہے "کیا تو بھول گیا تھا کہ انسان چین آرام کو، بلکہ موت کو، بھی اس پیچ و تاب سے زیادہ قابل برداشت سمجھتا ہے جس میں خیر و شر میں تمیز کرنے کی ذمہ داری اسے مبتلا کر دیتی ہے۔ ضمیر کی آزادی کی انسان کو بہت ہوس ہوتی ہے، لیکن یہ آزادی اس کی سب سے بڑی مصیبت بھی ہو جاتی ہے ... دنیا میں تین قوتیں ہیں، صرف تین، جو ہمیشہ کے لیے ان کمزور باغیوں کے ضمیر کو قابو میں لاسکتی ہیں اور اسے فریفتہ کرکے ان لوگوں کی مسرت کا ذریعہ بن سکتی ہیں، اور یہ تین قوتیں ہیں معجزہ، مذہبی اسرار، اور اقتدار۔ تونے پہلے دوسرے اور تیسرے سب سے انکار کر دیا اور اپنی ذات کو اس انکار کی ایک مثال بنا دیا ... تجھے امید تھی کہ تیری پیروی کرتے ہوے انسان اپنی عقیدت

کے استحکام کے لیے خدا کی ذات کو کافی سمجھے گا اور اسے معجزہ کی حاجت نہیں ہوگی - لیکن کیا تجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ جہاں انسان نے معجزے سے بے نیازی ظاہر کی وہ خدا سے بھی پھر گیا ' کیونکہ انسان کو حق کی اس قدر تلاش نہیں ہوتی جتنی معجزے کی ... ہم نے تیری تحریک کی اصلاح کرکے اسے معجزے' مذہبی اسرار اور اقتدار پر قائم کردیا۔ اور ان لوگوں کو اس پر بہت خوشی ہوئی ... "—

عام انسان کے ' اور اس شخص کے نقطۂ نظر سے جو عام انسانی فطرت کو سمجھتا ہے آئین عیسوی پر اِس سے زیادہ بھاری اعتراضات نہیں کیے جا سکتے جو اسقف اعظم نے اپنے قیدی کو سنائے ' اور ان اعتراضات کو اگر ان دلیلوں میں شامل کر دیا جائے جن کی بنا پر اوان نے کائنات اور زندگی کے نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کیا تھا تو عقیدت اور مذہب کی جڑ کٹ جاتی ہے - لیکن جیسا کہ اوان خود تسلیم کرتا ہے -" باغی ہوکر جینا مشکل ہے ' اور میں جینا چاہتا ہوں "- اس سے کچھ پہلے وہ کہہ چکا ہے : " میں زندہ رہنا چاہتا ہوں ' اور زندہ ہوں ' خواہ یہ میری منطق کے خلاف ہی کیوں نہ ہو - میں کائنات کے نظام کو درست نہیں مانتا تو کیا حرج ہے ' مجھے وہ کونپل تو عزیز ہے جو بہار میں پھوٹ نکلتی ہے - مجھے اِس نیلے آسمان سے تو محبت ہے ' میری سرشت میں وہ چیز تو ہے جو کبھی کبھی کسی سے خاص شخصی لگاؤ پیدا کر دیتی ہے ' اور معلوم نہیں ہوتا کیوں' میں انسان کی بعض کوششوں کی دل سے قدر کرتا ہوں جن کے مطلب اور مقصد سے زمانہ ہوا مجھے کوئی عقیدت نہیں رہی ... اس میں عقل اور منطق کو دخل نہیں ' اس محبت میں اِنسان کی کل ہستی شامل ہوتی ہے ' یہاں تک کہ اس کا معدہ اور آنتیں بھی ' یہ محبت گویا

نئی نئی حاصل کی ہوئی قوت کا جوش ہے " ایوان کی بدقسمتی یہی ہے کہ وہ یہ نہیں طے کر پاتا کہ زندہ رہنے کی خواہش زیادہ قوی ہونی چاہیے یا زندگی کے معنی اور مقصد سمجھنے کی ' اور چونکہ اس کی طبیعت غور و فکر کی طرف زیادہ مائل ہے ' اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذہنی " بغاوت " کے باوجود زندہ رہنا کمینہ پن قرار دیتا ہے ' اور مذہب و اخلاق سے اس قدر بددل ہو جاتا ہے کہ عملی زندگی میں ان مخدوش اصولوں کو اپنا معیار بناتا ہے کہ " سب کچھ جائز ہے "۔ اور ہر شخص جس بات کی چاہے خواہش کر سکتا ہے ' حتیٰ کہ دوسرے کی موت بھی۔ اس معیار کے مطابق خاندانی معاملات کے متعلق وہ یہ رائے قائم کرتا ہے کہ " دو درندے ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے " اور اپنے بڑے بھائی اور باپ کی جانی دشمنی رفع کرنے کی مطلق کوشش نہیں کرتا۔ سمیرحیاکوف نے جو اس کے باپ کے قتل کی فکر میں تھا ' اِس کی بے پروائی اور بے تعلقی دیکھ کر اسے مشورہ دیا کہ چند روز کے لیے پاس کے ایک گانوں چرماش‌نیا چلے جاؤ اس خیال سے کہ اگر ایوان اپنے باپ کا قتل نہیں چاہتا ہے تو وہ یہ مشورہ منظور نہیں کرے گا ' کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ تین چار روز کے اندر کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔ ایوان چرماش نیا کے بجائے ماسکو چلا گیا۔ وہاں جب اسے خبر ملی کہ اس کا باپ مار ڈالا گیا ہے اور اس کے بڑے بھائی پر قتل کا الزام لگایا گیا ہے تو وہ فوراً واپس آیا۔ پہلے اسے یقین تھا کہ باپ کو اس کے بڑے بھائی نے مارا ہے ' لیکن سمیرحیاکوف سے تین چار مرتبہ گفتگو کرنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ اصل مجرم وہ خود ہے ' کیونکہ اس کا ماسکو چلا جانا سمیرحیاکوف کے لیے گویا قتل کی

اجازت تھی۔ اوان نے یہ کہہ تو دیا تھا کہ " دو درندے ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے " لیکن جب اس کا اپنے اصول کے نتائج سے سامنا ہوا اور سمیرجیاکوف نے اسے یقین دلا دیا کہ جرم میں بڑی حد تک آپ بھی شریک ہیں تو اوان کو بہت سخت صدمہ ہوا، اور اس صدمے نے اُسے دیوانہ کر دیا۔ یہ ہوا انجام اس کی "بغاوت" کا ―

اوان کا چھوٹا بھائی الیوشا اپنے دل میں اسی قدر درد اور انسانی ہمدردی رکھتا ہے جتنی اوان، مگر اُس کی شخصیت بغاوت کی طرف مائل نہیں ہوتی اور عملی زندگی میں شرکت کرنے سے انکار نہیں کرتی، اس وجہ سے کہ درد اور انسانی ہمدردی کے ساتھ ہی الیوشا کی طبیعت میں محبت اور ایثار کا ایک قوی جذبہ ہے جو اُسے دوسروں کی خدمت کرنے پر مجبور کرتا ہے، اور دوسروں کی خدمت کرنے سے اور ان کے دلوں میں محبت کے بیج بونے سے اُسے ایسی تسلی اور تسکین حاصل ہوتی ہے، اپنے عقیدے کی سچائی کے اُسے ایسے کُھلے ثبوت ملتے رہتے ہیں کہ شک اور انکار کی گنجائش نہیں رہتی۔ دل کی وہ خالص بولائی، پرائے دکھ کی داستان سن کر بے چین ہو جانے اور تڑپ اُٹھنے کی وہ پیاری صفت جس نے نواب میشکن کو سیانے سے دیوانہ بنا دیا تھا، اُس کی سرشت میں بھی موجود ہے، مگر ایک شدید مذہبیت کے بھیس میں، جو اسے ان اوصاف کے خطرناک پہلو سے محفوظ رکھتی ہے، اور اس کی شخصیت کے لیے ایک مضبوط سہارا بن جاتی ہے، الیوشا عیسائی ہے، بہت سچا عیسائی، جس کے نہ دل میں کمزوری ہے نہ عقیدے میں، وہ آئین عیسوی کا پیرو بھی ہے اور شیدائی بھی، اور اسے خاص تقویت اس بات سے حاصل ہوتی ہے کہ اس کی عقل مشکل پسند اور

نکتہ چیں نہیں ہے۔ اس کی شخصیت نواب میشکن کی طرح جادو کرنا نہیں جانتی، لیکن نواب میشکن کے مقابلے میں بہت زیادہ محکم اور مضبوط ہے۔ الیوشا روسی قوم، روسی مذہب، اور مذہبیت کی اعلیٰ ترین پیداوار ہے، اور اسے اپنی سر زمین اور ماحول سے بہت گہرا اور سچا لگاؤ ہے، اس کی سیرت اور وہ اصول جن پر وہ تعمیر کی گئی ہے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ دستہ ئف سکی بغاوت، انکار اور شک کے تمام مراحل طے کر کے منزل مقصود پر پہنچ گیا تھا۔ اثبات خودی، غرور اور سرد مہری جو اثبات خودی کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے، انسانی شخصیت کو کامل نہیں بنا سکتی۔ شخصیت کا فروغ صرف ایثار کے دم سے ہوسکتا ہے، لیکن اگر اس ایثار کے ساتھ دل میں قوت برداشت نہ ہو تو کوئی شخصیت اِس درد کی تاب نہ لاسکے گی جو زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے ہر نیک دل میں اٹھتا ہے، اور وہ اس اختیار کے ہاتھوں شکست کھائے گی جو ہر انسان کو اپنے دکھ اور سکھ کی فکر کرنے کے لیے ازل سے ملا ہے۔ ایثار کی راہ پر بھی انسانی شخصیت صرف اپنے بل بوتے پر نہیں چل سکتی، اسے مدد اور تقویت کی حاجت رہتی ہے، اور یہ اسے صرف مذہب سے، اور مذہبی رہنماؤں کے ایثار کی مثالوں سے حاصل ہوسکتی ہے۔ افسوس ہے دستہ ئف سکی "برادران کرمازوف" کی داستان ختم نہ کرسکا، اور اسے الیوشا کی شخصیت کی پوری شان دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ہم دیکھ سکتے ہیں الیوشا نے ایسے انداز سے میدان عمل میں قدم رکھا ہے، ایسے شوق اور عقیدت سے اپنا پیغام سنانا، اور محبت اور ایثار کا بیج بونا شروع کیا ہے کہ وہ ضرور ایک روز کامیاب ہوگا۔ الیوشا کی کامیابی، اور اس کی شخصیت کا

کامل بن جانا محض دین عیسوی کے برحق ہونے کا ثبوت نہیں ' بلکہ ہر مذہب ' ہر جماعت کے لوگوں کے لیے ایک نمونہ ' ایک روشن مثال ہے - کیونکہ ہر جگہ آسمان وہی ہے زمین وہی ' دل وہی اور درد وہی - اصل مشکل ہے خدمت کا حوصلہ پیدا کرنا ' اس حوصلے میں محو ہو جانا ' خودی کو بیخودی میں ڈھونڈھنا اور پانا —

" ایک مضحک آدمی کا خواب " دستہ وُف سکی کا ایک مختصر اور عجیب سا افسانہ ہے جس میں اس کا خاص فلسفۂ حیات بہت اچھی طرح سے بیان کیا گیا ہے - ایک شخص جو خود کشی کرنے والا ہے خواب دیکھتا ہے کہ وہ ایسے ملک میں پہنچا جہاں کے باشندے بالکل معصوم تھے' اور ان کے دل ایسے پاک تھے کہ انہیں یہ شخص جس کا دنیا میں ہر وقت بڑی بیدردی سے مضحکہ اڑایا جاتا تھا کسی طرح مذاق اور تضحیک کا سزاوار نہیں معلوم ہوا - اپنا تعجب اور خوشی ' اور ان لوگوں کی انتہائی نیکی اور خوش اخلاقی ظاہر کرنے کی غرض سے اُس شخص نے ان لوگوں کو اُس دنیا کا سارا حال سنایا جس میں وہ پیدا ہوا تھا ' اور اپنے دل کی ساری شکایتیں بیان کردیں - مگر اسے حیرت ہوئی کہ یہ لوگ افسوس کرنے کے بجاے دنیا والوں پر رشک کرنے لگے ' گناہوں کا مزا چکھنے کے لیے انھوں نے معصومیت کو خیرباد کہی' رفتہ رفتہ وہ تمام برائیاں جن کی انہیں خبر ملی تھی اختیار کرلیں ' اپنی زندگی کو درہم برہم کردیا اور اپنے آپ کو طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کردیا - یہ دردناک منظر دیکھکر مضحک آدمی اپنی حرکت پر بہت نادم ہوا ' اور گو اب یہ لوگ بھی اس پر ہنسنے اور اس کی تحقیر کرنے لگے تھے ' اس نے تہیہ کیا کہ میں اپنی غلطی کے کفارے

میں اپنی زندگی ان لوگوں کی خدمت اور ان کو راہ راست پر لانے کی کوشش میں صرف کروں گا۔ اس افسانے میں دستہ ؤف سکی نے جبر و اختیار کے مسئلے کو پھر چھیڑا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ انسان کے دل میں تجربے اور علم کا پھل چکھنے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔ اس کی ہدایت کے لیے یہ بتا دینا کافی نہیں ہے کہ اس کا نفع کن باتوں میں ہے اور نقصان کن باتوں میں، اور اسے صحیح مسرت اور نجات حاصل کرنے کے لئے کون سا مسلک اختیار کرنا چاہئے۔ انسان برے اعمال کے نتائج سے ڈرتا بھی ہو تو ان سے باز نہیں آتا، کیونکہ اسے زندگی کا مزہ اسی میں ملتا ہے کہ جو اس کا جی چاہے وہی کرے۔ ہر شخص کے سامنے نیکی اور سلامت روی کی ہزاروں مثالیں موجود ہوتی ہیں، ہر شخص یہ بھی دیکھتا ہے کہ خود رائی اور بے اعتدالی کی سزا کبھی کبھی ضرور ملتی ہے، پھر بھی راہ راست پر چلنے والے بہت کم ہوتے ہیں اور غلطی اور گمراہی سے دنیا تاریک اور دوزخ کا نمونہ بنی رہتی ہے۔ نوع انسانی کے رہنماؤں کو صدمے پہنچے ہیں اور ان کی تعلیم بے اثر رہی ہے تو اسی وجہ سے کہ انسان اپنے اختیار کا غلط استعمال کرتا ہے، اپنے سے زیادہ سمجھدار لوگوں کی نصیحت کا کیا ذکر ہے اسے خود اپنی عقل کی ہدایت پر عمل کرنا ناگوار ہوتا ہے جب تک اسے راست روی میں وہی مزہ نہ ملے جو اپنی مرضی پر چلنے میں ملتا ہے۔ عقل پرست لوگ مذہب کے غیر عقلی پہلو پر بہت اعتراض کیا کرتے ہیں، لیکن مذہب کی بنیاد جذبات پر رکھنے اور نیک جذبے کو صحیح رائے پر ترجیح دینے میں بڑی مصلحت ہے، کیونکہ اس سے راست روی میں ایک خاص کشش اور نیک زندگی میں ایک قوت

پیدا ہوجاتی ہے —

دستہ ئف سکی کے ناولوں پر جو مختصر اور نامکمل بحث یہاں کی گئی ہے اس سے بھی ظاہر ہوجاتا ہے کہ علم، اخلاق، فلسفے اور مذہب کے نقطۂ نظر سے وہ کس قدر بلند پایہ اور بیش بہا تصانیف ہیں۔ وہ محض قصے کہانیاں نہیں ہیں، محض انسانی زندگی کی حقیقت نما تصویریں نہیں ہیں، ان کا شمار دراصل ان الہامی کتابوں میں ہونا چاہئے جنھوں نے ایک قوم کے جان بہ لب عقیدوں اور حوصلوں میں جان ڈال کر ویرانوں کو آباد کیا ہے اور ایک نئی دنیا تعمیر کی ہے۔ ایک انگریزی نقاد کا خیال ہے کہ "دستہ ئف سکی نے فن ناول نویسی کا خاتمہ کردیا" اور یہ اس اعتبار سے بالکل صحیح ہے کہ دستہ ئف سکی نے اپنے ناولوں میں جو مقاصد پیش نظر رکھے ان سے بڑھ کر حوصلہ کرنا ناول نویس کے لیے ممکن نہیں۔ اس نے ایک فن کو جو ہمیشہ سے دلچسپی فراہم کرنے کے لیے وقف رہا تھا حق کا پیغام بر بنادیا، اور آرٹ اور مذہب کو اس بلندی پر پہنچادیا جہاں وہ دونوں ایک ہوجاتے ہیں۔ دستہ ئف کے پلاٹ سب اُلجھے ہوے ہیں، سیدھا سادہ قصہ سنانے کی اس میں صلاحیت ہی نہیں تھی اکثر جگہ اس نے معمولی باتوں کو جو ناول کے موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں رکھتی ہیں بہت بے جا طوالت دے دی ہے، اور اس کی زبان میں ایک ہذیانی کیفیت ہے جو ان موقعوں پر نہایت ناگوار ہوتی ہے جہاں وہ موضوع کے لحاظ سے ضروری اور موزوں نہیں۔ خالص ادبی خوبیوں کا اس کے یہاں نام تک نہیں۔ اس کی کل تصانیف میں شاید ہی دو

چار جملے ایسے ملیں جو پیچیدہ نہیں ہیں، اور الفاظ کے انتخاب میں اس نے عام طور سے فصاحت کا خون کیا ہے۔ تورگینف کی طرح وہ کسی کی صورت یا صورت اس طرح نہیں بیان کرسکتا کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، اس نے گوگول کی طرح اپنے ناولوں اور ان کے اشخاص کو قومی رنگ میں نہیں رنگا ہے۔ لیکن دستہ ئف سکی کا ایک ناول پڑھنے کے بعد ان دونوں کے ادبی کمالات نظر سے گر جاتے ہیں، "وہ ایک بڑا آرٹسٹ ہے جسے ادبی کمالات کا دماغ نہیں" ۔ ادبی دنیا میں اگر کوئی اس کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے تو تالستائی، اور تالستائی کو بڑے سے بڑے ناول نویس استاد مانتے ہیں۔ لیکن تالستائی میں وہ سوز، وہ درد، وہ تڑپ نہیں ہے جو دستہ ئف سکی کے دل میں تھی، اس کے ناولوں کو پڑھ کر دل میں وہ ہیجان نہیں اُٹھتا جو دستہ ئف سکی کے ناول پیدا کر دیتے ہیں، وہ طوفان برپا نہیں ہوتا جس سے پرانی دنیا بگڑتی اور نئی دنیا بنتی ہے ــــ

بعض غلط فہمیاں

از

(جناب پنڈت منوہر لال زتشی صاحب، ایم۔ اے)

رسالہ اردو کے حصہ ۵۱ (جولائی سنہ ۱۹۲۳) میں ڈاکٹر گریہم بیلی کی انگریزی کتاب، اردو لٹریچر کا تبصرہ چھپا ہے۔میں اس تبصرہ کا ایک ٹکڑا ذیل میں نقل کرتا ہوں —

" ایک انگریز اپنے سیاحت نامے میں لکھتا ہے کہ اہل ہند ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کے ثبوت میں اس نے یہ امر پیش کیا ہے کہ یہ لوگ ہمیں (انگریزوں کو) طنزاً گورا (یعنی گھوڑا) یا گھڑ منہا کہتے ہیں۔ یوروپی شخص کی زبان سے گھہ اور ڑا کا تلفظ ادا نہیں ہوتا۔ وہ گورا اور گھوڑا کو ایک ہی طرح بولتا ہے اس سے یہ مغالطہ ہوا۔ یہی حال ان یوروپی محققین کے ہاتھوں "کوڑی بولی" کا ہوا۔ یہ لوگ "کھڑی" اور "کھری" میں فرق نہیں کرسکتے؛ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کھڑی کے معنی پاک صاف شستہ اور عام مستند زبان سمجھتے رہے۔ ہمیں اس سے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب نے اس مغالطے کو رفع کیا ہے لیکن اصل غلطی میں یہ بھی مبتلا ہیں۔ کھڑی اور کھری کا فرق انہوں نے بہت صحیح بتلایا ہے۔ لیکن معنی تقریباً وہی رکھے ہیں

جو کھڑی کے ہیں یعنی ہر وجہ عام مستند (standard) زبان ۔ اور دوسرا غضب یہ کیا ہے کہ کھڑی بولی کو ایک خاص زبان قرار دیا ہے اور اس کی دو شاخیں بتلائی ہیں ایک ہندی اور دوسری اردو ۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال صحت سے اسی قدر بعید ہے جس قدر ان کے پیشرو یورپی محققین کا ۔ کھڑی بولی کے معنی ہندوستان میں عام طور پر گنواری بولی کے ہیں جسے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ" ۔

اس طرح کے مغالطے فرنگیوں کو ضرور ہوے ہیں ۔ ڈاکٹر فیلن ہندوستانی زبان کے مشہور محقق ہیں اور ان کے لغات دور دور مشہور ہیں اور سچ یہ ہے کہ بڑے کام کی کتابیں ہیں۔ مگر ایک جگہ ان کو بھی ٹھوکر لگی۔ اپنی لغت " اے نیو ہندوستانی انگلش ڈکشنری (A New Hindustani - English Dictionary) کے صفحہ ۱۷۷ پر ' سگا ' کے تحت میں ایک فقرہ لکھتے ہیں ' یہ تمھارے سگوں میں ہے ' اور اس کا ترجمہ انگریزی میں کرتے ہیں ؟ Is he one of your dogs

ایک دوسرے محقق سر جارج گریرسن ہیں اور انھوں نے واقعی جیسی محنت اور کاوش ہماری زبانوں کے سمجھنے اور سمجھانے میں کی ہے ویسی کوئی کم کرے گا مگر ان سے بھی غلطی ہوئی اور بڑی فاش غلطی ہوئی ۔ گریرسن صاحب کی ایک کتاب ہے دی ماڈرن ورنیکلر لٹریچر آف ہندوستان (The modern vernacular literature of Hindustan) اس میں ایک مقام پر ہندی کے مشہور شاعر سورداس کا ذکر ہے ۔ سورداس سری کشن جی کے بڑے بھگت تھے ۔ چونکہ اندھے تھے اس واسطے جو کچھ وہ کہتے تھے ایک کاتب لکھا کرتا تھا ۔ ایک روز کاتب موجود نہ تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ سری کشن جی اپنے بھگت کے سچے پریم سے اس قدر خوش

تھے کہ اس دن وہ خود تشریف لائے اور کاتب کی جگہ سورداس جی کے اشعار لکھنے لگے۔ سورداس جی ان کو دیکھ تو سکتے نہ تھے مگر انہوں نے یہ محسوس کیا کہ آپ کا کاتب ایسا چابک دست ہے کہ اس سے پہلے کہ شاعر کے منہ سے الفاظ نکلیں وہ ان کو لکھ لیتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بات کا انتظار ہی نہیں کرتا کہ الفاظ منہ سے ادا کئے جاتے۔ بلکہ جیسے ہی خیال ذہن میں آتا ہے وہ اس کو معلوم کرلیتا ہے۔ سورداس جی نے سمجھ لیا کہ ایسا کاتب سوائے سری کشن جی کے دوسرا نہیں ہوسکتا اور انہوں نے کاتب کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مگر کرشن جی ہاتھ جھٹک کر غائب ہو گئے۔ اس وقت سورداس جی نے کہا —

کر * چھٹکائے جات ہو دربل † جان کے مو نہی ‡
ہردے $ سے جو جاوگے مرد بکھانو †† تو ہی

معنی صاف ہیں سورداس جی فرماتے ہیں کہ مجھے کمزور سمجھ کر میرا ہاتھ جھٹک کر آپ چلدیے میں تب جانوں کہ آپ مرد ہیں کہ جب آپ میرے دل سے چلے جائیے۔ اب ملاحظہ کیجیے کہ مرد کے لفظ کو بجائے جواں مرد اور بہادر سے تعبیر کرنے کے گریرسن صاحب اس کے معنی انسان یا آدمی کے لیتے ہیں۔ اور کیسی کیسی ٹھوکریں کھاتے ہیں گریرسن صاحب کی شرح یہ ہے —

Thou thrustest away my hand and departest, knowing that I am weak (and pretending that thou art but a man), But not till thou departest from my heart will I confess thee to be a mortal.

اور سلئے معنی تو یہ سمجھے مگر ثنا و صفت کس قدر کرتے ہیں۔

Sur Das then uttered a poem still extant, and in my opinion by far his

---

* کر۔ ہاتھ۔ † دربل۔ کمزور۔ ‡ مونہی۔ مجھ کو۔ $ ہردے۔ دل۔
†† بکھانو۔ بیان کروں —

highest flight, the leading idea of which is that though a mortal might thrust him away, no one but God could tear himself from the poet's heart .

تحسین ناشناس اسی کو کہتے ہیں —

جناب نواب نصیر حسین خاں خیال داستان اردو لکھہ رہے ہیں۔ لاہور سے اِس سال ایک سالنامہ شایع ہوا ہے کاروان کے نام سے۔ اس رسالے میں اسی کتاب کا ایک حصہ چھپا ہے جس کی سرخی ہے محکوم کا اثر حاکم پر۔ جناب خیال فرماتے ہیں —

" ان ادیبوں کی زبانوں پر فارسی لفظیں چڑہ گئیں اور ہمارے بہاری نے آنکھوں کی تعریف میں اپنے بے مثل دوہے امیں ہلاہل مدہ بھرے سیت شام رت نار - جیت مرت جھک جھک پرت جہ چتوت یکبار ۔ میں فارسی کو بھی محبت سے یاد کیا اور شام یعنی سانجھہ کی بہار دکھادی اور اس یکبار پر ہزار بار ہماری نظر اٹہوادی تو حیرت کی جگہ نہیں ہے "

یہ دوہا بہت مشہور ہے اور بہاری سے منسوب کیا جاتا ہے مگر اس میں شام کے لفظ کے معنی سانجھہ کے نہیں ہیں - یہ لفظ شیام ہے جس کے معنی سانولے کے ہیں اور یہاں مراد آنکھوں کی سیاہی ہے جس کو شاعر نے ہلاہل یعنی زہر سے تشبیہ دی ہے —

اردو کے تبصرہ نگار کو بھی " کھڑی بولی " کے متعلق غلط فہمی ہوئی ہے - صوبجات متحدہ (United Provinces) میں پہاڑی علاقے کی بولیوں کو اور چھوٹے چھوٹے مقامی اختلافات کو چھوڑ کر ہندی کی چار زبانیں بولی جاتی ہیں۔ گورکھپور بنارس وغیرہ مشرقی اضلاع میں بھوج پوری، اودہ

اور اس کے آس پاس الہ آباد تک اودھی ' متھرا اور اس کے نواح میں برج بھاشا اور دلی میرٹھ اور ان کے قرب و جوار میں کھڑی بولی - بعض محقق اس تعداد میں قنوجی کا اضافہ کرتے ہیں - ہندی کی شاعری زیادہ تر اودھي اور برج بھاشا میں تھی - اودھی میں رامچندرجی کے بھگتوں کي مثلاً تلسی داس اور برج بھاشا میں کرشن جی کے بھگتوں کی مثلاً سور داس - کھڑی بولی پہلے نثر کے واسطے استعمال ہوتی تھی- للوجی لال نے فورٹ ولیم کلکتہ میں بیٹھہ کر انیسویں صدی کے آغاز میں پریم ساگر لکھی - اس کے دیباچے کی عبارت ملاحظہ ہو

" ایک سمے ویاس دیو کرت شری مد بھاگوت کے دشم اسکند کی کتھا کو چتر بھج مشر نے دوھے چوپائی میں برج بھاشا کیا سو پا تھہ شالا کے لییے .... سمبت ۱۸۶۰ میں سری للوجی لال کوئی برھمن گجراتی سہر اودیچ آگرے والے نے وس کا سار لے یا مئی بھاشا چھوڑ دلي آگرے کی کھڑی بولی میں کہہ نام پریم ساگر رکھا "

ہندی کے محققین کہتے ہیں کہ چونکہ ہندی کی یہ شاخ دلی کے نواح میں بولی جاتی تھی اس واسطے اردو کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے اور اردو دراصل ہندی کی اس شاخ کی ایک ترجم شدہ شکل ہے اسی وجہ سے ہندی کی اور شاخوں سے کھڑی بولی اردو سے قریب تر ہے - ہندی نثر کی تصنیفات زیادہ تر کھڑی بولی ھی میں ہوئیں اور اب نظم کے واسطے بھی ہندی کے شعرا اس زبان کو استعمال کرتے ہیں -

صوبجات متحدہ کی جن زبانوں کا میں نے ذکر کیا ان میں گرامر کا کہیں کہیں اختلاف ہے مثلاً

اردو	کھڑی بولی	برج بھاشا	اودھی	بھوج پوری
ہونا	ہونا	ہونو	ہوپ	بَھِیل
ہوا	ہویا	بھیو	بھوا	بھیل
ہوگا	ہوگا	ہوےگو	ہوئی	ہوئی

مگر اس کی تفصیل کا نہ یہ موقع ہے نہ اس کی ضرورت۔ جن صاحبوں کو شوق ہو تصانیف ذیل کا ملاحظہ کر کے اپنا اطمینان کر سکتے ہیں

(۱) هندی ساهتیہ کا اتہاس مصنفہ پنڈت رام چندر شکل (انڈین پریس الہ آباد)

(۲) هندی بھاشا اور ساهتیہ مصنفہ بابو شام سندر داس (انڈین پریس الہ آباد)

(۳) گرامیں هندی مصنفہ بابو دهیرندر ورما (ساهتیہ بھون لمیٹڈ الہ آباد)

(۴) هندی بھاشا کا اتہاس مصنفہ بابو دهیرندر ورما (هندوستانی اکیڈمی الہ آباد)

(نوٹ - فاضل مضمون نگار کی یہ تحریر بہت دلچسپ ہے - آخر میں انھوں نے کھڑی بولی کے متعلق بحث فرمائی ہے - اردو کے تبصرہ نگار کی رائے میں کھڑی بولی سے مراد وہ بولی ہے جو شستہ اور ادبی زبان نہیں - یعنی اس لفظ کا استعمال شستہ اور ادبی زبان کے مقابلے میں ہوتا ہے - آج کل بھی یہ لفظ انہیں معنوں میں یعنی گنواری بولی کے لیے بولا جاتا ہے - یہ کوئی خاص زبان یا کسی زبان کی شاخ نہیں ہے - للو جی لال نے بھی غالباً انہیں معنوں میں یہ لفظ استعمال کیا ہے - یعنی وہ بولی جو شستہ نہ تھی اور شاعری میں استعمال نہیں ہوتی تھی - یورپی محققوں کو اس سے مغالطہ ہوا اور انھوں نے اسے ایک خاص زبان قرار دیا - جن مصنفوں کا حوالہ فاضل مضمون نگار نے دیا ہے انھوں نے بھی یورپی محققوں کی تقلید کی ہے - اڈیٹر)

حافظ شیراز کی زندگی پر نئی روشنی

اعتراض کا جواب

از

جناب بشیر احمد ڈار

یہ مضمون، مولوی احتشام الدین کے اعتراض کے جواب میں لکھا گیا ہے جو رسالہ اردو اکتوبر سنہ ۳۰ ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مضمون میں صرف انہی اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے جن کا تعلق خواجہ حافظ کی زندگی اور شاعری کے ساتھ زیادہ گہرا ہے —

(۱) میں نے خواجہ حافظ کی تاریخ ولادت اور عمر کے سلسلے میں، حافظ اسلم صاحب پر اعتراض کیا تھا۔ میں نے تنقید میں صرف اپنے پہلے مضمون کی طرف اشارہ کر دیا تھا جو اردو جنوری سنہ ۲۹ ء میں شائع ہو چکا تھا۔ جہاں میں نے حافظ اسلم کے قیاس کی حقیقت کو واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہاں میں نے یہ ثابت کیا تھا کہ یہ قیاس غلط ہے۔ دلائل کے لیے مندرجۂ بالا مضمون کا حوالہ کافی ہے لیکن معترض نے بھی حافظ صاحب کے قیاس کی تائید میں ایک اور قیاس دوڑایا ہے۔ البتہ اس کی حقیقت اس جگہ واضح کرنی ضروری ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ " مظفر

کے عہد میں جب قریب دو سال شراب بند رہ کر دوا بن گئی اور شجاع کے شروع دور میں کھلی تو حافظ کی عمر چالیس سال تھی چنانچہ فرماتے ہیں ۔

چہل سال رنج و غصہ کشیدیم و عاقبت تدبیر ما بدست شراب دو سالہ بود

اس بیان میں کئی ایک غلطیاں ہیں —

(ا) مظفر کا عہد صرف دو سال نہ تھا بلکہ سنہ ۷۵۴ ھ سے لے کر سنہ ۷۹۰ ھ تک تھا یعنی تقریباً چھہ سال - معترض کو دو سال کا خیال شاید حافظ کے مندرجۂ بالا شعر کے الفاظ "دو سالہ" سے ہوا ہے جو بالکل غلط ہے شراب دو سالہ سے مراد محض شراب کہنہ ہے —

بلکہ درحقیقت اس شعر یا غزل میں حافظ نے اس واقعہ کی طرف کہ مظفر نے شراب بند کردی تھی اور شاہ شجاع نے کھولنے کی اجازت دے دی تھی کوئی اشارہ موجود نہیں اور اگر بقول معترض ہے تو پھر رنج و غم کا زمانہ تو صرف چند سال ہونا چاہئیے تھا یعنی صرف وہی زمانہ جب کہ شراب بند رہی (چھہ سال یا بقول معترض دو سال) نہ کہ چالیس سال - لیکن دراصل اس غزل یا شعر میں اس واقعہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں —

(ب) معترض کا اس شعر سے یہ اندازہ لگانا کہ شاہ شجاع کی تخت نشینی کے وقت حافظ کی عمر چالیس سال تھی، غلط ہے۔ غزل سے کسی طرح بھی معلوم نہیں ہوتا کہ حافظ نے یہ غزل شاہ شجاع کے واسطے یا اس کے زمانے میں لکھی۔ غزل کے آخری دو اشعار ہیں —

آں شاہ تند حملہ کہ خورشید شیر گیر پیشش بروز معرکہ کمتر غزالہ بود

دیدم کہ شعر دلکش حافظ بہ مدح شاہ ہر بیت ازاں سفینہ بہ از صد رسالہ بود

ان اشعار سے تو ظاہر ہے کہ کسی بادشاہ کی مدح کی گئی ہے اور الفاظ سے یہ بھی اندازہ ہوسکتا ہے کہ شاید امیر مظفر کی تعریف ہو۔ لیکن ہم وثوق سے پھر بھی نہیں کہہ سکتے کہ ان اشعار میں حافظ نے کس کی طرف اشارہ کیا ہے اور اگر ہم معترض کے قیاس کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم بھی کرلیں یعنی یہ کہ یہ اشعار شاہ شجاع کے متعلق ہیں تو پھر کیا معترض اس سے یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ یہ شاہ شجاع کی تخت نشینی کے وقت لکھے گئے تھے؟ کم از کم ظاہری شواہد تو اس بیان کی تائید سے بالکل قاصر ہیں —

(۲) اس کے بعد میں نے مظفر کی فتح شیراز کی تاریخ سنہ ۷۵۴ ھ لکھی تھی اور شاہ شجاع کی تخت نشینی کی تاریخ سنہ ۷۶۰ ھ ۔ لیکن معترض کے نزدیک یہ دونوں غلط ہیں۔ پیشتر اس کے کہ میں اس کا جواب لکھوں یہ بھی بیان کردینا مناسب سمجھتا ہوں کہ خود حافظ اسلم صاحب کے مطابق بھی وہ تاریخیں جو میں نے دی ہیں' ٹھیک ہیں۔ چنانچہ حیات حافظ صفحہ ۲۰ پر کہتے ہیں کہ " سنہ ۷۵۴ ھ میں امیر مظفر نے اس کو غافل پا کر حملہ کردیا اور دوسری جگہ صفحہ ۲۳ میں رقم طراز ہیں کہ "اس (مظفر) کے بیٹے شاہ شجاع نے جب دیکھا کہ عنقریب ملک میں بغاوت ہونی چاہتی ہے تو امراء لشکر کے ساتھ متفق ہو کر سنہ ۷۶۰ ھ میں مظفر کو گرفتار کر لیا ... اور خود تخت سلطنت پر بیٹھا ... " —

اب ہمیں اصل معاملہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے تاکہ "صحیح تاریخ کی فاش" غلطیاں جو تنقید میں رہ گئی ہیں ان کو معترض کے اعتراض کی روشنی میں واضح کیا جائے —

معترض کہتا ہے کہ شاہ ابواسحاق سنہ ۷۵۰ ھ میں قتل کیا گیا اور اس کی تائید میں دیوان حافظ سے دو قطعات تاریخ پیش کئے ہیں —

(ا) سنبل و سرو وسمن' یاسمن و سوسن و گل هست تاریخ وفات شہ سنبل کا کل
جمعہ و بست و یکم ماہ جمادی الاول درپسین بود کہ پیوستہ شد از جزو بہ کل

یہ قطعہ نقل کرنے کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ "آخری بیت کے آخری لفظ کل سے اعداد کا مجموعہ سنہ ۵۰ یعنی سنہ ۷۵۰ بر آمد ہوتا ہے۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ آپ کی تحقیق کا پہلا جزو بالکل غلط ہے۔ شعر کے مطالعے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے شعر کا پہلا مصرع تاریخ کے لئے ہے نہ کہ آخری شعر کے دوسرے مصرعہ کے آخری الفاظ۔ پھر لطف مزید یہ کہ لفظ کل سے صرف پچاس نکلتے ہیں۔ ان سے سنہ ۷۵۰ ھ کا اندازہ لگانا بالکل غلط ہے۔ اصل تاریخ دیکھنی ہو تو پہلے شعر کا پہلا مصرعہ ملاحظہ ہو۔ مگر معترض نے جس طرح یہ مصرع نقل کیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ عام دواوین میں یہ مصرع یوں ہے "بلبل و سرو وسمن یا سمن و لالہ و گل"۔ اب اگر ان حروف کو گنا جاے تو تاریخ سنہ ۷۵۸ ھ نکل آتی ہے۔ اس بین دلیل کی موجودگی میں قطعہ کو مسخ کرنا غلطی ہے —

(ب) ذرا دوسرے قطعہ کو بھی دیکھ لیجئے —

بروز کاف و الف از جمادی الاول بہ سال ذال و دگر نون جاهل الاطلاق

... الخ

اس شعر کے آخری مصرع سے تاریخ نکلتی ہے۔ اگر (ذ) اور (ن) کے اعداد کو جمع کیا جاے تو سنہ ۷۵۰ ھ نکلتے ہیں لیکن یہ بالکل غلط ہے۔ پہلی دلیل تو یہ ہے کہ پہلا قطعہ اس کے خلاف شہادت دے رہا ہے۔

اگر ہم پہلے قطعہ کو ویسے ہی رہنے دیں جیسے معترض نے درج کیا ہے تو پھر بھی ان سے سنہ ۷۵۰ھ نہیں نکلتا - معترض کا فرض تھا کہ وہ اس تضاد کو سلجھانے کی کوشش کرتے لیکن بجائے اس کے انھوں نے قیاس دوڑایا اور لفظ کل ہی سے (جس کے عدد صرف ۵۰ ہوتے ہیں) سنہ ۷۵۰ھ بنا کھڑے کئے - دوسری دلیل یہ ہے کہ اس شعر کا مصرع ثانی عام دیوانوں میں غلط چھپا ہوا ہے - ایک قلمی نسخہ دیوان حافظ (جو پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے) میں یہ مصرع یوں درج ہے - " بہ سال ذال ودگرنون و حا علی الاطلاق " یعنی اگرچہ لکھا " حا " تھا لیکن کسی کاتب نے " حا " کو نون کے نقطہ سے ملا کر علیحدہ لکھ دیا اور بجائے " ... و حا علی الاطلاق " کے " جاعل الاطلاق" بنا دیا - چنانچہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے لئے ہمیں ذال اور نون کے علاوہ ' ح ' بھی جمع کرنی ہوگی جس سے سنہ ۷۵۸ھ نکلتے ہیں —

واقعہ صرف اتنا ہے کہ سنہ ۷۵۴ھ میں ابواسحاق کو شیراز میں شکست ہوئی وہاں سے وہ اصفہان بھاگ گیا جہاں تھوڑی دیر بعد مظفر نے حملہ کیا اور آخر کار سنہ ۷۵۸ھ میں قتل ہوا - اس بیان کے لئے اگر معترض نے حیات حافظ ہی دیکھ لی ہوتی تو معاملہ صاف ہو جاتا —

اس کے بعد آپ فرماتے ہیں - " الغرض ان قطعات تاریخ سے قطعاً ثابت ہے کہ ناقد نے چار پانچ سال پیشتر جو واقعات گذر چکے تھے ان کو چار پانچ برس بعد قرار دیا ہے " افسوس ہے کہ یہ فیصلہ خود ان کے حق میں وارد ہوتا ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ فرق تو درحقیقت آٹھ برس کا تھا -

میں نے ابواسحاق کی وفات سنہ ۷۵۸ ھ قرار دی تھی اور ان کے دعوے کے نزدیک یہ سنہ ۷۵۰ ھ ہے اور ان آٹھہ برس کے فرق کو چھوڑ کر آپ چار پانچ برس کیسے کہہ سکتے ہیں ؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھہ خاص غرض پنہاں ہے - اگر معترض کا حساب درست ہو تو جہاں سنہ ۷۵۸ ھ کی بجاے سنہ ۷۵۰ ھ ہے تو یقیناً سنہ ۷۶۰ ھ جو شاہ شجاع کی صحیح تاریخ تخت نشینی ہے ' سنہ ۷۵۲ ھ ہونی چاھئے اور پھر حافظ کی پیدائش معترض کے حساب سے (۵۲-۴۰=۱۲) سنہ ۷۱۲ ہونی چاھئے - لیکن یہ تو حافظ اسلم کے بیان کے بالکل منافی ہے اور یہی وہ وجہ تھی جس نے معترض کو مجبور کیا کہ بجاے آٹھہ سال کے صحیح فرق کے صرف چار پانچ سال کا فرق پیش کرے اور اس سے شاہ شجاع کی تاریخ تخت نشینی سنہ ۷۵۵ قرار دیکر ' چالیس کو اس میں سے منہا کرے تاکہ سنہ ۷۱۵ ھ نکل آئے - اور یہی وہ سنہ ہے جو حافظ اسلم نے خواجہ حافظ کا سنہ پیدائش لکھا ہے - لیکن سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ معترض نے اول تو خود حافظ اسلم کی روایت کی تردید کی اور اس کے برعکس شاہ شجاع کی تاریخ تخت نشینی سنہ ۷۵۵ ھ بتاتے ہیں لیکن بعد میں اپنی غلطی تاریخ کی بنا پر ' حافظ اسلم کی پیش کردہ تاریخ ولادت کی حمایت کرتے ہیں - یہ بڑی سخت غلطی کا ارتکاب ہے -

ان سب پر طرہ یہ ہے کہ جس شاعر کی بنا پر معترض نے اپنے تمام دلائل پیش کئے ہیں وہ کچھہ ایسا موہوم سا ہے کہ اس سے کسی خاص واقعے کیطرف اشارہ نہیں پایا جاتا (جیسے کہ ابھی اوپر دکھایا گیا ہے) اس لئے آپ کا سب قیاس محض با در ہوا رہ جاتا ہے - ٹھیک تاریخ ولادت سنہ ۷۱۵ ھ نہیں ' سنہ ۷۲۲ ھ ہے - اس کے متعلق جتنے دلائل میں نے پیش کئے ہیں ان کے لئے رسالہ اردو بابت جنوری سنہ ۲۹ ع کیطرف اشارہ کردینا کافی ہے -

(۳) حیات حافظ کا تاریخی حصه بہت کچھ قابل ترمیم ہے - چنانچه تنقید میں ' میں نے چند ایک ایسی اغلاط کو ظاہر کیا تھا - خاصکر تاریخ اینجو کے سلسلے میں مولف نے بہت غلطیاں کی ہیں - اس زمانے کی تاریخ اگرچه بذات خود بے معنی ہو لیکن حافظ کی زندگی کے متعلق جس شخص کو صحیح اندازہ لگانا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ ان تاریخی حالات کو واضح طور پر معلوم کرے - اگر مولف حیات حافظ نے اسے چھوڑ دیا تو میرے نزدیک یہ اُن کی کتاب کے نقائص میں سے ایک نقص ہے - تاریخ اینجو پیچیدہ سہی لیکن نه اتنی طویل جیسا که معترض نے اس کا نقشه کھینچا ہے - اگر حافظ اسلم اس کو اپنی کتاب میں درج کرلیتے تو سوائے ایک دو صفحوں سے زیادہ جگه درکار نه ہوتی - مگر کم از کم یه فائدہ تو ضرور ہوتا که کتاب کا تاریخی حصه بھی صاف اور درست ہوجاتا اور مزید لطف یه ہے که ان اغلاط کو پڑھنے کے بعد بھی معترض اصرار کرتا ہے که جو کچھ مولف حیات حافظ نے لکھا وہی درست ہے —

پھر معترض نے ابن بطوطه اور روضۃالصفا وغیرہ کی سندوں کے مقابلے کی گفتگو کو چھیڑا ہے - ہم مانتے ہیں که ہمعصر کی بات زیادہ قابل غور ہوتی ہے لیکن اگر وہ راوی ہی معتبر نه ہو تو پھر اس کی روایت کی حقیقت بے معنی رہ جاتی ہے - چنانچه میں نے تاریخ اینجو کے سلسلے میں ' فٹ نوٹ میں صاف صاف وجوہ پیش کئے تھے جن کی بنا پر ہم ابن بطوطه کی روایت قبول نہیں کرسکتے - معترض کو چاہئے تھا که ان وجوہ کو بے بنیاد ٹھیراتے اور پھر دعوے کرتے که حافظ اسلم کا بیان درست ہے - لیکن یه کام اُن سے نه ہو سکتا تھا اور نه ہوا - خود حافظ اسلم نے بھی

شاید یہ بیان ابن بطوطہ سے نہیں لیا - کیونکہ انھوں نے اپنے ماخذ کیطرف کوئی اشارہ نہیں کیا اور یہ نقص حیات حافظ میں ہر جگہ موجود ہے - جب ہم کو صحیح ذریعے سے معلوم ہوجائے کہ ابن بطوطہ کے نوشتہ کاغذات سب ضائع ہوگئے تھے اور جو کچھہ اُسے یاد رہا ' صحیح یا غلط ' وہی اس نے لکھہ ڈالا تو اس سے اُس کے بیان کردہ واقعات کا اعتبار ضائع ہوجاتا ہے اور پھر ان سب پرطرہ یہ ہے کہ موجودہ سفر نامہ ' ابن بطوطہ کے پر از نقائص سفر نامے کا ایک خلاصہ ہے - اس سے ابن بطوطہ کی روایت کا غیر معتبر ہونا واضح ہے - علاوہ ازیں ابن بطوطہ عربی ہونے کی حیثیت سے ایرانی طریقۂ بودوماند سے نا واقف تھا - یہ اجنبیت بھی سفر نامے کیلئے باعث نقص ہے - اگر معترض اس روایت کو قبول کرتے ہیں تو چاہئے تھا کہ وہ وجوہ پیش کرتے لیکن اس نے اس معاملے کو چھوا تک نہیں - چنانچہ اب معلوم ہوا کہ یہ معاملہ محض " اختلاف روایت " کی بنا پر چھوڑا نہیں جا سکتا - روایتیں اگرچہ دو ہیں لیکن حافظ اسلم کو چاہیے تھا کہ دونوں کو پیش کرتے اور پھر ان میں سے ایک کو پسند کرنے کی وجوہ بیان کرتے - ایک روایت کا غیر معتبر ہونا ہم ثابت کرچکے ہیں - اس لئے معاملہ صرف اختلاف روایت کا نہیں بلکہ ایک طرف درست روایت کا قبول کرنا اور دوسری طرف بالکل غیر معتبر روایت کا قبول کرنا ہے - اس کے بعد وہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام اور فارس نامہ ناصری پر اعتراض شروع کرتے ہیں - مولفان انسائیکلوپیڈیا نے صاف لکھا ہے کہ ہم نے جو کچھہ لکھا ہے وہ شیرازنامے سے ماخوذ ہے اور شیراز نامہ خود ابواسحق کے ایک ہمعصر کی تصنیف ہے - یہ درست ہے کہ حیات حافظ کی تصنیف کے وقت انسائیکلو پیڈیا موجود نہ تھا اور جو چیز حافظ اسلم کو نہ مل سکی وہ انھوں نے درج نہیں کی - لیکن

اس سے حافظ اسلم کی کتاب غلطی سے بری الذمہ نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر وہ کسی پرانی مستند فارسی تاریخ کا مطالعہ کرتے تو یہ غلطیاں اُن کی کتاب میں موجود نہ ہوتیں - فارس نامۂ ناصری کے متعلق بھی معترض نے عجیب قیاس دوڑایا ہے - اس کتاب کا نام شاید آپ نے سنا نہ ہوگا فوراً سمجھہ لیا کہ یہ فرس نامۂ رنگین ہوگا جو گھوڑے کے علاجوں کے متعلق ہے - اب ذرا اندازہ لگائیے کہ یہ قیاس کیسا غلط ہے - اگر قیاس ہی دوڑانا تھا تو کسی تاریخ کا نام لے دیا ہوتا - میں فارس نامۂ ناصری کو تاریخ کے سلسلے میں پیش کررہا ہوں اور آپ اسے گھوڑوں کے علاجوں کی کتاب بتا رہے ہیں —

اس کے بعد معترض نے پھر ابواسحق کے قتل اور شاہ شجاع کے تخت نشین ہونے کی تاریخ کیطرف اشارہ کیا ہے اور بزعم خود سنہ ۷۵۰ ھ اور سنہ ۷۵۵ ھ کو ٹھیک سمجھکر، روضۃ الصفا اور اسلامی انسائیکلو پیڈیا کی اسناد پر بھی شک کیا ہے - لیکن میں ابھی دکھا چکا ہوں کہ یہ دونوں تاریخیں غلط ہیں - اگر وہ صرف قطعات حافظ پر ہی اکتفا کرتے تو انہیں اپنے اعتراض کی حقیقت معلوم ہوجاتی - کیونکہ جیسا کہ پہلے دکھا یا جاچکا ہے - ایک قطعے سے سنہ ۷۵۸ ھ نکلتا ہے - لیکن معترض، خدا جانے کس وجہ سے، اس کو فراموش کرگئے اور ایک غلط طبع شدہ قطعے پر اپنے اعتراض کی بنا رکھی - پھر ایسے غلط علم کی بنا پر، روضۃالصفا اور شیراز نامہ جیسی مستند تواریخ پر شک کرنا بہت بڑی جسارت کا کام ہے —

(۳) معترض کا چھٹا اعتراض بے معنی ہے - میرے نقطۂ نگاہ سے حافظ اسلم نے تاریخی غلطی کی اور دوسری جگہ اس کی تردید بھی کردی - لیکن معترض، حافظ اسلم کے دوسرے بیان کو پڑھتے نہیں اور پہلے بیان

کی غلطی پر اڑ بیٹھتے ہیں —

میں نے اپنے دعوے کی تائید میں حبیب السیر کی عبارت درج کی تھی لیکن معترض کے نزدیک اس کتاب کی کوئی وقعت نہیں کیونکہ اسی عبارت میں ہی ابواسحق کی شکست شیراز کی تاریخ سنہ ۷۵۴ ھ درج ہے اور معترض کے نزدیک یہ تاریخ سنہ ۷۵۰ ھ ہے لیکن جیسا کہ پہلے دکھایا جا چکا ہے معترض نے اس معاملے میں غلطی کی ہے۔ سنہ ۷۵۴ ھ کے لئے نہ صرف حبیب السیر کی سند لاسکتے ہیں بلکہ خود 'حافظ اسلم' کے نزدیک بھی یہی سن درست ہے۔ اگر محض سن کی وجہ سے حبیب السیر کی سند غلط ٹھیرائی جاسکتی ہے تو 'حیات حافظ' کی سند تو بہ درجۂ اولیٰ غلط ہوگی۔ اس کے بعد معترض کے 'حیات حافظ' کو صحیح ثابت کرنے کے دعوے کتلے بے معنی رہ جاتے ہیں —

معاملہ صرف اتنا ہے کہ 'ابو اسحق' پر جب امیر مظفر نے (سنہ ۷۵۴ ھ میں) حملہ کیا تو 'حافظ اسلم' نے ایک جگہ تو لکھا کہ یہ حملہ 'ابو اسحق' کی بے خبری میں ہوا اور دوسری جگہ اس کا با خبر ہونا بیان کیا۔ میں نے تاریخ کے حوالے سے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ 'ابو اسحق' بے خبر نہیں تھا مگر معترض کا دعویٰ ہے کہ وہ بے خبر تھا اور اپنے دعوے کی دلیل میں 'حافظ' کا مندرجۂ ذیل شعر پیش کرتے ہیں: —

دیدی آں قہقہۂ کبک خراماں حافظ کہ ز سر پنجۂ شاہین قضا غافل بود

لفظ "غافل" سے استدلال کیا گیا ہے۔ لیکن اس بیان میں معترض نے دو جگہ سخت ٹھوکر کھائی ہے: —

(الف) پہلی غلطی تو سن کی ہے۔ یہ شعر 'ابو اسحق' کی وفات کے بعد

لکھا گیا اور اس کا سن وفات سنہ ۷۵۸ ھ ہے' جیسا کہ حافظ کے
قطعات سے ثابت ہے۔ اس لیے اس شعر سے سنہ ۷۵۴ ھ کے حملۂ
شیراز کے متعلق کسی بات کا استنباط کرنا بالکل غلط ہے —

(ب) دوسری غلطی' شعر کے معنی کے متعلق ہے۔ "کبک خراماں" سے ہم
'ابو اسحق' کی طرف اشارہ سمجھہ سکتے ہیں چونکہ غزل میں
اس کے ما قبل شعر میں 'ابو اسحق' کا نام موجود ہے لیکن "شاہین
قضا" سے 'مظفر' کا اندازہ لگانا محال ہے۔ آخری مصرع کے معنوی
معنی ہیں کہ "وہ اپنی موت سے بے خبر تھا" موت کی بے خبری
سے حملے کی بے خبری کا قیاس کرنا بالکل غلط ہے —

(۴) معترض کا آٹھواں اعتراض بھی پہلے اعتراضات کی طرح غلط ہے۔
'حیات حافظ' میں لکھا ہے کہ "حاجی قوام الدین حسن نے خواجہ
'حافظ' کے لیے ایک مدرسہ قائم کردیا تھا" میں نے رسالہ اُردو
جنوری سنہ ۲۹ ع میں اس خیال کی تردید کی تھی۔ چنانچہ میں
نے اس کا اعادہ فضول سمجھا اور تنقید میں اسی مضمون کی
طرف اشارہ کر دیا۔ مگر معترض نے وہ مضمون پڑھا نہیں اور یونہی
اعتراض شروع کر دیا —

میں نے اپنے تردیدی مضمون میں اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ
'حافظ' کا واقعی ایک مدرسے سے تعلق تھا۔ 'حافظ' کے علم و فضل کے
متعلق دیوان میں کافی شہادت موجود ہے۔ اور میں نے اس سے کبھی
انکار نہیں کیا۔ اس کے علاوہ واقعی خواجہ 'حافظ' اور حاجی قوام الدین حسن
کا تعلق بھی تھا۔ اگر معترض میرے مذکورۂ بالا مضمون پڑھ لیتے تو کم
از کم انہیں اتنے اشعار جمع کرنے اور رسالۂ اُردو کے دو تین صفحات

ضائع کرنے کی ضرورت نہ رہتی۔ مدرسے میں درس و تدریس اور آپ کا فضل و علم ایک طرف اور حاجی قوام الدین حسن سے تعلق دوسری طرف — یہ دونوں تسلیم شدہ باتیں ہیں۔ لیکن اب سوال یہ ہے: آیا یہ مدرسہ جس میں حافظ درس دیتے تھے' حاجی 'قوام الدین حسن' کا بنایا ہوا تھا؟ مولف 'حیات حافظ' نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک اس کا جواب نفی میں ہے۔ معترض کا اعتراض تب حق بجانب ہوتا جب وہ یہ ثابت کرتے کہ یہ مدرسہ واقعی 'حاجی قوام الدین حسن' کا بنا کردہ تھا۔ لیکن وہ یہ ثابت کرنے سے قاصر ہیں —

'خواجہ حافظ' کا واقعی ایک مدرسے سے تعلق تھا جس میں وہ درس دیتے رہے۔ لیکن وہ مدرسہ حاجی 'قوام الدین عبد اللہ' کا مدرسہ تھا جو شاہ 'شجاع' کے زمانے کا آدمی تھا۔ اور وہ مدرسہ خود شاہ 'شجاع' کے حکم سے بنایا گیا تھا۔ تاریخ کی کتب میں کسی ایسے مدرسے کا مذکور نہیں جو حاجی 'قوام الدین حسن' نے صرف خواجہ 'حافظ' کے لیے تیار کیا ہو۔ پھر آپ فرماتے ہیں: "... مگر یہ تردید (یعنی مدرسۂ حاجی قوام کے "قیاس" کی تردید) رسالۂ اُردو کے جنوری نمبر کا محض حوالہ دے دینے سے اس مضمون میں ثابت نہیں ہو جاتی۔ اس کو ملاحظہ کئے بغیر بھی حاجی قوام الدین حسن کے اس سلوک کی روایت (نہیں بلکہ "قیاس" کہنا چاہیے) کو بہ وجوہات چند قریب باور کیا جا سکتا ہے" صفحہ ۴۷۳-۷۴ —

اس بیان میں اول تو یہ غلطی ہے کہ معترض کو بغیر مضمون پڑھے کوئی حق حاصل نہ تھا کہ وہ میری تنقید پر اعتراض کرتے۔ کیا یہی وہ اُصول ہے جس کی وہ اُردو دانوں میں کمی کے متعلق سرتا پا گریاں و نالاں

ھیں ؟ دوسروں پر یہ اعتراضات کہ تنقید کے صحیح مفہوم سے بھی ان کو بے بہرہ سمجھنا اور آپ کی یہ حالت کہ مخالف کے دلائل سنے بغیر ھی اس پر اعتراضات کی فہرست تیار کرنا —

دوسری غلطی یہ ھے کہ جو اشعار معترض نے اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کئے ھیں وہ بالکل آپ کے دعوے کی تقویت نہیں کرتے۔ آپ فرماتے ھیں : "حاجی قوام کا انتہا درجہ غنی اور متمول ھونا لہذا ایک مدرسے کی تعمیر پر قادر ھونا اس کے قطعۂ تاریخ وفات موجودہ دیوان حافظ کے پہلے ھی شعر سے مسلم ھے۔ "سرور اھل غنائم" کو تین دیواروں پر ایک سائبان ڈال دینا کیا مشکل تھا..." اس میں کوئی شک نہیں کہ حاجی 'قوام' امیر تھا' سخی تھا' سب کچھ تھا۔ لیکن اس قطعۂ تاریخ یا کسی اور شعر سے جو معترض نے دیوان 'حافظ' سے اکٹھے کئے ھیں' یہ بالکل ظاھر نہیں ھوتا کہ حاجی قوام نے ان کے لیے مدرسہ بنایا تھا —

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اشعار خواجہ 'حافظ' اور حاجی قوام کے تعلقات خوش کی خبر دیتے ھیں۔ لیکن وہ تعلقات کیسے تھے ؟ یہی کہ حاجی 'قوام' کے دربار سے آپ کو بہت زیادہ وظیفہ ملتا رھتا تھا۔ اور اس لیے آپ نے ان کی تعریف بہت جگہ کی ھے۔ تقریباً ھر جگہ حاجی قوام کی تعریف بخشش و جود سے وابستہ ھے۔ اس سے البتہ یہ عقدہ کھل جاتا ھے کہ خواجہ 'حافظ' کو امیروں کے دربار سے وظیفہ ملا کرتا تھا اور اس کے صلے میں آپ ان کی تعریف بھی کیا کرتے تھے۔ اس مضمون کے متعلق مفصل بحث کچھ تنقید میں گزر چکی ھے اور کچھ ابھی آے گی۔ انشاالله —

(۵) معترض نے اب امیر 'مظفر' اور شاہ 'شجاع' کے تعلقات پر بحث

شروع کی ہے۔ امیر 'مظفر' کے کیریکٹر کے متعلق جو کچھ 'حافظ اسلم' نے لکھا ہے وہ درست ہے۔ وہ سخت طبیعت کا آدمی تھا۔ اس نے کئی مجرموں کو بڑی بے رحمی کے ساتھ قتل کیا تھا۔ خود 'حافظ' کا شعر موجود ہے:—

سروران را بے گنہ می کردحبس گردناں را بے سخن سر می برید

لیکن ان سب باتوں کے باوجود تاریخ کے اوراق عام بغاوت سے بالکل خاموش ہیں اگر کوئی بغاوت ہوتی تو یقیناً حبیب السیر اور روضۃ الصفا جیسی مستند کتب تاریخ میں ان کا مذکور ضرور ہوتا۔ روضۃ الصفا کے صاف الفاظ موجود ہیں کہ چونکہ امیر 'مظفر' اپنے فرزند شاہ 'شجاع' سے اس کی شراب خوری اور عیاشی کی وجہ سے ناراض تھا اور چاہتا تھا کہ اپنے چھوٹے بیٹے کو ولی عہد مقرر کرے' اس لیے شاہ 'شجاع' نے اپنے باپ کو اندھا کردیا اور خود تخت پر بیٹھ گیا۔ اب معترض کے اعتراض کو بھی سنیے۔ آپ فرماتے ہیں: " امیر مظفر " کی سخت گیری ' بے رحمی ' ناحق کشی ' دشنام دہی ...... اس کا نتیجہ اگر حیات حافظ میں عام بغاوت کا ہو جانا لکھ دیا گیا تو یہ کوئی بعید از قیاس نہیں ...... اس بیان کے بعد پھر وہی معاملہ چھڑ جاتا ہے۔ معترض کا "قیاس" ایک طرف اور تاریخ کی شہادت دوسری طرف۔ آپ جس کو چاہیں قبول کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد آپ اپنے قیاس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کئی اور قیاسات اور مثالیں پیش کرتے ہیں - آپ یوں رقمطراز ہیں - " مولف حیات حافظ کے یہ سب قیاسات انھی عبارات کے بین السطور میں پڑھے جا سکتے ہیں جو تنقید میں تردید کے طور پر پیش ہوئی ہیں ... ممکن ہے کہ معترض کو اس واقعے کے متعلق کوئی خاص اطلاع ہو لیکن اگر ظاہری آنکھیں اور

انسانی دماغ کا کام ہے تو یقیناً ہم ان عبارات میں کوئی اشارہ عام بغاوت کی طرف نہیں پاتے - البتہ یہ چیز واضح ہے کہ شاہ شجاع کی نیت یقیناً خود غرضی پر مبنی تھی - اور امیر مظفر کی اس سے ناراضگی کی وجہ تعیش اور شراب خوری تھی —

آپ پھر فرماتے ہیں کہ " شجاع کے پاس خود کوئی فوج و سامان نہ تھا - باپ کی ہی قوت و حشمت تھی - شجاع نے اس کی سازش سے ایسے قوی بازو باپ کو چشم زدن میں اسیر کرلیا یہ بغیر اس کے ممکن نہیں ہوسکتا کہ مظفر کی سختیوں اور گالیوں سے سب نالاں اور برگشتہ ہوچکے تھے " یہ بیان غلط در غلط ہے - اول تو شاہ شجاع نے کسی فوج کے ساتھ باپ کا مقابلہ نہیں کیا تھا - واقعہ صرف اتنا ہے کہ جب امیر مظفر قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا' شاہ شجاع نے موقع پاکر اس کو پکڑ لیا اور قید کرکے آنکھیں نکال ڈالیں - دوسرے' ایسا واقعہ ایک عادل اور نرم مزاج بادشاہ کے ساتھ بھی پیش آسکتا ہے - ہندوستان کی تاریخ میں جلال الدین خلجی بڑا عادل اور نرم مزاج بادشاہ تھا - وہ سخت گیر نہ تھا' ظالم نہ تھا' دشنام گو نہ تھا - رعایا اس سے نالاں نہ تھی' لیکن باوجود ان سب خوبیوں کے اس کے بھتیجے علاءالدین خلجی نے اسے قتل کر ڈالا - اور یہ فعل محض خود غرضی پر مبنی تھا - یہی حال شاہ شجاع اور امیر مظفر کا ہے - شجاع کا فعل تمام تر خود غرضی پر مبنی تھا اور امیر مظفر کا اس کو تخت سے محروم کرنے کا ارادہ اس کی بدمعاشی' شراب خوری اور دیگر ایسی ہی غیر اسلامی حرکات کی وجہ سے تھا —

اس کے بعد آپ رقمطراز ہیں کہ " شاہ شجاع اس بغاوت کے

وقت ... قید قفس میں تھا ۔ لوگوں نے ہی اس کو قید سے نکال کر اپنا سردار بنایا ' تخت پر بٹھایا ...'' بڑے افسوس کی بات ہے کہ معترض بھی حافظ اسلم کی طرح اپنے ماخذ کو بیان کرنے کا عادی نہیں ۔ کسی تاریخی کتاب میں یہ واقعہ درج نہیں ۔ دیوان حافظ کی نہ کسی غزل اور نہ کسی قطعے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے ۔ اور نہ حافظ اسلم نے ہی اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ معلوم نہیں معترض نے اس واقعے کو کہاں سے نقل کیا ہے !

(۶) دسواں اعتراض حافظ کی شاعری کے متعلق ایک اہم سوال ہے ۔

کئی اشخاص کا خیال ہے کہ حافظ نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا ۔ اس زمرے میں حافظ اسلم اور معترض دونوں شامل ہیں ۔ لیکن میں نے اپنی تنقید میں صاف بتا دیا ہے کہ حافظ نے کئی قصیدے لکھے ہیں ۔ البتہ یہ دلیل کہ چونکہ یہ قصیدے عبید زاکانی ' خواجو اور سلمان کے ہاں نہیں ملتے اس لیے ضروری حافظ کے ہیں ' بہت کمزور ہے ۔ مگر اس کے باوجود بھی ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ یہ قصیدے حافظ کے ہیں ۔ کیونکہ کئی پرانے نسخوں میں موجود ہیں ۔ خود محمد گلندام نے دیباچے کو ختم کر کے یہ الفاظ لکھے ہیں :

" وھو من نتائج طبع اللطیف فی القصائد فی مدح خواجہ محمد ...''

اور اس کے بعد ایک قصیدہ درج کیا ہے جو قوام الدین والدنیا محمد بن علی کی تعریف میں ہے ۔ اگر اس عبارت کو غور سے دیکھا جائے تو اس کی کافی شہادت ہے کہ حافظ نے اس قصیدے کے علاوہ دوسرے قصیدے بھی لکھے ۔ چنانچہ دیوان میں ہمیں مندرجۂ بالا قصیدے کے

علاوہ کئی اور قصائد بھی ملتے ہیں۔ ایک ابواسحق کی مدح میں، ایک شاہ شجاع کی مدح، ایک جلال الدین تورانشاہ اور ایک شاہ منصور کی مدح میں۔ ان کے علاوہ کئی قطعات بھی ہیں جن میں حافظ نے وزیروں اور امیروں کی تعریف کی ہے اور اُن سے وظیفہ طلب کرنے کے لیے تقاضا کیا ہے —

آپ فرماتے ہیں کہ خاقانی، انوری، منوچہری، سلمان ساوجی، عرفی وغیرہ کے قصائد کے مجلدات ضخیم ہیں۔ ان کے مقابلے میں حافظ کے قصائد کا کوئی مجلد نظر نہیں آتا۔ اس سے آپ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ انہوں نے کوئی قصیدہ تصنیف ہی نہیں کیا۔ کتنی ناقص دلیل ہے۔ اگر انہوں نے خاقانی وغیرہ کی طرح قصائد کی کوئی ضخیم جلد تصنیف نہیں کی تو کیا اس سے یہ مطلب ہے کہ انہوں نے تھوڑے قصائد بھی نہیں لکھے؟ زیادہ کی نفی سے ضروری نہیں کہ تھوڑے کی بھی نفی ہوجائے۔ زمانے کا اقتضا تھا۔ خاقانی وغیرہم کے زمانے میں بادشاہ تھے۔ درباری شاعر تھے وہ قصیدے کہتے تھے۔ لیکن حافظ کے زمانے میں زیادہ امن نہ تھا۔ ابواسحق کے زمانے میں ان کی شاعری ابھی ترقی پر نہ تھی۔ اور شاہ شجاع کو حافظ سے کوئی عقیدت نہیں تھی * البتہ شاہ منصور کو حافظ سے عقیدت تھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تمام دیوان میں بہت زیادہ تعریف شاہ منصور کی پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ساقی نامے میں بھی حافظ نے اسی کی تعریف کی۔ اور ساقی ناموں کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شاعر نے ساقی نامے میں بھی بادشاہ کی مدح سرائی کی ہو۔ لیکن شاہ منصور کے علاوہ ابواسحق، شاہ شجاع،

---

* دیکھو حیات حافظ مصنفۂ اسلم صاحب جیراج پوری —

سب کی تعریف میں قصیدے کہے حتیٰ کہ ان بادشاہوں کے وزیروں' قوام الدین والد نیا محمد ابن علی' جلال الدین تورانشاہ کی مدح میں بھی قصائد موجود ہیں —

اسی سلسلے میں بہتر ہوگا اگر حافظ اسلم کے خیالات پر بھی نئے سرے سے روشنی ڈالی جائے —

اس میں کوئی شک نہیں کہ دیوان حافظ میں دوسرے شعراء کے بہت سے اشعار موجود ہیں۔ لیکن اس کے دفعیے کے لیے یہ بہتر بچاؤ نہیں ہوسکتا کہ بہت سی وہ چیزیں جو حافظ کی ہیں' ان کو بھی دیوان حافظ سے خارج سمجھا جائے۔ حافظ اسلم نے اپنی کتاب حیات حافظ میں یہی غلط رویّہ اختیار کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "غزلوں کے علاوہ اور جو چیزیں مثلاً قصیدے' ترکیب بند' ترجیع بند' مغنی نامہ' ساقی نامہ وغیرہ ہیں۔ ان سب کا صحیح نسخوں میں پتہ نہیں ہے ..." ص ۹۵۔ خدا جانے حافظ اسلم کے نزدیک صحیح نسخہ کون سا ہوسکتا ہے؟ آپ نے جو معیار پیش کیا ہے وہ صرف قدامت کا ہے۔ یعنی وہ نسخہ جو دوسرے نسخوں سے زیادہ قدیم ہو۔ مثلاً قصائد کے سلسلے میں آپ فرماتے ہیں (ص ۵۷) کہ برٹش میوزیم میں دیوان کے پرانے قلمی نسخے جس قدر موجود ہیں تقریباً سب بلا قصیدہ ہیں۔ لیکن ذرا ڈاکٹر ریو (Rieu) کی فہرست کتب جلد دوم کا ملاحظہ فرمائیے :-

سب سے پرانا دیوان جو برٹش میوزیم میں موجود ہے سنه ۸۵۵ ھ کا ہے جس میں غزلیات' مثنویات' قطعات اور رباعیات سب کچھ موجود ہیں۔ البتہ قصائد نہیں —

اب اس بیّن ثبوت کی موجودگی میں حافظ اسلم کے بیان کی حقیقت

بالکل بے معنی رہ جاتی ہے۔ اگر بعض نے دیوان حافظ میں بہت کچھ داخل کردیا ہے تو حافظ اسلم اس کے بالکل برعکس کئی چیزوں کو نکال دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ ساقی نامہ، خواجہ حافظ کی تصنیف ہے اور اس کی شہادت عبدالنبی کی تصنیف میخانہ ہے جو جہانگیر کے زمانے کا آدمی ہے۔ اُس نے خواجہ حافظ کے ساقی نامے کو تسلیم کیا ہے۔ اور حافظ اسلم تو اس کو بھی دیوان سے خارج کر رہے ہیں! اب رہا معاملہ قصائد کا اس کے متعلق حافظ اسلم کا فیصلہ صاف ہے کہ حافظ نے کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ اس کے لیے آپ ڈاکٹر ریو (Rieu) کی فہرست کتب کی مدد لیتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ "برٹش میوزیم میں دیوان کے پرانے قلمی نسخے جس قدر موجود ہیں تقریباً سب بلا قصیدہ ہیں - یہ بیان غلط ہے۔ اپنی تائید میں حافظ اسلم فرماتے ہیں: "مثلاً ابوالفتح شیخ محمد بنی اسرائیل ساکن کول کا لکھا ہوا نسخہ جمادی الاول سنہ ۱۰۲۰ ھ کا بلا قصیدے کے ہے۔ عبدالرشید بن مولانا عبداللطیف ترکمان دہلوی کا نسخہ جو ۱۰۵۳ ھ کا لکھا ہوا ہے بلا قصیدے کے ہے۔ ... الخ"۔ لیکن ذرا ڈاکٹر ریو (Rieu) کی فہرست کا بھی ملاحظہ فرمائیے —

(۱) دیوان حافظ - سنہ ۸۵۵ ھ - جس میں غزلیات، مثنویات، قطعات اور رباعیات ہیں —

(۲) دیوان حافظ - ۹۲۱ ھ [Add. 7760] جس میں قصائد (جو مصرع "زدلبری نتواں لاف زد بہ آسانی" سے شروع ہوتا ہے)۔ مثنویات۔ غزلیات۔ رباعیات۔ سب موجود ہیں —

(۳) دیوان حافظ۔ سنہ ۹۸۳ ھ جس میں غزلیات، قصائد (جو مصرع "شد عرصۂ جہاں چوں بہشت بریں جواں" سے شروع ہوتے ہیں)

وغیرہ موجود ھیں —

(۴) دیوان حافظ ۱۰۲۰ ھ۔ اس میں البتہ قصائد موجود نہیں —

اس شہادت کی موجودگی میں ذرا حافظ اسلم کے بیان کو پڑھیے تو فوراً معلوم ھو جاے گا کہ آپ نے جہاں اپنے مطلب کے مطابق کوئی بیان دیکھا وہ لے لیا اور باقی چھوڑ دیا۔ ۱۰۲۰ ھ کے دیوان میں قصائد موجود نہیں اور اس سے آپ تمام قصیدوں سے انکار پر اُتر آتے ھیں۔ آپ کو یہ خیال نہیں آیا کہ اِسی فہرست میں ۹۲۱ ھ اور ۹۸۳ ھ کے دیوان بھی ھیں جن میں قصائد موجود ھیں —

لیکن ان سب سے زیادہ قابل غور شہادت خود محمد گلندام کی ھے جو اوپر درج کی جاچکی ھے۔ ان شہادتوں کی موجودگی میں، حافظ اسلم اور معترض کے خیالات کو تسلیم کرنا بڑا مشکل ھے —

گیارھویں اعتراض میں، معترض، حافظ کی مدافعت کرتے وقت بڑے جوش میں آجاتے ھیں۔ فرماتے ھیں کہ حافظ غزلوں کے آخر میں صرف چند بیت تعریف کی زائد کر دیتے تھے اور بس۔ لیکن جیسا کہ ھم دکھا چکے ھیں انھوں نے قصائد بھی لکھے —

اس کے بعد آپ بارھویں اعتراض میں یوں رقمطراز ھیں کہ ھر وہ شعر جو خواجہ حافظ نے کسی بادشاہ کی مدح میں لکھا، خوشامد اور جھوٹ سے بری ھے۔ اس کے لیے آپ نے ایک شعر کی مثال پیش کی ھے —

مظہر لطف ازل، روشنی چشم امل جامع علم و عمل، جان جہاں شاہ شجاع

اس شعر میں " جامع علم و عمل " ھی معترض کے اعتراض کو غلط بتانے کے لیے کافی ھے۔ آپ نے حبیب السیر کے فقرے پر جو ھنگاسی اور

عارضی عمل کے متعلق لکھا گیا تھا اپنی دلیل قائم کی ہے ۔ حالانکہ تاریخ کی واضح شہادت ہے کہ وہ شرابی تھا اور اس لیے بے عمل ۔ آپ فرماتے ہیں: "حافظ صاحب کا شعر تو غور سے لفظاً و معناً دونوں طرح صحیح اور واقعہ کے مطابق ثابت ہوا لیکن مدعی کے دعوے میں سوائے پھونک کے کیا نکلا ؟ " —

میں اس کے جواب میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتا ۔ دیوان سے مثالیں پیش کر کے دکھانا چاہتا ہوں کہ معترض کا یہ بیان کس حد تک درست کہلا سکتا ہے —

قوام الدین محمد ابی علی کی تعریف میں یوں فرماتے ہیں :

اگر نہ گنج عطاے تو دستگیر شود همه بسیط زمیں رو نہد بہ ویرانی
توئی کہ صورت جسم ترا ہیولیٰ نیست چو جوہر ملکی در لباس انسانی

پہلے شعر میں' اس کو اتنا سخی قرار دیا جاتا ہے کہ تمام روے زمیں کے انسان اسی کی سخاوت سے زندہ ہیں ۔ اگر وہ آج ان کی روزی بند کر دے تو سب کے سب فنا ہوجائیں ۔ نعوذ باللہ یہ شان ربوبیت تو صرف خداے ذوالجلال' رب العالمین کی ہے ۔ کسی بندے کو اس صفت سے متصف کرنا کتنا ظلم ہے اور اس پر بھی معترض فرماتے ہیں کہ حافظ کے مدحیہ اشعار خوشامد سے پاک ہوتے ہیں —

دوسرے شعر میں اس کی پاکی کو اتنا بڑھاتے ہیں کہ اس کو مادی جسم کی آلودگی ہی سے مبرا قرار دیتے ہیں یعنی وہ انسان ہی نہیں ۔ لفظ "توئی" صاف ظاہر کرتا ہے کہ تمام دنیا میں سوائے تیرے کوئی ایسا شخص نہیں جو اس صفت میں ممدوح کا مقابلہ کرسکے ۔ سیرت و عادات میں فرشتہ ہونا تسلیم شدہ بات ہے ۔ لیکن جسمانی حیثیت

سے کسی کو فرشتہ کہنا یعنی اس کو مادی جسم سے ہی مبرا قرار دینا بالکل خوشامد اور مبالغہ ہے !

ساقی نامہ کے وہ اشعار جو حافظ نے منصور کی مدح میں کہے ہیں، ملاحظہ ہوں —

نہ تنہا خراجت دہند از فرنگ   کہ مہراج باجت فرستد ز زنگ
اگر ترک و ہندست وگر روم و چین   چو جم جملہ داری بہ زیر نگین
ہمائیست چترت ہمایون نظار   کہ دارد بسیط زمین زیر پر ... الخ

شاہ منصور بیچارا سنہ ۷۸۹ ھ میں تیمور کے شیراز سے واپس لوٹ جانے کے بعد شیراز پر قابض ہو بیٹھا۔ اور سنہ ۷۹۵ ھ تک حکمراں رہا۔ یعنی کل چھ برس۔ اس زمانے میں کوئی شک نہیں تاریخ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ خاص کر اس کا سلوک خواجہ حافظ کے ساتھ بہت ہمدردانہ تھا۔ لیکن اس کی حکومت کا دائرہ سوائے شیراز یا اس کے علاوہ دو چار اور پرگنات کے کچھ زیادہ نہ تھا۔ اس بنیاد پر کہنا کہ ترک و ہند، روم و چین سب اس کے ماتحت ہیں یقیناً مبالغہ آمیز ہے۔ حتیٰ کہ ان تسخیر شدہ ممالک میں فرنگ (تمام یورپ) اور زنگ (حبش) کا نام بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ لیکن آخری مصرع میں تو یہ مبالغہ حد سے بھی زیادہ تجاوز کر گیا۔ شاعر کہتا ہے کہ نہ صرف ترک و ہندوستان، نہ صرف روم و چین، نہ صرف فرنگ و زنگ بلکہ دنیا کا ہر خطہ شاہ منصور کے زیر نگیں ہے۔ ممکن ہے کہ معترض اپنے قیاسات کو استعمال میں لاکر ان اشعار کی کوئی نئی تاویل پیش کر سکیں اور ثابت کر سکیں کہ یہ اشعار بھی لفظاً و معناً حقیقت کے مطابق ہیں۔ اگر ایسا ہے تو ہمیں انتظار کرنا چاہیے —

(۱۱) آپ فرماتے ہیں:

"تخت نشینی کے قریب ایام کی غزل میں اس (شاہ شجاع) کو جیسا وہ اس وقت تک تھا کہدینا کوئی خوشامد نہ تھی۔ اس سے وہ حرکات کے آخر عہد کی جن کی بنیاد پر تنقید میں اس کو محض شرابی کا خطاب دے دیا گیا ہے۔ ظہور میں آنے میں ہنوز سالہا سال کا عرصہ درمیان میں تھا ..." صفحہ ۷۵۹

اول تو یہ فیصلہ کرنا کہ وہ غزل جس میں حافظ نے شاہ شجاع کی تعریف میں یہ شعر کہا ہے:

مظہر لطف ازل، روشنی چشم امل	جامع علم و عمل، جان جہاں شاہ شجاع

شاہ شجاع کے ابتدائے ایام میں لکھی گئی کسی طرح فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ خود دیوان حافظ میں اس کے لیے نہ کوئی دلیل ہے اور نہ کوئی وجہ۔ ثانیاً آپ فرماتے ہیں کہ وہ تخت نشینی کے وقت تک بالکل جامع علم و عمل تھا۔ لیکن یہ غلط ہے۔ کیا یہ واضح نہیں ہو چکا کہ خود امیر مظفر کی حیات میں اس نے کئی دفعہ شراب پی اور جس کے باعث اس کا باپ اس سے ناراض تھا؟ معاملہ صاف نظر آ رہا ہے کہ حافظ نے شاہ شجاع کی اس حالت میں تعریف کی جب کہ وہ شراب نوش بھی تھا۔ اس مدافعت کا آخری پہلو آپ یوں بیان فرماتے ہیں کہ حافظ نے جب دیکھا کہ شاہ شجاع نے شراب نوشی شروع کر دی ہے تو اس کو نصیحت بھی کی۔ لیکن یہ درست نہیں۔ معترض کی شاہ شجاع کے آغاز عہد اور آخر عہد کی تفریق بالکل غلط ہے۔ شاہ شجاع شہزادگی کے زمانے سے لے کر آخر عہد تک شراب پیتا رہا —

(۷) میں نے حافظ کے قصائد کی مثال پیش کرتے وقت وہ قصیدہ

پیش کیا تھا جو قوام الدین محمد بن علی کی تعریف میں کہا گیا تھا اور جس کی صحت کے لیے میں نے خود محمد گلندام کی شہادت پیش کی ہے۔ اسی قصیدے میں سے میں نے تنقید میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس میں حافظ نے کافی مبالغے سے کام لیا اور دلیل میں جو اشعار پیش کیے تھے ان کو تو معترض نے بالکل چھوڑ دیا۔ اسی لیے میں نے ان کو دوبارہ اس جواب میں درج کر دیا ہے تا کہ ناظرین کو صحیح راے قائم کرنے کا موقع مل جاے لیکن ان میں سے ایک مندرجۂ ذیل شعر لیتے ہیں :

هزار سال بقا بخشدت مدایح من چنین متاع نفیسے بچوں تو ارزانی

اس شعر کی تشریح میں آپ فرماتے ہیں: "اس میں کوئی خوشامد قوام الدین علی کی نہیں ہے۔ اگر کچھ نکلتی ہے تو اس مضمون میں کہ " میرے کلام کے طفیل و تصدق میں تمہارا نام بھی ہزار برس تک قائم رہ سکے گا۔ اس کی کچھ تحقیر ہی نکلتی ہے ... "۔

میں آپ کی اس تشریح سے بالکل متفق ہوں۔ لیکن میں یہ سوال کرنے کی جرات کرتا ہوں کہ مندرجۂ ذیل اشعار مدیحہ کی نسبت آپ کی کیا راے ہے!

به یمن دولت منصور شاهی علم شد حافظ اندر نظم اشعار

شعرم بیمن مدح که صد ملک دل کشاد گوئی که تیغ تست زبان سخنورم

گر به دیوان غزل صدر نشینم چه عجب سالها بندگی صاحب دیوان کردم

کیا ان اشعار میں بھی ممدوح کی تحقیر ہے؟ کیا واقعی حافظ کا نام شاہ منصور، شاہ شجاع اور صاحب دیوان اور دیگر بادشاہوں کی بدولت زندہ ہے؟ افسوس حافظ کو ہر فارسی اور غیر فارسی دان جانتا ہے لیکن ان بادشاہوں سے صرف چند تاریخ دانوں کے علاوہ کوئی واقف نہیں —

لیکن اگر دیوان حافظ کے قصائد میں مبالغہ و خوشامد دیکھنی ہو تو معترض کے بارھویں اعتراض کا جواب جو میں نے اوپر درج کیا ہے وہ ذرا غور سے ملاحظہ فرمالیں تو معاملہ صاف نظر آجائے گا —

پھر آپ یوں رقمطراز ہیں : " تنقید میں یہ شائستہ الفاظ کہ :- حافظ بھی قصیدہ خوانی میں ایسا ہی تھا جیسے کہ دوسرے شاعر! یہ تنقید کرنا نہیں تنقید کی ٹانگ توڑ دینا ہے " —

محمد گلندام کی شہادت کے ہوتے ہوئے ' نہ معترض اور نہ حافظ اسلم ہی اس بات سے انکار کرسکتے ہیں کہ حافظ نے قصائد لکھے. اور ان قصائد سے مبالغہ آمیز اور خوشامدانہ اشعار باوجود یکہ معترض نے ان کو چھپانے کی بہت کوشش کی ' نمایاں کرکے دکھائے جاچکے ہیں - اس کے بعد صرف ایک اور سوال رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ جو طریقہ پہلے فارسی شعراء مثلاً خاقانی ' انوری وغیرہ نے قصائد لکھتے وقت ملحوظ رکھا تھا وہی حافظ نے بھی ذہن میں رکھا - قصیدے میں ' ممدوح کی تعریف میں زمین وآسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اور بعد میں دعا دی جاتی ہے اور دعا میں اپنی حاجت بیان کی جاتی یا حاجت روائی کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے - تنقید میں ' میں نے زیادہ مثالیں دینے سے احتراز کیا تھا لیکن معترض کے اعتراض کے جواب میں مجبور ہوں کہ وہ مثالیں جو دیوان حافظ میں جابجا پھیلی ہوئی ہیں ناظرین کے سامنے پیش کروں —

(الف) شاہ نصرۃ الدین یحییٰ کو شاہ شجاع نے یزد کا علاقہ سپرد کیا تھا لیکن شاہ شجاع کے مرتے ہی اس نے شیراز پر حملہ کیا مگر ناکام رہا - سنہ ۷۸۹ ھ میں تیمور نے شیراز فتح کرلیا لیکن چند وجوہات کی بنا پر وہ سمرقند واپس چلا گیا - جاتی دفعہ وہ شاہ یحییٰ کو

شیراز کا گورنر مقرر کر گیا - مگر تیمور کے جانے ہی کی دیر تھی
کہ شاہ منصور نے اسے بھگا دیا —

اسی شاہ یحیی کی تعریف میں کئی قصائد حافظ نے لکھے ہیں جن کو
میں ذیل میں درج کرتا ہوں - سب سے پہلے غزل میں آپ ذکر کرتے ہیں :-

اے صبا با ساکنان شہر یزد از ما بگو کاے سر ناحق شناساں گوئے میدان شما
گرچہ دوریم از بساط قرب، ہمت دور نیست بندۂ شاہ شمائیم و ثنا خوان شما
اے شہنشاہ بلند اختر، خدا را ہمتے تا ببوسم ہمچو گردون خاک ایوان شما

کیا انہی اشعار سے حافظ کا استغناء اور بے پروائی ثابت کی جاتی
ہے ؟ کیا اسی کو بے نیازی اور ماورائے حاجت دنیاوی تصور کیا جاتا
ہے ؟ کوئی شک نہیں کہ حافظ بلکال نہیں گئے - مگر کیوں ؟ اس لیے نہیں
کہ وہ دنیا پر لات مارے ہوئے تھے - اس لئے نہیں کہ وہ جاہ و حشمت
سے متنفر تھے - اس لیے نہیں کہ وہ صوفی تھے یا قناعت پسند تھے - اصلی
وجہ یہ ہے کہ فطرتاً آرام پسند اور زندگی کی جد و جہد سے گریزاں رہنے
کی کوشش کرتے رہتے تھے - ملاحظہ ہو —

دمے باغم بسر بردن جہاں یکسر نمی ارزد بمے بفروش دلق ما کزیں بہتر نمی ارزد
بس آساں می نمود اول غم دریا بہ بوئے سود غلط گفتم کہ ہر موجش بہ صد گوہر نمی ارزد
الخ

حافظ نے بڑی کوشش کی کہ شاہ یحیی ان کی طرف التفات کرے لیکن
مقصد میں کوئی کامیابی نہ ہوئی - چنانچہ فرماتے ہیں —

دل منہ اے جان من بر وعدۂ شاہ و وزیر
کس نمیداند کہ کارش از کجا خواہد کشاد

رد توکل کن نمیدانی کہ نوک کلک من
نقش ہر صورت کہ زد رنگے دگر بیروں فتاد

شاہ ہرمزم ندیدہ و بے سخن صد لطف کرد
شاہ یزدم دیدہ و مدحش گفتم و ہیچم نداد

خدا را ملاحظہ فرمائیے - کیا اب بھی یہ دعویٰ درست نہیں کہ حافظ نے دیگر شعراء کی طرح قصیدہ خوانی کی ؟ کیا حافظ کے اپنے واضح الفاظ " مدحش گفتم " کافی شہادت نہیں ؟ بے شک حافظ نے توکل و استغنا کی تعلیم دی لیکن یہ تعلیم ھی تھی - کیا ان مندرجۂ بالا اشعار سے استغنا استنباط ہوتا ہے ؟

شاہ یحییٰ کی تعریف میں ان کے علاوہ ایک پوری غزل دیوان میں موجود ہے - ملاحظہ فرمائیے —

دارائے جہاں نصرت دیں خسرو کامل　　یحییٰ بن مظفر ملک عالم و عادل
اے آنکہ در اسلام پناہ تو کشودہ　　بر روئے جہاں روزنۂ جان و تن و دل
تعظیم تو بر جان و خرد واجب و لازم　　انعام تو بر کون و مکاں فائض و شامل
روز ازل از کلک تو یک قطرہ سیاہی　　بر روے مہ افتاد کہ شد حل مسائل
خورشید چوں آں خال سیہ دید بہ دل گفت　　اے کاش کہ من بودمے آں بندۂ مقبل
شاہا فلک از بزم تو در رقص و سماع است　　دست طرب از دامن ایں سلسلہ مگسل
مے نوش و جہاں بخش کہ در زلف کمندت　　شد گردن بدخواہ گرفتار سلاسل
چوں دور فلک یکسرہ بر منہج عدل است　　خوش باش کہ ظالم نبرد راہ بہ منزل

حافظ قلم شاہ جہاں مقسم رزق است
از بہر معیشت مکن اندیشۂ باطل

اس غزل کے مطالعے سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ حافظ کی قصیدہ خوانی کس حد تک دوسرے فارسی شعرا کی طرز پر ہے - معترض بڑے جوش و خروش کے ساتھ حافظ کا شعر پیش کرتے ہیں —

ما آبروے فقر و قناعت نمی دہیم   با بادشاہ بگوے کہ روزی مقدر است

لیکن ذرا اس کے ساتھہ مندرجۂ بالا غزل کا آخری شعر بھی پڑہ ڈالیے کہ نصرۃ الدین یحییٰ کی قلم روتی تقسیم کرنے والی ہے۔ کیا یہی وہ فقر و قناعت ہے؟ اور کیا اسی کے لیے بادشاہ کو کہا گیا ہے کہ " روزی مقدر است ؟"

میں نے شاہ یحییٰ کی تعریف کے متعلق مدحیہ اشعار درج کیے ہیں۔ جب شاہ یحییٰ جیسے معمولی بادشاہ کی تعریف میں حافظ اتنے مدحیہ اشعار جمع کرسکتا تھا تو شاہ شجاع شاہ منصور کی تعریف میں تو جو کچھہ لکھا جائے جائز ہے —

(ب) شاہ منصور کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے۔ وہ بھی ملاحظہ فرمائیے —

جوزا سحر نہاد حمائل برابرم   یعنی غلام شاہم و سوگندمی خورم

شاہا من ار بہ عرش رسانم سریر فضل   مملوک آں جنابم مسکین ایں درم

من جرعہ نوش بزم تو بودم ہزار سال   کے ترک آبخور کند ایں طبع خوگرم

یہ شعر ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے —

گر بر کنم دل از تو و بردارم از تو مہر   آں مہر بر کہ افگنم آں دل کجا برم

یعنی حافظ کے نزدیک ' اگر کوئی ہستی ایسی ہو سکتی ہے جس سے وہ محبت کرسکتا ہے تو وہ شاہ منصور ہے۔ کیا

منصور بن محمد غازی ست حرز من   وزایں خجستہ نام براعدا مظفرم

یعنی شاہ منصور کا نام ہی اتنا متبرک (اسم اعظم) ہے کہ اس کے ورد سے وہ اپنے دشمنوں پر فتح پا لیتا ہے

عہد الست من ہمہ با مہر شاہ بود   در شاہراہ عمر ازیں عہد بگزرم

یعنی عام انسانوں کا عہد الست تو خدا کی ربوبیت کو تسلیم کرنا تھا - لیکن حافظ کا عہد الست ' صرف شاہ منصور کی وفاداری تھا - اور اسی کے باعث اس نے تمام زندگی بسر کی —

اور آخری اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے :

شعرم بہ یمن مدح کہ صد ملک دل کشاد
گوئی کہ تیغ تست زبان سخنورم

حافظ بہ جان دعائے تو گوید بہ صبح و شام
بر ایں سخن گوا ہست خداوند اکبرم

ساقی نامہ میں بھی حافظ نے بدعت قائم کی - اس سے پہلے کسی شخص نے ساقی نامہ میں کسی بادشاہ کی مدح نہیں کی تھی - حافظ پہلا شاعر ہے جس نے ساقی نامے میں بھی مدح سرائی کو نہ چھوڑا - اس مدح کے بعض اشعار میں اوپر کسی اور بیان کے دوران میں درج کر آیا ہوں - اس جگہ صرف آخری اشعار درج کرتا ہوں —

بجائے سکندر بماں سالہا   بدانا دلی کشف کن حالہا
دو دریاے وصفت ندارد کنار   ثنا را کنم بر دعا اختصار
ازاں پیشتر کاوری در ضمیر   ولایت ستاں باش و آفاق گیر
زماں تا زماں از سپہر بلند   بغتم دگر باش فیروز مند

(ج) ذرا اب شاہ شجاع کے قصیدے کے الفاظ بھی سن لیں

شد عرصۂ جہاں چوں بساط ارم جواں   از پر تو سعادت شاہ جہانیاں
خاقان شرق و غرب کہ در غرب و شرق اوست   صاحبقراں و خسرو شاہ خدایگاں
خورشید ملک پرور و سلطان داد گر   دارائے عدل گستر و کسریٰ کے نشاں
سلطان نشان عرصۂ اقلیم سلطنت   بالا نشین مسند ایوان لا مکاں

دارائے دہرشاہ 'شجاع' آفتاب ملک خاقان کامگار و شہنشاہ نوجوان

حکمش رواں چو باد براطراف بحر و بر مہرش رواں چوروح براعضائے انس وجان

بے طاعت تو جاں نگراید بہ کالبد بے نعمت تو مغز نہ بندد در استخوان

با پائے جلال تو افلاک پائمال وز بحر جود دست تو در دہر داستان

اے خسرو رفیع جناب منیع قدر وے داور قدیم مثال و عظیم شان

آخر کے دعائیہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں:—

اے ملہمے کہ در صف کر و بیان قدس فیضے رسد بہ خاطر پاکت زمان زمان

دادہ فلک عنان ارادت بہ دست تو یعنی کہ من کنیم بمراد خودم رسان

خصمت کجاست در تہ پائے خودت فگن یار تو کیست بر سر و چشم منش نشان

ہم نام من بہ مدحت تو گشتہ منتظم ہم کارِ من بخدمت تو گشتہ جاودان

کیا آخری شعر کا بھی یہی مطلب ہے کہ 'حافظ' کے طفیل شاہ 'شجاع' کا نام روز آخر تک رہے گا؟ کیا اس سے بے انتہا خوشامدانہ لہجہ مترشح نہیں ہوتا کہ شاہ 'شجاع' کے مدحیہ قصیدہ کی بدولت 'حافظ' کا نام زندۂ جاوید ہوگا—

آخر میں' میں 'حافظ' کے دو قطعات بھی پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ ہو:—

(۱)

بہ سمع خواجہ رساں اے رفیق وقت شناس بہ خلوتے کہ دراں اجنبی صبا باشد

لطیفۂ بمیاں آر و خوش بخندانش بہ نکتۂ کہ دلش را دراں رضا باشد

پس انگہے ز کرم آں قدر بپرس ز لطف کہ گر وظیفہ تقاضا کنم روا باشد

(۲)

شاہا مبشرے ز بہشتم رسیدہ است رضواں سریر و حوروش و سلسبیل موے

خوش‌لفظ و پاک معنی و موزون و دلفریب صاحب جمال و نازک و خوب و لطیفہ گوے
گفتم درین سرا چہ ز بہر چہ آمدی گفتا ز بہر مجلس شاہ غریب جوے
اکنوں ز صحبت من مفلس بجاں رسید نزدیک خویس خواس و کام دلش بجوے

طوالت کے خوف سے میں اس سلسلے کو یہاں ختم کرتا ہوں —

(۸) میں نے تنقید میں وہ اشعار جو 'حافظ' نے شاہ 'شجاع' کی خوشامدانہ مدح میں لکھے تھے ' پیش کئے تھے - ان کے آخری اشعار یہ ہیں —

محل نور تجلی ست راے انور شاہ چو قرب او طلبی در صفاے نیت کوش
بجز ثناے جلالش مساز ورد ضمیر کہ ہست گوش دلش محرم پیام سروش
رموز مصلحت خویش خسروان دانند گداے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

ان اشعار کا سمجھنا ہر فارسی داں کے لیے آسان ہے —

(۱) بادشاہ کی روشن راے ' نور تجلی کا محل ہے۔ اگر تو اس (یعنی بادشاہ) کا قرب چاہتا ہے تو نیت کو صاف رکھہ —

(۲) سواے اس کی مدح کے اور کسی چیز کو اپنے ضمیر کا ورد مت بنا کیوں کہ اس کا دل جبرئیل؏ کے پیام (یعنی الہام و وحی) کا رازدار ہے ... الخ —

ان اشعار سے نہ صرف خوشامد کی بو آتی ہے بلکہ اس کے ساتھہ مبالغہ بھی موجود ہے - ایک بادشاہ کو جو خاص کر شراب نوشی پہ مداومت کرتا ہو ' جبرئیل؏ کے پیام کا حامل سمجھنا بڑے درجے کی خوشامد نہیں تو اور کیا ہے! لیکن چونکہ معترض کا مطلب فوت ہوتا تھا اس لیے فرماتے ہیں کہ یہ ترجمہ ہی غلط ہے - اشعار بالکل سیدھی عبارت میں ہیں لیکن پھر بھی فرماتے ہیں :—

"بادشاہ محل نزول نور تجلی ہوتا ہے اور (خدا) کا
قرب چاہیے تو صفائے قلب میں سعی جاری رکھے - سوائے اس
کی ثنائے جلال کے دل کا وظیفہ کچھ نہیں ہونا چاہیے
کیوں کہ دل کے کان محل نزول الہام ہیں - مطلب یہ ہے کہ
قلب صاف ہوگا تو انسان اپنے ارادوں میں ملہم من اللہ ہوتا
رہے گا اور اچھی ہی بات اس کے دل میں آے گی" —

اب ان اشعار کے ملاحظے کے بعد ان دونوں ترجموں کا مقابلہ کرنا چاہیے —

اول تو میں نے تنقید میں جو شعر پیش کئے تھے ان میں معترض نے بے جا اور بغیر کسی دلیل کے ایک تحریف کردی ہے - مثلاً دوسرے شعر کا دوسرا مصرع میں نے یوں لکھا تھا "کہ ہست گرہ دلش ... الخ" —
لیکن معترض نے "دلش" کو "دلت" بنا دیا اور اس تحریف کے لیے کوئی دلیل، کوئی شہادت پیش نہیں کی حالانکہ تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دواوین اس بارے میں متفق ہیں —

دوم - پہلے شعر کے دوسرے مصرع میں جو ضمیر "او" موجود ہے اس کا مرجع "رائے انور شاہ" ہے جس حالت میں وہ معنی جو میں نے کئے ہیں (یعنی اگر تو اس یعنی بادشاہ کا قرب چاہتا ہے الخ) ٹھیک بیٹھتے ہیں - لیکن اس کے برعکس آپ نے "او" کو "خدا" کی طرف راجع کیا ہے جیسا کہ آپ کے ترجمہ سے ظاہر ہے - لیکن یہ بالکل غلط ہے - یہی غلطی آپ نے دوسرے شعر کے ترجمہ میں بھی کی - ضمیر متصل "ش" جو دو بار موجود ہے، اسی "رائے انور شاہ" کی طرف راجع ہے - لیکن معترض اس کو بھی "خدا" کی طرف راجع سمجھتے ہیں -

لیکن سب سے بڑی دلیل جو میں اپنی تائید میں پیش کر سکتا

ہوں، حافظ کے تیسرے شعر کا پہلا مصرع "رموز مصلحت خویش خسرواں دانند" ہے۔ اس مصرع سے صاف اور واضح طور پر ٹپکتا ہے کہ جو کچھ اوپر کہا جا چکا ہے وہ "بادشاہ" کے متعلق ہے۔ ان شواہد کی موجودگی میں بالکل اُلٹے معنی کرنے، حافظ کی شاعری کا کمال نہیں بلکہ تنقیص ہے۔ اور پھر ایسی جسارت کے بعد آپ اس معنی کو عظیم الشان اور مفید دُل سمجھتے ہیں: —

حافظ تو ختم کن کہ ہنر خود عیاں شود

با مدعی نزاع و محابا چہ حاجت است

مرزا غالب کا غیر مطبوعہ خط

موسومہ نواب انوارالدولہ سعدالدین خاں بہادر

متخلص بہ شفق تلمیذ حضرت غالب

پیرو مرشد کیا حکم ہوتا ہی احمق بنکر چپ ہو رہوں یا جو ازروے کشف یقینی مجھہ پر حالی ہوا ہے وہ کہوں - اول رجب میں نوازشنامہ آپ نے کب بھیجا آخر میرے پاس پہنچ ہی گیا یہ جو اب بھیجا اگر روانہ ہوا ہوتا تو وہ بھی پہنچ گیا ہوتا بہر حال محبت کی گرمی ہنگامہ ہے۔ یہ جملہ محض آرایش عنوان نامہ ہے - عمرت دراز باد کہ اینہم غنیمت است۔ چندا رونکا اجراے پنسن اور اہل شہر کی آبادی مسکن یہاں اس صورت پر نہیں ہے جیسی اور کہیں ہے اور جگہ سیاست ہي منجملہ ضروریات ریاست ہے یہاں قہر الہی ہے منشاء تباہی ہی خاص میری پنسن کے باب میں گورمنٹ سے رپوٹ طلب ہوی ہی ابناے روزکار حیران ہیں یہ بھی ایک بات عجب ہوئی ہے رپوٹ کی روانگي کي دیر ہے چند روز اور بھی قسمت کا پھیر ہے دلی علاقۂ لفٹنٹ گورنر سے انقطاع پاگئی اور احاطۂ پنجاب کے تحت حکومت آگئی رپوٹ یہاں سے لاہور اور لاہور سے کلکتے جائے گی اور اسی طرح پھر کہا کر نوید حکم منظوری آئے گی - فعل لازم کو جب متعدی کیا چاہئے تو پہلے مضارع میں سے مصدر بنالیا چاہیے گشتن مصدر اصلی گردد مضارع گردیدن مصدر

مضارعی گردانیدن و گردانیدن مصدر متعدی موافق اس قاعدہ کے
کردن کا متعدی کنانیدن و کنانیدن ہے نہ کرانیدن - کرانیدن تو کرانے
کی فارسی ہے جیسے چلنے کی فارسی چلیدن اور یہ شوخی طبع وظرافت
ہے نہ اس میں صحت ہے نہ لطافت ہے - کرانیدن غلط اور کنانیدن صحیح
گشتن کو گشتانیدن اور رستن کو رستانیدن نہ کہینگے بلکہ گردیدن وروئیدن
بناکر گردانیدن وررویانیدن لکھینگے بلغا کے کلام میں کردن کا متعدی شاید
کہیں نہ آیا ہو اگر آیا ہوگا تو کنانیدن آیا ہوگا کرانیدن ٹکسال باہر ہے
۱۲ تذکیرو تانیث کا دایرہ بہت وسیع ہے - دہی - بعض کہتے ہیں دہی اچھا
بعض کہتے ہیں دہی اچھی - قلم - کوئی کہتا ہی قلم ٹوٹ گیا - کوئی کہتا ہے قلم
ٹوٹ گئی فقیر دہی کو مذکر بولتا ہی اور قلم کو بہی مذکر جانتا ہے علی ہذا القیاس
شنگرت بہی مذبذب ہے کوئی مذکر اور کوئی مونث کہتا ہے میں تو شنگرت کو مونث
کہونگا - خلاصہ یہ کہ اس ہیچمدان کے نزدیک کردن کا متعدی کنانیدن ہے
اور شنگرت مونث ۱۲ خداوند آئین بندہ پروری بہول نجاؤ گاہ گاہ نامہ و پیام بہیجتے
رہو - کیا میں یہ نہیں لکھہ سکتا کہ میں نے اس عرصے میں دو خط بہیجے اور
آپ نے ایک کا جواب نہیں لکھا ہاں یہ عرض کرتا ہوں کے آج صبح کو
آپ کا خط آیا ادہر پڑہا ادہر جواب لکھا سچ یوں ہے کہ ڈاک میں اکثر
خطوط تلف ہوتے ہیں بیرنگ پر ضایع ہونیکا گمان کم ہے اس دستور کا
بانی اور بانی میں ہوتا ہوں - یہ خط بیرنگ بہیجتا ہوں آپ بہی اب جب
کبہی بغرض محال خط بہیجئے تو بیرنگ بہیجئے زیادہ حد ادب - عرضداشت
غالب - نگاشتۂ چہارشنبہ سیوم شعبان ونہم مارچ سال حال ۱۲ —

ولی کے سنہ وفات کی تحقیق

از

اڈیٹر

ولی کا سنہ وفات اب تک غیر متحقق ہے - اردو شعرا کے جس قدر تذکرے اس وقت تک دستیاب ہوے ہیں وہ سب اس بارے میں خاموش ہیں - البتہ مولوی عبدالجبارخاں مرحوم مولف تذکرۂ شعراے دکن نے اس کا سنہ وفات سنہ ۱۱۵۵ ھ لکھا ہے لیکن کوئی حوالہ یا ثبوت پیش نہیں کیا - بعض حال کے مصنفین نے اِسی کو صحیح سمجھہ کر نقل کردیا ہے - بعض صاحبوں نے اس شعر سے —

دل ولی کا لے لیا دلی نے چھین   جا کہو کوئی محمد شاہ سون

یہ استنباط کیا ہے کہ ولی محمد شاہ کے زمانے میں تھا - محمد شاہ کا سنہ جلوس ۱۱۳۱ ھ ہے - لیکن یہ قطعی طور سے ثابت ہے کہ یہ شعر ولی کا نہیں - میرے پاس ولی کے بارہ قلمی دیوان موجود ہیں ان میں کہیں یہ شعر نہیں اور نہ کسی اور دیوان (قلمی یا مطبوعہ) میں یہ شعر یا اس شعر کی غزل پائی گئی - اور لطف یہ ہے کہ بعض مرتب دیوان جو اس شعر کو سند میں پیش کرتے ہیں ، خود ان کے مرتب کردہ دیوانوں میں یہ شعر نہیں پایا جاتا - اصل میں یہ شعر مضمون کا تذکرۂ گلشن گفتار (سنہ ۱۱۶۵ ھ)

اور چمنستان شعرا نے مضموں کے ذکر میں اس طرح نقل کیا ہے —

اس گدا کا دل لیا دلی نے چھین جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

اسی قسم کی ایک دوسری غلط فہمی بھی ہوی جس سے ولی کا محمد شاہ کے عہد میں ہونا ثابت کیا گیا ہے - مصحفی نے اپنے تذکرے میں شاہ حاتم کی زبانی یہ بیان کیا ہے کہ " روزے پیش فقیر نقل می کرد کہ در سنہ دویم فردوس آرامگاہ دیوان ولی درشاہجہان آباد آمدہ و اشعار ہر زبان خورد و بزرگ جاری گشتہ " * - بعض اصحاب نے اس بیان کو دیکھہ کر غلطی سے یہ سمجھہ لیا کہ ولی محمد شاہ کے عہد میں دلی گیا تھا - حالانکہ اس میں صاف طور پر دیوان کے پہنچنے کا ذکر ہے نہ کہ دلی کے جانے کا -

یہ سب تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ولی دلی گیا تھا لیکن سوائے قائم کے کسی نے صحیح سنہ اس کے دلی جانے کا نہیں بتایا - قائم لکھتا ہے کہ وہ عالمگیر کے ۴۴ سنہ جلوس † (سنہ ۱۱۱۲ ھ) میں دلی گیا - اس کا دو بارہ دلی جانا جیسا کہ بعض صاحبوں نے بیان کیا ہے ' ثابت نہیں ہوتا - غالباً اُس شعر سے جو اوپر نقل کیا گیا ہے یہ غلطی پیدا ہوی —

ایک مدت کی جستجو کے بعد اب یہ امر پایۂ تحقیق کو پہنچا ہے کہ ولی کی وفات سنہ ۱۱۱۹ ھ میں ہوی - اس کی شہادت ہمیں ذیل کے قطعۂ تاریخ سے ملتی ہے جو کتب خانۂ جامع مسجد بمبئی کے قلمی نسخۂ دیوان ولی (نشان ۴۲۷۹) کے خاتمے پر درج ہے —

مطلع دیوان عشق سید ارباب دل والي ملک سخن صاحب عرفاں ولی

* تذکرۂ ہندی صفحہ ۸۰

† مخزن نکات صفحہ ۱۰

سال وفاتش خرد از سر الہام گفت باده پیمانه ولی ساقی کوثر علی

اس دیوان کی کتابت ۲۱ سنہ جلوس محمد شاہی میں ہوی اور کاتب کا نام شہسوار بیگ ہے —

اس کے بعد اس امر کی مزید صحت و توثیق احمد آباد کے ایک خانگی کتب خانے کی بیاض سے ہوگئی ۔ اور اس اثنا میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قطعہ کے مصنف مولوی حسن مفتی ہیں —

ولی کی زندگی اور کلام کے متعلق ابھی اور کئی امور مشتبہ اور تحقیق طلب ہیں ۔ یہ فی‌الحال زیر تحقیق ہیں اور آیندہ وقتاً فوقتاً ان پر بحث کی جاے گی —

ادب

متفرقات

سالنامے

اُردو کے جدید رسالے

— * —

نقد الادب

(تالیف جناب حامداللہ افسر صاحب نول کشور
پریس لکھنؤ - مجلد ، قیمت دو روپے)

مولانا حالی کے بعد سے ادبی تنقید کی طرف توجہ ہونے لگی اور اس مبحث پر متعدد تالیفیں اور تحریریں شایع ہوئیں۔ جناب حامداللہ افسر صاحب کی یہ تالیف خاص اس فن پر ہے - اس میں انہوں نے مغربی اور مشرقی خیالات کو سمونے کی کوشش کی ہے - اصل میں یہ مختصر کتاب باسل ورس فولڈ کی تالیف Judgment in Literature کا چربہ ہے - البتہ قابل مولف نے اردو ادبیات کی مناسبت سے کہیں کہیں تصرف کر دیا ہے - خاص کر آخری باب جس میں اردو کے اصناف سخن یعنی غزل ، مثنوی ، قصیدے اور مسدس کی حقیقت اور ان کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ مبتدیوں

کے لیے یہ کتاب نئی تنقید پر رہ نمائی کا کام دے سکتی ہے - ہر مضمون کو بہت صفائی اور خوبی سے بیان کیا ہے —

نوادر

(یعنی مجموعۂ لطائف و ظرائف مولفۂ جناب مرزا محمد
عسکری صاحب بی ۔ اے لکھنوی - صفحات ۲۵۲ قیمت
ایک روپیہ - مولف یا النا ظر بک ایجنسی لکھنؤ
سے مل سکتی ہے)

یہ بڑی پر لطف کتاب ہے - قابل مولف نے ہر طبقے اور گروہ کے دلچسپ لطیفے بڑی تلاش سے جمع کردیے ہیں - اس میں شعرا و حکماء معلم اور موذن، احمق اور عورتیں ، ڈاکٹر اور طبیب ، چور اور پرخور غرض ہر قسم کے لوگ آگئے ہیں - آخر میں اشخاص کا ایک انڈکس بھی دیا ہے - جو لوگ اسے پڑھ کر لطف اٹھائیں گے وہ مولف کی محنت اور جستجو کی داد دیں گے —

اردو زبان اور ادب

(یعنی اردو سروے کمیٹی کی رپورٹ مولفۂ و مرتبہ
جناب مولوی سید ضامن علی صاحب ایم - اے، صدر
شعبہ اردو ، الہ آباد یونیورسٹی - ہندوستانی
اکاڈیمی الہ آباد سے مل سکتی ہے)

ہندوستانی اکاڈیمی کی کونسل کی ایک قرار داد کے بموجب ایک کمیٹی اس غرض سے قائم کی گئی کہ اردو زبان کے ادب کی جانچ پڑتال کی

جائے کہ اسے کس قسم کی تصانیف کی ضرورت ہے - اس کمیٹی کے صدر جناب سید ضامن علی اور سید مسعود الحسن صاحب ایم - اے اور رشید احمد صاحب صدیقی رکن تھے - یہ اُسی کمیٹی کی رپورٹ ہے —

اس رپورٹ کے تین حصے ہیں - پہلے حصے میں زبان کی ابتدا اور اس کی تدریجی ترقی کا بیان ہے - دوسرے حصے میں اردو ادب کی موجودہ اور آیندہ ضرورت اور اکاڈیمی کی طرز عمل کی بابت تجاویز ہیں - تیسرے حصے میں ابتدا سے لے کر اس وقت تک جو کتابیں اردو میں لکھی گئی ہیں ان کی فہرست بقید سنہ تصنیف ہے —

کتاب کا نام بڑا ہے مگر اس کے اعتبار سے کام بہت کم ہے - تینوں حصے ناقص اور نامکمل ہیں اور یہ رپورٹ محض سرسری اور ناکافی ہے - اس کام کو بخوبی انجام دینے کے لیے بہت زیادہ محنت، تلاش اور وقت کی ضرورت ہے —

روح ادب

(مولفہ جناب سید حید رعباس حیدر، منشی کامل، بی - اے
رام نگر بنارس اسٹیٹ - صفحات ۵۰ چھوٹی تقطیع - قیمت آٹھ آنے)

اس میں مولف نے کچھ ایسے الفاظ جمع کیے ہیں جو غلط بولے یا لکھے جاتے ہیں - مگر بعض جگہ انہوں نے زیادتی کی ہے - ہر زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ غیر زبان کے الفاظ جب اس میں داخل ہوتے ہیں تو اکثر اوقات ان میں کچھ نہ کچھ ردو بدل ہوجاتا ہے - قابل مولف کا یہ کہنا کہ جمعدار غلط ہے اور جماعۃ دار صحیح اور رسالدار غلط اور رسالہ دار

صحیح درست نہیں - لچار ترکیب کے لحاظ سے غلط ہو لیکن یہ ہندیوں کا تصرف ہے اور صحیح ہے - ناچار اور لچار کے مفہوم میں بھی فرق ہے - جو الفاظ استعمال میں آگئے ہیں اور عام و خاص کی زبان پر جاری ہیں انہیں اردو میں صحیح اور فصیح خیال کرنا چاہئے گو اصل کے اعتبار سے غلط ہی کیوں نہ ہوں - بہر حال اس کے مطالعہ سے پڑھنے والے کو بہت سے الفاظ کی صحت ہو جائے گی —

خاقانیء ہند.

(مولفۂ جناب میاں محمد رفیق خاور ایم - اے
مطبوعہ عالمگیر پریس لاہور - قیمت ایک روپیہ)

یہ ذوق کی شاعری پر مفصل تنقید ہے - پہلا باب اصول تنقید پر ہے ' دوسرا سوانح حیات پر ' تیسرا ماحول اور اس کے اثرات ' چوتھا ' وجدان ملکات اور شخصیت ' پانچواں ' آرٹ اور چھٹا باب موازنۂ ذوق و غالب پر ہے —

مولف پر جوش ' مستعد اور قابل نوجوان ہیں - لیکن اپنی طبیعت پر قابو نہیں - ان کا مطالعہ اور نظر وسیع ہے ' لکھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں ' اردو زبان کے دلدادہ ہیں ' فارسی کا اچھا ذوق ہے اور بہت اچھے تنقید نگار ہوسکتے ہیں بشرطیکہ مصنف ہونے کے شوق میں عجلت نہ کریں - اس کتاب میں عجلت کے آثار شروع سے آخر تک نظر آتے ہیں ' اسی وجہ سے ترتیب خیالات اور طرز بیان اکھڑا اکھڑا سا ہے —

ذوق کو کوئی بھی اعلیٰ درجے کا شاعر نہیں مانتا - اس بات کے ثابت کرنے میں کہ ذوق بڑا شاعر نہیں تھا، اس قدر دردسری اور اس قدر طول طویل مباحثوں کی ضرورت نہ تھی - اس میں ان کی محنت اور کاوش کا بہت سا حصہ رائگاں گیا - تنقید نہایت ضروری اور اچھی چیز ہے - تنقیص کے اظہار کا بھی ڈھنگ ہوتا ہے - لیکن اس طرح ہاتھ دھو کر کسی کے پیچھے پڑ جانا جس سے معلوم ہو کہ جیسے کوئی ذاتی بغض و عناد ہے، تنقید نگار کے لیے زیبا نہیں - بری چیز کو دیکھ کر بیشک غصہ آتا ہے لیکن غصے کا اظہار بری طرح نہیں ہونا چاہئے - وہی باتیں جو قابل مولف نے ذوق کے خلاف لکھی ہیں سلیقے سے بھی لکھی جا سکتی تھیں اور اس حالت میں یہ کتاب اور زیادہ قابل مطالعہ ہو جاتی - مولف نے جوش نفرت میں ہر امر کو جو ذوق کے خلاف ملا یا اس کے کلام سے انھوں نے اخذ کر کے دکھایا ہے بغیر تحقیق اور غور کے لکھ دیا ہے - مثلاً

> " آپ نے اپنے مذہب کی تصریح نہیں کی - چونکہ بادشاہ حنفی اور وہ شیعہ، اس لیے آپ نے اپنے تشیع کا کھل کر اظہار نہ کیا "
>
> " مذہب کے لحاظ سے ذوق مشدد شیعہ ہے " —
>
> " ذوق ایک مدت تک لذائذ دنیوی کے دلدادہ رہے، ان میں سے ایک مے نوشی ہے " —

یہ واقعات اگر مولف نے اپنی تحقیق سے دریافت کیے ہیں تو اپنے ماخذوں کا حوالہ دینا چاہئے تھا اور اگر ذوق کے بعض اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے تو درست نہیں - ہمارے غزل گو شاعر اس قسم کی سینکڑوں باتیں لکھ جاتے ہیں جن کو ان کی ذات یا عقائد سے کوئی تعلق نہیں ہوتا —

مولف نے منجملہ دیگر اعتراضات کے ذوق پر رکاکت اور عامیانہ پن کا بھی سخت اعتراض کیا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ خود مولف کی تحریر بعض اوقات اسی حد تک جا پہنچی ہے کہیں یہ کلام ذوق کے گہرے مطالعے کا اثر تو نہیں —

زبان اور محاورے اور اسی قسم کی دوسری بحثیں اس کتاب میں ضمنی طور پر آگئی ہیں۔ مثلاً انہوں نے بعض الفاظ اور محاوروں کو محض اس لیے سوقیانہ یا عامیانہ قرار دیا ہے کہ وہ ذوق نے استعمال کیے ہیں ورنہ اور کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ جو فہرست مولف نے دی ہے اس میں متعدد ایسے لفظ اور محاورے ہیں جو ہر معقول پسند شخص استعمال کر سکتا ہے۔ لفظ نہ رکیک ہوتا ہے نہ متین۔ یہ صرف استعمال پر منحصر ہے۔ اس قسم کے اور بھی بہت سے امور ہیں جو قابل بحث ہیں لیکن اس کے لیے نہ موقع ہے نہ گنجائش ہے —

مولف ذہین، پرجوش، ادب سے ذوق رکھنے والے اور قابل شخص ہیں اور بہت ہونہار معلوم ہوتے ہیں لیکن دو بڑے دشمن ان کی تاک میں لگے ہوئے ہیں ایک مصنف ہونے کا شوق دوسرا عجلت۔ اگر ان سے کبھی چھٹکارا ہو گیا تو بڑا کام کریں گے —

گاندھی نامہ

(مصنفہ میاں محمد رفیق صاحب خاور ایم۔ اے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ مصنف سے باغبانپورہ، لاہور کے پتے سے مل سکتا ہے)

شاید مہاتما گاندھی کی یہ پہلی منظوم سوانح عمری ہے۔ قابل مصنف

نے اس میں بہت صاف ستھرے طرز میں عقیدت کے ساتھ گاندھی جی کے حالات پہلی بار ولایت جانے تک کے نظم کئے ہیں - کہیں کہیں فسانے کا رنگ بھی دیدیا ہے لیکن اس سے حقیقت حال پر کچھ اثر نہیں پڑتا ' بلکہ وہ اس کا ممد ہوجاتا ہے - طویل بیانیہ نظم میں ہر جگہ شعر کی خوبی قائم رکھنا مشکل ہوتا ہے - اس لیے کہیں کہیں خامیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن وہ نظم کی روانی اور بیان کی صفائی کے سامنے قابل لحاظ نہیں - شاعر کو خود بھی شبہ ہے کہ ممکن ہے کہ کہیں کہیں " صوری و معنوی اسقام رہ گئے ہوں ' اسقام کا رہ جانا کوئی بڑا عیب نہیں لیکن جو عذر اس کے متعلق انہوں نے پیش کیا ہے وہ اگر نہ لکھتے تو بہتر تھا - مثلاً " ابھی نظم کا ایک شعر بھی تحریر نہیں ہوا تھا کہ اس کی افواہ بعض ادب پرست اصحاب تک پہنچ گئی ' اُن کے لاانتہاہی سلسلۂ خطوط اور فرمائشوں نے ہمیں عجب مصیبت میں ڈال دیا اور ہم مجبور ہوگئے کہ نظم کو کم سے کم وقت میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں " یا یہ کہ " چونکہ لکھتے وقت ہمارے پاس کوئی عمدہ ڈکشنری نہ تھی اور نہ کوئی ایسا قابل شخص موجود تھا جس سے ہم مشورہ کرسکتے اس لیے عجب نہیں کہ نظم میں بہت سے الفاظ اور قوافی وغیرہ غلط یا محاورے کے خلاف ہوں " اس تمام طول طویل معذرت کے جواب میں یہ پرانا برجستہ فقرہ کہا جاسکتا ہے کہ " شعر گفتن چہ ضرور " -

شاعر کو کوئی خارجی قوت شعر کہنے یا کسی نظم کو قبل از وقت تکمیل کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی - اگر اتفاق سے کوئی ایسی آسمانی سلطانی آفت نازل ہوجائے تو خیر وہ دوسری بات ہے - لیکن یہ مجبوریاں جو بیان کی گئی ہیں ' انہیں پڑھ کر شاعر کی سادہ دلی پر ہنسی بھی آتی ہے اور اُس سے ہمدردی بھی پیدا ہوتی ہے —

تغلق نامہ امیر خسرو

(مرتبہ مولوی سید ہاشمی صاحب ، سلسلۂ مخطوطات فارسیہ ، حیدرآباد دکن)

اگر مردے کا زندہ کرنا کرامات ہے تو تغلق نامے جیسی نایاب و ناپید کتاب کا کھوج لگانا اور شایع کرنا اس سے کچھ کم نہیں ۔ آج سے نہیں کئی صدی سے اس کتاب کا صرف نام ہی نام تھا اور کہیں پتا نہ تھا ، اب بزم مخطوطات فارسی (حیدر آباد دکن) کی بدولت چھپ کر شایع ہوگئی ہے ۔ بزم کا یہ بہت بڑا اور قابل ناز کارنامہ ہے ۔ مولوی سید ہاشمی صاحب نے اس کی تہذیب و تصحیح میں بہت محنت کی ہے اور شروع میں کتاب کی تاریخ ، اس کے متعلقہ حالات اور اس کی اہمیت پر بہت اچھا مقدمہ لکھا ہے اور آخر میں کتاب کا پورا خلاصہ بھی دیدیا ہے ۔ حضرت امیر نے اس کتاب میں بڑا کمال یہ کیا ہے کہ زبان کی فصاحت و سلاست اور بیان کی خوبی اور قدرت کے ساتھ تاریخی واقعات کا ذکر اس صحت اور احتیاط کے ساتھ کیا ہے کہ اس عہد کی تاریخیں بھی اس سے قاصر ہیں ۔ اس مثنوی میں سلطان قطب الدین کے قتل ، خاندان علائی کی تباہی ، خسرو خاں کی چند روزہ بادشاہی ، تغلق کی سرتابی ، دہلی پر چڑھائی اور فتحیابی ، خسرو خاں کی گرفتاری اور قتل کے حالات ہیں ۔ حضرت امیر کی یہ آخری مثنوی ہے اور اس میں ان کی استادانہ پختگی صاف نظر آتی ہے ۔ میں اُن کی اس مثنوی کو ادبی لحاظ سے بھی بڑے پایہ کی خیال کرتا ہوں ۔ یہ ان بے مزہ صنایع بدایع اور بے لگام تخیل سے پاک ہے جو فارسی کی اکثر مثنویوں کا مایۂ ناز ہیں ۔ حضرت امیر نے اس مثنوی میں

واقعات کی صورت بحیثیت شاعر اور مورخ کے بڑی صفائی کے ساتھ کھینچی ہے ۔ کتاب ہر لحاظ سے قابل قدر ہے اور اس کے لیے ہم سب کو بزم مخطوطات فارسی کا بہت ممنون ہونا چاہئے ۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کتاب ہے اور خوشی کی بات ہے کہ اس کی ابتدا ایسی نایاب اور بے مثل مخطوطے سے ہوئی —

مغل اور اردو

اردو زبان کے دلدادہ جناب نواب سید نصیر حسین خاں خیال کو اس وقت سے جانتے ہیں جب انہوں نے ۱۹۱۹ ع میں انجمن ترقی اردو کے سالانہ جلسے میں اپنا خطبہ " داستان اردو " کے نام سے پڑھا ۔ یہ خطبہ در اصل اردو زبان کی تاریخ کا سرسری خاکہ تھا ۔ اردو داں طبقے میں اس کا جو ذرا کچھ چرچا ہوا وہ محض اس وجہ سے کہ اس وقت تک تاریخ ادبیات اردو کا مواد زیادہ روشنی میں نہیں آیا تھا - لیکن اب اس موضوع پر کئی مشہور ادیبوں نے تحقیقات شروع کردی ہے اور اس قدر عجیب و غریب نتائج بر آمد ہو رہے ہیں کہ کبھی ساں گمان بھی نہ تھا کہ تاریخ زبان اردو کے میدان میں اس قدر وسعت ہوگی - حال کی تحقیقات اور مزید امکانات پر نظر کرتے ہوئے حضرت خیال کی یہ کتاب بہت ہی ابتدائی کوشش معلوم ہوتی ہے جو ہر طرح نا مکمل اور غیر کافی ہے اور طرح طرح کی غلط فہمیوں اور غلطیوں سے بھری ہوئی ہے —

" مغل اور اردو " جناب خیال کے خطبے (داستان اردو) کا ایک باب ہے جو تھوڑے بہت اضافہ و ترمیم کے ساتھ شایع کیا گیا ہے ۔ اس میں لائق

مولف نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے حکمران مغل خاندان نے اردو کی ترقی و توسیع میں کیا کام کیا —

فاضل مولف کو اپنے مقصد میں بہت کم کامیابی ہوی ' وہ اُس موضوع کو کما حقہ نہ نبھا سکے۔ اس میں طرح طرح کی غلطیاں اور خامیاں ہیں—

فاضل مرتب نے اُردو کا تعلق مغل حکمرانوں کے ساتھہ دکھانے کی غرض سے بہت سی باتیں جمع کردی ہیں اور بعید سے بعید واقعات کو لاکر کسی نہ کسی طرح اپنے موضوع سے متعلق کر دیا ہے۔ مثلاً عالم گیر کی تعلیم نوازی ' علمی سرپرستی کی کئی مثالیں دی ہیں ' اور چھہ سات صفحوں میں اس کا ذکر کیا ہے لیکن کوئی مدلل ثبوت اس بات کا نہیں دیا کہ عالم گیر نے اُردو پر کیا احسان کیا؟ بے حوالہ و سند ایک دو تھیٹ ہندی کہاوتیں لکھہ دی ہیں کہ عالم گیر نے کسی موقع پر ان کو زبان سے ادا کیا تھا —

احمد شاہ بادشاہ کا ذکر بارہ صفحوں پر کیا لیکن کہیں یہ نہیں بتایا کہ بادشاہ کو راست اُردو زبان سے کیا تعلق تھا —

اسی طرح دوسرے بادشاہوں کے تذکرے لکھے لیکن یہ ثابت نہ کر سکے کہ ان بادشاہوں نے اُردو زبان کے ساتھہ کیا سلوک کیا۔ اگر فاضل مولف اپنی پرانی معلومات پر اکتفا نہ کرتے اور اپنے دائرۂ تحقیق کو زیادہ وسیع کرتے تو ان قیاس اور بعید از کار باتوں کو ہیر پھیر سے اور پھیلا پھیلا کر لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ہم ان حکمرانوں کے متعلق چند باتیں لکھتے ہیں اُمید ہے کہ اس سے ہمارے اس بیان کی تصدیق ہوگی کہ حضرت خیال کی تحقیق ادھوری ' ناقص اور خیالی ہے —

عالم گیر کا کوئی فقرہ حضرت خیال کو نہیں ملا۔ ہم ایک مثال دیتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ اس نے فارسی سوال کا جواب اُردو میں دیا ہے۔

بساتین السلاطین میں لکھا ہے کہ جب عالم گیر نے بیجاپور فتح کیا تو وہاں کے علما کی ایک جماعت عالم گیر کی خدمت میں حاضر ہوئی اور سوال کیا کہ ایک اسلامی سلطنت کو اس طرح زیر و زبر کرنے کی کیا وجہ تھی؟ بادشاہ مسلمان ہے اس سے کوئی ایسا فعل سرزد نہیں ہوا کہ منافی شان اسلام ہو۔ عالم گیر نے جواب دیا کہ بے شک یہ سب درست ہے لیکن بادشاہ نے سیوا جی مرہٹے کو اپنے دربار میں پناہ دی اور وہ ایسا شخص ہے کہ اگر حرم میں بھی پناہ لے تو گردن زدنی ہے۔ عالم گیر کے اصل الفاظ یہ ہیں—

"اگر حرم میں بود اچھے تو کشتنی" —

احمد بادشاہ کا بارہ صفحوں پر ذکر ہے لیکن کہیں یہ اشارہ بھی نہیں کہ بادشاہ خود شاعر تھا۔ تذکرۂ شورش میں اس کا ذکر بحیثیت شاعر موجود ہے ملاحظہ ہو فہرست مرتبہ اسپرنگر صفحہ ۱۹۹ —

اگر فاضل مولف اپنے مطالعے کو زیادہ وسعت دیتے اور صبر و تحمل اور ضبط و تمکین سے اپنی تحقیقات میں مشغول ہوتے تو ضرور ان کو مستند مواد مل جاتا اور اس سے ان کی کتاب زیادہ محققانہ اور مستند ہو جاتی —

لایق مولف نے تاریخ و تذکرے کی ضروری اور مستند کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا اور اس ناواقفیت کے باوجود غیر مستند غیر صحیح واقعات کو بڑے شد و مد کے ساتھہ پیش کیا ہے۔ معمولی، پامال اور غیر معتبر روایتوں کو اس وثوق اور بے باکی سے نافذ کرنا چاہا کہ تاریخی حقایق مسخ و مجروح ہو کر رہ گئے —

فاضل مولف کو یہ تک نہیں معلوم کہ شاہ ولی اللہ اشتیاق اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی دو مختلف بزرگ ہیں۔ وہ ان دونوں کو ایک

سمجھتے ہیں، ان دونوں سے ان کی مراد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ہے چنانچہ انہوں نے اس کا ذکر دو جگہ کیا ہے —

" مولانا شاہ ولی اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے ۱۱۵۰ ھ میں قرآن کا ترجمہ گو فارسی میں کیا مگر ان مرحوم نے بھی اُردو کے بڑھتے ہوے زور کو آخر تسلیم کرلیا اور اشتیاق تخلص اختیار کرکے اس زبان کو بھی پاک اور اس کے مشتاقوں کو فرحناک کرنے لگے "۔ صفحہ ۱۱۲ —

" جناب شاہ ولی اللہ صاحب اشتیاق علیہ الرحمہ نے سنہ ۱۱۵۰ھ میں قرآن پاک کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ مگر اب پچاس برس کے اندر اندر اُردو نے فارسی کی جگہ لے لی۔ ان کے صاحبزادے جناب شاہ عبدالقادر صاحب نے .... اب اس کلام کے معنی اُردو میں بیان کرنا شروع کئے " —

اب جب کہ بہت سے تذکرے شایع ہو چکے ہیں اور تاریخ ادب کی تحقیق میں بڑی سہولت ہوگئی ہے اس پر بھی فاضل مولف نے اس غلطی کا ارتکاب کیا جو اس نواح میں علی لطف نے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل نہایت ثقیل الفاظ میں کیا تھا —

اگر لایق مولف میر اور قایم کے تذکرے دیکھ لیتے تو اس غلط فہمی کا شکار نہ ہوتے۔ اشتیاق کے متعلق میر اور قایم کے بیانات یہ ہیں —

" مردے بود ذی علم از اولاد شیخ الف ثانی - نبیسۂ شاہ محمد گل- مولد او سر ہند است ۔ در کوٹلہ فیروز شاہ سکونت داشت - درویش متوکل ۔ گاہے فکر ریختہ می کرد " (نکات الشعرا) —

" باوجود مذاق علمی چاشنی فقر داشت ۔ در کوٹلہ فیروز شاہ

سکونت داشت، انزوا گزیدہ اوقات عزیز بیاد الٰہی بسر می
برد...... چیزے از قبیل فارسی بر سبیل تفنن فکر می کرد۔
بندہ روزے بخدمتش حاضر شدم، حرفہائے با مزہ می گفت۔
مدت ہفت سال شد کہ بدار البقا انتقال نمود''۔ (مخزن نکات)۔

ان اطلاعات سے ظاہر ہے کہ یہ سر ہندی بزرگ شیخ مجدد الف
ثانی کی اولاد سے تھے۔ سنہ ۱۱۶۱ ھ میں وفات پا چکے تھے۔ شاہ ولی اللہ
محدث دہلوی کا انتقال سنہ ۱۱۷۶ ھ میں ہوا ہے۔ تاریخی مصرع ہے:۔

او بود امام اعظم دین۔ لایق مولف نے سنہ ۱۱۸۰ ھ لکھا ہے۔ محدث
دہلوی بے شک شاعر تھے لیکن فارسی کہتے تھے۔ 'امین' تخلص تھا۔
(ملاحظہ ہو حیات ولی افضل المطابع)۔ محدث دہلوی نے قرآن پاک کا
ترجمہ فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن کے نام سے کیا تھا نہ کہ اشتیاق سر ہندی نے
شاہ عبدالقادر اشتیاق سرہندی کے صاحبزادے نہ تھے بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ کے۔

اس قسم کی ایک نادر ہوا بات فدوی لاہوری کے متعلق لکھی ہے۔ ''یہ
جب ہندو تھے تو مکند رام بنے رہے اور مسلمان ہونے پر محمد حسن ہوگئے۔
بادشاہ (احمد شاہ) کی تعریف میں انہوں نے ایک قصیدہ عرض کر کے گذارا۔
اس کی بڑی قدر ہوی حضور نے ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا اور تلوار انعام دی۔
سودا سے اور ان سے بڑے معرکے رہے ہیں''۔

فدوی تخلص کے کئی شاعر ہوے ہیں۔ تذکرہ نویسوں کے بیانات ان کے
متعلق زیادہ صاف نہیں۔ اس تخلص کے ایک دو شاعروں کے متعلق کئی شبہات
ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ یہاں ہمیں یہ دکھانا ہے کہ فاضل
مولف نے جس فدوی کا ذکر کیا وہ یہ فدوی نہ تھا۔ نو مسلم فدوی ایک
نہایت عامی اور اوباش شخص تھا۔ شوق اور مصحفی نے اس کو عامیانہ وضع،

زیادہ گو، جنگ جو، نوکر پیشہ بے اندیشہ لکھا ہے۔ یہ غلط ہے کہ اس نے "عمر دلی میں گزار دی" یہ عرصے تک ڈانگے میں نواب محمد یار خاں امیر کی سرکار میں رہا (تذکرہ مصحفی)۔ اس کے بعد فرخ آباد گیا جہاں سودا سے شاعرانہ مجادلہ کیا۔ سودا نے خود لکھا ہے —

اے بیابان نصیحت کے غول بستیوں کو نہ کر تو ڈانوا ڈول
فرخ آباد کے محلوں میں حد سے باہر تو کر چکا ہے کلول

احمد شاہی دربار کا فدوی دوسرا شاعر ہے جس کے متعلق سرور نے لکھا ہے کہ وہ سرکار احمد شاہ میں سوانح نگاری کی خدمت پر مامور تھا۔ شاہ گھسیٹا کا شاگرد تھا۔ ہنگامۂ درانی کے بعد عظیم آباد چلا گیا۔ لاہور کا ایک اور شاعر میر محمد حسین تھا جس کا تخلص فدوی تھا۔ یہ حسینی سید تھا اور جوانی میں لاہور سے دہلی چلا آیا تھا۔ آبرو سے شعر میں اصلاح لیتا تھا۔ قدیم لاہوری فدوی یہی شاعر ہے (سرور و مصحفی)۔ ان دو شاعروں میں سے کسی ایک کو احمد شاہ نے انعام وغیرہ سے سرفراز کیا ہوگا۔ نو مسلم فدوی لاہوری بعد کا شاعر ہے جیسا کہ شوق نے اس کو میر و مرزا کے بعد کے طبقے میں شریک کیا ہے۔ اس تخلص کے اور بھی دو شاعر ہیں جن کا ذکر قایم، عشقی، میر حسن اور قاسم نے کیا ہے لیکن سرفرازی و انعام کا کوئی قرینہ ان کے بیانات سے ان کے متعلق نہیں پایا جاتا۔

ولی دکھنی کا ذکر لایق مولف نے اپنی ناواقفیت کے باوجود اس حقارت سے کیا ہے کہ ان کی بے باکانہ دلیری پر حیرت ہوتی ہے —

"ہمارے تذکروں میں میاں ولی (دکھنی) اردو کے باوا آدم کہے جاتے اور کم نظری کی وجہ سے آج تک وہ سراہے جاتے ہیں مگر ایک ولی کیا کئی ولی نے زبان کی یہ کرامت کبھی نہیں دکھلائی۔ حق یوں ہے کہ ولی محمد شاہ

کے شروع زمانے میں اپنا دیوان بغل میں دبائے ' کھوتے کھرے کی شناخت کے لئے دکھن سے دلی کے ٹکسال گھر تک آے اور اردو سیکھنے لگے " ـــ

فاضل مولف نے تذکرہ نگاروں کی "کم نظری" کا ذکر فرمایا ہے لیکن حیرت ہے کہ ایک قدیم تذکرہ نگار کے بیان پر نظر ڈالنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی - قایم کا تذکرہ چھپ چکا ہے اس نے ۱۱۶۸ ھ میں صاف طور سے لکھا ہے کہ ۱۱۱۲ ھجری (۴۴ سنہ جلوس عالم گیر) میں ولی دھلی گئے تھے - محمد شاہ کی تخت نشینی سے ۱۲ سال قبل (یعنی ۱۱۱۹ ھ میں) ولی کی وفات ہوی ھے - کسی قدیم مستند تذکرے میں ولی بہ عہد محمد شاہ دھلی جانے کا ذکر نہیں - مصحفی نے بحوالۂ حاتم لکھا ھے کہ سنہ دوم جلوس محمد شاہ میں ولی کا دیوان شاہ جہاں آباد پہنچا اور وہاں کے حلقۂ شعرا میں ھل چل ڈال دی اور اس کے اشعار لوگوں کی زبانوں پر جاری ھوگئے - اس کا اثر عرصے تک رھا - شاہ حاتم نے محمد شاہ کی وفات کے آتھہ سال بعد عالم گیر ثانی کے تیسرے سنہ جلوس میں لکھا ھے کہ " در ریختہ ولی را استاد می داند " - ایسی صورت میں ولی کا عہد محمد شاھی میں دھلی جانا اور زبان سیکھنا کہاں مستنبط ھوتا ھے - اس عامیانہ غلطی کو لایق مولف نے تسلیم کر کے بڑے وثوق سے پیش کیا ھے اور اس کے باوجود دوسروں کو " تنگ نظری " کا الزام دیا ھے - ولی کا عہد محمد شاہ میں دھلی پہنچنے اور وھاں کی زبان سیکھنے کا خیال دو وجوہ سے پیدا ھوگیا ھے پہلی وجہ تو وہ ھے جو رسالہ ھذا کے مندرجہ مضمون " ولی کے سنہ وفات کی تحقیق " میں بیان ھوی ھے - دوسری وجہ میر' قایم اور شوق وغیرہ کے بیانات ھیں جن میں شاہ گلشن برھان پوری کی اس ھدایت کی طرف اشارہ کیا گیا ھے کہ انھوں نے ولی کو ریختہ میں طبع آزمائی کرنے کی طرف توجہ دلائی - ولی سنہ ۱۱۱۲ ھ میں دھلی پہنچا

اور سنہ ۱۱۱۹ ھ میں فوت ہوگیا۔ ایسی صورت میں نہ تو یہ عہد محمد شاہی ہے اور نہ یہ لازم آتا ہے کہ سنہ ۱۱۱۲ ھ کے بعد ریختہ میں طبع آزمائی کر کے سنہ ۱۱۱۹ ھ تک اس قدر ضخیم دیوان چھوڑ گیا۔ ولی کا سنہ ۱۱۰۹ ھ سے قبل ریختہ میں طبع آزمائی کرنا ثابت ہے جیسا کہ ذیل کے شعر سے ظاہر ہے —

پڑے سن کر اوچھل جیوں مصرع برق
اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

ناصر علی ۱۱۰۹ ھ میں فوت ہوا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ولی اس سے قبل طبع آزمائی کرتا تھا اور اس کی تردید ہوتی ہے کہ عہد محمد شاہ میں شاہ گلشن کی ہدایت سے ریختہ میں طبع آزمائی کی —

لایق مولف کی نظر میں اردو زبان ترقی کے مدارج اور اس کے ارتقائی رجحانات نہیں ہیں۔ مختلف دوروں اور صدیوں میں اس زبان کے کیا رجحانات تھے اس کی ترقی و توسیع کے کیا اسباب تھے ان تمام ضروری علمی اور اصولی نظریوں سے ہمارے فاضل مولف لاعلم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے زبان کی تدریجی ترقی کا کوئی خاکہ پیش نہیں کیا۔ اس کمزوری کی وجہ سے وہ مختلف دوروں کی لسانی کیفیات میں تمیز نہ کرسکے —

مثالاً ہم دو مختلف اقتباسات پیش کرتے ہیں —

لایق مولف نے اکبر سے ذیل کے اشعار منسوب کئے ہیں —

پوچھی جو گھڑی مجھ سے براہ عادت
تو وصل کو ساعت کی نہیں کچھ حاجت
ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت
ساعت کا بہانہ نہیں خوش ہر ساعت

مولف ذیل کے اشعار کو نور جہاں بیگم کے مصنفہ تسلیم کرتے ہیں —

دیں جگہہ زخم جفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھہ بوی وفا اس بت بیباک میں ہم
نقش پا کی طرح اے راحت جان عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

ذیل کے اشعار کے متعلق لایق مولف کا دعوی ہے کہ اردو ہیں اور " یہی وہ زبان تھی جو اس صدی (اواخر گیارھویں صدی هجری ' عہد عالم گیر) میں بولی اور سمجھی جاتی تھی " —

دلی سہر سہاونا اور کنچھن برسے نیر
سب کے کنت بٹور کے لے گئے عالم گیر
بیٹھی رہو کرار سے من میں راکھو دھیر
ایکہ بچھڑے تب ملیں جب بوھریں عالم گیر

ان نمونوں سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکبر و جہانگیر کے عہد کی زبان سے هم قریب ہیں اور عالم گیری عہد کی زبان سے بہت دور - کیا مولف اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عہد اکبر و جہانگیر میں وہی زبان بولی جاتی تھی جو آج هم بول رہے ہیں اور کیا عالم گیر کے زمانے کی زبان نے ترقی کرکے تین پشتوں کے بعد یہ شکل اختیار کرلی تھی کہ سہر (شہر) کنچھن (سونا) نیر (پانی) کنت (خاوند) جیسے تھیٹ انگھڑ هندی الفاظ استعمال ہونے لگے تھے - اصل یہ ہے کہ جس زبان کو لایق مولف اکبر و جہانگیر کے دور کی زبان سمجھتے ہیں وہ عہد محمد شاہی کی زبان ہے - اس میں مطلق شبہ نہیں کہ یہ اشعار اکبر اور نور جہان سے غلطی سے منسوب ہوگئے ہیں - اور جس زبان کو وہ عالم گیری عہد کی زبان کہتے ہیں وہ خالص هندی ہے اور آج بھی کم و بیش

اسی طرح رائج ہے —

اگر لایق مولف زبان کے فطری ارتقا کی باریکیوں سے واقف ہوتے تو ضرور ان اشعار کے زمانے کے تعین میں اس قدر فاش غلطی نہ کرتے - اس کوتاہی کے باوجود فاضل مولف کی یہ الٹی زبردستی کسی طرح روا نہیں - وہ عہد عالمگیر کی تہمت ہندی کے متعلق فرماتے ہیں کہ اسے سوا اردو کے کچھہ اور سمجھنا زبان کے اتار چڑھاو اور اس کے مدارج سے لاعلمی ہے —

لایق مولف نے سنی سنائی باتوں پر اکتفا کرلیا ہے اور مستند ماخذوں کے مطالعے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی محمد شاہ بادشاہ سے یہ شعر منسوب کیا ہے -

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی
دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشہ کنـ کا

گردیزی ، شفیق اور سرور نے یہ شعر محمد صلح آگاہ سے منسوب کرکے اس طرح نقل کیا ہے —

پیری میں کرو سیر جہان کی تو مزا ہے
دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گذری کا

اگر فاضل مولف چمنستان شعرا پر ایک نظر ڈالتے تو ان کو محمد شاہ کے آٹھہ شعر مل جاتے - اور اس غلطی کا شکار نہ ہوتے —

لایق مولف نے غالباً عمداً یہ کوشش کی ہے کہ ماخذوں کے حوالوں سے کتاب آلودہ اور بوجھل نہ ہونے پاے - اکثر مشتبہ ، تحقیق طلب اور مختلف فیہ امور کے متعلق بھی حوالے نہیں دیے اور چند چیزیں تو اس طرح پیش کی ہیں کہ گویا اس سے قبل معرض تحقیق میں آئی ہی نہ تھیں - صفحات ۷۳ تا ۸۱ پر کوہل کتھا کے متعلق بڑی طویل بحث کی ہے اور اس کے نثری دیباچے کا ایک طویل اقتباس بھی درج کیا ہے اور حوالہ اس طرح دیا

ہے کہ گویا یہ ان کی ذاتی تحقیق ہے حالانکہ اقتباس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولف نے تاریخ شعرائے اردو (ترجمہ فیلن و کریم الدین) کے حالات ۵۷ تا ۶۱ سے حرف بحرف نقل کیا ہے - اس نقل میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں - اگر یہ مولف کی ذاتی تلاش ہوتی تو اقتباس کے انتخاب میں کچھ تو فرق ہوتا ' لیکن یہاں ایک نقطے کا بھی فرق نہیں حالانکہ قلمی نسخوں کے رسم الخط وغیرہ میں کافی فرق ہوجاتا ہے - شاید یہ بھی تو اردو کی کوئی قسم ہو —

فاضل مولف ایک کہنہ مشق ادیب ہیں - ان کی طرز تحریر کے متعلق کسی کو یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ زبان کی علمی تاریخ کے لیے ناموزوں و نامناسب ہوگی - کتاب کے موضوع کے لیے ایک سنجیدہ و پختہ اسلوب ادا کی ضرورت ہے - قلم پر ضبط و قابو چاہیے - جب ہم اس نظر سے کتاب کو دیکھتے ہیں تو بڑی مایوسی ہوتی ہے - اس میں ضبط و متانت اور تمکین و تحمل کے آثار بہت کم ہیں - کتاب میں جا بجا خطیبانہ جوش اور واعظانہ بلند آہنگی ہے اور اکثر جگہ ڈرامائی زبان میں اثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے میں ایک دو مقام نقل کرتا ہوں " شاہ عالم آپ کے شاہانہ اخلاق اور آپ کی رعایا پروری پر ہندوستان قربان ! آپ نے صرف یہاں کی زبان کو نہیں سرفراز بلکہ اپنی رعیت کو بھی ہمیشہ نوازا - ایک برہمنی آپ کی بہن اور شہزادیوں کی چھوٹی بنی - اس کے ہاتھ سے آپ نے راکھی بندن بندھوایا اور ہندو مسلم رشتے کو مضبوط کر دکھایا " —

" یہ تھا اس وقت کے امرا کا روزمرہ اور یہ تھی وہ ٹکسالی اردو جو ہمہ شما کے گھروں میں نہیں بلکہ ان امیروں کے

محلوں میں پلی اور وہاں سے نکل کر ہمارے شعرا کے منہ میں پڑی - نواب کی ایک غزل اور سن لو' سردھنو اور داد دو " -
"اکبر بادشاہ! ہم آپ کی بے تعصبی کو کیونکر بھول سکتے اور آپ کے اس وفادار کو کس طرح فراموش کرسکتے - آپ کی پاک و صاف روح پر فاتحہ پڑھتے اور آپ کو سلام کرتے ہیں - قبول کیجئے ! " -

اس طرز ادا اور اسلوب بیان کو نبھانے کی غرض سے لایق مولف کو جگہ جگہ تشبیہات و استعارات سے کام لینے اور صنایع بدایع کے استعمال کرنے میں پورا زور مارنا پڑا اور طرز ادا کے ایسے سانچے وضع کرنے پڑے جن میں جدت و ندرت نظر آے - لایق مولف کو اس میں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوی - صنایع بدایع کے الجھیڑے میں پھنس کر لایق مولف نے جملوں کی صحیح ساخت اور ان کی معنویت کی پروا نہیں کی اور جگہ جگہ اپنے خیال کو اس انداز میں ادا کیا کہ جدت کی جگہ بدعت نے لے لی - ان کی بھی چند مثالیں سن لیجیے —

"میرضاحک بھی اسی خزاں دیدہ باغ (دلی) کے وہ گل اور میرحسن بھی اُسی اُجاڑ چمن کے وہ پھول ہیں جو حضرت دہلی کو بھرے دل سے رخصت کرتے اور فیض آباد کے سے گلزار میں قدم رکھہ کر اردو کے پودے کو سینچتے ہیں " —

اس خوبصورت جملے کا تجزیہ کیجئے تو اس کی معنویت عجب مضحکہ خیز ہوجاتی ہے - "گل" اور "پھول" "پودے کو سینچے - " ہوے نظر آتے ہیں - یہ دیکھہ کر ہمیں بڑی حیرت ہوی کہ لایق مولف نے بعض محاورے اور لفظ اس طرح استعمال کئے ہیں کہ ان کی صحت ہر طرح مشتبہ ہے - اساتذہ کی تصانیف میں ان کا استعمال کبھی اس طرح نہیں ہوا جس طرح

حضرت خیال نے کیا ہے —

" اس ملک کا خون اس ابدالی کے منہ میں لگ چکا تھا "؛

منہ میں خون لگنا نہیں منہ کو خون لگنا ہے —

" بادشاہ خوش اور رعیت پھولوں نہ سماتی " ص ۱۰

" بادشاہ ... باغ باغ ہوتا ' پھولوں نہ سماتا " ص ۱۰

محاورہ پھولے نہ سمانا ہے یہ فعل پھولنا سے ہے لفظ پھول (بمعنی گل) سے نہیں —

" عمدۃ الملک تھوے کی دو پیالیاں بناکر اور کشتی میں رکھ کر حضور میں لائے لیکن سوچے کہ دو میں سے کس بادشاہ کے آگے پہلے پیالی رکھوں " —

سوچنا متعدی فعل ہے اس کے ساتھ بصیغہ ماضی " نے " کا استعمال ہوتا ہے —

" یہ زبان اہل ہند ... ... زمین ہند کا وہ عام میوہ تھی جو بزار میں لایا اور مزے لے لے کر کھایا گیا "

لایق مولف نے اس کتاب میں اور کئی جگہ بازار کو بزار ہی لکھا ہے ۔ بول چال میں شاید عوام کے علاوہ خواص بھی بولتے ہوں لیکن تحریری زبان اور ادب میں یہ بازار ہی استعمال ہوتا ہے —

" زبانوں سے الفت اور رعایا کی بھاکھا پر رغبت اس خاندان کا آئین رہا ہے " —

رغبت کے ساتھ " سے " استعمال ہوتا ہے ۔ بھاکھا سے رغبت فصیح ہے —

ان نقائص اور خامیوں کے باوجود لایق مولف نے نہایت دلیری سے

بعض قدیم واجب التعظیم ادیبوں کو لعن طعن اور سب و شتم کا ہدف بنایا ہے ۔ ان میں مرحوم آزاد دہلوی سب سے زیادہ مورد ملامت ہیں ۔ آزاد مرحوم کی آب حیات اپنی بعض واقعاتی غلطیوں کے باوجود اردو زبان میں ایک خاص پایہ رکھتی ہے ۔ تاریخ کی حیثیت سے نہ سہی افسانے کی حیثیت ہی سے اس کو دیکھیے ۔ اس کی زبان اور اس کا اسلوب بیان اس قدر شستہ و رفتہ ' سلیس و پاکیزہ اور دلچسپ ہے کہ ہمارے ادب میں اس کی بہت کم مثالیں ہیں ۔ آزاد مرحوم کا یہ کیا کم احسان ہے کہ اس نے سب سے پہلے تاریخ ادب کے لکھنے کا ڈول ڈالا اور ہمیں یہ خیال سجھایا ۔ بے شک آزاد کی غلطیوں کو دکھائیے لیکن اس پر لعن طعن کی بوچھار نہ کیجیے اور خصوصاً ذرا روا اور بیجا ۔ لایق مولف نے اس مرحوم کے متعلق لکھا ہے —

" آزاد مرحوم کی روح نہ شرمائے ' افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ اپنی انشا پردازی کی دھن میں آنکھیں بند کر لیتے اور اپنے قلم کو آزاد کر دیتے ہیں " —

" ہمارے آزاد ' اپنی قصہ گوئی میں اکثر بہت بڑھ جاتے اور ادھر اُدھر نہیں دیکھتے " " آزاد مرحوم اپنے مورخ ہونے کے مدعی نہیں اس لئے وہ تاریخی غلطیاں کر جائیں تو قابل معافی ہیں مگر تذکرے کی غلطیاں اور پھر اس طرح کی داستان سرائیاں لایق معافی نہیں "

لایق مولف آزاد مرحوم کی جن غلطیوں سے خفا ہیں ان میں سے اکثر آج صحیح ثابت ہو رہی ہیں ۔ اس کتاب میں آب حیات کی جن غلطیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے سوائے ایک آدھ کے سب صحیح ہیں ۔ اس کا تفصیلی ذکر یہاں طوالت کا باعث ہے ۔ اور کیا " مغل اور اردو " اس

قسم کی غلطیوں سے پاک ہے - یہی عیوب اس کتاب میں نہایت بھونڈے طریقے سے موجود ہیں - ہم نے اوپر دکھایا ہے کہ اس میں لفاظی ہے ' غیر معتبر واقعات ہیں - تحقیق و تدقیق کے ہفت آزما محنت و عمل سے حضرت خیال کوسوں دور ہیں - ان کی کتاب خیالی اور قیاسی باتوں کا مجموعہ ہے ' جس میں افسانے کی پوری شان ہے - اپنی اصل کتاب کا نام جو انہوں نے " داستان اردو " رکھا ہے غالباً اسی بنا پر یہ اردو زبان کی علمی تاریخ نہیں " خیالی " داستان ہے —

(چ)

هندی شاعری

از

ڈاکٹر اعظم کرلوی شائع کردہ هندوستانی ایکاڈمی
الہ آباد یو۔ پی قیمت دو روپے

جس طرح چلتی ہوی ریل گاڑی کی کھڑکی میں سے آدمی پہاڑ ' جنگل' کھیت اور ندیوں کے بڑے بڑے نظاروں کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھ لیتا ہے اسی طرح اس کتاب کے مطالعے سے هندی کے پرانے شعرا کی شاعری کی ایک هلکی سی جھلک نظر آجاتی ہے - کتاب کے دیکھنے سے جہاں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ مولف ایک زندہ دل اور شاعرانہ طبیعت رکھنے والے آدمی ہیں وهاں اس سے بھی زیادہ نمایاں یہ بات نظر آتی ہے کہ انہیں هندی شاعری سے کما حقہ واقفیت نہیں ہے - یہ واقفیت ایسی هی ہے جیسے

سوسری اور سطحی کہا جاسکتا ہے - انہوں نے ہندی کے بعض اہل قلم حضرات کو ہندی شاعروں کے بارے میں ایسا مستند (حکم) مان لیا ہے کہ وہ ان کی آراء کو ان شاعروں کے بارے میں لکھہ دینا ہی کافی سمجھتے ہیں - " چند بردائی " کی زبان کا جو نمونہ انہوں نے دیا ہے وہ ایسا نہیں ہے جس سے " چند بردائی " کی زبان کا تھوڑا سا بھی صحیح اندازہ ہوسکے - ہندی شعرا میں انہوں نے گوسائیں تلسی‌داس کی شاعری کے بہت سے عمدہ نمونے دیے ہیں لیکن سورداس کا انہوں نے بالکل برائے نام ذکر کیا ہے - حالانکہ برج بھاشا کی سادگی اور شیرینی جیسی سورداس کی شاعری میں نظر آتی ہے ویسی کسی پرانے ہندی شاعر کے کلام میں نہیں ملتی - انہوں نے اور بھی ہندی شعرا کا جو حال لکھا ہے وہ بالکل ہی مختصر اور معمولی ہے اور اُن کے کلام کے جو نمونے دیے ہیں وہ پر لطف تو ہیں لیکن ان کی ترتیب میں کوئی خاص دل کشی نہیں ہے —

انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے " متھرا اور مغربی علاقوں کی پراکرت کا نام برج بھاشا (متھرا کی زبان) ہے - " یہ بات صحیح نہیں ہے - متھرا کے علاقے کی پراکرت کو شورسینی پراکرت کہتے ہیں اور اسی شورسینی پراکرت سے برج بھاشا پیدا ہوی ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اُسی پراکرت کا نام برج بھاشا ہے - انہوں نے اسی طرح کی اور بہت سی باتیں لکھی ہیں جو قابل قبول نہیں معلوم ہوتیں —

پھر بھی جس مقصد کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ نہ صرف قابل تعریف ہے بلکہ قابل تقلید بھی ہے - اس کتاب کے لکھنے کا منشا یہ ہے کہ اردو داں طبقے کو ہندی شاعروں سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ بھی انہیں سمجھنے اور ان کی داد دینے کے قابل ہوسکے - اس میں شک نہیں کہ اس کتاب

سے اردو داں حضرات ہندی شاعری کا کچھہ نہ کچھہ ضرور لطف اٹھا سکیں گے —
(و - د)

کبیر صاحب

(مولفہ پنڈت منوہر لال زتشی - شائع کردہ ہندوستانی
ایکاڈمی الہ آباد یو - پی قیمت دو روپے)

— —

ہم نے اس کتاب کا نہایت شوق سے مطالعہ کیا - مولف نے کبیر کو ایک خالص مذہبی آدمی خیال کرکے اُن کے کلام پر تنقید کرنے کی کوشش کی ہے - ایک طرف تو انہوں نے مذہب کی تعریف بالکل سائنٹفک طور پر لکھی ہے اور دوسری طرف کبیر کے حالات لکھتے ہوے انہوں نے اُن سب باتوں کا حوالہ دیا ہے جن سے کبیر ایک مافوق البشر ہستی معلوم ہوتے ہیں انہیں کبیر کے بارے میں ہندی کتابوں سے جو کچھہ مسالا ملا ہے اُسے اُسی طرح اپنی اس کتاب میں نقل کردیا ہے - اس کی اچھی طرح چھان بین نہیں کی ہے - کیا اچھا ہوتا اگر وہ کبیر کی زندگی کے حالات بھی اسی طرح تحقیق کرکے لکھتے جس طرح انہوں نے مذہب کے متعلق سائنٹفک طریقے پر تحقیق کرکے لکھا ہے —

"ہندو مذہب کا ارتقا" انہوں نے بہت کچھہ خیالی بنیاد پر لکھا ہے نہ کہ تاریخی واقعات کی بنیاد پر - آج ہندوستان بھر میں کبیر کی شہرت اس لیے نہیں ہے کہ اُن کی وجہ سے "کبیر پنتھہ" چل پڑا - مذہبی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے ہندؤوں اور مسلمانوں کی معاشرتی زندگی پر کبیر کا کوئی

خاص اثر نظر نہیں آتا ۔ لیکن انھوں نے اپنی باتوں کو جس فور و خوض ' باریک بینی اور روز مرہ کی چلتی ہوی عام فہم اور سیدھی زبان میں لکھا ہے اس وجہ سے وہ ہندی ادبیات اور ہندوستان کے ایک انمول رتن بن گئے ہیں ۔ ڈاکٹر رونندر ناتھہ ٹگور کی کتاب One Hundred Poems of Kabir کے مقدمے میں Evelyn Underhill نے ٹھیک لکھا ہے :-

" But his wonderful songs survive, the spontaneous expressions of his vision and his love and it is by these, not by the didactic teachings associated with his name, that he makes his immortal appeal to the heart."

" لیکن اس کی حیرت انگیز نظمیں زندہ ہیں ۔ وہ اس کی محبت اور تخیلات کی قدرتی شاہکار ہیں۔ ہمارے دلوں پر انہیں کا گہرا اور لافانی اثر پڑتا ہے نہ کہ اُن پند آمیز تعلیمات سے جو کبیر سے نامزد ہیں "۔

کبیر کی زبان میں کسی قسم کا تصنع نہیں ہے۔ اس سے یہ سمجھہ لینا بڑی غلطی ہوگی کہ کبیر زبان سے ناواقف تھا ۔ کبیر کی زبان دل کی زبان ہے ' جذبات کی زبان ہے اور اسی لیے وہ راست دل پر اثر کرتی ہے ۔ آج کبیر کے کلام کا کتنا ہی حصہ کہاوتوں کی شکل میں آ چکا ہے جو خواص و عوام کے نوک زبان ہے ۔ اس جلاہے نے اپنے دل کو اپنے جذبات کے تانے بانے میں بُن کر ہندی زبان کا جو قماش تیار کیا ہے اس کی قدر ایک تاج محل ' اجنتہ اور ایلورا کی بے مثل صناعی سے کسی طرح کم نہیں ہے ۔ اس کتاب میں کبیر کے شاعر ہونے کے متعلق بہت ہی کم لکھا گیا ہے اور اس نقطۂ نظر سے اس کے دلی جذبات کی تشریح کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے ۔ اگر اس

کتاب کے مولف کبیر کے اس پہلو پر تفصیل سے غور کرتے تو کتاب کی قدر و منزلت بڑھ جاتی لیکن چونکہ اب تک اردو زبان میں کبیر پر کوئی اچھی کتاب موجود نہیں ہے اس لیے امید ہے کہ یہ کتاب اس کمی کو ایک حد تک پورا کرے گی —

(و ۔ د)

متفرقات

کلید قرأت

(یعنی تجوید کی پہلی کتاب ۔ مولنا خلیل احمد صاحب فاضل دینیات جمالیہ عربک کالج ' پرمبور پارکس ۔ مدراس)

اس مختصر رسالے میں صحیح قرأت کے اصول سبقوں میں تقسیم کرکے لکھے گئے ہیں ۔ ہر سبق کے آخر میں سوالات بھی دیدیے ہیں ۔ تجوید کی یہ کتاب بہت آسان اور سلیس زبان میں لکھی گئی ہے ۔ اس فن کے مبتدیوں کے لیے بہت کار آمد ہے —

سالنامے

کارواں

مرتب جناب مجید ملک صاحب ۔ چابک سواراں ' لاہور

قیمت دو روپے آٹھ آنے)

کارواں عید کے چاند کی طرح سال میں ایک بار نمودار ہوتا ہے اور اس کے دیکھنے سے وہی خوشی ہوتی ہے جو ایک روزہ دار مسلمان کو عید کا چاند دیکھنے سے ہوتی ہے ۔ یہ بہت سی خوبیوں کا مجموعہ ہے اور لکھائی چھپائی کی نفاست مضامین کے تنوع اور خاص کر تصاویر و نقاشی کے انتخاب کے لحاظ سے اردو میں تو کیا شاید ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں بھی اپنا نظیر نہیں رکھتا ۔ اس رسالے نے اردو میں صناعی اور ادب کو ملانے کی کوشش کی ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ اس وصل میں خوش مذاقی کو مدنظر رکھا ہے ۔ میں اب اس کے ظاہر و باطن پر ایک سرسری سی نظر ڈالتا ہوں —

سب سے پہلی چیز اس کا سرورق ہے ' اس میں ایشیائی صناعی کو اس کے رنگ میں ظاہر کیا ہے اور بلاشبہ دل کش ہے ۔ اس کے بعد فاضل مرتب کے "سخنہاے گفتنی " اور ناگفتنی" دونوں پڑھے ۔ انہیں لکھنے کا بہت اچھا سلیقہ ہے لیکن ان میں " گفتنی" کے ساتھ ناگفتنی باتیں بھی آگئی ہیں ۔ یہ ' اور بعض اور مضمون بھی اس رسالے میں ایسے درج ہوگئے

جن میں "اخباری" جھلک نظر آتی ہے۔ خدا کے فضل سے لاہور میں بہت سے اخبار ہیں اور ان میں گنجائش بھی کافی ہے۔ ان کے راقم اگر ان اخباروں میں خامہ فرسائی کرتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ ایسی چیزیں کاروان کی شان کے خلاف ہیں اور جو مقصد اس نے پیش نظر رکھا ہے اس سے گری ہوئی ہیں۔ قابل اڈیٹر کو اپنی قوت فیصلے سے کام لینا چاہیے اور نام پر نہیں جانا چاہئے۔ میں اگر کارواں کا اڈیٹر ہوتا تو ان میں کے کئی مضمون روز اخباروں یا ماہانہ رسالوں میں تقسیم کردیتا۔ لکھنے والے اور اڈیٹر دونوں خوش ہوجاتے۔ اُن کی خاصی شہرت ہوجاتی اور یہ مضامین فراہم کرنے کی سردردی سے بچ جاتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمیں اڈیٹر کی مجبوریوں کا بھی خیال رکھنا چاہئے۔ اُن کی یہ شکایت بالکل بجا ہے کہ "ہندوستان میں مضمون نگار کا حلقہ اس قدر محدود ہے کہ سال میں دو مرتبہ بھی اعلیٰ پائے کا رسالہ نکالنا قریب قریب ناممکن کے ہے"۔ اور ان کا یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ مسلم قابلیت کے حضرات سے "ہم بار بار اصرار بھی نہیں کرنا چاہتے' کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے اصرار سے مجبور ہوکر اگر وہ لکھ بھی دیں گے تو غالباً وہ کاروان کے معیار پر پورا نہ اُترے گا"۔ اس سچے قول کی تصدیق خود رسالے سے بھی ہوتی ہے کہ بعض مضمون ایسی ہی حالت میں لکھے گئے ہیں اور وہ کاروان کے معیار کے مطابق نہیں۔ یہ مجبوری ہے اور اس سے بچنا مشکل ہے ___

خیر' سخن ہائے گفتنی اور ناگفتنی" کے بعد رسالہ سال گزشتہ کی طرح سر اقبال کے اردو شعر سے شروع ہوتا ہے جو انہوں نے خاص اسی رسالے کے لئے عطا فرمایا ہے۔ گزشتہ سال آپ نے غزل عنایت فرمائی تھی اور اسی سال یہ شعر یہ کہہ کر عنایت فرمایا " تم غزل لے کر کیا کرو گے '

میں تمہیں ایک ہی شعر دیتا ہوں لیکن ایسا شعر جسے بیسیوں اشعار سے بہتر جانتا ہوں" —

نمود تری نمود اُس کی، نمود اُس کی نمود تری
خدا کو تو بے حجاب کردے! خدا تجھے بے حجاب کردے

کاروان بہت خوش نصیب اور قابل رشک ہے۔ سر اقبال کے قلم سے جو کچھ نکلے (خاص کر اردو میں) وہ سرآنکھوں پر رکھنے کے لائق ہے۔ شعر اچھا ہے خاصا ہے لیکن اس میں نہ تخیل ہے نہ جدت اور نہ شاعرانہ صناعی، مگر اقبال کا ہے، اور یہ کافی ہے —

رسالے کے پڑھنے کے بعد اس بات کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ باوجود اُن موانعات اور مشکلات کے جو اس پایے کے رسالے کے لیے مضامین فراہم کرنے میں پیش آتی ہیں، کاروان کے کار فرماؤں اور کار پردازوں نے ادب و تاریخ کے محققانہ مضامین، فسانے، نظمیں، ڈرامے، مزاحیہ مضمون، صناعی اور جدید فوٹوگرافی کے عمدہ اور نفیس نمونے جس طرح اس میں جمع کردیے ہیں وہ بہت قابل تعریف ہے۔ ان کی ہمت، محنت اور سلیقے کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ خاص کر اسلامی کوزہ گری، اردو ڈرامے کی مشاطگیں، پنجاب میں اردو کا ایک فراموش شدہ ورق، مسلمانوں میں مصوری کا ارتقا پڑھنے اور غور کرنے کے قابل ہیں۔ ترجمے کے لیے بعض فسانے بھی اچھے انتخاب کیے ہیں۔ آرٹ کے نمونے بھی اس سال بے مثل ہیں، انہیں دیکھ کر واقعی روح تازہ ہوتی ہے اور بڑی خوبی یہ ہے کہ علاوہ مغل اور راجپوت مصوری کے روس، جاپان، ہالینڈ، جرمنی کے مصوروں کے بھی شہکار موجود ہیں۔ مجھے چغتائی کا قلندر بہت پسند ہے اس کی آنکھیں اور اس کا رنگ ڈھنگ بہت ہی خوب اور نمایاں ہے۔ جدید فوٹو گرافی کے نمونے ایسے اچھے پہلے کسی رسالے

میں نہیں آئے —

آخر میں اردو مطبوعات پر تبصرے ہیں اگرچہ ان تبصروں میں کوئی خاص بات نہیں تاہم انہوں نے اس ضروری چیز کو فراموش نہیں کیا۔ اگر یہ چیز نہ ہوتی تو ایک کمی رہتی —

غرض یہ رسالہ ادب و صحافت کا ایسا اچھا مرقع ہے کہ اگر میں اسے اردو سالناموں کا سرتاج کہوں تو بالکل بجا ہے —

سالنامۂ نیرنگ خیال (لاہور) قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

نیرنگ خیال نے سالنامے کی ایسی چاٹ لگادی ہے کہ اب اردو کے اکثر رسالے سالنامے شایع کرنے لگے ہیں اور جستجو اور محنت کر کے اچھے اچھے مضمون، فسانے اور نظمیں جمع کر کے شایع کرتے ہیں۔ طباعت کی نفاست کا بھی خیال رکھتے ہیں اور تصویریں شایع کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ نیرنگ خیال مسلسل کئی سال سے، علاوہ بعض خاص نمبروں کے، سالنامہ شایع کر رہا ہے۔ سنہ ۳۴ کا سالنامہ بھی گزشتہ نمبروں کی طرح خاصا ضخیم ہے اور ہر طرح کے سنجیدہ اور مزاحیہ مضمون، فسانے اور نظمیں اور تصویریں موجود ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ قابل مرتب لوگوں سے اس قدر مضامین کیونکر حاصل کرلیتے ہیں۔ یہ سالنامہ بھی تین سو صفحے کے لگ بھگ جا پہنچا ہے جس میں سبھی کچھ ہے۔ تاریخ بھی ہے، ادب بھی ہے،

غزلیں بھی ہیں نظمیں بھی ہیں، فسانے اور فسانہ نما مضمون' اور نثر تو اس کی خصوصیت ہے - اور لکھنے والے بھی معمولی نہیں - بہرحال بہت اچھا مجموعہ ہے اور نیرنگ خیال کی بڑی تعریف ہے کہ اس نے اردو داں طبقے اور اپنی برادری میں ایک خاص شوق پیدا کردیا ہے اور دوسری بات یہ ہے جو اس نے خود ہی لکھ دی ہے کہ وہ "فرقہ پرستی (اور اتنا میں اپنی طرف سے اضافہ کرتا ہوں کہ صوبہ پرستی) کی لعنت سے پاک ہے"۔ نیرنگ خیال مقبول بھی ہے اور اس کے مقبول ہونے کی وجوہ بھی ہیں —

سالنامۂ ساقی - (دہلی) قیمت ایک روپیہ

ساقی بھی ہر سال اپنا سالنامہ شایع کرتا ہے اور سنہ ۳۴ کا سالنامہ گزشتہ سالناموں سے بہتر ہے - اگرچہ ضخامت میں وہ اردو کے ماہانہ رسالوں کے بعض سالناموں سے مقابلہ نہیں کرسکتا لیکن مضامین کے لحاظ سے وہ کسی سے ہیٹا نہیں - یہ ضرور ہے کہ ایسے مضامین جن کے لیے غور و فکر کی ضرورت ہو کم ہیں مگر لطف اور دلچسپی کی چیزیں بہت سی جمع ہیں - دو چار تصویریں بھی ہیں جو اعلیٰ درجے کی تو نہیں مگر پھر بھی بہت اچھی ہیں - ان میں دو ہندی مسلمان مصوروں کی ہیں اور خوب ہیں' اور تین فوٹو جاپانی آرٹ ہیں —

سالنامۂ ادبی دنیا- لاہور - قیمت آٹھ آنے

یہ سالنامہ بھی مضامین کا اچھا مجموعہ ہے خاص کر جناب کیفی (پنڈت برجموہن دتاتریہ) کا مضمون تذکیر و تانیث ' محمد حسین صاحب ادیب کا "برہمنی مذہب پر دراوڑی اثر" اور سید حسین برنی صاحب کا " سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوؤں کی حالت " اور حفیظ ' اختر ' امجد ' کیفی ' آزاد ' عابد ' فاخر کی نظمیں پڑھنے کے قابل ہیں —

ادبی دنیا نے اس سالنامے میں سنجیدہ ادبی مضامین کے جمع کرنے میں جو کوشش کی ہے وہ تعریف کی مستحق ہے - شروع میں " آئینۂ عالم " کے تحت میں تازہ علمی معلومات بہم پہنچائی ہیں - سالنامہ بحیثیت مجموعی دلچسپ ہے —

اُردُو کے جدید رسالے

شاہجہاں

(اڈیٹر سید ولایت حسین دہلوی و اسعدالاشرقی دہلوی

کٹرہ پریاں ۵ دہلی - سالانہ چندہ تین روپے

یہ نہم ماہی رسالہ دہلی سے حال میں شایع ہوا ہے - علمی اور ادبی مضامین ہوتے ہیں - جناب پنڈت برجموہن دتاتریہ صاحب کیفی کا مضمون' آزاد مرحوم پر بہت خوب ہے - فسانے اور نظمیں بھی ہیں - رسالہ دلچسپ اور مطالعے کے قابل ہے —

دبستان

(اڈیٹر غلام سرور فگار و رحیم اللہ خاں شاہ سیالکوٹ ؛
پنجاب ۔ سالانہ چندہ تین روپے)

یہ ماہانہ سیالکوٹ سے شایع ہوتا ہے ۔ زیادہ تر ادبی مضامین ' فسانے اور نظمیں ہوتی ہیں ۔ ایک حصہ بچوں کے لیے ہے ۔ بادۂ کہن کے عنوان کے تحت میں بعض ادبی بحثیں ہوتی ہیں ۔ گلہائے تازہ کے عنوان سے بعض رسالوں یا کتابوں سے چھوٹے چھوٹے انتخاب درج کیے جاتے ہیں —

فطرت

(مدیر اعزازی ادیب الملک حضرت یوسف بلخی ایم ۔ اے '
دوسرے مدیر صبا رشیدی بی ۔ اے اور منظور عالم ماہی ۔
راجگیر (پٹنہ) قیمت سالانہ تین روپے آٹھ آنے)

اس ماہانہ رسالے میں تاریخی اور نظم و نثر کے مضامین درج ہوتے ہیں ۔ تنقیدی تحریریں بھی پائی جاتی ہیں ۔ رسالہ مصور ہے ۔ خیالی مضمون اور فسانے بھی ہوتے ہیں —

علی گڑھ میگزین

اس میگزین نے آل احمد سرور صاحب کی اڈیٹری میں بہت اچھی ترقی کی ہے۔ اکتوبر کا رسالہ گوناگوں مضامین سے پر ہے۔ اس میں علمی ادبی، تنقیدی مضامین کے علاوہ اچھی اچھی نظمیں اور بعض فسانے بھی ہیں۔ مدیر صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے قابل قابل حضرات سے مضامین حاصل کیے ہیں۔ حجم بھی پہلے سے زیادہ ہے اور ۲۲۶ صفحے کا ہے۔ کتابوں پر تبصرے بھی غور سے لکھے گئے ہیں۔ بعض مضامین تحقیق اور خوبی کے لحاظ سے خاص طور پر مطالعے کے قابل ہیں۔ مثلاً مولانا سید سلیمان ندوی کا مضمون "ہندوستان میں ہندوستانی"۔ علاوہ مضامین کی بوقلمونی اور خوبی کے چھپائی لکھائی بھی قابل تعریف ہے۔

گشتی چٹھی

حضرت غالب دہلوی کے قدر شناسوں کی خدمت میں -

جناب من'

تسلیم - یہ امر بلا شبہہ موجب مسرت ہے کہ غالب کے اردو خطوں اور رقعوں کی اشاعت بہت کافی و وافی ہوئی اور ہو رہی ہے' چنانچہ " اردوے معلی " اور " عود ہندی " کے مختلف ایڈیشن دہلی' لاہور' آگرے' لکھنو' الہ آباد وغیرہ سے شائع ہوے - مگر ساتھ ہی اِس کے کمال افسوس کی بات یہ ہے کہ اِن دونوں کتابوں میں سے ایک کا بھی کوئی ایڈیشن ایسا نہیں کہ اسقام و اغلاط سے پر نہ ہو —

کتابت کی غلطیوں اور چھاپے کی خرابیوں سے قطع نظر' کبھی کوئی کوشش اِس بات کی بھی نہیں کی گئی کہ یہ جواہر پارے تاریخی ترتیب کے لحاظ سے مرتب کیے جائیں اور اُن کے متعلق ایسا تاریخی مواد اکٹھا کیا جاے جس سے اس ہمارے مایۂ ناز شاعر اور نثار کی صحیح تصویر نظر کے سامنے آئے - اگر اب بھی اِس طرف توجہ نہ کی گئی تو دس بیس برس بعد ضروری تاریخی مواد کا فراہم ہونا محال ہو جاے گا - اِس خیال نے مجھے اس کام پر آمادہ کیا اور میں نے باوجود اپنی بے بضاعتی کے عملی کوشش شروع کردی -

خدا کا شکر ہے کہ دو تین برس کے کام کا نتیجہ بہت ہمت افزا رہا :—

(۱) غالب کی کچھہ تحریریں ایسی جمع ہوگئیں جو اب تک نہیں چھپی ہیں ۔ ان میں بعض اصل رقعے غالب ہی کے ہاتھہ کے لکھے ہوے ہیں ۔

(۲) جو رقعے وغیرہ ملک کے مختلف رسالوں میں وقتاً فوقتاً شائع ہوے وہ بھی اِکٹھا ہوگئے ہیں —

(۳) " اردوے معلیٰ " اور " عود ہندی " کے مختلف مطبوعہ نسخوں کا مقابلہ اور تنقیح کر کے متن کی تصحیح کرلی گئی ہے ' گو کہ ابھی تک اصل رقعے دستیاب نہیں ہوے —

(۴) جو رقعے " اردوے معلیٰ " اور " عودہندی " یا مختلف رسالوں میں آگئے ہیں اُن کے علاوہ بھی ملک میں غالب کی بہت سی تحریریں مختلف خاندانوں میں یقیناً محفوظ ہیں ' جن میں سے صرف بعض کا پتا چلا ہے ۔ انھیں کے حاصل کرنے میں آپ حضرات سے میں مدد چاھتا ہوں ؛ تاکہ جہاں تک ایسی تحریریں مل سکیں غالب کے اردو رقعات کی مجوزہ اشاعت میں شامل کرلی جائیں ۔ اب غالب کے قدر شناسوں اور اپنے ہمدردوں سے میری درخواست ہے کہ وہ :—

(الف) غالب کا کوئی خط ، رقعہ یا اور کسی قسم کی کوئی تحریر (اور اگر اصل کا ہاتھہ آنا ممکن نہ ہو تو اُس کی صحیح نقل) بہم پہنچائیں ' یا کم سے کم اُس کا ٹھیک پتا بتلائیں —

(ب) جو تحریریں " اردوے معلیٰ " یا " عودہندی " وغیرہ میں شائع ہوچکی ہیں اُن کے اصل جہاں کہیں محفوظ ہوں اُس سے اِطلاع بخشیں —

(ج) غالب کے موسومۂ ذیل مکتوب الیہم میں سے جس کسی کے جو کچھہ حالات معلوم ہوسکیں اُنھیں (مع اپنے ماخذ کے حوالے کے) مجھہ تک

پہنچانے کی تکلیف گوارا فرمائیں ۔

غالب کے اصل رقعے اگر زیادہ تعداد میں مل گئے تو اُن کے عکس ایک الگ کتاب کی صورت میں شائع کیے جائیں گے : اگر کم تعداد میں ہاتھ آئے تو اُن کے عکس اِسی مجموعے میں شامل کردیے جائیں گے ۔ جن حضرات سے مجھے کسی قسم کی مدد ملے گی اُن کا شکریہ کتاب کے دیباچے میں عرض کیا جائے گا —

خاکسار

مہیش پرشاد (مولوی فاضل) ، اُستاد عربی و فارسی و اردو ہندو یونیورسٹی

بنارس ۱۶ - ستمبر سنہ ۱۹۳۳ ع

غالب کے مکتوب اِلیہ

جن کے حالات دریافت طلب ہیں

(۱) ۔ منشی غلام بسم اللہ

(۲) ۔ مولوی احمد حسن خاں ، مینا ، مرزا پوری

(۳) ۔ حکیم سید احمد حسن مودودی

(۴) ۔ مہر احمد حسن ، موکش

(۵) ۔ منشی ہرگوبند ۔ سہاے

(۶) ۔ سید بدرالدین ، فقیر

(۷) ۔ لالہ کیول رام ، ہشیار

(۸) ۔ مولوی کرامت علی

(۹) ۔ میر بندہ علی ، عرف میرزا میر

(۱۰) ۔ میر افضل علی ، عرف میرن صاحب

(۱۱) ۔ مرزا یوسف علی خاں ، عزیز

(۱۲) ۔ مولوی عزیزالدین

(۱۳) ۔ نواب میر ابراہیم علی خاں ، وفا

(۱۴) ۔ منشی حبیب اللہ ، ذکا (حیدرآبادی)

(۱۵) ۔ منشی ہیرا سنگھ

تازہ ترین مطبوعات انجمن ترقی اردو

۱ - مخزن شعرا - گجرات کے اردو شعرا کا تذکرہ، مصنفۂ فائق مرحوم مع مقدمہ مولانا مولوی عبدالحق صاحب مجلد ایک روپیہ چار آنے -

۲ - تذکرۂ گردیزی - تذکرۂ شعراے اردو مصنفۂ فتح علی حسینی گردیزی قیمت مجلد ایک روپیہ چار آنے —

۳ - اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیاے کرام کا کام - مصنفۂ مولانا مولوی عبدالحق صاحب - غیر مجلد آٹھ آنے —

۴ - مرھٹی زبان پر فارسی کا اثر - مصنفۂ مولانا مولوی عبدالحق صاحب - غیر مجلد آٹھ آنے —

۵ - مرحوم دھلی کالج - مصنفۂ مولانا مولوی عبدالحق صاحب - غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے —

۶ - داستان رانی کیتکی - مصنفۂ انشاءاللہ خاں انشا مرحوم - غیر مجلد چار آنے —

۷ - ترکوں کی اسلامی خدمات اور ان کی زبان وادبیات - غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے -

۸ - جنگ نامۂ عالم علی خاں اور نظام الملک - (نظم) - غیر مجلد چھ آنے -

حسب ذیل کتابوں کے دوسرے ایڈیشن تیار ہو گئے ہیں —

۱ - فلسفۂ تعلیم مجلد دو روپے - غیر مجلد ایک روپیہ بارہ آنے

۲ - رہنمایان ہند مجلد دو روپے - غیر مجلد ایک روپیہ بارہ آنے

۳ - امراے ہنود مجلد تین روپے آٹھ آنے - غیر مجلد تین روپے

(کل قیمتیں سکۂ انگریزی میں ہیں)

هندستانی

جنوری ، اپریل ، جولائی ، اکتوبر میں شائع ہوتا ہے —

زیر نگرانی

۱ — پروفیسر ڈاکٹر تارا چند ، ایم ۔ اے ۔ ، ڈی ۔ فل —

۲ — " عبدالستار صدیقی ، ایم ۔ اے ۔ ، پی ایچ ۔ ڈی —

۳ — " سید مسعود حسن صاحب رضوی ، ایم ۔ اے —

۴ — منشی دیا نرائن نگم صاحب ۔ بی ۔ اے —

مدیر

مولوی اصغر حسین صاحب " اصغر "

مشہور علماء اور مصنفین کے مضامین ہمیشہ شائع ہوتے ہیں ۔ چندہ

سالانہ پانچ روپے ۔ ایک نمبر کی قیمت ۱ روپیہ ۴ آنے

علاوہ محصول ڈاک

رسالے کے پرانے پرچے بھی مل سکتے ہیں —

———*———

مطبوعات اکیڈمی اور دیگر کتب کے لیے فہرست طلب کیجیے

کتابستان

ماہر کتابیات

هندستانی اکیڈیمی کی تمام اُردو مطبوعات کے واحد ایجنٹ

۱۷ ۔ سٹی روڈ ، الہ آباد

سائنس

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو
نون میں مقبول کیا جائے، دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی بحثیں
ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً
وقتاً ہونگے، ان کو کسی قدر تفصیل کے بیان کیا جائے - ان تمام مسائل
حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جاتی
- اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی
ر وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

سالے میں متعدد بلاک بھی شائع ہوتے ہیں —

سالانہ چندہ سات روپے سکۂ انگریزی (آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ)
ہ کی قیمت ایک روپیہ بارہ آنے سکۂ انگریزی (یا دو روپے سکۂ
یہ) — طلباء کے ساتھ یہ رعایت کی جاتی ہے کہ یہ رسالہ بہ تصدیق
سپل صاحب (یا ہیڈ ماسٹر صاحب) انہیں پانچ روپے چار آنے سکۂ
ریزی (چھ روپے سکۂ عثمانیہ) سالانہ چندہ میں دیا جاتا ہے —

امید ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی
پرستی فرمائیں گے —

انجمن ترقی اردو - اورنگ آباد دکن

Vol. 14 January 1934

The Urdu

The Quarterly Journal

OF

The Anjuman-i-Taraqqi-e-Urdu

EDITED BY

ABDUL HAQ, B. A. (ALIG.)

HONORARY SECRETARY

Anjuman-i-Tarraqqi-e-Urdu, Aurangabad. (Deccan.)

اُردو

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

اڈیٹر

عبدالحق بی ۔ اے (علیگ)

آنریری سکریٹری

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

اردو

۱ - یہ انجمن ترقی اُردو کا سہ ماہی رسالہ جنوری ' اپریل ' جولائی
اور اکتوبر میں شایع ہوا کرتا ہے —

۲ - یہ خالص ادبی رسالہ ہے جس میں زبان اور ادب کے مختلف شعبوں اور
پہلوؤں پر بحث ہوتی ہے - حجم کم از کم ڈیڑھ سو صفحے ہوتا ہے —

۳ - قیمت سالانہ محصول ڈاک وغیرہ ملا کر سات روپے سکۂ انگریزی
(مع محصول ڈاک وغیرہ آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ)

۴ - تمام خط و کتابت مولوی عبدالحق صاحب بی اے ' آنریری سکریٹری
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن) سے ہونی چاہئے —

:o:

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اردو پریس ' اُردو باغ
اورنگ آباد دکن میں چھپا اور دفتر انجمن ترقی اردو سے شایع ہوا)

اردو

فہرستِ مضامین

اردو اکتوبر سنہ ۱۹۳۴

خطبات گارساں دتاسی

(اتھارھواں خطبہ)

مترجمہ

جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب ڈی لٹ (پیرس)

ہندوستانی زبان، جس کے ذریعہ سے مسیحی خیالات اور مغربی تہذیب اہل ہند میں پھیل رہی ہے، برابر ترقی پر ہے۔ اس کی ادبیات میں روز بروز تنوع بڑھتا جا رہا ہے۔ میں اس دعوے کی تائید میں ایم ایس هاول کا خط یہاں نقل کرتا ہوں جو ممالک مغربی و شمالی کے ناظم تعلیمات ہیں —

" آپ نے اپنے خطبات میں جو خیال پیش کیا ہے کہ اردو کو ہندی پر فوقیت حاصل ہے، بحیثیت دفتری زبان ہونے کے اور بحیثیت معاشری ضروریات کے میں اس باب میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔ بہ حیثیت ناظم تعلیمات اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں میں نے ہر ممکن موقع پر اردو کی توسیع و ترقی کے لیے حمایت کی ہے اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ اردو ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مقابلے میں قومی زبان کہلانے کی مستحق ہے۔ اس سے میری مراد وہ زبان ہے جو ہر خاص و عام کی سمجھ میں آتی ہے۔ اس بات میں مسٹر کمسن، جو ممالک

مغربی و شمالی کے سررشتہ تعلیم کے سب سے اعلیٰ عہدہ دار ہیں
بڑی حد تک میرے ہم خیال ہیں - لیکن بد قسمتی سے ابتدائی
مدارس میں یہ طریقہ رائج ہوگیا ہے کہ اردو یا ہندی میں
سے کسی ایک کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی ہے - چونکہ اکثریت
ہندو طلبہ کی ہے اس لیے ہندی کا استعمال بڑھ رہا ہے - مسلمان
اور بعض ہندو جن کی مادری زبان اردو ہے' اردو کو ترجیح
دیتے ہیں* - میرے خیال میں اردو اور ہندی کی تفریق قومی
نقطۂ نظر سے سخت نقصان رساں ہے - یہ زیادہ بہتر ہوتا اگر
ہندو بچوں کو اردو سکھائی جاتی - بجائے اس کے کہ انہیں ایسی
"بولی' میں اظہار خیال کی مشق کرائی جائے جو بالآخر
ایک دن اردو کے آگے سر تسلیم خم کرے گی† " —

اردو اور ہندی کی اہمیت کے متعلق میں نے گزشتہ سال کے خطبے
میں جو ذکر کیا تھا اسی پر مسٹر ہنری کارٹر نے جو کئی سال تک میرے
شاگرد رہ چکے ہیں' اور مسٹر برڈوڈ کے یورپ واپس آجانے کے بعد بمبئی
کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کی شاخ کے سکریٹری ہوگئے ہیں' مجھے

---

* ہندی اور اردو کے فرق کو واضح کرنے کے لیے میں "باغ و بہار"
کے اس حصے کو پیش کرتا ہوں جس میں ایک مسلمان ایک ہندو کے
ساتھ گفتگو کرتا دکھایا گیا ہے - مصنف نے اس گفتگو میں اس کا خیال
رکھا ہے کہ مسلمان اردو بولے اور ہندو ہندی - اگرچہ ہندی اور اردو
ایک زبان سے عبارت ہیں لیکن ان دونوں کا فرق نہایت بین طور پر
نظر آتا ہے - اردو اور ہندی کا فرق ہمیں ان مکالموں میں بھی صاف
نظر آتا ہے جو آزاد بخت کی سرگزشت میں بیان کیے گئے ہیں —

† اگرچہ میں خود اردو کا بہت بڑا حامی ہوں لیکن میرے خیال
میں ہندی کو "بولی" کہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا —

ایک خط لکھا ہے اور اس مسئلہ کو چھیڑا ہے - خط کے الفاظ یہ ہیں-

" اردو بہ نسبت ہندی کے زیادہ بولی جاتی ہے - اس میں ترقی اور نشو و نما کی صلاحیت بھی زیادہ ہے - اس میں شک کی گنجائش نہیں کہ ایک دن آنے والا ہے جبکہ اردو سارے ہندوستان کی مشترک زبان بن جائے گی "

یہ سچ ہے کہ ہندوستانی کا ماضی ایسا زیادہ درخشاں نہیں لیکن اس کا مستقبل یقیناً شاندار ہے - نہر سوئز کی تعمیر سے وہ بحر روم کے کناروں تک پہنچ جائے گی - ہندوستانی ایشیا کے بعض ایسے حصوں میں بولی جاتی ہے جہاں کی وہ اصل زبان نہیں ہے - مثلاً برھما میں مونگ شالو (Mong shaw loo) جو مولمین کے رہنے والے ہیں اور نیویارک میں بہت عرصے تک رہ چکے ہیں اور وہاں سے طب کی اعلیٰ سند حاصل کی ہے ' ان سے پیرس میں میری ملاقات ہوئی تھی ' انہوں نے بھی یہ کہا کہ برھما میں ہندوستانی بولی جاتی ہے —

اس سال شہر روما میں پروپگنڈا کالج کے ایک طالب علم نے ہندوستانی نظم پڑھی - یہ طالب علم آگرہ کا رہنے والا ہے - ہر سال اکادمی السنہ کی طرف سے اسی قسم کا جلسہ بعثت مسیح کی تقریب میں ہوا کرتا ہے اور مختلف ممالک سے طلبہ موقع کی مناسبت سے اپنی اپنی زبانوں میں نظمیں پڑھا کرتے ہیں - حاضرین کو موسیقی سے بھی لطف اندوز کیا جاتا ہے * —

فاضل بیمز کلکتہ کے ایشیاٹک جرنل میں اسی موضوع پر برابر لکھہ

---

* Accademia poliglotta che gli alumni del collegio de Prop. Fide offrone a' Santi Re magi, Roma, 1868 p. 10

رهے هیں که هندوستانی زبان میں عربی اور فارسی عناصر کو بر قرار رکھا جاے - جو خیال موصوف نے "کوارترلی ریویو" میں پیش کیا تھا (نمبر ۲۳۴) اسی کو ان مضامین میں پھیلا کر پیش کیا جا رها هے - "کوارترلی ریویو" میں موصوف نے لکھا تھا که "اگر سرکاری طور پر هندوستانی کو سارے هندوستان کی زبان تسلیم کیا جاے تو یه صرف اس وقت ممکن هوگا که هندوستانی کو فارسی سے بالکل جدا نه کیا جاے - مسلمانوں میں جو لوگ تھوڑے بہت بھی تعلیم یافته هیں وہ فارسی ضرور جانتے هیں - اسی زبان کے توسط سے مجرد تصورات کی ان تک رسائی هوتی هے - نیز سیاست و حکمت و شاعری میں فارسی سے استفادہ کیا جاتا هے - در اصل اردو زبان سواے اس کے کچھه نہیں که وہ فارسی اور هندی کا امتزاج هے - مسٹر بیمز کا خیال هے که اگر اردو لکھتے وقت سنسکرت یا هندی یا عربی و فارسی کے هم معنی لفظوں میں سے ایک چننا هو تو آخرالذکر کو سب پر ترجیح دینی چاهئے - میرے خیال میں اس قسم کا انتخاب اهل هند بہت عرصه هوا کر چکے اور وہ عربی فارسی الفاظ کو سنسکرت اور هندی کے الفاظ پر ترجیح دے چکے هیں - هم اس مسئله پر یہاں بحث کرنا غیر ضروری سمجھتے هیں - (هندوستانی) اردو کو راے اور بلیے سب هی استعمال کرتے هیں - یه خاص کر شہروں میں بولی جاتی هے - همیں اس سے انکار نہیں که دیہات میں اور خاص کر وهاں کے هندوؤں میں هندی بولی جاتی هے - پنڈتوں نے هندی کی ادبی خدمت بھی کی هے جس طرح پرانے زمانے میں بھاٹ لوگوں نے اس کی خدمت کی تھی - بابو هری چندر اور دوسرے پر جوش هندوؤں کی هندی تصانیف نہایت اهمیت رکھتی هیں - هندوستان کے اهل علم و فضل اور یورپ کے مستشرقین

کو ان تصانیف کی اہمیت تسلیم کرنے میں مطلق پس و پیش نہ کرنا چاہئے۔ میں ذاتی طور پر ان تصانیف کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں لیکن میرے نزدیک ان تصانیف کے مقابلے میں ان مطبوعات کو زیادہ اہمیت حاصل ہے جن کے ذریعے اردو کی نشر و اشاعت کا کام ہو رہا ہے ۔۔

میں اس موقع پر پھر اس کا اعادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستانی زبان میں کمال پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فارسی اور عربی میں استعداد بہم پہنچائی جائے - اسی طرح فارسی جاننے کے لیے ہندوستانی جاننا بھی ضروری ہے * - یہ واقعہ ہے کہ فارسی زبان کے ادیبوں کی اچھی خاصی تعداد نے ہندوستان کی سر زمین میں اپنی تصانیف لکھیں - ان کی تحریروں پر ہندوستانی اثر ہونا لازمی تھا - ہندوستان کے مسلمانوں نے فارسی زبان کی تحصیل میں جو سر گرمی ظاہر کی ہے اس کا اظہار کہیں اور نہیں ہوتا - در اصل فارسی زبان مسلمانان ہند کی کلاسکی زبان ہے - انہوں نے اس زبان کی بہترین لغتیں تیار کیں جیسا کہ خود اہل ایران تسلیم کرتے ہیں - ڈاکٹر بلوخ مان نے بھی اپنی کتاب (Contributions to Persian Lexicography) میں اسی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے - موصوف نے بتلایا ہے کہ ہندوستان کی مروجہ فارسی اور ایران کی خالص فارسی کے درمیان کیا فرق ہے - اس ضمن میں تلفظ، لب و لہجہ اور محاورات کے فرق کو نہایت خوبی کے ساتھ ظاہر کیا

---

* اس ضمن میں ڈاکٹر بلوخ مان جیسے فاضل کی رائے ظاہر کرنا ضروری ہے - مجھے مسرت ہے کہ موصوف بھی میرے ہم خیال ہیں - آپ نے (Contributions to Persian Lexicography) میں لکھا ہے کہ " موسیو گارساں دتاسی کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ فارسی زبان کے علماء کو ہندوستانی جاننا ضروری ہے " ۔۔

گیا ہے - فارسی کے "استعمال ہند" کے متعلق مفید معلومات جمع کردی گئی ہیں - موصوف کی راے ہے کہ "ہندوستان میں فارسی زبان جس طرح استعمال کی جاتی ہے اس سے واقفیت رکھنا نہ صرف ان لوگوں کے لیے ضروری ہے جو فارسی کی ان کتب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں جو ہندوستان میں تصنیف ہوئیں یا طبع ہوئیں بلکہ ہندوستانی زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کو بھی اس میں درک رکھنا چاہئے- .. ... فارسی نے ہندوستان میں جو خصوصیات حاصل کی ہیں وہ قابل قبول ہیں اور ان خصوصیات نے ہندوستان میں جہاں تک راہ پائی ہے وہ بالکل صحیح تصور ہوں گی- عربی مثل کے مطابق "غلط عام ' صحیح اور فصیح" ہو جاتا ہے - اہل ہند نے فارسی کی جس قدر تصانیف لکھی ہیں ان سبھوں میں "استعمال ہند" صاف طور پر نظر آتا ہے - خود ابوالفضل کے ہاں آپ کو اس کی مثالیں ملیں گی- "استعمال ہند" میں ہمیں بعض ایسی لسانی خصوصیات بھی ملتی ہیں جو ایران میں اگلے وقتوں میں موجود ہوں گی اور جنھیں آج کل کے ایرانیوں نے متروک قراردیدیا ہے - ان کی زبان نے جوں جوں ترقی کی ویسے ویسے انہوں نے بعض الفاظ و محاورات کو متروک قرار دیا * —

گزشتہ ماہ جولائی کی ۲۸ تاریخ کو "انجمن بنارس" کے جلسے میں

---

* یہ خصوصیات مختلف الفاظ کے استعمال میں نظر آتی ہیں - مثلاً واؤ اور "یاے مجہول" کو خفیف اور معروف طریقے سے ادا کرنا - بجاے "او اور اے ' کے "اُ" اور "ای" - جلی حروف علت (Long vowels) کے بعد اسم کو ناک کے (nasal) لہجے سے ادا کیا جاتا ہے حالانکہ اہل ایران کے ہاں یہ بات نہیں ملتی - تشدید اور فتح ثانی کا حذف حالانکہ اہل ایران کے ہاں ایسا نہیں ہوتا —

کوئنز کالج (Queens College) کے ایک پروفیسر نے اس موضوع پر تقریر کی که شمالی هند میں جو هندوستانی رائج هے اس کو کس طرح ترقی دی جائے - انڈین میل کے نامه نگار نے لکھا هے که یه موضوع بحث هندوستان میں بہت مقبول هے - (۲ ستمبر سنه ۱۸۶۸ ع) - مقرر موصوف نے دوران تقریر میں یه خیال ظاهر کیا که هندی اور اردو کے ادب کو فروغ دینے کی صرف یه صورت هے که انگریزی سے ان میں تراجم کئے جائیں اور اسی طرح انگریزی زبان کے اعلیٰ خیالات و جذبات کو هندی اور اردو میں منتقل کیا جاے - موصوف نے یه بھی خیال ظاهر کیا که هندی اور اردو دونوں اخلاقی جذبات سے محروم هیں - همارے خیال میں یقیناً ان یورپین کتب کا ضرور ترجمه هونا چاهئے جو ترجمه کے قابل هیں- لیکن یه کوشش بے سود هے که مشرقی ادبیات کی روح کو تبدیل کردیا جائے اور اسے یورپین رنگ میں رنگ دیا جاے - یه خیال میرے نزدیک نه قابل عمل هے اور نه قابل قبول - میں پہلے بھی اس کی مخالفت میں اپنی راے پیش کرچکا هوں —

بمبئی کی انجمن جغرافیه کے سال کے آخری جلسه میں مسٹر برجس نے اس امر کی اپیل کی که هندو اور اسلامی ناموں کو لاطینی رسم خط میں ایک متعین قاعدے کے تحت لکھنا چاهئے - بابو شیو پرشاد نے بھی ' جن کی مسئله هندی اردو کی راے سے میں اختلاف کرتا هوں ' اسی قسم کا خیال ظاهر کیا - هم بھی اس خیال کی پرزور تائید کرتے هیں - یه بہت اچھا هو اگر اشخاص و مقامات کو بجاے مختلف طریقوں سے لکھنے کے ایک هی طور پر لکھا جاے - بعض اوقات هجے کا اس قدر فرق هوتا هے که ایک هی شهر اور ایک هی مقام کو دوسرا شهر اور دوسرا مقام سمجھا جاتا هے —

ہندوستانی زبان کے امتحانات کی بدستور پابندی کی جارہی ہے - یہاں تک کہ مبلغین مسیحیت کو بھی امتحان دینا پڑتا ہے - سرکاری گزٹ میں ان کے نام برابر شائع ہوتے رہتے ہیں جنھوں نے ان امتحانات میں کامیابی حاصل کی - سرایس نارتھہ کوٹ نے یہ تحریک کی ہے کہ ان امتحانات میں اور زیادہ سختی برتی جائے - آپ کو معلوم ہے کہ ہندوستان میں جو انگریز حکومت سے تعلق رکھتے ہیں وہ ہندوستانی میں بلا تکلف گفتگو کرسکتے ہیں اور بعض اوقات تقاریب کے موقعوں پر تقریر بھی کرتے ہیں - چونکہ اہل ہند سے انھیں کی زبان میں گفتگو کرنا مفید ہے اس لئے اس کا التزام رکھا جاتا ہے - میں نے اپنے پچھلے خطبے میں ذکر کیا تھا کہ وائسرائے بہادر نے آگرے میں تقریر کی تھی - اس سال بھی موصوف نے لکھنؤ کے دربار میں نہایت فصیح اردو میں حاضرین کو خطاب کیا - یہ دربار ماہ نومبر میں منعقد ہوا تھا - ہندوستانی اخبارات اس تقریر کے طرز اور اس کی سادگی کی تعریف میں متفق ہیں - وائسرائے بہادر سر جان لارنس نے یہ تقریر تعلقداروں کے ایڈریس کے جواب میں کی تھی - یہ تقریر پوری کی پوری ہندوستانی اخبارات میں شائع ہوچکی ہے - موصوف نے اپنی تقریر کے دوران میں ان تعلقہ داروں کو خطاب کرتے ہوئے جنھوں نے جدید سیاسی انتظامات کے تحت اپنی سندیں حاصل کی ہیں ' کہا کہ وہ اپنے ان بھائیوں کے ساتھہ مہر و محبت کا برتاو کریں جن کی سندیں ضبط کرلی گئیں —

اجمیر میں دیسیوں کے ایک کالج کی افتتاحی رسم کے موقع پر کرنل کیٹنگ نے جو گورنر جنرل کے ایجنٹ ہیں ' ہندوستانی زبان میں تقریر کی جس کو حاضرین نے بہت پسند کیا - موصوف نے جے پور کے

صنعتی اسکول کے افتتاح کے وقت بھی ہندوستانی میں تقریر کی اور ایک ادبی و علمی انجمن قایم کی- اس انجمن طرف سے جے پور میں ایک مطبع قایم کیا جائے گا جس میں ہندی اور انگریزی کی چھپائی ہوا کرے گی اور وہاں سے ایک اخبار بھی جاری کیا جائے گا —

سر ولیم میور نے اردو اور ہندی کی ادبیات کو فروغ دینے کے متعلق چند اصول و قواعد مرتب کئے ہیں - چنانچہ موصوف کی جانب سے اعلان ہوا ہے کہ ہر سال بہترین مصنف ' مولف یا مترجم کو ایک ایک ہزار روپے کے پانچ انعام دیے جایا کریں - طرز تحریر اور مضمون کی اخلاقی حیثیت کا بھی لحاظ رکھا جائے گا - موضوع کی کوئی قید نہیں ' چاہے ادبی ہو یا سائنٹفک - مصنف یا مولف کے جملہ حقوق محفوظ رہیں گے اور حکومت اشاعت کی خاطر ان کتب کی اچھی خاصی تعداد خریدے گی (*) -

نواب رامپور نے ہندوستانی کی اہمیت کو ملحوظ رکھتے ہوے متعدد اسکول اپنی ریاست میں قایم کئے ہیں جہاں ہندوستانی کی تحصیل پر خاص زور دیا جاتا ہے - اگرچہ اس حصۂ ملک میں تعلیم نسوان کے خلاف تعصبات موجود ہیں لیکن باوجود اس کے نواب صاحب نیز امراے ریاست نے لڑکیوں کی تعلیم کے لئے متعدد مدارس قایم کیے ہیں (‡) -

میں سید عبداللہ کے اس خط کے مضمون کے ساتھ بالکل متفق ہوں جو موصوف نے سر استفورڈ نارتھ کوٹ (Sir Stafford Northcote) کے نام لکھا تھا اور جس میں اس امر پر زور دیا تھا کہ آئندہ سے حکومت

(*) ہوم ورڈ میل - ۵ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ ع —

(‡) اودھ اخبار - ۲۶ جولائی سنہ ۱۸۶۸ ع —

ہند سول سروس کے مقابلے کے امتحان میں ہندوستان کی بعض مروجہ اور زندہ زبانوں کو لازمی قرار دے - در اصل ان السنہ کو سنسکرت اور عربی کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے اس واسطے کہ سنسکرت اور عربی کے ساتھہ اہل ہند کو ادبی اور علمی تعلق ہے لیکن اکثر امید واران سول سروس کے لیے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے - سید عبداللہ نے اپنے اس خط میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ سول سروس کے ہر امید وار کے لیے یہ لازمی قرار دینا چاہئے کہ وہ ملکی زبان میں پوری دسترس حاصل کرے ' شکستہ تحریر بآسانی پڑھ سکے اور اس زبان سے انگریزی میں اور انگریزی سے اس زبان میں بخوبی ترجمہ کر سکے - در اصل یہ تمام باتیں نہایت ضروری ہیں - چنانچہ نظماے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہیلی بری کالج (Haileybury) کے طلبہ کے لیے انہیں لازمی قرار دیا تھا - سید عبداللہ کے شاگرد اپنے پامر نے بھی اپنے استاد کے خیالات سے اتفاق کیا ہے * - ثانی الذکر نے دیسی زبان کے حصوں میں جو مہارت بہم پہنچائی ہے وہ اس بات کی ایک مثال ہے کہ ایک یورپین اگر چاہے تو السنۂ مشرقیہ میں کس درجہ تک کمال حاصل کر سکتا ہے -

حکومت کو اس جانب توجہ دلاتے رہنا مفید ہے - لیکن ہمارے خیال میں حکومت کو خود بخود پہلے سے اس بات کا خیال ہے کہ نوجوان سول سروس والوں کو ہندوستانی زبان کی تحصیل کے لیے آمادہ کرے اس واسطے کہ ہندوستانی ہی ملک کی مشترک زبان ہے اور جیسا کہ

---

* انڈین میل مورخہ ۲۳ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع میں پامر صاحب کا مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان " السنۂ شرقیہ کا مطالعہ " ہے - سید عبداللہ کے خط کے بعد —

میں بارہا پہلے بتا چکا ہوں اہل ہند کا ایک بڑا اور اہم طبقہ اس کے ذریعے اظہار خیال کرتا ہے اور ملک کے طول و عرض میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے ملتے ہیں - ان تمام امور کو مد نظر رکھتے ہوئے ان لوگوں کو جو حکومت کی خدمت انجام دے رہے ہیں اس زبان کا سیکھنا از بس ضروری ہے - مثلاً اگر کسی نوجوان عہدہ دار کا ایسے ضلع میں تقرر ہو جائے جہاں کی مقامی بولی سے وہ ناواقف ہے تو وہ ہندوستانی کے ذریعے کام نکال سکتا ہے - اسی طرح سیاسی امور کے لیے ہندوستانی اور فارسی کا جاننا لازمی ہے - (ہوم ورڈ میل' مورخہ ۲۳ مئی سنہ ۱۸۶۸ ع) -

فوجی عہدہ داروں کے امتحانات کے لیے خاص نصابی کتب ہندوستانی میں تیار کی گئی ہیں - یہ امتحان دو قسم کے ہیں - ایک اعلی اور دوسرا تحتانی - ان امتحانات میں ہندی اور اردو کو ایک دوسرے سے علحدہ تصور کیا جاتا ہے - میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہندوستانی کا لفظ ان دونوں پر حاوی ہے - اگرچہ مدراس کی طرف ہندوستانی سے مراد اردو لی جاتی ہے —

میرے گذشتہ سال کے خطبے کے بعد سے اب تک ہندوستانی میں جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان سبھوں کے نام اس جگہ میں نہیں بیان کروں گا بلکہ صرف چند کے متعلق ذکر کروں گا —

ان میں ایک اہم کتاب "حیات افغانی' ہے - یہ افغان لوگوں کی تاریخ ہے - مصنف کا نام محمد حیات خاں ہے - چنانچہ مصنف اور کتاب کے نام میں مناسبت موجود ہے - یہ کتاب بڑی تقطیع پر شائع ہوئی ہے اور ۷۰۰ صفحات پر مشتمل ہے - اس میں نقشے بھی دیے گئے ہیں - یہ لاہور میں سنہ ۱۸۶۷ ع میں شائع ہوئی ہے - مسٹر ٹی ایچ تھارنٹن (Thornton)

نے ازراہ کرم مجھے اس کا ایک نسخہ بھیجا ہے - موصوف پنجاب گورنمنٹ کے سکرٹری ہیں - یہ تاریخ تین حصص پر مشتمل ہے - پہلے حصے میں افغانستان کی جغرافی خصوصیات بیان کی گئی ہیں - یہ ملک افغانوں کا وطن ہے جنھیں پٹھان اور پشتو بھی کہتے ہیں * - اس ملک کی قدیم اور جدید حدود اور آبادی کا حال بیان کیا گیا ہے - اس کے علاوہ کانوں، نہروں، درختوں اور جانوروں کا حال ہے - پھر مشہور شہروں کا بیان ہے جو اٹک سے لے کر ایران کی سرحد تک پھیلے ہوے ہیں - صنعت و حرفت، تجارت، تاجروں کے مختلف طبقوں، پیداوار ملکی، در آمد و بر آمد اور آمد و رفت اور خبر رسانی کے راستوں کے متعلق بھی ذکر کیا گیا ہے - اس ضمن میں مصنف نے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ افغانستان کی تجارت کو فروغ دینے کے لیے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں - دوسرے حصے میں افغانستان کی عام تاریخ ۲۵۰۰ سال قبل سے بیان کی گئی ہے - مختلف زمانوں میں اس ملک کے جو جو نام رہے ان کا ذکر ہے - ہندو، یونانی اور اسلامی خاندانوں کی حکومت اور ان کے عروج و زوال کی تفصیل بیان کی گئی ہے - اسلامی خاندانوں میں مصنف نے بنی امیہ، بنو عباس، سامانی، غزنوی، غوری، مغل، نادر شاہ اور امیران افغانستان کا حال بیان کیا ہے - پھر سکھوں اور انگریزوں کی مشرقی علاقوں کی فتوحات کا ذکر ہے - اس کے بعد مصنف نے ان سرحدی سرکش قبائل کا ذکر کیا ہے جو پنجاب کے مغربی علاقے میں آباد ہیں اور یہ بتایا ہے کہ ان کو قابو میں رکھنے کی بہترین تدابیر کیا ہیں - دوسرے حصے میں افغانستان کے مختلف قبائل کی تاریخ بیان کی گئی ہے - ان قبائل کی

---

* پشتو زبان کو کہتے ہیں نہ کہ افغانستان کے لوگوں کو - (مترجم)

زبان اور ان کے گروهوں کا هندوستان، ترکستان، مازندران اور دوسرے ممالک میں جاکر آباد هونے کے متعلق بهی مسالا فراهم کیا گیا هے - کتاب کے تیسرے حصے میں مصنف نے ضلع بلو کے متعلق تاریخی معلومات جمع کی هیں —

حال کے زمانے کی مشہور هندی تصانیف میں " بال رام کتهه امرت " کا شمار هوتا هے - یه گروهرداس کی نظم هے - گوپال چندر نے (جو بابو هری چندر کے والد هیں) اس نظم کو مکمل کرنے کے لئے خود بهی تصرفات کیے هیں - گوپال چندر کو اس زمانے کے هندی مصنفین کی صف اول میں جگه دینی چاهئے - موصوف نے ستائیس سال کی عمر میں انتقال کیا اور اس کم عمری میں ۳۲ کتابیں تصنیف کیں - یه سچ هے که موصوف نے تصنیف و تالیف کی ابتدا بارہ سال کی عمر سے کردی تهی - ان تصانیف و تالیفات میں چوبیس هندی میں هیں اور آٹهه سنسکرت میں - موصوف نے والمکی کی پوری رامائن کا هندی کبت میں ترجمه بهی کیا هے - آپ کے فرزند ارجمند بابو هری چندر ان تمام تصانیف کو شائع کرنے کا قصد رکهتے هیں - چنانچه " بال رام کتهه امرت " سے اس سلسله کی ابتدا کی گئی هے —

گذشته سال دهلی میں هندی موسیقی پر ایک کتاب شائع هوئی هے جس کا نام " رکمنی منگل " هے * - اس موضوع پر لاهور سے بهی

---

* ۸۰ صفحات پر مشتمل هے - بڑی تقطیع -

ایک کتاب شائع هوئی هے جس کا نام " سرگوئنت " هے + - بنارس سے شیو پرشاد نے " ملتقطات هندی " شائع کی هے : —

کلکته کی ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک رکن مسٹر ایف ایس گروز (Growse) نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے یه درخواست کی تھی که هندی کی جلیل القدر نظم " پرتھوی راج راسو " کو جو چند بارد ے کی لکھی هوئی هے ' سوسائٹی کی طرف سے شائع کرنے کا انتظام کیا جاے - اس شاعر کو راجپوتوں کا هومر تصور کرنا چاهئے - اس تجویز کی پادری جیمز لانگ (James Long) نے تائید کی تھی - چنانچه اب ایشیاٹک سوسائٹی نے اس کی اشاعت کے متعلق فیصله کرلیا هے - اس نظم میں دهلی کے آخری هادو راجه پرتھوی راج کے حالات زندگی بیان کئے گئے هیں - یه نظم نه صرف تاریخی بلکه لسانیاتی حیثیت سے بہت اهمیت رکھتی هے - اس کی زبان هندی کی ایک خاص بولی هے - مسٹر بیمز نے اس کی اشاعت کا کام اپنے ذمه لیا هے - موصوف آج کل انگلستان میں اس نظم کے دو قدیم نسخوں کا مقابله کررهے هیں جو لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے کتب خانه میں هیں - میں نے بھی اپنے لندن کے دوران قیام میں ان نسخوں کو دیکھا تھا - بابو رجندر پرشاد متر نے بھی " پرتھوی راج

+ سرگوئنت سے مراد هے " بھگوت گیتا کا عطر " - مسٹر بیمز کی بدولت بھگوت گیتا کا ایک باتصویر نسخه مجھے دستیاب هوگیا هے - در اصل یه نسخه دسویں باب کے اردو ترجمه پر مشتمل هے - منشی جگناتھه نے اردو میں ترجمه کیا هے - (مطبوعه لاهور ' ۱۲۴ صفحات - هر صفحه پر ۲۱ سطریں هیں - سنه طباعت ۱۴ - سنه ۱۸۶۳ ع) -

(‡) اس کتاب کی (Trubner) کے اخبار " Literary Record " نے بہت تعریف کی هے - نمبر ۳۹ - مسٹر آرپر کلز نے بھی اس قسم کی کتاب " ملتقطات اردو " کے نام سے شائع کی هے جو ۳۱۶ صفحات پر مشتمل هے —

راسو " کے دو قلمی نسخے حاصل کئے ہیں جن کا مقابلہ کر کے موصوف بھی اس کی اشاعت کا سامان کر رہے ہیں - * - بہر حال اب امید بندھتی ہے کہ عنقریب اس کتاب کی اشاعت ہوگی اور اس کے ساتھ اس کا ترجمہ بھی شائع کیا جائے گا جس میں مشکل حصوں کی تشریح قابل اطمینان طریقے پر کی جائے گی —

اردو کتابیں جو مجھے وصول ہوئی ہیں یا جن کے متعلق میں نے اردو اخبارات میں پڑھا ہے، ان میں " مجموعۂ دلپسند " قابل ذکر ہے - یہ عشقیہ غزلیات کا مجموعہ ہے اور دہلی سے شائع ہوا ہے - اس کے علاوہ ایک اور غزلیات کا مجموعہ میری نظر سے گذرا جو ان ماہانہ مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں جو بابو ہری چندر کے ہاں منعقد ہوا کرتے ہیں - یہ مشاعرے ان کی نقل ہیں جو دہلی آگرہ اور لکھنؤ کی اسلامی سلطنتوں کے زیر اہتمام ایک زمانے میں ہوا کرتے تھے - " مثنوی زہر عشق " اور " چراغ ہدایت ' بھی قابل ذکر ہیں - اول الذکر با تصویر شائع ہوئی ہے - ثانی الذکر اخلاقی مضامین کا مجموعہ ہے جنہیں منشی محمد علی نے ترتیب دیا ہے " جذب القلوب " فارسی کی ایک مشہور کتاب کا اردو

---

* بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی " کارروائی ' نمبر ۷ ' (جولائی ۱۸۶۸) (Proceedings) میں تین نسخوں کا ذکر ہے - (۱) آگرہ کے کتب خانے کا نسخہ جو مہاراجہ جے پور کا عطیہ ہے - مسٹر بیمز نے بھی اسے استعمال کیا ہے - (۲) مہاراجہ بنارس کا نسخہ جو موصوف نے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کو مستعار دیا ہے - (۳) راؤ بیدلہ کا نسخہ - ان کے علاوہ دو قلمی نسخے بابو رجندر لال متر کی ملک ہیں - ان دونوں نسخوں میں مذکورۂ بالا تینوں نسخوں سے اختلافات موجود ہیں —

ترجمہ ہے * " حسن و دل " بھی فارسی کا ترجمہ ہے جس میں تشبیہ و استعارہ کثرت سے استعمال کیا گیا ہے - " تواریخ جہان ' میں آفرینش عالم کا حال ہے ' † ایک مسلمان ڈاکٹر نے " مخزن ادویہ " (Materia medica) لاہور سے شائع کی ہے - ‡ " تاریخ اضلاع " میں ممالک مغربی و شمالی کے اعداد و شمار ہیں - یہ کتاب لفٹننٹ گورنر بہادر کے حکم سے شائع ہوئی ہے —

مسٹر پیرسن (Pearson) نے جو حلقۂ راولپنڈی کے انسپکٹر تعلیمات ہیں اردو میں ایک تاریخ ہند لکھنا شروع کی ہے - موصوف ایک مسلمان فاضل سے بھی اس ضمن میں مدد لے رہے ہیں جو اپنے طرز تحریر اور انشا پردازی میں شہرت رکھتا ہے - اسی ضمن میں میں یہ بھی یہاں بتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ بابو شیو پرشاد کی تاریخ ہند جو ہندی میں لکھی گئی تھی اور جس کا نام "اتہاس تمر ناسک ' ہے اس کا اردو ایڈیشن بھی شائع ہوگیا ہے - اس کے علاوہ پیارے لال نے جو دہلی کے نارمل اسکول کے پرنسپل ہیں سرکاری طور پر اردو میں انگلستان کی تاریخ لکھنا شروع کی ہے - یہ تاریخ Students'theme کی وضع اور طرز پر ہوگی جسے کلکتہ یونیورسٹی کے نصاب میں شامل کرلیا گیا ہے —

* مسٹر بیمز کی بدولت اس کا ایک نسخہ مجھے مل گیا - جو لکھنؤ میں طبع ہوا ہے - بڑی تقطیع پر ۲۸۸ صفحات پر مشتمل ہے - ہر صفحہ پر ۳۲ سطریں ہیں - کتاب کا پورا نام " جذب القلوب الی دیار المحبوب " (یعنی مدینہ) ہے - اصل کتاب کے مصنف کا نام عبدالحق ہے - یہ کتاب سنہ ۱۵۹۲ ع میں لکھی گئی تھی - اس میں رسول خدا (صلی اللہ علیہ و سلم) کے مرقد مبارک اور مدینہ کے دوسرے مزارات اور عمارتوں کا تذکرہ ہے —

† مطبوعۂ دہلی - ۱۲۸ صفحات پر مشتمل ہے —

‡ ۵۱۸ صفحات پر مشتمل ہے —

یہ بات خلاف توقع ہے کہ مرہٹی زبان میں ملکۂ انگلستان کی کتاب " Leaves from a Journal of our life in the Highlands " کا ترجمہ بمبئی سے شائع ہوگیا پیشتر اس کے کہ ہندوستانی میں اس کا ترجمہ ہو * - اس کتاب کی یورپ میں بھی خوب قدر افزائی ہوئی - اس کتاب کے مرہٹہ مترجم کو نہ صرف ترجمہ شائع کرنے کی اجازت مل گئی ہے بلکہ اصلی کتاب کی تصاویر کے بلاک بھی مل گئے ہیں - جن کی مدد سے ترجمہ میں بھی یہ تصاویر شائع ہوسکیں گی —

کپتان ڈبلوآر - ایم ہالرائڈ (Holroyd) نے " رسوم ہند " کا پہلا جزو ازراہ کرم مجھے بھیجا ہے - موصوف پنجاب کے نئے ناظم تعلیمات ہیں اور اپنے پیشروکی نسبت اردو کی نشر و اشاعت میں زیادہ جوش و سرگرمی کا اظہار کر رہے ہیں - اس کتاب میں اہل ہند کے مذاہب اور ان کے مختلف فرقوں کا اختصار سے حال بیان کیا گیا ہے - ہندووں اور مسلمانوں دونوں کے عقاید پر تبصرہ ہے اور بالخصوص شمالی ہند کے باشندوں کی خانگی زندگی اور ان کے عادات و اخلاق پر روشنی ڈالی گئی ہے - " رسوم ہند " کی تالیف و ترتیب کا کام لاہور میں سنہ ۱۸۶۴ ع میں شروع ہوا جب کہ سرکاری طور پر ایک کمیشن اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا تھا کہ ہندوستانی زبان میں اعلیٰ درجہ کی تصانیف تیار کرائی جائیں - اس کمیشن کے صدر سر ڈی مکلیوڈ (Mac Leod) تھے جو آج کل صوبۂ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر ہیں † - " رسوم ہند " کی زبان اور

---

* انڈین میل - ۴ نومبر سنہ ۱۸۶۸ ع —

† حکومت پنجاب نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ کمیشن جن کتب کی تالیف کی سفارش کرے گا ان میں سے بہترین لاہور میں طبع کی جائیں گی —

اس کا طرز تحریر سادہ ہے جتنا سادہ کسی مشرقی زبان میں ممکن ہے -
اس کتاب کے مکالموں کی زبان اسی قسم کی ہے جو آج کل کے ناٹکوں میں
استعمال کی جاتی ہے - اس کتاب کی تالیف میں کپتان ہالرائڈ کے ساتھہ
ایک ہندو شریک تھے جو نارمل اسکول کے اول درجہ کے معلم ہیں اور
دوسرے دھلی کالج کے عربی کے ایک مسلمان پروفیسر نے بھی اس کام میں مدد
دی - ان کے علاوہ اور دوسرے اہل علم دیسی لوگ بھی شریک تھے -

کپتان ہالرائڈ نے اعلان کیا ہے کہ ۳۱ مارچ سنہ ۱۸۶۹ ع میں اردو
تصانیف کا مقابلہ عمل میں آے گا - یہ کتب مقابلہ چار موضوعوں پر ہونی
چاہئیں - (۱) عام اصول صرف و نحو (۲) فارسی صرف و نحو (۳) تاریخ
ہند سے ماخوذ کہانیاں جن میں اہم واقعات اور اشخاص کے تفصیلی حالات
بیان کئے جائیں جنھوں نے بڑے بڑے کام کئے ہیں - (۴) اقلیدس کے ایک
حصے کا ترجمہ - ان کتب میں سے بہترین کو اول اور دوم انعام دئے جائیں
گے - اعلان میں اس کی وضاحت کردی گئی ہے کہ نہایت سادہ زبان استعمال
کی جاے اور حتی‌المقدور فارسی محاورات سے احتراز کیا جاے - ناظم
تعلیمات کو یہ حق حاصل ہوگا کہ ان میں سے جو کتب پسند کی جائیں
انھیں تغیر و تبدل کے ساتھہ طبع کراسکے * -

ابتدائی مدارس کے لئے مسٹر فیلن (Fallon) کی نصابی کتب قابل
ذکر ہیں جن کا نام (Urdu School Readers) ہے - یہ کتب صوبۂ بہار کے لیے
ہیں جہاں موصوف انسپکٹر تعلیمات ہیں - ان ریڈروں کی تیاری میں
منشی سورج مل نے بہت محنت کی ہے - موصوف نے پٹنہ اور الہ آباد کے

---

* اس کی تفصیل "اخبار عالم" مورخہ ۱۳ اگست سنہ ۱۸۶۸ ع میں شائع
ہوئی ہے - میں اپنی ضرورت کے موافق اختصار سے اس کا یہاں ذکر کرتا ہوں -

تعلیمات کے انسپکٹروں کی تحریک پر ایک کتاب "اردو آموز" بھی تیار کی ہے - ان ریڈروں کی طبع اول کے نمونے میرے پیش نظر ہیں - ان کی تیاری میں مشرقی طریقے کو مد نظر رکھا گیا ہے - چونکہ مشرقی طلبہ کو نری نثر پڑھنا ناگوار ہوتا ہے اس لئے ساتھہ ساتھہ نظمیں بھی ہیں جو طلبہ زبانی یاد کرتے ہیں - اگر کوئی نظریہ نثر میں بیان کیا گیا ہے تو اس کو ساتھہ ہی نظم کردیا گیا ہے تاکہ یاد کرنے میں آسانی ہو ـــ

مہاراجہ بنارس کا ارادہ ہے کہ انگریزی انسائیکلوپیڈیا کا اردو میں ترجمہ کرائیں - اس انسائیکلوپیڈیا کو انگلستان میں بڑی شہرت حاصل ہے - مہاراجہ بہادر اس کام کے لئے دس ہزار روپیہ تک صرف کرنے کو آمادہ ہیں بشرطیکہ انگریزی حکومت بھی اس قدر رقم دینے کے لئے تیار ہو - موصوف کا خیال ہے کہ اس کام کی تکمیل میں بیس ہزار روپے کی ضرورت ہوگی - مجھے اس کا علم نہیں کہ اس تجویز کا کیا حشر ہوا اور آیا اس کا کوئی عملی صورت میں اظہار ہوا یا نہیں ـــ

حکومت ہند کے سکریٹری کی جانب سے ایک باتصویر کتاب شایع کی جارہی ہے جس میں ہندوستان کی مختلف نسلوں کے افراد کی تصاویر ہوں گی - اس کتاب کے متعلق اصل تجویز لارڈ کیننگ کے زمانے میں منظور ہوئی تھی - یہ کتاب آٹھہ جلدوں میں تقسیم اور ہر جلد بڑی تقطیع پر طبع ہوگی - ہر جلد ۶۰ ، ۷۰ تصاویر پر مشتمل ہوگی اور ہر تصویر کے ساتھہ اس کی تشریح ہوگی - اس کی پہلی اور دوسری جلد شائع ہوچکی ہے -

وائسرائے گورنر جنرل نے بنگال کے لیے یہ قانون نافذ کیا ہے کہ اس صوبے میں جتنے اخبارات اور کتابیں شائع ہوں ان کی رجسٹری ہونی چاہئے - چنانچہ پچھلے جولائی کے پہلے سے اس پر عمل شروع ہوگیا ہے -

ہماری خواہش ہے کہ یہ قانون ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی نافذ کیا جائے - اس کی رو سے حکومت ہر مطبوعہ اخبار یا کتاب کے تین نسخے خریدے گی - (اودھ اخبار مورخہ ۲۸ مارچ سنہ ۱۸۶۸ ع) - ان میں سے ایک نسخہ لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو بھیجا جائے گا - اس سوسائٹی کے کتب خانہ میں یہ جملہ مطبوعات دیکھنے کو مل جائیں گی اور امید ہے کہ سوسائٹی کے رسالے میں ان مطبوعات کے نام کم از کم شائع ہوتے رہیں گے -

اس سال امرتسر، لاہور، مرزا پور، بریلی اور لکھنؤ سے مسیحی مذہب کے متعلق اردو میں متعدد کتب شائع ہوئی ہیں - ان میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو ویزلین (Weslian) اور میتھودسٹ (Methodist کلیساؤں کے نمائندوں کی جانب سے لکھوائی گئی ہیں بلا امتیاز اس کے کہ وہ پریز بائٹیرین (Presbyterian) ہیں یا Episcopal - ان کتابوں میں سے میں اس جگہ صرف تین کی نسبت ذکر کروں گا (۱) تفسیر انجیل مقدس - (۲) انجیل اور قرآن کے درمیان مقابلہ (۳) جنگ مقدس - آخر الذکر تصنیف جے بنیئن (Bunyon) کی " Holy War " کا اردو ترجمہ ہے جو مسز ولش نے کیا ہے - موصوفہ الہ آباد کے ریورنڈ جے جے ولش کی بیوی ہیں - یہ بنین (Bunyan) وہی ہے جس کی مشہور آفاق کتاب (Pilgrim's Prgress) کا راہبلس کروسو کی سرگذشت کی طرح دنیا کی سب زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے -

اردو کی اور بعض دوسری تصانیف ہیں جنہیں ہم خالص مسیحی نہیں کہہ سکتے لیکن نیم مسیحی ضرور کہہ سکتے ہیں - ان میں وہ سب کتب شامل ہیں جو مسلمان علما نے انجیل کی تفسیر پر لکھی ہیں - یہ کتابیں اپنے رنگ میں اجتہادی رنگ رکھتی ہیں - چنانچہ سید احمد خاں

کی تفسیر انجیل اسی قسم کی کتاب ہے - اس کتاب کا دوسرا حصہ بھی مجھے مسٹر ایم ایس ہاول (Hcwell) کی عنایت سے پہنچ گیا ہے - میں موصوف کا نہایت شکر گذار ہوں - پڑھنے سے معلوم ہوا کہ پہلے حصے کی طرح یہ حصہ بھی نہایت دلچسپ معلومات پر محتوی ہے- اس حصے کے سرورق پر قرآن کی یہ آیت مندرج ہے : إنا انزلنا التوراة فیها هدی و نور یحکم بها النبیون الذین اسلموا للذین هادوا والربانیون والاحبار بما استحفظوا من کتاب الله و کانو علیه شهدآء فلا تخشوا الناس واخشون ولا تشتروا بآیٰتی ثمناً قلیلا(ط) ومن لم یحکم بما انزل الله فاولئک هم الکافرون - (سورۂ مائدہ آیت ۴۸)- اس حصے میں مصنف نے عہد نامۂ عتیق پر عام تمہیدی تبصرہ کیا ہے - اور ان کتب کا تجزیہ پیش کیا ہے جن پر وہ مشتمل ہے - اس تمہید میں تورات پر جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کے جواب بھی دیے گئے ہیں - پھر باب " پیدائش " کے ابتدائی گیارہ ابواب کا اصل متن اور اردو ترجمہ ہے - اصل متن عبرانی زبان میں ہے - عبرانی کے نیچے بین السطور اردو ترجمہ ہے - عبرانی کے ہر لفظ کے نیچے اس کا ہم معنی اردو لفظ ہے - صفحے کے ایک کالم میں یہ متن اور ترجمہ ہے اور دوسرے میں ایسی قرآنی آیات واحادیث ہیں جن سے مطالب کی توضیح ہوتی ہے - مصنف نے اپنی تفسیر میں اپنے امتزاجی خیالات کو راہ دی ہے - سید احمد خاں نے عبرانی الفاظ اور محاوروں کی نہایت بہتر تفسیر لکھی ہے اور اپنے دعووں کی تائید میں بہت سے اقوال جمع کیے ہیں - موصوف نے انجیل کے لاطینی ترجمے ' انگریزی ترجمے اور دوسرے ماخذوں سے استفادہ کیا ہے - پھر یہود و نصاریٰ کی مختلف تاویلوں پر بحث کی ہے - نصاریٰ میں بھی پروتستنت اور کیتھولک توجیہات کے فرق کو واضح کیا ہے - اس کے ساتھ قرآنی نقطۂ

نظر کو ' مفسرین اور فقہا کے خیالات کے ساتھہ جو عامۃ المسلمین میں مقبول ھیں ' پیش کیا ھے - ان مباحث کے ضمن میں مصنف نے معقولیوں (Ratioralists) کے اعتراضات کے جواب دیے ھیں اور ساتھہ ھی اس کا بھی اھتمام کیا ھے کہ جہاں کہیں قرآنی آیات کے مطابق عقلی توجیہ ھوسکے اس کو مرجح قرار دیا جاے —

یہ تصنیف اس اعتبار سے حد درجہ دلچسپ ھے کہ اس میں مشرقی اور مغربی علم و فضل کا امتزاج ھے - جگہ جگہ اشعار بھی درج کئے گئے ھیں جو نہایت موزوں اور با موقع معلوم ھوتے ھیں - مجھے افسوس ھے کہ چونکہ میرا موضوع اس وقت محدود ھے اس واسطے میں اس کتاب کے چند صفحات نمونتاً نہیں پیش کرسکتا - خصوصاً وہ عبارت جہاں طوفان نوح کے عالمگیر ھونے کے متعلق بحث کی ھے نہایت بصیرت افروز ھے - اس ضمن میں موصوف کے خیالات ' ڈاکٹر کولنسو (Colenso) کی تحقیق سے بالکل مختلف ھیں جن کا خیال ھے کی طوفان نوح عالمگیر تھا - سید احمد خان کا خیال ھے کہ یہ طوفان صرف ایک خطۂ زمین تک محدود تھا - اس بحث میں موافقت اور مخالفت کے دلائل پیش کرنے کے بعد موصوف نے اپنے نتائج تحقیق کو سینٹ پیٹر کے قول پر مبنی ٹھیرایا ھے جو اس کے پہلے خط سے نقل کیا گیا ھے - اس خط کے الفاظ یہ ھیں " ان لوگوں نے شبہہ کیا نوح کی نبوت پر پھر آخری مرتبہ انہیں مہلت دی گئی جب کہ کشتی بنائی گئی - اس کشتی میں صرف آٹھہ آدمی *

* ان میں نوکر چاکر اور غلام شامل نہیں ھیں جو پالتو جانوروں کی دیکھہ بھال کے لئے مقرر ھوے تھے —

طوفان سے بچے " † -

لائق مصنف نے ان جملوں سے ثابت کیا ہے کہ طوفان سے صرف وہ لوگ تباہ ہوے جنھوں نے سرکشی کی تھی نہ کہ ساری دنیا - پھر مصنف نے قرانی آیات سے مزید استدلال پیش کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ حضرت نوح اپنی قوم کی تلقین کے لئے نبی مقرر کئے گئے تھے - چونکہ قوم نے سرکشی اختیار کی اور ان کی نبوت کو جھٹلایا اس لئے اللہ جل شانہ نے ان پر طوفان کے ذریعہ عذاب نازل کیا - پھر اس کے علاوہ لائق مصنف نے بتایا ہے کہ حضرت نوح پورے عالم میں تلقین نہیں کرسکتے تھے - یہ بات سمجھہ میں آتی ہے کہ وہ ایک مخصوص قوم کی تعلیم و تلقین کے لئے مبعوث کئے گئے ہوں —

طوفان نوح کے متعلق اس کتاب میں ۴۹ صفحات وقف کئے گئے ہیں - ان کو پڑھنے سے آدمی نہیں اُکتاتا اور میری راے میں یہ صفحات اس کے مستحق ہیں کہ علم دوست اور مذہب سے دلچسپی رکھنے والے طبقے کی توجہ ان کی جانب مبذول کی جاے —

اس سال بعض نئے ہندوستانی اخبارات نے جنم لیا ہے -

(۱) " رتن پرکاش " مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتا ہے اور رتلام (بندھیلکھنڈ) سے گذشتہ مئی سے نکلنا شروع ہوا ہے - یہ اخبار اردو میں شائع ہوتا ہے اور ساتھہ ہی ہندی میں ترجمہ بھی ہوتا ہے - اس اخبار سے بعض اوقات " اودہ اخبار " اور " اخبار عالم " میں مضامین نقل کئے جاتے ہیں - " اخبار عالم " نے خاص کر اس کی ترتیب و ادارت کی بہت تعریف لکھی ہے —

---

† باب ۳ - آیت ۱۹ ' ۲۰ —

(۲) " گیان پر دائنی پترکا " یہ ماہوار ہندی رسالہ ہے - گذشتہ مارچ سے نکلنا شروع ہوا ہے - مضامین دلچسپ ہوتے ہیں - ویدوں اور دوسری سنسکرت کتب کے تراجم اس میں درج ہوتے ہیں - فلسفیانہ ' علمی اور ادبی مضامین اور اہم خبریں شائع ہوتی ہیں - یہ رسالہ لاہور سے نکلتا ہے - بابو نبن چندر رائے اس کے مدیر ہیں - موصوف نے ہندی میں سنسکرت کی ایک صرف و نحو کی کتاب بھی لکھی ہے —

(۳) " اخبار سائنٹفک سوسائٹی ' علیگڈہ " - اس سال کے شروع سے یہ مہینے میں دو مرتبہ شائع ہوتا ہے - ہر صفحہ پر دو کالم ہوتے ہیں - سرورق پر یہ الفاظ لکھے ہوے ہیں - " جائز رکھنا چاہیے کی آزادی کا ہے کام ایک دانا سیاست کا اور برقرار رکھنا اس آزادی کا ہے کام ایک آزاد رعیت کا " —

بعض اوقات مضامین کے اردو متن کے ساتھہ انگریزی ترجمہ بھی ہوتا ہے - ۱۲ مئی کی اشاعت میں اس سائنٹفک سوسائٹی کی سالانہ کار گزاری کی رپورٹ بھی درج ہے جو ۹ مئی کو منعقد ہوئی تھی - جن جن لوگوں نے اس موقعہ پر تقریریں کیں ان کی روداد بھی موجود ہے - مسٹر هاول نے از راہ کرم یہ نمبر مجھے بھیجدیا ہے —

(۴ ' ۵) سنہ ۱۸۶۷ ع سے دو رسالے برابر شائع ہورہے ہیں جن میں حکومت کے جملہ قوانین و احکام کا اردو ترجمہ شائع ہوتا ہے اور عدالت ہاے عالیہ کے فیصلوں کی نقل درج کی جاتی ہے - یہ دونوں لاہور سے شائع ہوتے ہیں اور دونوں کی ادارت ایک ہی شخص کے ہاتھہ میں ہے - ایک کا نام " گلنج شائگان " اور دوسرے کا نام " انوارالشمس " ہے —

" اودہ اخبار " اور " اخبار عالم " کے پڑھنے سے اردو کے بعض

جدید اخبارات کے متعلق مجھے علم ہوا جن کی نسبت پہلے میں بالکل نا واقف تھا - اُن کے نام یہ ہیں —

(۶) " طلسم حیرت " مدراس سے شائع ہوتا ہے -

(۷) امیر الاخبار - یہ بھی مدراس سے شائع ہوتا ہے -

(۸) اخبار سر رشتۂ تعلیم اودھ -

(۹) اکمل الاخبار -

(۱۰) ضیاء الاخبار -

(۱۱) اخبار محتشم -

(۱۲) دھلی سے " دھلی نیوز " (Delhi News) انگریزی میں شائع ہوتا ہے - اس اخبار کا علم مجھے بہادر شاہ بادشاہ کے مقدمہ کے سلسلے میں ہوا تھا - ممکن ہے کہ یہ کسی اردو اخبار کا انگریزی ترجمہ ہو جس کی اشاعت کا خاص کر چند انگریزی دانوں کے لئے مدیر نے اہتمام کیا ہو —

اب میں بعض مذہبی رسائل کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراوں گا جو خود دیسی لوگوں کے زیر اہتمام شائع ہوتے ہیں —

(۱۳) حقایق عرفان - یہ مسیحی تبلیغ کا ماہوار رسالہ ہے جس کی ادارت کے فرائض عمادالدین انجام دیتے ہیں - یہ امرتسر سے شائع ہوتا ہے جہاں کا خود مدیر رہنے والا ہے - اس میں امرتسر کے مسلمانوں سے خطاب کیا جاتا ہے - پچھلی جنوری سے اس رسالہ کی اشاعت شروع ہوئی ہے - ہر اشاعت میں مسیحی مذہب اور حضرت مسیح کے متعلق مقالے ہوتے ہیں - لاہور کے مطبع " آفتاب پنجاب " میں یہ طبع ہوتا ہے —

(۱۴) مواعظ عقبیٰ - یہ سنہ ۱۸۶۷ ع سے دھلی سے شائع ہونا شروع ہوا ہے - اس کی ادارت دو نو عیسائی ہندوؤں کے ہاتھہ میں ہے —

(۱۵) مخزن مسیحی - یہ رسالہ ماہوار ہے اور لاطینی رسم خط میں پچھلی جولائی سے شائع ہوتا ہے - اس کے مدیر الہ آباد کے ریورنڈ جے جے والش ہیں - اس رسالہ کا خطاب ہندوستانی عیسائیوں کی طرف ہوتا ہے جنھیں یہ بہت سستے داموں دیا جاتا ہے - ہر اشاعت کی ویسے قیمت تین آنے ہے - اس کے مضامین نصیحت آموز اور ان کا معیار بلند ہوتا ہے - اب تک اس کے جتنے نمبر شائع ہوئے ہیں وہ میرے پیش نظر ہیں - میرے خیال میں اس رسالے کے مضامین اہل یورپ کے لئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہے جاسکتے - اس کی زبان فصیح اور صاف اردو ہوتی ہے - ہر اشاعت میں مضامین کا تنوع ہوتا ہے - انگریزی طرز کی نظمیں ہوتی ہیں اور اہم مذہبی کتب کے تراجم بھی ہوتے ہیں —

ہندوستانی اخبارات کے مضامین کے معیار کے متعلق میں اس موقعہ پر زیادہ کچھہ نہیں کہنا چاہتا - دوسرے ممالک کے اخبارات کے خلاف ہندوستان کے اخبارات میں بارش اور موسم کے متعلق بہت زیادہ تحریر کیا جاتا ہے - اہل ہند کے نزدیک بارش کا موسم بہار کہلاتا ہے اور اس کی آمد کا انہیں بے چینی سے انتظار رہتا ہے چنانچہ "اخبار عالم" میں مہاراجہ بلرام پور کی ایک نظم میری نظر سے گذری جس میں خدائے عزوجل سے خشک سالی کو دور کرنے کی جو ملک کو تباہ کئے دیتی ہے ' " اور اپنے رحم و کرم کی بارش " کرنے کی التجا اور دعا کی گئی ہے - اس اخبار کے مدیر کا بیان ہے کہ جناب باری میں

یہ دعا قبول ہوئی اور بارش فوراً شروع ہوگئی —

" اخبار عالم " مورخہ ۴ جون ۱۸۶۸ ع کی اشاعت میں میری نظر سے ایک بارہ کالم کا مضمون گذرا جس میں مہاراجہ بلرام پور کے شہر اور جنگلی ہاتھی کے شکار کی مفصل کیفیت بیان کی گئی ہے - اس مضمون کی زبان شاعرانہ استعاروں سے پر ہے جو مشرقی مذاق کے بالکل موافق ہے - بعد میں عاصی کی ایک غزل ہے جو ہمعصر شعراء میں خاص رتبہ رکھتے ہیں —

میں نے ابھی جس اخبار کا ذکر کیا اس میں بس اسی قسم کے مضامین نہیں ہوتے بلکہ دوسرے مفید مضامین بھی ہوتے ہیں - مثلاً سفر کے فوائد ایک مضمون میں بیان کئے گئے ہیں اور نہایت مفید مشورے دیے گئے ہیں - اس مضمون کے بعض حصے مثال کے طور پر میں پیش کرتا ہوں !

> " ہندوستان کے ملک میں ایسے بہت کم امراء ملیں گے جو مفید مشاغل کی طرف رغبت رکھتے ہوں - بہت کم ان میں ایسے ہیں جو بلند نقطۂ نظر رکھتے ہیں اور علم و فضل میں جنھوں نے امتیاز حاصل کیا ہے یا جنھوں نے مدارس ' اسپتال ' سراے اور مساجد یا منادر کی بنا ڈالی ہو اور غریب غرباء کو خیرات دیتے ہوں - ایسی مثالیں اس طبقے میں نایاب ہیں جنھیں سفر سے دلچسپی ہو اور دوسرے ممالک کی سیر کا شوق ہو - اگر وہ خود اتنی صلاحیت نہیں رکھتے کہ یورپ جائیں تو کم از کم اتنا تو ضرور کرسکتے ہیں کہ اپنے اہل وطن کو بھجوائیں تاکہ وہ ممالک غیر کے عجائب دیکھیں

اور علمی اور تجارتی فوائد حاصل کریں - بیشتر مہاراجوں اور نوابوں کا دستور ہے کہ مہینوں وہ اپنے محلات کی چار دیواری سے باہر قدم نہیں رکھتے اور اپنی جاگیروں کے نظم و نسق کی انہیں مطلق پروا نہیں ہوتی - اگر وہ کچھہ عرصے کے لئے هندوستان سے باہر چلے بھی جائیں تو بھلا کسی کا کیا نقصان ہوگا ؟ اگر انہیں یہ خوف ہے کہ سفر میں محلات کا سا آرام نہیں ملے گا تو انہیں فارسی کے اس شعر کو یاد رکھنا چاہئیے جو آج سات صدی سے زبان زد ہے

منعم بہ کوہ و دشت و بیابان غریب نیست
هر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

اس زمانے میں اہل یورپ کے انتظام کی بدولت سفر میں بڑی سہولتیں ہوگئی ہیں - گھر کی سی آسائش پردیس میں حاصل ہوسکتی ہے - سڑکیں ہر طرف موجود ہیں - ہوٹلوں کی کمی نہیں - گوشے گوشے میں ڈاک خانے قائم کردیے گئے ہیں - ریلوں اور جہازوں کے ذریعہ ہزارہا میل کا سفر جلد اور سستے داموں طے ہوجاتا ہے - راستے ہر طرف محفوظ ہیں کسی قسم کا خطرہ نہیں ... "

" یورپ کے بادشاہوں میں یکانگت اس وجہ سے بھی قائم ہورہی ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کا موقعہ ملتا ہے - چنانچہ یونان ' روس ' فرانس ' اٹلی اور ڈنمارک وغیرہ کے بادشاہ ایک دوسرے کی سلطنتوں میں جاتے ہیں اور حالات کا مشاہدہ کرتے ہیں - هندوستان میں اس کی مثالیں ناپید ہیں - ابھی حال میں صرف بیگم بھوپال حج کی غرض سے مکہ تشریف لے گئی تھیں اور چند ماہ

تک وہ اپنی ریاست سے دور رهیں - خشکی اور سمندر پر هزار ها میل کا سفر کر کے بیگم بھوپال نے یہ ثابت کر دیا ھے کہ هندوستان کے والیان ملک میں اتنا حوصلہ موجود نہیں جتنا کہ اس والیۂ ریاست میں ھے اس لیے کہ یہ لوگ تو اپنی جاگیروں کے باهر قدم رکھنا حرام سمجھتے هیں - ایسے مردوں سے تو عورتیں هی اچھی هیں - .... ۔"(*)

"اخبار عالم" کے مدیر وجاهت علی نے جو اس اخبار اور میرٹھ والے مطبع کے مالک بھی هیں جس کا نام "دارالعلوم" ھے، ایک اور دوسرا مطبع قایم کیا ھے جس کا نام "لٹریری پریس" (Literary Press) ھے - اس جدید مطبع میں ٹائپ استعمال کیا جاتا ھے - یہاں سے پندرہ روزہ رسالہ "جنرل اڈورٹائزر" (General Advertiser) شائع هوتا ھے - اس رسالے میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں اشتہارات درج هوتے هیں - اس مطبع کا تعلق مکتبہ سے ھے جہاں مشرقی علوم کی کتب فروخت هوتی هیں - ان کتابوں کی فہرستیں "اخبار عالم" میں بھی کبھی کبھی شائع هوتی رهتی هیں —

"اودہ اخبار" میں، جو اب دس سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ چل رها ھے، بعض اوقات تصاویر اور اردو کی اعلیٰ پایہ کی غزلیں شایع هوتی هیں - غزلوں کے علاوہ مخمس اور قصیدے بھی هوتے هیں - حال

(*) همیں خبر ملی ھے کہ بیگم بھوپال جن کا اسم گرامی سکندر (جہاں بیگم) تھا ان کا ۳۰ ستمبر کو پچاس سال کی عمر میں انتقال هو گیا - هندوستانی اخبارات نے موصوفہ کے متعلق نہایت اعلیٰ خیالات کا اظہار کیا ھے —

میں فرحت کی ایک نظم شائع ہوئی تھی جس میں ہندوستان کے مناظر کا بیان تھا - موصوف آج کل کے اچھے انشاپردازوں میں شمار کئے جاتے ہیں - آپ نے " پریم ساگر " کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے جو لکھنؤ میں طبع ہوا ہے - "اودہ اخبار کی ایک تازہ اشاعت میں علیگڑہ کی سائنٹفک سوسائٹی کے رسالے سے ایک مضمون نقل کیا گیا ہے جس کا موضوع ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصانیف ہے * —

گوالیار کے ہندوستانی اخبار نے جو ہندی اور اردو دونوں میں نکلتا ہے (ایک کالم میں ہندی اور دوسرے میں اردو) اپنی ۱۴ جون کی اشاعت میں ان جشنوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو نہایت دھوم کے ساتھ مہاراجہ سندھیا کے ولیعہد کی شادی کے سلسلے میں منائے گئے - یہ جشن اپنی آب و تاب کے اعتبار سے خاص مشرقی رنگ کے تھے - ہم ذیل میں چند سطور پیش کرتے ہیں :

" شادی خانہ آبادی کے ضمن میں دربار منعقد ہوا - زہرہ جبین طوائفوں کا ناچ اور ان کے جسم کے حرکات و سکنات کو دیکھ کر فلک پیر کی آنکھیں حیرت سے کُھلی کی کھلی رہ گئیں - آفتاب عالمتاب کے غروب ہونے سے تقریباً ایک گھنٹہ قبل دولہا محل شاہی سے رخصت ہو کر پوجا کی غرض سے روانہ ہو گئے '

(*) میں اس مضمون نگار کا شکرگزار ہوں کہ اس نے میری تصانیف کو اس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے - میرا اب تک کبھی موصوف سے تعارف نہیں کرایا گیا - مجھے افسوس کے ساتھ ایک غلطی کی جانب توجہ دلانی ہے - (۲۲ ستمبر سنہ ۱۸۶۸ ع کے پرچے میں صفحہ ۹۰۹ ' سطر ۲۳ ' پہلے کالم میں بجائے فارسی لفظ انگریزی چھپ گیا ہے جس کے باعث مضمون خبط ہو گیا ہے) —

ہاتھی پر سوار جس پر زرین جھولیں پڑی تھیں اور ہودہ بھی سونے کا تھا - پیچھے پیچھے ریاست کے اعلیٰ عہدہ داروں کی سواریاں تھیں - یہ عہدہ دار بھی ہاتھیوں پر سوار تھے - پھر سوار تھے جو نہایت زرق برق لباس زیب تن کئے ہوئے تھے - اس کے بعد توپخانہ تھا اور اس کے پیچھے نیزہ برداروں اورعلمبرداروں کی قطاریں تھیں - جب کبھی کے محل پر سواری پہنچی تو توپیں داغی گئیں جن کی آواز سے فضاے آسمانی گونج اٹھی - محل کے فرش و فروش اور ساز و سامان کی بوقلمونی سے زمین رشک نہم آسماں بنی ہوئی تھی - چراغوں اور مشعلوں کی روشنی سے محل بقعۂ نور بنا ہوا تھا - رقص و سرود نے اس محفل کو راجہ اندر کی سبھا بنا دیا تھا - مغربی رخ ایک چبوترے پر وشنو کا بت نصب تھا جس کے چاروں طرف شعلے نظر آتے تھے - اس چبوترے پر ایک طرف مہاراجہ سندھیا اور ان کے فرزند ارجمند کی نشست کے لئے الگ الگ دو ریشمی گاؤ تکیہ رکھے تھے - ولیعہد کے پہنچ جانے کے بعد مہاراجہ چنا راجا کی سواری آئی - ان کی آمد پر بھی توپیں سر کی گئیں - اس کے بعد پوجا شروع ہوئی جو جو وہاں موجود تھے انھیں عطر اور پان تقسیم کئے گئے - پھر آتشبازی کی باری آئی - ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہ صرف مخلوق شادماں ہے بلکہ کلیاں تک فرط انبساط میں کھلی جا رہی ہیں- انار اور مہتابی کی رونق کے آگے چاند تک شرما گیا -

بنارس کے بابو ہری چند اُن ہندو ارباب علم و فضل میں سے ہیں جو ہندی ادب کی نشر و اشاعت کا کام نہایت تندہی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں -

موصوف ہندی کلام کو کتابی شکل میں شائع کر رہے ہیں اور کبھی کبھی منتخبات کی شکل میں جو تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد رسائل کی شکل میں شائع کی جاتی ہیں- ان رسائل کا نام "کوی بچن سدھا" رکھا گیا ہے- موصوف نے از راہ عنایت جو جو نمبر چھپتے جاتے ہیں میرے پاس بھیج دیے ہیں - اس مجموعے میں ایک نظم بعنوان "پریم رتن" میری نظر سے گذری- یہ نظم ایک ہندو دیوی رتن کنور کی لکھی ہوئی ہے-اور دوسری دلچسپ نظموں میں "دلی برنن" اور ایک "ہولی" شامل ہے - اول الذکر گلستان کی ایک حکایت سے ماخوذ ہے اور اسے ہندی جامہ پہنا دیا گیا ہے - اس کے علاوہ کبیر داس کی سکھیاں ہیں- شودروں کی زندگی اور موسم برشکال وغیرہ جیسے موضوعوں پر بھی نظم و نثر کے نمونے دیے گئے ہیں —

بابو صاحب کا ارادہ ہے کہ سنسکرت کے مشہور مشہور ناٹکوں کو ہندی زبان میں منتقل کریں - اس کام میں پنڈت سیتل پرشاد بھی ان کی مدد کرنے کو آمادہ ہیں- موصوف "سدھانت سنگرھا" کے مترجم ہیں - یہ کتاب (Synopsis of Science) کا ہندی ترجمہ ہے جو فتز ایڈورڈ ہال کی مدد سے پایۂ تکمیل کو پہنچا- اس ترجمہ کی غایت یہ بتلائی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے مشرقی اور مغربی سائنس میں امتزاج پیدا کیا جائے -

بابو صاحب نے "کوی بچن سدھا" کی ایک اشاعت میں اظہار تاسف کیا ہے کہ "جانکی منگل" کا ناٹک ختم ہوگیا * اگرچہ اس کے تماشے کا

---

* جانکی سیتاجی کا نام ہے اس لیے کہ راجہ جانک نے ان کی پرورش کی تھی اور اپنی بیٹی بنایا تھا - مذکورہ ناٹک تلسی داس کی تصنیف ہے - سنہ ۱۸۶۴ ع میں میرٹھ میں طبع ہوا - پھر سنہ ۱۸۰۵ ع میں آگرہ میں اس کا دوسرا ایڈیشن اور سنہ ۱۸۶۷ ع میں لاہور میں تیسرا

(باقی بر صفحۂ آئندہ)

اعلان هو چکا تها یه تماشه تمام تر دیسی لوگوں کے اهتمام سے منعقد هوا - پہلا تماشه ۴ اپریل کو بنارس میں هوا تها اور مہاراجه بنارس ' جو ایک نہایت روشن خیال اور تہذیب و ادب کے قدردان هیں ' اس کے مربی تھے - موصوف هندی ادب کی ترقی کے لیے بھی کوشاں هیں - پہلے تماشے میں مہاراجه اور ان کے فرزند ارجمند کے علاوہ ان کی ریاست کے اعلیٰ عہدہ دار و امراء ' بنارس کے هندوستانی اور یورپین باشندے جنهیں خاص طور پر مہاراجه کی طرف سے مدعو کیا گیا تها ' موجود تھے - چند مستورات نے بھی تماشه دیکھنے کی غرض سے شرکت کی - تماشه شروع هونے سے قبل اور بیچ کے وقفوں میں قومی گیت آرچسترا (Orchestra) پر بجائے گئے - " ستردهار " (Director) پہلے استیج پر آئے اور اپنی تمہیدی تقریر پڑھی (انڈین میل ' مورخه ۷ مئی سنه ۱۸۶۸ ع) - پھر اس کے بعد ایک عورت استیج پر آئی اور ڈایرکٹر سے گفتگو کرنے لگی - یه گفتگو سامعین کی توجه مرکوز کرنے کے لیے کی گئی تھی - یہی طریقه سنسکرت کے ناٹکوں میں بھی رائج تها - اسی اثنا میں پردے کے پیچھے کچھه شور سا سنائی دیا اور ڈایرکٹر یه کہه کر رخصت هوا که رام چندر جی آئے - پردہ اٹھا تو رام چندر جی ایک جنگل میں دکھائی دیے - اب گویا اصل ناٹک شروع هو گیا —

پہلے ایکٹ میں ایک باغ دکھایا گیا جس میں پاربتی جی بیٹھی

(از صفحهٔ گذشته)

ایڈیشن نکلا - همارے خیال میں یه ناٹک " هنومان ناٹک " یا " مہی ناٹک " کے پہلے سین پر مبنی هے جس کے متعلق ایچ ایچ ولسن نے اپنی کتاب " هندؤں کے ناٹکوں کے ملتخبات " میں ذکر کیا هے - دیکھو جلد ۳ - صفحه ۳۹ - راگ ساگر میں هندی ترجمه کے نسبت بھی ذکر هے —

ہوئی ہیں - پاربتی جی شیوجی کی بیوی ہیں جس طرح شیوجی تخریب عالم کے دیوتا ہیں اسی طرح ان کی بیوی بھی تخریب عالم کی دیوی ہیں جنہیں درگا بھی کہتے ہیں - پھر رام اور ان کے بھائی لکشمن نے منظر پر آکر سیتا جی کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی اور قریب جو باغبان کھڑا ہوا تھا اس سے پھول توڑنے کی اجازت مانگی - اسی اثناء میں سیتا جی آگئیں - ان کے ساتھ ان کی سہیلیاں تھیں - سیتا جی نے دیوی جی کو سلام کیا اور باغ میں ٹہلنے لگیں - ایک سہیلی سیتا جی کے پاس دوڑی ہوئی آئی اور کہا کہ میں نے ابھی اس باغ میں ایک نوجوان کو دیکھا ہے جس کے حسن جہاں افروز نے اپنی طرف مجھے محو کرلیا تھا - نوجوان بھی اتنے میں آموجود ہوا اور سیتا جی کے حسن کا جادو اس پر چل گیا - دوسرے اور آخری ایکٹ میں ایک کمرہ کے اندر جو شاہی طریقہ پر آراستہ تھا راجہ جنک سیتا جی کے پتا بیٹھے ہوئے تھے - مختلف ممالک کے شہزادے اپنے رنگ برنگ کے لباس میں ملبوس سیتا کی خواہش میں سامنے سے گذر رہے تھے - رام سب سے آخر میں منظر پر آئے - جب سب شہزادے بیٹھ گئے تو راجہ جنک نے خواہش ظاہر کی کہ ہر ایک اس کمان کو جھکانے کی کوشش کرے جو کمرے کے اندر رکھی ہوئی تھی - اس نے کہا کہ میں نے عہد کیا ہے کہ جو کوئی اس کام کو انجام دے گا سیتا اسی کی ہوجائے گی - سب شہزادوں نے کوشش کی لیکن سوائے رام کے کوئی بھی اس کمان کو جھکا نہیں سکا - رام نے نہ صرف اس کو جھکا دیا بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردیے - چنانچہ سیتا جی رام کو مل گئیں —

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سال ان احباب کی تعداد بہت زیادہ ہے جنھوں نے ہمیں ہمیشہ کے لیے داغ مفارقت دیا

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت نے چن چن کر انہیں ہم میں سے اٹھا لیا جن کی ہمیں سخت ضرورت تھی - گذشتہ سال ۲۵ نومبر کو گوکل داس تیج پال نے جو ایک نہایت معزز بھاٹیا خاندان کے چشم و چراغ تھے، جہان فانی کو خیرباد کہا - آپ نے اپنے ہم وطن لوگوں کی تعلیمی ترقی میں خاص سر گرمی کا ثبوت دیا تھا - آپ کے نام پر آج تک لڑکوں کا ایک مدرسہ بطور یادگار موجود ہے - آپ نے تعلیم اور دوسرے کاموں میں کئی لاکھ سے زائد رقم اپنے پاس سے صرف کی - غریب غربا کے لیے آپ نے ایک اسپتال بھی قایم کیا تھا - بمبئی کے اردو اخبار " راست گفتار " میں یہ اعلان شائع ہوا تھا کہ موصوف نے مرتے وقت وصیت میں اپنی کل ملک کا تیسرا حصہ ترقیء تعلیم کے لیے وقف کر دیا ہے - چنانچہ یہ ثلث دس لاکھ روپے کے مساوی ہے * —

پچھلے سال ۳۰ نومبر کو میر سید محمد خاں بہادر نے لکھنؤ میں داعیء اجل کو لبیک کہا - موصوف سید عبداللہ کے والد تھے جن کی نسبت میں اپنے خطبات میں متعدد مرتبہ ذکر کر چکا ہوں - موصوف سنہ ۱۸۱۵ ع سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں تھے - سنہ ۱۸۲۰ ع میں آپ دکن میں نائب مجسٹریٹ و کلکٹر مقرر کیے گئے اور سنہ ۱۸۳۵ ع میں آپ کا تبادلہ جبلپور بہ حیثیت مجسٹریٹ و کلکٹر ہوگیا - موصوف نے اس خدمت کے فرائض نہایت خوبی کے ساتھ سر انجام دیے - آپ اپنے ہر کام کو نہایت قابلیت اور جوش کے ساتھ کیا کرتے تھے - اور دوسرے مسلمانوں کے خلاف، جو مذہبی تعصب اور غلو کے باعث مغربی تعلیم کو حرام تصور کرتے ہیں، آپ نے تمام تعصبات کو بالکل ترک کر دیا تھا - اگرچہ

---

* ٹائمز آف انڈیا (انڈین میل ۲ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع) —

آپ سید اور پابند شرع مسلمان تھے لیکن باوجود اس کے آپ نے اپنے فرزند کو سنہ ۱۸۳۹ ع میں جبلپور کالج میں شریک کیا - یہ کالج کلیۃً انگریزی حکومت کے زیر انتظام تھا - آپ کے صاحبزادہ سید عبداللہ پہلے مسلمان ہیں جنہوں نے اس کالج میں انگریزی تعلیم حاصل کی —

سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کے موقعہ پر سید محمد نے برطانوی حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری قائم رکھی - جس وقت جبلپور کے یورپین باشندے ہر طرف سے گھر گئے تھے اور خود ہندوستانی اس پس و پیش میں تھے کہ کیا کیا جائے ' سید محمد نہایت استقلال کے ساتھ اپنی وفاداری پر قایم رہے - چنانچہ شورش کے بعد حکومت نے موصوف کی خدمات کا اعتراف کیا - بہادر کا خطاب عطا کیا اور خاطر خواہ پنشن دی لیکن افسوس ہے کہ موصوف بہت زیادہ دنوں تک اس پنشن سے فائدہ نہ اٹھا سکے * —

میرے نوجوان دوست ایچ پامر جو ایک نہایت ہوشیار ماہر زبان ہندوستانی ہیں ' آج کل قاہرہ کے قدیم قلمی نسخوں کی چھان بین میں مصروف ہیں - موصوف بھی اس تحقیقاتی کمیشن کے ساتھ ہو گئے ہیں جو کوہ سینا کی باقیات کے متعلق تفتیش کر رہا ہے اور اس علاقہ کی پیمائش میں مصروف ہے - پامر صاحب نے میر سید محمد خاں بہادر کی موت پر جن کے وہ نہایت محبوب شاگرد ہیں ' عربی زبان میں ایک مرثیہ لکھا ہے —

اس سال ۲۴ جنوری کو مستشرقین کے سردار ڈاکٹر جے ڈی میکبرائڈ

---

* ٹائمز - ۱۰ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع ؛ انڈین میل - ۲۳ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع —

نے نوے سال کی عمر میں جہان فانی کو الوداع کہا - موصوف آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی زبان کے پروفیسر تھے - اگرچہ موصوف نے عربی زبان میں خاص طور پر اپنی تحقیق کو محدود رکھا تھا لیکن آپ ہندوستانی سے بالکل نابلد نہیں تھے - موصوف کی آخری تصنیف مذہب اسلام پر ایک محققانہ کتاب ہے - اس میں اسلام کی ترقی پر نہایت بصیرت افروز بحثیں ہیں اور اسلامی عقائد کو بدلائل باطل قرار دیا ہے † - موصوف ہماری پیرس کی " ایشیاٹک سوسائٹی " کے سب سے قدیم اعزازی رکن تھے اور اس کے سب سے پہلے صدر سلوستردے ساسی سے موصوف کے خاص تعلقات تھے - آخرالذکر وہی صاحب ہیں جن کی بدولت اس کالج میں ہندوستانی کی چیر (Chair) قائم ہوئی - اب ڈاکٹر جے ڈی میکبرائڈ بھی سلوستردے ساسی آنجہانی سے عالم بالا پر جاکر مل گئے ' " یہ وہ عالم ہے جہاں فراق کا گذر نہیں - نیک بندے وہاں ابدی محبت میں ایک دوسرے کے ساتھہ شریک ہوتے ہیں - عقیدہ کی بدولت دنیاے فانی سے جانے والے اس عالم بالا پر پہنچتے ہیں " ‡

بابو رام گوپال گھوش کے مرنے سے ہندو جماعت کا ایک نہایت روشن خیال فرد اُٹھہ گیا - آپ کا کلکتہ میں گذشتہ ۲۵ جون کو ۵۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا - آپ " مجلس تعلیمی " کے سنہ ۱۸۵۵ ع

---

† " The Mohamedan Religion explained with an introductory sketch of its progress and suggestions for its refutations "

‡ عالم بالا میں جدائی کا وجود نہیں - وہاں محبت کی ابدی زندگی حاصل ہوتی ہے جو خیر محض پر مبنی ہوتی ہے - عقیدہ میں یہ قوت ہے کہ وہ دنیا میں مرنے والوں کو عالم پاک تک لے جاے " - مونٹگمری —

تک برابر رکن رہے جب کہ خود یہ کونسل ختم ہوگئی * - موصوف متعدد اخبارات کے مدیر تھے اور آپ نے بہت سی ادبی انجمنوں کی اپنی زندگی میں بنا ڈالی - ایک مدرسہ اور ایک کتب خانہ ٹونٹونیا میں قایم کیا - آپ کو عمر بھر تعلیمی مشاغل سے خاص لگاو رہا - آپ کا دستور تھا کہ ہر سال کلکتہ کے مختلف مدارس کے ان طلباء کو جنھوں نے امتحان میں امتیاز حاصل کیا ' مارشمن کی " تاریخ هند " کے سو نسخے تقسیم کیا کرتے تھے - یہ اس وقت کا ذکر ہے جب کہ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا تھا + -

گذشتہ سال میسور کے آخری راجہ کے فرزند کا انتقال ہوگیا - یہ آخری راجہ مہاراجہ کرشن راج دیو بہادر براے نام راجہ تھے - اس لئے کہ حیدر علی نے ' جو ایک مشہور مسلمان فاتح گذرا ہے ' ملک پر قبضہ کرلیا تھا اور اس کی حکومت چلتی تھی - سنہ ۱۷۹۹ ع میں جب انگریزوں نے ٹیپو سلطان کو شکست دے کر اپنی عملداری قایم کی تو مہاراجہ کے بھتیے کو برسر اقتدار کردیا - اس وقت اس شہزادے کی

* مجھے اس وقت مس کارنیٹر کے هم سفر بابو من موهن گھوش یاد آرہے هیں - موصوف بیرسٹری کی تعلیم کے لئے انگلستان آے تھے - موصوف کو بت پرستی سے قطعاً احتراز تھا اگرچہ انھوں نے مسیحی مذهب نہیں قبول کیا تھا - ان کی منگنی ایک نابالغ هندو لڑکی کے ساتھہ هوئی تھی جسے انھوں نے کلکتہ کی رومن کیتھولک خانقاہ میں تعلیم کے لیے بھیجا تھا - اس لئے نہیں کہ وہ مسیحی مذهب قبول کرلے بلکہ اس واسطے کہ خانقاہ کی زندگی موصوف کو زنانے کی زندگی سے بہت کچھہ مشابہ معلوم هوتی تھی جس میں اس لڑکی کو آئندہ زندگی بسر کرنا ہے —

+ کلکتہ ریویو - فروری سنہ ۱۸۶۸ ع - صفحہ ۵۱۱ -

صرف ۶ سال کی عمر تھی - مہاراجہ میسور کے اس فرزند کا گزشتہ ۲۷ مارچ کو بنگلور میں انتقال ہوگیا - انتقال کے دوسرے روز اس کی لاش ہندو رسم کے مطابق جلائی گئی - دیسی لوگوں میں مرحوم کی ذات بہت مقبول تھی اس لئے کہ وہ نہایت سخی اور فیض رسان تھے - سنہ ۱۸۵۷ ع کی شورش عظیم کے موقعہ پر راجہ نے انگریزی حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری قایم رکھی - اگر وہ ایسا نہ کرتے تو برطانوی حکومت کی راہ میں مزید دشواریاں پیش آجاتیں - انھوں نے شام راجندر دیار بہادر کو اپنا متبنی بنایا - اس لڑکے کی بھی ۶ سال کی عمر تھی جب میسور کا تخت و تاج اسے ملا - لڑکے کی نابالغی کے زمانے میں انگریزی حکومت کا ریاست پر انتظام قایم رہے گا جس طرح اس سے قبل اس کے والد ماجد کی زندگی میں رہ چکا تھا - نوعمر راجہ کا قیام بنگلور کے قلعہ میں رہے گا - دس سال قبل بنگلور کی آبادی ۷۰ ہزار تھی لیکن آج ایک لاکھ سے زیادہ ہے - یہاں اس کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا - بنگلور کی آب و ہوا نہایت خوشگوار ہے - ریل کی بدولت یہ شہر مدراس سے مل گیا ہے - گویا یہ دونوں شہر در اصل ایک ہی شہر ہوگئے ہیں - (اودہ اخبار ۱۴ جولائی سنہ ۱۸۶۸ ع)

پچھلے اپریل کی ۵ تاریخ کو رچرڈ ہاٹن (Richard Haughton) کا ۸۶ سال کی عمر میں انتقال ہوگیا - موصوف سر گریو ہاٹن کے بھائی تھے - انسٹیٹیوٹ دے فرانس کی " اکادمی فنون لطیفہ " کے بیرونی رکن تھے اور میرے ہم سبق تھے - ہم دونوں نے سلوسترد ساسی کے سامنے زانوے ادب تہ کیا تھا - موصوف کچھ عرصے سے رمسگیٹ (Ramsgate) میں اپنی زندگی کے آخری ایام دنیا سے الگ تھلگ گذار رہے تھے - موصوف کو ہندوستانی سے خاص لگاو تھا

اور آپ مدت تک (Addiscombe) کے فوجی کالج میں السنۂ مشرقیه کے پروفیسر رہ چکے تھے - آخری عمر میں بینائی کے بالکل زائل ہوجانے کے باعث انہوں نے گوشه نشینی اختیار کرلی تھی - اس کے باعث وہ علمی دنیا میں جتنے چمکنے چاہئے تھے نه چمکے —

میرے قدیم اور عزیز دوست ڈنکن فوربس (Duncan Forbes) نے بھی جہان فانی کو الوداع کہا - آپ سے میرے نہایت دیرینه تعلقات تھے - آپ ایک نہایت فاضل مستشرق تھے - آپ نے متعدد تصانیف اپنی یادگار چھوڑی ہیں - خصوصاً ہندوستانی لغت نہایت کار آمد ثابت ہوئی - آپ کی لغت نے شیکسپیئر کی ہندوستانی لغت کی جگه اسی طرح لے لی ہے جس طرح فرانس میں الکزنڈر کی یونانی کی لغت نے پلانش کی لغت کو ناکارہ بنادیا ہے - فوربس صاحب کو میری طرح ہندوستانی سے طبعاً مناسبت تھی اور آپ نے اس زبان کی ترقی اور نشرو اشاعت کے لئے اپنی تعلیم سے بہت مدد پہنچائی - فوربس اس کاتستان کے ایک چھوٹے سے قریے میں پیدا ہوے تھے - جوں توں اپنی تعلیم ختم کرکے آپ کلکته چلے گئے جہاں دو سال قیام کرنے کے بعد صحت کی خرابی کے باعث سنه ۱۸۲۶ ع میں یورپ واپس ہوے - اس بار میری ان کی پہلی ملاقات ہوئی - موصوف اپنے دوست سنٹ فورڈ آرنات (Santford Arnot) کی طرح جن کا جوانی میں سنه ۱۸۳۴ ع میں انتقال ہوچکا ہے گلکرسٹ کے شاگرد تھے - فوربس اور آرنات دونوں نے مل کر لندن کے "ادارۂ مشرقیه" (Oriental Institution) کی بنا ڈالی تھی - میں نے بھی اپنے اساتذہ سلوسٹر دے ساسی اور شیکسپیئر کی ہمت افزائی پر پیرس میں لندن والے ادارے کی نقل کی کوشش کی ہے - سنه ۱۸۳۷ ع میں فوربس

کو لندن یونیورسٹی کے کنگز کالج (King's College) میں السنۂ مشرقیہ کی پروفیسری دی گئی اور سنہ ۱۸۴۳ ع میں ڈاکٹر آف لا کی اعزازی سند عطا ہوئی - فوربس کے خطبات کی طرح ان کی جملہ تصانیف کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ نہایت صاف اور ستھری زبان میں لکھی گئی ہیں - فوربس کے شاگرد لا تعداد ہیں - بعض وہ ہیں جنھوں نے بلا واسطہ تحصیل علم کیا اور بعض وہ ہیں جنھوں نے بالواسطہ فیض حاصل کیا - ان سب کے دلوں میں اپنے استاد کی بیحد قدر تھی - موصوف نے ایک نہایت قابل قدر قلمی کتب خانہ جمع کیا تھا - تین سال ہوئے بعض وجوہ کی بنا پر انھوں نے یہ کتب فروخت کر ڈالیں - چنانچہ میں نے بھی اس موقع سے فائدہ اٹھاکر بعض نادر نسخے حاصل کرلئے جو میرے کتب خانہ کی زینت ہیں - فوربس نہایت سلیم الطبع اور خاکسار منش شخص تھے - ان کی زندگی ایک علم دوست آدمی کا اعلی ترین نمونہ ہمارے سامنے پیش کرتی تھی - اپنے اور دوسرے بعض احباب کی طرح جن میں شیکسپیئر، کانر میر، گرانگرے دے لاگرانج شامل ہیں، فوربس بھی عمر بھر مجرد رہے - ان کے علمی مشاغل میں اہل و عیال کی چھقلشیں حارج نہیں ہوئیں - فوربس نے عمر بھر اپنے کاموں کو انہماک اور انتہائی جوش کے ساتھ انجام دیا اور آخری وقت تک محنت اور کام کرتے رہے - موصوف کا گذشتہ اگست کی ۱۷ تاریخ کو لندن میں انتقال ہوا - میری دعا ہے کہ خدا موصوف کی روح کو امن نصیب کرے - ہمیں چاہئیے کہ ان کے کام کو جو ان کی بہترین یادگار ہے عزت و توقیر کی نظر سے دیکھیں —

اب میں دو معروف ہندوؤں کی موت کا اور ذکر کردوں جن کا

پچھلے اگست میں انتقال ہوا ہے - میری مراد ان سے گنجل لچھمن ارسوچتی اور پروسونو کمارتگور سے ہے - اول الذکر مدراس کی " مجلس وضع قانون " کے رکن تھے اور موصوف نے هندو مقاصد کو اخبار نویسی اور ادب کے ذریعہ سے ترقی دی - موصوف کو تعلیمی معاملات سے خاص دلچسپی تھی اور مقامی زبانوں اور هندوستانی کے ذریعہ تعلیمی اشاعت میں عمر بھر کوشاں رہے - ثانی الذکر ایک غیر معمولی خدا داد قابلیت کے شخص گذرے ھیں- آپ نے هندو قانون پر نہایت فاضلانہ شرح لکھی ہے - یہ کتاب نہایت شستہ انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے - یہ اصول قانون اب متهلا (آج کل کا ترهوت) میں تسلیم کئے گئے ھیں - یہ تصنیف اصل سنسکرت پر مبنی ہے (*) - پروسونوکمارتگور کا کلکتہ میں ۶۷ سال کی عمر میں انتقال ہوا - موصوف نہایت دولتمند شخص تھے لیکن ابتدا ھی سے طبیعت کو ادب اور قانون سے لگاؤ تھا - انگریزی زبان پر قدرت کا یہ عالم تھا کہ موصوف نے بیس سال کی عمر سے قبل ایک رسالہ بنام 'انڈین ریفارمر" نکالا تھا - شروع میں کچھہ روپیہ تجارت میں لگایا لیکن چونکہ اس سے قدرتی مناسبت نہ تھی سب روپیہ ڈوب گیا - پھر وکالت شروع کی اور خوب شہرت حاصل کی - اصول قانون پر موصوف کی نظر نہایت وسیع تھی - اس کے بعد مجسٹریٹی کے متعدد عہدوں پر فائز رہے اور مجلس وضع قانون کے رکن مقرر ہوے - لیکن صحت کی خرابی کے باعث عرصہ تک یہ خدمات انجام نہ دے سکے - آج تک تگور کی دریادلی اور حسن سلوک کا ان

(*) سنسکرت نام " وود چنتامنی " ہے - اصل کلکتہ میں سنہ ۱۸۶۳ ع میں شائع ہوچکی ہے - ۳۴۰ صفحات پر مشتمل ہے —

کے ہم مذہب ذکر کرتے ہیں - موصوف کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے اور علم و تعلیم کی ترقی سے خاص دلچسپی رکھتے تھے -" آپ برٹش انڈین ایسوسیشن " کے بانیوں میں سے ایک ہیں (*) - لیکن موصوف نے اپنے فرزند بابوگملدر موھن ٹگور کے مسیحی مذہب قبول کرنے کے باعث اس انجمن سے علحدگی اختیار کر لی - موصوف کے فرزند بعد میں کلکتہ ھائی کورٹ کے جج ھوے - موصوف کو ابتدا میں اصلاحی خیالات سے لگاؤ تھا لیکن بعد میں اصلاحی خیالات سے دلچسپی لینا چھوڑ دیا تھا - وہ مرتے دم تک پکے ھندو رھے ' انتقال پر آپ کی لاش گنگا کے نذر کی گئی - مرتے وقت آپ ۲۰ ھزار روپے سالانہ کی آمدنی اپنے خاندانی بت کے نام وقف کرگئے اور اپنے بیٹے کو محروم الارث قرار دیا (؛) - ھمارے خیال میں اگر بابو گملدر موھن ٹگور (بیٹے) کو مسیحی دین سے مخلصانہ تعلق ھے تو وہ اپنے محروم الارث ھونے کی پروا نہیں کریں گے اور بلا غم و غصہ اپنے ملک کی خدمت کرتے رھیں گے - اھل ھند عربی کی اس مثل سے ناواقف نہیں کہ " حب الوطن من الایمان ' —

——) * (——

(* ابھی حال میں تجویز پیش کی گئی ھے کہ تعلیمی ترقی کے لیے حکومت خاص ٹکس مقرر کرے بجاے اس کے کہ عطیات سے کام چلایا جاے - اس انجمن نے اس تجویز کی مخالفت کی ھے اور ھمارے خیال میں بالکل ٹھیک کیا ھے - (ھوم ورڈ میل - مورخہ ۲ اکتوبر سنہ ۱۸۶۸ع) -

(؛) موصوف نے تقریباً دس لاکھ کی ملک چھوڑی ھے - اس میں یہ خوشی کی بات ھے کہ تین لاکھ خیراتی کاموں کے لئے وقف کیا گیا ھے -

خطبات گارساں د تاسی

انیسواں خطبہ - ۶ دسمبر ۱۸۶۹ ع

ہر سال میرا یہ دستور رہا ہے کہ ہندوستان میں ادبیات کی ترقی کے متعلق آپ صاحبوں کے سامنے کچھہ نئی باتیں پیش کروں جنھیں سن کر آپ کو اطمینان ہو کہ وہاں ترقی ہو رہی ہے - میں لانگ فیلو کے ان اشعار کو اپنے حسب حال پاتا ہوں :

نہ مسرت اور نہ غم '
ہمارا مقصد حیات ہو سکتے ہیں '
ہمارا مقصد حیات عمل ہے ' تاکہ ہر آنے والا کل '
ہمیں آج کے مقابلے میں آگے بڑھا ہوا پائے -

اردو اور ہندی کا جھگڑا بدستور چلا جا رہا ہے - چنانچہ گزشتہ سال ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس جھگڑے میں نہایت گرمجوشی کے ساتھہ حصہ لیا - بالخصوص ہندو اس معاملے میں تعصب سے کام لے رہے ہیں - وہ اپنے حب وطن کے جوش میں ان تمام چیزوں کو پس پشت ڈالنا چاہتے ہیں جن سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کی یاد تازہ ہوتی ہے - چنانچہ ہندو لوگ کھلم کھلا برطانوی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت پر ترجیح دیتے ہیں - لیکن اہل اسلام کی حالت اس سے مختلف ہے - ان

کی ۳ کروڑ آبادی کے لیے برطانوی حکومت دو وجوہ کی بنا پر بری ہے - اول اس لیے کہ انگریزوں نے انہیں ہندوستان کی حکومت سے محروم کیا اور دوسرے اس لیے کہ انہیں ایسی حکومت کے سامنے سر جھکانا پڑا جس کے افراد کے مذہب سے انہیں سخت نفرت ہے - مسلمانوں کو اس وقت بعض شورش پسند پھر انگریزوں کے خلاف برانگیختہ کرنا چاہتے ہیں - چنانچہ کئی دفعہ حضرت امام مہدی کی آمد کا غلغلہ بلند ہو چکا ہے - امام موصوف اُنہیں غیروں کے تسلط سے نجات دلائیں گے - اس باب میں مختلف پیشین گوئیوں کی نشر و اشاعت کی جارہی ہے - گذشتہ سال وہابیوں کی شورش کی یہی بنا تھی - وہابیوں کے عقائد مسلمانان ہند کی جماعت میں مقبولیت حاصل کر رہے ہیں * —

یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح آج کل یورپ میں ایک تحریک اُٹھی ہے جس کا نصب العین یہ ہے کہ پھر سے ازمنۂ وسطیٰ کی طرف رجوع کیا جائے اور ان زبانوں کو زندہ کیا جائے جو اب بولیاں ہوکر رہ گئی ہیں اسی طرح ہندوستان میں بھی ازمنۂ وسطیٰ کو زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے - کچھہ عرصے سے یورپ میں ازمنۂ وسطیٰ کے خلاف جو نفرت پھیلائی جارہی تھی اس کے خلاف یہ تحریک ہے - ہندوستان میں بھی ازمنۂ وسطیٰ کی ادبیات کو قدر اور احترام کے ساتھہ دیکھا جارہا ہے - اس وقت ہندی کی حیثیت بھی ایک بولی کی سی رہ گئی ہے جو ہر گانو میں الگ الگ طریقے سے بولی جاتی ہے - چنانچہ ہندوؤں کی کوشش ہے کہ اردو کی بجاے ہندی کو فروغ دیا جائے حالانکہ اردو بہ نسبت ہندی کے زیادہ شستہ ہے - لیکن ہندی ان کے نزدیک خالص

* انڈین میل - ۲۳ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ ع —

هندوستان کی زبان هے اس واسطے کہ وہ سنسکرت سے نکلی هے - ان کو یہ نہیں سوجھتا کہ اردو زبان میں فارسی اور عربی کی ساری خوبیاں جمع هوگئی هیں - یہ دونوں زبانیں (فارسی اور عربی) اسلامی مشرق کی قابل احترام السنہ هیں اور جمیع علماے عالم ان دونوں کو همیشہ سے اسی نظر سے دیکھتے آے هیں —

اب میں ان دور ازکار اسباب کی تشریح کرتا هوں جو هندی کے حامی اردو کے مقابلے میں پیش کر رهے هیں - اس کے ساتھ میں ان دلائل کو بھی بیان کروں گا جو مسلمان علما نے جواب میں پیش کی هیں - لیکن جیسا کہ اس قسم کے مباحثوں میں هوا کرتا هے طرفین اپنی راے پر اڑے رهتے هیں اور کوئی نتیجہ نہیں نکلتا - گزشتہ صدی میں یہ قول مشہور تھا جو اس وقت شاید حسب حال هو - لیکن آج کل لوگوں نے اس کو فراموش کردیا هے : "بحث مباحثے سے نہ اپنے تئیں بصیرت حاصل هوتی هے اور نہ دوسرے کو کوئی فائدہ هوتا هے - بحث کا لازمی نتیجہ یہ هے کہ لوگوں کو غصہ اور ضد پیدا هو - غرور اور ضد جہاں هوتے هیں وهاں نیک نیتی نہیں باقی رہ سکتی "—

گزشتہ سال هندی اردو کے جھگڑے کے سلسلے میں جس کی نسبت میں نے ابھی ذکر کیا ' الہ آباد انسٹیٹیوٹ کا وہ جلسہ خاص اهمیت رکھتا هے جو سال کے آخر میں منعقد هوا تھا - اردو هندی کے مسئلہ پر خوب گرمجوشی سے مباحثے هوے جن کا لکھنؤ کے هندوستانی رسائل میں تفصیل کے ساتھ حال چھپا هے * - اس جلسے کی یہ بات قابل ذکر هے کہ ان سبھوں نے جو اردو کے مخالف تھے خود اردو میں نہ کہ هندی میں اردو

* اودھ اخبار ۲,۶ - نومبر سنہ ۱۸۶۸ ع —

کے خلاف دھواں دھار تقریریں کیں —

بحث اس مسئلہ سے شروع ہوئی کہ گذشتہ جلسوں کی کارروائی کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ وہ دیسی زبان میں لکھی چاہئے - اب سوال یہ اٹھا کہ دیسی زبان سے آیا اُردو مراد لی جاے یا ہندی - ایک ہندو صاحب نے اٹھہ کر تقریر کی کہ ہندی ملک کی اصلی زبان ہے - ہندی کی طرف سے جو بے اعتنائی برتی جارہی ہے وہ قابل افسوس ہے - مقرر نے یہ بھی کہا کہ حکومت سے تحریک کرنی چاہئے کہ دفاتر اور عدالتوں میں اردو کی بجاے ہندی کو رائج کرے - اس کے ساتھہ مقرر نے یہ بھی کہا کہ اگر ایسا کیا گیا تو صرف رسم خط میں تبدیلی کرنی ہوگی - ایک اور دوسرے ہندو صاحب نے اس تجویز کی تائید کی اور کہا کہ اگرچہ ہندی کو دفاتر اور عدالتوں کی زبان بنانے سے بہت سے ہندوستانیوں کو زحمت گوارا کرنی ہوگی کیونکہ وہ اردو رسم خط کے عادی ہوچکے ہیں، لیکن بہر نوع یہ تبدیلی گانو میں رہنے والے ہندوؤں کے لیے ہوگی جو صرف ہندی لکھنا پڑھنا جانتے ہیں - چونکہ گانو والے اردو رسم خط سے ناواقف ہیں اس لیے انھیں اردو کی تحریروں سے دھوکا دیا جاسکتا ہے - اس کے علاوہ اردو کا رسم خط چینی رسم خط کی طرح بہت پیچیدہ ہے - مقرر نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ سنسکرت زبان کو دیوناگری رسم خط کے ذریعے پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے - ہندوؤں نے اٹھارہ صدیوں سے سنسکرت کی طرف سے بے پروائی برتی ہے، اب انھیں چاہئے کہ اس قدیم زبان میں زندگی کی نئی روح پھونکیں —

ایک تیسرے ہندو صاحب نے تجویز کی تائید مزید کرتے ہوے کہا کہ اردو کی بجاے ہندی کو رواج دینے سے صرف رسم خط کی تبدیلی

لاحق نہیں ہوگی بلکہ الفاظ اور محاورے بھی بدلیں گے اس واسطے کہ اردو میں عربی اور فارسی کے بے شمار الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور ہندی خالص ہندوستانی زبان ہے —

یہ سچ ہے کہ بعض اردو مصنفین ترکی مصنفین کی طرح' اپنا علم و فضل ظاہر کرنے کی غرض سے عربی فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں اور ملکی زبان کے صرف افعال و حروف ان کی عبارت میں نظر آتے ہیں' لیکن فی الحقیقت اردو ہندی میں کوئی فرق نہیں ہے - ہمارے لیے یہ امر ناممکن ہے کہ اردو اور ہندی کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والی کوئی حد فاصل قائم کر سکیں - در اصل دونوں ہندوستانی کے تحت آجاتی ہیں اور صرف ان کا رسم خط ہی ان میں امتیاز پیدا کرتا ہے —

الہ آباد انسٹیٹیوٹ کے دوسرے اجلاس میں جو ۲۵ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ ع کو منعقد ہوا تھا' اردو ہندی کا مسئلہ پھر اُٹھایا گیا- اس میں یہ طے پایا کہ دیوناگری رسم خط کو رواج دینا چاہئے - ویسے اردو اور ہندی میں لسانی فرق نہیں کیا جائے گا - چاہے ہندی کو "ہندوئی" کہئے یا اردو کو "دکھنی" کہئے' زبان ایک ہی رہے گی اور ایک ہی محاورے ان میں مستعمل رہنے چاہئیں —

برطانوی حکومت اس تحریک کے موافق معلوم ہوتی ہے - حکومت کا خیال ہے کہ ہندی کی موافقت سے ہندو لوگ خوش ہو جائیں گے اور چونکہ ہندوستان کی آبادی کی کثرت انہیں پر مشتمل ہے اس لیے ہندی کی تائید ملکی مصالح پر مبنی ہے - اضلاع شمال مغربی' اودھ اور پنجاب میں دفاتر اور عدالتوں میں ہندی رائج کرنے سے جو سیاسی فوائد منتج

ہوں کے ان کے متعلق "انڈین ڈیلی نیوز" کے ایک مقالے میں تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ اس مقالے کی نقل ۲۷ جنوری سنہ ۱۸۶۸ ع کے "انڈین میل" میں بھی شائع ہوئی ہے۔ میرے خیال میں اس مقالے میں ہندی کی تائید میں جو استدلال پیش کیا گیا ہے وہ صحیح نہیں اور جو دعوے پیش کئے گئے ہیں ان پر بحث کی جاسکتی ہے لیکن اس جگہ میں اسے چھیڑنا نہیں چاہتا۔ اس مقالے میں اردو کے متعلق کم از کم یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ اس نے ہندوستان میں وہی حیثیت حاصل کرلی ہے جو فرانسیسی زبان کو یورپ میں حاصل ہے۔ عدالتوں اور شہروں میں اردو بولی جاتی ہے۔ مصنفین اپنی کتابیں اسی زبان میں تصنیف کرتے ہیں اور اس کی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ اردو کے ذریعہ اہل ہند یورپین لوگوں سے گفتگو کرتے ہیں۔ غرض کہ ان تمام امور کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو اردو کو ہندی پر فضیلت حاصل رہتی ہے جسے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں —

علی گڑہ کے اخبار میں اس مسئلہ پر ایک مضمون میں مفصل بحث کی گئی ہے۔ یہ مقالہ ۲ فروری سنہ ۱۸۶۸ ع کے "اودھ اخبار" میں دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مضمون نگار صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتا کہ رسم خط بدل دیا جائے بلکہ اس نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اردو میں جو عربی حروف مستعمل ہیں ان کا دیوناگری میں بدل ہوہی نہیں سکتا، اس لیے سہولت اس کی مقتضی ہے کہ تمام عربی الفاظ کے استعمال سے احتراز کیا جائے اور ان کی جگہ ہندی الفاظ استعمال کئے جائیں۔ اردو میں عربی فارسی کے الفاظ لینے کی بجائے سنسکرت کے الفاظ لیے جائیں اور اس طرح زبان کو وسعت دی جائے۔ مضمون نگار کے نزدیک ہندی

در اصل سنسکرت ہی کی ایک شکل ہے —

غرض کہ ہندوؤں کی عام طور پر یہ خواہش ہے کہ عربی اور فارسی کے عنصر سے قطعی احتراز کیا جائے بلکہ بعض ہندو ایسے بھی ہیں جو لاطینی رسم خط کو اردو رسم خط پر ترجیح دیتے ہیں - یہ بات ان کے دلوں میں اسلامی حکومت کی مخالفت کے باعث پیدا ہوئی ہے —

مدیر "اودھ اخبار" نے مقالہ نگار کی خواہش کے موافق مضمون چھاپ تو دیا ہے لیکن بعد میں اس کے استدلال کی دھجیاں بکھیر دی ہیں اور تمام دلائل کو بے معنی لفاظی سے تعبیر کیا ہے - مدیر نے اسی ضمن میں یہ بتایا ہے کہ ہندی اردو کے جھگڑے اسی طرح لایعنی ہیں جس طرح یہ خیال کہ ایک دن آئے گا جب کہ اردو ہندی کے قضیے کا خاتمہ ہو جائے گا اور اس کی صورت یہ ہوگی کہ انگریزی زبان ان دونوں پر حاوی ہو جائے گی اس لیے کہ وہ حکام وقت کی زبان ہے اور قدرتی طور پر رعایا اسی زبان کو اختیار کرے گی - مدیر موصوف نے یہ بھی لکھا ہے کہ اردو زبان جس کی ہندو لوگ اس وقت مخالفت کر رہے ہیں، فاتح مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلط ملط سے بالکل اسی طرح وجود میں آئی جیسے انگلستان میں سیکسن اور فرانسیسی کا امتزاج عمل میں آیا - اردو میں دوسری زبانوں کے وہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو کھپ جائیں - ان الفاظ کے انتخاب میں خاص سلیقہ برتا جاتا ہے - یہی وجہ ہے کہ اردو کو عدالتوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور سرکاری تحریرات میں یہ زبان استعمال کی گئی - ان تمام باتوں کی تائید میں خود ہزارہا ہندوؤں کی آرا پیش کی جا سکتی ہیں - بھلا یہ کونسی عقل کی بات ہے کہ اردو کے عوض، جو ایک نہایت شیریں اور شستہ زبان ہے اور جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے، ہندی

کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے جو ایک نہایت بھدی اور درشت زبان ہے اور جس کے حروف دیکھنے میں بھلے نہیں معلوم ہوتے ـــ

۱۹ فروری سنہ ۱۸۶۸ ع کے "اخبار" میں (مطبوعۂ علی گڑھ) ایک اور مضمون چھپا ہے جس میں ہندی اور سنسکرت کی یکسانیت کا مغالطہ پیش کیا گیا ہے - ہندوؤں کی یہ خواہش ہے کہ سنسکرت کا رواج بڑھے لیکن انہیں اس بات پر تو غور کرنا چاہئے کہ دریا کو ماخذ کی طرف بہنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا - بابو سرود پرشاد جنہوں نے یہ مضمون لکھا ہے 'سنسکرت ادبیات کی تعریف میں رطب اللسان ہیں - میرے خیال میں ان کا یہ تعریف کرنا بجا ہے - لیکن اس سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ عربی اور فارسی بھی قابل قدر زبانیں ہیں - برطانوی حکومت نے بنگالیوں کے ساتھ یہ خاص رعایت کی کہ انہیں مقامی عدالتوں میں بجائے فارسی کے اپنی زبان استعمال کرنے کی اجازت دے دی - چنانچہ اضلاع شمال مغربی کے ہندوؤں نے بنگالیوں کی دیکھا دیکھی یہ مطالبہ شروع کیا کہ ہمارے ہاں بھی اردو کی بجائے عدالتی زبان ہندی قرار دی جائے - اس مطالبے سے ان کی مراد یہ ہے کہ بجائے مسلمانوں کی زبان کے ہندوؤں کی زبان کو فروغ حاصل ہو - بابو سرود پرشاد نے دیوناگری رسم خط کی بہت تعریف کی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ دنیا بھر کی زبانوں میں صرف دیوناگری رسم خط میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے کہ صوت انسانی کے ہر نازک فرق کو واضح کر سکے - لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود اردو میں ایسے بیشمار الفاظ ہیں جنہیں دیوناگری حروف سے نہیں ادا کیا جا سکتا - چنانچہ ح خ ص ض ط ع غ اور ق کا اظہار نہیں کیا جا سکتا - مضمون نگار نے دیوناگری اور ناگری رسم خط کی تعریف کے

بعد خط شکستہ کی برائیاں گنوانی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس خط پر پوری قدرت حاصل کرنے کے لیے سالہا سال محنت کرنے کی ضرورت ہے - یہ درست ہے کہ اردو کے خط شکستہ کا پڑھنا دشوار ہے اس لیے کہ سب حروف صاف نہیں ظاہر کیے جاتے - لیکن ناگری خط جو ساہوکارے اور تجارتی ضروریات کے لیے استعمال ہوتا ہے اور جسے "کیتھی ناگری" کہتے ہیں، اس کا پڑھنا بھی بہت دشوار ہے - اس کے پڑھنے میں اس وقت سہولت ہوتی ہے جب کہ پڑھنے والا پہلے سے مضمون سے واقف ہو —

علی گڑھ کے "اخبار" مورخہ ۵ مارچ سنہ ۱۸۶۸ ع میں ایک مضمون اردو کی تائید میں شائع ہوا ہے - یہ مضمون متعدد کالموں میں شائع کیا گیا ہے - بعض باتیں نہایت صحیح مشاہدہ پر مبنی معلوم ہوتی ہیں - عربی کی مثل ہے کل حزب بما لدیہم فرحون * - لیکن اہل ہند کا طریقہ ہے کہ وہ ہر بات میں کوئی نہ کوئی تبدیلی کرنی چاہتے ہیں - مضمون نگار اس باب میں میرا ہم خیال ہے کہ اردو کے خلاف جو تحریک اس وقت اٹھ رہی ہے اس کا اصلی محرک نسلی اور مذہبی اختلاف ہے † - مضمون نگار نے اس کی وضاحت کی ہے کہ یہ تحریک دراصل سیاسی ہے - مذہبی اعتبار سے مسلمانوں کی زبان عربی ہے اور ہندوؤں کی زبان سنسکرت ہے - اردو اور ہندی کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں - مضمون نگار نے اس کے بعد ان سب اعتراضات کا ایک ایک کرکے جواب دیا ہے جو اردو کے خلاف پیش کیے گئے ہیں - مثلاً کہا گیا ہے کہ ہندو عوام اردو نہیں سمجھتے - لیکن دنیا کے ہر ملک میں کم و بیش یہی حالت نظر آئے گی - چنانچہ برٹانی،

---

* یہ قرآن کی آیت ہے - سورۂ روم رکوع ۳ - (مترجم)

† ملاحظہ ہو میرا سالانہ خطبہ سنہ ۱۸۶۶ ع —

پرووانس اور الساس کے عام باشندے فرانسیسی زبان نہیں سمجھتے - کیا یہ معقول وجہ ہے کہ فرانس کے صوبوں کے دفاتر اور عدالتوں میں فرانسیسی زبان کا استعمال ترک کردیا جاے - مضمون نگار نے اس طرف توجہ مبذول کرائی ہے کہ خالص ھندی میں بھی عربی اور فارسی کے الفاظ ضرور ملتے ھیں - ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ کو رواج دینا بالکل ناممکن ہے - بہت سے ھندو راج کماروں نے جو اپنے دربار میں ھندی رائج کرسکتے تھے ' اردو کو ترجیح دی ہے - چنانچہ الور ' گوالیار ' جے پور ' اندور اور بھانہ کے راجاؤں کی درباری زبان اردو ہے - اس کے سوا یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ جس وقت سنہ ۱۸۳۷ ع میں برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ فارسی کی جگہ اردو سرکاری طور پر تسلیم کی جاے گی تو اس وقت ایک آواز بھی نہیں اٹھی کہ نہیں ' اردو کے بجاے ھندی کی سرپرستی حکومت کو کرنی چاھئے - کچھ دنوں پہلے تک اس مسئلہ کی کسی کو کانوں کان خبر تک نہ تھی - جس زمانے میں فارسی دفتری زبان تھی اس وقت اس کی کسی نے مخالفت نہیں کی حالانکہ وہ اردو کے بہ نسبت ھندی سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی - پھر یہ کیا بات ہے کہ آج ھندو لوگ ایک دم سے اردو کے خلاف چیخ پکار کر رہے ھیں - اس وقت اردو اور ھندی کی حیثیت ایسی ہے کہ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر غالب نہیں تصور کرسکتے - لیکن ان دونوں میں جو ربط اور تعلق موجود ہے اسے قائم رکھنے میں کوئی قباحت نہیں - اگر ھندوستان کے بعض حصوں میں ھندوؤں کو اکثریت حاصل ہے تو بعض دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے - جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں

ہندی کو زبردستی رواج دینا انہیں ان کے حقوق سے محروم کرنے کے ہم معنی ہوگا - رعایا کی حیثیت سے برطانوی حکومت کے نزدیک ہندو اور مسلمان برابر ہونے چاہئیں - اردو کے خلاف جو یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مخلوط زبان ہے درست ہے - لیکن کیا عربی میں سریانی ' عبرانی اور یونانی الفاظ کی آمیزش نہیں ہے ؟ کیا فارسی میں عربی الفاظ مستعمل نہیں ؟ اور کیا یہ صحیح نہیں کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں دوسری زبانوں کے الفاظ کا میل پایا جاتا ہے ؟ اگر اردو میں عربی اور فارسی الفاظ استعمال ہوتے ہیں تو اس کے ساتھ یہ بھی ماننا ہوگا کہ سنسکرت اور ہندی کے بھی لاتعداد الفاظ مروج ہیں - بالکل اسی طرح جیسے انگریزی اور فرانسیسی میں لاطینی اور یونانی الفاظ گھل مل گئے ہیں اور ہر اہل زبان انہیں سمجھتا ہے - اردو دو طریقے سے لکھی جاتی ہے - ایک نستعلیق اور دوسرے شکستہ - - لیکن ہندی لکھنے کے طریقے بیشمار ہیں - ان بولیوں کے لکھنے کے طریقوں کا ہم یہاں ذکر نہیں کرتے جو ہندی سے مشابہ ہیں اور اس کی اور ان کی اصل ایک ہی ہے - انہیں وہی شخص پڑھ سکتا ہے جس نے خاص کر ان کا مطالعہ کیا ہے - سنسکرت کے فاضل تک ان تحریروں کو نہیں سمجھ سکتے - ان بولیوں کا پڑھنا خود ہندوؤں کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے اور ان کے لئے بھی یہ بولیاں وہی حیثیت رکھتی ہیں جو کسی اجنبی زبان کی ہوتی ہے - خود دیوناگری رسم خط جسے ناگری بھی کہتے ہیں ' اور جسے اردو رسم خط کی جگہ رائج کرنے کی کوشش ہورہی ہے ' عیوب سے خالی نہیں —

اردو ہندوستان کے شہروں نیز دیہات میں جہاں بعض دوسری

بولیاں بولی جاتی ہیں سمجھی جاتی ہے - اضلاع شمال مغربی اور اودھ میں تو اردو ہی بولی جاتی ہے - ان تمام امور کے پیش نظر بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ اردو کو ترک کرکے ہندی کو اختیار کیا جائے جسے عرصے سے اہل ہند چھوڑ چکے ہیں اور جس کو رائج کرنے میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا —

علیگڑھ کے " اخبار " مورخہ ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۶۸ ع میں (سر) سید احمد خاں نے سرود پرشاد کے اس مضمون کا جواب دیا ہے جس کی نسبت ابھی میں حوالہ دے چکا ہوں —

سید صاحب موصوف نے اردو زبان کی تاریخ بیان کرنے کے ساتھ بابو صاحب کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ انہوں نے زبان اور رسم خط کے دو جداگانہ مسائل کو آپس میں گڈ مڈ کر دیا ہے - اردو دراصل قدیم بھاشا اور فارسی کے میل سے بنی ہے - اردو کو شہروں کی شستہ اور شائستہ ہندی کہہ سکتے ہیں - ہندی اور اردو دونوں لسانی حیثیت سے ایک ہیں - دونوں کے رسم خط جدا جدا ہیں - سید صاحب موصوف خود اس بات کے خلاف ہیں کہ اردو میں عربی فارسی کے مغلق الفاظ کثرت سے استعمال کئے جائیں - موصوف عربی فارسی الفاظ کو صرف اس وقت استعمال کرنے کی اجازت دیتے ہیں جب کہ ان کے بغیر چارہ نہ ہو - لیکن عربی فارسی الفاظ کو خارج کرکے ان کی جگہ سنسکرت الفاظ ٹھونسنے کے بھی موصوف مخالف ہیں - اس لئے کہ خود ہندوؤں کے لئے یہ سنسکرت الفاظ عربی فارسی الفاظ کے مقابلے میں اجنبی ہوں گے - عربی فارسی الفاظ کو بہت عرصے سے سنتے سنتے خود ہندو بھی ان سے آشنا ہوگئے ہیں - ہندوؤں کو چاہئے کہ سنسکرت کی بجائے بھاشا کو پھر سے زندہ

کرنے کی کوشش کریں اگرچہ ثانی الذکر بھی اول الذکر کی طرح مردہ ہوچکی ہے - لیکن مردہ زبانوں کو زندہ کرنا ناممکن ہے - ان تمام باتوں کے مدنظر یہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو اور ہندی اس وقت جیسی ہیں انہیں بلا تصرف ویسا ہی رہنے دیا جاے —

یہ اعتراض بھی غلط ہے کہ اردو میں حساب کتاب، رسائد اور پروانے نہیں لکھے جاسکتے - بلکہ اس کے برخلاف اردو میں ان تمام ضروریات کو پورا کرنے کے جو اصول مقرر ہوچکے ہیں ان میں تبدیلی کرنا سخت باعث زحمت ہوگا - دفاتر اور عدالتوں میں جہاں اردو لکھنے میں ایک دستہ کاغذ صرف ہوتا ہے وہاں ہندی میں دو دستے ہوں گے - اس کے سوا ہندی لکھنے میں بیحد زیادہ وقت صرف ہوتا ہے —

مظفر پور کے سید وارث علی نے بھی علیگڑہ کے "اخبار" مورخہ ۲۶ اپریل میں اردو کی حمایت میں ایک نہایت پر جوش مضمون سپرد قلم کیا ہے - موصوف نے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو ہی در اصل اہل ہند کی عام زبان ہے - اردو کے سمجھنے والے عربستان تک میں ملتے ہیں - اس جگہ اردو کی ہندوستان کے باہر اشاعت کے متعلق ایک واقعہ قابل ذکر ہے - (سر) سید احمد خاں جب بمبئی میں انگلستان جانے کے لیے جہاز پر سوار ہوے تو اسی جہاز پر بعض چینی اور حبشی بھی سفر کر رہے تھے - موصوف کو یہ دیکھ کر بے حد تعجب ہوا کہ وہ اردو سمجھتے تھے اور بات چیت بھی کر سکتے تھے - چنانچہ موصوف نے اردو میں ان سے گفتگو کی اور وہ آپس میں بھی اردو ہی کے ذریعہ تبادلۂ خیال کرتے تھے - اس واقعہ سے اردو کی

ہمہ گیری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے* —

سید وارث علی نے اپنے مضمون میں ہندوؤں کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ ان کی زبان اردو کے مقابلے میں جو آج کل مروج ہے، ترقی کی زیادہ مستحق ہے - اسی ضمن میں موصوف نے یہ استدلال پیش کیا ہے کہ جس بنا پر ہندی کو سرکاری زبان بنانے کی تجویز پیش کی گئی ہے بالکل اسی طرح انصاف کا مقتضی یہ ہے کہ ہندوستان کے طول و عرض میں جو بولیاں بولی جاتی ہیں انہیں بھی سرکاری زبان کیوں نہ بنا یا جاے۔ ایک ہندو صاحب نے جو یہ ادعا کیا تھا کہ ہندی الفاظ کا اردو کے رسم خط میں اظہار نہیں ہو سکتا، اس کا موصوف نے یہ جواب دیا ہے کہ عربی فارسی کے بہت سے ایسے الفاظ ہندی میں مستعمل ہیں جن کا ناگری رسم خط سے اظہار ناممکن ہے - مثال کے طور پر "ضلع، فیض آباد اور زمان، کی قبیل کے بہت سے الفاظ پیش کئے جا سکتے ہیں - ناگری رسم خط میں مذکورہ الفاظ کا املا "جلا، فیج آباد اور جمان ہوگا -

---

* (سر) سید احمد خاں نے جس جہاز پر سفر کیا اس پر مس کارپنٹر بھی سفر کر رہی تھیں - موصوفہ اپنی صحت درست کرنے کی غرض سے یورپ تشریف لائیں - موصوفہ کو تعلیم نسواں سے اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ یورپ میں زیادہ دنوں تک نہیں ٹھیریں اور بمبئی روانہ ہو چکی ہیں - (سر) سید احمد خاں نے مس موصوفہ کی اپنے سفر نامے میں بہت تعریف کی ہے اور ان کی سعی و کاوش کو جو وہ ہندوستانی عورتوں کی خاطر کر رہی ہیں بہت سراہا ہے - لیکن اس کے ساتھ سید صاحب کی خواہش ہے کہ مس موصوفہ انجیل مقدس اور معجزات کے متعلق اپنے خیالات میں، محققہ علمی تحقیق کی روشنی میں تبدیلی کر لیں تو اچھا ہے —

ناگری میں گ اورغ ' پ اور ف ' ک اور ق ' ج اور ز ذ ض ظ ' کا امتیاز نہیں کیا جاسکتا —

علی گڑہ کے "اخبار" مورخہ ۷ مئی سنہ ۱۸۹۸ ع میں "جلوہ طور" سے جو میرٹھ سے شائع ہوتا ہے ' ایک مضمون نقل کیا گیا ہے - اس مضمون کا عنوان ہندوستانی کی ایک کہاوت "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" ہے - اس مضمون میں یہ بتایا گیا ہے کہ چونکہ ہندو لوگ ہندوستان میں اکثریت میں ہیں اس لیے وہ اپنے حسب خواہش تبدیلیاں کرنے کے مجاز ہیں - لیکن "اخبار" کی اشاعت میں مولوی فدا حسین کا لکھا ہوا سپاس نامہ شائع ہوا جو اضلاع شمال مغربی کے لفٹننٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا - اس سپاس نامے میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ اردو ہندی کی جو موجودہ حالت ہے اس کو برقرار رکھا جاے اور کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جاے —

الہ آباد انسٹیٹیوٹ نے یہ قرارداد منظور کی ہے کہ "کمپنی ایکٹ" کا ہندی میں ترجمہ شائع کیا جاے - اس کے سوا یہ تجویز منظور ہوئی ہے کہ ہندی زبان اور دیو ناگری رسم خط کو فروغ دینے کی تدابیر پر ایک کتاب لکھی جاے اور مصنف کو معقول معاوضہ دیا جاے - ایک یہ تجویز منظور ہوئی ہے کہ ہندی میں ایک "انشا" لکھی جاے * جو عدالتی قواعد ' کاروباری خطوط اور پروانوں کے نمونوں پر مشتمل ہو - نیز عورتوں کے لیے بھی ہندی میں کتابیں تحریر کرائی جائیں + —

* جس طرح اسٹورٹ نے فارسی انشاء لکھی تھی جس وقت فارسی ہندوستان کے دفاتر اور عدالتوں کی زبان تھی —

+ اودھ اخبار - ۱۸ مئی ' سنہ ۱۸۶۹ ع —

"اودھ اخبار" میں اس مسئلہ پر موافقت اور مخالفت میں جو مضمون شائع ہوے ہیں ان میں ہندی کی حمایت میں ایک مضمون میری نظر سے گذرا - اس میں لکھا تھا کہ ہندؤں کو اس میں بڑی دشواری ہوتی ہے کہ اپنے گھروں میں ہندی اور گھر سے باہر اردو بولیں - اگر ایسی کوئی دشواری فی الواقع ہے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ہر اس قدیم زبان بولنے والے کو پیش آتی ہے جس کی زبان بولی ہوکر رہ گئی ہو - چنانچہ جنیوا اور وینس کے اکثر باشندے اپنے گھروں میں اپنی مقامی بولیوں میں گفتگو کرتے ہیں اور گھروں سے باہر اطالوی زبان میں بات چیت کرتے ہیں جو اٹلی کی مشترک اور عام زبان ہے —

"اودھ اخبار" مورخہ ۱۲ جولائی سنہ ۱۸۶۹ ع میں ایک مضمون اردو کی حمایت میں شائع ہوا ہے جس میں مخالفوں کے اعتراضات کے جواب دئے گئے ہیں - اس مضمون میں مضمون نگار نے ثابت کیا ہے کہ اردو ہی وہ زبان ہے جو ہندوستان بھر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے - اس ضمن میں اردو کو ایک ایسے دریا سے تشبیہ دی ہے جس میں ندیاں آ آکر شامل ہوتی ہیں (*) - موصوف نے ثابت کیا ہے کہ اردو کے رسم خط کی بجائے دیوناگری رسم خط اختیار کرنے کا صرف یہ مطلب نہیں سمجھنا چاہئے کہ

(*) ان ندیوں سے ہماری مراد سنسکرت، عربی، فارسی اور ترکی ہیں - یہ عجب اتفاق ہے کہ میں نے بھی چالیس سال قبل اردو کے لئے یہی تشبیہ استعمال کی تھی جس پر میرے ہم عصر علماء میں سے ایک نے جو تنقید میں تنگ نظری سے کام لیتے تھے، مجھ پر اعتراضوں کی بوچھار شروع کردی تھی —

صرف تحریر کا طریقہ بدل گیا بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ایک مکمل اور وسیع زبان کو ترک کر کے ایک کم مایہ اور ناقص زبان کو اختیار کررہے ہیں - ہندی کو اردو پر فوقیت دینے سے جو اور دوسری خرابیاں پیدا ہوں گی ' جن کے متعلق بارہا ذکر ہوچکا ہے ' اس کی بھی وضاحت کی ہے - اب رہا رسم خط کا سوال تو اس باب میں بھی اردو رسم خط کو ترجیح حاصل ہے اس لئے کہ اس کے ذریعہ سے سنسکرت کے ان تمام الفاظ کا پوری طرح اظہار کیا جا سکتا ہے جو ہندی میں مستعمل ہیں - سنسکرت میں تالو سے ادا ہونے والے حروف کو عربی کے حروف موکدہ سے ادا کیا جا سکتا ہے - اگر ثانی الذکر کو سنی حروف (Dental) میں ضم کردیا جاے —

سنسکرت میں جو علحدہ علحدہ چار "ن" آتے ہیں ان کے تلفظ میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور ان سبھوں کے اظہار کے لئے عربی "ن" کافی ہے - چونکہ اردو مختلف زبانوں کے میل سے بنی ہے اس لئے اس کے بولنے والوں کو غیر زبانیں بولنے میں بہت سہولت ہوتی ہے - اس بات سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا - ہندوستانی زبان کا خزانہ مالا مال ہے حالانکہ ہندوستان کی دوسری زبانیں بالکل بے مایہ ہیں - مضموں ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے کہ ہمیں اپنی زبان کی حفاظت کے لیے کوشش کرنی چاہئے اس لئے کہ اس کے ساتھ ہماری ملی زندگی وابستہ ہے (*) —

(*) مضمون نگار نے اس سلسلے میں برطانوی حکومت پر سخت حملے کئے ہیں جس نے اہل ہند کو مطبع کی آزادی دے رکھی ہے - موصوف کا

(بقیہ بر صفحۂ آئندہ)

هندوستانی زبان کی اهمیت روز بروز تسلیم کی جارهی هے - ابهی حال میں نیپلز میں چینی کالج کی بجاے ایک مشرقی کالج قایم کرنے کا سوال اتها تها - چنانچه سب سے پہلے لوگوں کا هندوستانی کی طرف خیال گیا - پروفیسر این - لاسیسیلیا (N. La Cecilia) نے جو اس کالج کے معتمد هیں ' هندوستانی کی تعلیم کا نصاب تیار کیا هے - اس میں ایک جگهه یه فقرہ هے " هندوستانی جسے اردو بهی کهتے هیں ' برطانوی هند کی عالمگیر زبان هے - اس میں عربی ' فارسی ' مغلی (ترکی) اور تاتاری کے عناصر شامل هیں - ایسا معلوم هوتا هے که برطانوی اثر کے تحت هندوستان میں جو نیا تمدن قایم هورها هے ' اس کی زبان هندوستانی هے —

جدید تصانیف اور اخبارات کی اشاعت سے معلوم هوتا هے که اردو کے خلاف جو تحریک اتهی هے اس کا کوئی اثر نهیں هوا - اگرچه هندو بهت چیخ پکار کررهے هیں لیکن اردو کی ترقی بدستور جاری هے - گذشته سال سے جو نئے اخبارات شائع هونا شروع هوے هیں ان میں سے بیشتر اردو میں هیں نه که هندی میں - " اردو اخبار " میں خصوصیت کے ساتهه

(نوٹ از صفحهٔ گذشته

خیال هے که اردو کے خلاف جو تحریک اتهی هے اس کی ذمه داری حکومت پر عائد هوتی هے - حکومت چاهتی هے که هندوستان کی مشترک زبان کو فنا کردے تاکه اهل هند پهر کبهی سنه ۱۸۵۷ع کی شورش کی طرح یک جهتی کے ساتهه کوئی کام نه کرسکیں - یه مضمون سعدی کے اس شعر پر ختم هوتا هے -

ع هرکه با فولاد بازو پنجه کرد ساعد سیمین خود را رنجه کرد

(*) نصاب اطالوی زبان میں هے - صفحه ۱۱ -

اس قسم کے مضامین نکلتے رہتے ہیں جن میں یہ بتایا جاتا ہے کہ نوجوان انشاپرداز اور شاعر اس تحریک سے مطلق متاثر نہیں ہوے اور نہ ان کے حوصلے پست ہوے - ہندو ان کی زبان پر، جو دراصل ایک مخلوط زبان ہے، حملے کئے جائیں لیکن وہ اپنا کام برابر کر رہے ہیں - ان واقعات کو دیکھنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سواے چند شورش پسند ہندوؤں کے جو رجعت پسندی کے حامی ہیں، باقی سب اہل ہند اردو زبان کو ترجیح دیتے ہیں- اس لئے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل سے بنی ہے - ان کے نزدیک نہ قدیم بھاشا اور نہ وہ زبان جو سنسکرت کی بگڑی ہوئی شکل رکھتی ہے، اردو کا مقابلہ کرسکتی ہے - اردو کی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ گذشتہ سال کلکتہ یونیورسٹی کے میٹریکولیشن کے امتحان میں ۲۵۲ طلبہ نے اردو لی اور صرف ۳۸ نے ہندی لی —

مسٹر کمپسن (Kempson) ناظم تعلیمات صوبہ جات شمال مغربی کی رپورٹ میں جو ۱۹ فروری سنہ ۱۸۶۹ ع کو شائع ہوئی یہ مندرج ہے کہ ان کے صوبے میں صرف ۲۴ ہندوستانی اخبارات ہیں- ان میں سے سولہ اُردو میں، پانچ ہندی میں اور تین اردو ہندی دونوں میں ہوتے ہیں یعنی ایک کالم میں اردو اور دوسرے میں ہندی - ان اخبارات میں ۱۳ ہفتہ وار ہیں، پانچ مہینے میں دو دفعہ شائع ہوتے ہیں، اور چھہ ماہوار رسالے ہیں - آگرہ سے ۲، الہ آباد سے ۴، کانپور سے ۲، بنارس سے ۱، مرادآباد سے ایک ہفتہ وار اور ایک ماہوار، بریلی سے ۲، جونپور، علی گڈہ شاہجہاں پور اور فرخ آباد سے ایک ایک شائع ہوتے ہیں —

اب میں اردو اور ہندی کے جدید اخبارات و رسائل کی حروف تہجی کے اعتبار سے فہرست پیش کرتا ہوں- مجھے جہاں تک علم ہے یہ سب میرے

گزشتہ خطبہ کے بعد وجود میں آے ھیں —

(۱) آئینۂ علم - یہ ایک ماھوار ادبی رسالہ ھے اور الہ آباد سے شائع ھوتا ھے - ۸ جزو پر مشتمل ھوتا ھے - ھندی میں برنلت درپن کے نام سے اسی کے مضامین شائع ھوتے ھیں —

(۲) آئینۂ طبابت - یہ ماھوار طبی رسالہ اردو میں شائع ھوتا ھے —

(۳) اخبار سر رشتۂ تعلیم - گزشتہ سال ماہ فروری سے یہ ماھوار رسالہ لکھنؤ سے شائع ھونا شروع ھوا ھے - صوبۂ اودھ کے ناظم تعلیمات مسٹر ڈبلو ھنڈ فورڈ کے زیر سرپرستی شائع ھو رھا ھے - یہ ۱۲ جزو پر مشتمل ھوتا ھے اور کبھی کبھی ضمیمہ بھی ساتھ ھوتا ھے - اس کے نظم و نثر کے مضامین کا معیار اچھا خاصا بلند ھے - اس کی چند اشاعتیں، جو از راہ کرم مجھے بھیجی گئی تھیں، میرے پیش نظر ھیں - اس کے بعض مضامین نہ صرف اھل ھند بلکہ یورپین لوگوں کے لئے سبق آموز ھیں - اس کے مدیر خصوصی اور دیگر کارپرداز ھندوستان بھر میں اپنی ادبی قابلیت کے لئے مشہور ھیں —

(۴) اخبار الاخبار - مرزا پور (بہار) سے اردو میں شائع ھوتا ھے -

(۵) اتالیق پنجاب - یہ اخبار "سرکاری اخبار" کے بند ھونے کے بعد اس کی جگہہ شائع ھوتا ھے - لیکن اول الذکر کے مقابلے میں اس میں ادبی رنگ زیادہ غالب ھے - میں نے یہ راے اس کی چند اشاعتوں کو دیکھہ کر قایم کی ھے جو مسٹر ھولروڈ ناظم تعلیمات صوبۂ پنجاب نے از راہ لطف مجھے بھجوائی ھیں —

(۶) بدیادرش - یہ ھندی میں مہینے میں دو مرتبہ میرٹھہ سے شائع ھوتا ھے - یہ دراصل اردو کے نجم الاخبار کا ھندی ایڈیشن ھے -

(۷) برھم گیان پرکاش - اس ماھوار رسالہ کے بانی بابو کشب چندر ھیں جو برھموسماج کے بانی ھیں -

(۸) برتلت درپن - یہ اردو کے "آئینۂ علم" کا ھندی ایڈیشن ھے اور الہ آباد سے ماھانہ شائع ھوتا ھے -

(۹) چشمۂ علم - یہ پٹنہ سے اردو میں مہینے میں دو دفعہ نکلتا ھے - اس سے پہلے اس شہر میں کوئی اخبار نہ تھا - اس کی پہلی اشاعت یکم جنوری سنہ ۱۸۶۹ ع کو شائع ھوئی - یہ چھوٹی تقطیع پر ھے اور ھر صفحہ پر دو کالم ھوتے ھیں - میرے ایک مہربان نے اس کی ایک اشاعت مجھے بھیجی ھے - اس کا ایک مضمون مجھے پسند آیا جس کا موضوع بنی نوع انسان کے اتحاد سے متعلق تھا -

(۱۰) دبدبۂ سکندری - یہ سکندرہ سے شائع ھوتا ھے - "علی گڈھ گزٹ" مورخہ ۷ مئی سنہ ۱۸۶۱ ع میں اس اخبار کے چند اقتباس میری نظر سے گذرے -

(۱۱) ڈاکہ پرکاش - اس کی ایک اشاعت میں "برٹش انڈین ایسوسیشن" کو مشورہ دیا ھے کہ نئی منتخب شدہ پارلیمنٹ سے تین باتوں کی درخواست کرے (۱) سول سروس کا امتحان اھل ھند کے لئے ھندوستان میں منعقد کیا جائے - (۲) اھل ھند کو ارکان بلدیہ منتخب کرنے کا حق حاصل ھو - (۳) پولس والوں کی تنخواھوں میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ پبلک سے رشوت لینا چھوڑ دیں -

(۱۲) دھرم پرکاش - یہ آگرہ سے شائع ھوتا ھے - دراصل یہ ھندی کے "پاپ موچن" کا اردو ایڈیشن ھے جس کے مدیر جوالا پرشاد ھیں جو بابو کشب چندر کی طرح وسیع المشرب شخص ھیں -

(۱۳) غالب الاخبار - یہ ھفتہ وار اخبار اردو میں سیتا پور سے نکلتا ھے -

یکم مارچ سنہ ۱۸۶۹ ع سے اس کی اشاعت شروع ہوئی - ہر دو شنبہ کے روز شائع ہوتا ہے * -

(۱۴) گنجینۂ علوم - یہ ماہوار رسالہ مرادآباد سے شائع ہوتا ہے - گنگا پرشاد اس کے مدیر ہیں † -

(۱۵) گنجینۂ احکام - یہ ماہوار قانونی رسالہ ہے - یہ بھی مرادآباد سے شائع ہوتا ہے -

(۱۶) جگت سماچار - یہ ہفتہ وار اخبار ہندی میں ہر سہ شنبہ کو شائع ہوتا ہے - مطبع "دارالعلوم" میں طبع ہوتا ہے -

(۱۷) جلوۂ طور - یہ ہفتہ وار اردو اخبار میرٹھ سے شائع اور مطبع "سلطان المطابع" میں طبع ہوتا ہے - باوجود اس نام کے اس کے مدیر ایک ہندو رائے گنیشی لال ہیں - یہ بڑی تقطیع پر شائع ہوتا ہے اور ۸ صفحات پر مشتمل ہے - ہر صفحہ پر ۲ کالم ہیں - سرورق پر بطور عنوان چار اشعار لکھے ہوئے ہیں - دو فارسی کے اور دو اردو کے - ان اشعار کا مضمون یہ ہے کہ اس اخبار کے ذریعہ کوہ سینا کی سی تجلی پیدا ہوگی جس نے حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر کی آنکھیں خیرہ کردی تھیں -

(۱۸) کوکب عیسوی - میرٹھ کے "اخبار عالم" مورخہ ۲۶ اگست سنہ ۱۸۶۸ ع میں اس کے متعلق اعلان میری نظر سے گذرا —

---

* "اخبار" علیگڑہ - مورخہ ۲۶ مارچ سنہ ۱۸۶۹ ع —

† موصوف ہندوستانی کے نامور انشاپردازوں میں سے ہیں - میں نے اپنی کتاب "تاریخ ادب ہندی و ہندوستانی" میں ان کے متعلق ذکر کیا ہے - دوسرا اڈیشن - پہلی جلد ' صفحہ ۴۸۷ —

(۱۹) خیرالمواعظ - یہ ہفتہ وار اخبار اردو میں دھلی سے شائع ھوتا ھے - ۸ صفحات پر مشتمل ھے - اس کے پیش نظر یہ مقصد ھے کہ اصول اسلام کی نشر و اشاعت کرے اور مسیحی تعلیمات کا رد کرے —

(۲۰) مخزن العلوم - یہ ماھوار رسالہ بریلی سے شائع ھوتا ھے - اس کے مدیر کا نام کالی چرن ھے - اس کی پہلی اشاعت دسمبر سنہ ۱۸۶۷ ع میں ھوی - اسی کو " بریلی مخزن " بھی کہتے ھیں - یہ روھیلکھنڈ کی مجلس ادبی کی طرف سے شائع ھوتا ھے جس کا مرکز مراد آباد میں ھے -

(۲۱) مفید عام - یہ جدید اردو اخبار مہینے میں دو دفعہ نکلتا ھے - ۲۰ صفحات پر مشتمل ھوتا ھے اور ھر صفحہ پر دو کالم ھوتے ھیں - اس کی تقطیع چھوٹی ھے - مسٹر کمپسن ناظم تعلیمات صوبۂ شمال مغربی نے جو نمبر نمونتاً میرے پاس بھیجا ھے اس کو دیکھنے سے معلوم ھوتا ھے کہ اس پر ادبی رنگ غالب ھے - اس اشاعت میں صوبۂ شمال مغربی کی تعلیمی رپورٹ ' تعلیم نسواں ' کلکتہ یونیورسٹی ' سہور اور جے پور کی تعلیمی حالت ' ھندوستان کے مختلف حصوں کی زرعی پیداوار ' قدیم فلاسفہ اور مورخین ' سبکتگین اور محمود ' میر ' ذوق ' گویا اور وزیر کے دیوانوں کے انتخاب ' اور اسی قسم کے دوسرے موضوعوں پر مضامین درج ھیں - میرے خیال میں اردو میں پہلی مرتبہ سکون پر مضمون اس اخبار میں شائع ھوا ھے - مضمون کا عنوان " عہد جہانگیر کے سکے " ھے - ان کے ۲۰ نمونے بھی پیش کئے گئے ھیں جو نہایت واضح ھیں -

(۲۲) مفید انام - یہ ھفتہ وار اخبار فتح گڑھ سے اردو میں نکلتا ھے - اس کے مدیر ایک ھندو شنکر سروپ ھیں - اس اخبار میں عورتوں کو مسیحی

مذہب قبول کرنے سے باز رکھنے کی تجاویز پیش کی گئی ہیں اور اس غرض سے ایک انجمن قایم کرنے کا اعلان کیا گیا ہے - چنانچہ ۴۰ ہزار روپیہ انجمن کے لیے جمع بھی ہو گیا ہے —

(۲۳) میور گزٹ - میرٹھ کا ماہوار اردو رسالہ ہے - اسے "جلوۂ طور" کا ضمیمہ تصور کرنا چاہئے جس کی نسبت میں ذکر کر چکا ہوں - سر ڈبلو میور کے زیر سر پرستی یہ رسالہ گزشتہ سال سے شائع ہو رہا ہے - رسالہ کا نام موصوف کے نام پر رکھا گیا ہے - یہ چھوٹی تقطیع میں ۸ صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحہ پر دو کالم ہیں - رسالہ کے سر ورق پر عربی کا یہ مقولہ بطور عنوان مندرج ہے: "کل جدید لذیذ" —

(۲۴) نیر اکبر - یہ اردو اخبار بجنور سے نکلتا اور "زین المطابع" میں طبع ہوتا ہے - ہر ہفتہ جمعرات کے روز شائع ہوتا ہے - جمعرات کا روز مسلمانوں میں حدیث نبوی کے مطابق متبرک مانا جاتا ہے - حدیث یہ ہے: خدا نے ساتویں دن (یعنی ہفتہ) اور پانچویں دن (یعنی جمعرات) کو متبرک قرار دیا ہے —

(۲۵) پاپ موچن - یہ "دھرم پرکاش" کا ہندی ایڈیشن ہے جس کے متعلق میں ابھی ذکر کر چکا ہوں —

(۲۶) راجپوتانہ گزٹ - اس اردو اخبار کے کرنل کیٹنگ (Keating) بانی ہیں - اس کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے انگریزی حکومت کے احکام و قواعد کی صوبے میں نشر و اشاعت عمل میں آے * —

(۲۷) روہیلکھنڈ اخبار - یہ ہفتہ وار اردو اخبار مراد آباد سے شائع ہوتا ہے -

* علی گڑھ کا "اخبار" مورخہ ۴ دسمبر سنہ ۱۸۶۸ ع —

(۲۸) سبے بلود - نینی تال کا هندی اخبار هے جو مهینے میں دو دفعه شائع هوتا هے —

(۲۹) تذکرہ بال کو بند - یه ماهوار اردو رساله آگرہ سے شائع هوتا هے —

(۳۰) ادیپور گزٹ - ۲۴ نومبر سنه ۱۸۹۸ ع کے اودھ اخبار میں اس هندی اخبار کی اطلاع مندرج تھی - اخبار مذکور نے افسوس ظاهر کیا هے که "اودیپورگزٹ" کو دیوناگری رسم خط میں چھپنے کے باعث کامیابی نہیں حاصل هوئی - بر خلاف اس کے اگر وہ اردو رسم خط میں چھپتا تو زیادہ مقبولیت حاصل هوتی —

(۳۱) عمدة الاخبار - اسی نام کا ایک اخبار بریلی سے نکلتا هے لیکن یه گزشته سال سے مدراس سے شائع هونا شروع هوا هے - اس کا پورا نام "عمدة الاخبار، اعظم الانوار" هے - یه مهینے میں تین بار چھوٹی تقطیع پر نکلتا هے - هر صفحه پر دو کالم هوتے هیں - میرے پرانے شاگرد مسٹرای سیسے (E. Sice) نے، جو آج کل پانڈی چری میں هیں، اس کی ایک اشاعت کا نمونه مجھے بھیجا هے - اس میں نواب کرناٹک کی تصویر بھی هے جن کا خطاب عمدة الدوله تھا - نواب صاحب موصوف کے نام پر اخبار کا نام رکھا گیا هے -

میں اس وقت ادب اردو سے تعلق رکھنے والی تصانیف کا نہایت اختصار سے ذکر کروں گا - میری کتاب "تاریخ ادب هندی وهندوستانی" کا دوسرا ایڈیشن تیار هورها هے اور عنقریب شائع هوجاے گا - اس کے متعلق میں اس موقع پر کچھ زیادہ نہیں کہنا چاهتا —

ڈبلو آر هولرائڈ، ناظم تعلیمات پنجاب کی رپورٹ بابته سنه ۱۸۹۷ - ۱۸۹۸ ع کے دیکھنے سے معلوم هوتا هے که صوبۂ پنجاب میں زیر تبصرہ سالوں میں

هندوستانی میں ۱۵۲ کتابیں شائع هوئیں - ان میں سے ۱۱۹ اردو کی هیں اور ۳۳ هندی کی - اسی تعداد میں ۱۴ وہ بھی شامل هیں جو اردو اور هندی دونوں میں هیں ایک اردو کی کتاب رومن رسم خط میں هے اور دو اردو اور انگریزی میں هیں - ان میں سے بیشتر لاهور دهلی اور لدهیانه سے شائع هوئی هیں —

مسٹر کمسن ' ناظم تعلیمات صوبۂ شمال مغربی کی گزشته رپورٹ میں ' جو ۲۰ فروری سنه ۱۸۶۹ ع کو شائع هوئی ' ان مطبوعات کا تذکرہ هے جو سنه ۱۸۶۸ ع میں رجسٹر کرائی گئی هیں - ان کی تعداد ۳۶۸ هے - ان میں سے ۲۵۳ هندوستانی کی هیں - ۱۴۶ اردو کی اور ۱۰۷ هندی کی - جن میں سے گیارہ ایسی هیں جو اردو اور هندی دونوں میں هیں اور صرف چھه اردو کی کتابیں رومن رسم خط میں هیں - ۱۸ کتابیں هندی اور سنسکرت کی هیں - ۵ اردو اور انگریزی کی جن میں سے دو رومن رسم خط میں هیں - ۲ اردو اور فارسی کی هیں - ایک اردو ' عربی اور انگریزی کی هے اور ایک اردو ' هندی اور انگریزی کی هے - اسے هم سه زبانی لغت تصور کر سکتے هیں جس کے مصنف کا نام مسٹر ایچ ایس ریڈ (Read) هے -

مذهبی کتب کی مقبولیت بدستور قایم هے - گزشته سال بیس کتابیں هندوؤں میں تبلیغ کرنے کی غرض سے هندی میں شائع هوئی هیں - مسلمانوں کے لیے اردو میں سترہ کتابیں شائع هوئیں - یه تعداد اس اعتبار سے بہت زیادہ هے که مسلمانوں کی تعداد هندوستان میں به نسبت هندوؤں کے بہت کم هے - مدارس کی نصابی کتب میں ۱۳ اردو میں اور ۱۳ هندی میں شائع هوئیں - تعلیم کے متعلق حکومت کی طرف سے جس قدر کتابیں شائع هوی هیں ان کی تعداد وهی هے جو پبلک کی شائع

کردہ کتب کی ہے - لیکن آخرالذکر کم تعداد میں طبع ہوتی ہیں - ہندی میں بہ مقابلہ اردو کے قصے کہانیوں کی کتابیں زیادہ مقبول ہیں- اس بات پر مسٹر کمپسن ناظم تعلیمات صوبہ شمال مغربی نے تعجب ظاہر کیا ہے - خوشی کی بات ہے کہ موصوف بھی میری طرح اس رجعت پسندانہ تحریک کے خلاف ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ اردو کی جگہ ہندی کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہئے —

صوبۂ شمال مغربی کے لفٹنٹ گورنر نے بہترین ادبی مضامین پر انعام دینے کا جو اعلان کیا تھا اس کا نتیجہ حسب دلخواہ نکلا - چنانچہ ۸۰ مضامین (قلمی اور مطبوعہ) اس کمیٹی کے روبرو پیش ہوے ہیں جو ان کی جانچ کے لئے مقرر کی گئی ہے —

(سر) سید احمد خان کی اردو لغت کے چار صفحات نمونتاً مجھے بھیجے گئے ہیں - موصوف نے ایس هاول (Howell) اور میری راے کے مطابق اس لغت کا نام، پرانا یوروپین نام ترک کرکے، "لغت زبان اردو" رکھا ہے- مسٹر هاول نے میری راے بھی سید صاحب موصوف کو پہنچادی ہے - اس لغت میں وهی عربی ٹائپ استعمال کیا گیا ہے جو سید صاحب کے مطبع میں ہے اور جس میں موصوف نے "انجیل مقدس کی تفسیر" شائع کی ہے - اس ٹائپ کا بڑا عیب یہ ہے کہ اس کے حروف بہت چھوٹے ہیں - مسٹر ڈبلو ہنڈ فورڈ (Handford) نے افسوس ظاہر کیا ہے، اور میں بھی ان کے ساتھ متفق ہوں، کہ اس لغت میں الفاظ کی اصل نہیں بتائی گئی - اگرچہ اس سے انکار نہیں کہ الفاظ کے معنی اور مطلب صاف زبان میں بیان کئے گئے ہیں اور ہر لفظ کے بعد اس کے مشتقات لکھے گئے ہیں - لیکن علیگڑھ کے "اخبار" مورخہ ۵ فروری سنہ ۱۸۶۹ ع میں اس لغت پر جو

تنقید شائع ہوئی ہے میں اس سے متفق نہیں - مثلاً یہ اعتراض معقولیت پر مبنی نہیں کہ چونکہ اردو زبان سنسکرت ' عربی اور فارسی سے بنی ہے اس لیے دیسی لوگوں کے لئے ان زبانوں کی علحدہ علحدہ لغتیں تیار کرنی چاہئیں - رہے خالص ہندوستانی الفاظ ' تو ان کے لیے لغت کی کیا ضرورت ہے ' اس لئے کہ ہر کس و ناکس انہیں سمجھتا ہے اور روزمرہ میں استعمال کرتا ہے - یہ بات ایسی ہوئی کہ کوئی یہ کہے کہ بھلا فرانسیسی زبان کی لغت کی کیا ضرورت ہے ' لاطینی کی لغت کافی ہے 'اس لیے کہ فرانسیسی زبان اسی سے نکلی ہے - ان الفاظ کے لیے جو عام طور پر استعمال کئے جاتے ہیں اور جن کے معنی ہر شخص جانتا ہے ' علحدہ لغت کی کیا ضرورت ہے - اسی طرح انگریزی کی لغت کی بھی ضرورت نہیں - اس کے لیے سیکسن زبان اور فرانسیسی کی لغت سے کام نکل سکتا ہے - بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایسے مفید کام پر اس طرح غیر ذمہ داری کے ساتھ تنقید کی جائے - لوگوں کی عادت ہے کہ وہ " دوسروں کی آنکھ کے تنکے کو دیکھ لیتے ہیں لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر انہیں نظر نہیں آتا " - بوالو (Boileau) نے ٹھیک کہا ہے : " تنقید آسان ہے لیکن صناعی (Art) مشکل ہے " - سید صاحب جیسے جلیل القدر مسلمان کے حوصلے کو پست کرنے کی کوشش کرنا ' جو تعلیم و تمدن کے سچے دل سے حامی اور قدردان ہیں ' کہاں کی انسانیت ہے - موصوف کے نکتہ چیں جو خود علم و فضل میں زیادہ ممتاز درجہ نہیں رکھتے' انہیں سبق دیئے چلے ہیں - سچے محققوں کا یہ شیوہ ہے کہ وہ ایسی تصنیف کے عیوب سے چشم پوشی کرتے ہیں جو مجموعی طور پر اطمینان بخش ہو اور جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہو —

کچھ عرصے سے یورپ اور ہندوستان ' دونوں جگہ ' سنسکرت کی تعلیم

کا رواج بڑھ رہا ہے - بہت سی سنسکرت کی قدیم کتابیں ایسی ہیں جن پر گمنامی کا پردہ پڑا ہوا تھا اور سوائے چند پنڈتوں کے ان تک کسی کی رسائی نہیں تھی ، اب شائع ہو رہی ہیں - عام طور پر تو ہندو لوگ سنسکرت مطلق نہیں سمجھہ سکتے - ان محققوں کو بھی جو سنسکرت زبان کے متعلق تحقیق کر رہے ہیں بعض اوقات سمجھنے میں سخت دشواریاں پیش آتی ہیں - انہیں بھی خارجی مدد کی ضرورت رہتی ہے - چنانچہ آج کل بنارس میں سنسکرت کی جس قدر کتب شائع ہو رہی ہیں ، ان کے ساتھہ شرح ضرور شامل ہوتی ہے - یہ شرح ہندی میں ہوتی ہے - مثال کے طور پر ہم ان ناموں کو پیش کرتے ہیں - "رام چندر نام سہسرا" جو "پدم پران" میں شامل ہے اور "رام گیتا" جو "اتار کا ندا ادھیا تما رامائن" میں شامل ہے ؛ "سیو پنچ ارتنا" جو سیوا کی منظوم تعریف ہے : ویدیا امرت ، ویدانت تریا (یعنی تتوا بودھا ، آتما بودھا اور مکشا سدھی) —

ہندوستان میں آج کل جو جدید اخبارات اور کتب شائع ہو رہی ہیں ان میں عمرانی زندگی کی اصلاح پر زور دیا جارہا ہے - اس اصلاحی تحریک کا کام بعض انجمنیں کر رہی ہیں جن کے متعلق میں ذکر کرچکا ہوں - ان انجمنوں کی بدولت اصلاحی کام نہایت گرمجوشی کے ساتھہ ہورہا ہے - ان سب انجمنوں کا نصب العین یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح اہل ہند کو جہالت اور تعصب کے جوے سے نجات دلائی جاے اور ان کی فلاح کی راہیں تلاش کی جائیں - انہیں تعصبات کی وجہ سے آج ان میں ایسی رسوم رائج ہوگئی ہیں جنہیں ساری مہذب دنیا برا کہتی ہے - اس کے سوا ان انجمنوں کے مقاصد میں یہ بھی ہے کہ اہل ہند میں حب وطن کا جذبہ

پیدا کیا جائے ان میں مفاد عامہ کا احساس پیدا ہو اور اس غفلت کو دور کیا جائے جو آج عام طور پر سارے ملک پر چھائی ہوئی ہے —

انہیں مقاصد کے مدنظر بمبئی میں ایک نئی انجمن قایم ہوئی ہے جس میں هندو اور مسلمان دونوں شرکت کرتے هیں - اس انجمن کا نام " معراج پلتهہ " ہے - دیدہ و دانستہ اس کے نام میں ایک عربی اور دوسرا هندی لفظ شامل کیا گیا ہے * —

اس تبصرے کو هم " برهموسماج " کے ذکر سے شروع کرتے هیں اس لئے کہ یہ انجمن اس وقت هندوستان میں سب سے زیادہ عملی کام کررهی ہے - یہ وحدانیت باری کے عقیدہ کو ماننے والوں کی انجمن ہے - اس انجمن کی بدولت ترقی یافتہ لوگوں کی ایک جماعت قائم هوگئی ہے جو اپنی اصلاحی تحریک کی اشاعت میں سرگرم عمل ہے - اس جماعت کی وجہ سے جو اصلاحات هورهی هیں انہیں دیکھہ کر خوشی هوتی ہے - هماری خواهش ہے کہ کیا اچھا هو اگر یہ اصلاحات هندوستان کے طول و عرض میں جاری و ساری هوجائیں - یہ انجمن چالیس سال سے کام کررهی ہے اور آهستہ آهستہ تنظیم میں منہمک ہے - اب اس نے یہ بات محسوس کرلی ہے کہ جب تک ایک کلیسا کے مثل وہ اپنی تنظیم نہ کرے گی اپنے ارکان پر قابو رکھنا دشوار ہے - چنانچہ اس جماعت کے سرگروہ بابو کشب چندر کا خیال + ہے کہ کلکتہ میں مچھوا بازار روڈ پر ایک مندر قایم کیا جائے جہاں پابندی کے ساتھہ عبادت کا

---

* " میرٹهہ گزٹ " مورخہ ۲۵ ستمبر سنہ ۱۸۶۹ ع —

+ برهموسماج کے ارکان اپنے پیشوا کو " آقا اور گنہگاروں کی ڈهارس " کہتے هیں اور جب کبهی اس کا سامنا هوجائے تو سجدے میں گر جاتے هیں —

انتظام کیا جائے گا * —

بنارس میں بعض وسیع المشرب اشخاص کا ارادہ ہے کہ ایک عبادت خانہ قایم کریں جس کے ایک حصے میں عیسائی ' ایک میں مسلمان اور ایک میں هندو کے لیے عبادت کا انتظام کیا جائے گا † —

کلکتہ میں ایک انجمن قایم هوئی هے جس کا مقصد یہ هے کہ هندوؤں کے مذهب میں جو رسومات قبیح داخل هوگئی هیں انهیں خارج کیا جائے - راجہ کرشن بہادر اس انجمن کے صدر هیں - موصوف وهی هیں جنهوں نے هندوستانی کی متعدد کتب تصنیف کی هیں اور " گے کی کہانیوں " (Fables de Gay) کا هندوستانی ترجمہ کیا هے - (اودہ اخبار مورخہ ۳۰ مارچ سنہ ۱۸۶۹ ع) —

لکھنؤ کی انجمن تہذیب کو روز بروز ترقی هورهی هے اور اس کی تنظیم بہتر هوتی جارهی هے - اگرچہ یہ انجمن اس قدر بنیادی اصلاحات نہیں چاهتی جیسے کہ برهموسماج چاهتی هے لیکن بہر حال عملی اعتبار سے وہ اصلاح کا کام کررهی هے - اس کے قواعد میں ایک یہ هے کہ اس انجمن میں هر شخص بلا قید مذهب و ملت شریک هوسکتا هے ‡ - اس کے زیر اهتمام هر ماہ لکچر هوتے هیں جو بعد میں " رسالہ " کے نام سے شائع هوجاتے هیں - میں ارباب انجمن کا تہ دل سے ممنون هوں کہ انهوں نے مجھے اس کا ایک نمونہ بھیجا هے - میں نے اسے نہایت

---

* انڈین میل ' مورخہ ۱۳ اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ ع —

† Saint Sepulcre کے کلیسا کی طرح جہاں مختلف مسیحی فرقوں کے عبادت کے لئے کمرے مقرر هیں —

‡ اودہ اخبار مورخہ یکم جون سنہ ۱۸۶۹ ع -

شوق اور دلچسپی کے ساتھہ پڑھا - اس ماہوار رسالہ کے سرورق پر انجمن کے قیام کی تاریخ دو اشعار میں بیان کی گئی ہے • —

گذشتہ مارچ کے مہینے میں جے پور کی " راج پوتانہ سوشل سائنس کانگریس ' کا اجلاس منعقد ہوا - یہ انجمن اس ریاست کے مہاراجہ کے زیر سرپرستی قایم ہوئی ہے - اس کا نصب العین یہ ہے کہ مدارس قایم کیے جائیں اور نصابی کتب کی اشاعت بڑھائی جاے - اس کے ساتھہ انجمن زراعت اور صفائی کو ترقی دینا چاہتی ہے - لکھنو کی " انجمن تہذیب " کی طرح یہ انجمن بھی ایک رسالہ شائع کرتی ہے - اس رسالہ کی پہلی اشاعت میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ طبقۂ امرا کے بچوں کی تعلیم کے لئے ایک کالج قایم کیا جاے اور اس کالج میں ایسی تربیت کا انتظام کیا جاے جو امراء کے بچوں کو ملنی چاہئے - جہاں ریاضی ' کیمیا ' علوم فطری ' معاشیات ' اردو ' ہندی ' ہندوستان کی قدیم السنہ اور انگریزی کی تعلیم کے ساتھہ ساتھہ جسمانی ورزش اور شناوری وغیرہ کا پورا انتظام کیا جاے گا —

آگرہ کی " انجمن رفاہ خلائق " کا اجلاس گذشتہ جون کے مہینے میں منعقد ہوا تھا - اس موقع پر انجمن کے تمام کاموں کا جائزہ لیا گیا - میرٹھہ کی " انجمن مباحثہ " بھی بنارس کی " انجمن ادبی " کی طرح مضامین شائع کرتی رہتی ہے - معلوم ہوتا ہے یہ مضامین قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اس لئے کہ انگریزی حکومت مضامین کے مجموعہ کو مستقل طور پر خریدتی ہے اور ان کے بعض حصوں کو دوبارہ طبع کراتی ہے —

• یہاں اشعار کا فرانسیسی ترجمہ ہے - (مترجم) -

" اودھ اخبار " مورخہ ۸ مئی سنہ ۱۸۶۹ ع میں چنار کی ایک انجمن کے قیام کا ذکر تھا جس کے ماہوار جلسے منعقد ہوا کرتے ہیں —

ایسٹ انڈیا ایسوسیشن (East India Association) جس کا مرکز علیگڑہ ہے ' اس غرض سے قایم کی گئی ہے کہ اہل ہند کے حقوق کی تمام جائز طریقوں سے نگہداشت کی جاے ' ان کی فلاح و تعلیم کے لیے کوشش کی جاے ' اور انہیں ترقی کی راہ پر گامزن ہونے میں مدد دی جاے - اس انجمن میں سنہ ۱۸۶۸ ع کے اواخر میں ۵۴ ارکان شریک تھے - انجمن ایک ماہوار اردو رسالہ شائع کرتی ہے جس میں انجمن کی رودادوں کے سوا لکچروں اور ان مباحثوں کا حال درج ہوتا ہے جو انجمن کے زیر اہتمام ہوتے ہیں * —

گزشتہ سال سر ڈبلو میور (W. Muir) کے زیر سرپرستی مراد آباد میں اس انجمن کی ایک شاخ قایم ہوئی - سال کے آخر میں اس انجمن کے جلسہ میں منشی گنگا پرشاد نے انجمن کی خدمت گذاری کے مقاصد پر تقریر کی اور کہا کہ ان مقاصد کو عملی جامہ پہنانے کی ایک صورت یہ اختیار کی گئی ہے کہ مغربی علوم کو رائج کرنے کی ہر ممکنہ کوشش کی جا رہی ہے - موصوف نے کہا کہ وہ خود علم ہیئت ' کیمیا ' فلسفہ ' اور تاریخ پر کام کر رہے ہیں - موصوف نے یہ بھی کہا کہ انجمن کے مقاصد میں یہ بھی شامل ہے کہ سیاسی مسائل معرض بحث میں لاے جائیں اور بالخصوص ان قوانین کے متعلق پوری بحث و تمحیص ہو جو اہل ہند کے لیے وضع کیے جاتے ہیں —

---

* علیگڑہ کا " اخبار " مورخہ ۱۸ دسمبر ۱۸۶۸ ع -

اس انجمن کی یہ بھی کوشش ہے کہ اہل ہند اپنی تہذیب و تمدن کی ترقی کی خاطر یورپ کا سفر کریں اور دنیا دیکھیں۔ اب بعض مشہور پنڈتوں نے بھی یہ بات تسلیم کرلی ہے کہ یورپ کا سفر کرنا شاستروں کی تعلیم کے خلاف نہیں ہے۔ چنانچہ انجمن چندے کے ذریعہ ایک رقم جمع کررہی ہے تاکہ یورپ جانے والوں کو مالی امداد بہم پہنچائے اور اپنا ایک پروگرام تیار کرے جس کے مطابق یورپ جانے والے عمل کریں۔

انگریزی حکومت بھی حتی المقدور ان لوگوں کی ہمت افزائی کر رہی ہے جو تعلیم کی تکمیل کی غرض سے انگلستان جانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے خاص وظائف مقرر کیے گئے ہیں جو سالانہ عطا کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ بنگال، مدراس اور بمبئی کے صوبوں کے لئے ایک ایک وظیفہ منظور ہوا ہے اور تین وظائف صوبۂ شمال مغربی، پنجاب، اودھ اور صوبۂ متوسط کے لیے مقرر ہوے ہیں۔ آخرالذکر دونوں صوبوں کو باری باری سے ایک ایک سال کے بعد ایک وظیفہ ملے گا *۔

نواب بنگال نے اپنے ہم وطنوں کے لیے بہت اچھی مثال قایم کردی ہے کہ موصوف چند ماہ کے لیے یورپ تشریف لاے +۔ آپ کے ہمراہ آپ

---

* (سر) سید احمد خان کے صاحبزادے سید محمد محمود کو صوبۂ شمال مغربی سے وظیفہ ملا ہے۔ موصوف اپنے والد محترم کے ساتھ انگلستان پہنچ چکے ہیں۔

+ انھیں نواب مرشد آباد بھی کہتے ہیں۔ اسلامی حکومت کے زمانے میں مرشد آباد بنگال کا دارالسلطنت تھا۔ نواب صاحب کے خطابات یہ ہیں جنھیں اخبارات نے عجب عجب طرح لکھا ہے، منتظم الملک، محسن الدولہ، فریدوں جاہ، نواب سید منصور علی خان بہادر نصرت جنگ نواب ناظم بنگال، بہار و اوڑیسہ۔

کے دونوں صاحبزادے، ایک ڈاکٹر اور میر وزیر علی کاظمی اور کرنل لیارڈ (Layard) تھے۔ میر وزیر علی کاظمی نہایت بذلہ سنج شخص ہیں۔ کرنل لیارڈ کے بھائی برطانوی ہند کے اعلیٰ عہدہ دار اور فاضل شخص گذرے ہیں۔ نواب صاحب مع اپنے ساتھیوں کے جب پیرس میں ٹھہرے تھے تو اس وقت مجھے ان سے ملاقات کا موقع ملا *۔ نواب صاحب اور ان کے ساتھی سب شیعہ ہیں۔ مذہبی پابندی میں شیعہ سنیوں سے زیادہ کٹر اور کھانے پینے کے معاملے میں محتاط ہوتے ہیں+۔ چنانچہ نواب صاحب اور ان کے ساتھیوں کو فرانس اور انگلستان میں بعض اوقات دعوتوں میں جانے سے انکار کرنا پڑا۔ بہر حال اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ یورپ کے سفر کی بدولت نواب صاحب اور ان کے صاحبزادوں کے خیالات میں وسعت پیدا ہوئی ہوگی اور ان کے ساتھیوں اور نوکروں کی معلومات میں اضافہ ہوا ہوگا۔

اس سال ہندوستان کا ایک اور نہایت معزز شخص یورپ آیا ہے۔ ہماری مراد (سر) سید احمد خان سے ہے۔ موصوف کو علمی اور ادبی دنیا

---

* اس سال مجھے دیوان متھرا داس سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جب کہ وہ لندن جاتے ہوے پیرس میں ٹھہرے تھے۔ موصوف مہاراجہ کپورتھلہ اندھیر سنگھ کے وزیر ہیں اور نہایت فاضل اور علم دوست شخص ہیں۔ نواب سلطان علی خاں سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں موصوف کے ساتھ ہندوستانی زبان میں گفتگو نہیں کرسکا اس لیے کہ وہ نہایت شستہ فرانسیسی بولتے ہیں۔ موصوف نے اپنی تعلیم کی تکمیل روس میں کی ہے۔

+ انہیں ہم مسلمانوں کے پروٹسٹنٹ کہہ سکتے ہیں۔ دیکھو میری کتاب "مسلمانان ہند کا مذہب" (Memoire Sur la Religion Musulmane dans l'Inde)

میں خاص اہمیت حاصل ہے - سید عبداللہ نے مجھہ سے بیان کیا کہ مسلمانان هند میں (سر) سید احمد خان کا سا عالم اس وقت کوئی اور موجود نہیں - نواب مرشدآباد کی طرح سید صاحب موصوف بھی اپنے صاحبزادوں کو اپنے همراہ یورپ لاے هیں - آپ کا ارادہ ہے کہ دونوں صاحبزادوں کو بیرسٹری کی تعلیم دلائیں - سید صاحب کی آزاد خیالی اور وسیع مشربی کا ثبوت آپ کی اس تصنیف میں موجود ہے جو انجیل مقدس پر لکھی ہے - آپ کا سفر کی غرض سے یورپ آنا بھی اسی وسیع مشربی پر مبنی ہے - سید صاحب موصوف نے علی گڑہ کے "اخبار" میں اپنے سفر یورپ کے تجربات شائع کیے هیں اور اپنے تمام انگلستان کے حالات نہایت دلچسپ طریقے پر بیان کئے هیں * - همیں پوری توقع ہے کہ ان حالات کو پڑہ کر بہت سے هندوستانیوں کے دل میں یہ خواهش پیدا هوگی کہ اپنی تعلیم کی غرض سے انگلستان آئیں اور سفر سے فائدہ اٹھائیں - میری نظر سے یہ خبر گذری ہے کہ آئندہ سال بابو کشب چندر بھی یورپ تشریف لا رہے هیں —

* سید صاحب موصوف کی میرے نوجوان دوست ایچ پامر سے خوب ملاقاتیں رهیں - جو آج کل کیمبرج میں هیں - کوہ سینا کے کتبوں کی تحقیق میں ایچ پامر نے خاص نام پیدا کرلیا ہے اور ان کا علم و فضل آج مسلم هوچکا ہے - موصوف نے کوہ سینا کے متعلق کئی هزار کتبے جمع کیے هیں اور ان کی عبارتوں کو حل کیا ہے جن پر بہت کچھہ بحث مباحثے هوچکے هیں - موصوف نے ان کتبوں کی مدد سے یہ تحقیق کیا ہے کہ کوہ سینا کے علاقے میں پہلی صدی عیسوی میں ایک مستقل بستی آباد تھی —

(سر) سید احمد خان کے قیام انگلستان کے دوران میں هندوستان کے ایک اور مشہور مسلمان عالم سید اولاد علی اپنے وطن واپس گئے هیں تاکہ وهاں لوگوں کو تمدن جدید کی برکات سے آگاہ کریں اور اخبار بینی کا شوق پیدا کرائیں جس کے ذریعہ یورپ کی ترقیات کا حال اهل هند کو معلوم هو اور هندوستان میں ترقی کی جو مساعی هورهی هیں ان کے متعلق لوگوں کو واقفیت حاصل هو - سید اولاد علی آئرلینڈ کی جامعۂ ڈبلن میں اردو پڑھاتے هیں اور کئی برس سے ڈبلن میں مقیم تھے —

هندوستان میں اب تک اصلاحی اور علمی انجمنوں میں زیادہ فرق نہیں کیا جاتا - شاہ جہاں پور میں جو انجمن سنه ۱۸۶۲ ع میں قایم هوئی ہے اس کے پیش نظر علمی اور ادبی کام هے - در اصل صوبۂ شمال مغربی میں یہ پہلی علمی انجمن هے - ارکان انجمن کی مستقل مزاجی کی بدولت یہ انجمن ترقی کررهی هے - اب اس وقت جلال آباد اور دوسری تحصیلوں میں اس کی پانچ شاخیں موجود هیں - اهل هند کا تعلق جن جن مسائل سے هے ان سب پر اس کے جلسوں میں بحث هوتی هے اور کتابوں کے ذریعہ خیالات کی نشرو اشاعت کی جاتی هے - چنانچہ انجمن ' بلدیات کے صدر اور اعلیٰ عہدہ داروں کے ساتھہ تعلقات رکھتی هے اور متعلقہ مسائل ان کے گوش گذار کرتی رهتی هے - چنانچہ بعض اوقات انهیں اپنا هم خیال بناکر ضروری اصلاحات رائج کراتی هے - ابھی حال میں اس انجمن کی مساعی کی بدولت برهمنوں اور کھتریوں نے اپنی شادی کی بعض رسوم قبیحہ ترک کردی هیں - انجمن کی طرف سے ایک محتاج خانہ ' ایک مدرسہ سنسکرت اور عربی کی تعلیم کے لیے اور تین لڑکیوں کے مدارس قایم کئے گئے هیں - انجمن زندگی کے هر شعبۂ

کی اصلاح کرنا چاہتی ہے - چنانچہ اردو شاعری میں جس میں عشق و محبت کے اظہار کے سوا کچھہ نہیں ' انجمن تبدیلیاں پیدا کرنا چاہتی ہے - انجمن کے نزدیک ہندی زبان کی ترقی ضروری ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس میں سنسکرت الفاظ رائج کئے جائیں - انجمن کی طرف سے ایک ہندوستانی رسالہ " رفاہ خلائق " شائع ہوتا ہے (*) - اس رسالے کے ساتھہ تبادلہ کرکے انجمن میں نو دوسرے اخبارات آتے ہیں - ان میں پانچ اردو ' ایک بنگالی ' اور تین انگریزی کے ہیں - انجمن کے کتب خانہ میں اس وقت دو ہزار کتابیں موجود ہیں (+) —

اس انجمن سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ اس کی وجہ سے علیگڑہ ' لاہور ' اٹاوہ ' بنارس ‡ ' بدایوں ' مرادآباد اور الہ آباد میں انجمنیں قایم ہوئیں - مرادآباد اور الہ آباد کی انجمنوں کی روداد اردو میں شائع ہوتی ہے - الہ آباد کی انجمن کی روداد " کارروائی جلسۂ عام ماہوار " کے نام سے شائع ہوتی ہے - اس کے سوا کالی چرن " مخزن العلوم " کے نام سے الہ آباد سے ایک ماہوار ادبی رسالہ نکال رہے ہیں - مراد آباد کی انجمن کے رسالے کا نام " گنج العلوم " ہے —

(سر) سید احمد خاں نے جو " علیگڑہ انسٹیٹیوٹ ' قایم کیا تھا وہ وزیر ہند ڈیوک آف ارگائل (Duke of Argyle) کے زیر پرستی خوب فروغ

(*) اس کے متعلق آگے ذکر آے گا —

(+) علیگڑہ کا " اخبار " مورخہ ۱۳ جنوری سنہ ۱۸۶۹ ع —

(‡) بنارس کی انجمن کا نام " انجمن ہند " ہے - بنارس چونکہ مرکزی جگہ ہے اس واسطے وہاں کی انجمن بھی سارے ہندوستان کے لئے ہے -

پا رہا ہے۔ مسٹر گرانٹ ڈف بھی جو نائب وزیر ہند ہیں ، اس کے حامی ہیں۔ سید صاحب موصوف بد ستور انسٹیٹیوٹ کے معتمد اعزازی ہیں۔ اس انجمن نے بعض اہم انگریزی تصانیف کے اردو ترجمہ کا انتظام کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہفتہ وار 'اخبار' نہایت پابندی سے شائع ہوتا ہے جس میں نہایت مفید معلومات ہوتی ہیں۔ چنانچہ مجھے اپنے اس خطبے کی تیاری میں "اخبار" سے بہت کچھہ مسالا ملا ہے۔ انسٹیٹیوٹ کی طرف سے ایک مدرسہ قایم کرنے کی تجویز پیش کی گئی ہے جہاں اعلی تعلیم کا انتظام کیا جاے گا۔ اس مدرسہ کا نام " مدرسۂ مفید خلائق " ہوگا۔ یہ بھی تجویز ہے کہ اس مدرسہ میں ایک پنڈت سنسکرت اور ہندی کی تعلیم دینے کی غرض سے ملازم رکھا جاے (*) —

علیگڑہ کی انجمن کی طرح لاہور کی " انجمن پنجاب " بھی انگریزی تصانیف کا اردو ترجمہ کرا رہی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اس انجمن کے بانی اور صدر ڈاکٹر لیٹنر کی غیر موجودگی سے یہ کام غیر مکمل نہ رہ جاے۔ ڈاکٹر لیٹنر (Leitner) عرصہ سے ہندوستان میں مقیم تھے لیکن فی الوقت وہ انگلستان میں ہیں۔ موصوف نے سب سے پہلے یہ خیال پیش کیا تھا کہ لاہور میں ہندوستان کی کلاسی کی السنہ (سنسکرت عربی اور فارسی) کی تعلیم کے لئے ایک علحدہ جامعہ قایم کی جاے۔ مجھے افسوس کے ساتھہ بیان کرنا پڑتا ہے کہ موصوف کی اس تجویز کو حکومت نے منظور نہیں کیا حالانکہ پنجاب کے امراء و معززین نے اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لئے بڑی بڑی رقمیں دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اگر یہ تجویز منظور ہو

(*) "اخبار" مورخہ ۳۰ اپریل ، اور ۹ مئی سنہ ۱۸۶۹ ع۔

جاتی تو یقیناً ہندوستانی ادبیات میں نئی جان پڑجاتی - حکومت لاہور میں صرف ایک " مشرقی کالج " (Oriental College) قایم رکھنا چاہتی ہے - حکومت کے پیش نظریہ بات ہے کہ اگر لاہور میں مشرقی یونیورسٹی قایم کی گئی تو وہ کلکتہ ' بمبئی اور مدراس کی یونیورسٹیوں سے بالکل مختلف نوعیت کی ہوگی —

بہار کی ' سائنٹنک سوسائٹی " کا صدر مقام مظفر پور ہے - اس انجمن کے معتمد ایک فاضل مسلمان ہیں - اس وقت انجمن میں (۳۱۸) ارکان ہیں - اس تعداد میں ۱۲۸ مسلمان ہیں ' ۱۹۲ ہندو ہیں اور ۲۰ یورپین ہیں - انجمن کی طرف سے " اخبارالاخبار " شائع ہوتا ہے - تجویز ہے کہ انجمن مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لیے ایک کالج قایم کرے اور اس کے ساتھ مغربی علوم کی اشاعت کا کام بھی انجام دے (*) -

' دہلی انسٹیٹیوٹ کی عمارت یورپین وضع کی اب تیار ہوچکی ہے - عمارت میں ایک کتب خانہ اور ایک عجائب گھر بھی شامل ہے (٭) -

امسال جو نئی انجمنیں قایم ہوئی ہیں ان میں " نیلی تال انسٹیٹیوٹ" قابل ذکر ہے - دوسری انجمنوں کی طرح اس کے بانی بھی چند متمول امرا ہیں جو قوم میں روشن خیالی پھیلانا چاہتے ہیں -

مشاعروں کا سلسلہ بدستور جاری ہے - ایک بڑا مشاعرہ آگرہ میں ۱۹

(*) اودہ اخبار - مورخہ ۱۰ نومبر سنہ ۱۸۶۸ ع ' اخبار عالم مورخہ ۷ مئی و ۸ جولائی سنہ ۱۸۶۹ ع -

(†) ملاحظہ ہو بھولا ناتھ چندر کی کتاب " ایک ہندو کا سفر" جلد ۲ - صفحہ ۳۸۰ -

اکتوبر سنہ ۱۸۶۹ ع کو ہونے والا تھا - اودھ اخبار مورخہ ۲۸ ستمبر سنہ ۱۸۶۹ع میں ان شعرا کے لئے ہدایات کا اعلان شائع ہوا ' جو اس مشاعرہ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں - ان ہدایات میں ہے کہ شعرا پہلے سے اپنے نام ' تخلص ' مذہب عمر ' استاد کا نام اور یہ کہ آیا استاد زندہ ہے یا فوت ہوگیا ' مطبوعہ دوانین کے نام اور دوسرے حالات کے متعلق اطلاع کردیں —

ان انجمنوں کے قیام سے اہل ہند کا یورپ کے ساتھ ربط قایم ہورہا ہے - اس ربط و ضبط کی بدولت ہندوستان میں ایک نئی تہذیب قایم ہونے والی ہے - اس وقت ہندوستان میں جس قدر جامعات ' مدرسے اور کالج قایم ہیں وہ سب کے سب مغربی اصول پر ہیں - آہستہ آہستہ اہل ہند مغربی علوم سے آشنا ہوتے جارہے ہیں - جس طرح انہوں نے قدیم علوم کی تحصیل میں کمال پیدا کیا تھا ' اب وہ مغربی اثر سے جدید طریق تعلیم میں بھی کمال پیدا کرنے لگیں گے (*) -

اس وقت تقریباً ۳۰ لاکھ ہندو اور ۹۰ ہزار مسلمان سرکاری مدارس میں تعلیم پارہے ہیں - اس کے سوا ۳۳ ہزار لڑکے اور ۸ ہزار لڑکیاں مشن کے مدرسوں میں پڑھ رہی ہیں - اب تک جو بات سننے میں نہیں آئی تھی اس کی عملی صورتیں ہمارے سامنے ظاہر ہورہی ہیں - ہندو ' مسلمان اور پارسی اپنے خرچ سے مدارس قایم کررہے ہیں جہاں نہ صرف لڑکوں بلکہ لڑکیوں کی بھی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے - یہ مدارس مغربی اصول پر چلائے جاتے ہیں - پورنیا کے ایک باشندے نے آٹھ سو روپے سالانہ کی رقم اپنے گانوں میں مدرسہ قایم کرنے کے لیے وقف کردی ہے (+) -

---

(*) بنارس میں بعض اہل ہند لاطینی زبان سیکھ رہے ہیں -

(+) " اخبار " - مورخہ ۲۶ اپریل سنہ ۱۸۶۹ ع -

ہندوؤں نے آپس میں مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ مدارس میں دیسی عورتوں کو نارمل کی تعلیم دینے کے لیے ایک مدرسہ قایم کیا جائے - راجہ وزیانگرم نے وعدہ کیا ہے کہ وہ پانچ طالبات کا خرچ خود برداشت کریں گے - ملکی تعصبات کو تسلیم کرتے ہوئے ارباب مدرسہ نے یہ قاعدہ بنادیا ہے کہ شروع شروع میں صرف اونچی ذات کی لڑکیاں مدرسہ میں شریک ہوسکیں گی (*) —

مرادآباد میں مدرسۂ فوقانیہ کے جلسۂ افتتاحی کے موقع پر سر ڈیلو میور لفٹنٹ گورنر صوبہ شمال مغربی نے تقریر کے دوران میں کہا کہ یہ مدرسہ ایک مسلمان خاتون کے وقف کی بدولت قایم ہورہا ہے - اس وقف کا انتظام حکومت کے ہاتھہ میں ہے - دراصل اس شہر میں پہلے سے امریکن مشن اسکول موجود تھا لیکن چونکہ اہل ہند نے کثیر تعداد میں مسیحی مذہب نہیں قبول کیا ہے اس لئے حکومت نے بظاہر اس معاملے میں غیر جانبداری کا اظہار کیا ہے - اگرچہ حکومت مشنریوں کے جوش عمل کی قدردان ہے لیکن وہ ہندوستانی طلبہ کو ان کی تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب نہیں دے سکتی —

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندوستانی نوجوان نہ صرف مشن اسکولوں بلکہ سرکاری مدارس میں جو تعلیم حاصل کررہے ہیں، اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ عیسائیت کی طرف مائل ہوں - مسلمانوں کو خاص کر اس بات کا احساس ہے اور وہ اپنے بچوں کو ان مدارس میں بھیجنے سے احتراز کرتے ہیں - اس لئے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ مذہب

(* ہوم ورڈ میل - مورخہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۸۰۹ ع —

اسلام کے علاوہ نجات کا کوئی دوسرا رستہ نہیں (*) - لیکن ہندو لوگ اس باب میں زیادہ سخت نہیں - چنانچہ انہیں کی جماعت کے افراد مسیحی تبلیغ سے متاثر ہو رہے ہیں - کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مشنری بھی غافل نہیں ہیں - وہ بھی اپنا کام انہماک سے کئے جاتے ہیں اور اپنی مساعی کا پھل پاتے ہیں - مسیحی جماعتوں کی تصانیف ' رسائل اور اخبارات کی بدولت دیسی لوگوں میں مسیحی خیالات کا چرچا بڑھ رہا ہے اور وہ مسیحی دین کی طرف مائل ہو رہے ہیں - کپتان ایکمان (Aikman) کی کتاب " ثلاثۃ الکتب " جس سے ان کی مراد عہد نامۂ جدید ' عہد نامۂ عتیق اور قران سے ہے ' بہت مقبول ہوئی (†) - یہ کتاب اردو میں لکھی گئی ہے - مدراس کے اسقف نے از راہ عنایت اس کا ایک نسخہ مجھے بھیجا ہے - اس کتاب سے مسلمانوں میں ہل چل مچ گئی ہے - ہر جگہ مولویوں نے جلسے کرکے اس کا پڑھنا ممنوع قرار دیا ہے - اس کتاب میں مسئلۂ نجات اُخروی کے متعلق ' جو عیسائیوں اور مسلمانوں میں مختلف فیہ چلا آتا ہے ' بحث کی گئی ہے - چنانچہ انجیل اور قران کی رو سے مسلمانوں کے بہت سے عقاید کو غلط ثابت کیا گیا ہے —

(*) حیدرآباد سندھ میں ایک مسلمان کے عیسائی ہو جانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ دو سو مسلمان طالب علم جو مشن اسکولوں میں تعلیم پا رہے تھے اپنے نام خارج کراکے علحدہ ہو گئے —

(†) یہ کتاب بڑی تقطیع پر ۲۳۲ صفحات پر حاوی ہے - اصل کتاب اردو میں ہے لیکن یورپین پبلک کے لئے مصنف نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شائع کردیا ہے -

کلکتہ کے مشہور و معروف اسقف نے گذشتہ سال اپنے پورے علاقے کا دورہ کیا - موصوف کشمیر اور پشاور بھی گئے - ہر جگہ خوب شاندار استقبال کیا گیا - موصوف اردو بلا تکلف بولتے ہیں جس کے باعث انہیں دیسی لوگوں سے میل ملاقات میں بیحد سہولت ہوتی ہے * - پنجاب میں ۳۰ مرکزوں کا معائنہ کیا - چار نئے کلیساؤں کی افتتاحی رسم ادا کی - آٹھ قبرستانوں کو قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا ' ۳۶ جلسوں کے موقعوں پر ۲۲۵۰ اشخاص کا کنفرمیشن (Confirmation) کیا جن میں سے ۷۳ دیسی لوگ تھے † - موصوف نے " انجمن اشاعت انجیل " کے روبرو کہا کہ چھوٹا ناگپور میں سات ہزار دیسی مسیحی زمرہ میں داخل ہوگئے ہیں - چنانچہ اس علاقہ کے لیے چار لیوتھری مسلک کے پادری مقرر کردئے گئے ہیں اور انہیں حق تبلیغ عطا کیا گیا ہے ‡ -

مسیحی مبلغین نے اس خیال سے کہ ہندوستانی رواج کی خلاف ورزی نہ ہو ' یہ فیصلہ کیا ہے کہ جو عورتیں عیسائی مذہب قبول کریں اور جو پہلے سے پردہ کی زندگی کی عادی ہوں ' وہ اپنے مکان میں ہی بپتسمے کی رسوم پوری کرسکتی ہیں - لیکن عشائے ربانی کے لیے انہیں اجازت ہوگی کہ برقع پہن کر کلیسا اور لوح مقدس کے قریب جائیں - ان کے لیے علحدہ جگہہ مقرر کردی جاتی ہے جہاں انہیں کوئی دوسرا شخص نہیں

* سب اخباروں میں میری نظر سے یہی گذرا کہ موصوف اردو بولتے ہیں نہ کہ ہندی —

† کولونیل چرچ کرانیکل - ۲ مارچ سنہ ۱۸۶۹ ع —

‡ انڈین میل - ۲۱ جولائی سنہ ۱۸۶۹ ع —

دیکھہ سکتا - بالکل اسی طرح جیسے Carmelites اور Clarisses کے کلیساؤں میں انتظام کیا گیا ہے - ریورنڈ آر کلارک نے امرتسر کے انگلی کن مشن کی سنہ ۱۸۶۸ ع کی رپورٹ میں یہ باتیں بیان کی ہیں —

جو لوگ ابھی حال میں مسیحی زمرہ میں شامل ہوئے ہیں ان میں مولوی سراج الدین پانی پتی قابل ذکر ہیں - ان کی عمر اس وقت سو سال ہے - وہ عمادالدین کے والد ہیں جن کے متعلق میں گذشتہ سال تذکرہ کرچکا ہوں اور تفصیلی حالات بیان کرچکا ہوں - وہ اس وقت انگریزی کلیسا میں پادری ہیں - ان کے بھائی خیرالدین اور ان کی بیوی اور خود عمادالدین کی بیوی کے سوا اس خاندان کے سب افراد نے عیسائی مذہب قبول کر لیا ہے - کریم الدین اب تک اسلام کے نام لیوا ہیں —

ایک دن آنے والا ہے جب پورا ہندوستان مسیحی جھنڈے تلے ہوگا - ہمیں پوری توقع ہے کہ " خدائے تعالیٰ نے جو دن اس کام کے لیے مقرر کیا ہے وہ قریب آرہا ہے جب کہ زمین پر آسمان کی جانب سے ایک روشنی نازل ہوگی جس سے دنیا جگمگا اٹھے گی - اسی روز کا دنیا اتنے عرصے سے انتظار کررہی ہے " * —

" صلیب والے علم " ایک دن دنیا میں چھا جائیں گے ' اور خدائے حی و قیوم کی انجیلی تعلیم دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ جائے گی ... ...

---

* یہ " دعائے پیرس " کے ابتدائی اشعار ہیں - یہ دعا " دعائے لیون " میں شامل کرلی گئی ہے جو بہت قدیم ہے - لیکن ۱۲ مارچ سنہ ۱۸۶۹ ع کے احکام کی رو سے نئی دعا یا جسے Romano - Iyonnaise کہتے ہیں رائج ہوئی ہے -

ہندوستان کے جنوبی ساحلوں پر جہاں شیطان پوجا جاتا تھا، آج وہاں ہمارے آقا یسوع مسیح کے کلمات پاک کا غلغلہ بلند ہے اور مسیحی رواج لوگوں کے دلوں میں گھر کر رہے ہیں * —

اس صدی میں اعداد و شمار کو بہت اہمیت دی جاتی ہے - علیگڑھ کے "اخبار" میں جو اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں اُنھیں میں اس جگہ درج کرتا ہوں - ان کے دیکھنے سے آپ کو سنہ ۱۸۶۸ - ۱۸۶۷ ع کی ہندوستان کی مذہبی زندگی کا حال معلوم ہو جائے گا - یہ اعداد و شمار "ہندوستانی نظم و نسق کے سالنامے" سے نقل کیے گئے ہیں - حکومت برطانیہ کے تحت اس وقت ۱۵ کروڑ نفوس زندگی بسر کر رہے ہیں ان میں سے دس لاکھ ترانوے ہزار عیسائی ہیں، جن میں ۶۴۰۰۰۰ کیتھولک ہیں اور ۴۵۳۰۰۰ پروتستنٹ وغیرہ ہیں ‡ - گیارہ کروڑ ہندو ہیں - تیس لاکھ بدھ مت کے متبعین ہیں - دو کروڑ پچاس لاکھ مسلمان ہیں - ایک کروڑ بیس لاکھ قدیمی باشندے ہیں جو نیم وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں - ستر لاکھ پارسی یہودی وغیرہ ہیں -

یہ بات آسانی سے سمجھ میں آتی ہے کہ ہندو لوگ زمرۂ اسلام میں شامل ہو رہے ہیں - لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ بعض

* ورد زور تھے - "ہولی ایئر" (Holy Year) - مناجات ۱۲ -

‡ ہندوستان کے قدیم عیسائیوں کو "سینٹ طوماس کے عیسائی" کہتے تھے - ان کی مناجاتیں سریانی میں ہیں یہی حضرت مسیح کی زبان تھی - یہ لوگ رومن کیتھولک یا دوسرے کلیساء میں ضم ہونا نہیں چاہتے - بلکہ وہ اپنے تئیں یونانی کلیساء سے وابستہ ٹھہراتے ہیں اس لیے کہ آخرالذکر قدیمی مسیحیت سے قریب ترین ہے جس کی وہ نمائندگی کے دعویدار ہیں -

عیسائی لوگ نہ معلوم کیوں اسلام قبول کرلیتے ہیں - اگرچہ اس کی مثالیں کم ہیں لیکن ہیں ضرور - امسال بعض تنگدست یورپین مسلمان ہوگئے - اردو کے ایک اخبار "چشمۂ علم" میں ان غریب یورپینوں کے اسلام قبول کرنے کے متعلق حالات بیان کئے گئے ہیں - یہ محتاج لوگ مدراس کی ایک مسجد میں جمع ہوے اور شریک اسلام ہونے کا اعلان کردیا اور نماز میں اس کے بعد دوسرے مسلمانوں کے ساتھ شرکت کی - اس مذکورۂ بالا اخبار کے مدیر نے یہ لکھا ہے کہ اور بعض دوسرے یورپینوں کا بھی یہی ارادہ تھا کہ اسلام قبول کرلیں، مکہ حج کے لئے جائیں اور اس طرح اپنا "پیٹ بھریں" —

ایک سوئٹزرلینڈ کے باشندے نے کمال کردیا - نہ صرف یہ کہ اس نے اسلام قبول کرلیا بلکہ اب وہ مشرقی لباس زیب تن کئے ہوے بلند یلکھنڈ میں تبلیغ کرتا پھرتا ہے - مجمعوں میں تقریریں کرتا ہے اور قرآن کے مطالب اردو میں بیان کرتا ہے حالانکہ اردو پر اسے قدرت حاصل نہیں* —

اب ہم ان ہمدردوں کا حال بیان کرتے ہیں جنہوں نے گزشتہ سال داعیٔ اجل کو لبیک کہا - میں سب سے پہلے ایک مشہور و معروف انگریز سر ہربرٹ ایڈورڈز کا ذکر کرتا ہوں جن کا گزشتہ دسمبر میں ۲۳ تاریخ کو انتقال ہوا - ان کی عمر صرف ۴۹ سال تھی - موصوف ایک حوصلہ مند فوجی آدمی تھے اور علم و فضل میں بھی ممتاز تھے - میں خاص کر سب سے پہلے موصوف کا ذکر اس لیے کر رہا ہوں کہ آپ کو ہندوستانی زبان سے خاص لگاؤ تھا - شملہ سے جو اردو اخبار نکلتا ہے وہ موصوف ہی کی سرپرستی میں شائع ہونا شروع ہوا تھا - اس اخبار کی زبان اردو ہے لیکن چونکہ چندہ دینے والوں میں کثرت ہندو لوگوں کی ہے اس لیے انہیں

* اودھ اخبار، مورخہ ۵ جنوری سنہ ۱۸۶۹ ع —

خوش کرنے کے لیے اس کی طباعت دیوناگری رسم خط میں ہوتی ہے - موصوف نے ایک نہایت عمدہ کتاب تصنیف کی تھی جس کا نام "پنجاب میں ایک سال" (A Year in the Punjab) ہے - میں نے یہ اعلان دیکھا تھا کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ عنقریب لاہور سے شائع ہونے والا ہے - موصوف نے "دہلی گزٹ" میں متعدد مضامین بھی تحریر کیے جو نہایت دلچسپ تھے - آپ نہایت پابند مذہب عیسائی تھے اور آپ کی دلی خواہش تھی کہ سب ہندوستانیوں کو متنرف بہ مسیحیت کریں - آپ نے حکومت کی مذہبی غیر جانبداری کے خلاف متعدد بار صداے احتجاج بلند کی اور حکومت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ اسے مسیحی مبلغوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے - موصوف ہی کی تحریک پران مدراس میں جہاں برطانوی نظم و نسق کی تعلیم دی جاتی ہے' انجیل کی تعلیم لازمی قرار دی گئی اس لئے کہ اس کی حیثیت کلاسکی ادب کی ہے - آج موصوف وہاں ہیں "جہاں بادل اور سایے کا وجود نہیں' اور جہاں آفتاب عدل کی قربت کے باعث ہم سر چشمۂ حقیقت کے دو بدو آجا سکتے ہیں" * —

پچھلے سال دو مشہور ہندوستانی اہل قلم نے دعوت اجل کو لبیک کہا - ایک رجب علی بیگ سرور ہیں جن کے انتقال کی خبر میں نے علیگڑھ کے "اخبار" مورخہ ۱۴ مئی میں پڑھی - موصوف نثرنگار کی حیثیت سے اپنے ہم عصروں میں امتیاز رکھتے تھے اور عام روش کے خلاف اپنی خیالی تصانیف کو نثر کے ذریعہ ظاہر کیا - موصوف کا شاہکار "فسانۂ

---

* مناجات پیرس —

عجائب" ہے جسے اہل ہند فرصت کے اوقات میں پڑھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔ اس کے سوا اور تصانیف بھی موصوف نے یادگار چھوڑی ہیں۔ آپ راجہ صاحب بنارس کے ہاں اعلیٰ خدمت پر مامور تھے اور راجہ صاحب آپ کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ دوسرے مشہور شخص اسداللہ خان غالب ہیں۔ آپ اسد بھی تخلص کرتے تھے۔ آپ کا سرور سے دو ماہ قبل ۷۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ موصوف اپنے زمانے کے بہترین انشاپرداز اور شاعر تصور کئے جاتے ہیں۔ اہل ہند کا خیال ہے کہ موصوف کی تصانیف ابدالاباد تک زندہ اور باقی رہیں گی —

علمی اور ادبی دنیا کی ان دو ممتاز شخصیتوں کے علاوہ دو اور ہیں جن کا گذشتہ سال انتقال ہوا اور جنھیں سیاسی حیثیت سے اہمیت حاصل ہے۔ نواب کریم شاہ برادر ٹیپو سلطان کی بیوہ کا ۱۷ اپریل سنہ ۱۸۶۹ ع کو انتقال ہوگیا۔ حیدر علی شاہ کے زمانہ میں موصوفہ کی شادی ہوئی تھی۔ انتقال کے وقت بیگم صاحبہ کی عمر ۱۱۴ سال تھی۔ اور آخر وقت تک ہوش و حواس برقرار رہے۔ فروری سنہ ۱۸۶۹ ع میں افضل الدولہ نظام الملک والیٔ حیدرآباد (دکن) نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آپ پابند مذہب مسلمان تھے۔ آپ کے ہاں چار سو حافظ قرآن کی تلاوت میں مصروف رہتے اور ۲۴۰ علما اسلامی علوم اور مسئلے مسائل کی تحقیق میں مشغول رہتے تھے۔ میر محبوب علی خان بہادر جو اس وقت بہت کم عمر ہیں، آپ کے تخت و تاج کے وارث ہیں۔ انگریزی حکومت کی سرپرستی میں (سر) سالار جنگ وزیر اعظم ریاست حیدرآباد انصرام مملکت کے فرائض بحیثیت ولی انجام دے رہے ہیں۔ اگرچہ نظام کو اپنی ریاست میں جو رقبہ میں انگلستان سے بڑی ہے، پوری آزادی حاصل ہے لیکن وہ انگریزی اقتدار کو تسلیم

کرتے ھیں- اس ریاست کی آبادی ایک کرور دس لاکھ ہے - اس ریاست کے باشندوں کی زبان دکنی اردو ہے - گولکنڈہ کسی زمانے میں اس ریاست کا پایہ تخت تھا اور ہیرے کی کانوں کے لیے تمام عالم میں مشہور تھا- اب یہاں ہیرے نہیں نکلتے- سندباد جہازی نے وادی گولکنڈہ کے دلفریب حالات کہانی کے طور پر بیان کئے ھیں لیکن دوسرے مشہور سیاحوں نے جو یہاں کا ذکر کیاہے وہ حقیقت پر مبنی ہے - چنانچہ مارکوپولو نے اپنے سفر نامے میں یہاں کے جو حالات بیان کئے ھیں انھیں ہم بطور مثال پیش کرسکتے ھیں -

بادشاہ ہویا کوئی عامی، موت ہر ایک کے لئے برحق ہے - عربوں کا مقولہ ہے " حاصل زندگی موت ہے " —

——)•(——

جدید روسی تھئیٹر

از

مولوی عزیز احمد صاحب

(۱)

تماشا پسندی روس کی زندگی کا ایک فطری عنصر ہے - مظاہرے، معاشری جلسے، تماشے، درباری تمثیلیں، ہمیشہ روسیوں کی اہم ترین مصروفیتیں رہیں - وہ دماغی خصوصیتیں، اور جسمانی اہلیتیں جو روسیوں کو عام دنیا سے، اور عام مذاق سے کسی قدر جداگانہ طرز خیال اور طرز عمل کا عادی بناتی رہتی ہیں، ان میں اظہار و تمثیل اور تماشا پسندی کے عناصر کو بھی برابر فروغ دیتی ہیں —

ہمیشہ سے روس کو تھئیٹر سے ایک فطری مناسبت رہی - روس کے درباری رقص اپنا جواب نہیں رکھتے - روس کا رئیس طبقۂ تھئیٹر کی سر پرستی میں ہمیشہ منہمک رہا - روسی دہقان تک اپنی دہقانی تمثیلوں میں جواب نہیں رکھتے - اور اب انقلاب کے بعد بھی اشتراکی روس نے تھئیٹر کو اپنے مسلک کی تبلیغ کے لئے انتخاب کیا —

روسیوں کا طرز خیال، عام یورپ کے طرز خیال سے ہمیشہ مختلف رہا - بہیمیت کا ایک خفیف سا جزو ہمیشہ روسی ذہن پر حاوی رہا - نفسیاتی تجزیہ ان کے ادب پر، اور ان کے فنون پر اس قدر چھا گیا کہ

اُن کے زاویۂ نگاہ کا ایک جزو بن گیا۔ یہی بہیمیت، اور یہی زاویۂ نگاہ روسی تھیٹر پر بھی اپنا مستقل اثر جمائے بغیر نہ رہ سکا ــ

ایک اور بہت بڑی خصوصیت جو روس کو دنیا کے تمام ممالک سے ممتاز کرتی ہے، حقیقت شعاری ہے۔ حقیقت نگاری کو روسیوں نے اپنے ادب میں مبالغہ کی حد تک بڑھا دیا۔ یہی حال ان کے فنون لطیفہ کا ہے۔ روسی حقیقت شعاری ہی نے روس کے تھیٹر کو اس مرتبہ تک پہنچا دیا کہ جس حد تک یورپ کے عام تھیٹر نے باوجود صدہا سال کے مسلسل ارتقا کے پرواز نہیں کی۔ پھر حقیقت شعاری کے متعلق ہمیشہ جدا جدا بلکہ اکثر متضاد نظریے پیدا ہوتے رہے۔ اِن متضاد نظریوں میں سے ہر ایک ایسا تھا کہ برابر کامیاب رہا ــ

باضابطہ روسی تھیٹر کی عمر سو سال سے زیادہ نہیں۔ یہ صرف شخصی دماغوں کی رفعت پرواز اور بلند خیال اور عام روسی فنکاروں کی صلاحیت کا نتیجہ ہے کہ روسی تھیٹر نے اس قدر کم مدت میں اتنی ترقی کی ــ

(۲)

استینلی سلاوسکی اور اس کا اثر

روسی تھیٹر میں حقیقت شعاری کے رجحان کا اصلی باعث روسی ڈراما نگار ہیں۔ آستروسکی (Ostrovsky) سے حقیقت شعاری کا آغاز ہوتا ہے۔ اور چیخوف میں یہ خصوصیت انتہا کو پہونچ جاتی ہے۔ ان ڈراما نگاروں کے شاہکاروں کو صداقت سے تمثیل کرنے میں سب سے پہلے اسی چیز کی ضرورت تھی کہ حتی الامکان حقیقت شعارانہ اسالیب تمثیل استعمال کیے جائیں۔ ایک شخصیت نے جس کو تھیٹر کی حد تک فوق البشر

کہا جاسکتا ہے اس حقیقت شعارانہ اسلوب کو کمال پر پہنچا دیا - میری مراد روس کے مشہور ڈائرکٹر اسٹینی سلاوسکی (Stanislavsky) سے ہے - جس نے تمثیلوں کو نقل کے درجے سے بہت بلند کر کے خود زندگی کا ایک حصہ بنا دیا تھا - تمثیلیں ' زندگی اور فطرت کا حقیقی نمونہ بن گئیں —

قدیم تھیٹر یکل اسالیب سے اس نے روسی تھیٹر کو بالکل پاک کردیا - پرانے طریقوں سے اسٹیج پر آنا ' ایک خاص لہجے میں باتیں ' خاص قسم کی حرکات — غرض وہ تمام چیزیں جن سے تصنع کا اظہار ہوتا تھا اس نے بالکل مٹادیں —

اس کی تمثیلوں کا سب سے بڑا اصول یہ تھا کہ تمثیل خود زندگی کا ایک حصہ معلوم ہو - آپ اپنے پورے حواس کے ساتھ یہ محسوس کریں کہ یہ اصلی واقعات ہیں ' کوئی فرضی قصہ نہیں ہے - اس تمثیل کا آپ سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے - یہ تماشہ آپ کو دکھلانے ' آپ کو خوش کرنے کے لیے نہیں پیش کیا جارہا ہے ' بلکہ یہ ایک اصلی فطری واقعہ ہے جو اسی طرح پیش آرہا ہے جیسے زندگی کے واقعات پیش آیا کرتے ہیں - اسباب و علل کی زنجیر آپ کے نزدیک قصے کے نشیب و فراز کو نہیں بلکہ زندگی کے اتار چڑھاو کو نمایاں کرتی ہے -

یہ اثر پیدا کرنے میں اسٹینی سلاوسکی کو کمال تھا - فطرت کی نامکمل نقل ہونے کے بجائے اس کی تمثیلیں عین فطرت کا ایک حصہ بن جاتی تھیں - اور یہ " فطری اثر " پیدا کرنا کوئی معمولی کام نہ تھا - سب سے پہلے تو یہ کہ ایک غیر معمولی مہتمم تمثیل اور ادا آموز کی ضرورت تھی ' جو ہر خفیف سی خفیف چیز کو اُس فطری ہم آہنگی کا

ایک حصہ بنادے۔ ذراسی فروگذاشت پوری تمثیل کے مجموعی اثر کو خاک میں ملاسکتی تھی - اس لیے ہر ذرا ذرا سے نکتے پر نگاہ رکھنا ' اور اس کو تمثیل کی حقیقت شعارانہ زنجیر میں منسلک کرنا اس کا بہت اہم فرض تھا۔

اس کامقصد یہ تھا کہ زندگی کے ہر رنگ کو' ہر فضا کو ہر شعبے کو انتہائی صداقت اور ہم آہنگی کے ساتھہ پیش کرے۔ اس کے لیے یہ چیزیں بہت ضروری تھیں —

(۱) اداکاروں (ایکٹروں) میں وہ نفسیاتی کیفیت پیدا کردی جائے کہ وہ بالکل کردار میں غرق ہو جائیں اور اس کی نمائندگی کرسکیں —

(۲) ایک ہم آہنگی پیدا کی جائے جو ہر ظاہری شے کو زندگی سے اور فطرت سے حتی الوسع مشابہ بنادے —

(۳) یہی ہم آہنگی تمثیل کے تمامتر ظاہری و باطنی عناصر میں پیدا کردی جائے کہ وحدت عمل' اور احساس وحدت ان میں بالکل طاری و ساری ہو جائے —

لیکن ان شرائط کو پورا کرنے میں اس قدر روحانی اور جسمانی محنت کی ضرورت تھی کہ جس کا اندازہ مشکل سے کیا جاسکتا تھا - استینی سلاوسکی کے اداکاروں کو جن نفسیاتی اصول کی پابندی کرنی پڑتی تھی وہ ان روحانی ریاضتوں سے کہیں زیادہ مشکل تھے ' جو زہاد اپنی عقبیٰ سنوارنے کے لیے کیا کرتے ہیں۔ ان اداکاروں کو اپنے فن سے اس قدر محبت تھی کہ جس قدر کسی روحانی پیشوا کو اپنی ریاضتوں سے ہوسکتی ہے - اپنے نفس پر اپنے فن کی خاطر جس قدر جبر وہ کرتے

تھے، اُنہیں کا حصہ تھا —

اسٹینلی سلاوسکی کا لائحۂ عمل یہ تھا - پہلے تو انتہائی محنت سے بہت بحث و مباحثے کے بعد کسی ڈرامائی شاہکار کو تمثیل کے لئے منتخب کیا جاتا - انتخاب کے بعد مہینوں تک ڈرامے کے متن میں یا عمل میں خفیف تغیر کا سلسلہ جاری رہتا - ایک آدھ سال تک اور بسا اوقات سالہا سال تک اُس کے مطالعے کا سلسلہ جاری رہتا - اس مطالعے کا مطلب یہ تھا کہ ہر اداکار ڈرامے کے ہر کردار کی ہستی کو پوری پوری طرح محسوس کرلے - صرف اُن واقعات تک کسی کردار سے اُن کا واسطہ محدود نہیں تھا جو ڈرامے کی روئداد کے دوران میں پیش آتے ہیں - بلکہ وہ اُس کردار کو زندگی کے ہر موقعے، ہر کیفیت، ہر حالت میں تصور کرتے تھے، اور اس کے جذبات، احساسات اور حرکات کو محسوس کرتے تھے —

پھر ان تمام محسوسات پر باہم تبادلۂ خیالات ہوتا تھا - وہ تمام تصورات جو اب تک انفرادی طور پر قائم ہوے تھے اب باہم بحث اور نفسیاتی تجزیے کے ذریعے تحلیل کئے جاتے تھے اور مجموعی طور پر ایک مجموعی اور مستقل تصور اُس کردار کا نشو و نما پاتا تھا - سالہا سال کی باطنی ریاضت، اور کامل توجہ کے بعد پہلے تو سایے کی طرح کردار کا تصور اُبھرتا تھا - پھر اس کے کچھہ کچھہ حرکات و سکنات تصور میں مادی شکل اختیار کرتے تھے - یہاں تک کہ آخرکار پورا کردار تصور میں ایک زندگی اختیار کرلیتا تھا - اور اداکار اُس زندگی میں جذب ہو جاتا تھا - اس طرح تمثیل کے لیے اُس کردار کی تخلیق ہوتی تھی - اور پھر اداکار اُس ذہنی تخلیق میں بالکل محو ہو جاتا تھا —

اپنے اداکاروں میں یہ روحانی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے اسٹینلی

سلاوسکی نے انتہائی سخت نفسیاتی تربیت کے اُصول رائج کئے تھے - مثلاً اگر کسی ڈرامے میں تنہائی کی فضا پیدا کرنا اُس کا مقصد ہوتا تو وہ اپنے اداکاروں کو دور اُفتادہ اضلاع اور ویران قلعوں اور جھونپڑوں میں منتشر کر دیتا اور دنیا بھر سے اُن کے تعلقات کو منقطع کر دیتا - یہاں تک کہ اُن کی ایک ایک حرکت، اُن کا تلفظ، اُن کا لہجہ، بلکہ اُن کا طرز خیال بھی ہر ممکن طریقے سے اُسی تنہائی کا اظہار کرنے لگتا - اگر تمثیل میں خوف، دہشت، یا رنج کا اثر ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا تو وہ بےدریغ ایسے ذرائع استعمال کرتا کہ اداکار وہی جذبات محسوس کریں، اور زندگی میں محسوس کرنے کا اثر تمثیل میں باقی رہے - یہی اُس کے کمال فن کا راز تھا - اِنہیں مہیب اور صبر آزما ذرایع کے استعمال کا یہ نتیجہ تھا کہ تمثیل میں نقل کا احساس بالکل باقی نہ رہتا بلکہ حقیقت اور تجربے کی فضا محیط ہو جاتی تھی - اداکار کا لہجہ، حرکت، جنبش یہاں تک کہ اُس کی نفسیاتی کیفیت، اُس کی دماغی حالت بالکل اُس کردار کی سی ہو جاتی —

خود اُس کا یہ حال تھا کہ خالی ہال میں کئی کئی گھنٹے وہ محض معمولی معمولی آوازوں کے امتحان اور اہتمام میں گذار دیتا — مثلاً گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز، یا پانی برسنے، یا اولے گرنے کی آوازوں میں حقیقت سے قربت پیدا کرنے میں اُس کے کئی کئی دن صرف ہو جاتے تھے -

اگر تمثیل ایک تقلیدی فن ہے تو شاید آج تک کوئی فن کار اُس فنی بلندی تک نہیں پہونچ سکا جس تک استینلی سلاوسکی پہونچ چکا ہے - اُس کی شخصیت نے نہ صرف روسی تھیٹر کو دنیا کا اہم ترین فنی ادارہ بنا دیا بلکہ خود فن تمثیل کو معراج کمال تک پہنچا دیا —

جدید روسی تھئیٹر کی تاریخ کا پہلا دور اُس کے نام اور اُس کے اثر سے وابستہ ہے - اشتراکیت کی مادہ پرستی نے اُس کے اسلوب کو مٹا دینے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا - پھر بھی اُس کا اسلوب فن نہ صرف زندہ ہے ' بلکہ تاریخ تمثیل میں چلد بہترین اسالیب میں شمار ہوتا ہے - جدید تھئیٹر کی شخصیتوں میں بجز ایڈورڈ گارڈن کریگ کے اور کوئی شخص اُس کا ہم پلہ نہیں —

روس میں اُس کے فن کو " ماہرین " کمپنی نے ' باقی و برقرار رکھا - اور اشتراکیت کے تیز و تند جھونکوں میں اُس کے اسلوب کا چراغ گل نہ ہونے پایا - ماہرین کمپنی اُ-ی کی قایم کی ہوئی تھی - روس سے زیادہ یورپ نے اُس کے اسالیب کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا - اگرچہ کہ پیروی کی ہمت نہیں کی - جدید روسی تھئیٹر کے دیگر مکاتیب کے بانی اور ناخدا بھی اکثر اسٹنلی سلاوسکی کے شاگرد ہیں - اُن کے نظریے بالکل متضاد سہی پھر بھی یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ اُنھوں نے اُسی کی آغوش تربیت میں نشو و نما پائی ہے —

(۳)

رد عمل - واختنگوف

اسٹنلی سلاوسکی کے اُصول ' اور اُن کے نتائج تھئیٹر کا معراج تھے - مگر طرز عمل کی دقتوں اور اُن تکلیفوں کی وجہ سے جو ان تمثیلوں کی تیاری میں پیش آتی تھیں ' ایک شدید رد عمل کا شروع ہونا بھی ناگزیر تھا - چنانچہ بہت جلد مختلف طریقوں پر رد عمل شروع ہو گیا —

رد عمل کا ایک باعث یہ بھی تھا کہ وہ نفسیاتی ریاضتیں ' جو اسٹنلی سلاوسکی نے اپنی تمثیلوں کے لیے اختیار کی تھیں ' اور اپنے اداکاروں پر

عائد کی تھیں زیادہ سے زیادہ محض " جذباتی اور نفسیاتی مصوری " پر ملتفت ہوتی تھیں - حقیقت شعاری کے اسالیب کی ایک آہنگی نے سب کو تھکا دیا تھا ' اور پھر اس حقیقت شعاری کا مدعا اور نتیجہ زیادہ سے زیادہ محض یہی تھا کہ زندگی کی نقل اس قدر کامل ہو کہ خود زندگی بن جائے - لیکن کیا صرف یہ اثر پیدا کرنے کے لئے وقت، محنت، ذہانت، اور عمل کی اس قدر قربانی جایز تھی؟

استینی سلاوسکی هی کے دو شاگردوں واختنگوف (Vaktangov) اور میئر ہولڈ (Mayerhold) نے بالکل مختلف طریقوں پر رد عمل کی تحریکیں شروع کیں - اِن دونوں کے اصول و اسالیب میں باہم زمین و آسماں کا فرق تھا - واختنگوف کبھی سیاسی اُلجھنوں میں گرفتار نہیں ہوا اور اُس کا مکتب فن کاری کا جمالیاتی گہوارہ رہا - میئر ہولڈ نے انقلابی تھیئٹر کا سنگ بنیاد رکھا اور سیاسی تحریکوں کے لئے تھیئٹر کو استعمال کرنا شروع کر دیا —

واختنگوف نے تھیئٹر کو حقیقت شعاری کے اس پرانے ' تھکا دینے والے اسلوب سے نجات دلانے کی کوشش کی - اُس نے نفسیاتی تجزیے کی باریکیوں کو فراموش کر دینا چاہا اور بجائے اس کے تھیئٹر کو اپنے جمالیاتی اسلوب سے ایک " افسانہ نما حقیقت " میں تبدیل کر دینے کی کوشش کی - وہ حاضرین اور سامعین سے کوئی چیز چھپانا نہیں چاہتا تھا - اداکار اپنے معمولی لباس میں آتے ' حاضرین کا خیر مقدم کرتے ' اسٹیج پر پہنچ کر وہ کپڑے پہن لیتے جو اس تمثیل کے کرداروں کے لئے ضروری تھے اور اس طرح حاضرین کی موجودگی میں اپنے آپ کو بدل کر ڈرامے کے کرداروں کا روپ اختیار کر لیتے —

یہ اسلوب جس کو واختنگوف نے " تھیئٹر کی افسانہ نما حقیقت " کہا

ہے ' بہت قابل غور ہے - واختنگوف نے تھیٹر کے اصلی بنیادی اصولوں پر اپنے نظریے کی بنیاد رکھی ہے - تھیٹر کی اصل محض نقل ہے - آپ سب جانتے ہیں کہ آپ کے سامنے ایک شخص کسی اور شخص کی نقل کررہا ہے - مگر آپ اِس وجہ سے مسرور ہوتے ہیں کہ وہ بہت اچھی نقل کررہا ہے - تو جب نقل ہی دلچسپی کو برانگیختہ کرنے والی چیز ہے تو اس کی کیا ضرورت کہ آپ کو یہ دھوکا دیا جائے کہ یہ نقل نہیں اصل ہے؟ آپ سے ہر چیز کیوں چھپائی جائے ؟ اور آپ کو بجائے مسرور کرنے کے مسحور کرنے کے ذرائع کیوں اختیار کئے جائیں ؟ اگر اداکار اپنے فن میں کامل ہیں تو باوجود اس کے کہ وہ آپ کے سامنے بھیس بدل چکے ہیں ' محض اپنے کمال فن سے آپ کو متاثر کرسکتے ہیں ' ہنسا سکتے ہیں ' رلا سکتے ہیں —

یہ اسلوب واختنگوف کا اختراع کردہ نہیں تھا - بلکہ قدیم یونانی اور ہندوستانی تھیٹر کی ایک ترقی یافتہ صورت تھی - ہندوستان قدیم کے پرانے ناٹک جس طرح کھلے میدانوں میں یا درختوں کے نیچے تمثیل کئے جاتے یا جس طرح اتھنہ وغیرہ میں کھلے ہوے تھیٹر میں ایسے استیج پر جس کے چاروں طرف حاضرین ' کی نشستیں ہوتی تھیں ' ایسکائی لس اور یور یپڈیز کے ڈرامے ایکٹ کئے جاتے تھے - اسی طرح بیسویں صدی میں ان تمام ذرائع کو استعمال کرکے ' جو ترقی یافتہ تھیٹر کے لئے ضروری ہیں ' واختنگوف نے بھی اپنے حاضرین پر وہی کیفیت طاری کرنے کا انتظام کیا تھا - اور اس طرح وہ تصنع کی فضا جو حقیقت شعاری کے اسالیب پر کہر کی طرح چھائی ہوئی ہے ' اس کے اُصول کی وجہ سے بالکل صاف ہوجاتی ہے —

کمال نقل واختنگوف کے اسلوب کی جان ہے - اُس کی تمثیلیں معاشری جلسے معلوم ہوتے ہیں - اُس کے اسلوب کا نتیجہ یہ ہے کہ تمثیل حقیقت میں بدل

جاتی ہے اور حقیقت تمثیل میں- اور حقیقت اور تمثیل میں امتیاز مشکل ہوجاتا ہے-

(۴)

"ہابرین" جماعت - اور اُس کا فن -

لیکن واختنگوف کا سب سے بڑا کارنامہ یہودی اداکاروں کی اُس جماعت کا نشو و نما ہے جو "ہابرین" کہلاتی ہے - یہودیوں کی ایک جماعت جو ہجرت کر کے روس آئی تھی ' اُن صلاحیتوں سے مالا مال تھی جو استینی سلاوسکی کی نظر میں نفسیاتی اداکاری کے لئے ضروری ہیں - استینی سلاوسکی نے ان کے مذہبی غلو میں وہ نفسیاتی صلاحیتیں تلاش کر لیں جو اُس کے اسلوب کے لیے ضروری تھیں - اُن کی روحانی ریاضت کو اُس نے تھئیٹر کی طرف منتقل کرلیا - اِس کام کے لئے اُس نے اپنے شاگرد واختنگوف کو انتخاب کیا - واختنگوف عبرانی زبان کا ایک حرف بھی نہیں جانتا تھا ' پھر بھی اُن کی روحانی صلاحیتوں کو جلا دیکر اُس نے اُن کو اداکاروں کی اُس جماعت میں تبدیل کردیا جو آج اپنے فن کے لحاظ سے عدیم المثال ہے - سات سال کی انتہائی سخت پابندیوں اور قیود کے بعد یہ جماعت اِس قابل سمجھی گئی کہ اِسے تھئیٹر کے فن کی تعلیم دی جائے —

یہودیوں کی روحانی صلاحیتیں ' جب روسی تھئیٹر کے حقیقت شعارانہ نفسیاتی اسالیب کے قالب میں ڈھال لی گئیں تو قدیم و جدید عناصر کی اِس یکجائی کا نتیجہ بہت اُمید افزا نکلا - اِن دونوں قوموں کی خصوصیات ' جن میں بعدالمشرقین تھا ' جب یکجا ہوگئیں تو ایک ایسا فنکارانہ اسلوب پیدا ہوا کہ جو آج تک باوجود اشترا کی تھئیٹر کے شور و شر اور مادہ پرستی کے روس میں استینی سلاوسکی اور واختنگوف کے فن کو زندہ کئے ہے - محض اس جماعت کی وجہ سے ماسکو' تھئیٹر

کے متعلمین، اور متعلقین کے لیے ایک ضروری درس گاہ اور زیارت گاہ ہے —

انتہائی نفس کشی کے ساتھہ "ماہرین" جماعت کے افراد وہ تمام تکلیفیں جھیلتے ہیں، جن کی وجہ سے اُن کے فن میں صداقت پیدا ہو سکے - تمام غیر متعلقہ عناصر سے اپنے نفس کو پاک کرکے، اُس نفسیاتی کیفیت کو پیدا کرنے کی سعی کرتے ہیں جو اُن کے فن کے لیے ضروری ہے - اور اِن کوششوں میں صرف اہم اداکاروں ہی کو راہبانہ اور بے لطف زندگی گذارنے پر مجبور نہیں ہونا پڑتا بلکہ معمولی معمولی اداکاروں کو بھی جو محض چھوٹے چھوٹے کرداروں کی نمائندگی کرتے ہیں تمام دلچسپ مصروفیتوں کو ترک کردینا پڑتا ہے - کیونکہ کامل اور حقیقی اداکاری کی روحانی نفسیات کی فضا پیدا کرنے کے لیے روحانی قوتوں اور صفائے قلب کے مکمل استعمال کی ضرورت ہے —

برسوں تک ایک ڈرامے کی مشق کی جاتی ہے - اور انتہائی صبر و استقلال کے ساتھہ ایک ایک لفظ، اور ایک ایک حرکت کی گہرائی کو محسوس کیا جاتا ہے - جس محنت سے فرانس کا مشہور ادیب گستاف فلابیر (Gustav Flaubert) ہر ہر لفظ پر غور کرتا تھا کہ کیا یہی وہ صحیح لفظ ہے جو اُس خاص معنی کی، جو اُس کے دماغ میں ہیں، ترجمانی کرسکتا ہے؟ جس طرح اُس کے خیال میں ایک اور صرف ایک لفظ اُس خیال کو صحیح طور پر ادا کرسکتا تھا، اور وہ اُس لفظ کی تلاش میں انتہائی دماغی ریاضت سے کام لیتا تھا، بالکل اُسی طرح اِس جماعت کا ہر ہر فرد ایک ایک لفظ، ایک ایک جملے کے صحیح طرز ادا کی فکر میں گھنٹوں غرق رہتا ہے - اور ہر ہر حرکت کا صحیح طریقہ ڈھونڈھنے اور سوچنے میں حتی الامکان دماغی محنت، اور زیادہ سے زیادہ وقت صرف کرتا ہے -

چھہ مہینے تک یہ نظام العمل رہتا ہے کہ ہر ادا کار اپنے ڈسک پر بیٹھا رہتا ہے - ڈرامہ پڑہ کر سنایا جاتا ہے اور اُس پر دن رات بحث ہوتی ہے - ہر ادا کار اپنی راے کا اظہار کرتا اور نئے نئے طریقے سونچتا ہے - اس طرح پہلے انفرادی تصورات قائم کئے جاتے ہیں جو مکمل مباحثوں کے بعد ایک "اجتماعی تصور" میں تحلیل ہوجاتے ہیں —

اُس کے بعد پھر انفرادی تصورات کا بلند تر سلسلہ شروع ہوتا ہے جس میں ہر ادا کار اپنے کردار کے ہر پہلو پر غور کر کے اُسے مکمل طور پر محسوس کرنے اور پوری قدرت کے ساتھہ اُس کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے - ان کوششوں میں مزید چہہ مہینے صرف ہو جاتے ہیں - اسی دوران میں اہم کرداروں کے متعلق بحث بھی ہوتی ہے —

جب کرداروں کی تقسیم کا وقت آتا ہے تو اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ کون شخص کس کردار کو بہترین طریقے پر محسوس کر چکا ہے اور اُس کے اظہار کی پوری قدرت رکھتا ہے - ان تمام چیزوں کا لحاظ رکھہ کے کرداروں کی تقسیم کی جاتی ہے - اس طرح مشق شروع ہونے سے پہلے ایک سال محض ان ابتدائی تیاریوں میں گذار دیا جاتا ہے —

ان ابتدائی منازل کے بعد جب تمثیل کی مشق کا وقت آتا ہے تو مہتمم تمثیل' ہر چیز پر حاوی ہوجاتا ہے' اور تمثیل کے تمام تر عناصر ترکیب کو ترتیب دینا شروع کرتا ہے تاکہ وہی حقیقت شعارانہ ہم آہنگی پیدا ہوسکے جو اس جماعت کی منتہاے نظر ہے - ادا کار' منظر کش مصور' موسیقی نگار اور دوسرے تمام عناصر تخلیق اس کے اشاروں پر کام کرتے ہیں —

مناظر کا مصور' مشق کی تمام تر مجلسوں میں موجود رہتا ہے' اور

اُس وقت تک اپنا کام شروع نہیں کرتا جب تک تمثیل کی روح عمل کو سمجھہ نہ لے- اور اس کے بعد وہ پردوں پر اپنے فن سے ڈرامے کی روح عمل کی ایک خاص نقطۂ نظر سے نقاشی کرتا ہے- اسی طرح موسیقی نگار کا فرض یہ ہے کہ وہ ڈرامے کی ہر چیز کو پیش نظر رکھہ کے اپنے نغمے موزوں کرے' جو بجائے خود مستقل طور پر ڈرامے کی روح عمل کو موسیقیانہ اسلوب سے دھراتے رہیں —

اسی طرح ملبوسات' اور سامان آرائش کے انتظام میں بھی خاص اہتمام کیا جاتا ہے- اور جملہ ادا کاروں کی متفقہ رائے لی جاتی ہے —

(۵)

تائروف اور مذاقیہ تمثیلیں

استینی سلاوسکی کی سخت حقیقت شعاری کے خلاف جہاد کرنے والوں میں ایک مشہور فن کار تائروف (Tairov) ہے' جس نے تھیٹر کی فضا کو بدلنے کے لیے مذاق کا عنصر نمایاں کرنے کی کوشش کی - اُس کے اسلوب تمثیل میں نفسیاتی تجزیے اپنی شکل بدل کر محض مذاقیہ مظاہرے بن جاتے ہیں- اِس مذاقیہ اسلوب کی بنیاد "مثالیت" (Symbolism) پر رکھی گئی ہے- اور اس مثالیت کو مذاق کا رنگ دیدیا گیا ہے- اس کے تھیٹر میں ادا کار عجیب و غریب حرکات' اور رنگ برنگ ملبوسات کی فضا میں ایک خاص اثر پیدا کرتا ہے- ان قہقہوں کی تہہ میں جو ان تمثیلوں کا ظاہری نتیجہ ہیں' انتہائی گہرے تاثرات' اور احساسات حاضرین کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں- اس طرح تائروف نے اس "جدید روسی طرز ادا" کی بنیاد ڈالی جس کو اشتراکی تھیٹر نے بھی اپنے لیے انتخاب کیا- لیکن بجائے خود اس کا اپنا تھیٹر اور اُس کا مکتب تمام سیاسی شورشوں

اور اشتراکی تحریکوں سے ہمیشہ پاک رہا۔ اس حیثیت سے اُس کا اور واختنگوف کا کردار، اور ان دونوں کی صداقت قابل تحسین ہے کہ انہوں نے اپنے اسالیب فن کو سیاسی مصالح کا شکار نہیں ہونے دیا —

(۶)

اشتراکی تھیٹر

انقلاب روس کی ذمہ دار شخصیتوں نے شروع ہی سے تھیٹر کی اہمیت کو محسوس کرلیا تھا۔ اور اس امر کو اچھی طرح جان گئے تھے کہ اُن کے سیاسی اُصول کی تبلیغ کا بہترین ذریعہ بننے کی صلاحیت، تھیٹر میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اِس لیے اُنہوں نے کوشش شروع کردی کہ تھیٹر کو اشتراکی تبلیغ کے لیے استعمال کریں —

"اکتوبر تھیٹر" اس سلسلے کی سب سے پہلی کوشش تھی۔ وجہ تسمیہ محض یہ تھی کہ اِس میں اکتوبر کے انقلاب کے واقعات کی تمثیلیں پروپا گنڈا کے طور پر پیش کی جاتی تھیں —

تھیٹر کے لیے حکم نافذ کیا گیا کہ قدیم متمدن اور متمول طبقے کے محبوب اسالیب تمثیل کے خلاف جہاد کیا جائے۔ اور اُن تمام تمثیلی اِداروں کی مخالفت کا علم بلند کیا جائے جو سیاسیات اور اشتراکیت سے بے تعلق ہیں —

میئر ہولڈ (Mayerhold) نے جو اشتراکی تھیٹر کا بانی ہے، سارے ملک کے تھیٹروں کو فوجی حلقوں کی طرح کئی حلقوں میں منقسم کردیا تاکہ سارے ملک میں ان کے ذریعے پروپا گنڈا ہوسکے۔ "اکتوبر تھیٹر" تقریباً فوجی تھیٹر تھے۔ تمثیلوں میں فوجی عنصر نہ صرف نمایاں رہتا تھا، بلکہ اس کا کام یہ بھی تھا کہ ممکن ذریعے سے قدیم تھیٹر کے خلاف جہاد کرے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جملہ جمالیاتی لطافتوں، فنی خوبیوں سے ملک کے عام مذاق کو بیگانہ کرنے کی انتہائی سعی کی جانے لگی- مقصد محض یہ تھا کہ تھیٹر کی جمالیاتی اور فن کارانہ خصوصیتوں کو مٹا کر اس کو اشتراکیت کی نشر و تبلیغ کا ایک ذریعہ بنا دیا جاے- فن اور جمالیاتی خوبیوں کی ذاتی دلکشیوں کی طرف توجہ نہ کی جاے- فن کا مقصد محض فن نہ رہے بلکہ وہ ان کے مقصد خاص کا آلۂ کار بن جاے- اشتراکی تھیٹر کی ارتقا کے ساتھہ ساتھہ اس مدعا میں بھی خفیف خفیف تبدیلیاں ہوتی رہیں- رفتہ رفتہ اس کا احساس ہونے لگا کہ صرف قدیم تھیٹر کے خلاف جہاد کافی نہیں- ضرورت اس کی ہے کہ نئے نئے اسالیب اختیار کئے جائیں جن کے باعث اشتراکی تبلیغ میں ترغیب اور دلچسپی کا عنصر بہت بڑھ جاے- چنانچہ اس قسم کے اسالیب اختیار کیے گیے جن میں باوجود دلچسپی اور دلکشی کے اصلی مقاصد یعنی اشتراکیت کی نشر و تبلیغ کا پورا لحاظ رکھا گیا- بلا استثنا ہر ڈرامہ جو اشتراکی تھیٹر میں تمثیل کیا جاتا ہے، اشتراکی پروپا گنڈا کا ذریعہ بنایا جاتا ہے —

اس موجودہ اشتراکی تھیٹر کا صحیح تصور قایم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جدید روس کی فضا سے آگاہی ہو- تھیٹر میں اشتراکیت کی فضا زندگی سے بھی زیادہ نمایاں معلوم ہوتی ہے —

اشتراکی تھیٹر کا اسلوب دنیا کے ہر ممکن اسلوب سے مختلف ہے- "جسمانیت" اور "مشین پرست" کا جیسا بیزار کن مظاہرہ اشتراکی تھیٹر میں ہوتا ہے، سواے روسیوں کے اور دنیا کے کسی حصے کی پبلک شاید ہی اس کی تاب لا سکے- اسٹیج مشینوں، آلات حرب، اور دیگر آلات سے

آراستہ ہوتا ہے۔ تھئیٹر کی آرائش تک میں اقلیدس کی شکلوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اداکاروں کی حرکت میں مشینوں کی حرکت سے مشابہت پائی جاتی ہے اور پوری کوشش اس امر کے لیے ہوتی ہے کہ تھئیٹر بھی ایک مشین معلوم ہو۔ ایک مکمل بالشویک مشین ــ

(۷)

میئر ہولڈ اور اس کا فن

اِس اِنقلابی اور اشترا کی تھئیٹر کا اصلی بانی استنیلی سلاوسکی کا مشہور شاگرد میئر ہولڈ ہے۔ اُسی نے تھئیٹر میں اشتراکیت کی تبلیغ کی صلاحیت پیدا کی۔ اور اُس کے فن سے اُس کی ذہانت کا پتہ چلتا ہے۔ سب سے پہلے تو اُس نے ایک طرح کی "مثالیت" پیدا کرنے کی کوشش کی اور تائروف کی طرح ایک حد تک اس اسلوب میں کامیاب بھی رہا۔ پھر اُس نے تھئیٹر میں "مشین پرستی" کی وہ فضا پیدا کی۔ جو آج روسی تھئیٹر کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ خود اس کو اپنی کوششوں میں شاید زیادہ کامیابی نہ ہو سکتی اور اُس کا چراغ واختنگوف کی جمالیاتی کوششوں کے مقابلے میں نہ جل سکتا مگر اُس کو انقلابیوں نے پوری پوری مدد دی۔ سویت حکومت نے اس کے تھئیٹر کو نہ صرف ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں بلکہ اُسے اپنی سیاسی تبلیغ کا ایک مستقل جزو قرار دیا۔ میئر ہولڈ کا تھئیٹر اشتراکیت کی تبلیغ کا فن کارانہ مرکز بن گیا ــ

سنہ ۱۹۲۱ع میں میئر ہولڈ اور اُس کے ساتھی درشوین (Dershavin) نے اداکاری کے سرکاری "کارخانوں" کی بنیاد ڈالی ــ

میئر ہولڈ کے فن کے اہم اُصول یہ ہیں:

(۱) جسمانی تربیت، اور آزاد حرکتیں جن کا مقصد استنیلی سلاوسکی کے

روحانی نفسیاتی أصول کا رد عمل ہے —

(۲) حرکات انسانی ' اور مشینوں میں ایک قسم کی مشابہت پیدا کرنا جس کا مقصد یہ ہے کہ بنی نوع انسان بھی مجموعی طور پر ایک مشین کی طرح کام کرے —

(۳) اداکاری کے جمالیاتی اور نفسیاتی أصول کے خلاف جہاد —

(۴) تھئیٹر میں کارل مارکس کے اس نظریے کو عمل میں لانا کہ ہر شے " غیر شخصی " اور " اجتماعی " ہو - میئر ہولڈ کا مقصد صرف ایک ہے یعنی ان تمام ذرایع سے اشتراکیت کی تبلیغ - اپنے نظریوں کی تاویل میں میئر ہولڈ نے استینی سلاوسکی کے اصول پر کئی اعتراضات کئے ہیں - سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ استینی سلاوسکی کے یہاں نفسیاتی کیفیتوں کے پیدا کرنے میں روحانی قوت بہت زیادہ صرف کی جاتی ہے ' لیکن تھئیٹر محض جسمانی مظاہرے کا فن ہے - اسی اعتراض کو رد عمل کی وجہ بنا کے جسمانی مظاہروں کو اُس نے اپنے نظریے میں بہت زیادہ اہمیت دی ہے - " جسمانی مظاہرے " سے میئر ہولڈ کی مراد یہ ہے کہ حاضرین کی توجہ بجائے اداکار کی جذباتی یا نفسیاتی کیفیت کے اُس کے ظاہری حرکات ' اس کے جسم کی جنبش کی طرف منعطف رہے - اور تمثیل میں جو کچھ اثر پیدا ہو وہ اداکار کی ظاہری ' جسمانی جنبشوں ' اور حرکتوں سے پیدا ہو —

اِس مقصد کے لئے میئر ہولڈ نے شدید ریاضت جسمانی کو اپنے اسلوب کے لئے ضروری قرار دیا تاکہ اداکار اپنے جذبات کی ترجمانی محض اپنی حرکات و سکنات سے کر سکے - اُس کو اِس بات کا بھی دعویٰ ہے کہ یہ جسمانی ریاضتیں اداکاروں ' اور حاضرین ' دونوں کے لئے صحت بخش اور مفید

ثابت ہوں گی - اور ان جسمانی ریاضتوں کی وجہ سے ملک اور معاشرے میں صحت کا ایک اثر پھیلتا جائے گا - وہ مشین نما حرکات و سکنات جو اس کے اداکاروں کی طریق اظہار ہوں ' انہی جسمانی ریاضتوں کا نتیجہ ہیں —

اس کے اس اسلوب کا ملک کے سیاسی رجحانات سے بہت اہم تعلق ہے - اور اسی وجہ سے میئر ہولڈ کے فن کے اس پہلو کو ایک ہم ملکی اور معاشری خدمت قرار دیا جاتا ہے کہ وہ تھیٹر کے ذریعے عوام الناس کی جسمانی نشوونما کی کوشش کر رہا ہے —

لیکن میئر ہولڈ کی کوششوں کا سب سے اہم ' اور سب سے زیادہ قابل غور حصہ ' اس کا یہ نظریہ ہے کہ تھیٹر میں " اجتماعی ' اثر پیدا کیا جائے - شخصی نفسیات کا کوئی لحاظ نہ کیا جائے - شخصی خصوصیات کو فنا کر دینا ' اور بنی نوع انسان کے "اجتماع ' کو اصلی اہمیت دینا اشتراکی مشرب کا ایک بہت اہم جزو ہے - اس اشتراکی اصول کو پوری پابندی کے ساتھ تھیٹر پر منطبق کرنے کی کوشش کس حد تک جائز ہے - تمثیل بجائے خود ایک مجموعی اثر کا نام ہے لیکن یہ مجموعی اثر انفرادی نفسیاتی کیفیتوں کی یکجائی سے پیدا ہوتا ہے - اگر انفرادی نفسیاتی کیفیتیں فنا کر دی جائیں ' تو مجموعی اثر میں حقیقت اور فطرت کا نشان تک باقی نہیں رہتا - اس طرح جو مجموعی یا اجتماعی اثر میئر ہولڈ کی کوششوں سے پیدا ہوتا ہے اس پر سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ اس کو فطرت اور حقیقت سے کوئی علاقہ نہیں - اس طرح تھیٹر فریب و دروغ کا ایک ہیولیٰ بن کے رہ جاتا ہے —

لیکن سیاسی مصلحتوں ' اور تبلیغ کی ضرورتوں کی وجہ سے جو اسالیب

اختیار کیے جاسکتے ہیں، ان کے لیے میئر ہولڈ خالص جمالیاتی اعتراض کی کوئی پروا نہیں کرتا - چونکہ "اجتماعی کیفیت" اشتراکیت کا اہم جزو ہے، اس لیے اس کے نزدیک یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے تھیٹر کا بنیادی اصول یہی رہے —

اسی طرح تھیٹر کے مناظر اور سامان آرائش، سے اس نے ہر اس چیز کو خارج کردیا جس کا کوئی عملی اثر حاضرین پر نہیں پڑ سکتا - جمالیاتی اثر اور ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے زیبائش و آرائش کو وہ جائز نہیں سمجھتا - ہر چیز جو اسٹیج پر نظر آئے اشتراکیت کا اشتہار ہو -

اس کے نزدیک تھیٹر زندگی کی نقل کا نام نہیں - بلکہ تھیٹر ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے زندگی پر اثر ڈالا جاسکے - یہی وہ نظریہ ہے جس پر اشتراکی تھیٹر کی بنیادیں قائم ہیں —

اور اسی نظریے کی بنا پر اس نے روسی تھیٹر کو نہ محض تفریح کا بننے دیا اور نہ انسان کی زندگی کی نقل بنا رہنے دیا - اس کا تھیٹر ایک دلچسپ مکتب ہے، جس میں اشتراکیت کی تعلیم دی جاتی ہے -

(۸)

فاریگر - اور آئی سن سٹاین

میئر ہولڈ کے ساتھیوں میں ایک گروہ انتہا پسندوں کا بھی ہے جنھوں نے اشتراکی تبلیغ کو تھیٹر کا اہم ترین فرض قرار دے کے روسی تھیٹر کی مٹی پلید کردی ہے - تصنع اس حد کو پہنچ گیا ہے کہ ادا کاری محض مسخرے پن کی حد تک محدود رہ گئی ہے —

اس طبقے میں قابل ذکر شخصیت صرف ایک ہے یعنی فاریگر (Forregger) جس نے پرولٹ کلٹ (Proletcult) کمپنی اور پروجکشن

تھیٹر (Projection theatre) کی بنیاد ڈالی ہے - فاریگر کی تمثیلیں سرکس کے تماشے بن کر رہ گئی ہیں - ادا کاری کے بجائے کود پھاند ہوا کرتی ہے یا جسمانی ریاضتیں ہوتی ہیں - مذاق اکثر بہت بھونڈا ہوتا ہے —

فاریگر کے سوا اگر کسی اور شخص کا ذکر اس ضمن میں کیا جاسکتا ہے تو وہ آئی سن سٹاین (Eisenstien) ہے جو تھیٹر کی طرح سنیما میں بھی بہت اہمیت رکھتا ہے - تھیٹر کی حد تک تو یہ کہ ایک زمانے میں اس نے انتہا پسندی کی انتہا کردی تھی- اور اس کے اداکار محض بھاند ہو کر رہ گئے تھے مگر اس کے بعد سنیما نے اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر کے اُس کے اسلوب کو کسی قدر بدل دیا —

اس گروہ نے تھیٹر میں ایک طرح کی بہیمیت کا اثر پیدا کر دیا - خفیف سی بہیمیت روسی طبائع کا ہمیشہ سے خاصہ رہی ہے - اس وحشی پن کو روسی تھیٹر ہمیشہ ظاہر کرتا رہا ہے - مگر انتہا پسندوں کے اس گروہ نے بہیمیت کے اس عنصر کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ روس کی عام پبلک کے مذاق پر اس کا اثر بہت برا پڑ رہا ہے —

(۹)

تبلیغ اشتراکیت کے تمثیلی مظاہرے

چونکہ روسی ذہنیت کو تھیٹر سے ایک خاص مناسبت تھی ' اس لیے اشتراکیوں نے صرف باقاعدہ تھیٹر ہی کو اپنا آلہ کار نہیں بنایا بلکہ خود شہری زندگی کو تھیٹر کے رنگ میں رنگنے کی کوشش کی - اس مقصد کے لیے تمثیلی مظاہرے کیے جانے لگے' جن میں ہر طرح سڑکوں پر' شاہراہوں' مکانات میں اشتراکیت کی تبلیغ انتہائی دلچسپ طریقوں سے کی جاتی

ہے - ان تماشوں کے دیکھنے والے بھی وہی ہوتے ہیں جو ان تماشوں میں کسی نہ کسی طرح حصہ لیتے ہیں - ان مظاہروں میں شہر کی پوری آبادی شریک ہوتی ہے - جوق در جوق لوگ جلوسوں میں نکلتے ہیں - نمائشیں ہوتی ہیں - جشن ہوتے ہیں - ہر فرد خود تماشے کا ایک جزو بھی ہوتا ہے اور تماشے میں حصہ بھی لیتا ہے - حکومت ان مظاہروں میں غیر معمولی دلچسپی لیتی ہے - سرکاری عہدہ دار جا بجا تقریریں کرتے ہیں —

سب سے پہلے مصنفوں، تھئیٹر کے منتظموں، مصوروں، سنگتراشوں، اور مغنیوں کا ایک گروہ بڑی محنت اور جانفشانی سے مظاہرے کا نظام العمل بناتا ہے - اور "اجتماع" کی اس تمثیل کے لیے مناظر و مقامات کا انتخاب و انتظام کرتا ہے - یہ مظاہرے اشترا کی تمدن اور اشترا کی مذہب کے بہت اہم نمونے ہوتے ہیں، حکومت اور عوام الناس دوش بدوش ان کی کامیابی میں حصہ لیتے ہیں - ہر قسم کی دلچسپیاں جمع کردی جاتی ہیں - اور پورا "اجتماع" اِن میں حصہ لیتا ہے اور اِن سے لطف اندوز ہوتا ہے - تہہ میں ان کا مقصد محض یہ ہے کہ اشتراکی جوش پھیلایا جائے —

تھئیٹریکل تمثیلیں ہوتی ہیں - تقریریں کی جاتی ہیں، انقلابی گیت گائے جاتے ہیں - آرکسٹرا اشتراکی موسیقی کے نغمے سناتا ہے - بڑے بڑے شعرا اپنا کلام سناتے ہیں - سرکاری دفاتر کے جھروکوں سے عوام الناس کے لیڈر مجمعوں کو مخاطب کرتے ہیں - مصوری، سنگتراشی، اور مصنوعات کی نمائشیں ہوتی ہیں —

کھلم کھلا سیاسی تبلیغ بھی کی جاتی ہے - ملک کی معاشی حالت سے عوام کو آگاہ کیا جاتا ہے - مشینوں اور آلات کی نمائش بہت بڑے

پیمانے پر ہوتی ہے - مختلف پیشوں کے متعلق ہدایتیں کی جاتی ہیں - زرعی اور صنعتی نمائشیں بھی ہوتی ہیں —

سب سے بڑھ کر یہ کہ انفرادیت کو فنا کرنے کی انتہائی کوشش کی جاتی ہے - ان مظاہروں میں ہر مذاق اور ہر ذہنیت کے آدمیوں کے لیے دلچسپی کا سامان ہوتا ہے - سب اس میں انتہائی ذوق سے مل جل کر حصہ لیتے ہیں - اور جوش و خروش کی اس کیفیت میں "اشتراکیت" کی فضا خود بخود پیدا ہو جاتی ہے —

ان مظاہروں کے بانی کا نام نکولائی ایوریلوف (Nikolai Everinov) ہے -

(۱۰)

اشتراکی آپیرا

اشتراکیت نے اپنا تباہ کن اثر روسی موسیقی اور آپیرا پر بھی ڈالا - درباری سرپرستی کی وجہ سے رقص و موسیقی روس میں بہت ترقی کرتے رہے - چنانچہ "کاساک" اور "تاتاری" رقص اور موسیقی کے اسالیب دنیا بھر میں بہت پسند کئے جاتے ہیں - اگرچہ کہ روس میں صاحب دماغ نغمہ نگار بہت کم پیدا ہوے مگر فنکار بہت کثرت سے پیدا ہوے اور دنیا بھر میں اُن کی شہرت ہے - اینا پنلونا (Anna Pavlena) اولگا سیکوا (Olga Tscekova) کے نام تھیٹر کی تاریخوں میں ہمیشہ باقی رہیں گے —

لیکن اُس "مشین پرستی" نے جو روسی تھیٹر کو محض مصنوعی تماشا گاہ بنا چکی تھی، جب آپیرا پر اپنا قبضہ جمانا چاہا تو نتیجہ نسبتاً بہت تباہ کن ثابت ہوا - موسیقی سے زندگی پر اثر پڑ تو سکتا ہے - لیکن موسیقی میں اس قسم کا اثر پیدا کرنا کہ انسانوں کو ایک متحد

مشین بنا دے، اُصول فطرت کے بالکل خلاف ہے —

بہر حال جب اشتراکی نظریوں کی بنا پر اشتراکی موسیقی اور اشتراکی آپیرا کی تعمیر کا سوال پیدا ہوا تو سب سے پہلا تصرف یہ کیا گیا کہ آرکسترا میں سے کنڈکٹر (Conductor) کو نکال دیا گیا - کیونکہ فہرستی موسیقی میں وہ "انفرادیت" کا نمائندہ ہے - اُسی کے اشاروں پر آرکسترا کام کرتا ہے - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آرکسترا بجاے کسی ایک شخص کی ہدایات کی پابندی کے اپنے مجموعی اثر کا پابند ہو گیا - اس قسم کا پہلا آرکسترا پروفیسر زیت لین (Zietlein) نے ماسکو میں قایم کیا --

باوجود اس تصرف کے ابتدا میں آرکسترا وہی پرانی موسیقی دہرایا کرتا تھا - موسیقی میں اشتراکیت کی خصوصیات نہیں آسکی تھیں - اس خامی کے دفع کرنے کے لیے اور بالشویکی موسیقی کی اختراع و تعمیر کے لیے سنہ ۱۹۲۳ ع میں "جدید موسیقی کی انجمن" قایم ہوئی - اس انجمن کے بانیوں میں اناطول الکسندروف (Anatole Alexanderov)، ولادمر دریانووسکی (Vladimir Derianovski)، نکولائی میاسکووسکی (Nikolai Miaskovski) کانسٹنٹین سارازدیف (Constantin Sarazdev) اور وکٹر بیلیف (Viktor Balaev) ہیں -

اِن میں نکولائی میاسکووسکی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے جس نے سب سے پہلے اشتراکی نغمے لکھے - اُس کے نغموں کے متعلق مشہور روسی نقاد گلے بوف (Glabov) لکھتا ہے "میاسکووسکی کے نغمے ممکن ہے کہ سامعین کے جذبات کو متاثر نہ کر سکیں - اُسکا موضوع اکثر تاریخی ہوتا ہے - نغموں میں ایک انقلابی کیفیت، ایک قسم کا خوف و دہشت پیدا کرنے والا اثر پایا جاتا ہے اور باوجود اس اثر کے اُن نغموں کی خوبیوں

میں کلام نہیں ہو سکتا - ناممکن آوازوں کی تخلیق ' غیر متعلق آوازوں کی یک جائی ' ... یہ میاسکوسکی کے مخصوص اسالیب ہیں " —

جدید روسی انجمن موسیقی کا ایک مشہور رکن سیموئیل فائنبرگ (Samuel Feinburg) ہے - جس کے نغمے میں آوازیں بالکل دست و گریباں ہو جاتی ہیں - ان کی موسیقی میں روسی بہیمیت کا اثر بدرجۂ اتم موجود ہے - لیکن کہیں کہیں اس کے نغموں میں سادگی بھی پائی جاتی ہے —

دیگر موسیقی نگاروں میں قابل ذکر اناطول الکسندروف ہے جو اکثر عشقیہ نغمے لکھتا ہے - دوسرا موسیقی نگار میخائیل گیزن ہے جس کی موسیقی میں ایشیائی رنگینی کی جھلک بہت نمایاں ہے —

آپیرا میں انقلاب پیدا کرنے کی جو تجویز اشتراکیوں نے سونچی تھی اُس میں کئی دقتوں کا سامنا تھا - صرف موسیقی ہی میں تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی بلکہ آپیرا کو ادبی حیثیت میں لکھوانے کا اہم مسئلہ بھی پیش نظر تھا - اور ادبی صورت میں آپیرا اشتراکیت کے کرخت اور مشین پرست اُصول کا متحمل مشکل سے ہو سکتا ہے - اس زمانے کے آپیرا نگاروں میں سرگئی پروکوفیف (Sergei Prokovef) اشتراکی اُصول کا سب سے زیادہ پابند ہے - اُس کے نغموں میں روسی بہیمیت اور وحشت انتہا کو پہنچ گئی ہے —

قدیم درباری بیلٹ (Ballet) اور رقص کے رد عمل کے لیے جدید اسالیب رقص کی بنیاد رکھی گئی - اِن اسالیب کی تہہ میں اشتراکی تمدن کا اثر پیدا کیا گیا ہے - حرکات میں تصنع اِس حد تک رکھا گیا ہے کہ بجائے انسانوں کے رقص کے جدید روسی رقص مشین کے پرزوں کا رقص

معلوم ہوتا ہے - رقص میں مشین کے پرزوں' اور آلات کی جنبشوں کی کیفیت پیدا کی جا رہی ہے - اِس رجحان کا ذمہ دار بھی ایک بڑی حد تک فاریگر ہی ہے - جس نے ڈرامائی تمثیلوں کی طرح' اپنی انتہا پسندی کے جوش میں قدیم روسی رقص کو ختم کرکے یہ "مشینوں کا رقص" ایجاد کیا ہے —

موسیقی اور رقص اس قدر لطیف فنون ہیں کہ "اشتراکی فضا" کو برداشت کر ہی نہیں سکتے - جس طرح اور تمام فنون لطیفہ روس کے موجودہ اشتراکی دور میں برباد ہوے ہیں یہ بھی بالکل غیر فطری بن کے رہ گئے —

جدید روسی آپیرا میں اگر کوئی نام کسی قدر عظمت کا مستحق ہے تو وہ استراونسکی (Stravinsky) کا نام ہے جس نے اِس مشین پرستی کے ماحول میں زندگی کے آثار باقی رکھے - اُس کے فن میں قدیم روسی آپیرا کی عظمتیں نظر آتی ہیں - صرف اُسی کی شخصیت کو یورپ نے بھی تسلیم کیا - اُس کی دعوت پر اِساڈورا ڈنکن بھی روس گئی تھی - اور وہاں اُس کے زیر اہتمام' اُس کی موسیقی کے ساتھ رقص کرتی رہی —

(۱۱)

یہ جدید روسی تھیٹر کے تمام مختلف پہلوؤں کا ایک مختصر سا خاکہ تھا - مختلف اداروں کے اسالیب میں بعدالمشرقین ہے - صرف ایک چیز اِن سب میں مشترک ہے - اور وہ روس کی خاص ذہنیت یعنی بہیمیت کی جانب ایک خفیف رجحان ہے - یہی بہیمیت ہم کو استنی سلاوسکی تک کے شاہکاروں میں باوجود انتہائی روحانی کوششوں اور نفسیاتی تجزیوں کے نظر آتی ہے —

جہاں روسی تھیٹر کے اشتراکی اداروں نے تھیٹر کو جمالیاتی حیثیت سے تباہ کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا، وہاں غیر اشتراکی اداروں نے روسی تھیٹر کو اُن بلند منازل تک پہنچا دیا جن تک مشکل سے دنیا کا اور کوئی تمثیلی ادارہ پہنچ سکا ہے- اسٹنلی سلاوسکی کو نہ صرف جدید تھیٹر میں یہ اہمیت حاصل ہے بلکہ تھیٹر کو اس سہ ہزار سالہ زندگی میں اُس کی شخصیت کے آدمی خال خال ہی نظر آتے ہیں- اُس کے ہم عصروں میں سے اگر کسی کو اُس کا ہم پلہ قرار دیا جاسکتا ہے تو صرف ایڈورڈ گارڈن کریگ کو- لیکن اُس کے اور ایڈورڈ گارڈن کریگ کے نظریے، اور زاویہ ہاے نظر بالکل متضاد ہیں- اِن دونوں میں سے ہر ایک اپنے فن کو کمال تک پہنچا چکا ہے —

اب یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ دنیا روسی تھیٹر کو کن نظروں سے دیکھتی ہے- روسی تھیٹر کے مختلف اداروں میں اس قدر فرق ہے کہ ہر ادارے کے لیے جداگانہ نقطۂ نظر ضروری ہے- اسٹنلی سلاوسکی نے دنیا بھر کے تھیٹر کو بے حد متاثر کیا ہے۔ نہ صرف تمثیلی نقطۂ نظر سے اُس کے نظریے مقبول ہیں بلکہ ڈرامائی ادب پر بھی اُن کا بہت گہرا اثر پڑ رہا ہے- جرمن ڈراما نگار گرہارٹ ہاپٹ مان (Gerhart Hauptmann) کی انتہائی حقیقت نگاری کا ایک باعث وہ اثر بھی ہے جو اسٹنلی سلاوسکی کی عملی کوششوں کی وجہ سے مترتب ہوا —

واختنگوف اور اُن کے ساتھیوں کی تعریف تو کی جاتی ہے مگر عملی حیثیت سے دنیا کے تھیٹر پر اِن کے اسالیب کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا —

اشتراکی تھیٹر اور اشتراکی آپیرا کی مخالفت ہر جگہ پوری

قوت سے ہٹ رہی ہے۔ گو اس مخالفت کی وجہ زیادہ تر سیاسی ہے پھر بھی اس میں ایک حد تک خالص جمالیاتی عنصر شامل ہے۔ اِس کے باوجود کم سے کم رقص کی حد تک روس کا اثر نمایاں ہوتا جا رہا ہے۔ پہلے خم (Curve) کو رقص کی جان سمجھا جاتا تھا۔ اب زاویوں اور خطوط مستقیم کی حرکت کی طرف توجہ کی جا رہی ہے۔ لیکن یہ اثر بہت خفیف ہے اور بدنما نہیں معلوم ہوتا —

(*)

حضرت زکی بلگرامی

(ایک غزل گو کی حیثیت سے)

از

(جناب سید حامد حسن صاحب بلگرامی ایم اے)

حضرت زکی کا تعارف دنیاے ادب سے بعض مشہور اہل قلم کے ہاتھوں ہو چکا ہے - چنانچہ مولوی سید افضل حسین صاحب ثابت رضوی لکھنوی اپنے تذکرۂ دربار حسین المعروف بہ چراغ مجالس میں تحریر کرتے ہیں —

"سید محمد زکی صاحب بلگرامی مرحوم بڑے ذہین اور زکی تھے - بلگرام کے سادات عظام سے تھے - لکھنؤ میں آرہے تھے - سنا ہے کہ پہلے شیخ گوہر علی صاحب مشہر سے اصلاح لیا کیے پھر مرزا دبیر مرحوم کے شاگرد ہوے" —

"آپ نے مرثیہ گوئی میں بڑی مشق بہم پہونچائی تھی - مرزا سلامت علی صاحب دبیر مرحوم جو اس فن میں اکمل تھے ان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے - ہر چند کہ غزل ' قصیدہ ' رباعی سب قسم کی شاعری کرتے تھے لیکن اپنے ہم عصروں سے اس فن خاص میں سبقت لے گئے تھے - عظیم آباد پٹنہ کی

طرف مجالس عزا میں پڑھے، بخوبی پھولے پھلے۔ دارالسرور رامپور میں کچھہ وظیفہ وہاں کے رئیس کی قدر دانی کی وجہ سے پاتے رہے۔ پھر وہاں سے زمانۂ جنت آرام گاہ مختارالملک نواب میر تراب علی خاں مغفور سر سالار جنگ مدارالمہام سرکار عالی حیدرآباد میں تشریف لائے۔ یہاں سے وطن جاکر بارھویں شعبان سنہ ۱۲۸۸ ھ میں انتقال کیا" —

صفحہ ۱۳۵ و ۱۳۶

لالہ سری رام صاحب ایم۔اے۔ مولف خم خانۂ جاوید جلد سوم خم خانہ جاوید کے صفحہ ۶۲۴ پر رقم طراز ہیں کہ:

"سید محمد زکی۔ خلف غلام رضا بلگرامی شاگرد جناب دبیر لکھنوی۔ ان کے نسب کا سلسلہ زید شہید سے ملتا ہے۔ بڑے طباع اور قابل بزرگ تھے۔ ریاست رامپور میں ملازم تھے۔ مرثیہ اور قصیدہ کہنے میں اچھی مشق تھی اور مرثیہ خوانی میں بھی کمال حاصل تھا۔ سنہ ۱۲۸۸ ھ پچاس سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کے شاگردوں میں نواب بلے صاحب مشتاق لکھنوی بڑے طبیعت دار خوش مذاق شاعر تھے" —

غرض حضرت زکی عموماً ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور وہ بھی حضرت دبیر کے شاگرد ہونے کی وجہ سے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زکی کا ذہن رسا غزلوں میں بھی ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ ہر چند مرثیہ گوئی کے رواج نے، اور خود طبیعت کے رجحان نے ان کو رفتہ رفتہ مرثیہ نگاری کی طرف مائل کردیا اور غزلوں سے ایک زمانہ میں یہاں تک منحرف کردیا کہ کہہ اُٹھے:

"جز مدح اور کچھہ نہ کوئی ہم زباں کہے"

پھر بھی ابتدائی دور میں جو غزلیں کہیں میں لطف و کیف سے لبریز ہیں - جوں جوں طبیعت میں مذہبیت غالب آتی گئی مرثیہ نگاری میں جوش آتا گیا ' یہاں تک کہ آج مرثیہ گوئی کی حیثیت سے باقی رہے-

یہیں ایک بات اور لکھتا چلوں ' حضرت زکی کو جناب ثابت صاحب ٭ اور لالہ سری رام صاحب نے حضرت دبیر کا شاگرد بتایا ہے - لیکن بعض اہل وطن کا اس پر اتفاق نہیں - ان کے نزدیک حضرت زکی انیس و دبیر کے شاگرد نہ تھے بلکہ مد مقابل - ممکن ہے یہ خیال وطن پرستی کے جوش پر مبنی ہو - لیکن میری نظر سے حضرت زکی کی ایک رباعی گذری جس سے یہ ترشح ہوتا ہے کہ شاید مہر و ماہ سے کچھہ حضرات انیس و دبیر کی طرف اشارہ ہو —

مداح امام ابن امام آیا ہے شہدائے شہہ عرش مقام آیا ہے
آنکھیں مہ و مہر کی جھپکتی ہیں زکی کیا ذرۂ خاک بلگرام آیا ہے

اگر حضرت دبیر کے شاگرد ہوتے تو شاید اس طرح کی نوک جھونک نہ ہوتی - پھر بھی یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ مہ و مہر صرف ذرۂ خاک

٭ جناب ثابت صاحب نے اسی سلسلے میں دربار حسین کے صفحہ ۱۳۶ پر تحریر فرمایا ہے کہ "مرزا محمد جعفر صاحب لیصر شاگرد حضرت دبیر مرحوم مجھہ سے جنوری سنہ ۱۹۱۷ ع میں بمقام لکھنؤ فرماتے تھے کہ میر محمد زکی صاحب مرحوم پہلے شیخ گوہر علی صاحب مشہر مغفور کے شاگرد تھے - پھر مرزا دبیر کے شاگرد ہوئے - امیرالامرا قدم رسول کے یہاں مجلس پڑھی مرزا صاحب موصوف تشریف رکھتے تھے - میرے سامنے تعریف ہونے پر میر زکی صاحب نے کہا کہ یہ سب تصدق جناب مرزا صاحب کا ہے" —

بلگرام کی رعایت سے نظم کیا گیا ہو نہ کہ کسی اس قسم کے خیال کی بنا پر۔ جناب منشی محمود صاحب 'حمد' بلگرامی شاگرد جناب بحر و قدر کی بھی یہی راے ہے —

میں اس مختصر مضمون میں زکی کو ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے ان کی مرثیہ نگاری سے فی الحال • چشم پوشی کرنا پڑتی ہے۔ حالانکہ ان کے ۲۲ مرثیے' چند سلام' کچھ رباعیات بھی نظر سے گذریں جو اب بھی حضرت زکی کے ایک عزیز جناب مجتبیٰ حسین صاحب بلگرامی کے پاس محفوظ ہیں۔ موصوف نے نہایت مسرت سے حضرت زکی کے کلام سے مجھے سرفراز فرمایا —

دل نہیں چاہتا کہ ان بزرگ کے خاص رنگ شاعری سے اغماض برتا جاے۔ مرثیہ نگاری آپ کی طبع جولاں کا خاص میدان تھا۔ اس لیے د بند ان کے کلام سے نقل کرتا ہوں کہ بلند خیالی و شیریں بیانی کی اداے دلکش کا کچھ اندازہ کیا جاسکے :—

صبح

جب ہر طرف حجاب عروس سحر ہوا پھولے شگوفے رنگ شفق جلوہ گر ہوا
ظاہر وداع لیلی شب کا اثر ہوا خاموش جھلملا کے چراغ قمر ہوا

پھیلی وہ ضو کہ چشم کواکب جھپک گئی
پھوٹی کرن جو مہر کی بجلی چمک گئی

ہیں قدرتی یہ بذلۂ دلکش کے چہچہے دریا فصاحتوں کے ہیں اک بات میں بہے
جز مدح اور کچھ نہ کوئی ہم زباں کہے حاضر جواب صورت آئینہ چپ رہے

• میں نے ان کے سوانح و کلام پر تنقید اپنی تالیف "تذکرۂ شعراء بلگرام" میں کی ہے۔ عنقریب شایع ہوجاے گی —

کھائے نہ پیچ زلف گرہ گیر کی طرح
بلبل ہو تیذ بلبل تصویر کی طرح

لیکن مرثیہ نگاری کے اس رنگ تک پہونچنے کے لیے مہر صاحب نے اپنی شاعری کی ابتدا میر انیس کی طرح غزل ہی سے کی تھی اور اوائل عمر میں اپنی طبیعت کی جولانی اس رنگ میں دکھائی تھی - لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ آتش کی آتش بیانی اور ناسخ کی مشکل پسندی نے اہل لکھنؤ کے سامنے شاعری کے گویا دو معیار پیش کردیے تھے - ناسخ نے شاعری کو بہت کچھ لغوی اور ذہنی بنا دیا تھا ، جہاں دور از قیاس استعارات ، نادر تشبیہات پر شاعری کا دارومدار تھا - حضرت دبیر اور ان کے بیشتر شاگرد بھی اسی طرف رجوع معلوم ہوتے ہیں - دوسری طرف آتش نے شاعری کے لیے جذبات و کیفیات کو اہمیت دی تھی - کچھ لوگوں نے ان کی اتباع شروع کردی تھی لیکن قابل قدر ہستیاں وہ ہیں جنھوں نے کم از کم لکھنؤ ہی کے ان دونوں اسکولوں کی خوبیوں کو اپنی شاعری کا معیار بنایا - حضرت زکی انھیں جیسی چند ہستیوں میں تھے - جن کے یہاں آتش اور ناسخ کے رنگ کا سنگم نظر آتا ہے —

نہ گئی شوخی، تقدیر بتوں کی نہ گئی
بن کے تصویر بھی گویا لب خاموش رہے

" گویا " کی لفظی خوبی نہ صرف ناسخ کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے بلکہ آتش کی جذباتی شاعری کے لیے بھی " لب خاموش " کے ساتھ ایک حسن ہے - یا دوسرا شعر لیجئے —

صفت حسن میں سر گرم رہیں اہل زبان
شمع بھی محفل جاناں میں نہ خاموش رہے

شعر میں صنعت لفظی ضرور موجود ہے لیکن جو لطف و کیفیت اس استعارے کے دامن میں پنہاں ہے اپنی داد کی الگ مستحق ہے —

گویا زکی کا یہ انداز بیان تھا کہ ایک طرف لفظی خوبیاں اپنا حسن دکھا رہی ہوں اور دوسری طرف ان سے زیادہ شعر کی معنویت دل کو لبھا رہی ہو - مثال کے لیے دو شعر لیجئے —

رحم کر رحم کہ اے برق تجلی جمال لطف کیا طالب دیدار جو بے ہوش رہے
لن ترانی ہی کی پردے سے چلی آے صدا اسی امید میں عاشق ہمہ تن گوش رہے

لیکن انہیں اشعار میں جو امتیازی خصوصیت حضرت زکی کی جھلک رہی ہے ان کے رنگ تغزل کو ناسخ اور آتش کے دونوں کی رنگ شاعری سے الگ کرتی معلوم ہوتی ہے - وہ ان کا ایک مخصوص زاویۂ نگاہ ہے جس کو فلسفہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے - اس زمانہ میں ایک ایسے شخص کے لیے جو لکھنؤ کے ماحول میں رہے اور پھر اپنی نظریں بلندی پرواز اور رفعت خیالی کی طرف رکھے ایک ایسا امر محال تھا جس کا مقابلہ آسانی سے نہیں کیا جاسکتا تھا - زکی لکھنؤ کے ہو رہے تھے - لکھنؤ کی سر زمین سے اتنی محبت پیدا ہوگئی تھی کہ جب وطن واپس آے اور لکھنؤ کی یاد نے ستایا تو کہہ اُٹھے :

زکی ہر وقت جلسے لکھنؤ کے یاد آتے ہیں
ہوا وہ باغ ویراں سیر جنت کی جہاں برسوں

باوجود اس کے زکی نے الفاظ کے گورکھ دھندھوں میں پھنس کر عروس خیال کو مجروح نہ کیا - یہ اثر بڑی حد تک خاک بلگرام کا تھا - اہل بلگرام اگرچہ اکثر لکھنؤ سے متاثر رہے لیکن کبھی ان لوگوں نے ان کی ادبی عظمت کو اس حد تک قبول نہ کیا کہ اس سے مرعوب

ہوکر غلط و صحیح کا امتیاز ہی باقی نہ رکھتے - دوسری وجہ جس نے زکی کے دامن کو خارستان میں الجھنے نہ دیا وہ ان کی غالب پسندی تھی - بلگرام کے اکثر شعرائے اردو کے کلام میں غالب کا خاص رنگ جھلکتا ہے - زکی کی شاعرانہ ذہنیت بھی غالب کی بلندی پرواز و رجحان فلسفہ سے بلا اثر پذیر ہوئے نہ رہ سکی - فلسفہ کی یہ جھلک اُن کی بیشتر غزلوں میں موجود ہے -

وہ دنیائے مجاز میں منزل مقصود کے قائل نہیں - چنانچہ کہتے ہیں-

طریق عشق میں کب منزل مقصود ملتی ہے
پھرے ہیں خاک اُڑاتے کارواں کے کارواں برسوں

حضرت زکی کے نزدیک کمال عاشقی یہی ہے کہ ایک شخص خود عشق میں اس درجہ غرق ہوجائے کہ اس کے اور معشوق کے درمیان سے امتیاز من و تو بالکل اُٹھ جاوے - وہ خود ہی عاشق ہو اور خود ہی معشوق - عشق کا کمال بھی یہی ہے کہ عاشق حسن کا ہر جلوہ خود اپنی ذات میں دیکھنے لگے —

کمال عاشقی یہ ہے کہ خود معشوق بن جائے
انا لیلیٰ رہا ہے قیس کے ورد زباں برسوں

یا اسی کو اس طرح کہتے ہیں —

کمال عشق ہے اے دل تو جذب کیف پیدا کر
نہ صورت آشنا ہو صورت آئینہ صورت کا

لیکن اس خیال کو جس شعریت اور کیف کے ساتھ ایک دوسری جگہ لکھا ہے شاید ادب میں اس کا جواب مشکل سے ملے گا —

واہ' اے عشق کہ معشوق بنا جاتا ہوں

کس کے انداز ہیں خاطر میں سمائے جاتے

دنیا میں رنج و آلام کی اصل وجہ امید موہوم ہی ہے - انسان کو رنج اسی وجہ سے تو ہوتا ہے کہ وہ جس چیز کی امید کرتا ہے اسے نہیں ملتی ۔ اگر امید وصل نہ ہو تو شاید رنج ہجر کا سامنا ہی نہ کرنا پڑے نہ دکھہ اٹھانا پڑے نہ درد سہنا پڑے - حضرت زکی ایک شعر میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں —

امید وصل و رنج ہجر نے رکھا مصیبت میں

نہ دل ٹھہرا نہ آئی موت رگڑیں ایڑیاں برسوں

اسی سلسلے میں زکی مرحوم کا ایک شعر خاص طور سے قابل ذکر ہے جس میں انہوں نے اجر عمل کے نازک مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے اور نہایت اختصار سے حل کرنے کی کوشش کی ہے - دنیا میں ہزاروں نیکیاں صرف خواہش جنت کی وجہ سے کی جاتی ہیں لیکن جنت اصل میں نام ہے خالص اور بے لوث عبادت کے اجر کا' نہ کہ خواہش جنت میں نیکیوں کے عوض کا - حقیقت بھی یہی ہے کہ اعلیٰ ترین عبادت وہی ہے جس میں ذاتی خواہشات سے الگ رہ کر ایک عمل صرف اپنی خوبیوں کی بنا پر کیا جائے یا زیادہ سے زیادہ صرف خدا کے واسطے ہو - ماسوا اس کے جو عمل صرف خواہش جنت میں کیا جاتا ہے مفید ثابت نہیں ہوتا —

جنت کی آرزو تھی جہنم ہوا نصیب

اب سمجھے اب کھلا کہ سمجھہ کا قصور تھا

یعنی دوزخ اس لیے ملی کہ عمر بھر ہم صرف آرزوئے جنت میں

رہے - ظاہر ہے کہ جو نیکیاں کیں وہ اس خواہش ذاتی کے نذر ہوگئیں-
مرنے کے بعد جب دوزخ نصیب ہوئی تو اپنی غلطی کا ہوش آیا —

کلام میں اکثر جگہ اخلاقیات کی بھی چاشنی ہے - اور شاید اسی اخلاقیات نے مذہبیت کے رنگ میں ڈوب کر مرثیہ نگاری کو اپنا شعار بنا لیا تھا - لیکن یہ ماننا پڑتا ہے کہ ایسے خشک موضوع پر بھی زکی نے رنگ تغزل ہاتھہ سے جانے نہ دیا - دو شعر اس قبیل کے بھی ملاحظہ ہوں -

خلاف آدمیت ہے نہ کر پرہیز مے سے
لٹیں گے خاک میں اومست نخوت استخواں برسوں

نہ اترا او گل نو خواستہ حسن دو روزہ پر
بہار باغ دم بھر ہے صعوبات خزاں برسوں

زکی بلگرامی کی چند غزلیں نقل کرنے سے قبل یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ ہر چند طبیعت کی خود داری نے اپنی انفرادیت دکھلائی ہے پھر بھی کلام پر لکھنؤ کے اثرات نمایاں ہیں' جہاں تک ہو سکا انہوں نے گوہر آب دار سے اپنا کلام سجایا ہے ' اگر دو چار جھوٹے موتی آگئے تو وہ ماحول کے اثر سے -

غرض زکی کے کلام میں فلسفہ و اخلاقیات کی معنوی خوبیوں کے ساتھہ ساتھہ لطف زبان' برجستگی' نرمی اور صفائی بدرجۂ اتم موجود ہے - ذیل کا مختصر انتخاب زکی کے اس رنگ طبیعت کا شاہد ہے -

انتخاب غزلیات زکی

جاؤں گا کہاں باب قفس کھول دے صیاد
پرواز کی طاقت مرے بازو میں نہیں ہے

کیوں خواستگار وصل دل ناصبور تھا
میں دور تھا نہ اوس سے نہ وہ مجھہ سے دور تھا

نسبت تھی اس کو برق تجلی سے کچھہ نہ کچھہ
موسیٰ ' کہو؟ یہ تھا دل عاشق کہ طور تھا

کیوں خاک ہوکے داغ محبت مٹا دیا
اے دل اسی چراغ سے آنکھوں میں نور تھا

(ایک بلند مضمون کو جس رنگ سے کہدیا ہے تغزل اسی کا نام ہے)

کیوں اُن سے دل کا حال کہا سوچ ہے یہی
کہنا ضرور تھا کہ نہ کہنا ضرور تھا

در پردہ قتل کرنے سے کیا فائدہ ہوا
قاتل نقاب رخ سے اُٹھانا ضرور تھا

ساقی جھکی نہ گردن مینا کسی طرح
شیشہ بھی کیا کسی کا سر پر غرور تھا؟

ہم حشر میں بھی جھومتے اُٹھے زمین سے
کیفیت خمار میں بھی ایک سرور تھا

کیو بیٹھے ' منت عشق میں ہاتھوں سے اے زکی
پروردۂ کنار دل ناصبور تھا

نقاب میں وہ بت بے مثال تھا کیا تھا؟
قہر تھا پر تو حسن جمال تھا کیا تھا؟

مٹا دیا ہمیں او بت ترے تلوں نے
فلک کا رنگ زمانہ کا حال تھا کیا تھا؟

پھڑک پھڑک کے اسیروں نے جان دی صیاد
اجل کا دام محبت کا جال تھا کیا تھا ؟

جنوں کا جوش تھا پوچھو نہ ذکر فکر شباب
خدا کی یاد بتوں کا خیال تھا، کیا تھا

زمین مجھ سے، میں لپٹا زمیں سے کھول کے دل
فشار قبر بھی لطف وصال تھا، کیا تھا

زکی کمال تعجب ہے ہجر میں جینا
حیات سہل تھی مرنا محال تھا، کیا تھا

تکرار نہ ہو وصل کے اقرار میں یارب
وہ بت کہیں کہہ دے کسی تدبیر سے اچھا

نہ وقت نزع بھی جھگڑا تھا معنی و صورت کا
بتوں میں دل رہا، لب پر رہا کلمہ شہادت کا

آیا جفائے یار سے دل میں غبار کب
اُٹھتا ہے اپنی خاطر نازک سے بار کب

برپا کریں گی طوفاں آنکھیں پر آب ہوکر
پھوٹیں گے دل کے چھالے اک دن حباب ہوکر

پھروں یہ سوچتا ہوں دنیا میں کیوں میں آیا
خارج حساب سے ہوں مد حساب ہوکر

فرقت میں روتے روتے اب دل پہ آبنی ہے
آنکھیں الٹ گئی ہیں جام حباب ہوکر

حسن و جمال جاناں روشن کرے جہاں کو
گہہ آفتاب ہوکر گہہ ماہتاب ہوکر

جگر جلتا رہا اتھا نہ آنکھوں کا دھواں برسوں
چھپایا ہے دل رنجور نے راز نہاں برسوں

لہو روتی رہی فرقت میں چشم خوں فشاں برسوں
خزاں میں بھی رہا گلزار اپنا بوستاں برسوں

کڑی میں ساتھ دینا سہل ہے مشکل پسندوں کو
کہا کہیں غل مرے ہمراہ میری بیڑیاں برسوں

یہ خود رفتہ کیا صیاد کی جوش محبت نے
نہ یاد آیا ہمیں کنج قفس میں آشیاں برسوں

جلوں کے جوش سے ہیں اور ہی عالم میں دیوانے
نظر آئی زمیں ہم کو نہ سوجھا آسماں برسوں

کمال عاشقی یہ ہے کہ خود معشوق بن جاے
انا لیلیٰ رہا ہے قیس کے ورد زباں برسوں

امید وصل رنج ہجر نے رکھا مصیبت میں
نہ دل ٹھہرا نہ آئی موت رگڑیں ایڑیاں برسوں

قفس کو جانتا ہوں، گھر میں اے صیاد کیا جانوں
کہے کیا جو رہے ناآشناے آشیاں برسوں

زکی ہر وقت جلسے لکھنو کے یاد آتے ہیں

ہوا وہ باغ ویراں سیر جنت کی جہاں ہوسوں

آہ و فغاں زباں پہ نہیں چشم تر نہیں

صد شکر راز دل کی کسی کو خبر نہیں

اللہ اس لجائی ہوئی آنکھہ سے بچائے

قاتل یہ تیغ تیز ہے نیچی نظر نہیں

ولولے دل میں تصور سے ہیں آتے جاتے

یاد کرتے ہیں تمہیں غم میں بھلاتے جاتے

درد پہلو کی کروں فکر ' کہ تھاموں دل کو

اور اک داغ دیے جاتے ہو جاتے جاتے

ذبح کرتے ہی مجھے ' جانے کا ارادہ تھا اگر

مرگ و زیست کا جھگڑا ہی مٹاتے جاتے

کیا میرا قصہ پرغم ہے کہ سننے والے

سنتے جاتے ہیں اور آنسو ہیں بہاتے جاتے

واہ اے عشق کہ معشوق بنا جاتا ہوں

کس کے انداز ہیں خاطر میں سماتے جاتے

—)•(—

کلام اثر

از

(جناب سید وقار عظیم صاحب ایم - اے)

اردو کی جہاں اور بدنصیبیاں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شروع سے آخر تک بیچاسوں معروف و غیر معروف شاعر اور ادیب ایسے ہیں جن کا نہ صحیح نام معلوم ہے اور نہ تاریخ پیدائش و وفات کا پتا ہے۔ ایسی صورت میں ان کی زندگی کے تفصیلی حالات کا معلوم ہونا ظاہر ہے - بہت سے بدنصیب ایسے بھی ہیں کہ ان کی پیدائش کا حال معلوم ہوا تو وفات کا پتا نہیں اور اگر وفات کا پتا لگ گیا تو تاریخ پیدائش مفقود - اِس کی ذمہ داری ہمارے تذکرہ نویسوں پر ہے - جنہوں نے ہمیشہ شاعر کی شخصیت اور اُس کی زندگی سے زیادہ کلام کو اہمیت دی اور بعض اوقات تو یہ ستم کیا کہ شاعر کے حالات میں دو سطریں لکھیں اور اشعار کے نمونے سے ورق کے ورق سیاہ کردیے - اِس کا ظاہری نتیجہ یہ ہوا کہ شاعر کے زمانۂ حیات کا صحیح تعین نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان کے خارجی اثرات سے کوئی مدد نہ لے سکے جنہوں نے ایک بڑی حد تک شاعر کے کلام کو اپنے اثر میں رنگا ہے —

اثر کا بھی یہی حال ہے - ان کا صحیح نام تو معلوم ہے لیکن نہ تاریخ پیدائش کا پتا ہے نہ تاریخ وفات کا -

اِس وقت ہمارے پاس جتنے تذکرے ہیں اُن میں سے گلشن گفتار ' نکات الشعرا ' مخزن نکات ' چمنستان شعرا اور گلشن بے خار میں اثر کا قطعی ذکر نہیں —

باقی تذکروں میں سے سخن شعرا اور گلشن ہند میں اتنے حالات ہیں جن کا ہونا نہ ہونا برابر ہے - مصحفی کے تذکرے میں اِن دونوں کے مقابلے میں کسی قدر زیادہ حالات ہیں - میر حسن نے بھی جو کچھہ لکھا ہے اس سے صرف یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا نام محمد میر اور تخلص اثر تھا اور علم و فضل کے علاوہ شاعری میں بھی ایک خاص مرتبہ کے مالک تھے - نام اور تخلص کے متعلق جتنے تذکروں میں ان کا حال ہے کسی میں اختلاف نہیں - نہ کوئی ان کے علم و فضل سے انکار کرتا ہے —

ان سب تذکروں کے بعد سب سے اچھا تذکرہ جس میں اِن کے کسی قدر مفصل حالات ملتے ہیں حکیم قدرت اللہ بیگ کا ہے - انہوں نے حتی‌الامکان وہ سب باتیں لکھہ دی ہیں جنھیں اس زمانہ کی تذکرہ نگاری کے معیار سے ضروری اور مکمل سمجھا جاسکتا ہے - ان کے خاندان ' ان کے علم و فضل ' ان کے استاد ' ان کی شاعری وغیرہ کے متعلق ہر ممکن بات لکھہ دی ہے - لیکن نہ تاریخ پیدائش کا ذکر ہے نہ وفات کا - ہمارے زمانے کے تذکرہ نویسوں میں آزاد ' لالہ سریرام ' مولوی عبدالحی ' اور صاحب تذکرۂ طور کلیم نے پرانے تذکرہ نویسوں کی تقلید کی ہے اور بلا کسی مزید تحقیق و کاوش کو کام میں لائے ہوئے وہی حالات دھرا دیے ہیں جو اب تک لکھے جا چکے تھے —

لیکن ان مختلف تذکروں کے دیکھنے کے بعد قیاساً ان کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا تعین کیا جا سکتا ہے —

تاریخ پیدائش و وفات

اثر کی تاریخ پیدائش معلوم کرنے کی کوشش کرتے وقت بھی ہم انہیں مختلف تذکروں ہی سے مدد لے سکتے ہیں - ان کے دیوان سے اس کا پتا چلنا محال ہے —

اِس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جس کی طرف ہماری نظر جاتی ہے یہ ہے کہ اردو کے بالکل ابتدائی تذکروں میں اثر کا قطعی ذکر نہیں - اس لئے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اِس وقت تک اثر شاعری کی دنیا میں بالکل مشہور نہیں ہوئے تھے —

اثر کا دیوان دیکھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا کلام شروع سے آخر تک بالکل ایک انداز کا ہے اور اس کے ہر شعر کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا کہنے والا ازل سے ایک شاعرانہ فطرت لے کر آیا تھا - اور اس لئے ضروری ہے کہ ایسا آدمی تھوڑی ہی سی عمر میں شاعری شروع کر دے گا اور شباب کی منزلوں تک پہنچتے پہنچتے ارباب ذوق اس کی شاعرانہ فطرت کی لطیف تخلیق کو پسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگیں گے - میر اور حمید اورنگ آبادی کے تذکرے سنہ ۱۱۶۵ ہجری میں تالیف ہوئے - ان میں اثر کا ذکر نہیں - قائم کا تذکرہ سنہ ۱۱۶۸ ہجری میں لکھا گیا - اس میں بھی اثر کا قطعی ذکر نہیں - اس لئے یہ ماننا پڑے گا کہ اثر اس وقت تک مشہور شاعر نہیں تھے —

درد کی پیدائش سنہ ۱۱۳۳ ہجری ہے - نکات الشعرا لکھے جانے کے وقت وہ ۳۲ سال کے ہوں گے - اور جب مخزن نکات لکھا گیا تو ان کی عمر اسی حساب سے ۳۵ برس کی ہوگی —

خود میر کی عمر ۱۱۶۵ ھجری میں ۲۸ سال کی ہوگی* اور ۱۱۶۸ ع میں ۳۱ سال —

سودا نسبتاً ان دونوں سے بڑے تھے اور ۱۱۶۵ میں قریب چالیس سال اور ۱۱۶۸ میں قریب ۴۳ سال کے ہونگے † - ان تینوں ہم عصر شاعروں کی عمر کا اندازہ کرنے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ اثر درد کے چھوٹے بھائی تھے یہ یقینی ہے کہ وہ سنہ ۱۱۶۵ ھجری میں ۳۲ سال سے کم ہوں گے —

اگر ہم فرض کرلیں کہ اس وقت اُن کی عمر ۲۰ سال کے قریب ہوگی تو کئی دقتیں پیش آتی ہیں اور ہمارے پاس ان کا کوئی معقول جواب نہیں —

(۱) پہلی دقت تو یہ ہے کہ جب اثر کی عمر ۱۱۶۵ ھجری میں ۲۰ سال کی تھی اور ان کے کلام کے دیکھنے کے بعد یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں بیس سال کی عمر میں کافی مشہور شاعر ہونا چاھئے تھا تو میر نے اُن کا ذکر اپنے تذکرے میں کیوں نہیں کیا —

(۲) اگر بالفرض ۲۰ سال کی عمر میں وہ کافی مشہور شاعر نہیں بھی ہوئے تھے تو شاعری کی دنیا میں تھوڑی بہت حیثیت ضرور حاصل کرلی ہوگی - چونکہ میر نے اپنے ہم عصروں میں اچھے اور برے سب شاعروں کا ذکر کیا ہے اس لیے ان کا ذکر کرنا بھی ضروری تھا —

---

* اس لیے کہ ان کی محقق تاریخ پیدائش ۱۱۳۷ ھجری ہے (مقدمۂ ذکر میر) —

† سودا کی تاریخ پیدائش زیر تحقیق ہے - اپریل سنہ ۳۳ ع کے اردو میں کسی صحیح نتیجہ پر پہونچنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن کامیابی نہیں ہوئی - اس لیے سر دست یہی تاریخ صحیح سمجھی گئی —

تیسرے یہ کہ ۱۱۹۵ ہجری میں ان کی عمر ۲۰ سال مان لینے کے بعد یہ ظاہر ہے کہ مخزن نکات کی تالیف کے وقت وہ تیئیس سال کے ہوں گے اور اس عمر میں ایک اچھے خاصے مرتبہ کے شاعر۔ قائم درد کے شاگرد ہونے کے باوجود ایسا نہیں کر سکتے تھے کہ اپنے استاد کے چھوٹے بھائی کا ذکر نہ کرتے۔ بلکہ خیال تو یہ ہے کہ اگر وہ تھوڑی بہت شاعری بھی کرتے ہوتے تو قائم ان کا ذکر ضرور کرتے۔ لیکن قائم نے ان کا نام تک نہیں لکھا۔ اس لیے ہم یہی نتیجہ نکالتے ہیں کہ اثر نے اس وقت تک شاعری شروع ہی نہیں کی تھی —

چوتھے یہ کہ اگر میر اور قائم نے انہیں چھوڑ دیا تھا تو شفیق نے چمنستان شعراء* میں ان کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ جب کہ اس میں دو سو سے زیادہ شاعروں کا تذکرہ ہے جن میں سے اکثر شاعر دلی کے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ جواب ملے کہ شفیق نے اپنے تذکرے میں میر اور گردیزی کی تقلید کی ہے۔ لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ شفیق کے تذکرے میں بہت سے ایسے شاعروں کا بھی ذکر ہے جن کا ذکر نہ میر کے یہاں ہے نہ گردیزی کے یہاں۔ شفیق کے تذکرے کی تالیف کے وقت مقررہ حساب سے اثر کی عمر ۳۰ سال کی ہوگی۔ جس عمر میں میرے نزدیک انہوں نے قبول عام کا شرف حاصل کرلیا ہوگا۔ پانچویں بات میرے نزدیک یہ ہے کہ درد اور اثر کے والد میر ناصر عندلیب بڑے بزرگ اور اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔ اور اس لیے انہوں نے درد کو خود ہی تعلیم دی۔ لیکن اثر کے متعلق مشہور ہے کہ اُنہیں مولوی خواجہ احمد خاں اور خود ان کے بھائی خواجہ میر درد نے پڑھایا۔ اس کی میرے نزدیک دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ چونکہ درد نے علم و

* تالیف ۱۲۷۵ ہجری —

فضل کی وہ منزلیں طے کرلی تھیں جو تبحر کا زینہ ھیں اس لیے بجاے اپنے آپ پڑھانے کے ان کے والد نے اثر کو درد کے سپرد کردیا - خواجہ احمد خاں نے ممکن ھے اس لیے پڑھایا ھو کہ وہ اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے - دوسری وجہ یہ بھی ھوسکتی ھے کہ جو زمانہ اثر کی تعلیم کا تھا اس میں عندلیب کافی بوڑھے ھوگئے تھے اور اس لیے ایک اھم کام کو انجام نہیں دے سکتے تھے - چونکہ میر عندلیب کی وفات سنہ ۱۱۷۲ ھجری* کے قریب ھوئی ھے سنہ ۱۱۵۳ ھجری† میں ان کی آخری تصنیف ھوئی - اس کے بعد ان کے علمی مشاغل کا کچھ پتا نہیں چلتا - یہی زمانہ میرے نزدیک اثر کے بچپن اور حصول تعلیم کا ھوگا —

ان خارجی شواھد کی بنا پر ھم اس نتیجہ پر پہنچتے ھیں کہ میر یا قائم کا تذکرہ لکھے جانے کے وقت اثر کی عمر مشکل سے گیارہ بارہ برس کی ھوگی اور اسی لیے ھمیں ان کا ذکر اس زمانے کے کسی تذکرے میں نہیں ملتا - اس حساب سے اثر کی پیدائش کا سال قریب قریب ۱۱۵۳ - ۵۴ یا ۵۵ یا اس کے بالکل قریب ھوسکتا ھے ‡ —

تاریخ وفات

تاریخ پیدائش کے متعلق کسی نتیجے پر پہنچنے کے بعد ھمارے سامنے دوسری دقت یہ ھے کہ ھمیں اُن کا سنہ وفات بھی صحیح نہیں معلوم - کسی تذکرہ نویس نے اس کی طرف اشارہ تک نہیں

---

* و † مقدمہ دیوان درد مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی

‡ اس موقعہ پر ایک بات اور کہی جاسکتی ھے اور وہ یہ کہ اثر نے درد کے متعلق اکثر جگہ جن جن جذبات کا اظہار کیا ھے اُس سے اندازہ ھوتا ھے کہ ان دونوں کی عمروں میں بڑا تفاوت تھا اور اس ذریعے سے بھی ھم اُس نتیجہ پر پہنچتے ھیں جس پر اب تک پہنچے (ملاحظہ ھو اسی مضمون کی سرخی درد سے ارادت) —

کیا - اس موقعہ پر بھی ہمیں خارجی شواہد کی مدد سے صرف قیاسات سے کام لینا پڑے گا —

ہمیں ان کی زندگی کا آخری واقعہ صرف یہ معلوم ہے کہ اپنے بھائی کی وفات کے بعد سجادہ نشین بھی ہوئے - لالہ سری رام نے اس کا ذکر یوں لکھا ہے کہ جب درد ضعیف ہوگئے اور زندگی کے ختم ہونے کے آثار نظر آنے لگے تو لوگوں نے پوچھا کہ اُن کے بعد سجادہ کسے دیا جائے تو آبدیدہ ہوکر حضرت درد نے یہ قطعہ پڑھا —

موت کیا ہم سے فقیروں سے تجھے لینا ہے — مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مرجاتے ہیں
تا قیامت نہیں مٹنے کے دل عالم سے — درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں •

اس سے معلوم ہوا کہ وہ ۱۱۹۹ تک زندہ تھے - اس کی تائید ایک دوسرے طریقے سے اور ہوتی ہے - حکیم قدرت اللہ لکھتے ہیں کہ "...... و بعد از انتقال آں ستودہ خصال ممکن نبود کہ در حین ذکر خیرے از چشم گوہر فشان شان اشک درد آلود حسرت اندود دریا دریا نبارد † " —

یہ تذکرہ ۱۲۲۱ ہجری میں لکھا گیا ہے - حکیم قدرت اللہ نے اس موقعہ پر ان کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ گویا اُن کا انتقال ہوگیا - ایک جگہ لکھتے ہیں —

"بریں عاصی بانواع المعاصی زیادہ تر ازانکہ در حوصلۂ تقریر و تحریر گنجد لطف عنایت مبذول می داشتند" - آگے چل کر لکھتے ہیں - "دیوان مختصر در نہایت جودۃ و پاکیزگی و مثنوی خوردک درغایت متانت و شستگی یادگار ایں بزرگوار است" —

"می داشتند" اور "یادگار ایں بزرگوار است" سے بھی نتیجہ

• خمخانہ جاوید جلد اول صفحہ ۱۲۹ - † مجموعۂ نغز -

نکالا جاسکتا ہے کہ وہ سنہ ۱۲۲۱ هجری سے پہلے مر چکے تھے —

مولف گل رعنا نے معلوم نہیں کس بنا پر لکھا ہے کہ اُن کے نزدیک وہ ۱۲۵۰ سے پہلے مرے - میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جب ۱۲۲۱ میں بھی اُن کی وفات کا یقین ہو چکا ہے تو اس زمانہ کو اور زیادہ طویل کیوں بنایا جاے —

ان قیاسی نتائج تک پہنچنے کے بعد ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ اثر کی عمر بھی اپنے والد اور بڑے بھائی کی طرح ۶۰ اور ۷۰ کے درمیان ہوگی -

دوسرے حالات

اثر کے متعلق ہر تذکرہ نویس کو اتفاق ہے کہ وہ خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی تھے - اس لئے اُن کا سلسلۂ خاندانی بھی وھی ہے جو درد کا تھا - درد کے متعلق جتنے تذکرہ نویسوں نے حالات لکھے ہیں وہ ہر حیثیت سے معتبر نہیں سمجھے جاسکتے - مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی نے ان کے حالات ان کی کتاب علم الکتاب سے اخذ کئے ہیں اور اس لیے وہ زیادہ معتبر ہیں - وہ لکھتے ہیں کہ "درد صحیح النسب حسینی سید ہیں - آبائی سلسلہ بارھویں پشت میں خواجہ بزرگ بہاؤالدین نقشبندی قدس سرہ سے اور چھبیسویں پشت میں حضرت امام عسکری سے ملتا ہے - مادری سلسلۂ نسب حضرت غوث اعظم (رض) تک منتہی ہوتا ہے - خواجہ صاحب کے والد کی والدہ بھی حضرت غوث اعظم (رض) کی اولاد میں تھیں - والد کا نام خواجہ ناصر' عندلیب تخلص ' نانا میر سید محمد حسینی تھے - جو بیٹے تھے نواب میر احمد خاں شہید کے - نواب صاحب پانی پت کے معرکے میں نادر شاہ کے مقابلہ میں شہید ہوے - جہانکشاے نادری میں ان کا ذکر ہے - مرزا رفیع سودا کے ممدوح تھے ...... مسکن پرانی دلی میں تھا ...... خواجہ ناصر صاحب کے والد بخارا سے

تحصیل علم کے بعد عہد عالمگیری میں وارد ہندوستان ہوے تھے - خواجہ ناصر صاحب ہندوستان میں پیدا ہوے - ابتداءً شاہی منصب داروں میں شامل تھے - آخر منصب ترک کرکے یاد الہی میں مصروف ہوگئے - حضرت قبلۂ عالم خواجہ محمد زبیر سے بیعت تھے " * - یہاں تک جتنے حالات ہیں ان کا تعلق لفظ بہ لفظ میر اثر سے بھی ہے —

تعلیم

اثر کے علم و فضل کی ہر ایک نے تعریف کی ہے - میر حسن لکھتے ہیں " درویشے است موقرو صاحب نسخے است مؤثر عالم و فاضل رتبۂ قدرش بغایت بلند گوہر صدرش نہایت ارجمند " † —

میر حسن نے جتنے شعرا کے متعلق رائیں قائم کی ہیں وہ بے حد جلچی تلی ہیں - ان پر مبالغہ کا گمان بھی نہیں ہوسکتا - اس لیے ان کی یہ راے بھی بے حد وقیع ہے —

حکیم قدرت اللہ خاں نے لکھا ہے " بزیور علم آراستہ و بحلیۂ فضل پیراستہ بودند - استفادۂ علوم ضروریہ ایشاں را از جناب افادۂ انتساب .... مولوی خواجہ احمد خاں علیہ الرحمۃ والرضوان است " ‡ —

اِس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے اُستاد خواجہ احمد خاں علیہ الرحمہ تھے - مولف گل رعنا کا خیال ہے کہ اثر نے ان سے فنون ریاضیہ کی تعلیم حاصل کی - معلوم نہیں ان کا ماخذ کیا ہے - انہوں نے خواجہ احمد خاں کے متعلق لکھا ہے کہ زیج محمد شاہی انہیں کے اہتمام میں لکھی گئی —

---

* مقدمۂ دیوان درد مطبوعہ بدایوں پریس صفحہ ۳ -

† تذکرۂ شعراے اردو میر حسن -

‡ مجموعۂ نغز (حالات اثر) -

اُن کی علمی قابلیت کے متعلق یہ دو خارجی شواہد جو ذمہ دار لوگوں کی زبان قلم سے نکلے ہیں معتبر سمجھے جاسکتے ہیں - اب ہم دوسرے وسائل کی طرف رجوع کرتے ہیں -

خواجہ میر درد کی تصانیف میں سے ایک علم الکتاب بھی ہے جو اُن کی مشہور کتاب 'واردات' کی شرح ہے * - مولانا حبیب الرحمن خاں نے لکھا ہے کہ علم الکتاب اثر کی فرمائش سے لکھی گئی + -

نالۂ درد علم الکتاب کے بعد کی تصنیف ہے ' اس کے متعلق درد نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ " علم الکتاب کے ختم ہونے پر جو مطالب " قلب حیران ' پر تراوش کرتے تھے ان کو میر اثر جمع کرتے گئے - جب مجموعہ تیار ہوگیا نالۂ درد نام رکھا ‡ - اس کی تاریخ بھی میر اثر نے کہی ہے " نالۂ عندلیب درد من است " -

سنہ ۱۱۹۲ ھجری میں درد نے ایک رسالہ آہ سرد لکھا - اُس کی تاریخ بھی اثر نے کہی " آہ سرد ما نماید گرمیء رفتار ما " - یہ چیزیں ایسی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ درد کے دل میں بھی اثر کے علم وفضل کا اثر تھا ورنہ وہ ان کی فرمائش سے ایسی اہم کتاب نہ لکھتے - نالۂ درد کے مطالب کو ان کے بھروسہ پر نہ چھوڑ دیتے - ان کی کہی ہوئی تاریخوں سے بھی ان کے کمال کا اندازہ ہوتا ہے -

اس کے علاوہ ایک اور چیز جس سے ان کے علم کا پتا چلتا ہے خود ان کا دیوان ہے - جس میں جا بجا تصوف وفقہ کے گہرے مطالب آسان

---

* مقدمۂ دیوان درد صفحہ ۴ -　　+ مقدمۂ دیوان درد صفحہ ۲ -

‡ مقدمۂ دیوان درد صفحہ ۲ -

لفظوں میں بیان کیے گئے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ ان کا بیان کرنے والا ان پر کتنا عبور رکھتا ہے۔ تصوف کے اشعار ان کی شاعری کا ذکر کرتے وقت پیش کیے جائیں گے۔ اس جگہہ صرف دو ایک شعر سن کر ان کی علمیت کا اندازہ لگائیے —

باوجو یکہ وہاں نہ ہجر نہ وصل کوئی مہجور کوئی واصل ہے

گر ہم ہی ہم ہیں آہ تو ہم ہم کبھو نہ ہوں اور تو ہی تو ہے سب کہیں تو ہم کہاں رہے

مفہوم متسلع سے عدم میں تو ہاں رہے کہنے کو آہ ہم تو رہے پر کہاں رہے

صلح کل بہت سچ ہے آساں ساتھہ ؑ اہل جدال مشکل ہے

صاحب دید کی زباں ہے لال شمع کو قیل و قال مشکل ہے

عرفان اتم ہے عجز عرفاں تعریف تصور ہے تلا کا

بعض جگہہ عربی کے فقرے بے حد بے تکلفی سے نظم کیے ہیں —

ازواج مطہرات اُس کے کل ماصدق انہ النساء کا •

ایک غزل کا شعر ہے —

یا رب سوا لقاء وجہک لا مقصودی ولا مرادی

اِن شواہد سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اثر عالم و فاضل تھے یا نہیں۔ میرے نزدیک شبہہ کی کوئی وجہ نہیں۔ ان کے زیادہ اشعار

• یہ مصرع تقطیع سے ذرا گرتا ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب کا خیال ہے کہ اصل نسخے میں یہ مصرع اسی طرح ہے۔ میرے نزدیک کتابت کی غلطی ہے۔

پڑھ کر یہ یقین اور زیادہ مضبوط ہوجاے گا —

درد سے ارادت
اثر نے بیعت اپنے والد بزرگوار کے ہاتھہ پر کی - لیکن انہیں اپنے بڑے بھائی سے جتنی محبت، عقیدت اور ارادت تھی وہ ضرب المثل ہونے کے لائق ہے - حکیم قدرت اللہ نے اس بات کو صرف ایک جملے میں اس طرح لکھا ہے " در محبت برادر میں آنچناں مستغرق و ھالک بودند کہ زیادہ ازآن متصور نیست " + - انہیں کے خیال کے مطابق ان کی اس قدر اطاعت کرتے تھے کہ کوئی بات یا کام بلا ان کی مرضی کے نہیں کیا اور ان کے انتقال کے بعد انہیں یاد کر کرکے بہت رویا کرتے تھے - ان باتوں کا اندازہ اُن کا کلام پڑھ کر بھی ہوتا ہے - اکثر جگہ درد کا ذکر کیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں وہ سب کچھہ انہیں کو سمجھتے ہیں - حتی کہ عاقبت کی نجات کا ذریعہ بھی اُنہیں کا دامن ہے - جو شعر اس قسم کے دیوان اثر میں ہیں وہ درد کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں - کچھہ شعر آپ کی خدمت میں بھی پیش کیے جاتے ہیں --

ہے غلامی اثر کو حضرت درد بدل و جاں تری جناب کے بیچ

ہے تجھہ سے عاشقوں کی خوبی یا حضرت درد میرے والی

اس شعر میں حضرت عندلیب کی طرف رجوع ہوئے ہیں لیکن درد کا ذکر وہاں بھی ہے —

یا حضرت عندلیب بخشش یہ تیرے ہی درد کا اثر ہے

اسی غزل کا مقطع ہے

بے درد تو کیونکہ رہ سکے گا یہ حضرت درد کا اثر ہے

درد کا صدقہ اثر ہم بھی بھلا حق کے حضور شمع ساں اشک ندامت سے خودی دھوکرچلے

---

* مجموعۂ نغز - + مجموعۂ نغز -

ایک رباعی ہے —

جب تجھہ سے جدائی میری محبوب ہلی — تب زیست اثر کی بری اسلوب ہلی
اُس کی بھی خود بخود تم هی خوب ہلاو — جوں درد تمہاری بخدا خوب ہلی

ہے درد کا درد اثر کا یار جانی — یہ بات تو اب زیست گزارے جانی
صد شکر نہیں رہا غم تنہائی — ہے جان اسی کے ساتھہ بارے جانی

مرشد دستگیر قرباں تیرے — اے میرے زندہ پیر قرباں تیر.
تیری هر بات پر دل و جاں ہے فد — یا حضرت خواجہ میر قرباں تیر.

یا درد یا اثر اثر تیرا ہے — اے سر پدر یہ بے پدر تیرا ہے
اللہ کریم اور تو کریم ابن کریم — یہ گوکہ گنہگار ہے پر تیرا ہے

مثنوی خواب و خیال میں دو جگہ اسی جذبہ کی ترجمانی ہوئی ہے * —

درد هی میرے جی پہ چھایا ہے — درد کا میرے سر پہ سایا ہے

خصوصاً یہ شعر —

تونے ایسی هی دستگیری کی — پدری مادری و پیری کی
تونے اس مہر و نور سے پالا — نہ پڑا مجکو اور سے پالا

ان شعروں میں سے بہت سے شعر ایسے هیں جن سے یہ اندازہ هوتا ہے کہ اثر اور درد کی عمروں میں کافی فرق تھا -

---

* مقدمہ مثنوی خواب و خیال —

اخلاق و عادات | اثر کے اخلاق و عادات کا پتا کسی تذکرے سے نہیں چلتا - صرف حکیم قدرت اللہ نے ان کے متعلق یہ لکھا ہے کہ

" از نیک ذاتی شان چہ بر طرازد - خامہ با وجود دو زبان از تحریر آن عاجز اید خیلے خلیق و متواضع - و رفیق القلب و صاحب درد .. ..." *

اس کے علاوہ ان کے ان شعروں سے جو انہوں نے درد کے متعلق کہے ہیں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ انتہا سے زیادہ مہذب ، منکسر مزاج اور فرماں بردار تھے - خود حکیم قدرت اللہ نے بھی لکھا ہے کہ بلا بھائی کی اجازت کے کوئی کام نہ کرتے تھے - ایک دوسری صفت جو ان شعروں میں نمایاں طور پر جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ حد سے زیادہ احسان کو ماننے والے تھے - دنیا کے جھگڑوں سے بہت کم سروکار رکھنا چاہتے تھے اور خدا تک پہنچنے کے لئے بھی اپنے بھائی کی مدد کے طالب تھے - مجموعی حیثیت سے ان باتوں کو دیکھ کر ہم ان کے متعلق یہی رائے قائم کرتے ہیں کہ ان میں وہ سارے اخلاق حسنہ موجود تھے جن سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے - پہلی چیز یہ ہے کہ اپنے بزرگوں کا احترام کیا جائے - دوسری چیز یہ ہے کہ دنیا کے لوگوں سے خاطر اور محبت سے ملا جائے - دل میں نیکی اور سچائی ہو - اثر میں یہ سب باتیں موجود تھیں —

ان کی روحانی بزرگی کا ثبوت یہ ہے کہ خود میر درد نے انہیں اپنے سجادہ کے لئے سب سے زیادہ موزوں سمجھا —

شاعری | اس وقت ہم اثر کی شاعری کے جس پہلو پر نظر ڈالنے جا رہے ہیں اس کا تعلق اس دیوان سے ہے جو مولانا عبدالحق صاحب کے مختصر مقدمہ کے ساتھ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑہ سے شائع ہوا

---

* مجموعۂ نغز -

ہے - دیوان میں کل ۷۸ صفحے ہیں - ۱۱ صفحے تک مختلف ردیفوں میں غزلیں ہیں - صفحہ ۱۱ سے صفحہ ۶۲ تک مختلف مطالع ہیں - صفحہ ۶۲ سے آخر تک رباعیات ہیں - لیکن کلام پر تنقید کرتے وقت ہم ان چیزوں کو الگ الگ نہیں کریں گے بلکہ اثر کے کلام کے جو نکات بیان کریں گے ان کی مثالیں غزلوں ' مطالع اور رباعیات سے یکساں طور پر اخذ ہوں گی —

اثر کی شاعری کی مجموعی اور انفرادی صفات بیان کرنے سے پہلے یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام پر جو خارجی اثرات پڑے ہیں ان کا بھی ذکر کردیا جائے —

ان کی زندگی کے ہر پہلو کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ خواجہ میر درد کی ذات تھی - ان کی نیکیاں ' ان کے دنیاوی اخلاق ' ان کی روحانی بلندی ' ہرچیز درد کے اثر کی مرہون منت ہے - اول تو اسی رنگ میں رنگ جانے کے بعد اثر کی فطرت بالکل ایسی ہوگئی کہ نفسیاتی نقطۂ نظر سے بھی ان کی شاعری کو بالکل ویسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسی درد کی شاعری ہے - لیکن میرے نزدیک یہ چیز صرف شاعری کی روح اور اس کے خیالات اور جذبات کے انداز پر اثر ڈال سکتی تھی - لیکن کلام اثر کو گہری نظروں سے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ جہاں انہوں نے درد سے اور اثرات لئے وہاں ان کی شاعری کے انداز سے بھی بے حد متاثر ہوے اور میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ یہ اثر اس قدر نمایاں ہے کہ درد کے کلام کے متعلق مختلف نقادوں اور تذکرہ نویسوں نے جو تنقیدیں کی ہیں ان میں سے اکثر کا اطلاق لفظ بہ لفظ اثر کے کلام اور دیوان پر ہوسکتا ہے - اس میں شک نہیں کہ اثر نے درد سے اصلاح لی لیکن اردو میں کسی دوسرے شاعر کی اس قسم کی مثال ملنی دشوار ہے

جس میں شاگرد نے استاد کا اتنا گہرا اثر قبول کیا ہو کہ دونوں میں تمیز مشکل ہوجائے - اب ہم مختصر طور پر اس بات کو مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کریں گے —

میر حسن کی تنقید دیوان درد پر یہ ہے کہ "دیوانش اگرچہ مختصر مگر سراپا انتخاب" اثر کا دیوان درد کے دیوان سے بھی زیادہ مختصر ہے اور اس کا ہر شعر انتخاب ہے -

درد کے کلام کے متعلق مجموعی تنقید یہ ہے کہ ان کے یہاں درد اور اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے - تصوف اردو میں ان سے بہتر کسی نے نہیں کہا - زبان بے حد صاف ' سلیس ' فصیح اور شیریں ہے - ان سب باتوں کا ذکر آگے چل کر کسی قدر مفصل طور پر کیا جائے گا - لیکن اس جگہ دو ایک باتیں لکھنی ضروری معلوم ہوتی ہیں -

آزاد نے درد کے کلام پر تنقید کرتے وقت اُن کی غزلوں کی ایک تعریف یہ کی ہے کہ چھوٹی بحروں میں جو غزلیں ہیں ان میں تلواروں کی آبداری نشتروں میں بھر دی ہے - یا بقول امیر مرحوم کے بسی ہوئی بجلیاں ہیں - مثال کے طور پر اثر کی دو ایک ایسی غزلیں دیکھ کر اندازہ کیجئے -

جب تلک تو اِدھر کو آوے گا تب تلک جی نکل ہی جاوے گا

پھر طوفان ہے مرا گریہ ایک عالم کو یہ ڈوباوے گا

کون ہے وہ کہ خیر خواہی سے حال میرا تجھے دکھاوے گا

دیکھ لیجو یہ انتظار میرا ایک دن تجھ کو کھینچ لاوے گا

تو نے بندے سے جو سلوک کیا بت کافر خدا سے پاوے گا

یاد رکھنا بھلا نہ مل بہتر پھر کبھو تو خدا ملاوے گا

جس قدر ہو سکے ستالے تو جب یہ بندہ بھی کچھ ستاوے گا

اثر اب تو ملے ہے تو اس سے
پر یہ ملنا مزا دکھاوے گا

دیکھئے تو سہی کہ کیا ہوتا ایک نالہ اثر کیا ہوتا

چھوٹتی ہی یہ بد معاملگی پہلے دل کو تو لے لیا ہوتا*

اب توقع کسے بھلائی کی دل نہ ہوتا تو کچھ بھلا ہوتا

خواہ بوسہ ہی خواہ گالی ہی کچھ تو دل کے عوض دیا ہوتا

جانتا کچھ قدر ہماری بھی تو بھی عاشق اگر ہوا ہوتا

بےوفائی پہ تیری جی ہے فدا قہر ہوتا جو با وفا ہوتا

کچھ اثر کا علاج کرتے ہم
رات کی رات گر جیا ہوتا

جو سزا دیجئے بجا مجھکو تجھ سے کرنی نہ تھی وفا مجھکو

غم میں بیٹھوں کہاں نکلوں بت کے اب اٹھا دے کہیں خدا مجھکو

سرد مہری نے تیری اے ظالم آہ کتنا جلا دیا مجھکو

گر اسی میں خوشی تمہاری ہے اور بھی کھجئے خفا مجھکو

کیوں تو ہر چند جفا سی کرتا ہے نہیں کچھ دعوۂ وفا مجھکو

وہی میں ہوں اثر وہی دل ہے
اب خدا جانے کیا ہوا مجھکو

---

* مطبوعہ دیوان میں اس شعر کا پہلا مصرعہ یوں لکھا ہے 'چھوٹتی ہے یہ بد معاملگی' دوسرے مصرعہ کےساتھہ اس کے کچھہ معنی نہیں ہوتے - معلوم نہیں عبدالحق صاحب کی نظر اس پر کیوں نہیں پڑی - یہ غلطی اس لیے ہوئی ہوگی کہ قلمی نسخوں میں عموماً یائے مجہول و معروف کی کتابت میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا -

روز اٹھ کر نہا بہانا ہے   کام میرا فرض بہانا ہے

راہ تکتے ہی تکتے ہم تو چلے   آئیے بھی کہیں جو آنا ہے

نہ ملوں جب تلک کہ تو نہ ملے   اب یہی قصد جی میں ٹھانا ہے

کبھو میرا بھی کہنا مانئے گا   جو کہا تو نے میں نے مانا ہے

وعدے کر انتظار میں رکھنا   نت نئی طرح کا ستانا ہے

دل گیا جی بھی اب ٹھکانے لگا   تس پہ بھی باقی آزمانا ہے

تیرے در پر بسان نقش قدم   نقش اپنا ہمیں بٹھانا ہے

ہر طرف توڑ جوڑ کرتے ہو   دلبری ایک کارخانہ ہے

تیری عیاریوں کی باتیں اثر
سب سمجھتا ہے گو دوانا ہے

لوگ کہتے ہیں یار آتا ہے   دل تجھے اعتبار آتا ہے

دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا   دشمنی پر تو پیار آتا ہے

تیرے کوچہ میں بے قرار ترا   ہر گھڑی بار بار آتا ہے

زیر دیوار تو سلے نہ سلے   نام تیرا پکار آتا ہے

حال اپنے پہ مجکو آپ اثر
رحم بے اختیار آتا ہے

اثر کی یہ غزلیں بلا کسی انتخاب کے لکھی گئی ہیں اور ضروری نہیں کہ یہ سب سے اچھی ہوں - بلکہ مجھے یقین ہے کہ ان کے دیوان میں ان سے اچھی اچھی غزلیں چھوٹی بحروں میں موجود ہیں - بلکہ پورے دیوان میں زیادہ غزلیں چھوٹی بحروں میں ہیں اور بہت کم بڑی بحروں میں- اور ان سب غزلوں میں درد کے کلام کی ساری خصوصیات موجود ہیں -

ان میں درد اور اثر ہے - ان میں بلند جذبۂ عشق کی ترجمانی ہے - اُن میں تصوف ہے - اور ساتھ ساتھ سادگی اور زبان کی فصاحت و سلاست —

اثر کے دیوان میں کئی غزلیں ایسی ہیں جو درد کی غزلوں کی زمینوں میں کہی گئی ہیں - ان سب کا یہاں نقل کرنا طوالت سے خالی نہیں - لیکن کم از کم دو غزلیں لکھی جاتی ہیں جن سے اندازہ ہو جائے کہ دونوں کے کلام میں کس قدر باتیں یکساں ہیں - درد کے دیوان کی پہلی غزل یہ ہے —

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کے رقم کا حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

جس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب کا اور دل میں بھروسہ ہے تو تیرے ہی کرم کا

مانند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی

کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

اثر کی غزل بھی پانچ شعر کی ہے - دونوں غزلوں میں صرف ایک قافیہ یکساں ہے - باقی جداگانہ - لیکن خیالات کا اندازہ دیکھئے کیسا ہے -

نے ضد کوئی نے ند تری اوصاف و شیم کا وہ ہست نہیں تو کہ مقابل ہو عدم کا

کیا کہہ کے بیاں کیجیے تری ذات صفت کو وھاں تو نہ گزر نام و نشاں کا نہ علم کا

کیا تیرے دوام اور بقا کی کہیے حادث اس تن کی عبادت سے ہے اطلاق قدم کا

ہم عاصی گنہگاروں کو بس دونوں جہاں میں صرف ایک ٹھکانا ہے تیرے فضل و کرم کا

رہتا ہوں بہر حال سبھی وقت میں میں شاد

ہے کا یہ اثر خاص ترے درد و الم کا